(ماہ نامہ)

سب رس

۱۹۴۴ع

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
چندہ بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
ایک پرچے کی قیمت (۸/)

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی
خواجہ حمید الدین بی اے

جلد (۷) بابت اپریل سنہ ۱۹۴۴ء شمارہ (۴)

(ادب)

(حدیثِ دیگراں (کہانیاں))

شعرستان

شاعرِ مشرق اقبال

خواجہ حمید الدین بی اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیرت آباد سے شایع ہوا۔

(اس بات کا اظہار میرے لئے باعث مسرت ہے کہ یہ شمارہ سب رس کے سابق ایڈیٹر صاحبزادہ میکش نے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اپریل کا شمارہ ان کو مرتب کرنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ ان کی خواہش عملی جامہ پہن کر آپ کے پیش نظر ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ کاغذ کی گرانی اور قلت کی وجہ سے اس شمارہ کا ایک حصہ "آئینہ" شامل نہ ہو سکا۔ انشاءاللہ آئندہ اشاعت میں اس کو جگہ دی جائے گی۔)

شاہد

سب رس کا یہ شمارہ پیش کرتے ہوئے مرتب کی حیثیت سے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس شمارے کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ ادب سے متعلق ہے۔ دوسرا علامہ اقبال سے اور تیسرا "آئینہ" ہے جس میں بعض عصری مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ اردو ادب اب ایک ایسی منزل پر ہے جہاں اس پر سے زندگی گریز گندہ نقاب اٹھ گئے ہیں۔ اب ہمارا ادب زندگی سے قریب ہوتا جا رہا ہے اس شمارے میں آپ کو بعض ایسے مضامین ملیں گے جن کے ذریعے ہمارے ادب کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ دوسرا حصہ علامہ اقبال سے متعلق ہے۔ علامہ اقبال کا انتقال آج سے چھ سال پہلے اسی مہینے میں ہوا تھا۔ اور ان کے انتقال کے بعد سب سے پہلے "سب رس" ہی نے ایک خاص نمبر کے ذریعے سے ان کا خراج تحسین ادا کیا تھا۔ آج چھ سال بعد بھی "سب رس" اقبال کے ساتھ ایک مستحکم تر ذہنی وابستگی پاتا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج سے چند سال پہلے سب رس کا "اقبال نمبر" میں نے ہی مرتب کیا تھا۔ آج بھی یہ خوش قسمتی مجھے ہی حاصل ہوئی ہے

اگر آپ نے اس نمبر کو پسند کیا تو میں آپ کی اس پسندیدگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور محترمی ڈاکٹر زور اور ادارۂ ادبیات اردو کی عنایت سے جولائی میں ایک خاص شمارہ پھر پیش کروں گا جو تمام تر حیدرآباد سے متعلق ہوگا۔ جولائی میں ہم سالگرہ ہمایونی کی قومی عید منا چکے ہوں گے۔ اور یہ نمبر گویا اس انبساط آفریں تقریب کا ایک خوش گوار تتمہ ہوگا جسے ادارۂ ادبیات اردو آپ کی خدمت میں پیش کرے گا۔

آخر میں مجھے محترمی ڈاکٹر زور اور عزیزی شاہد کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے ایک بچھڑے ہوئے کو پھر ایک دفعہ آپ کے سامنے لا کھڑا کیا ــــ وہ اصحاب جنھوں نے بعض غلط فہمیوں کی بناء پر یہ سمجھ لیا تھا کہ میں سب رس یا ادارۂ ادبیات اردو سے اس قدر دور ہو گیا ہوں کہ میرا لوٹنا ممکن نہیں، اب سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا انفرادی اختلاف جو کاروباری نوعیت کا ہو کسی قدیم ترمقصد کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ "سب رس" اور ادارۂ ادبیات اردو مجھے اب بھی اسی طرح عزیز ہے جس طرح کہ پہلے کبھی تھا

میکش

اُردو کی کہانی

(شمالی ہند کا دور)

شمالی ہند میں اُردو ادب و شعر کی ابتدا، اور فارسی کے ترک کرنے کا سبب میر نے شاعرانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے —

خوگر نہیں کچھ یونہی ہم ریختہ گوئی کے معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

زوال گولکنڈہ کے بعد دکن کے جو اُردو شاعر شمال گئے ان کی تعداد میں (جیسے جیسے اُردو کے تذکرے دستیاب ہوتے جا رہے ہیں) اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ایک مصحفی ہی کے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن کے چودہ پندرہ اُردو شاعر دہلی گئے تھے جہاں انہوں نے قدر و مقبولیت حاصل کی۔ تذکرۂ اعظم الدولہ سرور سے بھی اس بارے میں اچھا مواد حاصل ہوتا ہے۔

مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں شمال کے تیس کے قریب ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جنھوں نے دکن کا سفر کیا تھا۔

یہ تو شاعروں کا ذکر تھا اس زمانے میں دکن کی بہت سی اُردو کتابیں بھی شمال پہنچیں چنانچہ شاہان اودھ کے کتب خانوں میں دکن کی معتد بہ اُردو قلمی کتابیں جمع ہو گئی تھیں۔ "اسپرنگر" کا کیٹلاگ ان کے تذکروں سے معمور ہے۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ دکن کے اردو ادب نے شمال میں کس درجہ مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس کی شہادت اس طرح سے بھی ملتی ہے کہ یورپ کے مختلف کتب خانوں میں جو قدیم دکنی مخطوطے محفوظ کر لئے گئے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے کاتب شمالی ہند کے باشندے تھے اور جنھوں نے محمد شاہ کے اوائل عہد میں دکن کی ان اردو کتابوں کو نقل کیا تھا۔

قدیم تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی مجلسوں میں دکن کے اُردو اشعار دلچسپی سے سنے جاتے تھے اور دکنی شاعروں کی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ ولی نے تین دفعہ — یا دو — دہلی کا سفر

کیا ... ... اور بھی جی نہیں بھرا

دہلی کے شاعر ولی کی غزلوں کی تقلید میں غزلیں لکھتے اور انہی کے شعروں سے اپنے مشاعروں کے لئے مصرع طرح حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ اب تک شمال کے اس زمانہ کے اردو شاعروں کے کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوئے ہیں تاہم دیوان زادۂ حاتم سے اس کے ثبوت ملتے ہیں۔ دیوان زادہ اس عہد کی تنہا محفوظ یادگار ہے۔ اس کا نفیس اصلی نسخہ انڈیا آفس میں موجود ہے۔ اور اس کو نقل اور مرتب کر کے ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔

دیوان زادہ کے دیباچہ میں حاتم نے ولی کی استادی کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں انہی کی طرز میں لکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی غزلوں میں ولی کی استادی کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے اس انتخاب کلام میں بھی تیرہ غزلیں ایسی ہیں جن پر انہوں نے صراحت کر دی ہے کہ یہ ولی کی زمین اور تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ بعض شعروں میں وہ ولی سے مخاطب بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ولی کی موجودگی ہی میں لکھے گئے ہیں۔

تذکرۂ قاسم میں ولی کی تعریف کرنے کے بعد اس زمانہ کے ایک شاعر کا مصرعہ اپنے خیالات کی شہادت کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ "پیر خاں کمترین کہ خدا لیش بیامرزد بسیار بہ موقع و بجا گفتہ کہ —

ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں"

اس زمانہ کی ایک اور تصنیف "تذکرۂ بے جگر" ہے جس کا خود مصنف کا لکھا ہوا مخطوطہ انڈیا آفس میں موجود ہے، ولی کی نسبت لکھا ہے۔

"درحقیقت گفتہ کہ اسپ در میدان ہندی دوانید آن بود۔ وفی الواقع شخصے کہ آب رفتہ باز در جوئے این زبان ہندی رسانید ہماں بود۔ چون در سنہ اثنا جلوس محمد شاہی دیوان او بہ دہلی رسید موزونان طبع عالی بلند فکر و عالی

تلاشان ہم عصر مثل حاتم و آبرو و فغاں وغیرہ بہ
تتبع زبانش پیرو و ہم زباں شدند،،

ایک اور تذکرۂ طبقات سخن میں آبرو کے ذکر میں لکھا ہے

"چوں دیوان ہندی شاہ ولی اللہ گجراتی بہ عصر
محمد شاہ بہ دہلی رسید تتبع آن شد"

مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندی میں حاتم کا قول نقل کیا ہے جس سے دلی میں اردو ادب کے آغاز پر روشنی پڑتی ہے۔ حاتم کے ذکر میں لکھتے ہیں

"روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سنہ دوم فردوس آرام گاہ
دیوان ولی در شاہجہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد
و بزرگ جاری گشتہ۔ با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون
آبرو باشد بنائے شعر ہندی را بایہام گوئی نہادہ داد معنی
یابی و تلاش مضامین تازہ می دادیم"

ولی کے علاوہ دکن کے جن اردو شاعروں کے کلام نے دہلی میں شہرت حاصل کی ان میں فقیر اللہ آزاد اور فراقی بھی شامل ہیں۔ میر حسن اپنے تذکرہ کے آغاز میں۔ لکھنے کے بعد کہ "باید دانست کہ ریختہ اول از زبان دکنی است" فقیر اللہ آزاد کا حال لکھتے ہیں اور پھر اس کی شاعری کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

"ہمراہ فراقی دکنی در شاہجہاں آباد آمدہ بود طبع دردمندے
داشت و بسیار بہ صفا حرف می زند خدا لیش بیامرزد"

غرض ان اسباب اور حالات کے نتیجے کے طور پر شمالی ہند اور خاص کر دہلی میں اردو ادب کا آغاز ہوا۔ اور فارسی کا اثر کم ہونے لگا۔ چونکہ دکن کے اردو کلام کے اثر سے ابتدا ہوئی تھی اس لئے اول اول دکنی طرز کی پیروی کی گئی۔ اس کے خلاف لکھنے والے کی شاعری غلط سمجھی جاتی تھی چنانچہ اس آغاز ہی دور کے ایک مشہور شاعر شاہ مبارک آبرو نے اس کے متعلق جو نصیحت کی تھی اس کو حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں نقل کیا ہے سے

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ہے
ان سنتے کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لائے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل اس کے ریختہ میں حرف ہے

لیکن شعرائے دلی کا یہ اسلوب عرصہ تک قائم نہیں رہ سکا۔ دکنی طرز کی پیروی ان کے لئے غیر فطری تھی اس میں بھی اظہار خیال کے لئے انہیں تکلف اور تصنع سے کام لینا پڑتا تھا اب انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنے روزمرہ میں فارسی اجزا کی آمیزش کر کے شعر لکھیں۔ اگرچہ پہلے پہل بعض شعرانے اس کی مخالفت بھی کی مگر یہ تحریک کامیاب ہو گئی اور بہت جلد اردوئے معلی کی زبان میں شعر و شاعری ہونے لگی۔ اس رجحان کا آغاز مرزا مظہر جان جاناں نے کیا اور اس کی ترقی عہد ناسخ تک جاری رہی۔ حاتم نے اس تبدیلی کا ذکر اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں کیا ہے اور چونکہ وہ دہلی میں اردو شاعری کے آغازی اور اصلاحی دونوں رجحانوں کی ترویج و ارتقاء کے وقت زندہ تھے اس لئے ان کا بیان اس بارے میں زیادہ دلچسپ اور مستند ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"دریں ولا ایں تربیت طلب از دہ دوازدہ سال
اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی و فارسی
کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روزمرۂ
دہلی کہ میرزایان ہند و فصیح گویاں رند در
محاورہ دارند منظور داشتہ سوائے آن زبان
ہر دیار تا بہ ہندوی کہ آن را بھاکا گویند
موقوف نمودہ فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص
پسند بودہ اختیار کردہ"

پھر قدیم وجدید لفظوں کی فہرست لکھنے کے بعد کہتے ہیں "دیوان زادہ میں قدیم یعنی دکنی طرز کے اشعار میں نے نہیں درج کئے ہیں۔ اگر کوئی مل جائیں تو مجھے معاف کیجئے"۔ لیکن اب تذکروں سے حاتم کی قدیم طرز کی نظمیں بھی دستیاب ہوگئی ہیں۔ حمد و نعت پیران کی ایک نظم تذکرۂ گلشن گفتار میں منقول ہے۔ اس کے چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ یہ ظاہر ہوسکے کہ دہلی کی ابتدائی اردو شاعری کس رنگ کی تھی اور اس کے ساتھ ہی دیوان زادہ کی ایک نظم کے چند شعر بھی پیش کئے جاتے ہیں جو ثابت کریں گے کہ لسانی تبدیلی کے رجحان نے دہلی کے ابتدائی ادب کے اسلوب کو کس قدر بدل دیا حاتم کی ابتدائی شاعری کا نمونہ یہ ہے :-

الہٰی داغ سیں دل کوں جلادے برہ کی آگ مجھ تن میں لگادے
جلا جیوں پھلجھڑی اس ناتواں کوں شرر لبریز کر ہر استخواں کوں
فنا کر عشق میں یہ جان بےتاب کہ جیوں آتش میں گھٹ جاتا ہے سیماب
کہ ہو سٹ آپ سیں یکبار جاؤں پیمبر کی صفت کرنے کو دھاؤں
رکھے ہیں جس کے دروازے پہ موتی سعادت جان دربانی کا عاصا
مسیحا ناک گھس تج آستان پر دماغ اپنا چڑھایا آسمان پر
اگر تر سدرہ بنتے ہر پیر جبریل کیا علم حقیقت خوب تحصیل
نبیؐ کی آل پر سے وار جانا اسی بارہ پلے میں پار جانا

دلی کی یہ وہ طرز شاعری تھی جو حاتم کے آخری زمانہ میں متروک ہوگئی تھی اور جس طرز کے کلام کا انتخاب انھوں نے دیوان زادہ میں نہیں کیا۔ یہاں ہم دیوان زادہ کی ایک نظم سے چند شعر پیش کرتے ہیں :-

کیا بیاں کیجئے بیرنگیٔ اوضاع جہاں کہ بیک چشم زدن ہوگیا عالم ویراں
جن نے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں پھرتے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں
نعمتیں جن کو میسر تھیں ہمیشہ ہر وقت روز پھرتے ہیں یہاں قوت کو اپنے حیراں

جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اس لسانی تبدیلی کو ابتدا میں بعض حضرات نے پسند نہیں کیا۔ تذکرۂ مخزن نکات میں قائم نے اس کے متعلق اپنے خیالات اس طرح ظاہر کئے ہیں۔

"بر آشنائے سلوک سخن مخفی و محتجب نیست کہ
از عہد عبداللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانۂ بہادر شاہ
اول کسانے کہ شعر ریختہ گفتہ اند نسق کلام
ایں ہا بسیار مربوط و معقول است۔ ہر چند
اکثر الفاظ غیر مانوس گوش ما مردم مستعمل ایشاں
است لیکن چونکہ موافق زبان دکن راست و
درست است پیش ہمہ کس راہ بدو دارد"

قائم کے اس بیان کے سلسلے میں ان کا یہ اردو شعر غالباً دلچسپی سے سنا جائے گا کہ:-

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

شمالی ہند کے شعرا کے طبقہ سوم یعنی میرؔ، سوداؔ اور سوزؔ وغیرہ کے ذکر سے پہلے قائم لکھتے ہیں۔

"مخفی و محتجب نماند کہ انچہ الحال اشعار و احوال
شعرائے متاخرین نوشتہ می آید۔ طرز کلام ایں ہا
مانند بہ شعر فارسی است۔ چنانچہ جمیع صنائع
شعری قرارداده اساتذۂ اسلاف است بہ کار
می برند و اکثرے از ترکیبات فرس کہ موافق
محاورۂ اردوئے معلیٰ مانوس گوش می نمایند
جواز البیان می دانند۔ اما ترجمۂ زبان مغل
بہ ریختہ کردن معقوح است۔ چہ دریں
صورت صحت زباں یکے از ہر دو نمی ماند"

مگر قائم اور ان کے ہم خیالوں کے اعتراض کے باوجود شمالی ہند کا اردو ادب فارسی سے متاثر ہوتا گیا۔ یہ رجحان اس لئے

بھی کامیاب ہوگیا کہ اس کے علمبردار مظہر جان جاناں، میر درد سودا اور درد و سوز جیسے بلند مرتبہ شاعر تھے۔

شمالی ہند کا اردو دور تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے پہلا حصہ اس ابتدائی عہد پر مشتمل ہے جس میں حاتم، مظہر، مضمون، آبرو اور ناجی وغیرہ نے فارسی چھوڑ کر اردو میں لکھنا شروع کیا۔ ان میں سوائے حاتم، مظہر اور آبرو کے دوسروں کو زیادہ شہرت نصیب نہ ہوئی اور اس عہد کے شاعروں کے کلام کے مجموعے بھی بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔

شمالی ہند کے اردو ادب کا دوسرا دور اُن باکمالوں پر مشتمل ہے جنھوں نے اردو شعر و سخن کو معراج کمال پر پہنچا دیا اور آخر کار دلی کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچے اور وہاں اردو کی فضا پھیلائی۔ ان شعرا میں میر تقی میر، مرزا رفیع سودا اشرف علی خاں فغاں، محمد میر سوز، قیام الدین قائم اور میر درد خاص کر قابل ذکر ہیں۔ ان سبھوں نے مختلف اصناف سخن میں کلام لکھا اور اردو کو بہت وسیع اور مقبول بنا دیا۔

شمالی ہند میں اردو کا تیسرا دور میر حسن، مصحفی، انشا حسرت، جرأت، رنگین اور ناسخ جیسے اساتذۂ سخن پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اکثروں نے میر اور سودا کی قائم کی ہوئی روایتوں میں اپنی اپنی بساط کے مطابق وسعت دی اور بعضوں نے ایسا کلام بھی لکھا جو ادب کے سبک اور ظریفانہ پہلو کو اجاگر کرنے کا باعث ہوا۔ ان میں انشا، رنگین، اور جرأت کا نام سب سے نمایاں ہے۔

یہ ایک مختصر کہانی تھی شمالی ہند کے اردو ادب کی۔ اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اس لئے کہ اس دور کے شعرا میں متعدد ایسے گزرے ہیں جن میں سے ہر ایک مستقل اور جداگانہ کتاب کا موضوع بن سکتا ہے۔

سید محی الدین قادری زور

اُردو کی کہانی

(اورنگ آبادی دور)

سرزمین اورنگ آباد تقریباً ڈیڑھ دو صدی تک علم و ادب کا گہوارہ رہ چکی ہے۔ اس مردم خیز خطے نے ایسے بلند پایہ شاعر پیدا کئے جن کی شہرت دکن سے باہر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ جب دکن پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا تو اورنگ زیب کو دکن کا صوبہ دار بنا کر بھیجا گیا اور اس نے اورنگ آباد ہی کو اپنا مرکز حکومت قرار دیا۔ شاہ جہاں کی وفات کے بعد جب اورنگ زیب عالمگیر نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو دہلی کی بجائے اورنگ آباد سلطنت مغلیہ کا دارالحکومت قرار پایا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اورنگ آباد کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی اور سارے ہندوستان کی نظریں اس طرف اٹھنے لگیں۔ ہندوستان کے امراء، علما، شعرا اور مشائخین جن کو سلطنت مغلیہ سے تعلق تھا اورنگ آباد چلے آئے اور یہیں مستقل بود و باش اختیار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ آباد علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا۔ علم و ادب کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ فارسی اور اردو کے شعرا کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور گھر گھر شعر و سخن کے چرچے ہونے لگے۔ چنانچہ اس خاک پاک سے بڑے بڑے نامور شعرا پیدا ہوئے اور انھوں نے وہ لازوال شہرت حاصل کی کہ آسمان شاعری پر آفتاب بن کر چمکے۔ یہی زمانہ دراصل اورنگ آباد کے شباب کا زمانہ تھا۔

اس دور میں اورنگ آباد نے اردو علم و ادب کے نشو و نما میں جو حصہ لیا ہے وہ تاریخ ادب اردو کا ایک درخشاں باب ہے۔ بابائے ریختہ ولی اورنگ آبادی اور استاد تغزل حضرت شاہ سراجؔ اورنگ آبادی اس دور کی پیداوار ہیں۔ ان کے علاوہ کئی ایسے شاعر ہیں جو اردو شاعری میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے لیکن حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ اورنگ آباد کے عالموں اور شاعروں کا اب تک کوئی مبسوط تذکرہ نہیں لکھا گیا۔ البتہ شعرائے اردو کے تذکروں میں ان کے چیدہ چیدہ حالات ملتے ہیں۔ اب تک تاریخ ادب اردو کی کئی کتابیں شایع ہو چکی ہیں لیکن کسی میں بھی اس دور کے متعلق کافی معلومات یک جا نہیں کی گئیں۔ آج سے کوئی پندرہ سولہ سال قبل حیدرآباد کے ایک خاموش اردو خدمت گزار مولوی سردار علی صاحب نے اس کمی کو محسوس کرکے "تذکرۂ شعرائے اورنگ آباد" کے نام سے ایک کتاب شایع کی جس میں اورنگ آباد کے قدیم اور مشہور شاعروں کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام درج ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ مختصر ہے لیکن کافی محنت اور تحقیق کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی جواں ہمت اس کام کو اپنے ذمے لے اور اورنگ آباد نے اردو زبان اور شعر و سخن کی جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں ان سب کو یک جا کرکے ایک مبسوط تذکرہ ترتیب دے۔ یہ کام بہت اہم ہے اور تاریخ ادب اُردو میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔

اب ہم یہاں اورنگ آباد کے چند شاعروں کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

ولیؔ | ولیؔ اردو شاعری کے دور متوسط کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ تاریخ ادب اُردو میں ولیؔ کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہی وہ پہلا شاعر ہے جس نے شمالی ہند میں اُردو شاعری کو روشناس کرایا اور اپنے کلام کے اثر سے وہاں کے شاعروں کو فارسی کی طرف سے ہٹا کر ریختہ گوئی کی طرف مائل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ولیؔ کو اردو شاعری کا باوا آدم اور بابائے ریختہ کہا جاتا ہے۔ شاہ مبارک آبروؔ نے جو اپنے زمانے میں ریختہ کے مسلم الثبوت شاعر تھے ولیؔ کی کرامت کا اس طرح اعتراف کیا ہے ؎

آبروؔ شعر ہے ترا اعجاز   پر ولیؔ کا سخن کرامت ہے

ولیؔ کی شاعری کی عظمت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج تک اُردو شاعروں کے جتنے بھی تذکرے لکھے گئے ان سب میں ولیؔ کا ذکر صفۂ اولین میں کیا گیا ہے۔ اور جملہ تذکرہ نگاروں نے ولیؔ کی بے انتہا تعریفیں کی ہیں اور قدرت اللہ خاں قاسمؔ نے تو مجموعۂ نغز میں پیرخان کمترینؔ کا

بقیہ مضمون صفحہ ۳۸ پر ملاحظہ فرمائیے۔

ادب کا مقصد اور ترقی پسند ادب

ادب آرٹ کی وہ قسم ہے جس میں ادبی صناع زبان کے ذریعے سے انسانی خواہشات' جذبات' تاثرات اور تجربات کو کیفیاتی رنگ میں پیش کرتا ہے آرٹ زندگی کے ان عناصر کے تصور کی از سرنو تخلیق کو کہتے ہیں جن سے انسان کو سابقہ پڑتا ہے اور جن سے اسے دلچسپی ہے کسی ادیب کی تحریروں کا خارجی حقیقتوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ ادب کسی ایک شخص کی ذاتی خواہش کے عکس کا نام نہیں ہے۔

آرٹ بھی سائنس کی طرح ایک سماجی پیداوار ہے' ذہن انسانی کا ایک فعل ہے سائنس میں ہم تجربہ کرتے ہیں شہادتوں کو فراہم کرتے ہیں واقعات کو کاٹتے چھانٹتے ہیں پھر انہیں ترتیب دیتے ہیں۔ انسانی حالات کے اندرونی تفاوت کو دور کرتے ہیں گویا سائنس بکھری ہوئی معلومات کو ایک جا جمع کر کے باقاعدہ طور پر نظریہ کی شکل دیتی ہے۔ مگر سماجی انسان صرف سوچنے والا جانور ہی نہیں ہے بلکہ وہ محسوس بھی کرتا ہے وہ ہنستا ہے' روتا ہے غمزدہ ہوتا ہے مسرور ہوتا ہے پشیمان ہوتا ہے تکلیفیں اٹھاتا غصہ کرتا مایوس ہوتا اور بعض وقت جان پر سے اٹھ جاتا ہے۔ انسان کے خیالات لاکھ پیچیدہ نازک اور لطیف سہی مگر اس کے نفسی تجربات کا سر کسی نہ کسی طرح آرٹ سے مل جاتا ہے۔ آرٹ انہیں غیر مربوط منتشر تاثرات کو مرتب کرتا اور انہیں حسین پیکر بخشتا ہے آرٹ انسانی تاثرات کو عام یا سماجی بناتا ہے۔ یا جیسا کہ ٹالسٹائے نے کہا آرٹ جذبات کو متعدی بنانے کا نام ہے۔ مثلاً کوئی گانے والا راگنی گا رہا ہو تو سننے والوں میں بھی غم ملول کر جاتا ہے۔ ایک گانے کا ذاتی جذبہ آرٹ کی وساطت سے کئی لوگوں میں منتقل ہوتا اور انہیں متاثر کرتا ہے دوسرے لفظوں میں ایک فرد کی نفسی حالت عام دنیا کی نفسی حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سائنس کی طرح آرٹ بھی چند خاص مادی حالات میں پیدا ہوتا ہے ان خاص مادی حالات سے مراد انسان کی وہ اولین اور بنیادی ضرورتیں ہیں جن سے جسم و جان کا رشتہ برقرار رہتا ہے جیسے کھانا' کپڑا' رہنا سہنا فرصت اور فراغت وغیرہ۔ جب انسانوں کی یہ بنیادی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں تو ان میں آرٹ پیدا ہونے کے سازگار حالات پیدا ہو جاتے ہیں شاعر' مصور' رقاص' مغنی جنم لیتے ہیں۔ جب جڑوں کو پانی ملتا ہے تو کونپلیں بھی پھوٹتی ہیں پھول بھی کھلتے ہیں آرٹ فرصت اور فراغت کا بچہ ہے یوں کہئے کہ آرٹ کی پیدائش سے پہلے چند معاشی اور مادی ضرورتوں کا پیدا ہو جانا ضروری ہے ورنہ سعدی کا وہ شعر مجھے بھی یاد ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق   کہ یاران فراموش کردند عشق

پھر جہاں روٹی ہی کا نہیں کپڑے کا علم کا عقل و فراست کا اور فرصت و فراغت کا قحط ہو وہاں آرٹ تلاش کرنا بنجر زمین سے فصل کی امید رکھنا ہے۔ سماجی زندگی اگر بنجر ہو تو وہاں آرٹ نہیں اگ سکتا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ محنت کش طبقے جو زندگی کی بنیادی اور اولین ضرورتوں کی تکمیل سے محروم ہیں جن کی زندگی ایک ایسے لق و دق صحرا کی سی ہے جس میں شادابی اور شگفتگی کا نام و نشان تک نہیں تو وہاں آرٹ کا بھی پتہ نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ آرٹ ہمیشہ خوش حال اور تونگروں کا ہی حق اور میراث اور اس طبقے کے جذبات اور خواہشات کا آئینہ دار' عام مخلوق سے بے تعلق اور انسانیت کے حقیقی خیالات اور جذبات سے بیگانہ رہا۔

حیات انسانی کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خوش حال طبقے بھی ہمیشہ بدلتے رہے۔ انسان بعض بنیادی ضرورتوں کے تقاضوں کی بناء پر اپنی زندگی میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کرتا نئے سماجی تعلقات اور نئے ماحول پیدا کرتا رہتا ہے۔ ان تبدیلیوں کا اثر

اس کے دل و دماغ پر، اس کی قوت فکر اور قوت عمل، اس کے ذہنی رجحانات اور جمالیاتی ذوق پر بھی پڑتا ہے اور ادب اور اس کے موضوعات اور میلانات انداز بیان اور لغت بھی جو بہرحال انسان ہی کے ذہن کی تخلیق ہوتے ہیں بدلنے لگتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ اختر پیا کے تہ بار سے اندر سبھا ہی نکلی مسدس حالی کیوں نہیں نکلی یا اکبر جیسا طنز نگار بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں کیوں نہ پیدا ہوا۔ زمانہ جامد نہیں ہے وہ بدلتا رہتا ہے اور آرٹ، سماج کے پودے کی ایک ڈالی ہے۔ آج ہمارے ملک میں بھی تغیرات ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ زندگی میں جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں ان کے ساتھ ادب کی نئی قدریں قائم کی جا رہی ہیں۔ ادب کا مفہوم بدل رہا ہے۔ اس کے فرائض اور حقوق کی از سر نو جانچ ہو رہی ہے اور اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ادب کو سوسائٹی اور اس کے کلچر میں وہی جگہ دی جائے جس کا وہ مستحق ہے۔ جب آرٹ یا ادب پر گفتگو ہوتی ہے تو بعض لوگ اس ربط اور تعلق کو بھول جاتے ہیں جو آرٹ اور سماج میں ہے۔ سماجی تقاضوں کو نظر انداز کرکے جو ادیب اپنی ایسی ذاتی خواہشوں کا نغمۂ بے ہنگام الاپتے ہیں جو سماجی خواہشوں سے ہم آہنگ نہیں ہے تو وہ نہیں جانتے کہ کتنے بڑے سماجی جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

بعض ادیب اپنے طبقاتی تعصب کی بنا پر دانستہ یا نادانستہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ ادیب آزاد ہے وہ جو چاہے لکھ سکتا ہے جیسا چاہے لکھ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے۔ وہ انسانوں سے بلند و بالا ہے وہ آدمی نہیں دیوتا ہے سماجی ذمہ داریوں اور فرائض کا بار اس کے مقدس اور نازک کندھوں پر ڈالنا ادب کی ہتک کرنا اور ادیب کی انفرادی آزادی کا خون کرنا ہے۔ ایسے لوگ نہ جانے کیا ہوتے ہیں جو زندگی سے بے تعلق ہو کر خود ساختہ چار دیواری میں بیٹھے خود ہی ہنس لیتے ہیں رو لیتے ہیں اچھلتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا کو ان پر انگلی اٹھانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو شاعر ہیں ادیب ہیں جو چاہے کر سکتے ہیں۔ ان بزرگوں کی نظر میں آرٹ اور زندگی ایک بے مقصد چٹان ہے جس میں نہ نمو ہے اور نہ بالیدگی۔ کاش تاریخ اور انسانی تجربہ ان کے اس ادعا کی تائید کر سکتا ہے۔

کبھی انسان نے طلسماتی حکایتوں، دیو، پریوں کے افسانوں اور ایسے فرضی قصوں سے اپنے جذبۂ حیرت کی تسکین کی جن کا وقوع اس دنیائے آب و گل میں ناممکن ہے۔ کبھی اس نے رزمیہ اور بزمیہ واقعات سے تو کبھی گل و بلبل کے پردے میں حسن و عشق کے تذکروں سے بھوک اور جنسی میلانات کی تشفی کی پستی اور ادبار کے زمانے میں اس نے جان صاحب اور جعفر زٹلی کے کلام سے بھی حظ حاصل کیا۔ مفید ہو یا مضر ہر دور میں کسی نہ کسی مقصد ہی کے تحت ادب پیدا ہوتا گیا۔ مقاصد کا معین کرنے والا انسان ہوتا ہے اور انسان اپنی سماجی ضرورتوں کے دباؤ سے مقاصد کا تعین کرتا ہے آج کل ہمارا ادبی ذوق بڑی تیزی سے بدلتا جا رہا ہے۔ ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں یا دل بہلاؤ کے علاوہ اس کا کچھ اور مقصد بھی ہے وہ اب محض حسن و عشق کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ان کا محاکمہ کرتا اور ان کو حل کرتا ہے۔ بہتر بننے کی خواہش ہر انسان میں موجود ہوتی ہے ہم میں جو کمزوریاں ہیں وہ کسی مرض کی طرح چمٹی ہوئی ہیں جیسے تندرستی ایک فطری امر ہے اور بیماری غیر فطری۔ اس طرح ذہنی اور سماجی صحت بھی فطری بات ہے۔ ہم ذہنی اور اخلاقی پستی سے اس طرح مطمئن نہیں ہو سکتے جیسے کوئی مریض اپنے مرض سے مطمئن نہیں ہوتا۔ اخلاقیات اور ادبیات کا مشن جدا جدا نہیں۔ ہاں طرز بیان جدا ہے۔ اخلاقیات نے استدلال کا راستہ اختیار کیا ہے تو ادبیات نے کیفیاتی اور حسن کارانہ راستہ۔ انسانیت بیماریوں کو ختم کرکے صحت یاب ہونے کے لئے بے چین ہے۔ اب یہ ادیب کا کام ہے کہ وہ انسانیت

کا غم گسار اس کا ہمدم اور اس کا چارہ ساز بنے ۔ ادب اور انسانیت جب باہم ایک دوسرے کے رفیق ہو جائیں گے تو رہنمایانِ خلق کو مستقبل کی اصل راہ ملے گی اور پھر وہ سمجھیں گے کہ بیداری کا ظہور کیا ہے اور زمانہ کس نغمہ کو سننے کے لئے بے چین ہے ۔ اسی وقت ہمیں عوام کے جذبات کا علم ہو گا ۔ ظاہر ہے کہ عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانہ محض ہیں ٹیگور سا شاعر عزلت پسندی جس کی طبیعت ثانیہ بنی ہوئی تھی دیکھئے اب کیا کہتا ہے

" ادیبوں کو انسانوں سے مل جل کر انہیں پہچاننا چاہئے ۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا ۔ زمانۂ دراز تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں میں نے جو بہت بڑی غلطی کی ہے اب میں اسے سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ یہ نصیحت کر رہا ہوں "

منشی پریم چند مرحوم ایک مقام پر فرماتے ہیں " آسمان پر چھائی ہوئی شفق بے شک نہایت خوش نما نظارہ ہے لیکن اساڑھ کے مہینے میں اگر آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ ہمارے لئے خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے " آرٹسٹ اپنے آرٹ سے حسن کی تخلیق کر کے اسباب اور حالات کو بالیدگی کے لئے ساز گار بناتا ہے ۔

وہ یوں بھی کہتے ہیں کہ ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے ۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے ۔ وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں ہے بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے ۔

ادیبوں کے دماغ اور ادب کا نظریہ صرف اس ملک میں نہیں بدلا ہے بلکہ ساری دنیا کے ادیب انسانیت کی بقا اور حسن سچائی اور انصاف کی فرمانروائی کے لئے مورچہ بنائے جھوٹ اور اندھیرے سے مقابلہ کر رہے ہیں ۔

چین کی ایک مشہور مصنفہ تنگ کنگ کے خیالات بھی ادب کے بارے میں سن لیجئے جس سے معلوم ہو گا کہ آج زمانہ ادیبوں اور ادب پر کتنی بڑی ذمہ داریاں عاید کر رہا ہے ۔ کسی نے تنگ کنگ سے پوچھا کہ چینی ادب کے نئے رجحانات کیا ہیں ۔ تو اس نے جواب دیا کہ میں ادبی رجحانات کے متعلق کچھ نہیں جانتی ۔ میں چھ مہینے سے محاذ جنگ پر ہوں لیکن ادیب کے فرض اور ادب کے مقصد کے متعلق اپنی رائے قائم کر چکی ہوں اس کا آج صرف ایک کام ہے ۔ ملک کی مدد کرنا اور اس کی حفاظت ہمیں ادب کے نظریات میں اپنا وقت خراب نہیں کرنا چاہئے ۔ ہمیں صرف عوام کو بیدار کرنے کے لئے لکھنا چاہئے ۔

ہماری زبان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کو شروع ہوئے کچھ زیادہ دن نہیں گزرے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک نے توقع سے زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے ۔ پڑھے لکھے لوگوں کی محفلوں میں ادبی کانفرنسوں، مشاعروں، رسالوں اور اخباروں میں کوئی دن نہیں جاتا کہ اس پر گفتگو نہ ہوئی ہو ۔ پچھلے پانچ، سات برس میں لکھی ہوئی نظموں، کہانیوں اور تنقیدوں کو کوئی پڑھے تو وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہماری زبان اور ادب میں ایک نیا رنگ داخل ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ اب ہمیں ادب میں زندگی کے ایسے موقعے ملتے ہیں جو اس سے پہلے اس زاویے اور اس اسلوب سے پیش ہی نہیں کئے گئے تھے ۔

اب تک اگر مصنفین کی محض ذاتی خواہشیں اور ان کے خود ساختہ عقیدوں کی مسخ شدہ شکلیں ادب میں دکھائی دیتی تھیں تو اب ادب میں ہمیں جمہور کے احساسات ان کی تمناؤں کی جھلک ان کے مصائب اور ان کے ارادوں کی دھمک سے ایک حیات نو کا پتہ چلتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ گل و بلبل، ہجر و وصال، رقیب اور محبوب کے مضامین کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کسان، تونگری اور مفلسی، غلامی اور آزادی کا بار بار ذکر آتا ہے ۔ کچھ ایسے ادیب اب بھی باقی ہیں جو اپنی ذات ہی کو زندگی سمجھتے ہیں اور

سماج کی ترقی کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا اور ذاتی اغراض پر جمہوری اغراض کی بھینٹ چڑھانا ہی عین آرٹ اور خالص ادب تصور کرتے ہیں۔ ایسے ادیبوں کی مثال ان مکڑیوں کی سی ہے جو اپنے ہی پیٹ کے لعاب سے اپنے اطراف ایک جال بناتی ہیں اور لعاب ختم ہونے پر اس خود پسندی کے جال میں پھنس کر بے بسی کے عالم میں جان دیتی ہیں۔ حالانکہ ادب ایک ایسا شہد خالص ہے جس میں زندگی کے چمن کے ہر پھول کا رس موجود ہو اور یہی ترقی پسند ادب ہے۔ اغراض و مقاصد کے دائروں کی تنگی اور وسعت کے تصادم نے ہماری زبان اور ادب کو دلچسپ تحریکوں سے روشناس کرایا ہے۔ ادب ایک ایسے دور سے گزر رہا ہے جہاں ماضی اور مستقبل کی تاریخی قوتیں برسرپیکار ہیں۔ ایک طرف خود پرستی، خود نمائی اور خود غرضی مستقبل کی طرف پیٹھ کئے ترقی کا راستہ روکنے کی بے سود کوشش کر رہی ہیں تو دوسری طرف زندگی، تاریخ کی بے پناہ ارتقائی قوتوں کے ساتھ رکاوٹوں کو روندتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ ایک طرف ماضی ہے تو دوسری طرف مستقبل آپ جانتے ہیں کہ فتح ہمیشہ مستقبل کی رہی ہے۔

رجعت اور ترقی کی جنگ کوئی نئی جنگ نہیں ہے۔ سماج کا ارتقاء انہیں انسداد کی باہمی آویزش کا رہین منت رہا ہے۔ انسانوں کے ابتدائی شعور سے لے کر آج تک ان کے خیالات ان کی خواہشات، ان کے احساسات ان کے جمالیاتی ذوق اور ان کے وجدان میں جو بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ اسی جد و جہد کی نشانیاں ہیں جو انسانوں نے اپنے ماحول پر فتح پانے کے لئے کی ہیں۔ قدیم اور جدید کے پیہم تصادم سے پیدا ہونے والے شعلۂ حیات کو اپنے سینے میں دبائے ہوئے زندگی کا جلوس ابد کے راستوں پر ازل سے رواں دواں ہے۔ اس ہر آن بدلتی رہنے والی دنیا میں ثبات و قرار اور کسی شئے مطلق کی تلاش کرنا اندھیرے کمرے میں ایک ایسی کالی بلی کی تلاش کرنا ہے جو وہاں موجود نہیں ہے۔ اس لئے وہی ادب ترقی پسند ادب کہلایا جا سکتا ہے جو تاریخی ارتقائی قوتوں کا ہم نوا، سماجی ترقی کا دلدادہ ہوتے ہوئے فنی محاسن سے آراستہ ہو۔

ہماری سماجی زندگی کئی شعبوں میں بٹی ہوئی ہے مگر ادب کا جس شعبے سے تعلق ہے وہ تہذیب یا کلچر ہے جب ہم ادب کے ذریعہ سماج کی مدد کرنا کہتے ہیں تو اس سے مراد تہذیب یا کلچر کی ترقی میں مدد ہوتی ہے۔

خود تہذیب یا کلچر آسمان سے ٹپکی ہوئی چیز نہیں ہے بلکہ وہ ہمیشہ انسانوں ہی کے بنائے ہوئے سماجی نظام کا نچوڑ یا حاصل ہوا کرتا ہے۔ کسی شخص کے خیالات اور احساسات اس کی طرز زندگی کے ہمیشہ تابع ہوا کرتے ہیں اور طرز زندگی وسائل معاش کی تابع ہوتی ہے۔ ایسے ہی مجموعی حیثیت سے کسی سماج کے ان احساسات اور خیالات کا اظہار جو اس کے ادب، مذہب، فلسفہ میں ہوا کرتا ہے اس طریقے پر منحصر ہے جو سماج نے اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لئے ضروری اشیا، کی پیدائش تقسیم اور ان کے مبادلے کے لئے جاری کی ہے۔ یہ بات اس زمانے میں تو بہت آسانی سے ہماری سمجھ میں آجاتی ہے مگر قدیم قبایلی زندگی اور زرعی تہذیبوں کے عہد میں اس حقیقت پر توہمات کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ صنعتی سرمایہ داری کے تحت پیدائش دولت کے تعلقات کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں نے ادب اور آرٹ کے مسئلے کو بھی بے حد پیچیدہ اور گراں بنا دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ادب بہ حیثیت مجموعی سارے سماج کا ورثہ ہوتا، ایک مخصوص طبقہ کا استحقاق بن کر رہ گیا ہے جو فراغت نصیب اور صاحب اقتدار ہے جب سے ادب نے سماج سے ناتا توڑ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی ہے اس نے اپنا وہ اصلی مقام چھوڑ دیا جہاں پہنچ کر

ادب جزو پیغمبری ہو جاتا ہے۔ جب ہم خوش حال طبقے کے ادب کو پس ماندہ غریب عوام کی ضروریات، احساسات اور خیالات کے بیچ میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو ہمارے ادب کا بیشتر حصہ ایک بے وقت کی راگنی اور ایک بے جوڑ پیوند معلوم ہونے لگتا ہے۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک سوسائٹی خود کو تہذیب یافتہ بھی کہتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک بڑی تعداد کو تہذیب سے محروم بھی رکھتی ہے۔ دولت کی فراوانی میں افلاس کا یہ بھیانک نظارہ بڑا عبرت ناک ہے۔ اسی تضاد کا نتیجہ ترقی پسند ادب کی تحریک ہے جو یورپ، امریکہ کے اور ملکوں کی طرح ہندوستانی ادب میں بھی جاری ہے یورپ کے ترقی پسند ادیب نے ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کی داغ بیل ڈالی جس کا مقصد فاشسزم کی بڑھتی ہوئی سامراجی قوتوں کا روکنا اور انسانوں کے حقوق کی حفاظت کرنا تھا۔ مگر چونکہ سماجی حق تلفیاں اور بے انصافیاں اس عالمگیر سرمایہ دارعہد میں کسی خاص ملک اور قوم کا عارضہ نہیں رہیں، اس لئے ترقی پسندی کا ادبی جہاد دنیا کے ہر ترقی یافتہ زمانے میں شروع ہوا۔ چنانچہ اب دنیا کے سارے ترقی پسند ادیب دشمن ترقی اور دشمن عوام خبیث قوتوں کے مقابلہ میں صف آرا اور سینہ سپر ہیں۔ انگلستان کے ممتاز ترقی پسند ادیب رالف فاکس اور کرسٹا فر کاڈول نے ہسپانوی عوام کی آزادی کے لئے فرانکو کی فوج سے لڑتے ہوئے سرزمین ہسپانیہ میں اپنی جانیں دیں۔ خود ہسپانیہ کے ترقی پسند شاعر میلگاڈو اور لورکا کے خون کو دنیا کے عوام نہیں بھول سکتے ہیں۔

ترقی پسند ادب اپنا تاریخی فرض ادا کر رہا ہے۔ اس جہانِ گزراں میں کوئی ادب بھی جاودانی ہونے کی توقع نہیں کرسکتا۔ آج کا ادب بھی کل پرانا اور فرسودہ ہو جائے گا۔ مگر مستقبل کا نقاد اقبالؔ، جوشؔ، ٹیگورؔ، نذرالسلام اور منشی پریم چند کو پڑھکر بیسویں صدی کے ہندوستان اس کے تمدن اس کی بے چینیوں اور رجحانات کا پتہ لگائے گا اور دیکھے گا کہ ان شاعروں اور ادیبوں نے انسانی مفاد کو پیش نظر رکھنے میں کہاں تک اپنے فرائض انجام دئے ہیں۔

ہمارے ادب کی پیدائش اور ترقی کا زمانہ صوفیوں اور فقیروں کے عروج اور جاگیرداری نظام کے زوال کا زمانہ تھا۔ اس لئے اس کے اندر وہ سب باتیں آگئیں جن میں زندگی سے مقابلہ اور کسی نصب العین کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کی جدوجہد کی روح مفقود ہوتی ہے۔ آج البتہ اردو ادب بڑی بڑی تبدیلیوں سے ہم آغوش ہے شبلیؔ، حالیؔ، سرسید، آزاد، نذیر احمد سب نے پرانے ادب کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا تھا اور اس کے خالص جمالیاتی اور ادب برائے ادب کے نظریے کے مہمل اور بے معنی ہونے پر بڑی دلیری اور جوش سے اظہار خیال کیا تھا۔ مگر اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے اور بڑی تیزی سے بدلتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے نوجوان ترقی پسند ادیب بھی ان حالات سے غیر متاثر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ سارے مصنفین زندگی کے جدلیاتی فلسفہ سے واقف ہیں اور اس مستقبل سے بھی بے خبر نہیں ہیں جو سماج کے موروثی تضاد سے جنم لینے والا ہے۔ میں نے اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان نے پچھلے بیس برس میں بڑے تغیرات اور انقلابات دیکھے ہیں۔ آزادی کے لئے عمومی تحریکوں نے ادب کو بھی کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے اس کا اندازہ آج کل کے ترقی پسند ادب سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ نئے ادب میں ہماری سماج کے صدیوں کے وہ ناسور بے نقاب نظر آئیں گے، جنھیں ہمارے اجداد نے کچھ تو بے علمی سے اور شرم و حیا کے مارے چھپائے رکھا تھا۔ اب تو یہی نہیں ہے کہ مرض کی تشخیص بھی ہو چکی ہے بلکہ اس کا نسخہ بھی تجویز کر دیا گیا ہے۔ وہ بچہ جو ایک زمانے سے زندگی کے بطن میں گردش کر رہا تھا تاریخی دایۂ جنگ کے ہاتھوں معرض وجود میں آنے کے لئے بے چین ہے جو لوگ

اب بھی ماضی ہی کے ساتھ چمٹے رہنا چاہتے ہیں وہ ماضی ہی کے ساتھ ختم بھی ہو جائیں گے۔ انسانیت کی بقا کے لئے یہ ضروری ہے کہ دنیا نئے سماجی طریقوں کے ساتھ اپنی تجدید کر دے ورنہ اس کا ختم ہو جانا یقینی ہے۔ اس لئے تمام مصنفین کا یہ فرض ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ ماضی کے نظام زندگی سامراج فاشزم یا اسی طرح کے پرانے عطائی نسخوں کی تائید کریں، وہ بیمار اور مصیبت زدہ نوع انسانی کے لئے معقول اور صحت بخش طریقوں کے اختیار کرنے میں مدد کریں۔ کیونکہ انسان کی تخلیقی قوتوں کا اظہار کرنے والے ہمیشہ مصنفین ہی رہا کئے ہیں۔ ایک نئی دنیا بنانے کے لئے پرانی دنیا کا ختم ہو جانا ضروری ہے۔ اس سے پہلے کہ فرسودہ سماج کی گرتی ہوئی دیوار گر کر ہمیں بھی دبوچ لے اور کام تمام کر دے، یہ اچھا ہے کہ اس گرتی ہوئی دیوار کو پہلے ہی منہدم کر دیا جائے اور اسی وقت ادب برائے ادب کا فلسفہ بھی منہدم ہو جائے گا اور ادب کسی مخصوص فراغت نصیب طبقے کی جاگیر نہیں رہے گا بلکہ نوع انسانی کا ورثہ بن جائے گا۔ ادب پھر ایک بار دنیا کے ادب عالیہ کی طرح انسان کی اپنے ماحول پر فتح پانے کے لئے جدوجہد کا مظہر بن جائے گا۔

خوش قسمتی سے ہمارا ترقی پسند ادب بھی اس تعمیری خدمت کے انجام دینے میں مصروف ہے۔

مخدوم محی الدین

ہمارا ادب

(ایک طائرانہ نظر)

ادب زندگی کی طرح ایک متحرک حقیقت ہے اور اس میں حیات انسانی کی طرح محسوس کرنے اور اثر قبول کرنے کی قوتیں ہیں۔ اس لئے ماحول کی تبدیلی اور زندگی کی حقیقی ضرورتوں اور عصری تقاضوں کے ساتھ، اس کے محرکات اور اس کے اقدار کا بدلنا بھی ناگزیر ہے۔ جس طرح نظام زندگی کے مختلف شعبے بے شمار عوامل سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح ادب کو بھی مختلف عوامل کے اثرات شعوری طور پر قبول کرنے پڑتے ہیں۔ ہر وہ تحریک جو ہمارے دل و دماغ میں جگہ پا سکتی ہے، براہ راست یا بالواسطہ ادب میں داخل ہو جاتی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہر دور میں اپنے ماحول کا ساتھ دیا ہے۔ اس کی توہم پرستی، مذہبی جنون اور طلسماتی تحیر کا دور، اس کی ادبی تفریح اور دماغی تعیش کا دور، اس کے بازاری اور ہوس کارانہ عشق کا دور، ان سب کے پیچھے، ایک تہذیبی اور معاشرتی پس منظر کام کرتا رہا ہے۔ انسانی تہذیب اور سماجی تقاضوں سے ادب کو علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے ہماری تاریخیں، زیادہ تر نصابی ضرورتوں کی تکمیل، تحقیقی شوق کی تسکین یا ایک فرض کی بجا آوری کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ مورخ یا تو اپنے عہد کو جانبدارانہ رنگ میں پیش کرتا ہے یا پھر ماضی سے غلط نتائج اخذ کرتا ہے۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ تاریخوں کی تقریباً تمام کتابیں بادشاہوں اور راجاؤں کی داستانیں ہیں۔ ان کے صفحوں پر ہمیں عوام کی زندگی کے تہذیبی اور معاشرتی نقوش بہت کم ملتے ہیں۔ خوش حالی یا بد ہنگامی کا تصور، قصر و ایوان سے پیدا کیا جاتا ہے حالانکہ تاریخ کے بنانے والے وہ عوام ہوتے ہیں جن کے گہواروں میں تہذیب پلتی اور نشوونما پاتی ہے۔ تاریخ ادب اردو کا ماضی بھی ہم تک زیادہ تر اسی رنگ میں آیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو ادب کے اولین کارنامے درباروں کی سرپرستی میں سرانجام پائے ہیں اور ان میں جگہ جگہ درباداری کے مصنوعی احساسات نظر آتے ہیں لیکن حقیقی ادیب، اپنے حقیقی ماحول کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ داخلی زندگی کی نمائش میں وہ کوئی بہروپ بھرے لیکن خارجی زندگی سے اس کے ذہنی ربط کی عریانی کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتی ہے۔ سودا جیسا خوش پسند شاعر بھی نام نہاد صوفیا کے تسلط کو گوارا نہیں کرتا اور اس کے خلاف ایک طنز لطیف کے طور پر کہتا ہے۔

پوچھے ہے مریدوں سے وہ ہر صبح کو اٹھ کر ہے آج کدھر اس کی شب روز کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس ... تو کر داڑھی کو کنگھی لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے
ڈھولک جو لگی بجنے تو واں سب کو ہوا وجد کودے ہے کوئی اور کوئی نعرہ زناں ہے

یہ اپنی بد دماغی کے باوجود جب اپنے بوسیدہ گھر کی لفظی تصویر اتارتا ہے تو اس میں ہمیں اس زمانے کے عوام کی بے مائیگی ایک عریاں حقیقت کے طور پر دکھائی دینے لگتی ہے۔ یا پھر مرغ بازوں کے متعلق اس کی ہجو، اس زمانے کی معاشرت کا پردہ چاک کر دیتی ہے۔ غالب کی زبان جب قصیدہ خوانی سے تھک جاتی ہے تو وہ "گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو" جیسے استعاروں میں اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے۔ بہرحال ہوائی قلابازیوں سے ٹھوس حقائق پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔ بہرحال جو ادب اپنے آپ میں اب بھی زندگی کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ وہی ہے جس کا ماحول پر تطابق ہو سکے۔ ان تبرکات کو چھوڑئیے، جن کو "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو" کہہ کر ہم بوسہ دیتے ہیں۔ عقیدت مندی یا ماضی پرستی بہت سے معائب کو چھپا دیتی ہے۔ غالب اگر اپنے عہد سے زیادہ، موجودہ زمانے میں اپنے لئے بلند مقام رکھتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے مستقبل کی پیش رس میں مصنوعی شاعرانہ ماحول سے روگردانی کی۔ یقیناً نظیر اکبرآبادی کا کلام نصاب کی کتابوں سے ہٹ کر بھی اس لئے پڑھا جاتا ہے کہ اس نے شعری زمین کے لئے آسمان سے تارے نہیں توڑے بلکہ اپنے لئے اپنے پیش و پس سے موضوع چنے۔ غرض ادب، عوامی تہذیب اور اس کے ارتقاء کا مظہر ہوتا ہے۔

اردو ادب پر جو مصنوعی رنگ چڑھ گیا تھا اس کو دور کرنے کی کوشش بہت پہلے سے شروع ہو گئی تھیں میرحسن، انیس، نظیر نے قدیم ڈگر سے ہٹ کر تخیل اور حقیقت کے ایک وسیع امتزاج کی کوشش کی۔ نظیر اکبرآبادی، اردو کا سب سے پہلا عوامی شاعر ہے جس نے شعر کو زندگی کے عامل کے طور پر

استعمال کیا اس نے شاعری کے رخ کو خارجی حقیقتوں کی طرف پھیرا اور اس طرح اس نے جن کیفیات اور احساسات کی ترجمانی کی وہ اس کے ماحول کا انعکاسی تاثر ہیں لیکن بہ حیثیتِ انیس۔ نظیر کے اس بدلے ہوئے اسلوبِ نگارش اور خیال آفرینی کے نئے سانچے، حالات کی ناسازگاری میں غرق ہوگئے ان کے اٹھان نے عام تحریک کی صورت اختیار نہیں کی بلکہ ان کا شعر و فکر کا سرمایہ، اُردو ادب کے مستقبل کی اولین بنیاد کے طور پر رہ گیا۔ انہوں نے دور کے آنے والوں کے لئے مشعل روشن کی لیکن ان کے ساتھ والے اس روشنی میں صحیح منزل کی جستجو نہ کرسکے۔

اس کے بعد زندگی کے تعطل کی وجہ سے ایک عام ذہنی انحطاط کا دور رہا اور یہ دور اس وقت ختم ہوا جب ۱۸۵۷ء کے نشتر نے غفلت اور واماندگی سے بیمار گی کے موادِ فاسد کو نکال دیا۔ ہندوستانیوں کے شعور اور احساس میں ایک تازہ روح کروٹیں لینے لگی۔ جدید اور قدیم تہذیبوں میں ایک عہد آفریں تصادم ہوا جس سے منجمد ماحول میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ سیاسی بیداری نے ادب کے پیش پا افتادہ کھنڈروں پر تجدیدِ زندگی کا پرچم کھولا، معاشرتی زندگی کا انقلاب ایک دھماکے کی صورت میں نمودار ہوا۔ ایک طرف مغربی اثر نے اور دوسری طرف مشرقی تہذیب کے تحفظ کے جذبے نے انتہا پسند نقاطِ نظر پیدا کردئے۔ بعضوں کو جدید روشنی میں اپنے گھر کی ہر چیز بھیانک معلوم ہونے لگی، اور بعضوں نے یہ خیال کیا کہ اس روشنی سے آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔ غرض یہ کہ یہ کش مکش، مستقبل کو بنانے میں بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ اسی زمانے میں بعض حقیقت پسند ادیبوں نے حقیقی ماحول میں زندگی کے تقاضوں کی طرف نظر ڈالی اور کمزوریوں کی اصلاح اور صحیح منزل کی تلاش میں آگے بڑھے۔ ان مصلحین میں سرسید احمد خاں کا نام سرفہرست ہے انہوں نے اپنی ہمہ گیر توجہ سے اصلاحی اقدام اور اصلاح کے لئے ایک ماحول تیار کیا۔ ادبی اصلاح کی تحریک حالیؔ اور آزادؔ نے شروع کی۔

حالیؔ نے ادب کی حقیقت کو بدلتے ہوئے ماحول کی روشنی میں سوچا اور اس سے اہلِ ملک کو بھی واقف کرانے کی کوشش کی "مقدمۂ شعر و شاعری" میں ادب کے محرکات، اس کے اثرات اور اس کے مقاصد پر انہوں نے جو تنقیدی بحث کی ہے، ... . اسی کے سہارے اُردو ادب کے جدید رجحان نے پہلی انگڑائی لی۔ حالیؔ خود شاعر و ادیب کی حیثیت سے، اُردو ادب کے عبوری دور کے طرح انداز ہیں۔ انہوں نے شاعری کو صناعی کی بجائے اظہارِ حقیقت کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی۔ غرض یہ کہ حالیؔ نے اصول اور عمل کے ذریعے اُردو ادب کو حقائق نگاری کی طرف پھیر دیا۔ خوش قسمتی سے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں شبلیؔ، اسمٰعیل میرٹھیؔ، نذیر احمد، محسن الملک اور ذکاء اللہ جیسے مخلص رفیق کارمل گئے۔ ان کے اشتراکِ عمل اور خلوص نے اس تحریک کو سارے ہندوستان میں پھیلا دیا اور فکر و نظر میں ایک تبدیلی پیدا کردی اور اُردو ادب میں سب سے پہلے غایت اور مقصد کے تحت واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری کا رجحان پیدا ہوا۔ لیکن اُردو ادب کا یہ عبوری دور جسے اصلاحی دور کہنا چاہئے جس تیزی سے شروع ہوا تھا، اسی تیزی سے اس کے خلاف ایک ردِ عمل بھی شروع ہوا ایک طرف جدید رجحانات کا یہ دھارا بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف رجعت پسندی کا اندھیرا بھی گہرا ہوتا جارہا تھا۔ اس زمانے میں بھی داغؔ، امیرؔ مینائی، جلالؔ لکھنوی وغیرہ شاعروں کی رونق بڑھا رہے تھے ان کے ساتھ بہت سے لوگ لکیر پیٹنے میں مصروف تھے۔ حالیؔ کے متوازی خط پر اکبر الہ آبادی کے جراحت پاش قہقہے بھی، اس تہذیب پر طنز کی کمندیں پھینک رہے تھے جس کو زندگی قبول کررہی تھی۔ غرض یہ کہ تصورات کے اس ہجوم میں تبدیلی اور تغیر کے یہ نقوش صرف اپنی جگہ ابھر کے رہ گئے اور عام رجحان ان کے دائرے میں نہ آسکا۔ سرسید، حالی اور شبلی کی تحریریں، نذیر احمد کے افسانے آزاد اور اسمٰعیل میرٹھیؔ کی نظمیں، ایک آنے والے دور کی نقیب ضرور ہیں لیکن حال کی فرسودگی پر ان کا کوئی دیرپا اثر نہیں پڑا۔ اُردو ادب کا یہ دور اصل میں ادبی ارتقاء کی دوسری کڑی تھی جس کو ماضی اور مستقبل کی درمیانی کڑی کہنا چاہئے۔ رجعت پسندی کے ردِ عمل کے باوجود تغیر کا یہ رجحان فنا نہیں ہوگیا بلکہ وہ اپنی تیز گامی کے لئے خاموشی سے تازگی حاصل کرتا رہا۔ چنانچہ بہت جلد اس ترقی کے آثار پھر رونما ہونے لگے۔ سرشارؔ، شررؔ، مرزا محمد ہادی رسواؔ، منشی سجاد حسین وغیرہ کی وجہ سے اُردو ادب کے جدید رجحانات نے پھر ایک انگڑائی لی اور یہ انگڑائی، ایک مسلسل بیداری اپنے ساتھ لائی۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ہمارا ادب ایک بڑے دائرے کے اندر چھوٹے چھوٹے دائروں میں گھومتا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلوب اور اندازِ فکر کا بدلتا ہوا رجحان ضرور پیدا ہوگیا تھا لیکن یہ سب کچھ قدیم طرز اور قدیم تخیل کی بدلی ہوئی شکلیں تھیں۔ ایک ایسا انقلابی دور ابھی نہیں آیا تھا جو ماضی کے خیال کو حال کے تقاضوں سے نکال دے۔ اقبالؔ سب سے پہلا شاعر ہے جس نے ظاہر کے حصار سے اپنے ذہنی اور فکری پیکر کو نکالنے کا

کامیابی کے ساتھ اقدام کیا۔ اقبال نے بہ انداز نو انگڑائی لی لیکن اس کی پہلی ہی نظر کو ہمالیہ نے روک لیا۔ یہ مجاہد، ہمالیہ کو چیر کر آگے نکل گیا۔ اس نے جغرافیائی حد بندیوں سے آزاد ہو کر ایک وسیع تر دنیا دیکھی۔ اپنے آرٹ کو بامقصد بنایا اور اس طرح اس نے کوشش کی کہ ماضی کی مدد سے ایک ایسا تصورِ حیات پیدا ہو جو بلند تر مستقبل کی تعمیر کر سکے۔ اس مستقبل کی تعمیر کے لئے بھی اسلام کی قوت حیات کے احیاء پر زور دیا اسلام کا وہ مبلغ نہیں تھا بلکہ اس نے فرقہ پرستی کے ادنیٰ جذبات سے ہٹ کر انسانیت کے پیکر میں وہ روح بھرنی چاہی جو جمہور کو مطمئن کر سکتی ہے۔ اسلام کا فلسفۂ حیات، محبت، عمل اور یقین ہے۔ وہ نسل اور رنگ کے قلعوں کو ڈھاتا ہے۔ اس کے مقصد امارت اور غربت کو خود غرضی اور محرومی کے تصادم سے بچاتا ہے۔ اقبال نے اسی پیام کو دہرایا۔ اس نے کہا "اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" اقبال کے اس نعرے کی گونج میں ہمیں وہی آواز ملتی ہے جو آج "مفادات کی ٹکر" میں دبے اور کھلے انداز سے بلند ہو رہی ہے۔ حالی اور اس کے ہم عصروں نے اردو ادب کے کھنڈروں کی بنیادوں کو ہلا دیا تھا لیکن اقبال نے ایک زلزلے کی کیفیت پیدا کر دی اور ان ہی کھنڈروں پر ایک تعمیرِ نو کا پرچم کھول دیا۔ اقبال کے مجاہدانہ نعروں اور اس کی قلندرانہ خود اعتمادی اور اس کی شاہی پرواز نے ہمارے نوجوانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے غالب کی اس آرزو کو جو اس نے "کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے" کی صورت میں ظاہر کی تھی اقبال کے کلام میں صورت پذیر ہوتے دیکھا۔ ہمارے ادیب غیر شعوری طور پر اس بیدار حوصلۂ احساس اور زندہ سلیقۂ اظہار کو قبول کیا جو اقبال کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح اقبال کی آفریدہ بجلیوں میں نوجوانوں کا خون حیات ڈھلتا گیا۔ رجعت پسندی کے ایڑیاں رگڑتے ہوئے ڈھانچے میں جو چند سانس سسک رہی تھیں اب ان سے زندگی کی کوئی توقع نہیں رہی۔ ان کے مقصد اور ان کی تخلیقی صلاحیت نے جمالیاتی تسکین کے توسط سے موجودہ سماجی کشمکش کا حل دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ان کے دلوں کی یہی دھڑکنیں تھیں جن کے ہاتھوں ہمارے موجودہ دور کا رنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ سائنس نے سرمایہ داری کے سہارے عمرانی نشوونما کی اجارہ داری حاصل کر لی اور طبقاتی کشمکش کا چھپا ہوا احساس نمایاں ہونے لگا۔

آرٹ کی طرح سائنس بھی سماج کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ صرف تجربہ خانے کی مشغولیت نہیں بلکہ فطرت کے موانعات پر قابو پانے کی ایک مسلسل کوشش کا نام ہے۔ اس کی ابتداء انسانی بقاء اور ترقی کے آلۂ کار کی حیثیت سے ہوئی اس طرح انسانی احتیاج نے انسانوں کو ہر قدم پر سائنس کا غلام بنا دیا۔ لیکن جب سرمایہ دار نظام نے صنعتی مستقبل کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے خود غرضانہ خواہشوں کی تکمیل کے لئے استعمال کرنا شروع کیا تو اس کے خلاف ایک عام ردِ عمل شروع ہوا۔ عوام نے دیکھا کہ سائنس کا مقصد انسانی بہبودی سے زیادہ منافع کی وہ مقدار ہے جو سرمایہ دار طبقہ کو ملتا ہے۔ غرض یہ کہ تخریبی طاقتوں نے سائنس کے بنیادی مقصد کو مسخ کر دیا اور اس طرح وہ خلیج وسیع ہو گئی جو جاگیرداری نظام کے درشت ہاتھوں سے کھودی گئی تھی۔ خوش حالی کے اجارہ داروں اور محرومی کے شکوہ سنجوں کے درمیان جو ناخوش گوار تصادم ہوا، اس میں سائنس کی اس بے راہ روی کا بڑا حصہ ہے۔ ہمارے ادیبوں نے دیکھا کہ دنیا کو سکون اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ رنگ، نسل اور امارت کے ان گراں بار پتھروں کو راستے سے ہٹا دیا جائے جو سرمایہ داری نے ایک نمائشی تمدن کی پرداخت میں سنگ میل کے طور پر گاڑھ دئے ہیں۔ اسی احساس سے ہمارے عوامی ادب کی ابتدا ہوتی ہے۔

اس آخری دور میں پریم چند کی ادبی قیادت نے سادہ پرکار انداز میں نئے رجحانات کو مستقل طور پر آگے بڑھانے کے لئے اقبال کا ساتھ دیا۔ اقبال نے اگر اپنے شعروں سے دلوں کو گرمایا تو منشی پریم چند نے اپنے ناولوں اور قصوں سے ایک حرارت پیدا کی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ یورپ مختلف سیاسی، معاشی اور معاشرتی تحریکوں کا جولاں گاہ بن گیا تھا اور صنعتی ملکوں میں مزدوروں اور سرمایہ داروں میں

کش مکش شروع ہوگئی تھی۔ روس سے اس کش مکش کی پہلی آواز بلند ہوئی اور وہاں سے مسائلی ادب کا ایک سیلاب شروع ہوا۔ ٹالسٹائے ان ادیبوں میں سرفہرست نظر آتا ہے جنہوں نے ادنیٰ طبقوں کے دبے ہوئے جذبات کو اپنے ادب کے ذریعے ابھارنا چاہا۔ میکسم گورکی کی کتابیں عام طور پر پڑھی جانی لگیں۔ چنانچہ آج سے دس سال پہلے ان ہی خارجی اثرات نے اُردو ادب میں عصری دور پیدا کیا اور دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی۔

آج ہمارا ادب جس دور سے گزر رہا ہے وہ ایک نیا دور ہے۔ اس دور کی ابتدا میں جس طبقاتی کش مکش کی ادب غمازی کر رہا تھا وہ اب ایک بڑی جنگ کی صورت میں نمودار ہوگئی ہے۔ انسانیت، فاشسٹی درندگی کے خلاف برسرپیکار ہے۔ جمہوریت اور اشتراکیت کا متحدہ محاذ ہے۔ انسان دشمن تخریبی عناصر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ مابعد جنگ ایک ایسی دنیا کی تعمیر کے خاکے ڈالے جا رہے ہیں جو طبقاتی تصادم کو ختم کردے ہمارے ادیب بھی استبداد کے اُس چنگیزی تسلط کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں جو جرمنی اور جاپان کے کمیں گاہوں میں پرورش پا رہا تھا اور جس کے جنون نے امن اور انسانیت کو اپنی مدافعت کے لئے بیدار کردیا۔ یہی ترقی پسند ادب ہے جس کو جمہور کی آواز کہنا چاہئے۔ اس ادب کی بنیاد زندگی کے وہ حقیقی تقاضے ہیں جو سیاسی بحران اور اقتصادی محرومی نے پیدا کئے ہیں۔

اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کردینا چاہئے کہ ترقی پسند ادب کوئی "لیبل" نہیں ہے جسے کسی کی پیشانی پر چپکا دیا جائے اور سمجھا جائے کہ یہی ترقی پسند ادیب ہے۔ ہر حقیقی ادیب زندگی سے گریز اور فرار کی کتنی ہی کوشش کرے، اپنے ماحول سے رُوگردانی نہیں کرسکتا۔ ترقی پسند ادب کے خلاف جو آوازیں اٹھ رہی ہیں وہ اسی غلط نگاہی کا نتیجہ ہیں۔ ترقی پسند ادب کے مخالفوں نے چند ایسے ادیبوں کو جو ترقی پسندی کی آڑ میں ذہنی سرمایہ داری کا کھیل کھیل رہے ہیں، ایک صف میں کھڑا کردیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی انفرادی کمزوریوں کو وہ ترقی پسند ادب کی اجتماعی کمزوری تصور کر رہے ہیں۔ یہ ایک غلط فیصلہ اور جذباتی فریب ہے۔ ادب، کسی فرد کے توسط سے عوام تک پہنچتا ہے۔ اس کی یہ ادبی تخلیق عوام کے سامنے آتی ہے۔ ایک فرد یا چند افراد کے برخود غلط پن سے ادب کا اجتماعی تصور قائم کرنا غلط ہوگا۔ ترقی پسند ادب سے جہاں تک ایک عظیم تر مقصد سے اس کا یہ تعلق ہے، کوئی اختلاف نہیں کرسکتا۔ جو لوگ اس مقصد سے کھیلنا چاہتے ہیں، ان کو ہم ترقی پسند ادیب کہہ کر کیوں کوسیں۔ رجعت پسندوں کے قلعے میں اگر تیر بچے کی ضد نہ ہو تو وہ محسوس کریں گے کہ پیچھے ہٹ کر تیر چلانے سے بہتر یہ ہے کہ آگے بڑھ کر زندگی کا دامن تھام لیا جائے۔

نام نہاد ترقی پسند ادیب اگر گندگی اُچھال رہے ہیں تو آپ ادب کے دامن سے دھبے کیوں نہیں دھوتے۔ وہ گندگی اچھال رہے ہیں اور ان سے چڑنے والے ان پر گندگی پھینک رہے ہیں۔ "گناہ" کی سزا تجویز کرنے والا خود گناہ گار بن جائے یہ تعمیر نہیں تخریب ہے!!

کاغذ کی ناؤ — **میکش** — صاحبزادۂ میکش کے مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے جن میں غریبوں کی زندگی کے عکس ہیں۔ ان کے ذریعے سے "انسان دوستی" کے احساسات کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے جو ہر انسان کے دل میں ہیں۔ ہر ڈراما تمثیلی کرداروں کو پیش کرتا ہے اور تقریباً تمام تمثیلی کردار غریبوں کے مسائلِ حیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان ڈراموں میں تمثیل نگار کی روح کی تڑپ اور دل کی دھڑکن نے اپنے حقیقی جذبات کو لفظی پیکر پہنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ طرزِ بیان انتہائی سادہ اور شگفتہ ہے۔ صفحات (۱۲۰) قیمت عہر

اُردو میں افسانے

کسی زمانے میں افسانہ نگاری کا مقصد تخیل کے لئے عشرت بہم پہنچانا تھا۔ زندگی کے اقدار کے بدلنے کے لئے ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی بدل گیا ہے۔ اب ہمارے کھانے پینے کے طریقے اور سوچنے اور محسوس کرنے کے سانچے سب کچھ بدل گئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کا جن باتوں میں جی لگتا تھا اب وہ باتیں زیادہ دیر تک ہم کو متوجہ نہیں رکھ سکتیں۔ جن مشغلوں میں وہ دن رات ڈوبے رہتے تھے۔ وہ ہمارے لئے بے کیف ہیں۔ اگلا زمانہ تخلیق محض کا معصوم زمانہ تھا۔ آج ہر چیز کی علت ہر بات کی منطق اور ہر فعل کی ایک نفسیات ہوتی ہے۔ یہ تجزیہ اور تنقید کا دور ہے۔ اب کوئی ایسی بات ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہوتی جس کا تجزیہ نہ کیا جاسکے۔ اور جس پر کوئی تنقید نہ کی جاسکے۔ افسانے کو بھی کسی نہ کسی طرح اسی میزان منطق پر اترنا ہے۔ نفسیاتی افسانہ بھی اسی جدید رجحان کی پیداوار ہے۔ اس میں واقعات سے زیادہ اہم وہ نفسیاتی محرکات ہوتی ہیں جن سے کوئی ماجرا ترتیب پاتا ہے۔ ہماری زبان میں افسانوں کی اس صنف پر ابھی ابھی توجہ کی جانے لگی ہے۔

قاضی عبدالغفار صاحب کی تصنیف لیلیٰ کے خطوط اُردو کے نفسیاتی افسانوں کے لئے نشانِ راہ ہے۔ اس کی ترتیب ان نفسیاتی عناصر سے ہوتی ہے جو لیلیٰ کے کردار کو بناتے ہیں۔ لیلیٰ ایک بازاری عورت ہے۔ معاشرت کے ہر پہلو پر اور خصوصاً مرد کی ہوس رانی پر اس کی نفسیات میں ایک عجیب تلاطم پیدا ہوجاتا ہے۔ لیلیٰ ایک دانشمند لڑکی کے روپ میں پیش کی گئی ہے، جو زندگی کی ٹھوکروں پر قہقہے لگاکر اپنے آنسو چھپاتی ہے۔ اپنے ہیجانِ نفس پر وہ بے حسی کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ کہیں اس کی یہ کوشش کامیاب ہوتی ہے اور کہیں جذبات ابل پڑتے ہیں۔ مجنوں کی ڈائری اس مصنف کا دوسرا نفسیاتی افسانہ ہے۔
مجنوں عہد حاضر کا ایک کم زور دل نوجوان ہے جو جذبات کے تیز دھارے پر بہتا ہے سنبھلنے کی کوشش کرتا ہے اور سنبھلنے نہیں پاتا۔ اس کے کردار میں بھی وہی ہیجان اور ذہنی انتشار پایا جاتا ہے جس پر لیلیٰ تو قابو پالیتی تھی لیکن جو خود اس کو بے قابو کردیتا ہے۔

پروفیسر مجیب کا افسانہ "باغی" صرف تین افراد کی نفسی کیفیتوں سے بنتا ہے۔ بڑے بابو اس قصے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کی طبیعت میں عجیب صبر آزما سکون ہے۔ جو انسان کو تنہائی میں طاری کرتا ہے اور اس کی ہستی کو باعظمت بنادیتا ہے۔ دوسرا کردار ٹکٹ بابو کا ہے یہ ایک پراگندہ دل نوجوان ہے۔ جس کے نزدیک ہر معمولی واقعہ غیر معمولی ہوتا ہے۔ قصے کا ماحول آبادی سے بہت دور ایک ویران ریلوے اسٹیشن کا ہے۔ جہاں ہفتوں میں ایک آدھ بار اکادکا مسافر گاڑی سے اترتا ہے۔ اسٹیشن سے قریب ایک آم کا کنج ہے۔ آم کا کنج اس قصے کی روح رواں ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ آموں کے کنج کے آہنگ خاموش میں اور بڑے بابو کی روح میں کوئی ربط پنہاں ہے۔
مجیب کے آموں کے کنج میں اور ہارڈی کے The return of the Native کے Egdon Heath کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں بڑی مشابہت ہے۔ نقادوں کا خیال ہے کہ ہارڈی کی یہ جھاڑیاں مشیت کی طاقت اور انسان کی تقدیر نظر آنے لگتی ہیں۔ آموں کے کنج سے بھی مصنف نے یہی تاثر پیدا کیا ہے۔ افسانہ ماحول کی اس خاموشی پر ختم ہوجاتا ہے، جس کو بڑے بابو کے سکون اور آموں کے کنج نے ایک حقیقت محکم کی حیثیت بخش دی ہے۔

نفسیاتی افسانے لکھنے والوں میں مجنوں گورکھپوری کا نام بھلایا نہیں جا سکتا ۔ افسانے کے متعلق ان کا اپنا خیال ہے کہ اس میں پڑھنے والوں کو اپنی ہی بنی یا بگڑی صورتیں نظر آتی ہیں ۔ فنونِ لطیفہ کی اصل غایت اس کے نزدیک یہ ہے کہ حقیقت کو مجاز کے پردے میں اس طرح پیش کردیا جائے کہ دنیا اس حقیقت کو سمجھ سکے ۔ اور اس کی متحمل ہو سکے ۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ اپنے افسانوں کو وہ قصداً اور التزاماً غایتی بتاتے ہیں ۔ محبت ان کے افسانے کا خاص موضوع ہے ۔ اس موضوع کے انتخاب کے محرکات خود ان کی زبان میں یہ ہیں کہ " میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نظر کے سامنے رکھتا ہوں اور مشاہدہ اور مطالعے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ زندگی کی تلخ ترین حقیقت محبت ہے جو اور حقیقتوں پر محیط ہے "۔ مجنوں گورکھپوری کے افسانوں میں قنوطیت بہت زیادہ ہوتی ہے ۔ شوپنہار کا فلسفہ کہ انسان مجبورِ محض ہے جو ایک اندھی مشیت کے جبر سے رہتا ہے اور اسی جبر سے جیتا ہے " ان کے افسانوں میں بھی جاری و ساری نظر آتا ہے مجنوں کے افسانوں کے کردار قنوطیت اور الم پسندی کے باوجود زندہ کردار معلوم ہوتے ہیں ۔ ان میں زندگی کا احساس بہت شدید ہوتا ہے ۔ زندگی کے مصائب کو بھی وہ اتنی ہی شدت سے محسوس کرتے ہیں لیکن ان کی قنوطیت اور غم پسندی غمِ حیات کو ناگزیر سمجھ کر گوارا کر لیتی ہے ۔ اسی فنی کیفیت سے مجنوں کے افسانے بنتے ہیں اور ان کو اردو افسانے میں ایک مستقل مقام دیتے ہیں ۔

نوجوان ادیبوں میں کرشن چندر کے نفسیاتی افسانے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں "دو فرلانگ لانبی سڑک" کرشن چندر کا ایک مختصر افسانہ ہے ۔ افسانے کا مرکزی کردار نچلے متوسط طبقے کا ایک دفتری نوجوان ہے ۔ یہ اسی ذہنی کش مکش کا شکار ہے جو اس طبقے کی تقدیر ہے ۔ "دو فرلانگ لانبی سڑک" دراصل تہذیب کے مسلسل چکر کے لئے ایک استعارہ ہے ۔ اس سڑک کے دیکھتے رہنے سے نوجوان کے دل میں عجیب و غریب تلاطم پیدا ہوتا ہے اور اس پر دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے ۔ افسانے کا پہلا تاثر جن الفاظ سے شروع ہوتا ہے اس کو مصنف کی زبان سے سنئے ۔

" کچہریوں سے لے کر لا کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لانبی سڑک ہوگی ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا پڑتا ہے ۔ کبھی پیدل کبھی سیکل پر ۔ سڑک کے دو رویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اداس سے تناور درخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے ۔ متواتر نو سال سے اسی پر چل رہا ہوں نہ اس میں کوئی گڑھا دیکھا ہے نہ شگاف ۔ سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر بنائی گئی ہے ۔ اب اس پر تارکول بھی ہے جس کی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے ۔"

نو سال کی طویل مدت میں اس سڑک پر اس نے جو مناظر اور کرشمے دیکھے ہیں ان سے اس کی روح اکتا چلی ہے ۔ اس سڑک پر چلتے رہنا اس کو اپنی تقدیر کا ایک جبر معلوم ہوتا ہے ۔ اس کی روح اس جبر کو توڑ دینا چاہتی ہے ۔ قصے کے اختتام پر یہ تاثر شدید ہو جاتا ہے مصنف نے اس تاثر کو نوجوان کے الفاظ میں یوں ظاہر کیا ہے ۔

" انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر اس سڑک کو ڈائنا میٹ لگا کر اڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو ۔ ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے ۔ مجھے اس وقت کتنی مسرت حاصل ہوگی اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا ۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں ۔ چاہتا ہوں ۔ کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلا چلا کر کہوں میں انسان نہیں ہوں ۔ میں پاگل ہوں مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو ۔ میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا ۔"

کرشن چندر کا ایک اور طویل نفسیاتی افسانہ " زندگی کی موڑ پر " ہے۔ مصنف نے افسانہ شروع کرنے سے پہلے اقبال کا مصرع " منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی " لکھا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار شہر کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان پرکاش ہے، جس پر انتشار اور سراسیمگی سی طاری رہتی ہے۔ تہذیب کا ستایا ہوا انسان صدیوں سے سکون کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔ " زندگی کی موڑ پر " بھی کچھ ایسی ہی جستجو اور سرگردانی کے نقوش ملتے ہیں۔ پورے افسانے میں ایک عجیب اور لطیف مزاح کا رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن اس مزاح اور طنز کی مسکراہٹوں میں بہت سے آنسو چھپے ہوئے ہیں۔ پرکاش ایک لالۂ صحرائی ہے جس کو تہذیب کے مظالم نے کملا دیا ہے اور اس کو منزل سے دور کر دیا ہے۔ پورا افسانہ پرکاش کی اس نفسیاتی کیفیت سے مرتب ہوتا ہے۔ اسی سلسلے میں مصنف نے متوسط طبقے کی شادی پر بھی طنز کیا ہے۔ پرکاش کی نفسیات میں ایک طرح کا طنز شامل ہے اور زندگی کے تلخ تجربوں نے اس کو یہ طنزیاتی زاویۂ نگاہ عطا کیا ہے۔ طنز کی عادت اس کی طبیعت میں اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ وہ اپنے رشتے کی بہن پرکاش وتی کی شادی پر جو اس کی یعنی (پرکاش وتی کی مرضی کے خلاف ہو رہی ہے) اس کے منہ پر طنز کرنے نہیں چوکتا۔ اس منظر کو مصنف کی زبان سے سنئے۔

" پرکاش وتی دوسری منزل میں ایک کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ پرکاش کا خیال تھا کہ وہ بہت سی لڑکیوں میں گھری ہوگی اور اس سے دو چار میٹھی میٹھی گالیاں سننے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ لیکن حسن اتفاق سے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پرکاش بہت خوش ہوا۔ اس نے پرکاش وتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی حنائی انگلیوں کو زور زور سے ملنے لگا۔ لیکن پرکاش وتی بولی نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے پرکاش وتی کی تھوڑی کو اونچا کیا اور کہنے لگا۔ سنتی ہو بہن جان تمہارا بھائی تمہیں بدھائی دینے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی ہو۔ اور پرکاش وتی اپنی آنکھوں میں سچ مچ آنسو روکے بیٹھی تھی۔ یہ بات سنتے ہی وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ پرکاش بولا تو تو کہتی تھی میں بی اے پاس کرکے نوکری کروں گی یا کہانیاں لکھوں گی اور شاعری کروں گی اب بتا یہاں تو تجھے کسی نے گیارھویں جماعت سے آگے نہیں پڑھایا اور تو تو شاید فلم ایکٹرس بننا چاہتی تھی اب وہ اداکاری کے ولولے کہاں گئے۔ تیرے وہ سونے کے تمغے جو تو نے مہا و دیالہ میں ناچ ناچ کر حاصل کئے تھے اب کہاں ہیں؟ پرکاش وتی نے رو کر کہا۔ اس لئے تم مجھے جلانے آئے ہو۔ کیا میں اب تم سے بھی ہمدردی کی امید نہ رکھوں۔ پرکاش چپ رہا اور چند لمحوں تک آنسوؤں کی ان ندیوں کی طرف تکتا رہا جو اپنی روانی میں زندگی کے پورے نہ ہونے والے سپنوں کو بہا لئے جا رہی تھیں۔

اس افسانے میں پرکاش کے جذبات اور اس کی نفسی کیفیات کہیں بلند آہنگ ہیں تو کہیں اس میں کچھ سرگوشیاں بھی چھپی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد آخر شب میں سونے والوں کی رنگا رنگ کیفیتیں اپنے معنی کے اظہار کے لئے شرمندۂ الفاظ نہیں ہیں۔ ایک طرف پرکاش کے اپنے جذبات کا طوفان تھا جس نے اس کو رات بھر بے چین رکھا اور دوسری طرف سونے والوں کی وہ بے حسی جو تقدیر کے شاکر انسانوں پر مسلط ہو جاتی ہے۔ اس طویل افسانے میں کرشن چندر نے پرکاش کے کردار کا نفسیاتی تجربہ کیا ہے۔ یہ فسانہ پرکاش کی نفسیاتی کیفیتوں سے بنتا ہے اور اس کی نفسیاتی کیفیت ہی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ہماری زبان کے

جدید افسانوں کا ایک مختصر خاکہ ہے ۔ نفسیاتی افسانہ اور معاشرتی یا تخیلی افسانوں میں صرف یہ فرق ہے کہ جہاں معاشرتی افسانوں میں بھی ذہنی میلانات اور کیفیات پس منظر میں رہتی ہیں اور قصے سے نفسیات کے بہت سے پہلو اخذ ہوتے ہیں۔ نفسیاتی افسانے میں واقعات کسی نہ کسی نفسیات کے زیر اثر بنتے ہیں ۔ یہ نفسیات پورے قصے پر حاوی ہوتی ہے ۔ افسانہ نگار اپنے کرداروں کی کسی نہ کسی مخصوص ذہنی کیفیت اور احساس سے قصہ تیار کرتا ہے اور اسی کو قصے کے ارتقاء اور انجام کا ذمہ دار قرار دیتا ہے ۔ اسی ترتیب اور تجزیے کو آپ چاہیں تو افسانے کی داخلیت بھی کہہ سکتے ہیں ۔

محمد عمر مہاجر

رات کا بھولا اور دیگر افسانے ۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے ۔ جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے ۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں ۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابل مطالعہ ہیں ۔ اس کتاب کا ٹائیٹل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے ۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے ۔
صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

محبت کی چھاؤں ۔ مرزا ظفر الحسن بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے ۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں ۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں ۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے ۔ چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہر

من کی دنیا ۔ حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی ایم اے کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے ۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے ۔
ہر فسانہ رعنائی خیال اور رنگینیٔ بیان کا بہترین نمونہ ہے ۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستاران افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہوں گے ۔ جو اصحاب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پرکیف افسانوں سے ضرور لطف اندوز ہوں گے ۔ صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد عہ

ہوش کے ناخن ۔ اس ڈرامے کو جامعۂ عثمانیہ کے دو بہترین انشاپرداز میر حسن صاحب ایم اے اور مخدوم محی الدین صاحب ایم اے نے نہایت ہی محنت اور توجہ سے لکھا ہے ۔ اس میں حیدرآباد کی سماجی زندگی کو دل آویز و دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے یوں تو یہ ایک انگریزی ڈرامے سے ماخوذ ہے لیکن اس طرح اپنا کر پیش کیا گیا ہے یوں تو یہ ایک انگریزی ڈرامے سے ماخوذ ہے لیکن اس طرح اپنا کر پیش کیا گیا ہے کہ بجائے خود تصنیف ہو گیا ہے ۔ زبان سلیس مذاق لطیف اور انداز بیان نہایت ہی شگفتہ ہے ۔ تعداد صفحات (۹۴) قیمت عہ ۔

اُردو ڈراما

ڈراما ادبیات کا ایک نہایت اہم اور دلچسپ جزو ہے اور زندگی کی ترجمانی کے اعتبار سے ادب کا کوئی دوسرا شعبہ اس کو نہیں پہنچتا۔ اس کے دو اہم پہلو ہیں ایک تمثیلی دوسرا ادبی، تمثیلی پہلو نہایت قدیم ہے کسی واقعہ کی ہو بہو نقل اتارنا یا سوانگ بھرنا ہمیشہ دلچسپی اور توجہ کا باعث رہا ہے چنانچہ کم سن بچوں کا اپنے کھیلوں میں مختلف کرداروں کی نقالی کرنا اسی مشابہت پسندی کا نتیجہ ہے اسی وجہ سے غالبؔ نے دنیا کو "بازیچۂ اطفال" اور شکسپیر نے "اسٹیج" قرار دیا ہے۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ تمثیل کا آغاز مذہبی رسم و رواج کے زیر سایہ ہوا ہے کیونکہ عوام کی مذہبی عقیدت نے اپنے اکابروں اور دیوی دیوتاؤں کی مقدس زندگی اور ان کے نیک عمل کو تمثیلی انداز میں پیش ہوتا ہوا دیکھنا ضروری گردانا۔ "رام لیلا" اس کی بڑی اچھی اور اچھوتی مثال ہے۔ اس قسم کے کھیل، تماشوں کی مقبولیت کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ہر چھوٹی بڑی تعریب کے ساتھ ان کی نمائش لازمی تھی۔ رفتہ رفتہ یہی کھیل تماشے ادبی صورت اختیار کرنے لگے اور ان میں خصوصیات بھی پیدا ہونے لگیں۔ ابتداً ان ڈراموں کا موضوع مذہبی معتقدات اور ان میں خاص طور پر دیوتاؤں کی معرکہ آرائیاں ان کے معجزات اور ان کے عشق و محبت کی داستانوں کو پیش کیا جاتا تھا اور ان میں رقص و سرود کو کوئی جگہ حاصل نہیں تھی۔ بعد کو فطرت انسانی تنوع پسندی اور جدت طرازی نے اس میں ناچ اور گانے کو بھی داخل کر لیا۔ بدھ مت کے پیشواؤں نے سب سے پہلے ڈرامے کی افادیت کو پہچانا اور اس کو اپنے عقائد کے پرچار کا ذریعہ بنایا چنانچہ راجاؤں کی سرپرستی سے تھوڑے ہی دنوں میں سارے ہندوستان میں بدھ مت کی دھوم مچ گئی اور بدھ مت عقائد اس طرح پھیل گئے جیسے بن میں آگ پھیلتی ہے۔ ڈرامے کی اس کامرانی نے عوام کا دل موہ لیا لیکن جب ہندو مت کے فی زمانہ ردعمل سے بدھ مت کو زوال ہوا تو ڈرامے کو بھی پس پشت ڈال دیا گیا۔ اس کے علاوہ بیرونی حملہ آوروں کی یلغاروں نے بھی اہل ہند کو ڈرامے کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ دیا اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈراما بالکلیہ فنا ہو گیا کیونکہ عوام نے اس کو اپنے روزگار کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ "ناٹک منڈلیاں" اسی پیشہ ورانہ مقصد کے تحت قائم ہوئیں جو گاؤں گاؤں پھرتی تھیں۔ ان "منڈلیوں" کے کارندوں نے روپیہ کمانے کی فکر میں عوام کے مذاق کی آسودگی کے لئے مبتذل اور گندہ خیالات کی نمائش کی جس کی وجہ سے مذہبی پیشواؤں نے ان ڈراموں کو اخلاق سوز اور خلاف مذہب قرار دیا مگر یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں اس صنعت کے اچھوتے اور نادر نمونے نہ پائے جاتے ہوں خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان نے بھی کالیداس کا سا عہد آفریں ڈراما نگار پیدا کیا جس کی ٹکر کے ڈراما نگار دنیا میں بہت کم پیدا ہوئے ہیں لیکن اُردو میں ڈرامے کی طرف بہت دیر میں توجہ کی گئی اس لئے اُردو ڈراما ابھی طفولیت ہی کے دور میں ہے۔ اسلامی بادشاہوں کے زوال کے موقع پر جب عیش و عشرت کی محفلیں اور لطف و تفریح کے مختلف اسباب پیدا ہو گئے تو ڈرامے کو بھی عیش رانوں نے تفریحی غایت کی تکمیل کے لئے چنا۔ کہا جاتا ہے کہ فرخ سیر خاندان مغلیہ کے "شاہ شطرنج" کے حکم سے نواز نامی ایک شخص نے ایک ڈراما تیار کیا جس کا سلیس اردو میں فورٹ ولیم کالج کے مشہور مترجم مرزا کاظم علی جوان نے سنہ ۱۸۰۱ء میں ترجمہ کیا ہے۔ واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ ڈراموں اور جلسوں کے بڑے دلدادہ تھے چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے کئی ایک ڈرامے اور جلسے تیار کئے مگر ادب میں ان کا کوئی مستقل درجہ نہیں ہے لیکن اس دور کی نہایت اہم اور ان مٹ یادگار۔ امانت کی "اندر سبھا" ہے۔ اندر سبھا کا پلاٹ یا بیرنگ ہندی دیومالا اور اسلامی روایات کے خوش گوار سنجوگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اُردو زبان کا سب سے زیادہ مقبول اور مشہور ڈراما ہے جس کا ترجمہ مشرق و مغرب کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے اور انڈیا آفس میں اس کے کم و بیش ۴۸ نسخے ہیں۔

اور غالباً امانت ہی اُردو ڈرامے کے باوا آدم ہیں

اندرسبھا کے کردار دیو، پری اور اسی قسم کی مافوق فطرت ہستیاں تھیں جب پہلے پہل ان آسمانی کرداروں کو اسٹیج پر پیش کیا گیا تو عوام نے بے حد پسند کیا اس کی مقبولیت سے دوسرے ڈراما نگاروں کو بھی اس نہج پر ڈراما نگاری کا شوق ہوا لیکن جس طرح جھوٹے سکے ٹکسال میں نہیں چل سکتے اسی طرح ان حضرات کی "مصنوعی مخلوق" بھی فنا ہو گئی یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ یہ سارے ڈرامے نظم میں لکھے جاتے تھے یعنی مکالمے میں قافیہ پیمائی کی جاتی تھی یہ قدیم طرز کے ڈراموں کی نہایت اہم خصوصیت ہے اس کے علاوہ اس دور کے ڈراما نگاروں نے اپنے ڈراموں میں عوام کے مذاق کو بطورِ خاص ملحوظ رکھا جس کی وجہ سے ان میں سوقیانہ مذاق، فحش خیالات اور بھونڈی زبان داخل ہو گئی۔ مرزا ہادی رسوا لکھنوی نے اپنی کتاب "مرقع لیلیٰ مجنوں" میں ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھ کر ذیل کے تاثرات سپردِ قلم کئے ہیں۔

"حیران تھا کہ یہ کس شہر کی بولی ہے جو اِن لوگوں کی زبان سے سنتا ہوں۔ سمجھ میں تو آتی ہے مگر اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ ایک شفیق سے معلوم ہوا کہ یہ نظم و نثر دہلی اور لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ بمبئی کے بھنڈی بازار کی بول چال ہے۔ میں نے دل میں کہا شکر خدا کا ان جہلات کو ہماری زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

رسوا کی رائے کی تصدیق اس دور کے تمام ڈراموں سے ہوتی ہے اس کے علاوہ قدیم ڈراموں کا ایک اور نقص یہ ہے کہ ان کے پلاٹ بیشتر غیر ملکی قصوں اور روایتوں سے گھڑے جاتے تھے اور لطف یہ کہ ڈراما نگار اِن ملکوں کی معاشرت اور تہذیب تو ایک طرف ان کے محل وقوع سے بھی قطعاً ناواقف ہوتے تھے اور ملکی آداب و معاشرت کی بے محل ٹھونس ٹھانس سے ڈرامے کو مضحکہ خیز بنا دیتے تھے۔ اس کے ساتھ عشق و محبت کے فرسودہ واقعات بڑے بھونڈے طریقے سے شریک کر دئے جاتے تھے جس کی وجہ سے ڈراما اثر آفریں ہونے کی بجائے تکلفات اور تصنعات کا گھروندہ بن کر رہ جاتا تھا۔ گویا بظاہر ڈراما سب کچھ تو ہوتا تھا مگر روح مفقود ہوتی تھی۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، نل دمن، ہیر رانجھا، اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس کے بعد بعض ڈراما نگاروں نے حسن و عشق سے ہٹ کر مسائلی یا موضوعی ڈرامے لکھنے کی کوشش کی جن میں دنیا کی دورنگی، آسمان کی کج روی یا کسی اصلاحی اور اخلاقی خیال کو ڈرامائی رُوپ میں پیش کیا گیا اس ذیل میں قابل ذکر ڈرامے "چلتی دنیا" "کایا پلٹ" "دورنگی دنیا" "حسن کا بازار" "پاپ کا گناہ" وغیرہ ہیں لیکن یہ سب قدیم لکیر کے پیٹنے والے تھے اور قدیم طرز کی جکڑ بندیوں سے سرمو انحراف کرنے کو مہاپاپ اور مکروہ جانتے تھے۔ اس دور میں اردو ڈراما بندھے ٹکے اصولوں میں ہی جکڑا رہا۔ تاہم بعض ڈراما نگاروں نے زبان اور ادب کی بھی خاصی خدمت کی ہے ان میں قابل ذکر رونق بنارسی، حافظ محمد عبداللہ مرز، نظیر بیگ، احسن لکھنوی، یاور علی اعظم اور حشر کاشمیری وغیرہ ہیں۔ حشر کاشمیری نے تو اردو ڈرامے کی اتنی خدمت کی ہے کہ وہ عوام میں ہندوستان کے شکسپیر کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن ایک بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ڈراما نگار کاروباری نقطۂ نظر سے ڈرامے لکھنے پر مجبور تھے کیونکہ ناٹک کمپنیاں انہی ڈراموں کو پیش کرتی تھیں جو عوام پسند ہوں ان سے ہٹ کر اگر بالفرض کوشش کی بھی جاتی تو ان کا پھلنا غیر یقینی تھا۔ تاہم حشر نے بعض ڈراموں میں مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی کی جگہ سیدھی سادی زبان میں معاشی اور معاشرتی مسائل داخل کئے ہیں اس کے علاوہ انھوں نے شکسپیر کے کئی ڈراموں کو اُردو کے قالب میں منتقل کیا ہے

جس کی وجہ سے زندگی میں دولت کی دیوی نے ان کو گلے لگایا بلکہ شہرت کے دربار میں بھی پہنچا دیا۔

طرزِ جدید کے اِحیاء سے پہلے قدیم دور کی ناٹک کمپنیوں کا سرسری خاکہ اور ان کی خدمات کا اجمالی تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں متعدد ناٹک کمپنیاں قائم ہوئیں اور انھوں نے مختلف ڈراما نگاروں کی ذہنی فتوحات کی نمایش کی ان کمپنیوں میں ذکر کے قابل اوریجنل تھیٹریکل کمپنی، لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی، الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے علاوہ حیدرآباد دکن کے ڈرامٹک کلب بال روم، دال منڈی وغیرہ بھی ہیں مگر ان ناٹک کمپنیوں کے اداکار غیر تعلیم یافتہ تھے اور ان میں عورتوں کا پارٹ بازاری اور پیشہ ور عورتیں کرتی تھیں جس کی وجہ سے بہتیری سماجی برائیاں تھیٹر میں داخل ہوگئیں اور مہذب طبقے نے اس کو "برائیوں کا گھر" اور اداکاری کو ادنیٰ پیشہ قرار دیا اس کے علاوہ ایک اور نقص یہ بھی تھا کہ خود مالک کمپنی، ادا آموز اور بیشتر ڈراما نگار اداکاری سے قطعاً ناواقف تھے۔

ان خرابیوں اور موانعات کی وجہ سے اُردو ڈراما بالکل ابتدائی حالت ہی میں تھا۔ لیکن جب انگریزی زبان ملک میں پھیلنے لگی، اور انگریزی دانوں نے مغربی ڈراموں کا اردو ڈراموں سے موازنہ کیا تو ان کو اپنی زبان کی تہی مائگی نے ڈرامے کی اصلاح پر آمادہ کیا اور طرز جدید کے پیش روؤں نے جن میں ذکر کے قابل مولانا ظفر علی خاں، مرزا رسوا، محمد عمر نور الہٰی وغیرہ ہیں۔ اس کی طرف توجہ کی مگر ان حضرات نے صرف زبان و بیان کی نزاکتوں کا خیال رکھا اور ڈرامے کے فنی پہلو کو نظر انداز کردیا لیکن طرز جدید کے پیروؤں نے اس کمی کو محسوس کرکے اس کو دور کرنے کی قابل قدر کوشش کی اس دور میں بعض چوٹی کے ڈراما نگار پیدا ہوئے ان میں اشتیاق حسین قریشی، عبدالماجد دریا بادی، دتاتریہ کیفی، فضل حق قریشی، مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، امتیاز علی تاج، شاہد احمد، فضل الرحمٰن، یلدرم وغیرہ خاص طور پر ممتاز ہیں۔

ان حضرات کے بیشتر ڈرامے انگریزی اور دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں لیکن ایک خصوصیت ان میں قابل ذکر یہ ہے کہ انہوں نے غیر ملکی کردار اور معاشرت کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ اُردو کے قالب میں ان کو اجنبی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ویسے موجودہ دور ترجمے ہی کا دور ہے۔ دنیا کی زبانیں یونہی دوسری زبانوں کے سرمائے سے اپنی زبانوں کو مالا مال کرتی ہیں۔ "اردو ڈراما" اب روز بروز تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول ہوتا جارہا ہے۔

حیدرآباد میں مختلف انجمنیں ڈراموں کی خدمت کررہی ہیں اور ان کو تعلیم یافتہ طبقے میں ڈرامے کا مذاق پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ ان میں بزم تمثیل، انجمن ترقی ڈراما اور سٹی کالج، نظام کالج، عثمانیہ کالج، اورنگ آباد کالج کی انجمنیں کافی مشہور ہیں ان انجمنوں نے کئی ایک ڈراما نگار اور اچھے اداکار پیدا کئے ہیں جن میں میر حسن، مخدوم محی الدین، اکبر وفاقانی، نزاکت اللہ بیگ، ظفر الحسن اور غلام محمد خاں وغیرہ کے نام یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

علاوہ ازیں اب اُردو رسائل میں ڈرامے بہ کثرت شائع ہورہے ہیں جو بلا شبہ ایک نیک فال ہے۔ نیز عوام کے مذاق کو بدلنے میں بولتے فلموں کا بڑا حصہ ہے اور خاص طور پر نیو تھیٹر، بمبئی ٹاکیز اور منروا مووئیٹون نے ہماری زبان اور ڈرامے کی قابل قدر کوشش کی ہے اور لاسلکی ایجاد سے اُردو ڈراما نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اب آئے دن دلچسپ ڈرامے نشر گاہوں سے نشر کئے جارہے ہیں۔ یہ ڈرامے سامعین کی دلچسپی کے نقطۂ نظر سے لکھے جاتے ہیں اور خوشی کی بات ہے اردو کے ادیب اس نئے میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ صاحبزادہ میکش کے نشریاتی ڈرامے ادارۂ ادبیات اُردو کی جانب سے شایع ہوچکے ہیں اور فضل حق قریشی نے بھی اپنے نشری ڈراموں کا مجموعہ پیش کیا ہے۔ بہرحال اُردو ڈرامے کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ ہم کسی دوسری صحبت میں ڈرامے کے اقسام اور اس کے افادی پہلو پر روشنی ڈالیں گے۔

میر عزیز الحق

اُردو ترجمے

ہر ہونہار زبان کو جلد جلد ترقی کرنے اور زمانے کی رفتار کا ساتھ دینے کے لئے قدیم اور وسیع زبانوں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُردو لکھنے اور بولنے والوں کی وسعتِ نظر اور بے تعصبی کی بدولت یہ راستے ہماری زبان کے لئے ہمیشہ کھلے رہے ہیں۔ چنانچہ سنسکرت اور پراکرت کا دودھ اُردو نے ایک عرصہ تک پیا اور جب مغلیہ دور میں فارسی کو عروج ہوا تو اس کے اثرات بھی اُردو نے جی کھول کر قبول کئے۔

عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اُردو زبان میں ترجمہ کے دو دور گزرے ہیں۔

ایک دور ابتدائی ہے جب کہ اولاً فارسی اور عربی کے اور بعد کو سنسکرت کے ترجمے ہوئے۔ قدیم دکنی ادب کا بیشتر حصہ اُس زمانہ کی مقبول اور مروجہ فارسی تصانیف کے ترجموں پر مشتمل ہے۔ اُردو لکھنے اور بولنے والوں کی فارسی دانی اور ترجموں کی وجہ سے جو فائدے اس زبان کو ہوئے اُن سے سب واقف ہیں۔ بے شمار الفاظ، ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں کا اضافہ ہوا۔ شعر اور نثر کے نئے نئے سانچے اور اسالیب اُردو ادب کی رونق کا باعث ہوئے۔

مغربی تصانیف کے اُردو ترجموں کی ابتدا اُس وقت سے ہوئی جب کہ مختلف مغربی قوموں نے ہندوستان میں تھوڑی بہت قوت حاصل کرلی۔ اس سلسلے میں اولین قابلِ ذکر کوششیں عیسائی پادریوں کی ہیں جنھوں نے وقتاً فوقتاً انجیل کے مختلف حصوں کے ترجمے کرائے اب تک جو مواد مل سکا ہے، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ انجیل کا ترجمہ پہلی دفعہ ہندستانی زبان میں بنجمن شولز نے ۱۷۴۵ء میں کیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار پر آنے تک اُردو یعنی ہندستانی کو ہندوستان کی عام زبان کی حیثیت حاصل ہوچکی تھی۔ ۱۸۰۰ء میں حکومت نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جہاں نو عمر انگریزوں کو ہندستانی اور مشرقی علوم سکھانا منظور تھا۔ تعلیمی ضروریات کے تحت اُردو ادبیات کی تلاش ہوئی۔ اس کا سارا ذخیرہ شعر و شاعری پر مشتمل تھا۔ اس لئے ادبی کتابوں کی تالیف اور ترجمہ کے لئے ایک محکمہ قائم کیا گیا۔ اس سررشتہ میں اخلاقی قصوں اور بعض تاریخی کتابوں کا ترجمہ قدیم مشرقی زبانوں یعنی عربی اور سنسکرت سے کیا گیا۔ دوسرے علوم یا سائنس پر کوئی کتاب اِس عہد میں تیار نہیں ہوئی۔

شمالی ہند میں اُردو نثر کی باضابطہ ابتدا انگریزی اثر کی بنا پر ہوئی لیکن ابتداً اس پر انگریزی زبان و ادب کا اثر کم پڑا اور جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے فورٹ ولیم میں کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ اُردو میں نہیں ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ دیسی لکھنے والے انگریزی نہیں جانتے تھے۔ فورٹ ولیم کے کسی اہم کام کا ذکر مغربی زبانوں سے ترجموں کے سلسلے میں کیا جاسکتا ہے تو صرف اُس انگریزی لغت کا جس کا ایک حصہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ۱۷۹۶ء میں چھپوایا۔ فورٹ ولیم کالج اس لغت کی اشاعت کے چار سال بعد قائم ہوا لیکن چونکہ گلکرسٹ اس کالج کی روحِ رواں تھے اس لئے ہم نے ان کے کام کا ذکر اس سلسلے میں کردیا۔

مرزا فطرت نے ول ہنٹر کی مدد سے ۱۸۰۵ء میں انجیل کے عہدِ جدید کا ترجمہ شایع کیا۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ یونانی زبان سے کیا گیا۔ ۱۸۰۹ء میں کنڈرلے نے اپنی لغت شایع کی اس کے بعد ۱۸۱۱ء میں کپتان ٹامس روک ROCK نے لغتِ جہازرانی چھپوائی جس میں جہازرانی کی اصطلاحوں کے علاوہ ایسے الفاظ کا اُردو ترجمہ بھی درج ہے جو کمانداروں کو جنگ کے میدان اور بارکس میں کام آسکتے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ایک عرصے بعد یعنی ۱۸۴۵ء کی لکھی ہوئی ایک کتاب دستیاب ہوئی ہے جس کا نام "مجموعۂ گنج" ہے اور جو کلکتہ اسکول بک سوسائٹی پریس میں چھپی ہے (تفصیل کے لئے اکتوبر ۱۹۳۲ء کا معارف ملاحظہ فرمائیے) یہ کتاب چونکہ اولین ترجموں میں سے ہے اور کم یاب ہے اس لئے اس کی خصوصیات کے بارے میں کچھ عرض کردینا ضروری ہے۔

"مجموعۂ گنج" کی عبارت میں قدامت پائی جاتی ہے۔ جملوں کی ترکیب پر انگریزی اثر نمایاں ہے۔ بعض ایسے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جو عرصہ ہوا متروک ہوچکے ہیں۔ "نے" کے غلط استعمال اور جملہ کی ترکیب کی اجنبیت کی ایک مثال یہ جملہ ہے "کمپنی کے سوا کوئی آدمی پوست کا کھیت کرنے اور افیون مول لینے نہیں سکتا مگر کمپنی کے حکم سے۔"

اُس زمانے میں اُردو ترجمے کا دوسرا اہم مرکز شہر حیدرآباد دکن تھا۔

حیدر آباد کے امیر کبیر نواب فخرالدین خاں شمس الامرائے ثانی بڑے علم دوست تھے ۔ نواب صاحب موصوف نے اپنے اطراف علماء کا ایک گروہ جمع کر لیا تھا جن میں سے اکثر تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا کام کرتے تھے ۔

نواب فخرالدین خاں کو ریاضیات اور علم ہیئت سے خاص شغف تھا ۔ اپنی علم دوستی اور علمی دلچسپی کی وجہ سے انہوں نے اپنے زمانے میں بہتیرے مستند اور اعلیٰ پایہ ترجمے اپنے سنگی چھاپہ خانے میں چھپوائے ۔

نواب شمس الامرا کی کتابوں کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے ۔ اُن کے مترجموں کو اپنے موضوعوں پر پورا پورا عبور حاصل تھا ۔ ستہ شمسیہ اس مرکز کی بہترین یادگار ہے ۔

اس دور میں اُردو ترجموں کا تیسرا اور آخری مرکز لکھنؤ تھا ۔ شاہان اودھ نے لکھنؤ میں جدید مغربی علوم و فنون کی بعض کتابوں کے ترجمے کرائے جو مطبع سلطانی میں چھپ کر شائع ہوئے ۔ سید کمال الدین حیدر لکھنوی نے جدید علوم پر انتیس[29] رسالوں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا جو کیمیا، برق، مقناطیس، طبیعیات، ہیئت، علم المناظر، علم آب، علم ہوا، علم حرارت وغیرہ سے متعلق ہیں ۔

ان کے مقابلے میں شمالی ہند کے ترجموں کی زبان پر عربیت حاوی نظر آتی ہے ۔

ترجموں کے ابتدائی دور میں یعنی ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۲ء تک جو اجتماعی کوششیں ہوئیں ان کا ذکر ہو چکا ۔ انفرادی کوششوں میں یہ کتابیں قابلِ ذکر ہیں :—

ایلیمنٹس آف جنرل ہسٹری کا ترجمہ ۱۸۲۹ء
تاریخ انگلینڈ " " ۱۸۴۰ء
تاریخ روم " " ۱۸۴۱ء
تاریخ ملک چین " " ۱۸۴۱ء
بنیان کی پلگرمس پروگرس " " ۱۸۳۸ء
جانسن کا رسیلس مترجمہ سید محمد میر ۱۸۲۵ء

اِس کے علاوہ "داؤد کی زبور" "گے کے فیبلز" اور "خلاصۂ علم الارض" اِن تیں کتابوں کا تعلق بھی اسی دور سے ہے ۔

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم کا دوسرا دور ۱۸۴۲ء میں شروع ہوا ۔ اِس دور کا پہلا اہم مرکز دہلی کالج تھا ۔ پچھلے دور میں جن مرکزوں کا ذکر کیا گیا ان کی کوششیں اس قدر وسیع پیمانے پر اور اس درجہ منظم نہیں تھیں جتنی کہ دہلی کالج کی تھیں ۔ اس کلیہ کے ارباب نے ترجمہ کی مشکلات کو حل کرنے کی غرض سے بعض مفید اصول پہلی دفعہ مرتب کئے ۔ اور نصابی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے مختلف علوم اور سائنس کی اعلیٰ قسم کی کتابیں اُردو میں منتقل کیں ۔ اس سے پہلے صرف ابتدائی کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے تھے ۔ ترجمہ کے بارے میں جو اصول بنائے گئے تھے ان میں سے بعض یہ ہیں ۔

مترادف لفظ اُردو میں نہ ملے تو اصل لفظ استعمال کیا جائے ۔

اُردو لفظ ملے تو وہی استعمال کیا جائے ۔

سائنس کی کتابوں کا ترجمہ چونکہ انگریزی ہی سے کیا جائے گا اس لئے انگریزی لفظ کا اُردو میں استعمال ناگزیر ہے ۔

انگریزی جملے میں اگر کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہو جس سے اہلِ ہند ناواقف ہوں تو مترجم کو چاہئے کہ حاشیہ یا متن میں مختصر طور پر اس کی تشریح کر دے ۔

ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اُردو میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی جائے ۔ دہلی کالج سے خدا جانے کُل کتنی کتابیں شائع ہوئیں ۔ اس وقت تک ان میں سے صرف (۳۰) کا پتہ چلا ہے ۔ اس کے علاوہ چھے ایسی کتابوں کے نام معلوم ہوئے ہیں جو زیر ترجمہ تھیں ۔

دہلی کالج کے ترجمے ان علوم سے متعلق ہیں۔ تاریخ انگلستان، الجبرا، علم ہیئت، کیمیا، قانون مال، معاشیات، میکانیات طبعی جغرافیہ، مساحت، طبیعیات، صرف و نحو انگریزی، مقناطیس جراحی، حرکیات اور سکونیات، سکونِ سیّالات، علم المناظر، حرارت، علم آب، برق، ریاضی، طب، فلسفہ، نباتیات، حفظانِ صحت، عضویات، معدنیات۔

انیسویں صدی میں اُردو ترجمہ کا آخری ادارہ سائنٹیفک سوسائٹی تھی۔ جب سرسید کو یقین ہوگیا کہ جس وقت تک ملک میں جدید علوم کی اشاعت نہ ہو اُس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں فضول ہیں تو انہوں نے اُردو میں مغربی تصانیف اور علوم کا ترجمہ کرانے کی غرض سے ایک انجمن قائم کی۔ سرسید نے ترجمہ کے کام کو انگریزی زبان کی اشاعت سے زیادہ ضروری سمجھا اس لئے کہ ہندوستان کی آبادی کے ایک حصے کو اس سے نفرت تھی تو دوسرا حصہ اس کو صرف ملازمت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ ان دونوں کے دلوں پر انگریزی تعلیم کا نقش بٹھانے کے لئے کچھ کتابوں کو اُردو میں منتقل کرنا ضروری تھا۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ اس سوسائٹی کا اصلی مقصد انگریزوں اور ہندوستانیوں میں میل جول پیدا کرنا تھا۔

سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام کا اعلان سرسید نے ۱۸۶۳ء میں کیا۔ کچھ ہی عرصے میں ارکان کی تعداد کثیر ہوگئی۔ غازی پور میں ترجمہ کا کام باضابطہ طور پر شروع کردیا گیا۔ بعد میں سوسائٹی علی گڑھ میں منتقل ہوگئی تو وہاں سرسید نے اس کے لئے تیس ہزار روپے کے صرفہ سے ایک عمارت تیار کروائی۔ تقریباً پانسو روپے کے تنخواہ دار مترجمین اور دوسرے ملازمین سوسائٹی کے کام پر متعین کئے گئے تھے۔ اس زمانہ کے انگریزی جرائد میں جو اعلیٰ پایہ کے مضامین چھپتے تھے ان کے ترجمے سوسائٹی کے رسالے "انسٹیٹیوٹ گزٹ" میں شایع کئے جاتے تھے۔ اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں اُردو میں ترجمہ کرائیں۔ اس کی توجہ زیادہ تر تاریخ، سوانح، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات تک محدود رہی۔

یوں تو سوسائٹی کے تمام ترجمے کامیاب کہے جاسکتے ہیں لیکن خاص طور پر معاشی اصطلاحات کے ترجموں میں بڑے سلیقہ سے کام لیا گیا۔ اسی وجہ سے ان میں بعضوں نے یا تو اپنی اصلی حالت میں یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اُردو زبان میں مستقل جگہ حاصل کرلی۔

سائنٹیفک سوسائٹی کی مطبوعات بالعموم عام فہم ہیں اور اور ان میں ترجمہ پن کم پایا جاتا ہے۔ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۷۷ء تک انفرادی کوششیں بھی زیادہ تر تاریخ اور سوانح تک محدود رہیں۔ علمی کتابوں کے ترجمے بہت کم شایع ہوئے۔ (DE FOE) ڈِفو کی رابنسن کروسو کا ترجمہ "بزرگ رابنسن کروسو" کے نام سے اور پادری ویکفیلڈ" کے نام سے ویکار آف ویکفیلڈ کا ترجمہ بھی اسی دور میں چھپا۔

یہ تھا ۱۸۰۰ء سے ۱۸۷۷ء تک کے اُردو ترجموں کا نہایت اجمالی ذکر۔

اس کے بعد کی تاریخ ترجموں کی نوعیت اور وسعت دونوں کے لحاظ سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔

میر حسن

اطلاع:- رسالہ نہ ملنے کی اطلاع ہر انگریزی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک دفتر کو کردی جائے۔ مہینہ ختم ہونے پر رسالے بھی ختم ہوجاتے ہیں نئے سال کا چندہ تقسیم کنندہ سے باضابطہ مطبوعہ رسید حاصل کرکے عنایت فرمائیے۔

اُردو ادب اور ہندو سماج

علم اللسان کے ایک پروفیسر مسٹر فیڈش کا قول ہے کہ غیر زبان جو کسی قوم کو سیکھنی پڑتی ہے مخلوط نہیں ملتی بلکہ اس کی اپنی زبان کے اثر سے مخلوط بن جاتی ہے بالکل یہی صورت مسلمانوں کی آمد کے بعد اس ملک میں پیش آئی۔ ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملے دھواں دھار بادل یا گھٹا ٹوپ آندھیوں کی طرح تھے اور اگرچہ پنجاب پر آل غزنوی تقریباً پونے دو سو سال تک حکومت کرتے رہے لیکن باوجود اس امر کے کہ اس طویل عرصے میں اجنبیوں اور ملکیوں کے باہمی تبادلۂ خیالات کی بدولت ایک نئی زبان کا تشکیل پا جانا ممکن تھا چونکہ یہ زمانہ امن چین کا نہ تھا کوئی نئی زبان وجود میں نہ آسکی اور اسی لئے جب تک حضرت مسعود سعد سلمان کا ہندی دیوان دستیاب نہ ہو جائے اس نظریے کی مقبولیت میں فرق نہیں آسکتا کہ شہاب الدین محمدؐ غوری کے ہندوستان میں قدم جمانے کے بعد ہندی نو واردوں کی فارسی سے مخلوط ہو کر ایک نئی زبان بن گئی یعنی ترکوں اور مغلوں نے عربی، ترکی اور عجمی الفاظ کے جو دانے گنگا جمنا کی زرخیز وادی میں بکھیرے انہیں اس خطہ کی زبان کھڑی بولی نے اپنے وسیع اور کشادہ دامن میں جگہ دی اور یہ ہندی میں فارسی مخلوط کرنے والے خود اہلِ ہند تھے چنانچہ حصولِ علم، ضروریاتِ زندگی اور مہذب اور شائستہ سمجھے جانے کے خیال سے ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی اور جب متواتر مطالعہ کی بدولت خود استاد ہو گئے تو انہوں نے ایسے فارسی الفاظ سے جن کے ہم معنی یہاں موجود نہ تھے ملکی زبان کو مالا مال کرنا شروع کر دیا اور یہ بالکل صحیح طریقۂ عمل تھا لیکن احساس کمتری سے یا اظہار فضیلت و مشیخت کی خاطر جب غیر زبان کے الفاظ کا استعمال فیشن میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر اس کی روک تھام مشکل ہو جاتی ہے اور ایسے متعدد الفاظ جن کے ہم معنی اپنی زبان میں دستیاب ہو سکتے ہیں یا جن کا مفہوم ذرا سے الٹ پھیر کے بعد بآسانی ادا کیا جا سکتا ہے، زبان میں جگہ پا لیتے ہیں جو نامناسب ہے مگر فارسی اور ہندی کے اسی نامناسب اختلاط کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نہ صرف کھڑی بولی میں مترادفات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا بلکہ ہندی الفاظ کی دلنشینی اور اثر اور فارسی اور عربی الفاظ کی شان و شوکت نے حکمران قوم کو بھی اس کی طرف بیش از بیش متوجہ کرنا شروع کر دیا اب اس نے سینوں سے نکل کر سفینوں میں جگہ پائی اور اس نیک کام میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے یعنی جس طرح ہندوؤں نے فارسی میں دستگاہ کامل حاصل کی تھی اسی طرح اردو میں بھی خاصا ملکہ بہم پہنچایا اور اسی لئے سر سپرو کے ان الفاظ کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ " اردو زبان ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو ناقابل تقسیم ہے "۔

غرض کہ یہ خیال کہ ہندوؤں کو اُردو سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے، جیسا کہ احاطۂ مدراس اور بمبئی کے بعض مقامات میں عوام کے اسے مسلمانی کے نام سے موسوم کرنے سے ظاہر ہوتا ہے غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اُردو زبان اسی ملک میں بنی اور اسی ملک والوں نے جن میں ہندو شریک غالب تھے اس کے بنانے کا کام انجام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو علم و ادب کے ہر شعبے میں اس کے روز اول سے ہندو اور مسلمان دونوں دوش بدوش کام کرتے نظر آتے ہیں چنانچہ اسی وقت سے جب دکھنی نے شمال میں پہنچ کر دلی والوں کو اپنی زبان کی طرف متوجہ کیا اور وہ خان آرزو، شاہ حاتم اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے ہاتھوں پروان چڑھنے لگی۔ چند ہندو شعرا مثلاً ٹیک چند بہار جو خان آرزو سے مشورۂ سخن کرتے تھے رام نرائن موزوں آبادی جو حضرت شیخ علی حزیں کے شاگرد تھے اور سیوا رام عمدہ اور شیو سنگھ ظہور نے جنہیں انعام اللہ یقین سے شرف تلمذ حاصل تھا اُردو کے چمنستان سخن کی آبیاری کی طرف توجہ مبذول کی اور جب مرکز شاعری دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو گیا تو کشن چند مخلوح

شاگرد مرزا مظہرؔ، رام جس مغمومؔ اور موتی لال حیقتؔ اور صاحب رائے فریادؔ شاگردان میر سوز نے آتش سخن سے لوگوں کے دلوں کو گرمانا شروع کردیا۔ اس زمانے میں سرپ سکھ دیوانہ ایک نہایت پرگو اور بڑا شاعر گزرا ہے چنانچہ علی ابراہیم خاں خلیل اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ فارسی میں بھی اس کے دو دیوان تھے اور لکھنؤ کے مرزا جعفر علی حسرتؔ اور میر حیدر علی حیدرؔ اس کے شاگردوں میں سے ہیں اس کے بعد چھنو لال طربؔ اور موجی رام موجیؔ شاگردان مصحفیؔ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ پھر نسیمؔ لکھنوی کا زمانہ آتا ہے جنھوں نے گلستان نظم کو بڑی تر و تازگی بخشی۔ ان کی مثنوی گلزار نسیم کا شہرہ آج ہندوستان بھر میں ہے چنانچہ پنڈت چکبست لکھنوی دیباچۂ گلزار نسیم میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کے چرچے تھے لہٰذا خود بھی اس کوچے میں قدم رکھا اور چونکہ یہ مثنوی گلہائے مضامین سے پُر تھی اس لئے نام گلزار نسیم تجویز کیا۔ واقعی اس گلزار کا کیا کہنا ع سینچا تھا جس کو خون جگر سے وہ باغ تھا۔ ابھی تک مثنوی کے رنگ میں یکتائی کا سہرا میر حسن کے سر تھا، اب گلزار نسیم کے پھولوں کی مہک عوام کے دماغوں میں بس گئی جواہر سخن کے پرکھنے والے جان گئے کہ مثنوی کیا کہی ہے موتی پروئے ہیں۔ نسیمؔ کو بھی شہرت علم کا خلعت نصیب ہوا اور بقائے دوام کے دربار میں میر حسن کے برابر کرسی ملی۔

اس کے بعد بشمبھر ناتھ صابرؔ اور دیا شنکر نگار وغیرہم نے سخن دانی کا مذاق قائم رکھا اور جب انگریزی ادب کے اثر کے تحت اُردو نے کروٹ بدلی اور جدید رنگ کی شاعری کا آغاز ہوا تو بھی ہندو اپنے حصے کی خدمت کی طرف سے غافل نہیں رہے بلکہ جوالا پرشاد برقؔ، نوبت رائے نظرؔ، درگا سہائے سرورؔ، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفیؔ، سورج نرائن مہرؔ اور برج نرائن چکبست نے اس میدان میں بھی اشہب قلم کو اس طرح جولاں کیا ہے کہ ہر شخص کو ان کے کمال فن کی داد دینی پڑتی ہے چنانچہ برقؔ کی مثنوی صبح بہار کے سر سید مرحوم بے حد دلدادہ تھے۔ نظرؔ کے متعلق مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں کہ لکھنؤ کا گلشن شاعری اس طبل خوش الحان کے اٹھ جانے سے سونا ہو گیا اور سرورؔ کی نسبت تو یہ کہنا بجا ہے کہ انہیں فنا فی الشعر کا درجہ حاصل تھا ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت وطنیت، جذبات نگاری اور درد و اثر کا امتزاج ہے۔ کیفیؔ، حضرت آزادؔ اور مولانا حالیؔ کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں اور نیچرل شاعری میں آپ نے ایک جدت یہ داخل کی ہے کہ خشک موضوع میں رنگین بیانی کی چاشنی ملا دیتے ہیں۔ بہرحال آپکے رشحات قلم آپ کے ایک پختہ مغز اور کہنہ مشق شاعر ہونے کا کافی ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ مہرؔ گیتا اور راماین کا منظوم ترجمہ کرنے کی وجہ سے مشہور ہیں اور پنڈت چکبست ایک قومی شاعر تھے ان کے کلام میں ہمیں حب الوطنی، درس عمل اور آزادی کے نغمے سنائی دیتے ہیں اور قدم قدم پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر غلامی کا داغ مٹانے کے لئے بے تاب ہے۔

مذکورۂ بالا شعرا کے علاوہ موجودہ زمانے کے اور متعدد شاعر مثلاً تلوک چند محرومؔ، جگت موہن لال رواںؔ، گم نامؔ سکندر آبادی اور برقؔ دہلوی وغیرہ کے نام گنائے جاسکتے ہیں۔ لیکن بخوف طوالت ان کا ذکر حذف کیا جاتا ہے اور اب ہم ہندو نثر نگاروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کیونکہ اس میدان میں بھی ہندوؤں کی خدمات کچھ کم قابلِ قدر نہیں ہیں چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جس نے اردو نثر نگاری کی بڑی ہمت افزائی کی۔ امنؔ، افسوسؔ، طپشؔ اور حیدریؔ وغیرہ نے جب اپنی تصانیف سے اردو کو مالا مال کیا تو بینی نرائن جہاںؔ اور نہال چند لاہوری نے بھی چار گلشن اور مذہب عشق لکھ کر اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اس کے بعد اردو کی ترقی کی دوسری تحریک دلی میں نمودار ہوئی جہاں دہلی کالج سے متعلق ایک مجلس ترجمہ قائم تھی۔ یہ مجلس کالج کے طلبہ کے لئے انگریزی سے اُردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیتی تھی اور اس مجلس کے لئے پروفیسر رام چندر نے جو بعد میں عیسائی ہوگئے تھے تذکرۃ الکاملین، اصول علم

ہیئت اور عجائب روز گار نامی تین کتابیں لکھیں ۔ اس کے بعد آزاد، حالی، نذیر احمد اور ذکاءاللہ کا زمانہ آتا ہے اور ماسٹر پیارے لال آشوب اس عہد میں ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن اس زمانے سے کچھ عرصہ پیشتر افق نثر اُردو پر ایک ایسا روشن ستارہ طلوع ہو چکا تھا جس کی ضیاء قیامت تک دلدادگان اُردو کے دلوں کو گرمی پہنچاتی رہے گی ۔ یہ ستارہ پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کی ذات بابرکات تھی جنھوں نے حدیقہ نثر اُردو میں نئی روشیں نکالیں ۔ سرشار کی تصانیف میں فسانۂ آزاد، سیر کہسار، جام سرشار، کامنی اور خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں ۔ لیکن اول الذکر کتاب ان کا شاہکار ہے ۔ انہوں نے کچھ عرصے تک دبدبۂ آصفیہ کی ادارت کا کام بھی کیا تھا نیز بعض انگریزی کتابوں کا ترجمہ اُردو میں کیا جن میں سے ایک کا نام "شمس الضحیٰ" ہے ۔ سرشار حقیقی معنوں میں آزاد مزاج اور ایک خوش فکر شاعر تھے ۔ اسی کے ساتھ وہ ایک زبردست جرنلسٹ ایک مشہور مصنف، اُردو کے نامی زبان داں ظریف اور بذلہ سنج اور ایک خاص طرز کے موجد بھی تھے ۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُردو ناول کو انگریزی طرز پر لکھنے کا فخر انہیں کو حاصل ہے اور ان ہی کے طرز نگارش کی ان کے بعد منشی جوالا پرشاد برقؔ نے ایک حد تک تقلید کرتے ہوئے نہ صرف اکثر بنگالی ناولوں کے ترجمے اس طرز میں کر ڈالے بلکہ شکسپیر کے بعض ڈراموں کا بھی ترجمہ کیا کیونکہ ہندوستان میں اس زمانے میں ڈراموں کی مانگ بڑھ رہی تھی اور ہندوؤں میں صرف طالبؔ بنارسی اور بےتابؔ دہلوی اِس خدمت کو بہ حسن و خوبی انجام دے رہے تھے ۔ لیکن بیتابؔ ڈراما نویسی میں برقؔ سے آگے ہی رہے اور اگرچہ ان کی زبان میں ہندی اور سنسکرت الفاظ فارسی اور عربی الفاظ کے پہلو بہ پہلو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں اور کانوں پر بھی گراں گزرتے ہیں، لیکن انھیں ڈراما نویسی کے فن میں مہارت حاصل ہے ۔ بیتابؔ کے بعد اُردو کا تنازعہ بڑھتا جا رہا ہے ۔ بعض سنجیدہ پڑھے لکھے ہندو اُردو علم و ادب کی خدمت میں منہمک نظر آتے ہیں ۔ چنانچہ پریم چند کیفی منوہر لال زتشی اور دیا نرائن نگم اور سدرشن کے نام بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں ۔ پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے ہے یہ میدان قصہ گوئی کے مشہور شہسوار ہیں اور ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی دیہاتوں کے ہو بہو نقشے اور یہاں کے کسانوں کے من و عن واقعات نہایت عمدہ طریقے سے اپنے ناولوں میں بیان کئے ہیں ۔ علاوہ ازیں یہ انسانی جذبات اور نفسیات کے پورے ماہر ہیں اور چونکہ عبارت میں آمد اور زور ہوتا ہے اور مبالغہ کو یہ پاس نہیں آنے دیتے اس لئے تحریر تاثیر کا طلسم بن جاتی ہے ۔ پریم چند کو افسانہ نگاری کے فن میں بھی کمال حاصل ہے چنانچہ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو کر قبولیت عام کا شرف حاصل کر چکے ہیں ۔ کیفیؔ فارسی اور انگریزی کے فاضل اجل ہندی کے پورے ماہر اور قدرے عربی اور سنسکرت سے بھی واقف ہیں ۔ اُردو معلیٰ آپ کی مادری زبان ہے اور آپ کی ذات میں اسلامی تہذیب اور قدیم ہندو مسلم مودت کے نمایاں آثار نظر آتے ہیں ۔ اس کے علاوہ آپ ایک اچھے نقاد اور پہلے شخص ہیں جس نے اردو میں ڈرامے کے موضوع پر مضمون لکھا ۔ آج کل آپ کے مضامین کا مجموعہ طبع ہو گیا ہے اور نثر میں عورت اور اس کی تعلیم، چراغ ہدایت، ہنستا اناؔ اور پریم دیوی اور ڈراموں میں راج دلاری اور مرادی داد آپ کی تصانیف سے ہیں ۔ پنڈت منوہر لال زتشی ایک اچھے ادیب اور بلند پایہ نقاد ہیں ۔ منشی دیا نرائن نگم اپنے موقر رسالے "زمانہ" کی وجہ سے مشہور ہیں جس کا اجرا ۱۹۰۳ء میں عمل میں آیا تھا ۔ اس رسالے میں جو مضامین خود ان کے قلم سے نکلتے ہیں وہ نہایت نپے تلے اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں ۔ مہاشے سدرشن پنجاب کے ایک مشہور افسانہ نگار ہیں لیکن آپ میں وہ استادی اور فنی کمال موجود نہیں جو خاص پریم چند کا حصہ ہے البتہ ان کی چند خصوصیات کم تر درجے میں ضرور موجود ہیں ۔

اب تک میں نے ان چند ہندو بزرگوں کے نام لئے ہیں جنھوں نے اپنی دماغی کاوشوں سے اردو علم و ادب کے دامن کو وسیع کرنے کی امکانی کوششیں کی ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ ان چند باثروت ہندو اصحاب کا ذکر بھی ضروری ہے جنھوں نے شعراء اور ادیبوں کی سرپرستی فرما کر اردو کی بالواسطہ خدمت انجام دی تھی چنانچہ مہاراجہ شتاب رائے عظیم آبادی اس سلسلے کی پہلی کڑی ہیں انھوں نے حضرت اشرف علی فغاںؔ کے پٹنہ آنے پر ان کی بڑی خاطر و مدارات کی اور ان کے بیٹے نے جو راجہ تخلص کرتے تھے میر ضیاء الدین ضیاؔ کی سرپرستی فرمائی ۔ اقلیم سخن کے بادشاہ میر تقی میرؔ کی مہاراجہ ناگرمل اور

راجہ سورج مل نے کچھ دن دستگیری کی۔ اور کے مہاراجہ شمبھو دھان سنگھ نے تصویر اور تسنہ شاگردان ذوقؔ اور مجروحؔ اور سالکؔ شاگردان غالبؔ کی بڑی قدر کی اور مملکت حیدرآباد کے مشہور وزیر مہاراجہ چندولال شاداںؔ اور مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ نے مختلف ادیبوں اور شاعروں کی اعانت میں جو دلچسپی دکھائی وہ روز قیامت تک ان کی اُردو دوستی کی شاہد رہے گی۔

غرض کہ ان تمام باتوں سے ہندوؤں کی اُردو دوستی مسلم ہے لیکن افسوس ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل وعقد نے اپنے ہندو منشیوں کو اُردو کو ہندی رسم الخط میں لکھنے کا حکم دے کر ایک بڑا زہریلا بیج بویا اور غدر کے بعد راجہ شمبھو پرشاد اور بھارتیندو ہریش چندر ہندی کے فروغ کی تحریک سے اپنے دامن کو وابستہ کر کے اردو کے در پئے آزار ہو گئے اگرچہ لطف کی بات یہ ہے کہ اول الذکر ایک اردو کتاب کے مصنف اور ثانی الذکر اردو کے اچھے شاعر تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ غدر کے بعد ہندوؤں میں انگریزی کے انصاف پسندی کے اعتقاد نے قومیت اور وطنیت کے جذبے کی تخلیق کی اور میک مولر اور اینی بزانٹ کی تحریروں نے جن میں انہیں ان کے شاندار ماضی کی یاد دلائی جاتی تھی اس جذبے کو اور ابھار دیا مگر دیانند سرسوتی وہ شخص تھا جس نے مقدس قدامت کا واسطہ دے کر اسے بالکل مستحکم کر دیا۔ اب ہندو سماج کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو کو جسے وہ غلطی سے مسلمانوں کی زبان سمجھ بیٹھے تھے بالکل مٹا دیا جائے چنانچہ سب سے پہلے اس تحریک کا بیج بہار میں بویا گیا مگر اس کے پھل یو۔ پی میں پھوٹے اور اگرچہ سرسید نے اس کی مخالفت کی لیکن لفٹننٹ گورنر سر میکڈانلڈ کی کوششوں سے آخر ہندی سرکاری زبان قرار دے دی گئی اور اس کے بعد ہندوؤں کی مذہبی تحریکات شدھی اور سنگھٹن نے جن کا مقصد ہندوؤں کی تنظیم اور تقویت اور ہندو مذہب کی تبلیغ تھا ہندی کی تحریک کو اور آگے بڑھایا۔ ایک زمانہ تھا کہ نظیر اکبرآبادی نے ہولی' بسنت اور دیوالی پر نظمیں لکھی تھیں اور ہندو شعراء اپنے رسم و رواج اور تہوارات اور معتقدات کو تو خیر نظم کرتے ہی جیسا کہ ان کی سماجی نظموں اور طالبؔ اور بیتابؔ کے ڈراموں سے ظاہر ہے لیکن انہوں نے نعتیہ نظمیں بھی لکھ کر باہمی رواداری کی مثال قائم کی تھی۔ مگر اب یہ حالت ہو گئی کہ ہندی ادیب عربی فارسی الفاظ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر خارج کرنے اور ان کی جگہ سنسکرت کے تت سم یعنی اصلی الفاظ کو دینے لگے اور جب اس جھگڑے نے زور پکڑا تو آخرکار انڈین نیشنل کانگریس نے یہ قرارداد منظور کی کہ ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہو گی جس سے شمالی ہند کے عوام کی بول چال کی زبان مراد تھی لیکن بھارتیہ' ساہتیہ پرشد کے ناگپور کے اجلاس کے موقع پر گاندھی جی نے اسے ہندی ہندوستانی بنا دیا اور ان کے بعد یہ ہندی یا ہندوستانی کی شکل بدل کر آخرکار خالی ہندی رہ گئی ہے جیسا کہ رسالہ ہنس کی تحریروں سے جو ہندی ساہتیہ سمیلن کا پرچہ ہے اور مختلف کانگریسی لیڈروں کی تقریروں سے ظاہر ہے لیکن یہاں ایک یہ امر قابل غور ہے کہ فی زمانہ ہندی میں بھی ادب کافی مقدار میں موجود ہے اور اب ہندی اور اُردو بالکل مختلف زبانیں بن چکی ہیں جس کی وجہ سے رستم اور بھیم جیسے مہابلی بھی اب انھیں ایک دوسرے کے قریب لانے میں ناکامیاب رہیں گے البتہ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ باہمت اشخاص کا جن کے دلوں میں کچھ قومی درد موجود ہے، یہ کام ہونا چاہئے کہ وہ دونوں زبانوں کے الفاظ کا جائزہ لے کر ایسے الفاظ معلوم کریں جنھیں ان دونوں کا مشترک سرمایہ قرار دیا جا سکے تاکہ اس بنیاد پر ایک نئی قومی زبان تعمیر کی جائے۔

بلبیر پرشاد بھٹناگر

اُردو اور ظرافت

ظرافت صحت بخش زندگی کی علامت ہے اس لئے زندہ ادب ظرافت نگاری سے خالی نہیں ہوتا ۔ مغرب کی متمدن زندگی میں سنجیدہ ظرافت کا ایک خاص مقام ہے اس لئے ان سے ادب میں نہ صرف ظرافت نگاری کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے بلکہ اصولوں اور ضابطوں کے ذریعے مذاق اور پھوہڑ پن میں حد فاصل بھی قائم کردی گئی ہے ۔ اردو ادب میں بہ حیثیت مجموعی مزاحیہ ادب بہت کم ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظرافت کا قدیم اسلوب ہمارے موجودہ معیار پر پورا نہیں اترتا ۔ اس کے علاوہ ایک زمانے تک ناسازگار ماحول نے ہمارے ادیبوں پر قنوطیت کا رنگ غالب کردیا تھا ۔ یاس انگیزی اور غمگینی ان کے آرٹ کے بنیادی عناصر بن گئے تھے ۔ اُردو کے بعض قدیم قصوں میں قدیم انداز کی ظرافت ملتی ہے ۔ داستان امیر حمزہ، قصۂ حاتم طائی، فسانۂ عجائب، قصہ چہار درویش وغیرہ ہیں ۔ کہیں کہیں ہنسانے کی کوشش کی گئی ہے ۔

ادب اُردو کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ظرافت کے ایک مخصوص طرز کو ریختی کے ذریعے سب سے پہلے پیش کیا گیا ۔ یہ کہنا مشکل ہے ریختی کو ظرافت کہا جاسکتا ہے یا نہیں بہرحال یہ شاعر کی ایک غیر فطری آواز ہوتی تھی ۔ شاعر اپنے آپ کو عورت سمجھ کر الٹی گنگا بہاتا تھا ۔ ممکن ہے اس دیوانے پن پر اس وقت کا معیار پسند ہنس دیتا ہو ۔ ظرافت کی ایک قسم ہمیں قدیم زمانے میں زٹل کے نام سے ملتی ہے جس کے لئے جعفر زٹلی کا نام اب تک مشہور ہے ۔ جعفر زٹلی ایک پیشہ ور شاعر تھا جس نے اپنی اس قسم کی شاعری کو ذریعۂ روزگار بنایا تھا ۔ ظرافت کی ایک اور شکل اس زمانے میں ایہام گوئی تھی ۔ یہ ایک لفظی صنعت تھی جس میں ذومعنی الفاظ استعمال کئے جاتے تھے ؎ اب دین ہوا زمانہ سازی آفاق تمام دھر یا ہے

شاہ حاتم سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں ظرافت کی حقیقی روح کو پیش کرنے کی کوشش کی ۔ ریختی، زٹل اور ایہام گوئی سے ہٹ کر انھوں نے ظریفانہ رنگ میں شعر کہے لیکن ظرافت کے حقیقی مقام کے تعاقب میں وہ بہت پیچھے رہ گئے اور ؎ حق میں عاشق کے تجھ سیاں کا بچن قند ہے نیشکر ہے، شکر ہے جیسے اشعار ان کی بیاض میں ملتے ہیں ۔

سوداؔ کا نام قدیم ظرافت نگاروں میں سرفہرست لکھا جاسکتا ہے لیکن سوداؔ کی ظرافت کی بنیاد "ہجو" تھی ۔ ہجو سے ہٹ کر ظرافت میں ان کا کوئی مقام نہیں ۔ ان کے ہجویہ کلام کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی ہر نظم کو قبولیت عامہ کی سند مل جاتی تھی ۔ سوداؔ کے اس رنگ نے اُردو پر اپنا دیرپا اثر ڈالا اور ہجو اردو شاعری میں ایک مستقل ظریفانہ صنف کے طور پر داخل ہوگئی ۔ لیکن جہاں تک ان کی ہجویہ نظموں کا تعلق ہے، ان کو شخصیات کی تلخی نے بے مزا بنادیا ہے ۔ وہ فتح کے غرور میں اس قدر پست ہو جاتے ہیں کہ ان کو اپنا شاعرانہ مقام بھی یاد نہیں رہتا ۔ بہرحال شخصیات کے داخلی اور تنگ دائرے میں بھی جب ان کی نگاہیں خارجی ماحول پر پڑتی ہیں تو ان کی شوخی اپنے لئے فطری ماحول پاکر خوب چمکتی ہے ۔ اپنے مشہور گھوڑے کی رفتار کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگائیے ؎

پھیے اسے لگا ڈکہ تا ہووے یہ رواں ۔۔۔ یا بادبان باندھ، پون کے دو اختیار

کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا، تجھ سے کیا گناہ ۔۔۔ کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

میرؔ قنوطیت کا امام ہے ۔ اس کے ہر شعر میں حزن ملال کروٹیں لیتا دکھائی دیتا ہے لیکن آنسوؤں کی اس برسات میں کبھی کبھی وہ قہقہے کی بجلی بھی چمکا دیتا تھا ۔ مرغ بازوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں ؎ آدمی جو بڑے کہاتے ہیں مرغ مارے بغل میں آتے ہیں

ان نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے ۔۔۔ ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے

مرغ کی ایک پرفشانی ہے ۔۔۔ ان کی صد رنگ بدزبانی ہے

ظرافت کی یہ بنیادیں اگرچہ بہتر مستقبل کی ضمانت نہیں تاہم ان سے اصلاح اور نشوونما کی ایک توقع ضرور تھی لیکن بعد کو ماحول نے اسے اس کے برعکس کردیا۔ ابتذال اور چھچھورے پن کی گرم بازاری ہوگئی ۔ ممکن ہے یہ اس معاشرت کا نتیجہ ہو جس سے اُردو ادب گزر رہا تھا۔ شاعرانہ نوک جھونک، شخصی مخالفت، خودبینی، ان سب عیبوں نے دماغی توازن کو بگاڑ دیا اور ظرافت سے سنجیدگی کا عنصر بالکل غائب ہوگیا، جرأت، مصحفی، انشا اور رنگین یہ سب باہمی نقطی پیکار میں الجھ گئے اور زندگی اور ادب کی بجائے ان پر ذاتیات کا رنگ بڑھ گیا ۔ جرأت ظریف بھی تھے اور ستم ظریف بھی۔ اندھے بن کر انہوں نے جو کچھ کیا وہ سب کو معلوم ہے لیکن ان کی ظرافت اور ستم ظریفی، دونوں کا تعلق محض ان کی داخلی زندگی سے ہے ۔ ادب میں انہوں نے اس کے کوئی دیرپا نقوش نہیں چھوڑے انشا کی ظرافت اور ان کی زندگی کا انجام ایک افسانے کے رنگ میں اُردو ادب کے ہر متعلم کو معلوم ہے ۔ لیکن ان کی ظرافت بھی ان کی ادبی تخلیق سے زیادہ ان کی زندگی کے واقعات اور لطیفوں میں ہے ۔جہاں انہوں نے ظرافت کے رنگ میں شعر کی طرف رخ کیا ہے وہاں وہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔

اُردو ادب کی ابتداء سے لے کر اس دور تک ظرافت سے منہ چڑانے کا کام لیا گیا یا پھر اس کے ذریعے دل کی بھڑاس نکالی گئی زندہ دلی کا اجتماعی تصور، اس انفرادی تسکین کے مقابلے میں نشوونما نہ پاسکا۔ لیکن بہت جلد ہمیں نظیر اکبرآبادی کا نام ملتا ہے جس نے ادب سے ذاتی تسکین کے مقصد کو خارج کرنے کی کوشش کی اور سماجی ضمیر کے بیدار کرنے کے لئے اردو میں عوامی شاعری کی بنیاد ڈالی ۔ ایک حقیقی ماحول سے جہاں زندگی اپنے اصلی روپ میں بے نقاب ہوتی ہے زندہ دلی کو خارج نہیں کیا جا سکتا ؎

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیہہ سے ۔۔۔ یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے ۔۔۔ ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

ظرافت کی یہی سنجیدگی ہے جو دلوں کو گدگداتی ہے ۔ اس کے بعد غالب کو آپ حالی کے لفظوں میں "حیوان ظریف" کہہ لیجئے تو کہہ لیجئے لیکن ان کی ظرافت بھی، ایک سنجیدگی سے کم نہیں معلوم ہوتی اس لئے اس کو ظرافت نگاروں کی صف میں کھڑا کرنا ستم ظریفی ہوگا۔

اس کے بعد تک ہمیں کوئی ایسا مزاحیہ نقش نہیں ملتا جس پر نگاہیں رک سکیں تا آنکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے زندگی کی طرح ادب میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ ادب کی دوسری صنفوں کی طرح ظرافت اور مزاح کا رنگ بھی نئے سانچوں میں ڈھلنے لگا ۔ قدیم انداز ظرافت کے برخلاف اب یہ سمجھا جانے لگا کہ ظرافت، زندگی کی ایک طنزیہ تنقید ہوتی ہے ۔ ظرافت نگار یا مزاحیہ نگار کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ سرکس کے مسخرے کی طرح قلابازی لگائے یا مکار عورت کی طرح دشمن کے سامنے ناچنے لگے بلکہ وہ منہ بگاڑے بغیر ایک ایسا منتر پڑھتا ہے جس کے اثر کو غیر شعوری طور پر انسانی ذوق قبول کرے ۔ ادبی ظرافت کا مقصد ذاتی طمانیت یا تماشا گری نہیں بلکہ وہ زندگی اور سماج کی کمزوری تک رسائی اور اس پر ایک خوش گوار تنقید کا نام ہے ۔یوں کہنا چاہیئے کہ اب مزاح اور ظرافت کا مفہوم طنز لطیف ہے ۔غرض خود بینی، حسد اور شخصی مخالفت کی بجائے ایک وسیع النظری اور نیک نیتی ہی ظرافت کو اس کے صحیح مقام پر پیش کر سکتی ہے ۔میرے ایک دوست نے صحیح کہا ہے کہ :۔

" ظریف وہی ہے جو ہنستا ہنساتا ہو تو یہ محسوس ہو کہ وہ جان بوجھ کر ہمارے شعور اور احساس پر کوئی وار کر رہا ہے اس کا ہنسنا ہنسانا خندۂ بے محل نہ معلوم ہو، اس کی ظرافت دلوں میں یہ احساس پیدا کردے کہ زندگی ایک خندۂ مسلسل نہ سہی لیکن زندگی کے بے شمار آنسوؤں کو

مسکراہٹوں میں جذب تو کیا جاسکتا ہے۔

اُردو ادب کے دورِ جدید میں ہمیں محمد حسین آزاد کی تحریروں سے جدید طرزِ ظرافت کی ابتدائی جھلکیاں نظر آتی ہیں تذکرۂ آبِ حیات میں ان کے مخصوص رنگ نے جہاں شاعروں کی زندگی کے ظریفانہ رخ کو پیش کیا ہے وہاں ایک سنجیدہ ظرافت انگڑائی لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے حالی بھی ایک سنجیدہ واعظ کی ہلکی مسکراہٹ بن کر کہیں کہیں نمودار ہوئے ہیں لیکن ان کی یہ لہر ایک تیز رفتار بجلی سے زیادہ نہیں جو بہت جلد غائب ہوجاتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کو البتہ ہم جدید مزاحیہ ادیب کے نقیب کی حیثیت سے پیش کرسکتے ہیں۔ ان کے کلام میں لطیف طنز کا ایک سیلاب ہے، جو اپنی شوخیوں اور رنگینیوں کو لئے آگے بڑھ رہا ہے اور جیسا کہ میں ایک دفعہ کہہ چکا ہوں "انہوں نے سماج کو اس طرح ہنسایا کہ دل رونے لگا۔"

اس ڈنر میں کھا گیا اتنا کہ نکلی تن سے جاں　　خدمتِ قومی میں بارے جاں نثاری ہوگئی

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں　　یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

میں بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ　　علمی مباحثے ہوں ذرا آکے پاس لیٹ

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں　　کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ایسے ہزاروں شعر ہیں جن کو دو دھاری تلوار کہنا چاہئے۔ یہ تبسم کے ساتھ ہونٹوں پر لہراتے ہیں اور دل کی دھڑکن بن کر آنکھ سے آنسو ٹپکاتے ہیں۔ اکبر کی ظرافت کا یہ اعجاز ہے۔

نثری مزاحیہ ادب کا حقیقی دور نذیر احمد سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں کے اسلوب میں ایک سنجیدہ بے تکلفی ہے۔ وہ تلخ حقائق پر سے مسکراتے ہوئے نقاب اٹھاتے ہیں اور اس طرح اٹھاتے ہیں کہ دیکھنے والے مسکراتے مسکراتے اپنی صورت اپنے آئینے میں دیکھ لیں۔ ان کی تحریر کونین کی گولی ہوتی ہے۔

"باورچی خانے یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے، آدھ گھنٹے کھڑے کھڑے داڑھی مونچھ سنوار آہستہ سے عمامے کو ذرا اور جما لیا، چغے کے دامن سمیٹے اور بڑے مقطع بن کر ہاتھ باندھے نیچے نظریں کئے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف بڑھے۔ خدمت گار اور اردلی، چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر ہی تاڑ لیا تھا۔ کوٹھی کے پاس آتے دیکھ اِدھر اُدھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے اٹھانے کی آوازیں ہیں کہ چلی آتی ہیں۔ مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ہمت کرکے بے بلائے اوپر پہنچے۔ کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں۔ لوٹ چلیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں، شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کا اور اردلی کے لوگوں کا حال معلوم ہوگا۔ وہ لپک کر دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا اور ادھر کو رخ بھی نہ کیا غرض کوئی آدھے گھنٹے اسی طرح کھڑے سوکھا کئے۔ بارے خدا خدا کرکے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لئے نمودار ہوا۔ کیا کریں اپنی غرض کے لئے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور عزت کو بالائے طاق رکھ کر آپ منہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا، کیوں جمعدار کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے۔ بس اس کو ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر۔ مگر میں جانتا ہوں ادب اور ڈر تو خاک نہیں۔ صرف اسی بات کا لحاظ کہ شہر کی

فوجداری پر ہے"۔ خدا جانے کب موقع آپڑے۔ چار و ناچار اچھلتا ہوا اسلام کر کے جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہے اس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے ملاقات تو شائد ہی ہو سکے"

نذیر احمد کے بعد اُردو ادب میں سنجیدہ ظرافت اور مزاح نگاری کے کوئی ایسے نقوش نظر نہیں آتے جن کو نمایاں کہا جا سکے۔ البتہ جب اودھ پنچ اخبار نکلنے لگا تو اردو ادب میں مزاح نگاری نے ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر لی۔ اکبر الہ آبادی کی نظمیں اور منشی سجاد حسین کے مزاحیہ مضمون اسی اخبار کے توسط سے مقبول ہوئے۔

اُردو مزاحیہ ادب کے جدید دور میں رشید احمد صدیقی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ان کو مزاحیہ نگار سے زیادہ طنز نگار کہنا درست ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں طنز ہی تنقیدی مزاح کے معیار کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ رشید احمد اپنے مطالعہ، مشاہدے اور ذوق نظر کے باعث موجودہ مسائل پر اس طرح طنز کرتے ہیں کہ شوخی اور سنجیدگی کا ایک خوش گوار امتزاج ہو جاتا ہے۔ واقعاتی تسلسل یا اپنے مرکزی تخیل کے گرد گھومنے کی بجائے وہ اپنے خیالات کے مختلف مسائل اور زندگی کی تصویر کے مختلف پہلوؤں کو مربوط انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ تنوع کے ذریعے غایت کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ کو پھیر لیتے ہیں۔ ان کی تحریر کے پیچھے واقعاتی پس منظر کام کرتے ہیں۔ وہ صرف ہنساتے نہیں بلکہ اپنے پختہ اسلوب کے ذریعے دعوت فکر و نظر بھی دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں پر آرنلڈ کا وہ مشہور قول صادق آتا ہے کہ ادب زندگی کی تنقید ہے۔

رشید احمد کے بعد ہم پطرس کا نام لے سکتے ہیں۔ یہ آواز کی دنیا میں اب کچھ اس طرح گم ہیں کہ ان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ان کی خاموشی سے اُردو ادب ایک ممتاز ظریف ادیب سے محروم ہو گیا۔ ان کے بعض مزاحیہ مضمون ظرافت کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ پطرس کو میں ایک لحاظ سے رشید احمد پر ترجیح دوں گا۔ پطرس، پیچیدہ راہوں پر نہیں لے جاتے اور نہ پیشانی پر شکنیں لاتے وہ اپنی بے ساختگی سے ہنسی کو متعدی بنا دیتے ہیں۔ لیکن مسائل تک پہنچنے میں وہ رشید احمد کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اور ایک ادیب کا نام میں بغیر جھجکے لوں گا۔ یہ ادیب خاموشی سے کام کر رہا ہے۔ محمد فضل الرحمن کے ڈرامے آپ پڑھیے ان میں جگہ جگہ طنز لطیف اور شستہ ظرافت کے ایسے نمونے ملیں گے جن کو اُردو کے مزاحیہ ادب میں بلند مقام دیا جا سکتا ہے۔ وہ سماجی کمزوریوں پر ہنستے ہوئے اور ہنساتے ہوئے وار کرتے ہیں۔ مکالموں میں بعض وقت وہ لفظوں کے الٹ پھیر سے بلند طنز کا اس طرح کام لیتے ہیں، سنجیدگی، ظرافت اور ظرافت سنجیدگی معلوم ہونے لگتی ہے اور پڑھنے والا سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ ہنسے یا غور کرے۔

ان ادیبوں کے علاوہ برگشتہ (سید محمد اکبر وفا فانی) ناکارہ حیدر آبادی، شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کا شمار بھی مزاحیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ بھی مزاح نگار کہے جا سکتے ہیں۔ برگشتہ اور ناکارہ .. ظرافت کے بعض اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ شوکت تھانوی تو مزاح نگار کی حیثیت ہی سے مشہور ہیں ان کی "سودیشی ریل" ہمیشہ چلتی رہے گی۔ عظیم بیگ چغتائی کو ان کی بلانوسی نے مشہور تو کر دیا لیکن دوڑ کے شوق میں وہ اپنی چال کو نباہ نہ سکے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کو میں ماضی کی آواز کہوں گا۔ وہ ماضی کے سہارے جیتے ہیں اور ان پر ان کی زبان اور اسلوب اس قدر چھایا ہوا ہے کہ جدید ادب کے تنقیدی اصول کی طرف وہ توجہ نہیں کرتے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ واقعاتی کشش اور اسلوب کے بے ساختہ پن سے ہنسا ضرور دیتے ہیں۔ ان سب ادیبوں سے الگ ملا رموزی نے "گلابی اُردو" کے نام سے مزاح نگاری کا ایک طرز اختیار کیا۔ یہ "ایجاد بندہ" اپنے نئے پن کے باعث کچھ دنوں تک تمسخر کا سامان فراہم کرتی رہی لیکن ذوق کی پاکیزگی نے اس کی پذیرائی نہیں کی۔ اب کچھ دنوں سے ہم نوجوان بیدی کو بھی ایک اچھے طنز نگار کی

حیثیت سے سُن رہے ہیں۔ یہ اُن کی ابتدا ہے اس لئے ان کے متعلق فی الوقت کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی لیکن ان کی یہ اٹھان بتاتی ہے کہ وہ ایک بلند مستقبل کے مالک ہوں گے۔ ظرافت چونکہ ایک فطری چیز ہے اس لئے سنجیدگی کے پرُسکون سمندر میں بھی بعض وقت ظرافت کی لہریں اٹھتی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کے وہ شعر جن میں اکبرالہ آبادی کے قہقہوں کی آواز بازگشت سنائی دیتی۔ مصدرعم راشدالخیری کی "نانی عشو"، خواجہ حسن نظامی کی بعض تحریریں امتیاز علی تاج کا "چچا چھکن"۔ ان سب میں ظرافت اور طنز کے بعض اچھے نمونے ہیں۔

اُردو مزاحیہ ادب کا یہ ذخیرہ حوصلہ افزا نہیں۔ لیکن جب ہم ہندوستان کی قنوطیت پسندی اور یاس انگیزی پر غور کرتے ہیں تو ایک مضبوط محاذ کے خلاف، یہ چند حملے بھی ہمیں غنیمت معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے تو اس حزن اور یاس کے دبیز پردوں کو چاک کرنا ہے جس کے پیچھے ہماری افسردہ زندگی پل رہی ہے جب آنسو سوکھ جائیں گے تو ہونٹوں پر تبسم کی لہریں خود اٹھیں گی اور ہمارے ادیب یہ محسوس کریں گے کہ زندگی صرف آنسو نہیں ہے۔

میکش

گریہ و تبسم۔ صاحبزادہ میکش کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکش حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالی جناب ڈاکٹر زورؔ صاحب کا دیباچۂ عمومی اور جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔
صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر سنہری نام قیمت دو روپے

انوار۔ حضرت علی اختر حیدرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرُگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر اُن کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر اُن کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوشؔ کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے اُردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔
صفحات (۱۲۸) قیمت عہر۔

نمود زندگی۔ جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں ۱۰۱ نظمیں ۷۱ غزلیں اور ۵ رباعیات ہیں۔ سید علی منظور صاحب حیدرآباد کے پختہ مشق مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدردان دور دور پھیلے ہوئے ہیں اُردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپتی ہوں اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالے میں نقل کی جاتی ہیں۔ علی منظور صاحب عہد حاضر کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی صحیح ترجمانی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔
صفحات ۲۱۲ قیمت عہر۔

یہ مصرع کہ ع " ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں" پیش کر کے ولی کی ولایت پر مہر لگا دی ہے۔ خود ولی کو بھی اپنے شاعرانہ کمال کا پورا پورا یقین تھا اور بالآخر ان کو یہ لکھنا پڑا کہ ؎ ولی ایران و توران میں ہے مشہور اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

زمانہ کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ان کے نام، وطن اور تاریخ پیدائش اور وفات کے متعلق ہمیشہ چہ میگوئیاں ہوتی رہیں لیکن جدید تحقیقات نے اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کا نام ولی محمد تھا اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ عنفوان شباب میں تعلیم و تربیت کی غرض سے احمد آباد گئے تھے۔ ۱۱۱۲ھ میں دلی کا سفر کیا اور ۱۱۱۹ھ میں احمد آباد، گجرات میں وفات پائی۔

ولی اُردو کے ایک قادر الکلام، کہنہ مشق اور پُرگو شاعر تھے۔ ان کے کلام کا ایک ضخیم کلیات انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شایع ہو چکا ہے۔ اب ولی کی شاعری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں ؎

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

سجن نے یک نظر دیکھا نگاہ مست سوں جس کوں
خرابات دو عالم میں سدا ہے وہ خراب اس کا

مرا دل پاک ہے از بس ولی زنگ کدورت سوں
ہوا جیوں جوہر آئینہ مخفی پیچ و تاب اس کا

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یو آگ بجھاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر جاتا ہے ولی دایم
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

مجھ کو تجھ بن کسی سے کام نہیں
فکر ناموس و ننگ و نام نہیں

زندگی نام عشق ہے لیکن
فائدہ کیا اگر مدام نہیں

عشق اس کا ہے ناتمام جسے
پی کی خاطر کا اہتمام نہیں

اگرچہ ولی کے دیوان میں غزلیات کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن انھوں نے قصیدہ، قطعہ، رباعی، مخمس اور مثنوی وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی دو طویل مثنویاں "در فراق گجرات" اور "در تعریف سورت" بہت مشہور ہیں۔

اس دور کی دوسری نامور ہستی حضرت شاہ سراج اورنگ آبادی کی ہے جو ۱۱۲۵ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق سادات حسینی کے ایک محترم گھرانے سے تھا۔ ان کے والد سید درویش نے سراج کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا۔ ابھی بارہ سال کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ جذب کا عالم طاری ہوا اور حضرت شاہ برہان الدین غریب کے مزار پر بیٹھے رہنے لگے۔ سات سال تک یہی حالت رہی جب حالت جذب میں کچھ افاقہ ہوا تو شاہ عبدالرحمن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کی ۱۱۶۱ھ میں ان کے مرشد نے وفات پائی تو اس کے کچھ عرصہ بعد ہی سراج نے ترک لباس کر کے فقیرانہ زندگی بسر کرنی شروع کی۔ شاہ سراج کو بچپن ہی سے شعر و سخن کا فطری ذوق تھا اور ۱۱۵۲ھ تک پانچ ہزار اشعار کا ایک دیوان مرتب ہو گیا۔

اردو شاعری اور خصوصاً صنف غزل کو مقبول بنانے میں ولی کے بعد سراج کا درجہ ہے چنانچہ سراج خود کو ولی کا جانشین سمجھتے تھے اور اپنے ایک شعر میں اس کا اظہار بھی کیا ہے کہ ؎ تجھ مثل اے سراج بعد ولی کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

سراج نے ایک مثنوی "بوستان خیال" میں اپنی آپ بیتی کو بیان کیا ہے۔ انھیں ایک لالچی کے لڑکے سے گہری دوستی ہو گئی تھی۔ اس مثنوی میں اپنی داستان محبت کو نہایت درد انگیز انداز میں پیش کیا ہے ۱۱۷۷ھ میں بتاریخ ۴ شوال یوم جمعہ اورنگ آباد میں انتقال کیا اور شاہ چراغ کے تکیہ میں مدفون ہوئے ان کے چہیتے شاگرد اور مرید خاص ضیاء الدین پروانہ نے مرشد کے مزار پر بعد کو گنبد تعمیر کرایا۔ حسب ذیل اشعار سے سراج کے شاعرانہ کمال کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی ! — نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی — نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

میرے جگر کے درد کا چارہ کب آئے گا — یک بار ہو گیا ہے دوبارہ کب آئے گا — تیلی ہماری نین جھروکے میں بیٹھ کر — بے کل ہو جھانکتی ہے پیارا کب آئے گا

اس مشتری جبیں کا مجھے غم ہوا زحل — طالع مرے کا نیک ستارہ کب آئے گا

ولی اور سراج کے تذکرہ کے بعد چند اور مشہور شاعروں کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس دور کی خصوصیات پر روشنی پڑ سکے۔

محرم | محمد شاہ نام محرم تخلص، نواب شجاعت خاں صوبہ دار کے فرزند تھے۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ خوش فکر اور خوش مذاق تھے اس لئے تھوڑی مدت میں شعر گوئی میں نام پیدا کیا۔ فارسی شعر بھی کہتے تھے۔ ۱۱۶۶ھ میں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام ؎

نزاکت بس کہ رکھتا ہے وہ دلدار جہاں آرا — صفائی آئینہ ہے یار اس کے عکس عالی کا

بہار آوے تو بلبل کو قفس میں قید مت کرنا — نوا لیا ظلم اس بیکس پہ اے صیاد مت کرنا

ایما | میر بخشی عاشق علی خاں ایما خوش حال خاں قاقشال کے نواسے تھے۔ نانا کے انتقال کے بعد منصب و خطاب خانی سے سرفراز ہوئے۔ طبیعت شوخ پائی تھی۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بہت اچھی مہارت تھی۔ ۱۱۷۲ھ میں انتقال ہوا۔ ان کا ایک شعر بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے ؎

طبیب عشق سیں پوچھا زلیخا نے علاج اپنا — کہا تجھ پر بھلا ہے سورۂ یوسف کا دم کرنا

داؤد | مرزا داؤد نام تھا اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ولی کے شاگرد تھے اس لئے ان کے کلام میں ولی کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ چنانچہ داؤد نے بعض اشعار میں ولی اورنگ آبادی کا ذکر کیا ہے مثلاً ؎ کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعر کو سن کر — تجھ طبع میں داؤد ولی کا اثر آیا

بعد از ولی ہوئے ہیں کئی شاعر ولیکن — داؤد شعر تیرا مشہور ہے دکن میں

داؤد اپنے کو ولی کا جانشین سمجھتے تھے اور اس کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎ حق نے بعد از ولی تجھے داؤد — صوبۂ شاعری بحال کیا

لچھمی نارائن شفیق نے اپنے تذکرۂ چمنستان شعرا میں ان کے حالات اور وفات کا قطعۂ تاریخ لکھا ہے۔ جس سے ۱۱۶۸ھ نکلتی ہے۔ قطعہ یہ ہے ؎

بلبل گلزار معنی طوطی رنگین بیان — از غم آباد جہاں بگذشت چوں تیر از کماں — مصرع تاریخ فوتش گفت بامن ہاتفے — گو برفتہ میرزا داؤد از فانی جہاں

ایک چھوٹا سا قلمی دیوان یادگار چھوڑا ہے جس میں تقریباً پانچ سو اشعار ہیں یہ نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں ؎ مرا احوال چشم یار سے پوچھ — حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ — اس صنم کے خیال ابرو نے — ناتواں مجھ کو جوں ہلال کیا

قانون شفا نطق میں ہے یار کے موجود — اے دل نہ ہو محتاج طبیباں کے دوا کا

عاجز | عارف الدین خاں عاجز اورنگ آباد کے مشاہیر شعرا سے ہیں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی ایک مثنوی "لعل و گوہر" بہت مشہور ہے ان کا اردو دیوان سنگلاخ زمینوں اور مشکل مضامین کی وجہ سے مشہور ہے۔ آخری عمر میں ناندیڑ میں مقیم تھے کہ ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔ انھوں نے خود ہی اپنے نام عارف الدین خاں عاجز سے اپنی تاریخ وفات نکالی تھی۔ وہ نہایت ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎ چمن میں جا کے وہ رنگیں ادا جب مسکراتا ہے — گلوں سے رنگ اڑ کر لال سا جنگل کو جاتا ہے

ہمارا اشک خونیں یاد میں گل رد کے بہہ بہہ کر — نگہ کو رشتۂ تسبیح یاقوتی بناتا ہے !

عاشق وحشی کی گر تصویر کھینچا چاہئے — اول اس کے پاؤں میں زنجیر کھینچا چاہئے

چمن میں چل کے سجن بے حجاب ساغر کھینچ — بہار رنگ گلستاں کے سر سبں چادر کھینچ

کمتر | مرزا مغل کمتر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں تربیت پائی۔ فارسی اور اُردو میں شعر کہتے تھے۔ سراج اورنگ آبادی سے تلمذ تھا ۱۱۸۳ھ میں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام کے لئے صرف دو شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

ذرا تو لگ گلے ساقی ہے موسم بے حجابی کا — کہ جاری فیض بارش سیں ہوا چشمہ گلابی کا

مجھے اس بات پر کمتر تعجب سخت آتا ہے — مرے رونے پہ ہنسنا قہقہہ کر کر گلابی کا

عشرت | خواجہ ابو البرکات خاں عشرت اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شعر و سخن کی طرف توجہ کی۔ طبیعت موزوں اور فکر رسا پائی تھی تھوڑے دن میں چمک گئے اور مشہور شعرا میں شمار ہونے لگا۔ سراج اورنگ آبادی کے شاگرد تھے ۱۱۸۰ھ میں بمقام اورنگ آباد انتقال کیا۔ ان کے چند شعر یہ ہیں ؎

گلشن دل میں اگر سرو خراماں گزرے — رشک خونی سے گلستان میں طوفان گزرے

کیا ہوا حاصل تمہیں توڑے سے اس مفلس کا دل — ہاتھ آتا زر اگر تم توڑتے نرگس کا دل

سامی | سید غلام قادر سامی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل اور شعر و سخن کا ذوق پیدا کیا اور قادر الکلام شاعر بن گئے۔ تمام شہر میں ان کے کلام کی دھوم تھی شاگردوں کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ درویش صفت اور با اخلاق بزرگ تھے۔ متعدد امراء ان کے معتقد اور شاگرد تھے ۱۱۹۶ھ میں انتقال کیا اور اورنگ آباد میں دفن ہوئے۔ ان کے دیوان کے متعلق تذکرۂ محبوب الزمن جلد اول میں عبد الجبار ملکاپوری نے لکھا ہے۔ "آپ کا دیوان و قصۂ سرو شمشاد میرے کتب خانۂ نوادر میں موجود تھا ۱۳۲۶ھ کی طغیانی میں کتب خانہ کے ساتھ نذر آب تلف ہوگیا۔ کتب خانۂ آصفیہ و کتب خانۂ سالار جنگ میں دیوان و قصہ کو تلاش کیا نہیں پایا"

حسن اتفاق سے ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں سرو شمشاد کا قصہ محفوظ ہوگیا ہے۔ اس کے آغاز کے دو شعر یہ ہیں ؎

کیا یک تازہ جشن بادشاہی — درخشاں شب کو نور صبح گاہی

ہزاروں شمع اور قندیل روشن — زمین و آسمان گلزار و گلشن

اب ایسے شاعروں کو پیش کیا جاتا ہے جو ۱۲۰۰ھ کے بعد بھی زندہ تھے۔ ان میں سے چند مشہور یہ ہیں:-

جناب موہن لال اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ کھتری قوم سے تعلق تھا بہت اچھے خوش نویس اور انشا پرداز تھے۔ فارسی اُردو میں شعر کہتے تھے ۱۲۰۲ھ میں وفات پائی نمونۂ کلام یہ ہے

آب آنکھوں سے کم ہوا رو رو — چشمۂ آفتاب کی سوگند

دل سے وسواس دور کر آمل — تجھ کو تیرے جناب کی سوگند

نثار | مرزا محمد خاں نام وزارت خاں خطاب نثار تخلص تھا۔ ابتدائے سن شعور سے شعر کہنا شروع کیا اردو، فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ سراج اورنگ آبادی سے اصلاح لیتے تھے ۱۲۱۲ھ میں انتقال کیا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

نہ ہوتے شور و نالے سے مرے آنسو اگر جاری — نہ صحرا سبز ہو جاتا نہ دریا جوش میں آتا

کیا آتیں چڑھا کر آتا ہے شوخ ہم پر — یہ بانکپن کی طرزیں کس نے سکھائیاں ہیں

بس کہ روتا ہوں تری یاد میں آگوہر حسن — مردم چشم مرا مردم دریائی ہے

شفیق | لچھمی نارائن شفیق لالہ منسا رام کے فرزند تھے۔ ۲ صفر ۱۱۵۸ھ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی طرح تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق پیدا کیا تھا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں صاحب اور فارسی میں شفیق تخلص کرتے تھے انھوں نے کئی کتابیں مثلاً چمنستان شعرا، شام غریباں، گل رعنا، ماثر آصفی اور بساط الغنائم لکھیں۔ پہلی تین کتابوں میں شاعروں کے تذکرے ہیں۔ ۱۲۱۴ھ میں وفات پائی۔

تمنا | اسد علی خاں تمنا اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ آصف جاہ ثانی کے ساتھ حیدرآباد چلے آئے۔ کلیات کے علاوہ دو کتابیں تذکرۂ گل عجائب اور مقالات الغرائب مرتب کیں۔ گل عجائب اردو شاعروں کا تذکرہ ہے جو انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ ۱۲۰۳ھ میں وفات پائی۔

یہ تھی اورنگ آبادی دور کے شاعروں کی مختصر کہانی۔ اگر اس دور کے شاعروں پر کوئی قلم اٹھائے تو ایک مبسوط تذکرہ مرتب ہو سکتا ہے۔

خواجہ حمید الدین

قسمت

غریبی کی گود میں بچپن کے کھلنڈرے دن گزار کر نجمہ جب کچھ ہوش سنبھالنے لگی تب اسے اپنی ہمجولیوں کو سمجھنے اور اپنے ارد گرد کے حالات کو ان کے اصلی روپ میں دیکھنے کی سدھ بدھ ہوئی۔ تو وہ تو جیسے کھوئی گئی۔ جو نجمہ دن بھر کھیل کود میں مگن رہتی تھی، اب کسی تنہا مقام میں سب سے الگ تھلگ بیٹھی کچھ سوچتی رہتی۔ اس کی ماں تاڑ گئی تھی کہ نجمہ کے دل پر یہ کیسی خود فراموشیاں اپنا اثر ڈال رہی ہیں۔ لیکن نجمہ جیسی لاڈلی بیٹی کو وہ کس طرح سمجھا سکتی تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے نجمہ کو کام کاج میں لگے رہنے اور کھیلنے کودنے کے لئے کہتی۔ لیکن نجمہ جیسے بہری ہو، سب کچھ سنتی اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوتی۔ آپ جانئے لڑکیوں کے دل کنول کی طرح پاک اور کومل ہوتے ہیں اور سوچنا۔ اف ..... یہ سوچنا تو جیسے تند و تیز آندھی کی طرح دل و دماغ کی ساری فضاء کو متزلزل کر دیتا ہے۔ گر کوئی نجمہ کے دل سے پوچھتا کہ وہ آخر کس سوچ میں گم ہے۔ اس نے ابھی دنیا کو دیکھا ہی کیا ہے!! ۔ آپ شاید اسے نہ جانتے ہوں لیکن مجھے اس کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ وہ میرے پڑوس میں رہتی تھی اور جب وہ ننھی سی بچی تھی اس وقت سے ہمارے گھر میں اس کا آنا جانا تھا۔ وہ گھٹنوں ہمارے پاس کھیلتی، باتیں کرتی رہتی۔ توفیق میرا ایک بھانجہ تھا۔ وہ بھی اس کا ہم سن تھا نجمہ اور توفیق ایک دوسرے کے بڑے گہرے دوست بن گئے اور ہر کھیل میں دونوں کا ساتھ ہونا ضروری ہو گیا۔ بچپن کا یہ معصوم دلی تعلق۔ کسی کے لئے بھی قابل اعتراض نہ تھا — ہوتا بھی کیوں ؟ ۔ توفیق کو اس کے ماں باپ نے بلا لیا تو وہ بادل ناخواستہ ہمارے ہاں سے چلا گیا۔ نجمہ کو اس کے چلے جانے کا بڑا دکھ تھا۔ لیکن توفیق کو روک کے رکھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ مجبوری کے اس احساس نے اس کے دل پر ایسا گہرا اثر چھوڑا کہ وہ الہڑ اور کھلنڈری لڑکی سے ایک بے جان مورت میں بدل گئی اور اپنے آپ ہی سوچتے رہنے کو زندگی کی اصل غایت سمجھنے لگی۔ میں بھی اس کی اس تبدیلی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ماں سے میں نے ایک دن کہا "دیکھئے نجمہ گہرے پانی کی طرف بڑھتی جا رہی ہے آپ اسے سنبھالئے"۔ اس کی ماں نے مایوس لہجہ میں کہا۔ "بھائی میں تو اپنی سی کر کے ہار گئی۔ وہ تو مانتی ہی نہیں بس جب دیکھو سوچتی رہتی ہے۔ ٹہلتی رہتی ہے..... نہ اسے کھانے پینے کا ہوش ہے اور نہ کپڑوں کی سدھ۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری نجمہ کا کیا ہو گا"۔ اتنا کہہ کر وہ رو پڑیں مجھے بھی بڑا دکھ ہوا۔ میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں نجمہ سمجھدار بچی ہے۔ آج نہیں تو کل ضرور اپنے بھلے برے کو جان لے گی۔ بہتر ہے کہ آپ اسے اپنے حال پر چھوڑ دیں"۔ نجمہ کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ ایک شاعر تھے۔ نجمہ کو اس کی حساس طبیعت اپنے باپ ہی سے ورثے میں ملی تھی۔ شاعر باپ نے اپنی بیوی اور بیٹی کے لئے مال و دولت نہیں چھوڑا صرف انھیں چھوڑ گیا۔ نجمہ کی ماں محنت مزدوری سے اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پالتی تھی — نجمہ اپنی سہیلیوں کو زرق برق کپڑے پہنے ہوئے دیکھتی۔ ان کے قیمتی کھلونے دیکھتی اور اس کا دل اندر ہی اندر اپنی کم مائیگی پر آنسو بہاتا۔ وہ اپنی ماں سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن ماں کی مجبوریاں کسی اس کی زبان بند کر دیتی۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ کر رونے لگتی —۔ مجھے چند دن بعد کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ان دونوں ماں بیٹیوں سے مجھے ایک گونہ دلچسپی پیدا ہو چلی ہے اور کچھ نہیں تو میں اس المیہ کا تماشائی بننا چاہتا تھا، جو قسمت ان کی زندگی کے واقعات سے تیار کر رہی تھی۔ میں حتی المقدور ان کی مشکلوں کو دور کرتا اور نجمہ کی تعلیم کے اخراجات بھی میں نے اپنے ذمہ لے لئے تھے۔ نجمہ اس عرصے میں پھر اپنی دنیا میں واپس چلی آئی۔ وہ ہنسنے بولنے لگی تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ سیر و تفریح بھی کرتی۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ غریبی کے احساس سے بعض وقت اس کی روح کے ہر تار میں جھنکار اٹھتی — اور اس کی آنکھوں میں درد و غم کے آنسو چھلکنے لگتے۔ میں نے اسے کئی دفعہ سمجھایا کہ وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھے۔ اپنا عزیز سمجھے۔ اپنی جو ضرورت ہو مجھ سے بیان کرے لیکن اس نے کبھی اپنی طرف سے پہل نہیں کی۔ وقت گزرتا گیا۔ ہماری زندگیوں میں کوئی خاص انقلاب یا کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہوئی کہ نجمہ اب بچی نہ رہی حسن و شباب کی بہاروں میں وہ ایک نورس کلی کی طرح جھوم رہی تھی۔ کہ اسی زمانے میں توفیق آیا۔

وہ بھی اب اونچا پورا جوان تھا ... توفیق نے نجمہ سے ملنے کی کوشش کی۔ لیکن نجمہ ہمیشہ اس سے کتراتی رہی۔ توفیق نجمہ کی اس بے اعتنائی اور سرد مہری پر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ وہی نجمہ جس نے بچپن کی سہانی گھڑیوں کو اس کے ساتھ کھیل کود میں گزارا اب ایسی بدل گئی کہ بات کرنے کی بھی روادار نہیں ہوتی۔ وہ اس تبدیلی کے اسباب سوچنے لگتا۔ لیکن وہ سوائے اس کے کچھ اور نہ سمجھ سکتا کہ نجمہ اب بہت حسین ہو گئی ہے بہت بڑی ہو گئی ہے۔ بس اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ نجمہ کی ماں نے ایک دن ادھر ادھر کی باتوں کے بعد نجمہ کی شادی کا ذکر چھیڑا۔ کہنے لگیں "کوئی اچھا لڑکا نظر میں ہو تو نجمہ کا خیال رکھو۔" تھوڑی دیر بعد اس نے رکتے رکتے کہا "توفیق اچھا لڑکا ہے۔ نجمہ کو شاید وہ پسند بھی کرتا ہے۔" نجمہ کی ماں سے یہ جملہ سن کر میں عجیب کش مکش میں پڑ گیا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ان کے کہنے سے پہلے ہی میں نے یہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔ اور توفیق کے ماں باپ نے سرے سے انکاری جواب دیا تھا۔ ان کا توفیق لایق اور دولتمند ماں باپ کا بیٹا تھا۔ وہ کسی غریب خاندان سے کس طرح ناتا جوڑ سکتے تھے۔ میں بات کو اس طرح ٹال گیا۔ "آپ توفیق کے بارے میں اتنا اچھا خیال رکھتی ہیں۔ اور وہ ہے بھی اچھا لڑکا۔ لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں کہ شادی اس کے ماں باپ کی مرضی کے بغیر نہ ہو گی اور اس کے ماں باپ نے تو شاید کوئی لڑکی ڈھونڈھ رکھی ہو گی۔" نجمہ کی ماں جیسے ایک دم بجھ سی گئیں۔ مایوس نظروں سے مجھے دیکھا اور چلی گئیں۔ دوسرے ہی دن توفیق کو کسی ضروری کام کے لئے اس کے ماں باپ نے بلا بھیجا اور اس کے بعد توفیق کے خط سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ضروری کام اس کی شادی ہے، جو ایک متمول گھرانے میں طے پائی ہے۔ توفیق نے صرف اپنی شادی کی اطلاع دی تھی۔ میں چاہتا تھا وہ اس شادی سے اپنی ناراضامندی ظاہر کرتا۔ وہ مجھے کچھ کرنے کے لئے کہتا۔ میں نے اس کے لئے کیسے کیسے منصوبے سوچ رکھے تھے۔ میں نے نجمہ کے دل میں اس کے لئے کتنی جگہ پیدا کر دی تھی۔ اس کی کیسی کیسی تعریفیں کی میں نے۔ کیسا طلسم میں نے باندھا تھا، اور یہ توفیق تو بڑا ہی سنگدل نکلا۔ میں نے حتی الامکان اس خبر کو نجمہ سے چھپانے کی کوشش کی۔ لیکن گھر والوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں تو نجمہ کے کان پر بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ ایک دن نجمہ کی ماں میرے پاس آئیں۔ کہنے لگیں "کچھ نجمہ کی بھی خبر ہے آپ کو۔" اور انھوں نے جو نجمہ کا حال سنانا شروع کیا ہے تو میں تو سر تھام کر بیٹھ گیا۔ کہہ رہی تھیں "چند دن سے پھر وہی پرانی سوچتے رہنے کی عادت شروع ہو گئی ہے اور اب تو اس کا اثر ایسا گہرا نظر آ رہا ہے کہ اس کی صحت کے لالے پڑ گئے ہیں کونے میں بیٹھی آنکھیں بند کئے رہتی ہے۔ کبھی کچھ کھا لیا تو کھا لیا نہیں تو ویسی ہی پڑ کر سو رہی۔ اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ کبھی ہنسنے لگتی ہے تو کبھی رو پڑتی ہے۔" "تو پھر اب آپ نے کیا سوچا ہے۔" میں نے دھیمے لہجہ میں پوچھا۔ کہنے لگیں "سوچا کیا ہے۔ یہی کہ اب میں خود زہر کھا کر سو رہوں۔ نجمہ کی ایسی حالت اب مجھ سے تو نہیں دیکھی جاتی۔" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ذرا ایک بار توفیق کے ماں باپ سے مل آتا ہوں۔ پھر اس کے بعد کوئی نہ کوئی ترکیب سوچ نکالیں گے۔" میں توفیق کے ماں باپ سے مل کر کیا کرتا؟ وہ تو دولت کے پجاری تھے انھیں دلوں کی نزاکتوں کا کیوں کر خیال ہوتا اور وہ میری بات کیوں ماننے چلے پھر میں نے سوچا نجمہ کے علاج کا بہانہ خوب رہے گا۔ اس طرح وہ نجمہ کو دیکھ بھی لیں گے اور ممکن ہے نجمہ کی صورت اس کی قسمت بنا دے۔ توفیق کے ماں باپ کا دل پسیج جائے۔ میں نے نجمہ کی ماں سے بڑی مشکل سے نجمہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت لی اور ہم دونوں شہر روانہ ہو گئے۔ راستے میں میں نے نجمہ کو زندگی کی تلخیوں اور زمانے کے نشیب و فراز سے واقف کرانے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ اس مسئلے کو مجھ سے بہتر سمجھ چکی ہے اور اب وہ میری باتوں کو اس طرح سن رہی ہے جیسے کوئی استاد بچہ کا آموختہ سنتا ہے۔ میں نے یہ رنگ دیکھا تو دوسرا ہی ذکر چھیڑ دیا۔ نجمہ نے تھوڑی دیر بعد اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سو گئی۔ جب ہم شہر پہنچے تو میں نے اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھیرنا مناسب سمجھا اور دوسرے دن توفیق کے ماں باپ سے ملنے کے لئے گیا۔ توفیق کے گھر میں خاصی چہل پہل تھی۔ شادی کی ابتدائی رسمیں سرانجام ہو رہی تھیں میں امید و بیم کی حالت میں اندر داخل ہوا۔ توفیق کے والد انتظامات میں بڑی سرگرمی دکھا رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑی تو

بڑے تپاک سے ملاقات کی۔ ایک علیحدہ کمرے میں مجھے بٹھایا اور تھوڑی دیر بعد وہ خود بھی میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ میں بڑی مشکل میں تھا کہ جس مقصد کی تکمیل کے لئے میں آیا تھا اسے کس پہلو سے چھیڑوں کہ خود انھوں نے اس مسئلہ سے متعلق بات چیت شروع کی۔ کہنے لگے "توفیق کی قسمت بڑی اچھی ہے جو اسے ایسا اچھا سسرال مل رہا ہے"۔ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا "لیکن کیا توفیق بھی اس شادی کو پسند کرتا ہے"۔ توفیق کے والد نے ایک زور کا قہقہہ لگایا "آپ پسند کی پوچھ رہے ہیں۔ ارے وہ تو پھولوں نہیں سما رہا ہے۔ اسی کے اصرار سے تو شادی اتنی جلد قرار پاگئی"۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے نجمہ کے ساتھ میں بھی کسی گہرے سمندر میں غرق ہوا جارہا ہوں۔ میں نے اب زیادہ گفتگو مناسب نہ سمجھی اور باہر نکل کر توفیق کو ڈھونڈھنے لگا۔ توفیق اپنے چند دوستوں کے ساتھ ہنسی دل لگی میں لگا ہوا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ گھر والوں کی خیریت پوچھی اور رکتے رکتے نجمہ کے بارے میں بھی پوچھا۔ "وہ کیسی ہے شادی میں آئے گی یا نہیں"۔ میں نے جواب دیا "اچھی ہے تمہیں مبارک باد دینے کو کہا ہے"۔ "ماموں جان" توفیق کہنے لگا "آپ اسے اپنے ساتھ لے آئے ہوتے۔ یہاں شادی کی دلچسپیوں میں وہ بھی حصہ لیتی"۔ "ہاں" میں نے اس طرح غصہ سے دانت پیستے ہوئے کہا کہ توفیق ہکا بکا رہ گیا۔ اپنے گھر آکر میں نے نوجوانوں کے بارے میں ایسی خراب رائے قائم کرلی کہ مجھے توفیق جیسے بھانجے کا ماموں ہونے پر شرمندگی سی تھی۔ نجمہ سے میں نے کہا کہ وہ خود کیوں نہ توفیق سے مل لے۔ وہ اس زور سے ہنس پڑی کہ میں سہم کر رہ گیا۔ وہ مسلسل ہنستی رہی اور آخر میرے سامنے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سنا جیسے کوئی سسکیاں بھر رہا ہے۔ تڑپا دینے والی، دل میں چبھنے والی سسکیاں۔ میرا بھی دل بھر آیا اور میں صحن میں ٹہلنے لگا۔

دوسرے ہی دن ہم گاؤں کو چلے آئے۔ توفیق کی شادی ہوگئی لیکن ہم میں سے کوئی بھی شریک نہ ہوا جس دن توفیق کی شادی ہوئی اس دن نجمہ کی حالت بڑی خراب رہی مجھے تو ڈر ہو رہا تھا کہ کہیں وہ بالکل ہی پاگل نہ ہو جائے۔ میں نے وہ دن بڑی پریشانی کی حالت میں کاٹا۔ نجمہ کو جس مشکل سے میں نے سنبھالا ہے اس سے میرا دل ہی اچھی طرح واقف ہے۔ دو تین دن بعد نجمہ کی طبیعت کچھ سنبھلنے لگی۔ لیکن اس کے خیالات کی دنیا میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوگیا تھا وہ دولت کو اتنی اہمیت دینے لگی کہ ہر قربانی پر اسے حاصل کرنے پر تیار ہوگئی۔ اس نے مجھ سے کئی دفعہ بڑی بڑی رقمیں مانگ لیں۔ وہ محلہ کی بچیوں کو پڑھانے لگی وہ امیر گھرانوں کی عورتوں سے سلوائی کے لئے کپڑے مانگ لاتی۔ غرض جب بھی میں نے اسے دیکھا روپیہ کمانے ہی کی دھن میں سرگرداں دیکھا۔ ایک دن تو نجمہ کی ماں نے یہ خبر بھی سنائی کہ شہر کے ایک بوڑھے لکھ پتی سیٹھ گاؤں میں آئے ہوئے ہیں کسی جوان لڑکی سے شادی کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں اور نجمہ اڑ گئی ہے کہ اس بوڑھے سیٹھ سے شادی کرے گی"۔ نجمہ کو میں نے سمجھایا۔ جان پہچان کے سارے لوگوں نے سمجھایا لیکن نجمہ اپنی ہٹ سے باز نہ آئی اور جن لوگوں نے یہ نسبت ٹھہرائی تھی انھوں نے نجمہ کی مرضی پاکر بات چیت طے کروادی۔ ہم سب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بوڑھے سیٹھ صاحب دولہا بن کر آئے اور نجمہ کو پچاس ہزار روپے مہر پر اپنی دلہن بنا لیا۔ شادی میں ہم سب شریک تھے۔ لیکن اس طرح جیسے کسی کی میت میں شریک ہوں۔ مجھے تو صاف نظر آرہا تھا کہ اس عروسی لباس میں نجمہ نہیں اس کی لاش چھپی ہوئی ہے۔ دوسرے دن میں نے نجمہ کو دیکھا تو سونے اور جواہرات میں لدی ہوئی بیٹھی تھی سیٹھ صاحب نے دل کھول کر زیورات دئے تھے۔ اور نجمہ پتھر سے دیوی بن گئی تھی۔ "کیسی ہو" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ خلاف توقع نجمہ مجھ سے لپٹ گئی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اسے دلاسا دیتا کھڑا رہا کہ اتنے میں دروازے پر ڈاکیے نے آواز دی۔ میں نے اپنے نام کا خط وصول کیا خط پڑھ چکا تو میرے ہاتھ لرزنے لگے اور میرے دل پر جیسے کسی نے ایک زور کا گھونسہ لگایا۔ توفیق کا خط تھا اور اس نے لکھا تھا کہ اس کے خسر ہمارے گاؤں میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور وہ ان کے ساتھ چند دن گزارنے کے لئے اپنی بیوی کے ساتھ آرہا ہے۔ توفیق کے خسر! نجمہ کے دولہا!! خط میرے ہاتھ میں تھا اور میں جیسے ساری فضا میں گھوم رہا تھا۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ نجمہ میرے قریب آئی اور اس نے میرے ہاتھ سے خط لے لیا۔ نجمہ کے دیوانہ وار قہقہوں کی گونج نے مجھے چونکا دیا "نجمہ! نجمہ!!" میں پکارنے لگا۔ لیکن نجمہ کا گھر میں پتہ نہ تھا۔ البتہ اس کے قہقہوں کی آواز بازار کی طرف سنائی دیتی رہی اور یہ آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئی۔ میں دیوار کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں، کس حال میں ہوں۔ اور قسمت ایک مجبور اور بے سہارا کمزور لڑکی کے ساتھ کس بے دردی سے پیش آرہی ہے۔

رشید قریشی

پتنی

اس نے کبھی مجھے اپنے نام سے نہیں پکارا۔ گجری رنگ محل ہو کر آئی تو ایکناتھ بھائی کو مسٹر سے مخاطب کرنے لگی۔ پتنا شدھ بدھ پڑھ لکھ کر ہی اپنے پتی کو بیند سے ٹکر لینے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر اس ریکھا کو کیا ہو گیا۔ وہ ہمیشہ خاموش ہی رہتی ہے! بہت دیر تک نہ جانے کیا سوچتی رہتی وہ ——

ایکادسی کے روز سدھیر بھیا آئے تو ان کی پتنی کوسلیا کو دیکھ کر مجھے رشک ہونے لگا۔ سچ پوچھئے تو زندگی یہ ہے۔ زندہ دلی اسی کا نام ہے۔ کوسلیا ٹینس کھیلتی ہے سیکل چڑھ جاتی ہے اور ہنسی مذاق میں تو سارے مدن پورہ میں اس کا جواب نہیں۔ چلتی پون ہے جیسے جگہ جگہ سے پھک گئی ہو۔ اسی لئے تو سدھیر بھیا کی زندگی اتنی مسرت بخش اور پُرسکون ہے۔

اور ایک یہ ہے کہ میرے پیر دھو کر حیران ہے۔ ہنش۔ مجھے یہ نہیں چاہئے۔ پتنی شریک حیات ہوتی ہے۔ اس کا بھی کوئی مقام ہے۔ آزادی، خودداری اور اعتمادِ نفس۔ یہ سب کچھ چاہئے اس میں۔ کم از کم میں تو یہی چاہتا ہوں۔ یہ بھگوان سمجھ کر پتی کی پوجا کرنا اور اس کے پیر دھونا مجھے پسند نہیں۔ اس سے صنفِ نازک کی توہین ہوتی ہے۔ اس کی خودداری مجروح ہو جاتی ہے اور پھر وہ شریکِ حیات باقی نہیں رہتی۔ ایک کنیز بن جاتی ہے۔ کنیز ــ کون ہے وہ جو تعلیم پا کر بھی اپنی پتنی کے ساتھ کنیز کا سا برتاؤ کرنا پسند کرے گا۔ کوئی نہیں۔ اگر نطشے کے فلسفے نے کسی کے دماغ سے لطافت اور حسن کی صلاحیت سلب کر لی ہے تو کیا ہوا۔ ایسے کتنے ہوں گے۔ عورت کو نطشے کی آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ نطشے قاتلِ آرٹ تھا۔ اپنی جنم بھومی ہی کا دشمن تھا وہ۔ ان سلونی صورتوں کو تو ٹیگور کی سی حسن شناس نظروں سے دیکھنا چاہئے۔ شاعر اور مصور بن کر صنفِ نازک کے حسن میں لطافت کی رنگینیاں بھر دینی چاہئے۔ مگر یہ کیا۔ اس ریکھا کا تو کوئی مقام ہی نہیں۔ سمجھتی ہے میں ہی اس کا بھگوان ہوں۔ دیوانی عورت ایسا نہیں ہے۔ وہ زمانہ گیا۔ اب مساوات کا دور دورہ ہے۔ اب تو ایسا نہ کر۔ تو اور میں ــ دونوں میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں۔ برابر برابر کے ہیں۔ نہیں مانتی ریکھا۔ وہی پرانی بات ــ یہ تو احمق پن ہے۔ بیہودگی۔

وہ میری باتوں پر فلسفی کی طرح غور کرتی شاعر کی طرح سوچتی اور یہ سب کچھ کر کے ایک جاہل اور غبی لڑکی کی طرح بھلا دیتی۔ میں تنگ آ چکا ــ سدھیر بھائی لوٹتے ہوئے سمجھا گئے۔ ان کی کوسلیا نے تو اپنی سہیلیوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ "رجیون نے سونے کے پنجرے میں چڑیا پال رکھی ہے۔" میں یہ کیسے سن سکتا ہوں ـــ کوسلیا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ریکھا اپنے آپ سے اس سنہری پنجرے میں قید ہے۔ میں نے پنجرے کے کواڑ ہمیشہ کے لئے کھلے رکھے۔ میں نے پنجرا ابھی نہیں بنوایا اس کے لئے۔ یہ اپنے آپ قید ہے۔ عورت محدود ہو جاتی ہے تو اس کا دل اور اس کا دماغ دونوں غلام ہو جاتے ہیں۔ ریکھا اڑ تو سہی۔ دیکھ تو آزاد فضاؤں میں زندگی کا سمندر کس طرح ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اری پگلی زندگی افسانہ ہے، اپنے کردار کو آگے بڑھا۔ اوج پر لا اُسے، تاکہ اس افسانوی زندگی کا کوئی ایک پہلو ہی نظروں کو لبھا سکے۔

وہ اِن باتوں کو نہیں سمجھتی اور نہ ایسی باتیں سننا چاہتی ہے ـــ بھارت دیس کی ایک گرہستی پتنی ہونے پر ہی اُسے ناز ہے۔ اب بھلا اسے سمجھائے تو کون؟ میں نے ہزار بار کہا، لاکھ لاکھ کوشش کی کہ ریکھا یہ زندگی نہیں ہے،

یہ موت ہے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اسے بس میرے پیر دھونا آتا ہے اور وہ مجھے بھگوان کا اوتار ہی سمجھتی ہے۔

ایک دن مجھے یوں محسوس ہوا کہ مسلسل بارش کی وجہ سے پتھر کی سل گھس گئی ہے۔ میں برآمدے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ "مسز سدھیر نے آل انڈیا اوپن ٹینس کا چمپین شپ جیت لیا" میرے دل میں خیال ہو رہا تھا کہ ایک ہماری پتنی بھی ہے۔ میں ریکھا کی قدامت پسندی پر دل ہی دل میں کوفت کھا رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں میرے پاس آئی۔ مجھے کیا معلوم کہ آج سے نئی زندگی کا سنگ بنیاد پڑنے والا ہے میں اسی طرح اخبار پڑھتا رہا۔ دو نرم نرم ہاتھ کانوں کے پیچھے سے گزر کر میری آنکھوں پر ڈھک گئے۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ ریکھا۔ اس نے للچائی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا ــــــ گھورتی رہی ــــــ میں نے کہا چلو ریکھا بغیچہ میں گھوم آئیں۔ بڑی پُر لطف تھی آزادی کی پہلی شام ــــــ پھر تو ہمارا پتنگ اڑنے لگا۔ اونچا اور اونچا ــــ بعض اوقات وہ اس قدر اونچا اڑتا کہ مجھ میں سنبھالنے کی طاقت نہ رہتی۔

وہ سینما گئی۔ اکیلی ہی۔ مگر میرے دل میں ایسا خیال کیوں آتا ہے؟ اسے من مانی کرنے کا حق ہے۔ آزاد ہے وہ بھی میری طرح ــ میرا دل مان گیا۔ شام وہ دیر سے آئی لیکن میں نے اپنی جدید اشتراکیت نہیں چھوڑی۔ ریکھا بہت خوش ہے۔ اب وہ میرے پیر دھونے اور مجھے بھگوان سمجھنے والی ریکھا نہیں۔ وہ اب مسز جیون ہے۔ ایک آزاد خیال خود دار اور باعزت خاتون۔

ایک روز ریکھا اور میں اپنے بغیچہ میں گھوم رہے تھے کہ سدھیر بھائی آتے ہوئے دکھائی دئے۔ انتہائی پریشان۔ جیسے کسی کو قتل کر کے آئے ہوں۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا "سدھیر بھائی۔ بھائی صاحب ــــــ" انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیری کی کانٹے والے کھلیان کے بیچوں بیچ وہ چپ چاپ کھڑے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی مجسمہ اپنی ناکام محبت کے جذبے میں ڈوبا ہوا ہے۔ آنکھوں میں سرخی لہرا رہی تھی چہرہ تمتما رہا تھا اور سر کے بال رونگٹوں کی طرح کھڑے تھے۔ "کیوں بھائی سدھیر ــــ کیا ہوا بھائی؟" سدھیر کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اس نے کہا "جیون میرا گھر لٹ گیا" ــــ "گھر لٹ گیا؟" "ہاں کوسلیا کا پتہ نہیں ہے"۔ "تو گئی کہاں" ــــ "جاتی کدھر۔ معلوم تو کیا ہوتا" ــــ سدھیر نے روتے ہوئے کہا "کرن کو جانتے ہو تم"۔ میں سمجھ گیا۔ "تو یہ ہوا کیسے"۔ ریکھا ہنس پڑی ــــ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا چلو ڈیر جیون آج سدھیر کو سینما کی سیر کرائیں ــــ

میرے پیر زمین سے اکھڑ گئے ــــ قریب کی کانٹی نے مجھے چاروں طرف سے جکڑ لیا ــــ میں نے کہا ریکھا دیوی تم میرے پیر دھو ــ مجھے بھگوان کا اوتار سمجھو ــــ اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی ــ میری پتنی!

افضل عابدی

عشرت کو سینے ٹوریم میں آئے ہوئے چھ مہینے گزر چکے تھے' اس طویل مدت میں اس کے مرض نے بھی دوسرے درجے سے تیسرے درجے میں ترقی پالی تھی جب سے وہ یہاں آیا تھا اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی' حسرت نصیب اور تھکی ہوئی دنیا جس کا مستقبل ایک المناک اندھیرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ۔مگر کبھی کبھی جب وہ مس آرلی کو دیکھ پاتا تو اس کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہوتی جیسے اس کی جوت سے ساری دنیا تاباں ہو جائے گی اور اس کی اندھیری زندگی میں نور کی ایک کرن جگمگا اٹھے گی ۔مگر وہ پھر یوں خاموش ہو جاتا جیسے دو عالم کا سکوت ہی اس کی تقدیر ہو۔

اس کے سینے ٹوریم آنے کی داستان بھی کتنی دلچسپ ہے اور کتنی دکھ بھری۔ وہ پوست دانشواں ہی تھا مگر اس کی شخصیت میں جیسے ارسطو و افلاطون چھپے ہوں ۔جامعہ میں اس کی قابلیت اور ساتھ ہی خرابی صحت سے متاثر ہو کر ڈاکٹر قریشی کہتے تھے کہ عشرت (KEATS) کیٹس کی طرح جواں مرگی کا داغ دے گا ۔فلسفہ کے پروفیسر نے عشرت سے متواتر یہ کہا کہ روسو کی طرح علمی نہ ہو۔ ہاں اگر چاہتے ہو تو اس کا عمل اور کسی اور کا علم اختیار کر لو تا کہ تمہاری مخفی طاقتیں اجاگر ہو کر علم و ادب کا بیش بہا خزانہ ہو جائیں ۔مگر عشرت کتابوں میں دفن گھلتا ہی گیا ۔اس کی گرتی ہوئی زندگی کو سہارا دینے کے لئے طبیبوں نے بھی علاج تجویز کیا کہ وہ بیاہا جائے وہ صحت پائے گا' اس کی تقدیر بدلے گی اور دنیا بدلے گی ۔توقع بھی یہی تھی کہ وہ رفیعہ کے ساتھ نیا جنم لے گا۔رفیعہ میں یہ اعجاز تھا کہ اس کی شہابی آنکھیں اور وہ رخسار جیسے دو گلاب کھلے ہوں' یہ سب اس کی درماندگی اور بجھے ہوئے پن کو ختم کر سکیں گے مگر اس کی زندگی میں بہار نہ آسکی اور وہ خاندان والوں کے مشورے سے سینے ٹوریم بھجوا دیا گیا ۔

سینے ٹوریم میں وہ تنہا کہاں تھا؟ اس کے کئی ہم نصیب ایک بڑے ہال میں پناہ گزیں موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے ۔اس کے آتے ہی تیسرے روز کشور نے اس ناتوانی میں اپنی آخری سانس لی کہ اس کے ختم ہو جانے پر بھی ڈاکٹر نے نبض ڈھونڈی کہ کہیں وہ آہستہ آہستہ ہی حرکت نہ کر رہی ہو۔ اس کے ختم ہو جانے پر اس کی بہن سوشیلا نے منع کرنے کے باوجود کتنا کہرام نہ مچاتی جب کہ کشور ہی اس کے مستقبل کا نگران تھا۔کشور کے ختم ہونے پر اب کون باقی رہا تھا جو اسے راستہ بتلاتا اور منزل دکھاتا ۔

اپنے وارڈ میں کئی ساتھیوں کو دیکھ کر اس کا جی یوں بیٹھ جاتا کہ وہ کل کی بجائے آج ہی مر جانا چاہتا ہے ۔اس کو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ سینے ٹوریم صحت کے لئے نہیں بلکہ آنے والی موت سے مقابلے کی تیاری کے لئے بنایا گیا ہو۔اس کی کھانسی کے دورے اور بڑھ جاتے' اتنے بڑھ جاتے جیسے اس کے گلے میں کھانسی کا پھندا پڑ گیا ہو۔ ایسے میں مس آرلی کی تیمارداری کچھ سکون بخشتی ـــــ وہ مس آرلی سے مخاطب ہو کر کہتا کہ "نرس بہتر یہی ہے کہ تم اس مریض کی جانب زیادہ توجہ کرو جس کی کچھ امید ہے ۔میں تو مہمان ہوں نہ جانے کونسا لمحہ ــــ" وہ مسکرا کر یوں جواب دیتی کہ "وہ مریض تم ہی ہو" آرلی کی توجہ اور خدمت گزاری میں وہ ایک معمہ پا رہا تھا ۔جس کو وہ کوشش کے باوجود بھی حل نہیں کر سکتا تھا۔ سارے وارڈ میں یہی مشہور تھا کہ اس سسٹر کا دماغ ساتویں آسمان پر ہے اور وہ ہواؤں میں اڑتی ہے۔ اتنی بد مزاج نرس جس نے کل رشید کو اس قدر سخت ڈانٹ پلوائی کہ اگر وہ بار بار اپنی شکایت نرس سے کہتا رہے تو سینے ٹوریم سے نکال دیا جائے گا ۔حالانکہ رشید زندگی کی آخری منزل میں تھا ۔سخت تکلیف کے باعث کہہ اٹھتا تھا کہ پسلیاں تڑخ رہی ہیں' ٹوٹی جا رہی ہیں ۔کشش میں یوں تڑک اٹھ رہی ہے جیسے بچھو ڈنک پر ڈنک لگاتے جا رہے ہیں ۔مگر وہ بے پرواہ بنی ناول پڑھتی یا

کروشیا میں مصروف رہتی ۔

عشرت سینے ٹوریم میں کیا آیا وہ کہیں سے کہیں پہونچ گئی ۔جب کبھی عشرت کو کھانسی کے پھندے پڑ رہے ہوتے' ہڈیاں چٹ چٹا رہی ہوتیں وہ مضطربانہ دوڑتی ہوئی آکر دوا کا ایک خوراک دیتی یا آرام سے سلانے کی کوشش کرتی ۔ سارے وارڈ کو چھوڑ کر عشرت کے پیچھے وہ یوں موتی کہ خود اپنا پتہ بھول گئی تھی ۔عشرت کے ایک بازو ولیم پڑا ہوا تھا جو ایک سال سے سینے ٹوریم میں تھا وہ جب کبھی اپنا ٹمپریچر مانگتا تو آرلی بائے سے کہہ کر آگے بڑھ جاتی ۔مگر عشرت کی حرارت وہ کئی بار لینے سے بھی اکتاتی نہ تھی۔ ولیم نے ایک روز عشرت سے کہہ بھی دیا کہ آرلی کے سیب و انار سے تمہارے چہرے پر خون دوڑ رہا ہے ۔ مگر آرلی میں بھی ہر لمحہ ایک نئی بہار آرہی ہے ۔ وہ جب تمہارے قریب آتی ہے تو مجسم بہار بن کر آتی ہے ۔ اس کا رواں رواں مست ہوا جاتا ہے ۔ اس کی آنکھوں میں چاندنی جوت در آتی ہے اور تم بھی اس کے انار و سیب سے ۔۔۔"

عشرت بے معنی ہنسی ہنس کر ولیم کو جواب دینا چاہتا تھا مگر ولیم پر سانپ سا لوٹ جاتا کہ اس کا وجود کئی مریضوں کو بد سے بدتر بنائے جارہا ہے ۔۔۔ آرلی یہ چاہتی تھی کہ عشرت بھلا چنگا ہو جائے ۔۔۔۔ وہ آرلی کی دنیا کا محور بنا ہوا یوں گھوم رہا تھا جیسے اس کی زندگی کے دن پھر جلنے والے ہیں ۔ آرلی عشرت کے قریب محض اس لئے ہوئی جارہی تھی کہ وہ ایک غیر معمولی مریض تھا ۔ ایسا مریض اس سے پیشتر سینے ٹوریم میں کبھی نہ آیا ۔جو درد اور کرب کے انتہائی عالم میں بھی چیختا چلاتا نہ تھا بلکہ اپنی مٹھیاں بھینچا ہوا پیر اکڑایا ہوا' ہونٹ سکیڑ کر درد و غم کو شکست دینا چاہتا تھا ۔کھانسی کے سخت حملوں میں بھی اپنی آپ مدد کر لیتا مگر نرس کو نہیں پکارتا ۔جب کبھی لے میں آتا ہے تو اقبال کا کلام گنگنا لیتا یا دریچے میں سے ان میدانوں کو دیکھتا جہاں صبح و شام دق کے مریض کھلی ہوا لینے کے لئے قدم قدم لنگڑاتے لنگڑاتے یا پہیے دار کرسیوں پر گھوم رہے ہوں ۔ اس کی آنکھوں میں اس کی شخصیت میں ایک طلسم تھا جس میں وہ گرفتار ہوئی جارہی تھی ۔ اس سینے ٹوریم کی دنیا میں اس کے لئے خزاں کے سوا اور دھرا ہی کیا تھا ۔۔۔۔ تمام ڈاکٹر ہی ڈاکٹر یا مریض ہی مریض ۔۔۔۔ ڈاکٹر تو تمام نرسوں کے دوست تھے ۔۔۔۔ آرلی' آلمیڈا' مائیکل' روزالی اور تمام ۔۔۔۔۔
اس لئے آرلی ان ڈاکٹروں سے ناامید تھی ۔ ایک مرتبہ اس کی زندگی میں صبح طلوع ہوئی تھی جب کہ شمالی ہند کے طبی کالج کے لڑکے عملی تعلیم حاصل کرنے سینے ٹوریم آئے تھے ۔ ان میں کلیم نے آرلی کو مسحور کر رکھا تھا ۔ جب تک کلیم سینے ٹوریم میں رہا آرلی کو دو جہاں حاصل تھے اور جب وہ چلا گیا یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا ۔ اب اس کی دنیا میں مرتے ہوئے جسموں کی کراہ' کھانسی کا وہ شور جیسے رہٹ چل رہے ہوں ۔ خرر کھرڑ ۔۔ آق ۔ آہ' اوہ ۔۔۔ سسکیاں' آہیں' ٹوٹتی ہوئی سانسیں' چھوٹتی ہوئی نبضیں ۔۔۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں ۔ٹھنڈے جسم اور بسورتے ہوئے چہرے ۔ ان کے سوا اور دھرا ہی کیا تھا ۔۔۔" وہ ان کو دیکھتے دیکھتے اس قدر برہم ہو چکی تھی کہ اس کو قرار نہ تھا ۔جب عشرت سینے ٹوریم آیا وہ اپنے میں آپ آتی گئی اور اس کے قریب سے قریب تر ہونے لگی ادھر آرلی میں یہ تبدیلیاں ہوئیں اور ادھر عشرت میں ایک انقلاب آیا ۔ آرلی کے دلنشین خطوط میں اس کو رفیعہ جھلکتی دکھائی دی ۔ آرلی کی مرمریں بانہیں ان پر نیلی رگیں بھرے ہوئے بازو' یاقوت جیسے لب' چہرہ کے دلنشیں نقوش یہ سب رفیعہ میں رچے نظر آئے جس نے اپنا گہنا پاتا بیچ کر عشرت کو سینے ٹوریم بھیجا تھا ۔
وہ آرلی کے حسن و جمال کے سہارے آگے بڑھنے لگا ۔ گو کبھی کبھی وہ یہ سوچنے لگتا کہ آرلی کی گفتگو اور اس کا عمل اپنے اندر ایک معنی لئے ہوئے ہیں

یہاں آکر وہ رک جاتا اور انھیں تلاش کرنا شروع کرتا ۔ اس لمحہ اس پر بحرانی عالم طاری ہوجاتا۔ کھانسی، سسکیاں، کراہ یہ سب اسے ستاتے رہتے مگر آرلی آکر نجات دلاتی ۔ آرلی کی اس نجات دہندگی سے وہ یہ سمجھ بیٹھتا کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہی ہے ۔ اس کے علاوہ جب کبھی رات میں آرلی کی ڈیوٹی رہتی اس کا سائنسی ڈاکٹر اس کو یوں دیکھتا جیسے وہ آرلی کو کائنات کے رموز و نکات سمجھانا چاہتا ہے ۔ ایک مرتبہ آرلی نے بھی اس سے کہا تھا کہ "سینے ٹوریم میں اکثر جواں عمر جواں سال مریض ہی آتے ہیں نہ جانے گھل گھل کر مرنے والے یہ نوجوان ہی کیوں ہوتے ہیں۔ اس مرض سے اس کو سخت نفرت ہے ۔ وہ اس کو ہندوستان کی خوش قسمتی سمجھتی ہے کہ لیڈی لنلتھگو ہندوستان کو ایک بڑے دشمن سے نجات دلا رہی ہیں ۔ ہزاروں لڑکیوں کا سہاگ، ہزاروں معصوموں کے باپ یہ سب برقرار و زندہ رہیں گے"۔ جب وہ ان معنوں کو سمجھ جاتا تو آرلی اس کے لئے کوئی دشوار معمہ نہ رہتی ۔
وہ آرلی کے سہارے ہی بڑھتا رہا —— بڑھتا رہا !

ایک صبح وہ بہت مسرور تھا ۔ غالب اور داغ کی غزلیں گنگناتا ہوا مسکرا پڑتا تھا ۔ اس کی رقصاں مسرت اور سرور دیکھ کر آرلی شاداں شاداں چلی آئی ۔ اور یہ یقین لے کر آئی کہ آج اپنے دل کی تمام کیفیتیں اور سارے راز عشرت کو سنا دیگی ۔ آرلی کو دیکھتے ہی قہقہہ اور خندہ میں بے خود عشرت پکارا تھا "سسٹر آرلی آج میری رفیعہ آرہی ہے —— تم جیسی ہی شکیل، خوبصورت، دلفریب اور مہ پارا —— پیاری گڑیا" ——

آرلی کی آنکھوں میں دھند سا چھا گیا ۔ رخساروں پر کھلے ہوئے گلاب چندرمکھی کا روپ دھار گئے —— چاند سے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور دو جہاں لرز کر منہدم ہوتے دکھائی دئے ۔ وہ ایک مجسمہ بنی عشرت کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی —— آنکھوں میں آنسو بھر آئے —— لیکن نہ جانے اس کے کیا سمائی کہ دوسرے ہی لمحہ وہ تھرما میٹر اور چارٹ لئے تمام مریضوں کی حرارت لینے لگی ۔ عشرت پر سکتہ سا ہو گیا ۔ وہ رفیعہ آنے کے بعد بھلا چنگا سینے ٹوریم سے چلا گیا ۔

سینے ٹوریم کی فضا میں دوائیاں، انجکشن، اسٹریچر، پہیے دار کرسیاں، بیڈ پان، مریض، ان کی کراہیں، سسکیاں، یہ سب آرلی کو ایک افسانہ سناتے ہیں ۔ ولیم نے ایک روز آرلی سے پوچھا —— "وارڈ بائے کہتا تھا کہ دق کے مریضوں کی روحیں شیطان بن کر ستاتی ہیں" آرلی نے گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا —— "صرف مردوں کی نہیں بلکہ زندوں کی روحیں بھی" وہ یوں سہم کر آگے بڑھی کہ ولیم بھی خوفزدہ ہو گیا —— اس نے اپنی حالت کا جائزہ لیا ۔ بنیان ہٹا کر اپنی پسلیاں گنیں، پوست و استخواں کو باہم دگر دیکھا —— اور خود کو زندہ بھوت سمجھا —— اور یہ سمجھا کہ اسی کو دیکھ کر آرلی خوفزدہ ہو گئی —— حالانکہ وہ عشرت کا بھوت تھا —— بیچارہ ولیم کیا خوب سمجھا —— آرلی کو عشرت کا زندہ بھوت ڈرا رہا تھا، وہ سراسیمہ بنی، خیالوں میں الجھی نہ جانے آگے کدھر بڑھ رہی تھی —— سینے ٹوریم میں رہ کر وہ سینے ٹوریم کے باہر ایک زندہ بھوت سے کھیل رہی تھی ۔

محبوب حسین جگر

اطلاع :—— نئے سال کا چندہ روانہ کرکے شکریہ کا موقعہ عطا کیجئے ۔ مطبوعہ رسید کے بغیر چندہ نہ دیجئے ۔ اضلاع کے خریداروں کے نام رسالہ بذریعہ وی پی بھیجا جا رہا ہے ۔ وقت پر وی پی حاصل فرمالیں

مہتمم

آوازِ حق

دورِ اوّل

کچھ خاک کے بے قیمت ذرے سرگرمِ فلک پیمائی ہیں — تاریک کرے پر دنیا کے عبرت کی گھٹائیں چھائی ہیں
آئینِ حیاتِ فانی کی تکمیل سے رسم و راہ نہیں — اب تشنۂ بینش ہیں آنکھیں سینوں میں دلِ آگاہ نہیں
برپا ہے فضائے ہستی میں ہنگامۂ جہل و نادانی — خود اپنے لہو سے کھیل رہا ہے صاحبِ سرِّ یزدانی
ہر دل کی مسرت پنہاں ہے اک صبر شکن خود بینی میں — ہر روح کو تسکیں ملتی ہے اک محشرِ بے آئینی میں
دہقاں کے لہو کی جنسِ گراں، خاشاک سے بڑھ کر سستی ہے — سرمائے کی لعنت ہر جانب سرحلقۂ بزمِ ہستی ہے

یہ وقت ہے اب انساں کو سبق نیکی کا سکھایا جائے گا — پندارِ غلط کے سر بہ فلک مینار کو ڈھایا جائے گا
آیا ہے پیامِ موسمِ گل ترتیبِ چمن کی جائے گی — آراستہ پھر ان پھولوں سے ہستی کی دلہن کی جائے گی

عرفانِ حقیقت کی شمعیں ہر گھر میں جلائی جائیں گی
بھٹکی ہوئی بھیڑیں دنیا کی اب راہ پہ لائی جائیں گی

قرونِ وسطیٰ

(۲)

ذرّوں کو تجلّی دی میں نے، پھولوں کو تبسم میں نے دیا — موجوں کو سبک سیری بخشی، پھر ذوقِ ترنم میں نے دیا
اسرارِ حقیقت ملتے تھے، دنیا کو مرے افسانوں میں — اجزائے سکونِ سرمد تھے بیدار مرے طوفانوں میں
اک عمر کی پیاسی دنیا کو صہبا نے مری سرشار کیا — مدّت کی سسکتی روحوں کو نغموں نے مرے بیدار کیا

دانش کی حقیقت سمجھائی انسان کو انساں میں نے کیا
فطرت کے نہفتہ رازوں کو بے پردہ نمایاں میں نے کیا

عہدِ حاضر

(۳)

پھر لے کے وہی بے آئینی ہنگامۂ باطل اٹھا ہے — ہلتی ہیں جڑیں پھر دنیا کی اک حشر کا عالم چھایا ہے
ہستی کا فریبِ آسائش ایوانِ عمل ڈھا کر ہی رہا — وہ طائرِ نادان ہے انساں اس دام میں پھر آ کر ہی رہا
اک لہر سی ظلمت کی پنہاں آئینۂ جانِ پاک میں ہے — پیمانۂ گل ہے دور میں لیکن انجمن خاشاک میں ہے

انساں کو خبر دو زلزلہ آگیں بادل چھانے والا ہے — ہے گونج ابھی باقی جس کی طوفاں وہ پھر آنے والا ہے
عشرت کے یہ اجزا بکھریں گے یہ موجِ طرب رک جائے گی — لہرائیں گے پرچم عرفاں کے دانش کی جبیں جھک جائے گی
کانپے گی زمیں لرزے گا فلک، ایوانِ سلف ویراں ہوگا — اقرارِ غلط اندیشی پر مجبور یہی انساں ہوگا

سارا یہ ہجومِ خار و خذف اب صرف ہوا ہو جائے گا
اس سیلِ رواں میں باطل کا ہر نقش فنا ہو جائے گا

علی اختر

آگہی

(جمیل نے اس نظم میں جدلیاتی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ یہ انداز فکر، اردو کے شعری ادب کے لئے نئی چیز ہے)

وجودِ خارجی مجھ سے جدا خود اک حقیقت ہے
سوا ہے مجھ سے ہر شئے جو خیالِ حس کی علت ہے

مرے احساس خارج سے ہی تخلیقِ تخیل ہے
اسی احساس پر قائم تمیزِ سنبل و گل ہے

زمین و آسماں میرا توہم ہو نہیں سکتے
محض وہم و گماں یہ ماہ و انجم ہو نہیں سکتے

یہ دھوکا ہے کہ خارج کو خیالِ خام سمجھا ہے
اس عالم کو کسی کی جلوہ گاہِ عام سمجھا ہے

مرے ہست و عدم پر گر جہاں مقسوم ہو جاتا
میں کیا معدوم ہوتا کل جہاں معدوم ہو جاتا

وجودِ مادیت سے ہے سوزاں شمعِ عقلیت
اسی کے نور سے روشن ہے راہِ سرِ اصلیت

شعورِ داخلی گر خالقِ کون و مکاں ہوتا
مرے منشا پہ ہی مبنی وجودِ دو جہاں ہوتا

خرد کے نشتروں سے فاش کر دو راز ہستی کے
جنوں کی موت کو رنگیں بنا تقدیر کے محل سے

یہ ذوقِ شغلِ تعبیرِ زمین و آسماں کب تک
غلط تفسیر کے قائل رہیں یہ جسم و جاں کب تک

مرے فکر و عمل سے یوں مری تقدیر بنتی ہے
مصور کے ہنر سے جس طرح تصویر بنتی ہے

جنوں کا آسرا لے کر یہ دنیا چل نہیں سکتی
توہم کی فضا میں شمعِ ہستی جل نہیں سکتی

جمیل احمد فاروقی

کنول

گاؤں کا تالاب بڑا تھا پانی سے بھرپور
چھوٹا لڑکا ڈوب رہا تھا اپنے گھر سے دور
پانی پانی چار طرف اُس پانی میں مجبور

پانی پانی چار طرف وہ لڑکا گھبرا جائے
ڈوبے تو کچھ پانی پی لے اُبھرے تو چلّائے
پاؤں پٹکے گردن جھٹکے پھر بھی ڈوبتا جائے

ہاتھ اٹھائے لاکھ مدد کو ہاتھ بڑھائے کون؟
چیخ پکارا کون سنے اور سن کر آئے کون ؟
جس کو اجل نے تاک لیا ہو اُس کو بچائے کون؟

دوسرے دن جب صبح سویرے لوگ گئے تالاب
سب نے دیکھا ایک کنول کا پھول بروئے آب
ایک کنول کا پھول نہایت لال حسیں شاداب

سید ظہیرالدین احمد بابر

میری آواز

یہ ساون کا موسم یہ ہنستی بہار — یہ کیف و تبسم، یہ پھولوں کے ہار
شبِ ماہ کا یہ ہلکتا سہاگ — یہ جھرنے کے سازوں پہ تاروں کا راگ
یہ لہروں کی لرزش میں رقصِ نجوم — یہ ہر سمت رنگینیوں کا ہجوم

پلا ساقیا! آج ایسی شراب
عطا جو کرے مستقل اضطراب

ملے جس سے مجھ کو نشاطِ جنوں — فنا جو کرے زندگی کا سکوں
مری زندگی ہے مسلسل جمود — میں ہوں ایک ہنگامۂ ہست و بود
مری زندگی اک تمنائے خام — مری زندگی نغمۂ ناتمام
مری زندگی اک ادھورا خیال — مری زندگی جلوۂ بے جمال

پلا ساقیا! اپنے ہاتھوں سے جام
عطا کر مجھے مستیوں کا مقام

ترا نقشِ تعمیر یہ کائنات — ترا حسن معصوم جانِ حیات
رخِ ماہ میں تیرا عکسِ جمال — رخِ مہر میں تیرا نقشِ جلال
گل و لالہ تیرے یہ تیری بہار — ترے کوہ و دریا ترے آبشار
ترے ہاتھ میں زندگی کا نظام — زمیں سے فلک تک ترا اہتمام
کبھی تو تمنا کبھی آرزو — مرے قلب میں تو، نگاہوں میں تو
ترے عرش و کرسی ترا کوہِ طور — بحدِ نظر تیرا دامانِ نور

کوئی لے نہیں ایک جھنکار ہے
بتا کیا یہی تیرا شہکار ہے

نہ سینے میں دل کا وہ سوز و گداز — نہ ذوقِ تمنا نہ ذوقِ نیاز
نہ روحوں میں گرمی نہ سینوں میں آگ — نفس کے بڑھاپے میں بے جان راگ
نظر بہکی بہکی نفس سرد سرد — مرے ولولے دفن ہیں زیرِ گرد

مرے خوابِ ہستی کی تعبیر دے
مرے ہاتھ میں میری تصویر دے

مرے شوق کو اپنے قابل بنا — مرے دل کو دے حوصلے دل بنا
مرے درد کو زندگی بخش دے — مجھے گرمیٔ بندگی بخش دے
درِ میکدہ رات دن کھول دے — مرے خون میں بجلیاں گھول دے
ترے ہاتھ سے پا کے پیتی رہوں — ترا نام لے لے کے جیتی رہوں

رفعت لئیق

اُداس لمحے

ہستی نے غموں میں آنکھیں کھولیں درد بھرا دل ڈھونڈھ لیا
موجوں کی کشاکش میں کشتی نے اپنا ساحل ڈھونڈھ لیا
دامانِ تبسم میں غم کے اشکوں کی جوانی سوتی ہے
ہر نغمے کی گہرائی میں اک دل کی دھڑکن ہوتی ہے
ہر موسمِ گل انجامِ طرب میں فصل خزاں دے جاتا ہے
خورشید چمکتا ہے دن بھر اور خواب گراں دے جاتا ہے
گم ہو جاتی ہیں تدبیریں آگے بڑھ کر تقدیروں میں
یہ وہم و حقیقت کی دنیا بے تاب سی ہے تعبیروں میں
اک فکر و نظر کا زعمِ غلط ہستی کو ڈستا رہتا ہے
ہر لمحہ نیا غم دل کی تمناؤں میں بستا رہتا ہے
اک جبرِ مسلسل کے ہاتھوں دم توڑ رہی ہے مختاری
اک خوابِ پریشاں لوٹ رہا ہے ہر کروٹ میں بیداری
ہر سانس ہے اک آوازۂ اجل ہستی کا سفینہ کھیتی ہے
ہر ساعت فطرتِ گیتی کو اک حوصلۂ غم دیتی ہے

میکش

شاعرِ مشرق کی یاد

اقبال کو گزرے ہوئے چھ سال ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں اس کے بلند افکار سے بہ قدرِ فہم استفادہ کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اس کا تصورِ حیات، ایک متحرک اور کامراں زندگی کی تخلیق تھا اس لئے اگر اس کے پیام نے اپنی مقناطیسی کشش سے انسانیت کو اپنی طرف کھینچا ہو تو تعجب کی بات نہیں وہ ادب کبھی نہیں مر سکتا جس میں حیات آفریں تازگی ہو۔ اقبال کی ادبی تخلیق حال کو سنوارتے ہوئے ایک بلند تر مستقبل کی تعمیر کے لئے تھی۔ نقطہ پرستی اور تصور سازی کے اس تغیر پذیر دور میں جب کہ زندگی اپنے لئے ایک صحت بخش راستہ ڈھونڈھ رہی ہے، اقبال کا آرٹ ہمیں ایک روشن شمع کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

اقبال ایک ارتقائی شاعر تھا۔ اس کی مسلسل فکری تبدیلیاں بتاتی ہیں کہ وہ اپنے اُڑنے پروازِ تخیل کے لئے ہر لحظہ وسیع تر ماحول ڈھونڈھتا رہا ہے۔ وہ تقلیدی اثر اس کے کلام میں بہت دن تک نہیں رہ سکا جو داغ زدہ ماحول کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد اس کی منظر پرستی اور اس کا احساسِ وطنیت بھی زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا اور رفتہ رفتہ اس کی فکر و نظر نے اس کی ذہنی پختگی اور اس کی ذہنی وسعت کو اسلام کے توسط سے ساری انسانیت پر محیط کر دیا اور یہیں ہمیں اس کی شخصیت اور اس کا آرٹ اپنے اصلی روپ میں دکھائی دیتا ہے۔

اقبال نے اس آرٹ سے بیزارگی کا اظہار کیا ہے جس میں بیٹروں کے حسن کا جادو، شہ پرِ دل کو سلا دیتا ہے آرٹ افیونی کا خواب بیداری نہیں۔ اور نہ ایسی نامعلوم منزل ہے جہاں سے کسی رہرو کا پلٹ آنا ممکن نہ ہو۔ اس کے نزدیک آرٹ منزل نہیں بلکہ منزل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آرٹ بجائے خود حسن ہے جس کی حرارت دلوں میں ایک ولولہ ایک جستجو اور ایک خواہش پیدا کرے۔ اس کے نزدیک آرٹ کا مقصد ایک مسلسل حرکت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسن کار ایک بلند پرواز شہباز کی طرح فلک پیمائی کر سکتا ہے لیکن اسے اتنا اختیار ہونا چاہیے کہ وہ اپنے شکار کے نیچے اتر سکے آرٹ خارج کا تابع نہیں بلکہ اس کا ماخذ اور حسن کار کے حقیقی جذبات کا مظہر ہے۔ اس نے ایک مقام پر بتایا ہے کہ آرٹ، آزادی کا مصرعہ ہے غلامانہ ذہنیت اس سے گریز اور فرار کا کام لیتی ہے۔ غلاموں کے الفاظ تماشائیوں کے لئے جاذبِ نظر ہوتے ہیں لیکن آزاد قوموں کے حسن کارانہ نقوش اربابِ نظر کو معنی کی گہرائیوں میں لیجاتے ہیں۔ حسن خود ہم میں موجود ہے لیکن غلام فکر حسن کو فطرت سے مستعار لے کر اس کی نقل اتارتی ہے۔ غرض یہ کہ اقبال کے نزدیک آرٹ، ایک اظہار ہے جو اسکے خواہش کی تخلیق اور حقیقت کو متشکل کرتا ہے۔

اقبال کا آرٹ، شہنائی کا دردناک نغمہ نہیں بلکہ ایک بانگِ درا ہے۔ وہ لوری نہیں بلکہ ایک پیامِ بیداری ہے۔ وہ لفظوں کا کفن نہیں بلکہ حرکت و حیات کا ایک پرچم ہے۔ اس کی علو خیالی، اس کی وسعتِ نظر، اس کی حسن کارانہ صداقت اور اس کا خلوصِ اظہار ان سب کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ انسانیت کو اس کے صحیح مقام پر دیکھے۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ دنیا نظر فریب تصورات کے ہجوم میں انسانیت کے لئے ایسے مقام کو ڈھونڈھ رہی ہے جہاں مجاور قبروں کی تقسیم میں لاشوں کو روندتے ہوئے نہ گزریں۔ اقبال کا کلام اور اس کا پیام ہماری صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ آج چھ سال کے بعد بھی ہماری عقیدت مندی، اس کا خراجِ تحسین ادا کرنے میں اسی طرح فخر محسوس کر رہی ہے اور ہمارا مستقبل "تعمیرِ نو" میں مدد لینے کے لئے اس کے پیام سے بنیادیں مانگ رہا ہے۔

میکش

اقبال

شاعری اور شاعروں کی نسبت ہمیشہ سے مختلف قسم کے خیالات دنیا میں مروج رہے ہیں۔ کبھی کوئی قوم قدیم عربوں کی طرح شعر کو ایک اعجاز اور شاعر کو قوم کے لئے ایک سرمایۂ قوت تصور کرتی تھی۔ اور قبیلے میں شاعر کا ظہور ایک نعمت عظمیٰ خیال کیا جاتا تھا۔ کبھی یہ ہوا کہ شعرا اور اس کے ساتھ شاعر ایسا ذلیل ہوا کہ سقراط اور افلاطون جیسے مصلحین نے یہ ضروری سمجھا کہ اپنی مجوزہ تصوری مملکت میں سے یا تو شعراء کو بالکل خارج کر دیا جائے یا ان پر بڑے زور کا احتساب قائم کیا جائے کہ وہ قوم کو اخلاقی ضرر نہ پہنچا سکیں۔ مسلمانوں کی نسبت عام طور پر یہ رائے صحیح ہے کہ یہ قوم ہمیشہ ایک شعر پسند قوم رہی ہے۔ لیکن جہاں شعر سے اکثر ناجائز کام لینے کا رواج عام ہوا وہاں مسلمانوں میں بھی شعرا اور شاعر پاکبازوں اور مصلحین کی نظروں سے گر گئے۔ خود مولانا رومؒ جن کی تمام تر تصنیف منظوم ہے فرماتے ہیں کہ میرے وطن میں شاعری کو بہت ذلیل خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے میں عام اور خاص کی تلقین کے لئے اس امر پر مجبور ہو گیا کہ اپنے جذبات اور افکار کو نظم میں ادا کروں۔ شاعری اگر اپنی غلط روی سے ذلیل بھی ہو جائے تو بھی اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اس میں سحر اور قوت باقی رہتی ہے۔ افلاطون نے شاعروں کو بہت برا بھلا کہا لیکن وہ خود اپنی نثر میں بھی کسی بلند پایہ شاعر سے کم نہیں۔ مولانا حالی نے جب قوم کے اخلاقی انحطاط کے وجوہ پر نظر دوڑائی تو وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس تخریب میں ایک زبردست عامل وہ شاعری بھی ہے جو صدیوں سے غلط راہوں پر پڑ کر قوم کے تخیلات اور جذبات کو خراب کر رہی ہے۔ شعر و قصائد کے ناپاک دفتر کے خلاف انھوں نے احتجاج کیا۔ ان کے یہ شعر مشہور ہیں۔ لیکن اس میں لطیفہ یہ ہے کہ شاعروں کی مذمت کے لیے بھی وہ شعر کہنے پر ہی مجبور ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شعر کس قدر فطری اور ناگزیر قوت ہے۔ اس قوت کا صحیح استعمال وہ انقلاب پیدا کر سکتا ہے جو کسی اور ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے برعکس اس کا غلط استعمال احساسات اور فطریات حیات میں وہ خرابی پیدا کر سکتا ہے جو قوم کی رگوں میں سم قاتل کی طرح دوڑتی رہے۔ شاعر اگر اپنی قوت کا صحیح استعمال کرے تو تلمیذ الرحمٰن ہو جاتا ہے۔ اگر غلط استعمال کرے تو تلمیذ الشیطان بھی بن سکتا ہے۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ اگر میرے ترانے کسی قوم میں رائج ہو سکیں تو میں قطعاً اس کی پرواہ نہیں کروں گا کہ اس قوم کے لئے قوانین کون بناتا ہے۔ شعر کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے۔ اور دلوں کی کیفیات پر باقی تمام زندگی کا مدار ہے حضرت اکبر فرماتے ہیں کہ

"دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے"

اور تعلیم میں سب سے زیادہ موثر چیز وہ ہے جو شعر کے ذریعے سے اثر پیدا کرے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو بہت سے اچھے اشعار یاد تھے اور وہ اکثر لوگوں سے فرماتے تھے کہ اپنے بچوں کو اچھے اشعار یاد کرایا کرو۔

ایک بلند خیال شاعر کا وجود نوع انسان کے لئے بڑے روحانی فیض کا باعث ہوتا ہے اچھی شاعری نبوت کا

ایک جزو ہے۔ اسی لئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی نبی کو لوگوں نے شاعر سمجھ لیا۔ اور بعض شاعر اگر نبی نہیں تو کم از کم متنبی ہو گئے۔
حضرت اقبال کو فطرت نے یہ ملکہ غیر معمولی مقدار میں ودیعت کیا۔ شروع میں انھوں نے کسی قدر تقلیدی اور روایتی شاعری بھی کی اور ایک زمانہ ان پر ایسا بھی آیا کہ ان کو خیال پیدا ہوا کہ ان کی قوم شاعری سے سست عمل ہو گئی ہے۔ لہذا بہتر ہو اگر شاعری کی شراب کی کشید اس قوم کے لئے بند کر دی جائے اور کوئی علمی اور عملی کام کیا جائے۔ اپنے دوست سر عبدالقادر کے سامنے انھوں نے اس ارادے کا اظہار کیا۔ یہ اسی زمانہ کا مصرع ہے:-

کہ کام جو کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

سر عبدالقادر اور سر آرنلڈ نے ان کو یقین دلایا کہ تمھاری شاعری وہ شاعری نہیں ہے جو عمل کی منافی ہو۔ بلکہ اس کے ذریعہ سے تم قوم کے اندر زبردست قوت عمل پیدا کر سکتے ہو۔

اس کے بعد حضرت اقبال نے ترک شاعری کا خیال چھوڑ کر شاعری سے وہ کام لینا شروع کیا جو اردو اور فارسی شاعروں کی تاریخ میں کسی دوسرے شاعر نے نہیں لیا۔ شاعری کی جو عام کیفیت اقبال سے پہلے تھی۔ اس کا نقشہ کھینچنا یہاں مقصود نہیں ہوس پرستی قافیہ پیمائی زبان کا چٹخارہ عام شاعری کا سرمایہ تھا۔ حالی نے دوسری روش اختیار کی تو شاعروں نے کہنا شروع کیا کہ یہ شاعر نہیں واعظ ہے۔ اسی طرح مدت دراز تک شاعروں نے اقبال کو بھی شاعر نہیں سمجھا جس زمانہ میں میں طالب علم تھا اقبال کی مشہور نظمیں شمع و شاعر شکوہ اور جواب شکوہ شائع ہوئیں۔ میرے سامنے انھوں نے اس امر کا نہایت افسوس ظاہر کیا کہ ہماری قوم کے نقاد کسی نظم کی نفسیات پر تنقید کرنا نہیں جانتے۔ اپنی نظموں پر جب کبھی کوئی تنقید دیکھتا ہوں تو اس میں یہی ہوتا ہے کہ فلاں لفظ کو دہلی یا لکھنؤ والے مذکر باندھتے ہیں۔ اقبال نے مونث باندھا۔ فلاں محاورہ ٹکسالی نہیں ہے۔ فلاں مصرع میں پہلوئے ذم بھی نکلتا ہے۔ کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں کہتا کہ یہ نظم تاثیر کے لحاظ سے کیا ہے۔ اس کا نظریۂ حیات کیا ہے۔ فقط حضرت اکبر الہ آبادی نے ان کو لکھا کہ میں آپ کی نظم شمع و شاعر کو پڑھتا نہیں بلکہ اس کی تلاوت کرتا ہوں۔ اور سوتا ہوں تو اس کو اپنے تکیہ کے نیچے رکھتا ہوں جب اقبال کی شاعری رفتہ رفتہ مقبول خاص و عام ہو گئی۔ اس وقت بھی بعض مشہور شاعر اقبال کو شاعر نہیں سمجھتے تھے اور بعض ایسے شعرا اب بھی موجود ہیں اگر کبھی داد دینے میں فراخدلی برتتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ بھائی اس کو حکیم کہو فلسفی کہو مصلح کہو لیکن شاعر نہ کہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی شاعری کو اور متقدمین اور متاخرین میں اپنے جیسوں کی شاعری کو معیار قرار دے لیا ہے۔ اور اقبال ان کو اس معیار پر کم عیار معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت اقبال کی بلند نظری کا تقاضا کہ انھوں نے ایسے لوگوں سے کبھی الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے لبوں پر بھی غالباً وہی مضمون آتا ہوگا جو حضرت مسیح کی بابت انجیل میں مرقوم ہے کہ انھوں نے اپنے ایذار سانوں کی نسبت فرمایا کہ اے خدا انھیں معاف کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ حضرت اقبال کے ہاں شاعری کا مقصد اور اس کا معیار اس قدر مختلف ہو گیا تھا کہ یہ لوگ اقبال کو شاعر نہیں سمجھتے تھے اور اقبال ان کو شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ایک شاعر نے اپنا دیوان میرے پاس بھیجا ہے۔

یہ مشہور آدمی ہیں میں نے شروع سے آخر تک مختلف نظموں پر نظر دوڑائی۔ کہ خدا کا بندہ کہیں بھول کر کوئی شعر کہہ جائے لیکن افسوس کہ تمام دیوان میں ایک شعر بھی نہیں نکلا حضرت اقبالؔ نے شاعری کا معیار اتنا بلند کر دیا کہ ان کے سامنے اور ان کے بعد بھی اب روایتی غزل گوئی اور قافیہ پیمائی لوگوں کی نظروں میں نہیں جچتی۔ اگرچہ حضرت اقبالؔ کے اثر اور ان کی ہر دلعزیزی سے اردو شاعری میں ان کی نقالی کا ایک طوفانِ بے تمیزی بھی پیدا ہو گیا ہے۔ جس اخبار یا رسالے کو اٹھاؤ ایک یا دو نظمیں ایسی ضرور مل جائیں گی جن میں کسی نہ کسی صاحب نے اقبالؔ بننے کی کوشش فرمائی ہے۔ ان نظموں کا معیار اکثر بہت پست ہوتا ہے۔ لیکن بے اصل ہوس پرستی کے تغزل کے مقابلہ میں یہ بھی غنیمت معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت اقبالؔ کی شعر گوئی میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ کبھی فرمائشی نظم نہیں لکھ سکتے تھے۔ ابتدا میں وہ ایک مشاعروں میں شریک ہوئے، اس کے بعد تمام عمر کبھی کسی مشاعرے میں شریک ہونے کی خواہش ان کے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ لوگ ان کی طبیعت کے اس انداز سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ لاہور میں بڑے بڑے معرکے کے مشاعرے ہوتے تھے۔ لیکن کبھی کوئی شخص حضرت اقبالؔ کو مدعو کرنے کی بھی جرأت نہیں کرتا تھا مشاعروں میں شعر پڑھنا تو درکنار احباب کی صحبتوں میں بھی وہ کبھی کبھار اپنی مرضی سے کوئی شعر یا نظم سنا دیں تو سنا دیں ورنہ نہ وہ عام طور پر شعر سناتے تھے۔ اور نہ ان کی طبیعت کو جاننے والے ان سے شعر سنانے کی درخواست کرتے تھے۔ جب وہ حیدرآباد تشریف لائے تو ایک مشہور شاعر نے ان کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اپنا کلام سناؤں گا اور ان کا کلام سنوں گا۔ اس بے چارے نے اپنا سر پیٹ لیا۔ لیکن حضرت اقبالؔ نے ایک شعر سے بھی ان کی دعوت کی قیمت ادا نہ کی۔ اور اس سے زیادہ صدمہ اس شاعر کو اس بات کا ہوا کہ حضرت اقبالؔ نے بھی اس سے فرمائش نہ کی کہ حضرت کچھ اپنا کلام سنائیے۔ یہی حال ایک بڑے امیر و کبیر کی محفل میں ہوا جس نے بہت سے امیروں اور قافیہ پیماؤں کو ان سے ملنے کے لئے جمع کیا تھا۔ حضرت اقبالؔ نے اس شرط پر دعوت قبول فرمائی کہ میں شعر نہیں پڑھوں گا۔ ایک دفعہ مجھ سے فرماتے تھے کہ میں نے کبھی شعر کی خاطر شعر نہیں کہا۔ جب تک خاص کیفیت خود بخود پیدا نہ ہو میں شعر نہیں کہتا میں آورد سے شعر کہنے کا قائل نہیں ہوں۔ ایک مرتبہ دنیاوی حیثیت سے ایک بہت بلند ہستی کا نزول اجلال علی گڑھ میں ہوا۔ یونیورسٹی کی طرف سے ایک مقتدر بزرگ لاہور تشریف لائے اور علی گڑھ کے ارباب حل و عقد کی طرف سے گزارش کی کہ یہ ایک بڑا اہم موقع ہے۔ آپ علی گڑھ تشریف لائیے اور ایک نظم پڑھ دیجیے۔ دن بھر وہ صاحب ان کی منت سماجت کرتے رہے کوئی بھی اور شاعر ہوتا تو اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا لیکن اقبالؔ تھے کہ بالکل ٹس سے مس نہ ہوئے آخر جب تنگ آ گئے تو غالباً ٹالنے کے لئے یہ فرمایا کہ اچھا بھئی آج رات میں حسب موقع اور حسب حال اگر کچھ اشعار موزوں ہو گئے تو کل تمہارے ساتھ علی گڑھ چلوں گا۔ دوسرے روز وہ صاحب ان کے حکمت کدہ پر پھر کچھ امید لے کر حاضر ہوئے میں بھی ان کے ہمراہ تھا پوچھا۔ فرمائیے کہ کچھ الہام ہوا یا نہیں۔ جواب ملا کہ کل رات میں جلد ہی بستر پر اس خیال سے لیٹ گیا اور حقہ پاس رکھوا لیا کہ کچھ شعر اس موقع کے مناسب نازل ہوں لیکن شعر بھی عجیب چیز ہے۔ بلانے سے نہیں آتا۔ بن بلائے آ جاتا ہے۔ آپ کی مطلوبہ نظم کا ایک شعر بھی نازل نہیں ہوا۔ مگر ایک موضوع کی نظم خود بہ خود موزوں ہونے لگی اور بن بلائے

یکے بعد دیگرے کئی شعر نازل ہو گئے تمسخر سے فرمانے لگے کہ اب تم علی گڑھ چلے جاؤ اور میری طرف سے ایک نظم پڑھ دو۔ میں نے عرض کیا کہ کہاں آپ کی نظم اور کہاں میری نظم۔ وحی میں اگر اختراع گناہِ کبیرہ ہے تو الہام میں اختراع بھی اس سے کم نہیں اور دوسرے یہ بات ہے کہ میرے پاس بھی تو اس موقع کے لئے کوئی نظم نہیں۔ فرمانے لگے ریل میں لکھ لینا۔ ریل کی حرکت شعر گوئی کے لئے بہت موزوں ہوتی ہے۔ شعر بھی ایک حرکت ہے۔ یہ دونوں حرکتیں اکثر اوقات ہم آہنگ ہو جاتی ہیں غرض یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہلے اور نہ نظم لکھی ان کے شعر کہنے کے متعلق مجھے ایک بات یاد آگئی۔ شعر گوئی سے بے بہرہ لوگ اکثر شاعروں سے پوچھا کرتے ہیں کہ آپ شعر کیسے کہتے ہیں خیالات کہاں سے آجاتے ہیں۔ شعر کی زمین اور ردیف و قافیہ کا انتخاب آپ کس طرح کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت اقبال سے بھی ایک صاحب نے دریافت فرمایا انھوں نے اس سوال کا ایک نہایت لطیف جواب دیا۔ کہ فطرت کے اندر ہر تخلیق فعل جس میں انسان کچھ پیدا کرسکتا ہے ایک خاص نوعیت کے جذبہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ مجھ کو جذبۂ شعر بھی ایک جنسی جذبہ معلوم ہوتا ہے اس کی تحریک بھی اسی طرح سے یک بیک پیدا ہو کر ناقابل اور لذت آفریں معلوم ہوتی ہے اور یہ محض تشبیہ نہیں ہے کہ شاعر اپنے اشعار کو مصنف اپنی تصنیف کو اور فن کار اپنی پیداوار کو اپنی اولاد سمجھتا ہے۔ شاعر جس احساس کو آمد کہتے ہیں حضرت اقبال نے اس کی ایسی دلکش تشریح کی کہ اس کی تمام نفسیات کو دو فقروں میں ادا کر دیا۔

جب حضرت اقبال نے بار بار یہ سنا کہ اکثر نقادان فن کہتے ہیں کہ جو شاعر شعر کو علم و حکمت یا پیغام عمل کے لئے ایک واسطہ بناتا ہے وہ اصل شاعر نہیں اور اصل شاعر وہ ہے جو کوئی خاص مقصد نہ رکھتا ہو اور کسی خاص نظریۂ حیات کی تلقین نہ کرے۔ بلکہ زندگی کی تمام وادیوں میں گھومتا پھرے اور اپنے تاثرات کو موزوں کلام میں تبدیل کرتا رہے۔ ہر فن لطیف بے غرض اور بے مقصود ہونا چاہیے اور حسن بیان آپ ہی اپنا مقصد ہے۔ جب دیکھا کہ اکثر لوگ یوں ہی سمجھتے ہیں تو انھوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ:۔

شعر کجا و من کجا فکر سخن بہانہ ایست
سوئے قطار مے کشم ناقۂ بے زمام را

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ خدا اس شخص کو نہ بخشے جو مجھ پر شاعری کی تہمت لگائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی شاعری میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ فقط شاعری نہیں اور شعر ایک ایسی شراب کا پیمانہ ہے جو شاعری نہیں۔

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

لیکن کیا ضروری ہے کہ ہم شاعری کے متعلق یہ انداز بیان اختیار کریں کہ وہ حقیقی شعر جو روح کی گہرائیوں میں ڈوب جائے اور زندگی کی حقیقتوں میں غوطہ لگائے اس کی نسبت ہم یہ کہہ دیں کہ یہ فقط شاعری نہیں۔ یہ کیوں نہ کہیں کہ اصل شاعری یہی ہے اور جو اس معیار پر صحیح نہ اترے وہ شاعری نہیں ورزش سخن ہے، قافیہ پیمائی ہے، ہوس تخیل

ہے ابلہ فریبی ہے تضیع اوقات ہے۔ اقبال نے نوع انسان کی عام طور پر اور اپنی قوم کی خاص طور پر یہ خدمت کی ہے کہ مشرق اور مغرب اور ماضی و حال کے اعلیٰ ترین افکار کو سوز و گداز کے خم میں ڈبو کر شراب طہور بنا دیا ہے حکمت تصوف روحانیت اور اخلاق کے ابدی حقائق کا ایک خزانہ اس شاعری میں موجود ہے اس سے پہلے بھی اردو اور فارسی میں ایسے شعراء گزرے ہیں جن کے کلام میں اسی قسم کے جواہر پارے ملتے ہیں لیکن اقبال کی شاعری کا کمال اس کی جامعیت میں ہے۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ سنائی عطار اور مولانا روم کا تصوف۔ عرفی اور غالب کی حکمت پسندی پیغام احیا پیغام عمل زندگی کا کوئی اہم پہلو نہیں جو اقبال نے نظر انداز کیا ہو۔ فشٹے اور نطشے کا فلسفۂ خودی روحانیت کی لے خودی کے ساتھ ہم آغوش ملتا ہے۔ اردو اور فارسی پر کیا منحصر ہے کسی دوسری زبان میں بھی شائد کوئی ایسا شاعر ملے جس کے کلام میں افکار کی ایسی ندرت اور ایسی ثروت پائی جائے۔ یہ اسی ثروت افکار کا باعث ہے کہ گزشتہ دس سال میں ہزار ہا مضامین اقبال پر لکھے گئے ہیں لیکن افکار اقبال کی تشریح ابھی باقی ہے۔ افکار اقبال بھی فطرت کی طرح بے پایاں ہیں۔ ایک ایک شعر کی شرح میں ایک ایک کتاب تصنیف ہو سکتی ہے۔ اقبال کے افکار کے متعلق یہ خدشہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ جلدی سے دنیا آگے نکل جائے گی اور یہ دفتر تقویم پارینہ ہو جائے گا۔ ابدی حقائق کسی ایک زمانہ کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں۔ جب تک اردو اور فارسی زبانیں دنیا میں موجود رہیں گی کلام اقبال کو ان کے اندر وہی مرتبہ حاصل رہے گا جو اطالوی زبان میں ڈانٹے کو، انگریزی زبان میں شکسپیر کو اور جرمن میں گوئٹے کو حاصل ہے۔

خلیفہ عبد الحکیم

شاد اقبال :- اقبال اور شاد دونوں کی ہستیاں محتاج تعارف نہیں۔ البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے گی کہ علامہ اقبال مرحوم اور مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنتہ کے درمیان پچیس تیس سال تک جو مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے اور اس سے بڑھ کر مسرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ ان گراں مایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ شاد اور اقبال کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت عہ/ صفحات (۱۷۶)

اقبال شاعر یا مفکر؟

اقبال کو رخصت ہوئے تقریباً چھبّے سال ہوتے ہیں۔ اس قلیل عرصہ میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے اقبال کی عظمت کا اعتراف کیا جا چکا ہے۔ عقیدت کی یہ داستان بے پایاں ہے اور کیوں نہ ہو ؎

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اقبال نے یہ شعر کمال کے بارے میں کہا تھا۔ کمال یہ ہے کہ جو کچھ اس نے کسی اور کے بارے میں کہا وہ خود اس پر صادق آتا ہے۔

آج کل ہر ایک دوسرے کو یہ منوانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اقبال فلسفی شاعر تھا۔ کوئی اڑتا ہے کہ نہیں اقبال پہلے شاعر تھا اور پھر فلسفی۔ کوئی بنگارتا ہے کہ وہ فلسفی پہلے تھا اور شاعر پیچھے القصہ جیسے منہ ویسی بات۔ آئیے اسی زاویۂ نگاہ سے اقبال کا ذکر خیر ہے۔ (مجھے جو کچھ کہنا ہے بے دھڑک کہوں گا۔ آنکھیں چار نہ ہوں تو مروت کا ہے کی۔ آپ کو ناگوار معلوم ہوگا تو زیادہ سے زیادہ آپ اپنے ریڈیو سٹ کی سوئی کسی اور طرف گھما دیں گے۔ اس سے نہ میرا ہی نقصان ہوگا نہ اقبال کا)

میرے اور غالباً بہتوں کے نزدیک اقبال بہت بڑا شاعر ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں۔ ساری بحث اس پر ہے کہ وہ فلسفی تھا یا نہ تھا۔ میں عرض کروں گا کہ وہ فلسفی نہیں تھا۔ فلسفی نہ شاعر ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ فلسفہ اور شعر طاؤس و مار ہیں جن میں دوستی کبھی تھی اور نہ رہے گی۔ خود اقبال نے بارہا مختلف طریقوں سے جتایا ہے کہ وہ فلسفی نہیں ہے اس لئے کہ فلسفی ہنگامۂ حیات سے دور رہنے کے باعث زندگی کی قدروں سے اسی طرح ناآشنا رہتا ہے جس طرح ایک ریاضی داں ہندسی شکلوں سے کاغذ سیاہ کر کے پھولا نہیں سماتا اور سمجھتا ہے کہ زندگی کی ساری لذت اسے حاصل ہے۔ فلسفہ زندگی سے علٰحدگی اور بے تعلقی کا نام ہے ؎

انجام خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفۂ زندگی سے دوری

اس قسم کی صاف گوئی کے نمونے اقبال کے کلام میں آپ کو جا بجا ملیں گے۔ ان کھلے بیانات کے ہوتے کیا یہ زبردستی نہیں کہ اسے جبراً فلسفی بنانے کے لئے دوہوم دہام کے مقالے لکھے جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ فلسفے سے اسے سدا دلچسپی رہی۔ فلسفہ کا اس نے گہرا مطالعہ کیا۔ لیکن کیا فلسفہ پڑھنے یا پڑھانے سے کوئی فلسفی ہوتا ہے۔ فلسفہ شاعر کی نظر میں گہرائی پیدا کر سکتا ہے لیکن شاعر نہیں بنا سکتا۔ جس طرح فن عروض جاننے سے کوئی ناشاعر کبھی شاعر نہیں بنا۔ بقول اقبال فلسفہ جس طرح زندگی سے دوری کی علامت ہے۔ ریزی عروض دانی شاعری سے دوری کی علامت ہے۔

عروض کا یہ حوالہ میں نے بے سبب نہیں دیا۔ فلسفے کی خشک عقلیت اور استادانہ قسم کی شاعری سے جو عروض کے کانٹوں پر تلتی ہے، اقبال کو سدا نفرت رہی۔ بہت دنوں کی بات ہے اقبال کی مثنوی بے خودی چھپ رہی تھی یا چھپ کر نکل چکی تھی۔ اس زمانہ میں مجھے سنک سوار ہوئی کہ اقبال کا اسی طرح مراسلتی شاگرد بنوں جس طرح وہ خود استاد داغ کے شاگرد رہے۔ کاش برائے نام ہی مجھے یہ شرف حاصل ہوتا لیکن اقبال نے جواب جو کچھ مجھے لکھا اس سے کم از کم یہ شرف تو مجھے حاصل ہوا کہ میں نے اقبال کو پہچانا چند

الفاظ اس خط کے یہاں اس لئے دہراتا ہوں کہ ان سے شعر و شاعری کے بارے میں اقبال کے تصور کا آپ کو صحیح اندازہ ہو سکے۔ لکھا تھا۔

"عزیز من۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے جو حسن ظن آپ نے میرے بارے میں فرمایا ہے اس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کو اگر فن سیکھنا مقصود ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کا انتخاب ٹھیک نہیں۔ شاعری کے دو لوازم ہیں۔ زبان اور مضمون۔ زبان مجھ سے بہتر جاننے والے دکن میں موجود ہیں اور مضمون آفرینی ایسی شئے نہیں کہ سکھائی جا سکے۔ یہ ایک قدرتی عطیہ ہے۔ استاد شاگرد کی کوئی مدد اس امر خاص میں نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ فن شاعری میں مجھے خود کوئی درک نہیں اور اگر میں نے اشعار کو خیالات کا ذریعہ بنایا ہے تو اس سے نمائش فن نہیں۔ میں مسلمانوں اور ان کے نبی کی محبت دل میں رکھتا ہوں اور اسی کو سرمایۂ نجات جانتا ہوں۔ یہی محبت کبھی کبھی اشعار کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور بیدرد لوگ ان اشعار کو عروض و قافیے کے معیار پر پرکھتے ہیں۔ یہ چیز آپ کے سامنے حاضر ہے لیکن اس سے متاثر ہونے کے لئے صحبت کی ضرورت ہے۔ تاہم خطوط کے ذریعے سے جو کچھ بن آپ کے لئے کر سکتا ہوں اس کے لئے حاضر ہوں۔ آپ کبھی کبھی خط لکھا کریں۔ جواب میں انشاء اللہ کبھی دریغ نہ ہوگا۔"

آپ کا مخلص۔ محمد اقبال۔ لاہور ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۸ء

افسوس کہ یہ سلسلہ کچھ ہی دنوں جاری رہا اور بڑی بدقسمتی یہ کہ سوائے اس خط کے اور چند ایک خطوط جو اقبال نے مجھے لکھے تھے میں نے گنوا دیئے۔

بہرحال اس عبارت سے آپ نے اتنا ضرور محسوس کیا ہوگا کہ اقبال عروض کی ترازو میں تلنے والے شاعروں کی صف میں نہیں آتا۔ تاہم وہ بہت بڑا شاعر تھا۔ ایسا شاعر جس نے شاعری کے زاویے اور زندگی کے نظریے بدل دیئے۔ وہ ایک ایسی شاعری کا علمبردار ہے جو زندگی کی طرح بیکراں اور ہر آن نئے روپ بدلتی ہے۔ اقبال نے ایک جگہ زندگی کی بیکرانی کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کی شاعری پر بھی وہ کہا پورا اترتا ہے میں کسی قدر تصرف کے ساتھ اقبال کا ایک شعر پیش کرتا ہوں ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے شاعری　　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے شاعری

اس قسم کی شاعری اور ایسی شاعری کرنے والا عام شاعروں سے الگ تمیز رکھتا ہے۔ اوروں کی طرح ذی روح وہ بھی ہے لیکن اس کی روح اپنے لئے نت نئے میدان اور وسیع تر آسمان تلاش کرتی رہتی ہے جس کے آگے تاروں کی دنیا پھیکی پڑ جاتی ہے جس کے کارواں در کارواں خیالات کے آگے چرخ نیلی فام کی فضا دھندلی پڑ جاتی ہے۔ جس کی جبین نیاز میں سجدے تڑپتے ہیں تو بہتیرے بے نیاز اور نیاز مند قسم کے علامہ آنکھیں مل مل کر چونکتے ہیں لیکن پھر بھی خاک دکھائی نہیں دیتا کہ اقبال کی جبین نیاز میں سجدے کیسے تڑپتے ہیں جو شاعر جبریل کو صید زبوں سمجھا اسے فلسفے اور عروض کی کمند میں کوئی کیوں کر پھانسے گا۔

بہرحال اقبال فلسفیوں اور فن دانوں کی چھلانگ سے بلند و بالا انسان تھا۔ کیا کسی کا ایک بہت بڑا شاعر ہونا کافی نہیں کہ زبردستی اسے فلسفی بنانے کی کوشش کی جائے اس معنی میں وہ فلسفی ضرور تھا کہ حیات اور حقائق حیات کے بارے میں وہ اپنا ایک خاص مسلک اور زاویۂ نگاہ رکھتا تھا۔ اس کے زاویۂ نگاہ سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی تیز نگاہی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ہر بڑا شاعر اس معنی میں اپنا زاویۂ نگاہ۔ یا پیام۔ یا فلسفۂ حیات رکھتا ہے۔ آنریبل غلام محمدؒ نے ابھی حال میں حیدر آباد کی "بزم اقبال" کے یوم اقبال کے موقع پر ایک بات پتے کی کہی جس سے میرے خیال کو تقویت ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اقبال اور براؤننگ کا فلسفۂ حیات اصلاً ایک ہے۔ دونوں دعوت عمل دیتے ہیں۔ لیکن انگریزی ادب کے کسی متوازن دماغ طالب علم سے پوچھئے کہ براؤننگ اس اعتبار سے فلسفی کہا جا سکتا ہے جیسا کہ ہندوستان والے اقبال کو بنا رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ہر فلسفی اپنا ایک الگ اور انوکھا نظام فکر رکھتا ہے۔ آئیے اس نگاہ سے دیکھیں کہ وہ چیز جس نے بہتوں کو مغالطے میں ڈال دی ہے کیا سچ مچ وہی ہے جسے اصطلاحی معنی میں فلسفہ کہتے ہیں۔ کیا اقبال کا فلسفۂ حیات اپنے اندر وہ یکتائیت رکھتا ہے کہ اسے برگساں ہیگل اور نطشے کے قبیل کا انسان کہہ سکیں۔ یہ تھا تو پھر ان فلاسفہ کی طرح اس نے نثر کو اپنے خیالات کے اظہار اور اشاعت کا واحد ذریعہ کیوں نہیں بنایا واقعہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں نظم کی بجائے نثر ہی اس کے خیالات کے پرچار کا بہتر ذریعہ ثابت ہوتی اس نے رومی کے ہاتھ پر کیوں غائبانہ بیعت کی اور رومی کی طرح شعر و شاعری کی دنیا میں کیوں پناہ لی۔ ظاہر ہے کہ وہ نرو برگزیدہ شاعر تھا دنیائے آب و گل کے بکھیڑوں اور فلسفے کے الجھیڑوں میں خود کو الجھانا نہیں چاہتا تھا جہاں کہیں اس نے الجھنے کی کوشش کی۔ وہ نہ فلسفی ہی رہا نہ شاعر۔

آئیے اس کے پیام کا جسے فلسفہ یا پیام کہنے کی بجائے اس کی تعلیمات کہنا زیادہ مناسب ہے ایک سرسری تجزیہ کرلیں۔ اس کی تعلیم کا لب لباب ہے۔ خودی یہ خودی اس کا اپنا تراشا ہوا لفظ ہے جس کی معنویت کے آگے اس لفظ کا لغوی تصور ایک سرے سے غائب ہو گیا۔ اقبال جس خودی کی تلقین کرتا ہے وہ پندار اور رعونت کے منافی ہے۔ اس سے مراد وہ خود اعتمادی وہ عزت اور تعمیر نفس ہے جس سے فرد کی قیمت اور ساکھ بڑھتی ہے۔ ہر فرد غیور باعزت اور جری ہے تو یہی چیز پوری قوم کی رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے۔ خود لکھتا ہے ؎

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات　　　یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ　　　زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا

گوہر شبنم آنسو یہ سب کیا ہیں وہی فرد یا قطرے کی خودی کے مختلف مظاہر جن سے دل کائنات دھڑک رہا ہے۔ زندگی کا اتھاہ سمندر اسی ایک بوند پانی میں بند ہے۔ یہی چیز رائی کو پربت بناتی ہے اور اسی کی کمی سے پربت رائی کا دانہ بن جاتا ہے۔

اپنی تعلیمات کے اس بنیادی تصور کو واضح اور خاطر نشین بنانے کے لئے اقبال نے رسول عربی کی تعلیم اور فلسفۂ اسلام کا سہارا لیا ہے اور پیر رومی کے تو وہ اتنے معتقد ہیں کہ ان کے آگے فلاسفۂ مغرب کو وہ خاطر میں نہیں لاتے۔ حالانکہ مغرب کی

علمی خانقاہوں سے بھی انھیں کچھ کم فیض نہیں ملا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہوئی کہ اقبال کے شاعرانہ تصورات میں جسے بعض نے فلسفہ سمجھے ہوئے ہیں کہیں بھی وہ اپج اور انوکھا پن نہیں جسے ایک الگ نظامِ فکر کے تحت مربوط کیا جاسکے اور جس کے متعلق یہ کہہ سکیں کہ یہ اقبال کا فلسفہ ہے۔ فلسفۂ اسلام کے بنیادی اصولوں کو جوڑ جاڑ کر ان کے اپنے انداز میں بیان کردینے سے یہ فلسفہ اقبال کا اپنا فلسفہ نہیں کہا جاسکتا کیا قرآن کے زبان پہلوی میں اترنے کے بعد قرآن کی ضرورت باقی نہیں رہی کیا مولوی معنوی کے قرآن کا فلسفہ کلام پاک کا محتاج نہیں؟ پھر وہ فلسفہ جسے لوگ اقبال کا فلسفہ کہتے ہیں کیا سچ مچ اقبال کا فلسفہ ہے؟ اقبال زیادہ سے زیادہ فلسفۂ اسلام کا مفسر ہے کیا ایک مفسر کو فلسفی کہا جاسکتا ہے۔ اسلام سے اقبال کو عشق تھا۔ کیا عاشق فلسفی ہوتا ہے؟ اسلام کا فلسفہ اس کا فلسفہ ہے۔ اس کا اپنا فلسفہ کیا ہے وہی عشق ؎

عشق مری لے میں ہے عشق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میری رگ و پے میں ہے

ابوظفر عبدالواحد

اقبال کا نقشِ آخر

فسردہ سا جہانِ آب و گل ہے — یہ منظر شام کا عاشق کا دل ہے
شفق کی آخری کرنیں درخشاں — سحر کی گل فشانی سے نمایاں
حسیں پرچھائیاں کم ہو رہی ہیں — اندھیرے میں وہ خود کو کھو رہی ہیں
اندھیرا ڈرتے ڈرتے چھا رہا ہے — کوئی پُر درد لے میں گا رہا ہے
ستارے ہچکچاتے آرہے ہیں — ابھی آتے ہوئے شرما رہے ہیں
پرندے شور برپا کر رہے ہیں — فضا کو زیر و بالا کر رہے ہیں
موذن کی صدا بھی آرہی ہے — دلوں پر بے خودی سی چھا رہی ہے
سرِ مغرب درِ مسجد پہ ہم ہیں — نفس مغموم ہم صرفِ الم ہیں
نشانِ شاعرِ مشرق یہاں ہے — کہ جس کا نطق خالق کی زباں ہے
کہ جس کا ہر نفس گویا عبادت — کہ جس کا ہر سخن گویا شریعت
خدا سے جس نے کی تھی ہم کلامی — وہ رازِ خود شناسی کا پیامی
وہ جس کی زندگی علم و ادب تھی — وہ جس کی بندگی تسلیمِ رب تھی
جہاں میں واقفِ اسرارِ فطرت — زمیں پر رازدانِ ربِ عزت
زمانے کے جو تیور جانتا تھا — جو صبح و شام کو پہچانتا تھا
سکھایا جس نے رازِ زندگانی — خودی ہے آدمیت کی نشانی
برہمن زادۂ فرزندِ توحید — [illegible]
ابھی تو دے کے نیچے کھو گیا ہے — یہیں اقبال تھک کر سو گیا ہے

اکبر وفاقانی

اقبال اور سماج

سماج یا معاشرہ زندگی کا اتنا وسیع ادارہ ہے کہ فرقوں کی ساری ذہنی اور علمی کارکردگی اس کے اندر سما جاتی ہے۔ مذہب سیاست تعلیم و تربیت ادب اور فنونِ لطیفہ حتیٰ کہ طرزِ فکر بھی اسی کے مختلف شعبے ہیں۔ شاعر بھی یوں تو اور افراد کی طرح اپنے زمانے کے سماج کی پیداوار ہوتا ہے لیکن ہر بڑا شاعر اسی پر کچھ نہ کچھ اثرات بھی چھوڑ جاتا ہے۔

ہندوستانی شاعری کوئی سو سال پہلے تک زندگی سے اگر پوری طرح بے تعلق نہیں تھی تو کم سے کم اس کی توجہ تمام تر زندگی کے چند خاص پہلوؤں کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل تھی۔ مغربی اثرات نے ہندوستانی زندگی میں جہاں نئے نئے تاثرات کو اخذ کیا وہیں ادب اور شاعری کو بھی حیات کے مسائل سے دوچار کر دیا اس کے سب سے پہلے اثرات ہم جانتے ہیں کہ حالیؔ کے کلام میں نمایاں ہوئے۔ حالیؔ کے بعد اکبرؔ سب سے بڑا شاعر پیدا ہوا جس کی شاعری تمام تر حیات سے پیدا ہوئی۔ اور حیات ہی کو مرکز بنائے رہی۔ لیکن موجودہ زمانہ میں ہماری شاعری زندگی اور موت کی کشمکش کے اہم مسائل سے جیسی گتھ گئی ہے ویسی کبھی نہیں گتھی تھی۔ اور یہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس کا باعث بڑی حد تک اقبال تھے۔

اقبالؔ کی شاعری اپنے اطراف کی ساری تحریکات اور اس سے آگے اکثر عالمی تحریکات کا مخزن بن گئی ہے۔ یہ دور تخریب اور تعمیر کی کشمکش کا عبوری دور ہے۔ اور اسی نے اقبالؔ کو بھی پیدا کیا۔ اقبالؔ کے مجتہد ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور اس کا ثبوت ان کے صفحات میں جگہ جگہ ملتا ہے۔

اقبالؔ نے موجودہ سماجی نظام کے گہرے مطالعے کے بعد جن کوتاہیوں کا مشاہدہ کیا ان کو ظاہر کرنے اور ان کا حل بتلانے میں انھوں نے پیغمبرانہ شان دکھا دی جیسا کہ کہتے ہیں ؎

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبالؔ — پیغمبری کرد و پیمبر نہ تواں گفت

ان کی فکر نے زندگی کے کسی اہم پہلو کو نہیں چھوڑا۔ اسی لئے ان کی تعلیمات ہماری زندگی کا نصب العین بن گئی ہیں۔ وہ حقیقت میں انسانیت کے شاعر تھے۔ اور یہ جذبہ ان کو قومیت کے ابتدائی احساس کے زمانہ میں بھی برابر بے چین کر رہا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں انھوں نے یہ شعر بھی کہے تھے ؎

آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو — امتیازِ ملت و آئیں سے دل آزاد ہو

بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں — نوعِ انساں قوم ہو میری وطن میرا جہاں

اس میں شک نہیں کہ اسلامی فلسفہ اور زندگی کا انھوں نے وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا جس کا رنگ ان کے کلام میں جابجا نمایاں ہے۔ لیکن اس سے ان کے رتبہ میں کوئی فرق اسی طرح نہیں آسکتا جس طرح ملٹن کے رتبہ میں عیسائیت کی وجہ سے یا کالی داس کے رتبہ میں ہندوئیت کی وجہ سے نہیں آسکا۔

یہ وسیع تر انسانی ہمدردی کا شدید جذبہ ہی تھا جو ان کو ایسے زمانہ میں بھی جب دنیا قومیت رنگ نسل جیسی مصنوعی قیدوں میں جکڑی ہوئی خوش خوش تھی اور یہ نظام عقلیت کا مذہب بن گیا تھا انھوں نے اجتہادی شان دکھا دی۔ اور اس سماج اور اس کے سارے نظام کی بنیاد ہلا دی۔

لیکن جتنی تخریبی تنقیدیں انھوں نے کیں ان سے زیادہ تعمیری راہیں بھی تبلادیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رجحان جلد یا دیر میں ان کے پیش کردہ سماجی نظام کو آزمانے تیار ہو جائے گا۔

اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا خودی کا فلسفہ ہے جس کو انھوں نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کا یہ اٹل عقیدہ تھا کہ انسان اپنے ذاتی وجود کو سمجھے بغیر کسی چیز کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ وہ آسمانوں سے تارے توڑ لائے۔ زمین کے ساتوں طبق کھنگال ڈالے لیکن جب تک وہ ذات سے بے خبر ہے اس کا ہر فعل غلط پڑے گا۔ کیونکہ یہ وجود کائنات کی بنیاد ہے۔ اسی لئے خودی کی تربیت پر وہ سب سے زیادہ زور دیتے ہیں یہ گویا جوہر ہے اور دنیا کی ساری چیزیں عرض۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف　　　　کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب　　　　خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر
نہنگ زندہ ہے موج محیط میں آزاد　　　　نہنگ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر

خودی کو انسانی کمال کا نقطۂ آخر تصور کر کے زندگی کی ساری چہل پہل میں انھیں اسی کی نمود و نمائش نظر آتی ہے۔ اور جس چیز میں خودی کی نمائش نہ ہو اسے وہ درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ کہتے ہیں ؎

حیات و موت نہیں التفات کے لائق　　　　فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود
گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر　　　　وائے صورت گری و شاعری و نقاشی

خودی کے بعد قوموں کی زندگی میں یقین کا درجہ ہے۔ یہ وہ شمع ہدایت ہے جس کے سامنے ساری تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں اور منزل مقصود صاف نظر آنے لگتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے　　　　یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

قوموں کی زندگی میں عمل کی جو اہمیت ہے وہ بھی اقبال کی نظر سے کبھی اوجھل نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ عمل کے بغیر وجود بے حس ہے اور "بے عمل" وجود سے جیسی شدید نفرت اقبال کو تھی کسی اور کو کم ہوگی۔ ان کا یہ مشہور شعر ہے ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم　　　　جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ایک اور مقام پر کہتے ہیں ؎

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا　　　　روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

اسی لئے اقبال فطرتاً صوفی ہونے کے باوجود پابند خانقاہ تصوف کو بہانۂ راحت سمجھتے تھے۔ ایک نظم میں صوفی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا　　　مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن　　　غریب تر ہے حیات وممات کی دنیا

ایک اور مقام پر "ترکِ جہاں" کے خیال کا خاکہ اس طرح اڑایا ہے۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم　　　جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز　　　تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

آزادی اپنی تمام صورتوں میں خواہ وہ سیاسی ہو کہ معاشرتی ذہنی ہو کہ جسمانی اقبال کا مقصد نظر تھی۔ وہ اس راز سے اچھی طرح واقف تھے کہ آزادی کے بغیر کسی قوم کا بہتر سے بہتر فعل بھی درست نتائج نہیں پیدا کرسکتا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال　　　کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت　　　محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور　　　محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

آزادی ان کی نظر میں مکمل زندگی ہے اسی لئے غلاموں کی زندگی کو وہ ادھوری سمجھتے ہیں اور غلاموں کی فکر، مذہب عبادت فلسفہ ادب غرض ہر چیز میں انھیں ایک پژمردگی ایک کمی اور ایک پستی نظر آتی ہے۔ نفسیاتِ غلامی ان کی ایک نظم ہے اس کے چند شعر ہیں۔

شاعر بھی ہیں پیدا علماء و حکماء بھی　　　خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک　　　ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضا مند　　　تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

"اقبال" قوت کے پرستار تھے۔ لیکن اس کو وہ ہمیشہ اور لازمی طور پر ساز و سامان کا نتیجہ نہیں تصور کرتے تھے۔ بلکہ وہ اس قوت کے قائل تھے جو افراد اور اقوام میں اندر سے پیدا ہو۔ ایسی قوت ساز و سامان کی رہینِ منت نہیں ہوتی بلکہ یہ چیزیں خود اس کا قدم چومتی ہیں۔ اس فرق کو انھوں نے اپنی نظم "فقر و ملوکیت" میں عمدگی سے بیان کیا ہے۔

فقر جنگ گاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے　　　ضرب کاری ہے اگر سینہ میں ہے قلبِ سلیم

ایک اور نظم میں بھی اس کو وضاحت سے سمجھایا ہے کہتے ہیں۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے　　　وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی　　　یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار　　　اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے　　　کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہاں بانی

ان بنیادی لوازم کے علاوہ جو ایک ترقی پذیر سماجی زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔ اقبال نے اس کے جزئیات پر بھی نظر رکھی ہے یہ مسائل بے شمار ہیں جیسے تعلیم سیاست اور حکومت عورت ادب اور فنونِ لطیفہ معاشرت وغیرہ۔ موجودہ تعلیم اور خاص طور پر ہندستانی تعلیمی نظام پر انھوں نے بہت سی تعریضیں کی ہیں۔ تعلیم کو جن مادی اور ظاہری اصولوں پر ڈھالا گیا ہے اس کی وجہ علم کی غایت مفقود ہو جاتی ہے۔ اور طالبعلم کی حالت بسا اوقات "چارپایہ بروکتابے چند" سے زیادہ بہتر نہیں رہتی۔ اقبال علم کا اصلی مقصد خودی کو جگانا سمجھتے ہیں اور جس علم سے یہ نہ ہو سکے اس کے لئے ان کے سماجی نظام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے — ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

موجودہ تعلیم سے آزادئ فکر کی جو تحریک پیدا ہو رہی ہے اس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں۔

آزادئ افکار سے ہے ان کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادئ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ
اس قوم میں ہے شوخئ اندیشہ خطرناک — جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ — آزادئ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

ان اشعار میں وہ ہمارے طالب علموں سے مخاطب ہیں۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے مموں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

ہر سماجی نظام کسی نہ کسی شکل کی سیاست اور حکومت کے تابع ہوتا ہے۔ اس کے بغیر سماج کی پر امن ترقی ظاہر ہے کہ ناممکن ہے۔ اقبال ایسی سیاست اور حکومت کو جو محض ابلہ فریبی پر قائم ہو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ موجودہ سیاست کی چالوں کو وہ ایک مختصر نظم میں یوں ظاہر کرتے ہیں۔

اس کھیل میں تعین مراتب ہے ضروری — شاطر کی عنایت سے تو فرزیں میں پیادہ
بیچارہ پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز — فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

سیاست جو مذہب سے بیگانہ ہو اسے وہ دیو بے زنجیر سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد — فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

سماج کی ایک اہم رکن عورت ہے، جو مغربی سماج اور مشرقی ذہنیت پر عجیب عجیب صورتوں سے چھائی ہوئی ہے۔ اقبال نے سماج میں عورت کی اصل حیثیت آزادی اور تعلیم ہر مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے اس میں شک نہیں کہ یہاں انھوں نے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے۔ پھر بھی ان کا نقطۂ نظر پوشیدہ نہیں ہے۔ عورت کی آزادی کا جو مفہوم یورپ نے سمجھا ہے اسے وہ سماج کے حق میں مہلک تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور ۔۔۔ کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

ایک شعر میں وہ مغرب کے حکماء سے سوال کرتے ہیں۔

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال ۔۔۔ مرد بے کار و زن تہی آغوش

سماج کی تعمیر میں عورت کا حصہ مرد سے کسی طرح کم نہیں ہے لیکن وہ بہرحال عورت کو مرد پر منحصر سمجھتے ہیں جہاں اس بنیادی تصور میں خلل آئے سماج کی پوری عمارت لڑکھڑا جاتی ہے۔ ان کے اشعار ہیں۔

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی ۔۔۔ نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا ۔۔۔ اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

عورتوں کی تعلیم و تربیت کے وہ دل سے حامی ہیں لیکن ایسی تعلیم جو یورپ کی طرح عورت کو مرد بنا دے اسے وہ سماج کے حق میں موت تصور کرتے ہیں۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن ۔۔۔ کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

ادب شاعری اور سارے فنونِ لطیفہ کو اقبال اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس میں خودی کا جذبہ کس حد تک نمایاں ہے۔ اور وہ خودی کے نشو و نما میں کتنی مدد دے سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات ۔۔۔ نہ کر سکیں تو سرا سر فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی ۔۔۔ خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

"جواب شکوہ" اقبال کی ابتدائی اہم نظموں میں سے ہے۔ لیکن سماجی اصلاح سے متعلق اس میں ان کے خیالات کا نچوڑ موجود ہے۔ اس نظم میں اقبال نے وہ تمام برائیاں تفصیل سے گنائی ہیں جو ہماری معاشرت میں گھر کر چکی ہیں اور ہمارے ذہنوں اور اخلاقی حالت کو بگاڑنے میں بڑا دخل رکھتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز جو کسی قوم کی غلامی اور پستی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے وہ اس کی باطل پرستی ہے۔ فرقہ بندیاں اور مناقشات اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ تن آسانی ایک اور منحوس خصلت ہے۔ جو ہم میں پیدا ہو گئی ہے۔ خود داری خلوص اور ایثار کی اچھی صفتیں ہم سے زمانہ ہوا رخصت ہو چکی ہیں۔ مذہب سے بیگانگی

بلکہ بیزاری عام ہے۔ حالانکہ اقبال کے خیال کے مطابق علم و عمل زندگی غرض ہر چیز کا سرچشمہ مذہب ہی ہے۔ ان تمام برائیوں کے ہوتے ہوئے کسی جسد قومی سے ابھرنے کی توقع رکھنا فضول ہے۔ شاعر کی شکایت کے جواب میں حضرت باری تعالیٰ کا جواب سنئے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں — ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہ اس معاشرتی نظام کا ایک سرسری خاکہ ہے جس پر اقبال قوم کو ڈھالنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک آمر نہیں تھے۔ جو ان اصلاحوں کو سماج کے سر بہ جبر منڈھ سکتے۔ تاہم ان کے کلام کی دل سوزی اس کو جس قدر زیادہ مقبول بناتی جا رہی ہے ان کے خیالات کا اثر پھیلتا اور چپکے چپکے دلوں میں گھر کرتا جا رہا ہے۔ ابھی سے ہماری اجتماعی زندگی کے تصور ادب شاعری اور طرزِ فکر میں کسی بنیادی تغیر کا سراغ ملنے لگا ہے۔ اس اثر میں آئندہ جس قدر اضافہ ہوتا جائے گا۔ سماج کی نئی تعمیر خود بخود ہوتی جائے گی۔

عبدالقادر سروری

روحِ اقبال سے

تیری فکرِ دور رس جس راز سے آگاہ تھی
آج عریانی سے اس کی کانپتی ہے زندگی

دیکھ تہذیبِ نوی کی تیغ خوں آشام دیکھ
راز دارِ صبحِ ہستی زندگی کی شام دیکھ

سچ کہا تھا ٹوٹ جائے گا طلسمِ رنگ و نو
آنسوؤں میں بہہ رہا ہے عصرِ حاضر کا غرور

خون کی ہولی سے چرخِ غرب ہے یوں لالہ زار
سمتِ مشرق بھی نظر آتی ہے اس کی ایک دھار

لیکن اے جنت کی دولت لے کلیمِ خوش کلام
ان دھندلکوں میں شعاعِ نور ہے تیرا پیام

تیری بتلائی ہوئی راہوں پہ چلنے کے لئے
کارواں بیتاب ہے کروٹ بدلنے کے لئے

زندگی کے راگ کو بیداریوں کا ساز دے
مطربِ آتش نوا آواز دے آواز دے

نظر حیدرآبادی

اقبال اور اُن کا فلسفۂ خودی

اقبال بہ حیثیت شاعر کے نہ صرف ادبی دنیا میں بلکہ ساری اسلامی دنیا میں مشہور ہیں مگر وہ صرف شاعر نہ تھے۔ وہ ایک ایسے بڑے آدمی تھے کہ ان جیسا صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جس کا دل اور دماغ بڑا ہو۔ ان کا دل ایسے جذبات اور کیفیات کا حامل تھا جن کی بے انتہا وسعتوں میں رسمی شعر و شاعری استعارات اور تشبیہات مثل ان تنکوں کے ہیں جو کسی سمندر کے لب ساحل پائے جاتے ہیں۔ ان کا دماغ ویسا ہی تھا جو دنیا کے کسی بڑے سے بڑے مفکر کا ہو سکتا ہے۔ فکر و عمل کا تعلق دماغ سے اور جذبات اور احساسات کا تعلق دل سے ہے۔ اقبال نے اپنے دل و دماغ کی محنت و کاوش کو ایک خاص اسلوب اور دلکش پیرایہ میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ صرف اسلامی تعلیمات کے پیامبر ہی نہیں تھے، بلکہ ایک ایسے شاعر تھے جن کا پیام عمل ساری دنیا کے لئے اور انسانیت کے لئے مایۂ ناز ہو سکتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اقبال کی ابتدائی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا آغاز غزل گوئی اور رسمی شاعری سے ہوا مگر چونکہ وہ شاعرانہ بصارت کے ساتھ حکیمانہ بصیرت بھی رکھتے تھے، جدید فلسفہ اور اس کے عمل پیہم کی تعلیم اور تاثرات نے ان کے قلب اور دماغ میں ایک غیر معمولی ہیجان پیدا کر دیا اسلامی تعلیمات اور قرآنی حکمت سے ان کو ایک خاص شغف تھا۔ نفس انسانی کی عزت اور عظمت جو انھیں قرآنی تعلیم اور پیغمبر اسلام کی پیروی میں نظر آئی اس کی مثال اسلام کے کسی مبلغ اور شاعر کسی حکیم اور مفکر کے خیالات میں نہیں پائی جا سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری کا ماحصل وہ پیام عمل اور حسنِ عمل ہے جس کا ماخذ اسلام ہے اسلام کی ترجمانی ان کا مقصد حیات بن گیا تھا۔ تاہم یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ وہ ایک فرقہ پرست شاعر تھے۔ ان کا پیام عمل ان کے اعلیٰ مطمح نظر کا تابع تھا۔ ان کا مقصد نوع انسانی کو ایک اعلیٰ اور بلند مقام تک پہنچانا تھا۔ اور اس کے حصول کا ان کی نظر میں ایک ہی راستہ تھا۔ وہ اسلام کی شاہراہ عام ہے۔ اس لئے ان کا پیام عمل مسلمانوں کے لئے مخصوص نظر آتا ہے وہ ملت اسلامیہ کو ایک تازہ ولولہ بخشتے ہوئے اور انسانیت کو ایک نئی حیات کا راستہ دکھلاتے اور غلاموں کو درس خودی دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ کشمکشِ حیات میں مردانہ وار مقابلہ کرنے کو زندگی سمجھتے ہیں۔ عمل پیہم اور انقلاب ان کی زبان میں زندگی کا دوسرا نام ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی   روح امم کی حیات کشمکش زندگی

جذبات انسان کے دل سے نکلتی ہے وہ دوسرے پر اثر کرتی ہے۔ اقبال غیر معمولی طور پر متاثر دل رکھتے تھے اس لئے ان کے کلام میں بھی غیر معمولی اثر آفرینی اور ایمانی قوت نظر آتی ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا پیام انسانیت کو یہ ہے کہ وہ اپنی "خودی" کی تربیت کرے اور اپنی خودی کو سمجھے۔ ذات اور ملت کی عزت اور وقار کا دار و مدار خودی کی صحیح تربیت اور پرورش پر ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف   کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز

خودی کی تربیت کی بدولت انسان تمام دنیا ہی کو نہیں بلکہ ساری کائنات کو مسخر کرسکتا ہے۔

خودی ہے زندہ تو ہے فقر میں شہنشاہی — نہیں ہے طغرل و سنجر سے کم شکوہ فقیر
جس بندۂ حق میں کہ خودی ہو گئی بیدار — شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق
اس کی نگہ شوق میں ہوتی ہے نمودار — ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوت اشراق

اس فلسفۂ خودی کا سرچشمہ استغنا ہے یہ وہ استغنا نہیں ہے جو فقر اور تصوف کی اصطلاح میں ترک دنیا کہلاتا ہے۔ ترک دنیا کی تعلیم اور اس کے تصور سے اقبال کو سخت نفرت ہے ان کے نزدیک انسانیت کے اعلیٰ ترین زینہ تک پہنچنا "خودی" کو پانا اور خوددار بننا ہے انسان کائنات کا خلاصہ ہے۔ وہ ایک ایسی جامع ہستی ہے جس میں جمادی نباتی حیوانی اور ملکوتی عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہ سب خودی میں پوشیدہ بھی ہیں اور ظاہر بھی خودی انسان کا ازلی اور ابدی عنصر ہے۔ چونکہ ازلی اور ابدی حقیقت فانی نہیں ہے اس لئے خودی بھی مثل نباتات اور حیوانات کے فانی نہیں ہے۔ خودی کا غیر فانی عنصر یا پہلو روحانی اور ملکوتی ہے اور وہی اصل و حقیقت انسان ہے اس کی تربیت پر اسلامی تعلیمات کا دار و مدار ہے۔ جب انسان خودی کی تربیت سے غافل اور اپنے اصلی مرکز سے دور ہوجاتا ہے تو حیوانیت کے قعر ذلت میں گرجاتا ہے۔

"خودی" کے ارفع و اعلیٰ منزل تک پہنچنے کا راستہ اقبال کے نزدیک وہ نہیں ہے جو ترک دنیا و روحانی مسرتوں کے جمود و سکون کے عالم میں پایا جاتا ہے۔ تسخیر عالم اور عمل پیہم اور کشمکش حیات کے منازل طے کرنے کے بعد خودی کی آخری منزل تک انسان پہنچ سکتا ہے) خداشناسی اور خداپرستی کی یہی منزل ہے۔ اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ آسمان و زمین عالم و ما فی العالم سب کچھ انسان کے لئے ہے کیونکہ وہ خلاصۂ کائنات ہے انسان خلیفۃ اللہ ہے خودی کی منزل پر پہونچنے کے بعد انسان نیابت الٰہی کے منصب و مقام کا اہل ہوسکتا ہے۔

تسخیر عالم سے مراد اقبال کے نزدیک وہ علمی اور عملی فتوحات نہیں ہیں جن کی بدولت مغربی دنیا قدرتی طاقتوں پر قابو پاکر اپنی آسائش و دولت و ثروت کے بڑھانے کی فکر میں پیہم کوششیں کررہی ہے اور انھیں کوششوں کی بدولت بجائے حقیقی ترقی کے حیوانیت کے قعر مذلت میں گر رہی ہے۔ دنیا کی یہ تباہی در اصل عقل انسانی کی اس کارکردگی کا نتیجہ ہے جو محبت اخوت ہمدردی اور عشق الٰہی سے بری ہے۔ اقبال اس عقل سے جو عشق سے مبرا ہو نفرت کرتے ہیں۔

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر — سود خود بیند نہ بیند سود غیر

پیغمبر یا شارع جو حامل وحی الٰہی اور اسرار خودی اور رموز توحید کا معلم ہے ایسی خودی کو مٹانے کا حکم دیتا ہے جو خود غرضی پر مبنی ہو شارع کی تعلیم کی رو سے اسرار خودی کا عالم وہی ہے جس کی ہمدردی تمام موجودات کو گھیرلے جو دوسرے کے سود و بہبود کو اپنا سود و بہبود جانے ایسا ہی شخص نائب اللہ ہوسکتا ہے اس لئے عقل بغیر عشق کی رہنمائی کے انسان کے راستے کو روشن نہیں کرسکتی۔ انسان کو نائب اللہ کے درجہ تک پہنچنے کے لئے توانائی حاصل کرنا چاہیے ایسی توانائی عمل پیہم

اور مسلسل کشمکش کے بغیر حاصل کرنا ممکن نہیں جو محض قدرت کی طاقتوں کو دریافت کرنے میں مشغول اور ان طاقتوں سے بیہمانہ کام لینے میں مصروف ہو اور خودی سے غافل ہو وہ کافر ہے۔ مومن وہ ہے جو ایک طرف تو کائنات اور اس کی طاقتوں پر قابو پالے اور دوسری طرف اپنے نفس پر بھی اتنی ہی قدرت رکھتا ہو۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اقبال نے خودی پر یہ سارا زور اس لئے دیا ہے کہ انسان اپنی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ خودی کے ذریعہ خدا تک پہنچنا ممکن ہے۔ خدا کی ذات اپنی صفات سے ظاہر ہے وہ رحمٰن ورحیم بھی ہے اور قہار وجبار بھی ہے اسی طرح انسان جو صفات الٰہیہ کا مظہر ہے متضاد صفات کا جامع ہو سکتا ہے۔ وہ کریم و رحیم کا مظہر بھی ہے اور جباریت اور قہاریت کا اظہار بھی کر سکتا ہے صفات الٰہیہ کے صحیح امتزاج اور اعتدال کے ساتھ ظاہر کرنے میں ہی حقیقی انسانیت یا خودی کے اسرار مضمر ہیں۔

قہاری وجباری قدوسی وجبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

انسان اس بحر بیکراں کا ایک قطرہ ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں اگر قطرہ اپنی ذات کے تمام اسرار و رموز کو نہ پا جائے اور خود اپنی ہستی کی عظمت کو نہ جانے تو وہ ذات خدا کے ناپیدا کنار سمندر کی حقیقت کو سمجھنے سے بھی قاصر رہے گا۔ انسان خدا کی ذات کا پرتو ہے۔ دوسرے الفاظ میں خدا اپنے شیون وصفات کے ساتھ انسان میں جلوہ گر ہے۔ پس اگر انسان اپنی حقیقت کو جان لے یا "خودی" کے راز کو پالے تو وہ خدا کو بھی پا سکتا ہے۔ جس کے جمال وجلال کے ظہور کا ذریعہ خود اس کی ہستی ہے۔ دریا اور قطرے کی تمثیل دوسرے مذاہب کی روحانی تعلیمات میں بھی پائی جاتی ہے مگر ان مذاہب نے انسانی شخصیت کو اتنا حقیر و ذلیل کر دیا ہے کہ گویا وہ کائنات میں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ اقبال انسانیت کے اس نظریے کے سخت مخالف ہیں تو وہ مانتے ہیں کہ انسان بندگی کے مقام پر ایک حد تک مجبور ضرور ہے لیکن وہ عملی قوت سے یکسر محروم نہیں۔

اقبال انفرادیت کے علم بردار ہیں اور انسان کو یہ پیام دیتے ہیں کہ وہ اپنی ہستی کی قدر و قیمت کو پہچانے اور اپنے وجود پر غور کرے اپنے امکانات کو معلوم کرے اور اپنی شخصیت کے وقار کو کم نہ کرے اگر اس راہ میں فطرت حائل ہو تو اسے بھی مسخر کرے۔ اقبال کے نزدیک خودی کی موت انسان کی موت ہے اگر وہ اپنی ذات کو فراموش کر دیتا ہے تو ساری کائنات سے غافل ہو جاتا ہے۔

صوفیوں اور دوسرے روحانی مسلکوں پر چلنے والوں کے نزدیک خدا جوئی کا راستہ خودی سے پیدا ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ترک دنیا اور ماسوا اللہ سے غفلت لازمی ہے برخلاف ان کے اقبال کہتے ہیں کہ خودی سے خدا تک پہونچنے کی قدرت پر تصرف اور کائنات کی تسخیر ضروری ہے (سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ جَمِيعًا) چنانچہ اقبال کہتے ہیں۔

ہر چیز ہے محو خود نمائی ہر ذرہ شہید کبریائی

بے ذوق نمود زندگی موت تعمیر خودی میں ہے خدائی

قرآن پاک کی تعلیم کی رو سے معرفت کے دو سر چشمے ہیں: "آفاق اور نفوس" آفاق کے علم سے آسمان و زمین کی تمام موجودات کا علم مراد ہے۔ نفوس کا علم وہ ہے جو عبد و معبود کے رشتۂ باطنی کو روشن کرتا ہے۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "العلم علمان" "علم الابدان وعلم الادیان" کلام الٰہی کی بہترین تفسیر ہے علم الابدان میں وہ سارے علوم آجاتے ہیں جن کا تعلق طبعیات اور خارجی موجودات سے ہے۔ علم الادیان سے مراد وہ علوم ہیں جو معرفت حق اور معرفت عبد، خداشناسی اور خودشناسی۔ تربیت خودی اور تہذیب نفس کے منازل طے کرنے کے لئے درکار ہیں۔ اگر اس کل غیر جانبدارانہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ واضح ہوجائے گا کہ یوں تو دوسرے مذاہب خصوصاً آبائی مذاہب میں عرفانی معلومات کے دفتر ہیں مگر دنیا کی سب سے بڑی اور آخری تبلیغ ہی ایسی جامع ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ ماسوا اللہ کی معرفت کی تاکید کرتی ہے جس میں معرفت الٰہی کے خزائن ہیں اور ساتھ ہی تربیت خودی کی تفصیلات۔ طہارت وتقویٰ۔ حقوق العباد اور حقوق اللہ تصرف اور تسخیر عالم سے کی جیسی جامع تعلیم درکار ہے۔ ارسطو اور افلاطون' سینا اور فارابی کے جامد اور ساکن فلسفہ میں وہ اثرات نہیں جو خودی کو ابھار سکیں اور نہ دور حاضر کی مغربی تعلیم اور فلسفہ کے متحرک اثرات اور تاریخ انسانی کو انسانیت کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔

اقبال کا پیام عمل ان کا فلسفۂ حیات اور شاعرانہ اثر آفرینی اور گرم گفتاری جدید پیرائے میں ایسی تحریک حیات کی حکیمانہ تاویل ہے جس کی تبلیغ کی ابتدا تیرہ سو برس پہلے ہوئی تھی۔

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری — یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا — نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

لطیف النساء بیگم

نذر اقبال :- شاعر مشرق علامہ اقبال کے شایان شان ایک کتاب نذر اقبال ادارۂ ادبیات اردو کی طرف شایع ہوئی ہے ہے جس میں بہترین مضمونوں اور نظموں کے علاوہ متعدد نئے مضامین' تصاویر اور نظمیں ہیں۔ اور ان کے سوا اب تک اردو رسائل وغیرہ میں حضرت اقبال پر جو بہترین ادب شایع ہوا ہے ان کے منتخبات بھی اسی نذر اقبال میں شریک ہیں۔
قیمت عہ۔ سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

ادارے کی خبریں

ادارے کا نیا ہال ادارے کے دفتر اور اس کے شعبوں کے کام کے لئے اس کی موجودہ عمارت (جو دراصل اس کے معتمد اعزازی ڈاکٹر زور صاحب کا رہائشی مکان ہے) عرصہ سے ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ ادارہ کا دفتر ڈاکٹر صاحب موصوف کے مکان کے ایک کمرے سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ پورے مکان پر قابض ہو گیا اور ڈاکٹر صاحب کو نیچے کی منزل ادارے کے لئے چھوڑ کر اوپر کے حصے میں منتقل ہونا پڑا۔ بعد کو یہ پورا مکان بھی ناکافی ثابت ہوا اور کتب خانہ اور دوسرے تاریخی و ادبی آثار ایک گودام کی طرح بھر گئے۔ اور دیمک سے متاثر ہونے لگے۔ ادارے نے اپنے لئے ایک خاص عمارت حاصل کرنے یا تعمیر کرنے کی کارروائی کئی سال قبل سے شروع کر رکھی ہے اور نواب ڈاکٹر سر مہدی یار جنگ بہادر اور نواب زین یار جنگ بہادر کی معتمد صدارت و نائب صدارت میں ادارے کے مجلس عمارت نے فراہمی عمارت کی مہم شروع بھی کر دی ہے لیکن اب تک اس سلسلہ میں جو منزلیں طے ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوا کہ ابھی چار پانچ سال تک ادارے کو ایک شایان شان ذاتی عمارت سے محروم رہنا پڑے گا۔ اس لئے جناب ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی نے سات ہزار روپے کے اپنے ذاتی صرفہ سے موجودہ عمارت ادارہ کے محاذی ایک ہال تعمیر کرا دیا جس کا نقشہ ملک کے ایک مشہور و باکمال ماہر تعمیر مولوی فیاض الدین صاحب ارکیٹکٹ نے تیار کیا اور جس کی تعمیر ادارے کے ایک مخلص رفیق مولوی مرزا ضامن علی صاحب غازی صفوی کی ذاتی دلچسپی اور شبانہ روز انہماک کی وجہ سے بہت جلد اور بڑی آسانی کے ساتھ تکمیل کو پہنچ گئی۔

اس ہال میں فی الحال شعبۂ مخزن علوم وفنون (یعنی اردو انسائیکلوپیڈیا) اور دارالمطالعہ اور دفتر سب رس منتقل کیا گیا ہے۔

ادارے کے کتب خانے میں جو رسائل و اخبار وصول ہوتے ہیں ان سے ابتک صرف ارباب ادارہ ہی استفادہ کر سکتے تھے۔ ضرورت تھی کہ اس کی افادیت کو عام کیا جائے اور دوسرے علمدوستوں کے لئے بھی استفادہ کا موقع فراہم کیا جائے۔ ادارہ کا دفتر جس مقام پر واقع ہے اس کے اطراف و اکناف تین چار میل کے حلقے میں کوئی دارالمطالعہ یا کتب خانۂ عام موجود نہیں اور اس حلقے (خیریت آباد، سماجی گوڑہ، جوبلی ہل، پنجہ گٹہ، بیگم پیٹھ، امیر پیٹھ) میں شہر حیدرآباد کے اکثر و بیشتر علمدوست اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب قیام پذیر ہیں۔ نیز خود شہر میں جو دارالمطالعہ یا کتب خانے موجود ہیں ان میں سے کسی میں اتنے رسائل و اخبار نہیں آتے جتنے ادارۂ ادبیات اردو میں آتے ہیں۔ اس لئے دور دراز کے شائقین مطالعہ کے استفادہ کے لئے بھی ادارے کے ایک دارالمطالعہ عام کی ضرورت تھی۔ مسرت کا مقام ہے کہ اس ہال کی تعمیر سے ادارے کی یہ دیرینہ تمنا پوری ہو گئی۔

دارالمطالعہ کا افتتاح بتاریخ ۲۴ مارچ ۱۹۴۳ء روز جمعہ صبح گیارہ بجے ادارے کے فاضل صدر عالی جناب آنریبل ڈاکٹر نواب سر مہدی یار جنگ بہادر نے اپنے دست مبارک سے ادارے کے دارالمطالعہ عام کا افتتاح فرمایا۔ اس تقریب میں ادارے کے متعدد شعبہ جات اور شاخہائے اضلاع کے نمائندے اور دیگر علمدوست اصحاب نے بھی شرکت فرمائی جن میں بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات باب حکومت، پروفیسر حسین علیخاں صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ، نواب زین یار جنگ بہادر چیف ارکیٹکٹ، نواب ہوش یار جنگ بہادر معتمد تعمیرات سرکار عالی، میر باسط علی خاں صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا ناظم عدالت خفیفہ، ڈاکٹر محمد رحمت اللہ خاں صاحب ایم اے ڈی فل مہتمم کتب خانۂ آصفیہ،

نواب مرزا سیف علی خاں صاحب جاگیردار، پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی، مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار اسعد، مولوی فیض محمد صاحب صدیقی ایم اے، مولوی بادشاہ حسین صاحب، مولوی کاظم حسین صاحب بی اے، مولوی عبدالحفیظ صاحب صدیقی بی ایس سی، ایل ایل بی، مولوی مراد علی صاحب طالع، مولوی میر حسن علی صاحب وکیل ایجاپور، محمد حسین خاں صاحب نظام آباد، غلام حسن صدیقی صاحب پربنی، اشرف الدین صاحب فیضی پربھنی، معین الدین صاحب صدیقی جولہ نظام الدین، محمد علی خاں تعلی بھوم جاگیر۔

افتتاح کے بعد معتمد صاحب ادارہ نے نواب سر مہدی یار جنگ بہادر کو پھول پہنائے اور عکس کشی پر یہ تقریب سعید اختتام کو پہونچی۔ اور یہ نیا ہال آباد ہوگیا۔ مولوی فیاض الدین صاحب نے اس کا نقشہ بنانے میں ایسی خوش ذوقی اور ماہرانہ پرکاری سے کام لیا ہے کہ جو شخص اسکو دیکھتا ہے تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مولوی ضامن علی صاحب غازی نے اس کی تعمیر و تکمیل میں جو دلچسپی لی وہ ایک سچے علمدوست اور رفیق ادارہ ہی سے ظہور پذیر ہوسکتی تھی۔ ادارۂ ادبیات اردو ان دونوں اصحاب کا ہمیشہ شکر گزار رہے گا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر زور صاحب نے جنگ کے اس ہولناک زمانہ میں اشیائے تعمیر کی گرانی کے باوجود ادارے کے لئے جس ایثار اور فراخدلی کا ثبوت دیا ہے وہ دوسرے ارباب علم و ادب کیلئے ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔

دارالمطالعہ کے قواعد

۱۔ فی الحال دارالمطالعہ کے اوقات سہ پہر میں ۳ تا ۰ قرار دیے گئے ہیں۔

۲۔ دارالمطالعہ میں بڑی سگریٹ وغیرہ پینے کی ممانعت ہے۔

۳۔ دارالمطالعہ میں کسی قسم کا شور و غل اور بحث مباحثہ کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ اس سے دوسرے ناظرین کے مطالعے میں خلل واقع ہوتا ہے۔

۴۔ ہر ناظر کے لئے ضرورت ہے کہ دارالمطالعہ میں داخل ہوتے وقت رجسٹر ناظرین میں اپنا نام لکھکر دستخط کرے۔

۵۔ دارالمطالعہ میں کسی ناظر کو اپنی کتابیں وغیرہ لانے کی اجازت نہیں ہے البتہ نوٹ لینے کے لئے بہ اجازت نگران کار سادہ کاغذ ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔

۶۔ کتابیں اور مجلدات سلپ پر ان کا نام اور نشان لکھ کر مطالعے کے لئے طلب کی جانی چاہیں۔

نوٹ:۔ الماریوں وغیرہ کا انتظام ہونے تک کتابوں کے مطالعے کے طریقے کو ملتوی رکھا گیا ہے۔

دارالمطالعہ میں جو رسائل اور اخبارات بغرض مطالعہ رکھے گئے ہیں ان کی فہرست آویزاں ہے۔

اردو رسائل

ادارے کے اس دارالمطالعے میں حسب ذیل رسائل موجود رہتے ہیں۔

رسالہ	مقام	رسالہ	مقام
آج کل	دہلی	جدید اردو	کلکتہ
ادب لطیف	لاہور	جیت	حیدرآباد
ادبی دنیا	لاہور	حسن خیال	"
ارشاد	حیدرآباد	حکیم دکن	"
البیان	امرتسر	حور	لاہور
آواز	سکندرآباد	حیدرآباد ٹیچر	حیدرآباد
ایشیا	بمبئی	خیابان	"
برہان	دہلی	زمانہ	کانپور
بچوں کا باغ	دہلی	ساقی	دہلی
بچوں کا سب رس	حیدرآباد	سائنس	حیدرآباد
پیام ادب	"	سب رس	"
پیغام حق	لاہور	سہاگ	لاہور
تصویر	رامپور	سیاست	حیدرآباد

شاعر	آگرہ	مصنف	علیگڈھ
شاہکار	لاہور	معارف	اعظم گڑھ
شعاع اردو	کراچی	منزل	لکھنؤ
شہاب	حیدرآباد	نرالا	لاہور
عالمگیر	لاہور	نقاش	کلکتہ
فانوس	بنگلور	نگار	لکھنؤ
گاؤں سدھار	حیدرآباد	نورس	اورنگ آباد
گرلز کالج میگزین	علی گڑھ	نئی زندگی	الہ آباد
مجلۂ تحقیقات علمیہ	حیدرآباد	ہندستانی	"
مجلۂ عثمانیہ	"	ہندستانی ادب	حیدرآباد
مجلۂ طیلسانین	"	ہماری کتابیں	"
مجلۂ نظامیہ	"	ہمایوں	لاہور
مست قلندر	لاہور	ہل	الہ آباد

ہفتہ وار جرائد | ذیل کے ہفتہ وار جرائد بھی پابندی سے آتے ہیں۔

الفاروق	ناگپور	صحت عامہ	حیدرآباد
ایشیار	آگرہ	صدق	لکھنؤ
سلطنت	حیدرآباد	مملکت	حیدرآباد
شان اسلام	بمبئی	منادی	دہلی
شان ہند	"	نوائے وقت	لاہور
نیر اعظم	مراد آباد		

اخبارات | ذیل کے روزنامے بھی پابندی سے آتے ہیں۔

پیام	حیدرآباد	صبح دکن	حیدرآباد
رعیت	"	مسلمان	دہلی
رہبر دکن	"	میزان	حیدرآباد
وقت	حیدرآباد		

جلسۂ عطائے اسناد وانعامات ۱۹۴۳ء

ادارۂ ادبیات اردو کے اردو امتحانات کا جلسۂ عطائے اسناد و انعامات ۴۳ء بتاریخ ۱۴ مارچ ۱۹۴۴ء م ۱۷ اردی بہشت ۱۳۵۳ف بروز جمعہ شام کے پانچ بجے ٹاؤن ہال باغ عامہ میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت جنرل والاشان شہزادہ ڈاکٹر معظم جاہ بہادر نے فرمائی اور علیا شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ نے اسناد و انعامات اپنے دست مبارک سے تقسیم فرمائے۔

بلدہ کے امیدواروں کے علاوہ اضلاع کے مراکز امتحانات سے حسب ذیل اصحاب نے بطور نمائندہ شرکت کی اور اپنے اپنے مرکز کی اسناد حاصل کیں۔

(۱)	شاخ پٹن	مولوی سید ظفر مہدی صاحب صدر
(۲)	شاخ ویجاپور	مولوی میر حسن علی صاحب "
(۳)	" نظام آباد	" محمد حسین خاں صاحب معتمد
(۴)	" ہمنا آباد	" سید اسمٰعیل صاحب وکیل صدر
(۵)	" پربھنی	" حمید اللہ صاحب شیدا معتمد
(۶)	" کلیانی	" تاج الدین صاحب معتمد شعبہ طلبہ
(۷)	" بھوم	" محمد علی خاں صاحب معتمد
(۸)	" جولہ نظام الدین	" معین الدین صاحب صدیقی معتمد
(۹)	" پرینڈہ	" زین الدین صاحب
(۱۰)	" گلبرگہ	" مختار احمد صاحب بی ایس سی ال ال بی وکیل۔ مسٹر گنڈیا (نمائندہ گنوار ضلع گلبرگہ)
(۱۱)	" پرلی	مولوی ابو ظفر محی الدین صاحب بی ق معتمد شعبہ طلبہ

ان سب اصحاب کے قیام و طعام کا انتظام منجانب ادارہ سعیدیہ یتیم خانہ میں کیا گیا تھا ان میں سے بعض اصحاب نے اپنی سہولت کے لحاظ سے اپنے عزیز و اقربا کے پاس قیام کیا۔

ٹاؤن ہال سند لینے والوں اور علم دوست اصحاب سے معمور تھا۔ ادارے کی مجلس انتظامی کے ارکان اور معتمدین شعبہ

نے معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔

حاضرین میں افواج باقاعدہ سرکار عالی کے اکثر وبیشتر اعلیٰ عہدہ داروں کے علاوہ حسب ذیل اصحاب خاص کر قابل ذکر ہیں۔

نواب علی نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات و باب حکومت، نواب مہدی نواز جنگ بہادر معتمد صنعت و حرفت نواب شہید یار جنگ بہادر، مولوی سید محمد اعظم صاحب ناظم تعلیمات، مولوی سید علی اکبر صاحب پرنسپل نظام کالج، مولوی غلام یزدانی صاحب او۔بی۔ای، پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی، ڈاکٹر سید حسین صاحب مسجل جامعہ عثمانیہ، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب، مولوی ظہیر الدین احمد صاحب صدر محاسب سرکار عالی، مولوی رکن الدین احمد صاحب، ڈاکٹر راحت اللہ خاں مہتمم کتب خانہ آصفیہ، مولوی غلام قادر صاحب پرنسپل دار العلوم، پروفیسر محمد علی خاں صاحب، مولوی محمد عالم صاحب، پروفیسر لطیف احمد صاحب فاروقی، مولوی حبیب احمد صاحب فاروقی، مولوی محمد اعظم صاحب لکچرار، مولوی سید محمد صاحب لکچرار، مولوی ابو ظفر صاحب لکچرار، مولوی مرزا ضامن علی صاحب غازی، نواب مرزا سعید علی خاں صاحب، نواب میر سعادت علی صاحب رضوی، مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی، مولوی فیض محمد صاحب، مولوی بادشاہ حسین صاحب، مولوی کاظم حسین صاحب وغیرہ۔

نشر کا انتظام

جلسے کی کارروائی نشرگاہ لاسلکی حیدرآباد کی جانب سے راست ٹاؤن ہال باغ عامہ سے نشر کی گئی اور ممالک محروسہ کے علاوہ دوسرے مقامات کے علم دوستوں نے بھی گھر بیٹھے ٹاؤن ہال کی تقریریں اور خطبے سنے۔ ساتھ ہی ادارے کی تاریخ اور شعبوں کی تفصیلات بھی نشر کی گئیں۔ جس کے لئے نشرگاہ سرکار عالی کا منجانب ادارہ شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

عصرانہ

تقسیم اسناد کے بعد شہزادہ والا شان اور شہزادی صاحبہ اور دیگر مہمانان بلدہ واضلاع کی ایک پر تکلف عصرانے سے ضیافت کی گئی جو ٹاؤن ہال کے بالا خانے پر مرتب کی گئی تھی۔ تقریباً شام کے سات بجے یہ دلچسپ علمی صحبت اختتام کو پہنچی۔

خیر مقدم و روداد اردو امتحانات ۱۹۴۳ء

(یہ روداد اس جلسۂ عطائے اسناد میں سنائی گئی جو ۲۴ مارچ ۱۹۴۳ء کو بصدارت جنرل والاشان شہزادۂ ڈاکٹر معظم جاہ بہادر بہ مقام ٹاؤن ہال باغ عامہ حیدرآباد منعقد ہوا۔)

حضرت شہزادۂ والاشان۔ جنابہ شہزادی صاحبہ اور معزز حاضرین جلسہ۔

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ اردو امتحانات کے صدر کی حیثیت سے آج اس چوتھے جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات میں آپ سب خواتین و حضرات کا میں بڑی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔ گزشتہ جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت حضرت شہزادہ جنرل والاشان ڈاکٹر اعظم جاہ بہادر ہز ہائی نس پرنس آف برار نے فرمائی تھی اور اسناد و انعامات علیا ہز ہائی نس شہزادی در شہوار نے اپنے دست مبارک سے تقسیم فرمائے تھے۔
آج ہمیں اپنی اس خوش بختی پر ناز ہے کہ دودمان آصفی کے ایک اور چشم و چراغ شہزادۂ جنرل والاشان ڈاکٹر نواب معظم جاہ بہادر اس جلسہ کی صدارت فرما رہے ہیں اور علیا حضرت شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ اپنے دست مبارک سے کامیاب امیدواروں کو اسناد اور انعامات تقسیم فرمائیں گی۔

حضرت شہزادۂ والاشان ڈاکٹر معظم جاہ بہادر کو علم و ادب بالخصوص اردو ادب سے جو دلچسپی ہے اس کا تعارف میرے لئے غیر ضروری ہے۔ ہندوستان کی ادبی دنیا اور حیدرآباد کا ہر تعلیم یافتہ شخص حضرت شجیع کے کلام سے محظوظ ہوتا ہے اور بلند پایہ رسائل و جرائد ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں کہ اپنے صفحات کو شہزادۂ والاشان کے کلام سے زرین بنائیں۔ عہد حاضر میں حضرت شجیع نے اردو کے باکمال شعرا کی جو سرپرستی فرمائی ہے اس کو تاریخ ادب اردو بھول نہ سکے گی اور خود شہزادۂ والاشان کا اسم مبارک اردو کے باکمال شعرا کی فہرست میں کبھی محو نہ ہو سکے گا۔
یہ سرزمین حیدرآباد کی خوش قسمتی ہے کہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع سلطان الشعرا خلد اللہ ملکہٗ کے اس چشم و چراغ نے اردو شاعری کی محفلوں کو جگمگا دیا ہے۔

حضرت شہزادۂ والاشان کے ساتھ ہم حضرت شہزادی صاحبہ کی خدمت میں بھی ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں کہ آج کے جلسہ میں رونق افروز ہو کر ہماری عزت افزائی فرمائی جہاں شہزادۂ والاشان اپنے شعر و سخن کے ذوق اور آرائش بلدہ اور غریبوں کے آرام و آسائش کے کاموں کی وجہ سے شہرت حاصل فرما چکے ہیں شہزادی ممدوحہ مختلف اصلاحی اور معاشرتی رفاہ کے کاموں میں رہنمائی فرماتی رہتی ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں خواتین و اطفال کی طبی امداد کے لئے جو انجمن قائم ہوئی ہے وہ شہزادی صاحبہ ہی کی رہبری میں بڑی کامیابی کے ساتھ طبقۂ نسواں کے فلاح و بہبود کا کام انجام دے رہی ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی زندگی کا یہ چودھواں سال ہے اور یہ ادارہ اپنے قابل صدر آنریبل ڈاکٹر نواب سر مہدی یار جنگ بہادر کی عالمانہ رہنمائی میں اردو ادب، تاریخ دکن اور تعلیم بالغان کی جو خدمات انجام دے رہا ہے ان کے روشناس کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔
البتہ اس امر کا اظہار میرے لئے موجب مسرت ہے کہ ادارہ کا ایک شعبہ جو تعلیم بالغان کے کام کو اپنے طور پر آگے بڑھا رہا ہے اور

اردو کی ترقی اور قبولیت عامہ کے لئے اردو امتحانات کا جو سلسلہ قائم کیا ہے وہ گزشتہ چار سالوں میں برابر سرگرم عمل رہا اور اس کی افادیت میں روز افزوں ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال خواندگی کی مہم میں اس ادارہ کو ایسی کامیابی حاصل ہوئی کہ اردو دانی کا امتحان سال میں دو بار منعقد کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ اس ایک سال میں جتنے امیدواروں نے اردو امتحانات میں شرکت کی ان کی تعداد ابتدائی تین سالوں کے شرکا کی مجموعی تعداد کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو امتحانات کا آغاز کر کے ادارے نے ایک صحیح اقدام کیا ہے۔ یہ ادارہ کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو نہ صرف بلکہ مختلف اضلاع و دیہات میں مخلص کارکن فراہم ہوتے جا رہے ہیں یہ حضرات ملک میں اردو کی اشاعت کرنے اور خواندگی کی مہم کو آگے بڑھانے میں جو کام انجام دے رہے ہیں وہ نہایت قابل قدر ہے۔ ادارہ کے اردو امتحانات صرف مملکت حیدرآباد ہی میں مقبول نہیں ہیں بلکہ اس کے باہر بھی ان سے دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر میں بڑی مسرت کے ساتھ اس واقعہ کا اظہار کروں گا کہ اس سال اردو امتحانات کا ایک مرکز شہر بمبئی بھی تھا اور وہاں ان امتحانات کی خاطر گزشتہ سال تقریباً پچھتر ان پڑھوں کو پڑھا لکھا بنا دیا گیا۔ اسی طرح ہمارے دوسرے ہمسایہ برطانوی علاقوں یعنی صوبہ متوسط و برار اور صوبہ مدراس میں بھی کام شروع ہو چکا ہے۔ ساتھ ہی ریاست میسور بھی اس خوش گوار فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اگرچہ وہاں گزشتہ دو تین سال ہی سے ادارے کے اردو امتحانات کے لئے امیدوار تیار ہو رہے تھے لیکن جب سے پروفیسر عبد القادر سروری صاحب جامعۂ میسور میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے تشریف لے گئے ہیں اس وقت سے ادارے کا یہ فیض وہاں بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف اس شعبۂ اردو امتحانات کے معتمد تھے اور ان کی وجہ سے ہم کو اس شعبے کے کاروبار کی انجام دہی میں بڑی مدد ملتی تھی۔ افسوس ہے کہ ادارہ اب ان کے راست تعاون سے محروم ہو گیا اور شعبۂ اردو امتحانات کو بھی صدمہ پہنچا۔ لیکن یہ امر موجب امتنان ہے کہ میسور میں اب اردو کا کام زیادہ مستحکم بنیادوں پر شروع ہو چکا ہے۔ میسور کی طرح ریاست جوناگڑھ میں بھی طبقۂ اناث میں اردو امتحانات مقبول ہوتے جا رہے ہیں اور وہاں کی خواتین ان پڑھوں کی تعلیم اور اردو دانی کے امتحان کے لئے مفید کام انجام دے رہی ہیں۔

اس موقع پر میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ اردو امتحانات محض اس مقصد سے قائم کئے گئے ہیں کہ جہالت کو دور کر کے علم کی روشنی کو پھیلایا جائے اور ادب سے عوام میں دلچسپی پیدا کی جائے۔ قوم کے نونہالوں کے لئے تو مدارس اور کالج قائم ہیں لیکن بڑی عمر کے ایسے اشخاص کے لئے جن کو کسی جامعہ یا سلسلہ تعلیمی ادارے میں اردو کی تعلیم اور ذوق سے بہرہ مند ہونے کا اب موقع حاصل نہیں ہے یا ایسے اصحاب کے لئے جو دوسرے مضامین کے تعلیم یافتہ یا سند یافتہ تو ہوتے ہیں لیکن اردو زبان اور ادب سے بخوبی واقف نہیں ہیں اردو کی تعلیم کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا۔ اسی طرح ایسی عورتوں کے لئے بھی سہولتیں پیدا کرنے کی ضرورت تھی جو سرکاری مدارس سے استفادہ کرنے کے قابل نہ رہی ہوں۔ بہت سے افراد خصوصاً عورتیں ایسی بھی ہیں جنھوں نے خانگی طور پر اردو میں لکھنے پڑھنے کی خاصی مہارت حاصل کی ہے لیکن اپنے ٹھیک علمی و ادبی معیار سے لاعلم ہیں اور اس طرح اس خود اعتمادی سے محروم ہیں جو امتحان دینے اور سند حاصل کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے ادارہ ادبیات اردو نے سنہ ۱۹۳۹ء میں ان امتحانات کا آغاز کیا تھا۔ اس کے کاروبار ایک مجلس انتظامی کے سپرد ہیں جس کی صدارت کا شروع ہی سے مجھے فخر حاصل ہے۔ مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج بحیثیت نائب صدر اس شعبے کے روح رواں تھے۔ چنانچہ ان کی نگرانی میں اس شعبہ نے اردو دانی کی قابلیت کا نصاب تیار کرا کے چھپوائیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ نصاب کی اور کتابیں

بھی خاص طور پر مرتب اور شایع کرائی گئی ہیں جن میں سے ایک "معلم بالغاں" ہے جس کو زاہد حسین صاحب ایم اے ڈ نے پرنسپل صاحب موصوف ہی کی نگرانی میں ان لوگوں کے لئے قلمبند کیا ہے جو خود ان پڑھوں کو پڑھا لکھا بنانے کی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں۔ یہ اردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے اور توقع ہے کہ جہاں جہاں اردو کی تعلیم بالغاں کا کام ہو رہا ہے یہ کتاب ایک مفید رہنما ثابت ہوگی۔

مولوی سجاد مرزا صاحب نے شعبۂ اردو امتحانات کے لئے اپنی نگرانی میں ایک اور ضروری کتاب "رفیق اردو داں" مولوی مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب سے مرتب کرائی ہے جو نہایت ہی دیدہ زیب اور باتصویر شایع ہو رہی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اردو لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہیں وہ اپنی فرصت کے اوقات میں مطالعہ جاری رکھ کر پڑھنے لکھنے کی دولت میں اضافہ کر سکیں۔ ایسی کتاب کی بھی بے حد ضرورت تھی ورنہ اندیشہ تھا کہ جو لوگ امتحان اردو دانی میں کامیاب ہوئے ہیں وہ مرور ایام کے ساتھ جہاں سے چلے تھے وہیں واپس نہ آ جائیں۔ اس کتاب میں نہ صرف دلچسپ قصے اور کہانیاں شریک کی گئی ہیں بلکہ ایک معمولی انسان کے لئے جو معلومات ضروری ہیں ان کو بھی دلچسپ پیرایہ میں درج کیا گیا ہے۔ ادارہ کوشش کرے گا کہ آئندہ اس قسم کی مزید کتابیں شایع کرے۔

۱۹۴۳ء میں ادارے نے اردو دانی کا دو بار امتحان لیا۔ پہلا امتحان ماہ اگسٹ میں لیا گیا جس میں ۹۵۰ امیدواروں نے شرکت کی لیکن ۷۴۸ حاضر رہے جن میں سے ۶۳۲ کامیاب ہوئے۔

دوسرا امتحان ماہ ڈسمبر میں لیا گیا جسمیں ۱۷۰۹ امیدواروں نے شرکت کی لیکن بوقت امتحان ۶۹۰ حاضر رہے اور اس کا نتیجہ بہت اچھا نکلا یعنی ۶۲۳ امیدوار کامیاب ہوئے۔ اس طرح ۱۹۴۳ء میں گویا (۱۶۰۴) ان پڑھ آدمی پڑھے لکھے بنائے گئے۔ اور یہ تعداد تو ان لوگوں کی ہے جنھوں نے امتحان میں شرکت کی درخواست دی ان کے علاوہ سیکڑوں آدمی ایسے بھی ہیں جنھوں نے پڑھنا، لکھنا سیکھا، نصاب کی تکمیل کی، لیکن شرکت کی فیس داخل نہ کر سکنے یا علالت یا ملازمت کی مجبوریوں کی وجہ سے شرکت کا ارادہ نہ کر سکے۔ جن لوگوں نے اردو دانی کا امتحان کامیاب کر لیا تھا ان میں سے اکثروں کی یہ خواہش تھی کہ اپنی فرصت کے اوقات میں پڑھنا لکھنا جاری رکھیں اور اس کی خاطر کوئی امتحان مقرر کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں اردو زبان دانی کا ایک امتحان پہلی بار لیا گیا تھا اور گزشتہ سال اس کا دوسرا امتحان منعقد ہوا۔ اور اس میں چار سو امیدواروں نے شرکت کی درخواست دی جن میں سے تین سو پینتیس شریک اور ۲۰۱ کامیاب ہوئے۔

ان دو امتحانوں کے علاوہ بقیہ امتحانوں کے شرکا اور کامیاب امیدواروں کی تفصیل یہ ہے۔

	نام امتحان	شریک	حاضر	کامیاب
۱۔	اردو عالم	۲۵۶	۲۱۳	۱۰۰
۲۔	اردو فاضل	۳۱	۲۷	۱۷
۳۔	خوش نویسی	۱۷	۱۴	۷

ساتھ ہی یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نتیجۂ کامیابی کا فی صد بھی واضح کر دیا جائے جو تختۂ ذیل سے ظاہر ہوگا۔

	نام امتحان	حاضر	کامیاب	نتیجہ فیصد
۱۔	اردو دانی	۱۴۳۸	۱۲۵۵	۸۷
۲۔	اردو زبان دانی	۳۳۵	۲۰۱	۶۰
۳۔	اردو عالم	۲۱۳	۱۰۰	۴۷
۴۔	اردو فاضل	۲۷	۱۷	۶۳
۵۔	خوش نویسی	۱۴	۷	۵۰

یہاں اس امر کی وضاحت غیر ضروری ہے کہ ان اردو امتحانات میں ہر مذہب و ملت اور طبقے کے امیدوار شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سال امتحان اردو عالم میں ایک ہندو امیدوار بی۔ وی گوپال راؤ بہ حیثیت مجموعی اول آئے ہیں۔ اسی طرح متعدد غیر مسلم امیدواروں نے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی ہے جن کو آج انعامات بھی عطا کئے جائیں گے۔

اردو امتحانوں کے چار سالہ نتائج اور دیگر تفصیلات ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے ایک کتاب "ادارہ ۱۹۴۳ء میں" شائع ہو چکے ہیں۔ اس لئے اس بارے میں مزید وضاحت میرے لئے غیر ضروری ہے۔ البتہ میں اپنے اس غیر مقدم روداد کو ختم کرنے سے قبل اس واقعہ کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ شعبۂ امتحانات نے ان امتحانوں کی فیس بہت ہی کم یعنی اردو دانی کے لئے ایک روپیہ۔ اردو زبان دانی کے لئے دو روپے اور اسی طرح آخری بڑے امتحانات یعنی اردو فاضل کے لئے سات روپے مقرر کی ہے اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ سب امتحانوں ہی کے انتظامات پر صرف ہو جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مفید تحریک کو زیادہ قوی بنانے کے لئے علم دوست اصحاب اس شعبے کا ہاتھ بٹائیں اور غریب اَن پڑھوں کے لئے مفت کتابیں فراہم کرنے اور امتیاز سے کامیاب ہونے والوں کے لئے انعامات اور تمغوں کی رقمیں عطا فرمائیں۔ اس مد میں سالِ حال تین اصحاب نے پچاس پچاس روپے عطا فرمائے ہیں جن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی علیگڑھ۔
مولوی عبد المجید صدیقی صاحب استادِ تاریخ جامعہ عثمانیہ۔
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ۔

جو اصحاب بلدہ اور اضلاع میں امتحانوں کو مقبول بنانے اور تعلیم بالغاں کو وسعت دینے میں خاموشی کے ساتھ ادارے کا ہاتھ بٹا رہے ہیں ان سب کا نام بہ نام شکریہ میں خوشی سے ادا کرتا اگر بے جا طوالت اور آپ کی سمع خراشی کا خوف نہ ہوتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ مخلص خدمت گزار نام و نمود اور اظہارِ تشکر کی پروا کئے بغیر کام کر رہے ہیں۔ البتہ صرف دو اصحاب کا نام لینا ضروری سمجھتا ہوں جن کے نام اور کام ادارۂ ادبیات اردو کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان میں سے ایک کرنل نذیر الاسلام خاں صاحب ہیں جنھوں نے افواج سرکار عالی میں اردو امتحانات کو رائج کرنے میں ادارے کی مدد کی اور ہماری افواج کے علم دوست اور صاحبِ کمال کمانڈر جنرل سید احمد العیدروس کے بہبودیٔ فوج کے کارنمایاں میں اضافہ کا باعث ہوئے۔

دوسرے صاحب جن کا مجھے خاص طور پر ذکر کرنا ہے مولوی عارف الدین حسن صاحب ڈیویژن افسر اورنگ آباد ہیں جو کئی سال سے تعلیم بالغاں کے کام میں ادارے کا ہاتھ بٹانے میں شبانہ روز مصروف ہیں۔

سالہائے ماسبق کی طرح سالِ زیر رپورٹ میں بھی شعبۂ امتحانات کے ہر کام میں ادارۂ ادبیات اردو کے بانی اور فعال اور جوشیلے معتمد ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے بیش قیمت امداد فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شعبے نے جو کچھ کامیابی حاصل کی ہے اس کا سہرا زورؔ صاحب کے سر ہے۔

اب میں آپ سب صاحبوں اور خاص کر شہزادۂ والا شان اور شہزادی صاحبہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی شرکت سے اس جلسہ کو افتخار کا موقع بخشا اور اردو کی خدمت کرنے والوں کی ہمت افزائی کی۔

سید علی اکبر

تقریر آنریبل ڈاکٹر نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر ادارہ

شہزادۂ والاشان جنرل ڈاکٹر نواب معظم جاہ بہادر۔ شہزادی صاحبہ، خواتین و حضرات!

ادارے کی زندگی کے تیرہ سال ختم ہو چکے۔ اب اس نے چودھویں سال میں قدم رکھا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اس کی ہر جہتی ترقی کی رفتار بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اس ادارے کے یوں تو بارہ شعبے ہیں لیکن ان میں سے پانچ کے کام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۱) سب سے پہلا کام جس میں ادارے نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے تاریخ دکن کی خدمت ہے۔ ملک میں تاریخ کا ذوق عام کرنے کیلئے ادارے نے اب تک یوں تو کئی کتابیں شایع کی ہیں لیکن ان میں سلاطین آصفی کے سوانح حیات کا سلسلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اب تک چھے کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اور حضرت آصفجاہ اول سے لے کر غفراں مکاں نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس تک جملہ آصفجاہی سلاطین کے حالات باتصویر چھوٹی چھوٹی کتابوں میں منظر عام پر آچکے ہیں۔

قطب شاہی دور کے سلاطین اور امرا پر بھی ادارے نے اب تک کئی کتابیں شایع کیں اور تاریخ دکن کی تحقیقات کے لئے بڑا اچھا ذخیرہ فراہم کر لیا ہے جس سے استفادہ کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ قلعۂ گولکنڈہ میں کٹورہ حوض کے کنارے ادارے کو تقریباً سات ایکڑ زمین پٹہ پر حاصل ہوگئی ہے جس پر تاریخی مخزن اور طلبہ و محققین تاریخ کی رہایش گاہ کی عمارتوں کا نقشہ نواب زین یار جنگ بہادر تیار کر رہے ہیں اور توقع ہے کہ سال حال ان کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔

(۲) دوسرا کام ادارے کا کتب خانہ ہے۔ جس میں پندرہ سو سے زیادہ قلمی اور بارہ ہزار مطبوعہ کتب جمع ہو چکی ہیں اور قلمی نوادر کے تذکرے کی پہلی جلد اسی سال چھپ بھی چکی ہے جس میں ۵۰۰ مخطوطات کی تفصیلات درج ہیں۔ کتابوں کے علاوہ تقریباً سو رسائل و جرائد بھی ادارے میں پابندی کے ساتھ آتے ہیں۔

ادارے کے کتب خانہ سے کتابیں مطالعہ کے لئے باہر نہیں دی جاتیں البتہ اس کے اراکین وہیں بیٹھ کر ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اب تک عمارت ناکافی ہونے کے باعث زیادہ اصحاب ان سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ اب ادارے کے معتمد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اپنے ذاتی صرفہ سے دارالمطالعہ کے لئے ایک ہال بنایا ہے جو ابھی ابھی تکمیل کو پہنچا ہے اور جس کا میں نے آج ہی بڑی مسرت کے ساتھ افتتاح کیا ہے اس ہال کی وجہ سے محققین اور مطالعہ کرنے والوں کو بڑی سہولت حاصل ہوگئی ہے اور توقع ہے کہ اب زیادہ سے زیادہ اصحاب ادارے کے علمی ذخیرے سے استفادہ کر سکیں گے۔

(۳) ادارے کا تیسرا اہم کام مخزن علوم و فنون یعنی اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب و اشاعت ہے۔ یہ کام بڑا صبر آزما اور محنت طلب تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ پہلی جلد مرتب ہو کر دارالطبع سرکار عالی میں بغرض طباعت روانہ ہو چکی ہے۔

(۴) ادارے کا چوتھا کام مختلف موضوعوں پر مفید کتب اور رسالہ سب رس کی اشاعت سے متعلق ہے۔ گزشتہ سال باوجود مختلف ہنگامی مشکلات کے ادارے نے بارہ کتابیں شایع کیں جن میں سے بعض مثلاً ہندوستانی تمدن از ڈاکٹر ٹو یا طبیعیاتی کائنات

از پروفیسر محمد علی خاں۔ پودوں کی کہانی از پروفیسر سعید الدین اور تعلیم کا مسئلہ از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اپنے معیار اور افادیت کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں۔ ادارے کا ترجمان رسالہ سب رس بھی برابر پابندی کے ساتھ جاری ہے اور اردو کا ذوق عام کرنے میں ادارے کی بڑی مدد کر رہا ہے۔

۵۔ آخری کام جس کی رپورٹ مولوی سید علی اکبر صاحب نے ابھی آپ کو سنائی تعلیم بالغان سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ادارے نے بڑی محنت اور توجہ سے کام کیا ہے۔ گزشتہ سال اس نے ۲۲ مختلف اضلاع اور دیہات میں اپنا ایک وفد بھی روانہ کیا جس نے وہاں کے باشندوں کو اردو کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا چنانچہ سنہ ۱۹۴۳ء میں اردو امتحانات میں شریک ہونے والوں میں جو معتدبہ اضافہ ہوا ہے وہ اس وفد کے کام کا بھی نتیجہ ہے۔ توقع ہے کہ یہ امتحانات اسی طرح مقبول ہوتے جائیں گے اور ملک میں ناخواندہ لوگوں کی تعداد رفتہ رفتہ صفر تک پہنچ جائے گی۔

اب میں حضرت شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ سے استدعا کرتا ہوں کہ سنہ ۱۹۴۳ء کے کامیاب امیدواروں کو اسناد اور انعامات عطا فرمائیں اور شہزادۂ والاشان جنرل ڈاکٹر نواب معظم جاہ بہادر کا منجانب ادارہ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ہمارے ادارے کے اس جلسہ کی صدارت قبول فرما کر اپنی شہرۂ آفاق علم دوستی اور ادب پروری کا مزید ثبوت دیا۔

مہدی یار جنگ

خطبۂ صدارت

شہزادہ والاشان جنرل ڈاکٹر معظّم جاہ بہادر

اردو زبان و ادب اور خاص کر شعر و سخن سے مجھے جو دلچسپی ہے اس کی بنا پر مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ حیدرآباد میں جہاں حضرت اقدس و اعلیٰ کی سرپرستی میں جامعہ عثمانیہ سرکاری طور پر علمی خدمات انجام دے رہی ہے۔ وہیں ادارۂ ادبیات اردو کے نام سے یہ خانگی ادارہ بھی ملک کی زبان، تاریخ اور تمدن کی حفاظت و ترقی کے لئے گزشتہ تیرہ سال سے کوشش کر رہا ہے۔

اس ادارہ نے نہ صرف جدید و قدیم شاعروں کے کلام اور مکتوبات کے اچھے مجموعے اور انتخابات شائع کئے بلکہ ملکی مشاہیر ادب کے آثار کی حفاظت کا کام بھی کیا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بھی بہت مسرت ہوئی کہ اس ادارہ نے ملک میں تاریخ کا ایک اچھا ذوق پیدا کر دیا ہے۔ خصوصاً سلاطین آصفیہ کے سبق آموز حالاتِ زندگی شائع کر کے ملکی تاریخ کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ ادارہ مختلف علوم و فنون مثلاً تاریخ، سائنس، تنقید اور تعلیم سے متعلق بھی متعدد مفید کتابیں شائع کر چکا ہے۔ اس ادارہ کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ایک مخزن علوم و فنون مرتب کی جس کی پہلی جلد زیر طبع ہے۔

یہ سب کام ایسے اہم اور مفید ہیں جن کے لئے ادارہ کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لیکن میرے نزدیک اس ادارے کی سب سے زیادہ قابلِ تعریف کوشش تعلیم بالغاں کی مہم ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں تعلیم کا اوسط افسوسناک حد تک کم ہے غریب اور ان پڑھ لوگوں کو پڑھا لکھا بنانا نہایت ضروری ہے۔ پرنسس اور میرے لئے یہ امر بھی باعث مسرت ہے کہ ادارہ کے اردو امتحانات میں مردوں کے علاوہ ہر مذہب و ملت کی خواتین بھی شریک ہوتی ہیں۔ اور اس طرح تعلیمی ذوق روز بروز پھیلتا جا رہا ہے۔

توقع ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو اپنے پرجوش کارکنوں کی بدولت روزافزوں ترقی کرے گا۔ اور ملک کے علمی و تمدنی ارتقاء میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے گا۔

سرپرستی

یہ خبر علمی حلقوں میں بڑی مسرت سے سنی جائے گی کہ شہزادۂ والاشان نے ازراہ علم دوستی ادارے کی سرپرستی قبول فرما کر ایک ہزار روپیہ بھی عطا فرمائے ہیں۔ (۱۰-۱-۵۰)

ادارۂ روزنامہ رہبر دکن

(ادارہ ادبیات اردو کا جلسہ تقسیم اسناد)

ادارۂ ادبیات اردو کا جلسۂ تقسیم اسناد اس مرتبہ شہزادۂ والاشان حضرت معظم جاہ بہادر کی صدارت میں باغ عامہ ٹاؤن ہال میں بڑی شان سے منعقد ہوا اور اسناد و انعامات کی تقسیم شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آئی۔ اس کی علمی سرگرمیاں ماشاء اللہ اب اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ملک کے ہر گوشہ میں انکا اعتراف کیا جا رہا ہے انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر عزم راسخ و سعی پیہم موجود ہو تو غیر سرکاری کوششیں بھی علمی و فنی میدان میں بہت ہی نمایاں نتائج حاصل کر سکتی ہیں۔ اس ادارہ نے جس کی ابتدا کچھ زیادہ شاندار نہ تھی، اردو کی خدمت کو اپنی فکر و کاوش کا مرکز ٹھیرایا اور ابتدا چند پرانی اور غیر مطبوعہ تاریخی و ادبی کتابیں نئے طریق پر مرتب کرکے شائع کرنی شروع کیں۔ مگر ذوق خدمت زبان نے خدمت کا موقع دیا اور خدمت نے ذوق خدمت کو بڑھانا شروع کیا اور اس طرح میدان عمل وسیع سے وسیع تر ہونے لگا۔ اب یکے بعد دیگرے قابل قدر کتابیں بھی نکلنے لگیں اور ایک ادبی رسالہ بھی شائع ہونے لگا اور اس کے باوجود اس نے ایک طرف تو اردو زبان میں "مخزن علوم و فنون" کی تدوین و ترتیب شروع کر دی اور دوسری طرف ناخواندگی کے خلاف مختلف امتحانی نصاب مرتب کرکے ایک جہاد شروع کر دیا اور سارے ممالک محروسہ میں امتحانی مراکز قائم کر دیئے۔ اس طرح ملک میں ہر سمت اردو زبان میں اسناد حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا اور مرد اور عورتیں کثیر تعداد میں بلا لحاظ مذہب و ملت ان امتحانوں میں شریک ہونے اور اسناد حاصل کرنے لگیں۔ حتیٰ کہ اس جلسۂ تقسیم اسناد میں ۱۲۰۲۷ اسناد اور ۲۰۰ انعامات تقسیم ہوئے۔

شہزادہ والاشان حضرت معظم جاہ بہادر نے جو اردو زبان و ادب کا ایک پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور اردو شعر و سخن کا بہت اچھا ملکہ اپنے فاضلانہ خطبۂ صدارت میں اس ادارہ کی سرگرمیوں کو نہایت ہی جامع طور پر ظاہر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا کہ۔

"اس ادارہ نے نہ صرف جدید و قدیم شاعروں کے کلام اور مکتوبات کے اچھے مجموعے اور انتخابات شائع کئے بلکہ ملکی مشاہیر ادب کے آثار کی حفاظت کا کام بھی کیا۔ مجھے یہ معلوم کرکے بھی بہت مسرت ہوئی کہ اس ادارے نے ملکی تاریخ کا ایک اچھا ذوق پیدا کر دیا ہے۔ خصوصاً سلاطین آصفیہ کے سبق آموز حالات زندگی شائع کرکے ملکی تاریخ کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ ادارہ مختلف علوم و فنون مثلاً تاریخ، سائنس، تنقید اور تعلیم سے متعلق بھی متعدد مفید کتابیں شائع کر چکا ہے۔ اس ادارہ کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ایک مخزن علوم و فنون مرتب کی جس کی پہلی جلد زیر طبع ہے۔

یہ سب کام بڑے اہم اور مفید ہیں جن کے لئے ادارہ کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مبارکباد کے مستحق ہیں لیکن میرے نزدیک اس ادارہ کی سب سے زیادہ قابل تعریف کوشش تعلیم بالغان کی مہم ہے"

ادارۂ ادبیات اردو اپنی ان ساری کوششوں کے لئے یقیناً مستحق مبارکباد ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کا دائرۂ افادیت انشاء اللہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا

(رہبر دکن بابت ۲ مارچ ۱۹۴۳ء)

ادارئیہ روزنامہ صبح دکن

ادارۂ ادبیات اردو

ادارۂ ادبیات حیدرآباد میں ایک عرصے سے علم اور ادب کی خاموش خدمت انجام دے رہا ہے۔ دکنی مخطوطات اور حیدرآباد کی باعظمت شخصیتوں کی سوانح حیات کو شایع کرکے اس نے حیدرآباد کے کلچر، تہذیب اور تمدن کو محفوظ کرنے میں بہت بڑی مدد دی۔

اس ادارے کے ۲۲ مارچ ۱۹۴۴ء کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ڈاکٹر شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر نے جو تقریر فرمائی اس میں آپ نے ادارے کی علمی خدمات کو بہت سراہا اور خصوصاً اس ادارے نے تعلیم بالغان کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا ہے اس کے متعلق شہزادہ والا شان نے فرمایا کہ:۔

"میرے نزدیک اس ادارے کی سب سے زیادہ قابل تعریف کوشش تعلیم بالغان کی مہم ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں تعلیم کا اوسط افسوسناک حد تک کم ہے۔ غریب اور ان پڑھ لوگوں کو پڑھا لکھا بنانا نہایت ضروری ہے"

ادارے کے یہ امتحانات چار سال سے برابر منعقد کئے جا رہے ہیں اور ادارے کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے امتحانات کو دیگر صوبوں مثلاً میسور اور بمبئی وغیرہ میں بھی پسند کیا جا رہا ہے۔

اس ادارے کی سرگرمی صرف اردو امتحانات کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس نے بعض بڑی عمدہ کتابیں بھی تعلیم بالغان اور اردو امتحانات کے نصاب کے لئے شایع کی ہیں۔ عوام کو تعلیم دلانے کی ساری ذمہ داری حکومت ہی پر عائد نہیں ہوتی بلکہ ملک کے بعض بااثر لوگوں کو بھی اس مہم میں کافی دلچسپی لینی چاہئے۔ دوسرے ممالک میں محض خانگی ادارے ہی کئی مفید اور کارآمد اسکیمیں چلاتے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو ایک بالکل خانگی ادارہ ہے جو ابتدا میں صرف چند لوگوں نے برپا کیا تھا لیکن آج اس کی وسیع سرگرمیاں اہل ملک سے خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ اس خصوص میں پرنس معظم جاہ بہادر نے فرمایا کہ:۔

"جہاں حضرت اقدس و اعلیٰ کی سرپرستی میں جامعہ عثمانیہ سرکاری طور پر علمی خدمات انجام دے رہی ہے وہیں ادارۂ ادبیات اردو کے نام سے یہ خانگی ادارہ بھی ملک کی زبان، تاریخ اور تمدن کی حفاظت و ترقی کے لئے گزشتہ تیس سال سے کوشش کر رہا ہے"

حیدرآباد میں جہاں کی تعلیم کا اوسط بہت ہی پست ہے وہاں ایسے اداروں کی سرگرمی یقیناً اس ملک کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ اردو کی اشاعت و ترویج کا بھی یہ امتحانات ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ اردو کو اگر قومی زبان بنانا ہے تو اسے پہلے عوام کی زبان ہونے کا موقع ملنا چاہیے۔ کیونکہ اگر محض تعلیم یافتہ حضرات ہی اردو لکھ پڑھ سکیں تو اردو زبان کبھی قبول عام کا درجہ حاصل نہیں کرے گی۔ اس مسئلہ کا بہترین ذریعہ یہی تھا کہ بجائے حکومت پر بوجھ ڈالنے کے خود خانگی طور پر اردو امتحانات منعقد کئے جاتے۔ بہت کم ادارے ایسے ہیں جو خالص علمی کام انجام

دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ادارۂ ادبیات اردو ملک کا وہ تنہا ادارہ ہے جو ٹھوس علمی اور اردو پرچار کا کام کر رہا ہے۔

اردو زبان میں ہر قسم کا ادبی سرمایہ تو موجود ہے لیکن تاہم اس کا دامن علوم و فنون سے تہی ہے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے جامعۂ عثمانیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ جامعہ عثمانیہ میں علوم و فنون کی بیسوں کتابیں ترجمہ کر دی گئیں۔ پھر بھی ایک انسائیکلوپیڈیا کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ کہ اس سے قبل بھی مختلف حضرات نے ہندوستان میں انسائیکلوپیڈیا کو شایع کرنے کی کوشش کی لیکن بعض ناگزیر وجوہات کے تحت ان کی تمنائیں بار آور نہ ہو سکیں۔ اس اہم اور صبر آزما کام کا ادارۂ ادبیات اردو نے باوجود اپنی کم عمری کے ارادہ کیا ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پرنس معظم جاہ بہادر نے فرمایا کہ :-

"اس ادارے کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ایک مخزنِ علوم و فنون مرتب کی جس کی پہلی جلد زیر طبع ہے۔"

اس عظیم کام کو ڈاکٹر زور صاحب نے شروع کیا جو پہلے بھی اپنے علمی مشاغل اور اردو ادب کی خدمت کے سلسلے میں کافی مشہور ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر زور صاحب نے جس وقت اس ادارے کو قائم کیا تھا تو اس وقت اس کا دائرۂ عمل بہت ہی محدود تھا لیکن آج یہ ادارہ ہندوستان کے چوٹی کے اداروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ شہزادۂ والاشان نے ڈاکٹر زور کی خدمات کی ان الفاظ میں تعریف کی کہ

"یہ سب کام ایسے اہم اور مفید ہیں جس کے لئے ادارہ کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مبارکباد کے مستحق ہیں۔"

اس ادارہ کو نواب مہدی یار جنگ بہادر جیسی اعلیٰ پایہ ہستی کی صدارت کا شرف بھی حاصل ہے جن کی گراں مایہ ہدایتوں پر عمل کرتے ہوئے ہم امید کرتے ہیں کہ ادارۂ ادبیات اردو، اردو زبان کی اصلاح، اشاعت اور ترویج کی سچی خدمت انجام دے گا۔

(از صبح دکن بابت ۲ اپریل ۱۹۴۴ء)

اداریہ روزنامہ پیام

(ادارۂ ادبیات اردو)

گزشتہ ہفتہ ادارۂ ادبیات اردو کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا جس میں شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ نے اسناد و انعامات تقسیم فرمائے۔ تقریباً ۱۴ سال ہم اس ادارہ کی جدوجہد کے نتائج اس کی سالانہ رپورٹوں سے اخذ کر کے پیش کرتے رہے ہیں۔ کم و بیش ۱۴ سال کی جدوجہد نے اس ادارہ کو ملک میں اردو ادبیات کا ایک اہم مرکز بنا دیا ہے۔

چند سال کی ابتدائی کوششوں کے بعد ڈاکٹر زور کی رہنمائی میں ادارہ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں دکن کی تاریخ اور دیگر قدیم علوم کے متعلق اپنی قابل قدر اشاعتوں کے ذریعہ سے ایک ایسی نمایاں حیثیت حاصل کر لی ہے جس کی بنا پر وہ اب اپنی علمی صلاحیتوں سے قومی زبان کی ترویج و اشاعت کے وسیع تر میدان میں بہت موثر اور مفید کام لے رہا ہے۔ چنانچہ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں ادارہ نے اردو امتحانات کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا ہے جو اس وقت تمام ملک پر حاوی ہے، ان امتحانات کے ذریعہ اردو زبان کی مقبولیت میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن ان امتحانات کا ایک قابل ذکر اور نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ بغیر کسی پروپگنڈے کے ملک کی غیر مسلم آبادی کے افراد بھی شوق کے ساتھ ان امتحانات میں شریک ہو کر اور کامیابی کی اسناد حاصل کر کے اس حقیقت کو ثابت کر رہے ہیں کہ سیاسی تفریق اور تنگ نظری کی بناء پر اردو زبان کی کتنی ہی مخالفت کی جائے لیکن وہ درحقیقت ملک کی عام زبان ہے۔

ادارہ کی روئداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم، اردو فاضل اور خوش نویسی کے امتحانات کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ ان کے مراکز اب ممالک محروسہ کے باہر بمبئی، مدراس، صوبہ متوسط اور میسور میں بھی قائم ہو گئے ہیں۔ امتحانات کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۴۳ء میں ادارہ کے ان امتحانات میں ۱۴۵۷ امیدوار شریک ہوئے جن میں سے ۱۲۵۵ کامیاب ہوئے یعنی سال بھر میں تقریباً ۱۹ سو ناخواندہ اشخاص نے اردو زبان میں تعلیم حاصل کی۔ اس تعداد میں مسلم و غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ ادارہ کی رپورٹ میں خاص طور پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ

> "ان اردو امتحانات میں ہر مذہب و ملت اور طبقے کے امیدوار شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سال امتحان اردو عالم میں ایک ہندو امیدوار پی، وی، گوپال راؤ بحیثیت مجموعی اول آئے۔ اسی طرح متعدد غیر مسلم امیدواروں نے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی ہے۔"

گویا یہ روہے ان لوگوں کے دعویٰ کا جو اپنی تنگ نظری یا فرقہ واری تعصب کی بنا پر اردو زبان کو محض مسلمانوں کی زبان قرار دیتے ہیں، اور جن کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ ملک کی قومی وحدت کے لئے کسی ایک زبان کو جو عام طور پر مقبول ہو قومی زبان قرار دینا ضروری ہے۔ حکومت سرکار عالی نے جب فارسی کے بجائے اردو کو اپنی دفتری زبان قرار دیا اور اس کو جامعہ عثمانیہ میں واسطہ تعلیم بنایا تو اس نے اس فیصلہ میں یقیناً کسی قسم کی فرقہ واری عصبیت کارفرما نہ تھی بلکہ صرف یہ مدبرانہ تصور اثر انداز تھا کہ وحدت ملی، وحدت لسانی

کے بغیر ناممکن ہے۔ اردو کی ترویج کے ہرگز یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ ملک کی متعدد دوسری زبانوں کی مخالفت کی جائے یا اُن کی ترقی کو روکا جائے لیکن ان سب کے درمیان ایک مشترک واسطہ ضروری ہے۔ اور اس لحاظ سے ادارۂ ادبیات اردو کا مقصد اپنی تعلیمی مہم کے ذریعہ سے بلا لحاظ مذہب و ملت تمام اہل ملک کی خدمت کرنا ہے۔ اگر ادارہ نے مختلف فرقوں کے درمیان اس لسانی رشتہ کو مستحکم کر دیا تو یہ بہت بڑی قومی خدمت ہوگی جو وہ ممالک محروسہ کے تمام باشندوں کی انجام دے گا۔

ادارہ کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت اردو امتحانات کے ذریعہ سے خواندگی کی مہم پر زیادہ زور دے رہا ہے۔ اس کا یہ عمل بالکل صحیح اور ضروری ہے۔ ہماری قومی زندگی میں پہلی ضرورت یہی ہے کہ ناخواندہ آبادی کو خواندہ بنایا جائے اور اگر ادارہ اپنی تمامتر قوت اسی سمت میں صرف کرے تو وہ ملک کے ایک بہت بڑے مسئلہ کو حل کر سکے گا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر قومی ارتقاء کے ہر شعبہ کی ترقی کا انحصار ہے۔

ہم ڈاکٹر زورؔ کو ان کی جدوجہد کے ان خوشگوار نتائج پر مبارک باد دیتے ہیں۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ یہ ادارہ زیادہ سے زیادہ اثر و قوت حاصل کرے اور ایک مرکزی حیثیت سے ناخواندگی مٹانے کی قومی ضرورت کو پورا کر سکے۔ ہمیں یقین ہے کہ تمام محبان ملک کی مخلصانہ اور پرجوش تائید ادارہ کو حاصل ہوگی۔

(روزنامہ پیام بابت ۱۴؍ اپریل ۴۴ء)

ادارۂ ادبیات اُردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
من کی بیتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ...	۹۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۹۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
صحبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۹۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۹۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	۰
" " دوسری کتاب	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن ...	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی ...	۸۰	۰	۱۰	۰
مرلقا ...	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
سچ کا جادو ..	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات ...	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گوہر و شبنم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر هندهای دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن ...	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب ..	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ..	۵۶	۰	۶	۰
آبدوزکشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان ...	۳۲	۰	۳	۰
خطابات ...	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا ...	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ ...	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت ...	۵۶	۰	۸	۰
ادارہ سفر ۱۹۳۲ء میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۲	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

(ماہ نامہ)

سب رس

۱۹۴۴ء

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی، ایس سی
خواجہ حمید الدین بی، اے

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

جلد ۷ بابت مئی ۱۹۴۴ء شمارہ ۵

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین بی اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد سے شائع ہوا۔

وارداتِ جگر

شعر و نغمہ، رنگ و نکہت، جام و صہبا ہو گیا — زندگی سے حسن نکلا، حسن رسوا ہو گیا

اور بھی آج اور بھی، ہر زخم گہرا ہو گیا — بس کر۔ اے چشمِ پشیماں، کام اپنا ہو گیا

اس کو کیا کیجیے۔ زبانِ شوق کو چپ لگ گئی — جب یہ دل شائستۂ عرضِ تمنا ہو گیا

میں نے جس بت پر نظر ڈالی جنونِ شوق میں — دیکھتا کیا ہوں، وہ تیرا ہی سراپا ہو گیا

اس کو شاید ہی میسر ہو کبھی توفیقِ دید — جو اسیرِ حلقۂ امروز و فردا ہو گیا

اُٹھ سکا تم سے نہ بارِ التفاتِ ناز بھی — مرحبا وہ جس کو تیرا غم گوارا ہو گیا

اپنی اپنی وسعتِ فکر و یقیں کی بات ہے — جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اس کا ہو گیا

وہ چمن میں جس روش سے ہو کے گزرے بے نقاب — دیر تک۔ ہر ایک گل کا رنگ گہرا ہو گیا

شش جہت آئینۂ حسنِ حقیقت ہے جگر
قیس دیوانہ تھا۔ محوِ روئے لیلا ہو گیا

(خاص برائے سب رس) — جگر مرادآبادی

علامہ سید علی حیدر طباطبائی اور انکی شاعری

جن اصحابِ علم نے شمالی ہند سے آکر حیدرآباد میں بود و باش کرلی اور حیدرآباد ہی کے ہو رہے، ان میں علامہ سید علی حیدر طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ مرحوم کا نام بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے، علامہ کی شخصیت کیا بلحاظ علم و فن اور کیا بلحاظ شعر و سخن ممتاز ہے، انھوں نے اردو شاعری میں ایک جدید نوع کا اضافہ کرکے اردو شاعری کے دائرہ کو وسیع کردیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ زبان اردو میں علامہ کا نام بھی جلی حروف میں لکھا جائے گا۔ اس موقع پر ہم مختصر طور پر آپ کے کلام کا تعارف کراتے ہیں، لیکن اس کے پہلے اختصار کے ساتھ آپ کے حالاتِ زندگی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

خاندان، پیدائش، تعلیم و تربیت۔ سید علی حیدر نام، طباطبائی خاندان کے ایک فرد۔ حسنی سادات سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے اجداد ایران سے ہندوستان آکر متوطن ہو گئے تھے، علامہ کے والد سید مصطفیٰ حسین ایک سپاہی منش آدمی تھے، علم و فن سے دلچسپی نہیں تھی، آپ کے دادا سید مہدی طباطبائی فوجدار جلال آباد (یو۔پی) تھے، آپ کی دادی نواب مختار الدولہ کی پوتی تھیں، مختار الدولہ، نواب آصف الدولہ کے نائب السلطنت تھے، علامہ کا سلسلہ مادری نواب معتمد الدولہ آغا میر کے خاندان سے ملتا ہے، اس طرح علامہ علی حیدر مرحوم لکھنؤ کے معززین و شرفاہی سے نہیں بلکہ صاحب منصب و جاہ تھے۔

ماہ صفر ۱۲۷۰ھ م ۱۸۵۲ء میں علامہ کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ آپ کا ننھیال اپنے علم و فضل کے لحاظ سے لکھنؤ میں ممتاز تھا، آپ کی پرورش ننھیال میں ہوئی اس لئے آپ باوجود شان امارت کے اعلیٰ تعلیم سے بھی مستفید ہوئے۔

سچ پوچھو تو آپ کی تعلیم آپ کی والدہ محترمہ کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ بچپن سے مکتب میں شریک کردیا گیا تھا، نجف علی ایک ملازم کے ساتھ مکتب کو جایا کرتے۔ مکتب کے دو ملا مشہور ہیں۔ ملا طاہر علم نحو کے ماہر تھے اور ملا باقر فقیہہ تھے ان دونوں کی تعلیم کے بعد آپ نے منشی میڈولال زار سے تحصیل علم کیا، زار اپنے وقت کے بہت اچھے شاعر اور فن عروض و بلاغت کے ماہر تھے۔ منشی صاحب ہی کی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ علامہ نے صرف پندرہ سال کے سن میں فارسی کی متداولہ کتابیں ختم کردیں، اس کے بعد آپ نے علامۃ العصر مجتہد وقت مولانا محمد علی (جو قائمۃ الدین کے نام سے موسوم ہیں) سے اپنی تعلیم کی تکمیل کی، اور انگریزی کی بعض ابتدائی کتابیں کلکتہ میں محمد عسکری صاحب سے پڑھیں اور پھر ذاتی مطالعہ سے اس میں خاصی مہارت پیدا کرلی۔

بہرحال مولانا علی حیدر ایک جید عالم تھے خصوصاً علم و ادب، صرف و نحو، عروض و بلاغت، فلسفہ و منطق میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

ملازمت۔ انگریزی حکومت کی جانب سے مٹیا برج کلکتہ میں شہزادگان اودھ کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا گیا تھا، علامہ اودھ کے شاہی خاندان کے ہمراہ کلکتہ میں مقیم تھے، آپ کی قابلیت کا اعتراف کلکتہ کی دو بڑی ہستیوں کو تھا جن میں سے ایک جسٹس سید امیر علی مرحوم اور دوسرے مسٹر کرافٹ ناظم تعلیمات بنگال تھے۔ اسی اعتراف کے بدولت علامہ کو مٹیا برج کے مدرسہ میں مدرس اور اتالیق شہزادہ کام بخش کی حیثیت سے مامور کیا گیا۔ جہاں آپ ۱۳۰۵ھ تک مقیم رہے۔

حیدرآباد کی آمد اور ملازمت ۔ سنہ ۱۳۰۰ھ کے قبل ایک مرتبہ علامہ علی حیدر بطور سیر و سیاحت حیدرآباد آئے تھے، اس زمانے میں نواب مختار الملک وزیر اعظم زندہ تھے مگر وہ حیدرآباد میں موجود نہیں تھے اس طرح علامہ ان کی ملاقات سے محروم رہے البتہ بعض ممتاز اصحاب سے ملاقات ہوئی جن میں مولوی سید افضل حسین (جو بعد میں حیدرآباد کے چیف جسٹس ہو گئے) بھی شامل تھے۔

سنہ ۱۳۰۵ھ میں جب واجد علی شاہ کا انتقال ہو گیا تو علامہ بھی کلکتہ سے بر داشتہ خاطر ہو گئے تھے اور کلکتہ کو چھوڑنے کے خواہشمند تھے، مولوی افضل حسین نے آپ کو طلب کر کے اولاً خانگی طور پر ایک سو روپیہ ماہوار کے ساتھ اپنے لڑکے کی تعلیم کے لئے مقرر کیا اس کے بعد کچھ عرصہ تک نظام کالج میں بحیثیت لکچرار منصرم طور پر کام کرتے رہے، پھر جب نواب عماد الملک اور مولوی عبد القیوم نے کتب خانہ آصفیہ کی بنیاد رکھی تو علامہ علی حیدر کو مہتمم کتب خانہ بنایا گیا۔ ایک سال تک آپ اس خدمت کو انجام دیتے رہے، اس کے بعد نظام کالج کے عربی کے پروفیسر مولوی حیدر علی کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ علامہ سید علی حیدر طباطبائی عربی کے پروفیسر بنا دیئے گئے، ایک زمانہ دراز تک آپ اس خدمت پر مامور رہے، ماہوار پانچ سو روپیہ سے زیادہ ملتی رہی، نظام کالج کے پرنسپل مسٹر سیٹن کو آپ کی قابلیت کا بڑا اعتراف تھا۔ وہ آپ سے عربی پڑھا کرتے تھے۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے شہزادگان والا شان کی تعلیم کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا اور نظام کالج کی پروفیسری سے آپ شہزادوں کی تعلیم کے لئے منتقل ہو گئے، اس کے بعد جامعہ عثمانیہ کے دار الترجمہ میں مامور کئے گئے، یہاں آپ نے ناظر ادبی کی حیثیت سے ادبی خدمت انجام دی اور اردو کی تصحیح اور وضع اصطلاحات میں بھی مصروف رہے۔ غرض سات سال سے زیادہ عرصے تک آپ سرکاری خدمات انجام دے کر نیک نامی کے ساتھ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

انتقال اور آل و اولاد ۔ علامہ علی حیدر نے بڑی عمر پائی چنانچہ انتقال کے وقت ۸۲ سال کا سن تھا ۲۳ مئی سنہ ۱۹۳۳ء م سنہ ۱۳۵۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی، محلہ ترپ بازار کے تکیہ شاہ صاحب میں دفن کئے گئے۔ آپ کے بڑے فرزند سید احمد مہتمم کروڑگیری ہیں اور دوسرے فرزند سید امجد جاگیردار کالج میں سائنس کے لکچرار ہیں، چار لڑکیاں ہیں جن میں بڑی صاحبزادی سید احمد صاحب سے بھی بڑی ہیں۔

اخلاق و عادات ۔ علامہ علی حیدر بڑے منکسر المزاج تھے، شان و شوکت نام و نمود نہیں تھا شیعہ مذہب کے پیرو تھے مگر مذہبی تعصب بالکل نہیں تھا آپ پرانے زمانہ کے مولوی اور مجتہد تھے مگر اس کے ساتھ ہی بڑے روشن خیال تھے، آپ کی روشن خیالی کے ثبوت میں تین امور کا اظہار کافی ہوگا، آپ سائنس کی تعلیم کو ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی سمجھتے تھے۔ چنانچہ خود اپنے لڑکے کو سائنس کی اعلیٰ تعلیم دلائی۔ مدراس یونیورسٹی سے بی، ایس، سی میں سید احمد صاحب نے کامیابی حاصل کی۔ جیسا کہ بیان کیا گیا آپ میں مذہبی تعصب نہیں تھا تعزیہ داری وغیرہ سے شغف نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی پوری عمر شعر و سخن میں بسر ہوئی لیکن غزل گوئی کو آپ شاعری خیال نہیں کرتے تھے بلکہ کسی واقعہ سے متاثر ہو کر نظم نگاری کو در اصل شاعری تصور کرتے تھے۔ آپ باوجود اعلیٰ خدمت اور اعلیٰ قابلیت کے شہرت کے طالب نہیں تھے، گمنامی اور گوشہ نشینی پسند تھی۔

علمی خدمات ۔ اب ہم علامہ سید علی حیدر کے علمی کارناموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کی تفصیل طویل صفحات کی متقاضی ہے جس کا

یہاں موقع نہیں۔ اس لئے مختصر طور پر ان کی صراحت کی جاتی ہے، آپ کی علمی خدمات مختلف نوعیت رکھتی ہیں، مثلاً شاعری، نثرنگاری وضع اصطلاحات، درس و تدریس، یونیورسٹیوں کی مجلس کی رکنیت، مہتمی، علمی انجمنوں کی شرکت وغیرہ۔

علامہ علی حیدر کا تخلص نظم تھا، آپ کی شاعری کے متعلق آئندہ صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی۔ آپ پرگو شاعر تھے اس کے ساتھ ساتھ بہترین نثار بھی تھے مستقل تصانیف کے علاوہ آپ کے مضامین کی تعداد کثیر ہے۔ جو شمالی ہند اور حیدرآباد کے معیاری رسالوں میں نہایت قدر اور عزت کے ساتھ شایع کئے جاتے تھے، چنانچہ دکن ریویو، ذخیرہ، دبدبۂ آصفی، ادیب الہ آباد، اردوئے معلیٰ، نقاد، زمانہ، افادہ، العصر، شعلہ وغیرہ بیسیوں رسالوں میں آپ کے مضامین شایع ہوئے ہیں۔ آپ کا ایک طویل مضمون "آداب الکاتب الشاعر" ہے۔ جو ایک ضخیم مقالہ ہے۔ علامہ کے مضامین ان کے ورثا کی جانب سے شایع ہونے والے ہیں۔

آپ کی مستقل تصانیف میں عربی اور اردو دونوں شامل ہیں۔ عربی کے قطع نظر یہاں ہم اردو کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں، آپ کی "شرح دیوان غالب" نہایت مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کے متعلق مولانا حالی (جو غالب کے شاگرد رشید تھے) بیان کرتے تھے کہ اگر استاد مرحوم زندہ ہوتے تو وہ بھی آپ کے شکر گزار ہوتے، اسی طرح آپ نے شرح دیوان بیدل اور شرح دیوان امراء القیس بھی مرتب فرمائی تھی مگر افسوس ان کی اب تک اشاعت نہیں ہوئی۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابوں کے لئے آپ نے وضع اصطلاحات کا بہت کچھ کام کیا ہے، بیسیوں الفاظ آپ کے وضع کئے ہوئے ہیں، وضع اصطلاحات کی کمیٹی میں آپ اپنے انتقال تک شریک ہوتے رہے اور قیام جامعہ عثمانیہ میں بھی آپ کے مشوروں سے استفادہ کیا جاتا رہا۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں علامہ عرصہ دراز تک نظام کالج میں علوم شرقی کے پروفیسر رہے۔ اس طرح صدہا طلبہ نے آپ سے عربی، فارسی اور اردو پڑھی ہے، اس کے علاوہ بیسیوں طلبہ اور بعض طالبات نے خانگی طور پر بھی آپ سے استفادہ کیا ہے، قدیم اصول اسلامی کے مطابق آپ بلا کسی معاوضہ کے تشنگان علم اور شائقین فن کو سیراب کرتے رہے، اگر آپ کے شاگردوں کی فہرست لکھی جائے تو خاصی طویل ہو سکتی ہے، شاعری میں سرشار، شرر، لمعہ، ذہین، یاس لکھنوی وغیرہ نے شاگردی کی ہے۔

مدراس یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ کی سینٹ اور سنڈیکیٹ کے آپ ممبر تھے۔ آپ ہی کی جدوجہد اور کوشش سے مدراس یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے امتحانات قائم ہوئے، اور ان امتحانات کے لئے حیدرآباد سنٹر بنا۔ آپ آخر وقت تک ان جامعات کے ممتحن ہوتے رہے۔

مدرسہ دارالعلوم کی اصلاح میں بھی آپ کا کافی حصہ ہے۔ اس کے نصاب وغیرہ کی کمیٹیوں میں آپ سے مشورہ لیا جاتا رہا۔ علامہ کئی علمی انجمنوں کے رکن تھے اور اپنے خیالات اور مشورہ سے مستفید کیا کرتے تھے۔ غرض کہ علامہ سید علی حیدر طباطبائی کی علمی خدمات کی پوری صراحت وقت اور فرصت کی متقاضی ہے[1]۔

---

[1] علامہ کے حالاتِ زندگی کے لئے میں سید احمد صاحب کا شکر گزار ہوں۔

شاعری ۔ علامہ سید علی حیدر ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس میں علم و فضل کے ساتھ شاعری کا بھی ذوق تھا۔ آغا میر کے خاندان میں کئی ایک مشہور شعرا گزرے ہیں۔ پھر آپ کے استاد منشی میڈولال زار بھی اپنے وقت کے بہت اچھے شاعر تھے، ان وجوہ سے علامہ کا ماحول شاعری میں بسر ہوا، اور پھر مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے طفیل شعر و سخن کا بازار گرم تھا، اس طرح علامہ علی حیدر بھی اپنے سن شعور ہی سے شاعری کرنے لگے۔

آپ کے کلام کو چار اصناف میں تقسیم کرسکتے ہیں، یعنی قصائد، نظمیں، انگریزی نظموں کے ترجمے، اور غزلیں، یہ چاروں اقسام اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث قابل قدر اور لائق داد ہیں، مختصر طور پر ہر ایک نوعیت کی صراحت کی جاتی ہے۔

قصائد۔ شاعری کی ایک قدیم اور مقبول صنف، قصیدہ ہے، عربی اور فارسی کی تقلید میں اردو میں اس کا آغاز ابتدا ہی سے ہوا ہے۔ دکھنی شعرا کے قصائد مشہور ہیں، سلطان محمد قلی قطب شاہ، علی عادل شاہ ثانی، نصرتی وغیرہ کے قصائد اپنی مخصوص خوبیوں، مضامین کی جدت، طمطراق، شوکت لفظی وغیرہ کے لحاظ سے قابل توصیف ہیں، اس کے بعد آصفی دور کے ابتدا میں بھی قصائد کا زور رہا، اس زمانہ کے قصائد کے متعلق ہمارا ایک مضمون "مقالات ہاشمی" میں شامل ہے۔

جنوبی ہند کے قطع نظر شمالی ہند کے قصائد بھی اردو زبان کا اہم سرمایہ ہیں خصوصیت سے سودا اور ذوق کے قصائد کو اردو ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سودا اور ذوق نے اس صنف شاعری کو اردو زبان میں ترقی دیکر معراج پر پہونچا دیا۔ ان کے قصائد اردو زبان کے شہ کار ہیں۔

ذوق کے بعد کئی ایک شعرا نے قصیدہ نگاری کا حق ادا کیا، امیر، داغ، منیر، قدر وغیرہ کے قصائد اپنی اپنی حیثیت سے قابل تذکرہ ہیں، ان کے بعد نظم ہی کو قصائد کے لحاظ سے دوسروں پر ترجیح حاصل ہے، حضرت نظم کے قصائد کئی لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں۔ اول تو یہ کہ نظم کے قصائد زیادہ تر نعت اور سیرت النبی کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے ہیں، پھر ان میں واقعہ نگاری کا جو حق ادا کیا گیا ہے وہ نظم ہی کا حصہ ہے، نظم کے جو قصائد بادشاہوں کی مدح میں ہیں، وہ اپنے شوکت لفظی، طمطراق، جدت مضامین کے لحاظ سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں، ان قصائد میں قصائد کی خصوصیتوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔

نظم کے شائع شدہ مجموعہ میں چودہ قصائد شامل ہیں، ان میں سے سات آنحضرت صلعم کی سیرت سے متعلق ہیں اور سات بادشاہوں کی مدح میں۔ اول الذکر کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) بعثت و فتح مکہ (۲) قصیدہ معراج (۳) قصیدہ ذکر ہجرت و غزوۂ بدر (۴) قصیدہ ذکر جاہلیت و جہاد آنحضرت صلعم (۵) قصیدہ جنگ احزاب (۶) قصیدہ جنگ خیبر (۷) قصیدۂ جنگ حنین۔

قصائد کے مختلف لوازم ہیں۔ اول تو یہ کہ اس کے الفاظ شاندار اور پرشکوہ ہوں، دوسرے یہ کہ اس کے الفاظ روزمرہ سے جدا گانہ ہوں، ان میں جدت ہو۔ سامع پر ان کے سننے سے رعب پڑے، تیسرے یہ کہ وہ معنوی محاسن سے بھی مملو ہوں، حسن بیان ہو۔ چوتھے یہ کہ قصیدہ صنائع اور بدائع سے مرصع رہے، نئی نئی ترکیبیں ہوں اور تشبیہات اور استعارات میں جدت ہونی چاہیے۔

قصیدوں کے مضامین اور ترتیب بھی مقررہ ہوتی ہے، اول تمہید ہوتی ہے جس کو تشبیب کہتے ہیں، اس کے بعد گریز ہوتی ہے۔ یعنی تمہید کے بعد اصل مضمون شروع ہوتا ہے، گریز کے بعد مدح ہوتی ہے اور آخر میں دعا پر قصیدہ ختم ہوتا ہے۔ نظم کے قصائد میں یہ جملہ لوازم موجود ہیں، اس کے علاوہ واقعہ نگاری اور مرقع نگاری کا جو حق ادا کیا گیا ہے، وہ خاص ان ہی کا حصہ ہے، دکن کے قدیم شعرا کی طرح انھوں نے اپنے قصیدوں میں واقعہ نگاری کی خوب ہی داد دی ہے۔

مختصر طور پر کچھ نمونہ پیش ہے۔

کہاں سے کھینچ کر وارفتگی مجھ کو کہاں لائی — میں ہوں راز نہفتہ اور جہاں بازار رسوائی
کوئی سمجھا کہ یہ جھنکار کی کیسی صدا آئی — دل نازک تھا شیشہ اور پتھر تھی شکیبائی
پریشاں ہوں الجھ کر جال میں پیچ تکوب کے — اسیر دام ہوں میں اور ہزار آنکھیں تماشائی
تعین نے مکاں کے بیڑیاں کیوں پاؤں میں ڈالیں — تسلسل نے زماں کے کیوں مجھے زنجیر پہنائی
حواس خمسہ میں گھر کر میں سیر لامکاں بھولا — جہات ستہ میں پھنس کر طبیعت میری گھبرائی
وہ اپنی سادگی کی وضع یاد آتی ہے رہ رہ کر — کہ یہ رنگیں قبائے کیف وکم مجھ کو نہیں بھائی
حقیقت سے خرابات جہاں کی رند واقف ہیں — کہ اٹھ جائیں گے اس محفل سے لیکر ایک انگڑائی
یہ حسرت تھی نثار مقدم خیر البشر کرتا — حیات جاوداں افسوس ہے مجھ کو نہ ہاتھ آئی
پیاس سید کے ختم المرسلیں ہونے سے ثابت ہے — کہ یہ قربت رسولان سلف نے بھی نہیں پائی

جنگ خیبر کے قصیدے سے واقعہ نگاری کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

پکارا نام مرحب ہے مرا مشہور عالم میں — مقابل میرے ہو وہ جس کو اپنی جان ہو دوبھر
اماں کا ہو اگر خواہاں تو لا تیغ و سپر رکھ دے — جگر داری کا ہو دعویٰ تو لے شمشیر و وپیکر
ملا کر آنکھ اس کافر سے حضرت نے یہ فرمایا — کہ میری والدہ نے نام رکھا ہے مرا حیدر
اجل کو مرحبا کہہ نام ہے مرحب اگر تیرا — قضا کو خیر مقدم کہہ جو ہے تو نی بدِ لشکر
سنبھل کر ، ہاتھ قبضہ پر رکھا شیر الہٰی نے — کہیں ارمان رہ جائے نہ دل میں وار تو بھی کر
غرض آمادۂ پیکار شکل سے ہوا ظالم — ادھر اس کا اٹھا ہاتھ اور ادھر شمشیر دوپیکر
چمک سی اک ہوئی میدان میں اور ساتھ ہی اس کے — شگافت کوہ سے دیکھی نکلتے خون کی چادر
یہ ثابت کر دیا جرش نے اس تیغ دوپیکر کی — کہ تھا ایک اس کے آگے استخواں فولاد اور پتھر
یہ تھی تلوار کی جھنکار یا بجلی کا گرنا تھا — وہ تھا دست خدا یا قوت بازوئے پیغمبر

قصائد میں تشبیہات اور تخیلات سے بھی کلام کے جوہر ظاہر کئے جاتے ہیں۔ گھوڑے اور تلوار کی تشبیہات ملاحظہ ہوں۔

لکھوں ہر تیغ کی خوبی کہ ہر رہوار کی شوخی — جو آفت اس نے برپا کی قیامت اس نے بھی ڈھائی

چلی وہ ناز سے بن کر تو یہ انداز سے تن کر — اڑایا اس نے سر کافر کا اس نے لاش ٹھکرائی

وہ بجلی کی طرح کوندی یہ شعلہ کی طرح بھڑکا — دم پیکار اس نے خون اس نے خاک برسائی

بہایا اس نے جوں جوں خون اس کے سم بھر گئیں — اڑائی اس نے جوں جوں خاک اور اس نے جلا پائی

جو اس کی آنچ تھی آفت تو اس کی چال بھی آندھی — لگائی آگ اس نے رزم گہ میں اس نے بھڑکائی

پسینہ میں جو یہ تر ہے تو اس پر دام جوہر ہے — گہر ریزی جو اس میں ہے تو اس میں گوہر آرائی

اردو شاعری میں نعت نگاری کا سہرا حضرت محسن کاکوری کے سر ہے، محسن کے قصائد سادگی کے لحاظ سے قابل تذکرہ ہیں تو نظم کے قصائد اپنے رفعت خیال اور علمیت کے باعث ممتاز ہیں، مبالغہ اور لفاظی جو قدیم قصیدوں کے لوازم تھے، نظم نے اپنے قصیدوں میں ان کو متروک کر دیا، اس کے باوجود عرفی اور خاقانی کی طرح جوش اور عظمت سے نظم کے قصائد مملو ہیں، ان کے قصائد میں دقیق فلسفیانہ اور متصوفانہ خیالات کا اظہار رہا ہے، نعتیہ قصائد کی تشبیہوں میں شاعرانہ حقائق کی بجائے، آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک کے اہم واقعات کی مرقع نگاری کی ہے۔

بہر حال حضرت نظم کے قصائد اپنی خصوصیات کے باعث ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، اور اردو ادب میں ان کو خاص درجہ دیا جانا چاہیے۔

(باقی آئندہ)

نصیر الدین ہاشمی

جواب الجواب

"سب رس" جلد، شمارہ (۲) بابت فروری ۱۹۴۲ء میں جناب حامد حسن صاحب قادری پروفیسر آگرہ کالج کا ایک مضمون زیر عنوان "فانی کے نقاد" شایع ہوا ہے، جس کا تعلق براہ راست "نقد سخن" سے ہے۔ لہٰذا مجھ کو ممنون ہونا چاہیے جناب قادری صاحب کا جن کے خیالات کی روشنی میں اپنے خیالات پر مکرر نظر ڈالنے کا موقع حاصل ہوا۔

کچھ اس طرح تڑپ کر میں بے قرار رویا
دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رویا

"نواب عزیز یار جنگ بہادر کی تنقید ہے۔"

"اعتراض" "من بیقرار" کا ترجمہ "میں بیقرار" صحیح نہیں اس لئے کہ فارسی ترکیب میں لفظ "من" مضاف واقع ہوا ہے۔

"جواب" "میں بیقرار رویا" کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ "میں بیقرار ہو کر رویا" جس طرح "بے اختیار رویا" میں "ہو کر" روزمرہ میں ترک کر دیا گیا ہے، لیکن مصرع کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ فانی نے "من بیقرار" کے مفہوم میں "میں بیقرار" باندھا ہے، اس لئے محل نظر ہو سکتا ہے۔ "جواب الجواب" "میں بے اختیار رویا" یہ روزمرہ کے مطابق ہے، اس میں "ہو کر" کہنے کی نہ پہلے ضرورت تھی نہ اب ہے، بے شک "میں بیقرار رویا" اس میں "ہو کر" کی ضرورت ہے جب تک "ہو کر" کا لفظ بندش میں داخل نہ ہو شعر مہمل ہی رہے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ لفظ بیقرار، قافیہ ہے "رویا" ردیف، قافیہ اور ردیف کے درمیان میں "ہو کر" کی گنجائش کہاں؟ لہٰذا اس مصرع کو یوں پڑھنا چاہیے:۔

"کچھ اس طرح تڑپ کر میں زار زار رویا"

اس اصلاح میں "تڑپ" کا لفظ جو لفظِ بیقرار کی وجہ سے زائد بلکہ حشوِ قبیح تھا، بامعنی ہو گیا۔

آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوئے ملے ہیں
دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

"اعتراض" دونوں مصرعوں میں زمانے کا تطابق الفاظ سے صحیح نہیں ہے، ردیف "رویا" کی بجائے "روتا ہے" چاہیے۔
"جواب" اس شعر پر سیماب صاحب نے بھی یہی اعتراض کیا ہے لیکن یہ اختلاف زمانہ، اساتذۂ قدیم کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، مثلاً فصیح الملک مرزا داغ دہلوی فرماتے ہیں:۔

خط میں لکھا ہے جو حال دلِ مضطر اپنا
واں بھٹکتا ہی پھرا ہائے کبوتر اپنا

اگر تطابق زمانہ ضروری ہوتا تو حضرت داغ یا پہلے مصرع میں "لکھا تھا" لکھتے یا دوسرے مصرع میں "بھٹکتا ہی پھرتا ہے" بالکل یہی افعال اور یہی زمانے فانی کے شعر میں ہیں۔
"جواب الجواب" حضرت داغ کا شعر جو سند میں پیش کیا گیا ہے اس کے ہر مصرع سے ایک علیحدہ کیفیت ظاہر ہوتی ہے، ایسے مواقع پر تطابق افعال اور زمانے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، برخلاف اس کے فانی مرحوم کے شعر میں "آیا ہے" "ملے ہیں" ماضی قریب کے صیغے ہیں اور دوسرے مصرع میں اس کیفیت کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے صیغۂ ماضی مطلق (رویا) کا استعمال نہ صرف مخل فصاحت ہے بلکہ خلاف قاعدہ بھی ہے۔ نیز "غم" کا فعل "رونا" عجیب ہے، غم رلاتا ہے روتا نہیں۔

کیا اس کو بیقراری یاد آ گئی ہماری؛ مل مل کے بجلیوں سے ابر بہار رویا

"اعتراض" دونوں مصرعوں میں ربط نہیں ہے چونکہ پہلے مصرع میں "کیا" حرفِ استفہام ہے، اس لئے دوسرے مصرع میں "ل ل" کی بجائے "کیوں ل" ہونا چاہیے۔

"جواب" اگر "کیوں ل" ہوتا تو بلا شبہ درست تھا اور دونوں مصرعوں میں حروفِ استفہام سے حسنِ نظم پیدا ہوجاتا۔ لیکن ربط نہ ہونے کا اعتراض موجودہ مصرع پر بھی نہیں ہوسکتا، مضمون اور اسلوب صحیح ہے اور ربط صاف نظر آتا ہے۔ مضمون میں پہلے مصرع سے پہلے لفظ "جو" یا کہ "محذوف" ہے، یہ تقدیر زبان میں جائز ہے اس خلا کو ذہن بھر لیتا ہے بلکہ تکرار کے ساتھ ل ل نے جو بیقراری کا مفہوم پیدا کر دیا ہے وہ حسنِ مضمون میں اضافہ کر رہا ہے۔

"جواب الجواب" محذوف کا تصور درست ہوسکتا جب کلام میں قرینہ پایا جائے، شاعر کے ذہن میں مصرع ثانی کی حد تک کوئی کلمہ محذوف معلوم نہیں ہوتا، سامع کو اختراع کا کوئی حق نہیں اور نہ کسی کلمہ کا بے وجہ محذوف قرار دے کر شاعر کی طرف منسوب کرنا درست ہے، تاوقتیکہ مصرع ثانی میں حرفِ اول حذف کرکے مفروضہ حرف "جو" یا "کیوں" نہ بڑھایا جائے شعر درست نہیں ہوسکتا۔ ایسی فروگزاشت کو ضعفِ نظم کہنا چاہیے۔

آیا کہ دل گیا کوئی پوچھے تو کیا کہوں
یہ جانتا ہوں دل ادہر آیا اُدہر گیا

"اعتراض" اس شعر میں دل کا آنا کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ اگر لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے "آنا جانا" تو عاشق کا دل ٹینس بال ٹھیرا یعنی ادہر آیا اُدہر گیا" اگر "دل آنا" مجازاً عاشق ہونا کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو جب بھی "ادہر آیا اُدہر گیا" سے کیا مراد ہے؟

"جواب" نواب صاحب نے تامل نہیں فرمایا ورنہ اس اعتراض کا محل نہ تھا، دل کا آنا جانا دونوں مجازی معنوں ہی میں استعمال ہوسکتے ہیں اور فانی نے بھی دوسرے مصرع میں مجازاً ہی لکھے ہیں، یہاں لغوی معنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن پہلے مصرع میں بطور صنعت قول بالموجب کے لغوی معنوں سے لطفِ بیان پیدا کیا ہے اور بہت دلچسپ شعر نکلا ہے، اس طرح کسی محاورہ کے لغوی و مجازی پہلوؤں سے مضمون پیدا کرنا اصل میں متقدمین کا طرز تھا۔ ان بزرگوں نے لفظوں سے بہت کھیل کھیلے ہیں، فانی کا یہ انداز نہیں۔ پھر بھی ان کے کلام میں کہیں کہیں نظر آجاتا ہے۔ "دل آنا" کی طرح "دل جانا" بھی مجازاً عاشق ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے　　میر

لیکن اس محاورہ میں دل کا ہاتھ سے جاتا رہنا بھی مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ مرزا داغ کے اس مطلع میں صاف ہے۔

دل گیا تم نے لیا ہم کیا کریں
جانے والی چیز کا غم کیا کریں

یا جیسے مومن خاں دہلوی اس سے بھی زیادہ تصریح کرتے ہیں۔

کیا لگا دست دلارام سے ہاتھ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ
آئینہ جلدی سے پٹک دو کہیں
دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا　　مومن

ان ہی محاروں کی بنا پر فانی کہتے ہیں کہ یہاں تو یہ حال ہے کہ دل کا آنا جانا ایک ہی بات ہے، آنے جانے میں کوئی وقفہ نہیں، ادہر آیا ادہر گیا کہنے کو آتا ہے لیکن اصل میں جاتا ہی ہے، یا یوں سمجھو کہ دل ادہر آیا (عاشق ہوئے) اُدہر گیا۔

(پہلو سے ہاتھ سے کام سے) اب اگر کوئی پوچھے کہ دل آیا کہ گیا؟ تو بتاؤ میں کیا جواب دوں۔

جواب الجواب "یہ کد و کاوش قابل ستائش ضرور ہے لیکن محولہ اشعار میں ایک بھی مثال مفید مطلب نہیں، جس سے اصلی اعتراض رفع ہوسکے، مصرع ثانی میں (دل کا ادہر آنا ادہر جانا) جس طرح استعمال ہوا ہے اس سے بجز لغوی معنی (یعنی تبدیل سمت) کے مجازی معنی کا تصور پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔

شاید کہ شام ہجر کے مارے بھی جی اٹھے
صبح بہار حشر کا چہرہ اتر گیا

"اعتراض "جی اٹھے" یہ الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ "شام ہجر کے مارے" "کشتگان شام ہجر" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، لیکن اردو میں اس کے معنی ہیں وہ لوگ جن کو "شام ہجر نے ستایا ہے" جیسے "مصیبت کا مارا" جو مصیبت زدہ کا ترجمہ ہے کشتۂ مصیبت کا نہیں۔

"جواب" جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا۔ فانی کبھی کبھی رعایت الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں، اسی غرض سے (جی اٹھے) کے تضاد کی خاطر شام ہجر کے مارے، لکھ دیا۔ لیکن اس کے معنی کشتگان شام ہجر کے نہیں لئے ہیں بلکہ شام ہجر کے ستائے ہوئے عاشق بھی (جی اٹھے) اس لئے کہ "جی اٹھنے" کے تذکرے کے لئے کشتے یا مردے کا لفظ لانا ضروری نہیں ہے۔ فانی کے مصرع میں (مارے) اور (جی اٹھے) آنے سے ایہام تضاد کا حسن پیدا ہوگیا ہے۔

مجھے فانی کے اس شعر پر ایک اور اعتراض ہے، جو نواب صاحب کے اعتراض سے الگ ہے۔ یعنی دوسرے مصرع میں لفظ بہار نے کوئی خاص فائدہ نہیں دیا۔ صبح حشر کہنا کافی تھا۔

"جواب الجواب" اس شعر میں ایک غلط محاورے کے استعمال پر اعتراض ہے، جو کسی رعایت لفظی یا مصنوعی صنعت سے رفع نہیں ہوسکتا۔ استاد سخن حضرت غالب کے اس شعر سے اس صنعت کی قلعی کھل جاتی ہے، نیز صحت زبان اور اصلی محاورہ "مارے" اور "مارے ہوئے" کا فرق واضح ہوجاتا ہے۔

بسکہ اک ہم ہیں بہار ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

تجھے خبر ہے، ترے تیر بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دل ناتواں نہیں ملتا

"اعتراض" دوسرے مصرع میں الفاظ ماسبق کے لحاظ سے ردیف "نہیں ملتا" صحیح نہیں، یہ مقام "نہیں ملا" کا ہے۔

"جواب" میری رائے میں "نہیں ملتا" سے تلاش کا جاری ہونا پایا جاتا ہے، اس لئے اسی میں زیادہ معنویت ہے، یہ مفہوم ہے کہ ہم بہت دنوں سے ڈھونڈھ رہے ہیں، لیکن نہیں ملتا۔ نہیں ملا کی صورت میں صرف یہ معنی ہوں گے کہ بہت دنوں سے نہیں ملا، اس میں جستجوئے پیہم و جاری نہ پائی جائے گی۔

فانی کے اس شعر کا مرزا داغ کے مندرجہ ذیل شعر سے توارد دلچسپ ہے۔

ملتا نہیں ہم کو دل گم گشتہ ہمارا
تو نے تو کہیں اے غم جاناں نہیں دیکھا

مرزا صاحب کا خطاب "غم جاناں" سے نہایت موزوں اور معنی خیز ہے، فانی نے خود محبوب سے پوچھا ہے اس میں کوئی لطف نہ تھا۔ لیکن تیرے تیر بے پناہ کی خیر کہہ کر اسلوب بیان میں حسن پیدا کردیا۔

"جواب الجواب" زیر بحث شعر میں جستجوئے پیہم اور تلاش کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے، اس لئے معنویت کی خاطر غلط لفظ کے استعمال کی حمایت ہرگز جائز نہیں۔ اگر جستجوئے پیہم کو اہمیت دینی

مقصود ہو تو مصرع ثانی یوں ہونا چاہیے۔ ع

ہمیں تو اپنا دلِ ناتواں نہیں ملتا

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنجِ زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

"اعتراض" غم کے ساتھ "ملنا" استعمال نہیں ہوتا۔

"جواب" غمگین ہونا کے معنی میں غم ملنا' بے شک غلط ہے' لیکن فانی کے شعر میں یہ معنی نہیں ہیں۔ "غمِ جاوداں نہیں ملتا" کے یہ معنی کہ غم جاوداں میسر نہیں ہوتا۔ اس مفہوم کے لئے ملنا درست ہے۔

"جواب الجواب" "غم ملنا" "غم میسر آنا" "غم حاصل ہونا" یہ سب الفاظ ٹکسال باہر اور ناقابل استعمال ہیں۔ لیکن غم نہ ملنے کا غم ایک نئی اپج ہے' اور قابلِ داد!

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے
کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

"اعتراض" "مصرع میں "نہیں" کے عوض دونوں جگہ "نہ" چاہیے۔ جیسے (تو نہ یہاں ملتا نہ وہاں ملتا)۔

"جواب" "یہ اعتراض عجیب ہے نواب صاحب کی تجویز کے مطابق شعر کی عبارت یہ ہوگی "تیری تلاش کا ماحصل یہ ہے کہ تو نہ یہاں ملتا نہ وہاں ملتا۔" میری رائے میں یہ صحیح اردو نہیں ہے۔ (ماحصل یہ ہے) کی حالت میں اس طرح درست ہو سکتا ہے۔ "تری تلاش کا ماحصل یہ ہے کہ تو نہ یہاں ملتا ہے نہ وہاں ملتا ہے"۔

یہی مضمون فانی کے اسلوب کا ہے' (نہیں ملتا) سے ہی مطلب ادا ہوتا ہے (نہیں) کے ساتھ (ہے) کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اور (نہ) کے ساتھ (ہے) لازم ہے ورنہ (نہ یہاں ملتا نہ وہاں ملتا) کے معنی بدل جائیں گے۔ نواب صاحب نے جو دونوں جگہ (نہ) تجویز کیا ہے وہ اس صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ مصرع اول میں (ماحصل یہ ہے) کی جگہ (ماحصل یہ ہوتا) رکھ دیا جائے یعنی مضمون اس طرح ہو (تری تلاش کا ماحصل یہ ہوتا کہ تو نہ یہاں ملتا نہ وہاں ملتا)۔

"جواب الجواب" اعتراض یہی ہے کہ "تو نہ یہاں ملتا ہے نہ وہاں ملتا ہے" (ہے) کا لفظ کتابت سے چھوٹ گیا ہے' مصرع کی ترتیب ناقص ہے۔ محاورہ اس کی تائید نہیں کرتا نیز مصرع اولیٰ میں لفظ "فی الجملہ" حشو قبیح۔

اب اُسے دار پہ لیجاکے سلا دے ساقی
یوں بہکنا نہیں اچھا ترے متانے کا

"اعتراض" یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دار پر سلانے کی زحمت ساقی کو کیوں دی جا رہی ہے اور "دار پر سلانا" کس معنی میں استعمال ہوا ہے اگر "سولی دینا" کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو غلط ہے۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اردو میں "دار پر چڑھانا" مستعمل ہے۔

"جواب" فانی کے اس شعر پر سیماب صاحب اکبرآبادی کو بھی اعتراض ہے۔ ان کا تبصرہ یہ ہے' پہلے مصرع میں (لیجاکے) برائے بیت ہے اور "دار" سے ساقی کا عملی تعلق بھی نہیں،

یہ اعتراضات بہت پُرلطف ہیں اس لئے کہ نواب صاحب اور سیماب صاحب دونوں مرزا داغ کے شاگرد ہیں اور دونوں کہنہ مشق استاد ہیں۔ سیماب صاحب کو (لیجاکے) برائے بیت معلوم ہوتا ہے لیکن نواب صاحب اس پر اعتراض نہیں کرتے یہاں یہ احتمال کرنا مشکل ہے کہ نواب صاحب کی نظر سے یہ اعتراض رہ گیا۔ انھوں نے بہت غور و فکر کے ساتھ صرف وہی اعتراضات کئے ہیں جو ان کے نزدیک قابل توجہ اور درست تھے۔

میری رائے میں بھی سیماب صاحب کا اعتراض درست نہیں۔ شعر میں متانے کا ذکر ہے۔ مست و بے ہوش کو لیجانے کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود نہیں جاتا اس لئے (لیجاکے) برائے بیت نہیں برائے ضرورت ہے اس کے برعکس "دار پر سلانا" نواب صاحب کے نزدیک غلط ہے۔ لیکن سیماب صاحب یہ اعتراض نہیں فرماتے وہ بھی اگر درست نہ سمجھتے تو ضرور لکھ دیتے۔ میں بھی یہاں نواب صاحب کی رائے سے متفق نہیں۔ استعارہ اور اسلوب بیان میں بڑی گنجایش ہوتی ہے۔ زہر کھلا کر یا گلا گھونٹ کر مار ڈالنے کے لئے "سلا دینا" کہتے ہیں۔ شعر میں دار، بہکنا، اور متانہ، منصور کو یاد دلا رہے ہیں۔ بہکتے پھرنے والے مستانے کو کہیں لیجا کر سلا دینے کی تجویز بالکل درست ہے۔ فانی کہتے ہیں ترا متانہ بہکتا پھرتا ہے یہ اچھا نہیں اب اس کو لیجا کر دار پر سلا دے، مست و دیوانے کو سلانے کا مقصد پورا ہوگیا۔ اور بہکنے والے کو دار پر چڑھانے کا بھی۔

فانی نے دار پر چڑھانے کے لئے "دار پر سلانا" محاورہ اختراع نہیں کیا بلکہ شعر کے مضمون و الفاظ کے لحاظ سے اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے اور اس پر کسی اعتراض کا موقع نہیں۔

اب ایک اعتراض نواب صاحب اور سیماب صاحب دونوں کا مشترکہ یہ ہے کہ "دار" سے ساقی کا کیا تعلق ہے! اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ ظاہر ہے کہ اس شعر میں ساقی اور متانے سے میخانے کے لوگ مراد ہیں دونوں لفظ بطور استعارہ استعمال ہوئے ہیں۔ بہکنے سے متانہ کا خیال آیا اور متانے سے ساقی کا۔ جب ساقی نہیں کوئی اور ہے تو اس کو دار سے عملی تعلق ہو سکتا ہے اور اس کو دار پر سلانے کی زحمت دی جا سکتی ہے منصور کا تصور کیجیے اور ساقی سے مئے عشق مراد لیجئے۔

"جواب الجواب" اس طول طویل شرح کے باوجود دار پر سلانا" ایک تبسم خیز لطیفہ ہی رہا، اس "من گھڑت" کو "دار پر چڑھانا" یا "سولی دینا" کا ہم معنی یا ہم مفہوم قرار دینا بقول مرزا نوشہ غالب عقل کو گالی دینے کے مرادف ہے۔

عزیز یار جنگ

نمود زندگی :۔ حضرت سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں (۱۰۱) نظمیں (۱۷) غزلیں اور (۵۰) رباعیات ہیں۔ سید علی منظور صاحب حیدرآباد کے پختہ مشق مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدردان دور دور پھیلے ہوئے ہیں اردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپتی ہوں اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالے میں نقل کی جاتی ہیں۔ حضرت علی منظور عہد حاضر کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی صحیح ترجمانی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔ صفحات ۲۱۲۔ قیمت عہ

سب رس کتاب گھر سے طلب فرما سکتے ہیں۔

بسترِ مرگ پر

آج صبح میں اپنے کمرے میں کسی سوچ میں مغرق چہل قدمی کر رہا تھا۔ اتنے میں مکان پر ایک گاڑی آکر رکی اور اس میں سے میرے ایک دوست کا لڑکا تیزی سے اترا۔ میں نے اسے دیکھ کر ایک قسم کی روحانی خوشی محسوس کی۔ اس کا باپ بھی اسی عمر کا تھا جب ہم دونوں کی دوستی ہوئی تھی۔ وہ میرے پاس آیا اور میرے ہاتھ سے لپٹ کر رونے لگا۔ میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے ننھے؟ — کیا ہوا؟ —"

میری ماں —" اور زیادتیٔ رقت کی وجہ سے وہ آگے کچھ نہ بول سکا۔

میں جلدی سے کوٹ پہن کر اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا — بات یہ تھی کہ میرے دوست کی بیوی کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ اور اب اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ اس نے آنکھوں کی پتلیاں پھیر دی تھیں۔ پادری رسومات مقدس انجام دینے کے واسطے آ پہنچا تھا۔ بیوی کی موت سے میرے دوست کے پاگل ہو جانے کا اندیشہ تھا اسی لئے مجھے بلوایا گیا تھا کہ شاید میں اس کی تسلی و تشفی کر سکوں۔

اگر میں مستقل مزاجی سے اور اپنے دل پر جبر کر کے ان فرضوں کا خیال نہیں کرتا جن سے کہ دوستی کے بندھن میں بندھا ہوا تھا تو ممکن تھا کہ یہ دل شکن خبر مجھے بھی پریشان کر دیتی۔ کیونکہ میں دل کا بہت کمزور واقع ہوا ہوں۔ میں سوچتا رہا کہ کس طرح اپنے دوست کو تسلی دے سکوں گا۔ کیونکہ اس کا رونا اور پریشان حال ہونا بجا ہوگا۔ وہ ایک محبت والی سادہ مزاج اور منتظم عورت تھی۔ اس نے ہمیشہ اس کا ساتھ دیا تھا۔ اپنی مصیبتوں کی نہ کٹنے والی راتیں اس کے ساتھ ہنس ہنس کر کاٹی تھیں۔ اور تکالیف کے پہاڑ جیسے دنوں میں اس کی ہمت بڑھائی تھی۔

"کس طرح" میں نے سوچا "وہ اس کی موت دیکھ سکے گا جب کہ اس کی ذرا سی بھی ناسازیٔ طبیعت اس کا صبر و سکون چھین لیتی ہے!" ہم اب ویسٹ منسٹر میں کافی اندر آگئے تھے۔ اور میرے دوست کا مکان سامنے نظر آ رہا تھا۔ دروازہ پر مجھے فیدونیس ملا۔ اسے دیکھ کر میری کچھ ڈھارس بندھی۔ میں نے سوچا کہ جب یہ اندر ہو آیا ہے تو پھر میں بھی اس دردناک منظر کو دیکھ سکوں گا۔ میں کچھ عرصہ پہلے بھی اس سے یہاں گفتگو کر چکا تھا۔ اور اس کی باتیں بہت غور اور دلچسپی کے ساتھ سنی تھیں کیونکہ اس میں قوت بیانی کی تمام وہ خوبیاں موجود ہیں جو مذہب کے اصولوں کو حسین تر بنا کر پیش کرتی ہیں اور کبھی مذہبی مسئلہ کو بحث مباحثہ یا لڑائی جھگڑے تک نہیں پہنچاتیں۔ ہماری گفتگو اتفاق سے موت جیسے خوفناک موضوع تک پہنچ گئی۔ لیکن اس خشک اور ہیبتناک موضوع پر بہترین منطقی دلائل سے اس نے گفتگو کی جس سے کہ اس سے تجربہ کی وسعت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے موت کو اس طرح میرے سامنے پیش کیا کہ اس کا سب خوف اور ہیبت جاتا رہا۔ اور ایک سمجھدار کے لئے ایسی چیز ثابت ہوئی کہ جس کی آرزو کی جائے جس کے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے — جب میں اس سے دروازہ پر ملا تو اس کے مضبوط چہرہ پر رنج اور ہمدردی کی جھلک دکھائی دی۔ جو کہ مستقل مزاجی اور جوانمردی کی سرخی سے دست بگریباں تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی زود اثر گفتگو اور نصائح نے مرنے والی کا درد اور رونے والوں کا غم بہت کچھ ہلکا کر دیا تھا۔

میں سیدھا اس کمرے میں گیا جہاں وہ لیٹی ہوئی آخری سانسیں لے رہی تھی دروازہ پر اپنے دوست سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

وہ اب تک ضبط کیے ہوئے تھا لیکن مجھے دیکھ کر اس نے منہ پھیر
لیا۔ اور آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے ـــــ
ننھے ننھے بچوں کی قطار نے اپنی عمر اور سمجھ کے مطابق مختلف طریقوں
سے اپنے غم کا اظہار مجھے دیکھ کر کیا۔ سب سے بڑی لڑکی اپنی
ماں کی تیمارداری میں مشغول تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ اور گلابی
رخسار آنسوؤں سے تر ہو رہے تھے۔ دوسرے بچے گھٹنے ٹیکے
بستر سے لگے بیٹھے تھے۔ ایک ننھا منا سا بچہ ' ایک کونے میں
کھڑا ' صرف اس لئے منہ بسور بسور کر رو رہا تھا کہ اس کی بہنیں
بھی رو رہی تھیں ـــــ سارے کمرے میں خاموشی '
مطمئن اور سب خیالوں سے بےفکر اگر کوئی تھا تو وہ مرنے والی
کی پاک و معصوم ہستی تھی!

جب میں بستر کی طرف بڑھا تو اس نے مجھ سے بھرائی ہوئی
اور شکستہ آواز میں کہا

" تمھاری ہمدردی کا شکریہ! ـــــ اپنے دوست کا
خیال رکھنا ـــ انھیں اکیلا نہ چھوڑ دینا!"

اس سے قبل وہ اپنے خاوند اور بچوں سے الوداع
کہہ چکی تھی۔ اسی شان و جلال کے ساتھ جو اس جیسے کردار کی عورت
کے لئے موزوں تھا ـــــ شوہر ' اس ڈر سے کہ کہیں اس کی
بے چینی قریب المرگ ہستی کی آزادگی کا باعث نہ ہو جائے ' اپنے
غم کی دست درازیوں کو دبانے اور تسکین ظاہر کرنے کی بےسود
کوششوں میں مشغول تھا ـــــ اور بیوی! ایسے خطرناک
موقع پر بھی ' جب کہ اس کے ہاتھ پاؤں اینٹھے جا رہے تھے۔
جب کہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں نے حرکت بند کر دی تھی ' جبکہ
اس کی زبان اکڑ چکی تھی! ـــــ اپنی صحیح کیفیات تکالیف کو
چہرہ سے نہ ظاہر ہونے دے رہی تھی ـــ بلکہ اس کے چہرہ پر
تبسم اب بھی کھیل رہا تھا ـــــ یہ غمناک مناظر دیکھ کر میرا دل
لرز گیا ـــــ مریضہ نے کچھ عرصے کے لئے نظریں اپنے
شوہر کے چہرہ پر جما دیں ـــــ اور تھوڑی دیر بعد ہمیشہ
کے لئے ان کو بند کر لیا ـــــ اسی لمحہ میرا دوست ' جس نے
اب تک اپنے آپ پر قابو رکھنے کی بےانتہا کوشش کی تھی ' اور
اپنے منہ سے ایک آواز بھی نہ نکلنے دی تھی ' ایک خوفناک و دل خراش
چیخ کے ساتھ بیہوش ہو کر اس کے بستر پر گر پڑا۔ بچوں کی اس
وقت کی پریشانی ' گھبراہٹ اور سراسیمگی ایک سنگ دل شخص
کو بھی رلا سکتی تھی جنھوں نے یہ خیال کیا کہ ان کے ماں باپ
ایک ساتھ چل بسے اور دونوں ان کے سامنے مردہ پڑے
ہیں ـــــ لیکن جلد ہی ان کے باپ نے حرکت کی اور میں
سہارا دے کر اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ یہ ارادہ کر کے کہ جب تک
کہ اس کا غم ہلکا نہ ہو جائے اسے نہ چھوڑوں۔ میں سمجھتا تھا کہ ہمدردی
کا اظہار ' یا تسکین پہونچانے کی کوشش اس وقت بیکار تھی۔ بلکہ ہو سکتا
تھا کہ غم میں کچھ اور اضافہ کا باعث ہو جاتی۔ اس لئے میں اس کے
پاس بیٹھ کر خاموشی کی زبان سے اس کا غم ہٹانے لگا ـــــ یہاں
میرا طرز عمل قدیم زمانہ کے مشہور فلسفی سنیکا کے مثل تھا۔ اس نے
ایک خط میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا تھا۔

" میں اپنے دوست کو جب تک نصیحت نہ کروں گا جب
کہ وہ خود اس کے حاصل کرنے کے لائق نہ ہو سکے گا۔ اور وہ چیزیں
جو اس کو اس قابل بنائیں گی ' تین ہیں۔ ضرورت ' شکست ' طوالت وقت '
اور غم سے تھکاوٹ " ۔

آخر میں ' میں بہت افسوس کے ساتھ اس شخص کی غمگین
کیفیت بیان کرے بغیر نہیں رہ سکتا جس سے کہ ایک ایسی عزیز
ترین چیز چھین لی گئی ہو جس کی کمی وہ زندگی کے ہر شعبے میں محسوس

کرے۔ اس کی حالت بالکل اس شخص جیسی ہو جاتی ہے جس نے ابھی ابھی اپنا دایاں ہاتھ ضایع کر دیا ہو۔ اور ہر لمحہ اسے کام کرنے کے واسطے اٹھاتا ہو۔ اور پھر رنجیدہ و افسردہ ہو کر خاموش ہو جاتا ہو۔ وہ اپنے آپ میں بہت فرق محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے گویا وہ گھر میں اب پہلے جیسا شخص نہیں رہا ہے۔ اس کے لئے ان تمام آسائشوں اور خوشیوں کی لذت جاتی رہتی ہے جو پہلے اس کے ساتھ پرکیف اور مسرت بخش تھیں۔ کیفیات رنج و غم میں اضافہ کرتے ہوئے حد سے زیادہ پسندیدہ چیزیں اس ہستی کی یاد دلاتی ہیں جس کے ساتھ وہ ان سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا ـــــ

ملٹن نے بہت حیرت انگیز طریقہ سے ان مسرت انگیز لمحوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جن سے کہ ایک ہستی اپنے محبوب کے ساتھ ہونے پر لطف اندوز ہوتی ہے ـــــ حوا اگرچہ جنت عدن میں موجود ہے۔ لیکن اسے اپنے چاروں طرف کے حسین مناظر اور دل کش و خوبصورت چیزیں ایسی ہی پرکیف معلوم ہوتی ہیں جیسی کہ وہ آدم کی موجودگی میں پرکیف اور پرمسرت نظر آتی تھیں ـــ ملٹن ان ہی جذبات کی اپنے جادو نگار قلم سے ان اشعار میں بہت عمدہ طریقہ سے ترجمانی کرتا ہے۔

"تیرے ساتھ زندگی گزارتے وقت میں بھول جاتی ہوں تمام وقت تمام موسم اور ان کی تبدیلیاں!
سب ایک قسم کی مسرت خیز کیفیات پیدا کرتے ہیں!
باد شمیم کتنی ٹھنڈی اور فرحت بخش ہے!
اس کی روز افزوں شیرینی؛
صبح سویرے کی چہچہاتی چڑیوں کے ساتھ کتنی جادو بھری ہے!
شاہ خاور کتنا حسین اور منوّر نظر آتا ہے!
جب اولاً وہ اس سر زمین مسرت میں، اپنی منور کرنیں،
درختوں، جھاڑیوں، پھلوں اور پھولوں پر ڈالتا ہے!
جن پر کہ شبنم جھلمل جھلمل کرتی ہے!
ہلکی بوچھاڑ کے بعد زرخیز زمین کی بھینی بھینی خوشبوئیں!
خوشیوں سے پُر شام کی آہستہ آہستہ آمد!
خاموش اور پرسکون رات!
نغمہ سنج بلبل اور حسین چاند!
اور یہ فلک کے گوہر درخشاں!
رات کے منور، نور برسانے والے ساتھی!
کتنے حسین اور پُرکیف ہیں!
لیکن تیرے بغیر ـــــ میرے محبوب!
سب بے کیف اور بے حلاوت!
یہ باد شمیم جو چہچہاتی چڑیوں کی آواز علی الصباح لاتی ہے!
زرخیز زمین پر چمکتا ہوا شاہ خاور!
یہ جھاڑیاں، پھل اور پھول جن پر شبنم چمک رہی ہوتی ہے!
اور یہ بوچھاڑ کے بعد کی بھینی بھینی خوشبوئیں!
اور یہ شام کی آہستہ آہستہ آمد!
یہ خاموش اور پرسکون رات!
نغمہ سنج بلبل اور حسین چاندنی میں تنہا چہل قدمیاں!
اور جھلملاتے تاروں کی روشنی ـــــ
سب بے کیف ہیں تیرے بغیر ـــــ میرے محبوب!!"

شہاب سلمانی

ایک نظریہ

زندگی کے اکثر حزنیے اس لئے واقع نہیں ہوتے کہ مرد اور عورتیں گنہگار ہوتے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ محض انسان ہوتے ہیں۔ بعض لوگ جو خود کو "نیک" سمجھنا پسند کرتے ہیں، شاید یہ یقین رکھتے ہیں کہ کوئی شخص یہ لقب حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ ہر وقت "نیک" نہ رہے۔ مگر ہر وقت اور ہمیشہ "نیک" رہنا کچھ انسانی فطرت کے مغایر معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیفیت کم از کم معمولی انسان کی دست رس سے تو باہر معلوم ہوتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ کچھ یہ درکار بھی نہیں معلوم ہوتی کیونکہ الحمد للہ کہ لوگوں کی اکثریت انسان ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص $\frac{9}{10}$ اوقات میں بھی نیک رہتا ہے تو اس کو ایک "ولیانہ اوسط" قرار دیا جا سکتا ہے اور ایسے شخص کی اتفاقی فوری اور ناقابلِ تشریح لغزشوں پر کسی کو زیادہ متاسف ہونے کی ضرورت بھی نہیں بشرطیکہ وہ اتفاقی اور عارضی ہوں۔ کیونکہ آپ دیکھیں گے کہ ایسی کیفیات کے بعد پھر انسان ان بلندیوں تک پہنچتا ہے جو شاید پہلے اس کے لئے ممکن نہ ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ ایسی اتفاقی لغزشیں بہت سے سبق سکھاتی ہیں۔ کم از کم ان سے کسرِ نفسی انسان میں پیدا ہوتی ہے جو بزرگ ترین نیکیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ پھر ان سے دوسرے اشخاص کی اتفاقی لغزشوں اور غلطیوں کو عفو کرنے کا مادہ بھی انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ آپ کو یہ سکھاتی ہیں کہ آپ بھی انسان ہیں اور ہر شخص کو ضرورت ہے کہ وہ اپنی اس مشترک انسانیت کو سمجھے تاکہ وہ دوسرے انسانوں کی آزمائشوں اور لغزشوں کو سمجھ سکے اور ان کی تمناؤں کا بھی اندازہ کر سکے۔ اور آپ انسانیت کی خدمت اس وقت تک انجام نہیں دے سکتے جب تک یہ محسوس نہ کر لیں کہ "بدقسمتی سے" آپ بھی انہیں میں سے ایک ہیں۔ مگر بہت سے سادہ لوح نیک لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کو ہر وقت اور ہمیشہ نیک ہونا چاہئے ورنہ پھر وہ کسی وقت بھی نیک نہیں رہ سکتا۔ اس قسم کے لوگ مردوں اور عورتوں کو ان کی اس $\frac{9}{10}$ نیکی اور شریفانہ زندگی سے نہیں جانچتے بلکہ اس $\frac{1}{10}$ حصے سے جانچتے ہیں جو ان کو بدقسمتی سے معمولی مٹی سے بنا ہوا ظاہر کرتی ہیں۔

چنانچہ ان کیفیات کو دیکھ کر میرے ایک دوست نے ایک نظریہ قائم کیا ہے جس کو وہ سائنسی بنیادوں پر ثابت تو نہیں کر سکتے مگر اس کی تصدیق ان کی معلوماتِ زندگی اور خود ان کا تجربہ کرتا ہے۔ وہ نظریہ یہ ہے کہ دماغ کا ہر وہ حصہ جو بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے رفتہ رفتہ ارادہ کی اطاعت کو قبول کرنے سے گریز کرنے لگتا ہے اور اس لئے اس کو آرام دے دینا چاہئے ورنہ وہ پھر کاملاً بیکار ہو جائے گا۔ اسی طرح کوئی شخص نیکی کرتے کرتے بھی بہ آسانی ایسا ہی بیزار ہو جاتا ہے جیسے وہ بدی کرتے کرتے اس سے تنگ آ جاتا ہے اور انسان نیکیوں کی صحبت سے بھی ایسا ہی بیزار ہو سکتا ہے جیسا وہ بروں کی صحبت سے ہو جاتا ہے۔ اسی لئے جس چیز کو اوپر نیکیوں کی اتفاقی اور فوری لغزش سے (اور وہ عارضی ہوتی ہے) تعبیر کیا گیا ہے وہ گویا ان کی بشریت کا تقاضا ہے جو اُن کی اس تصوری نیکی پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے جو اس وقت عارضی طور پر مسلسل بار کی وجہ سے کمزور پڑ جاتی ہے۔ اگر کوئی مرد (یا عورت) ایسا کام کر بیٹھے جو اس کے اس اصول کے مغایر ہو جو آپ جانتے ہیں کہ اس کی زندگی پر حاوی ہے تو آپ کو اس کی فطرتی وجہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوتی چاہئے اور اگر آپ خود ایک بشر ہیں تو آپ کو اس کی اندرونی روحانی کشمکش کا بھی اندازہ ہونا چاہئے جو اس کی لغزش سے پہلے واقع ہوئی ہو گی۔ پھر اگر آپ کے مذہب نے عفو اور ندامت کا کوئی فلسفہ بیان کیا ہے اور آپ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ فوراً ایسے شخص کو معاف کر دیں گے۔ اور آپ بالکل حق بہ جانب ہوں گے۔ کیونکہ

مرد اور عورتیں جن سے ارادتاً نہیں بلکہ اتفاقاً اور کوشش کے باوجود خطا سرزد ہو جاتی ہے عموماً نیکی کی راہ پر اُن اشخاص سے زیادہ آگے بڑھ جاتے ہیں جو "زاہد شدہ از بندگی خود متکبر" والی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں اور یہ محسوس نہیں کرسکتے کہ جس چیز کو وہ اپنے زہد کا مستحکم حصار سمجھتے ہیں شاید وہ روحانی بے حسی کا ایک درجہ ہے ۔ انسان کی روح کی حقیقی خوبی اس کی توبہ استغفار کی حالت میں اس سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے جتنی کہ وہ اوقات تشفیٔ ذاتی میں ہوتی ہے ۔ اور بالآخر انسانوں کا محاسبہ ان کے اتفاقی اعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ اس غالب تصور یا عقیدہ ہی کی بنا پر ہونا چاہئے جو ان کی زندگی میں کارفرما رہا ہو ۔

کیا ہم اس غالب تصور کو متاثر اور وسیع کرسکتے ہیں؟ ہاں ایسا کیا جاسکتا ہے ۔ اس لئے کہ ہمارے خیالات ہی ہر چیز سے زیادہ ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ ماحول، دوسرے اشخاص کی صحبت اور بہت سی دوسری چیزیں ہمارے خیالات کو متاثر کرتی ہیں ۔ لیکن پھر بھی ہمارے اندر کوئی چیز ہے جو گویا خاموشی سے نگرانی کرتی اور فیصلہ کرتی ہے ۔ بعض کا خیال ہے کہ ماحول ہی سب کچھ ہے اور وراثت زیادہ تر ایک بہانہ اور ڈھکوسلہ ہے شاذ ہی اس کو ایک معقول وجہ کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے ۔ آپ نے ایسی فطرتوں پر جن سے لوگ مایوس ہوچکے تھے ماحول کا اچھا اثر دیکھا ہوگا ۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ماحول قلب ماہیت کردیتا ہے لیکن یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب وہ موجود رہتا ہے کم از کم اس وقت تک انسان اس بات کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ خود کو اس ماحول کا سزاوار بنائے اور اس کو اس کی عادت سی ہونے لگتی ہے ۔ اگر وہ ہر مرتبہ کامیاب نہ ہو تو تعجب نہ ہونا چاہئے لیکن یہ امر کہ وہ برابر کامیابی کی کوشش کرتا رہا، صاف ظاہر ہو جائے گا اور جہاں خواہش قوی ہوتی ہے وہیں سے زندگی کا غالب تصور پیدا ہوتا ہے ۔

غالباً گزشتہ پچاس سال کا سب سے زیادہ موثر واقعہ یہ ہے کہ دنیا کا سماجی ضمیر کروٹیں بدلتا رہا ہے اور بدل رہا ہے ۔ گو ابھی بہت کچھ باقی ہے ۔ کیونکہ ابھی ضمیر پوری طرح بیدار ہو کر آنکھیں مل نہیں چکا ہے ۔ لیکن وہ بیدار ہو جائے گا ۔ ابھی انسانوں کی مفلسی اور خستہ حالی باقی ہے ۔ ابھی امتیازاتِ رنگ و نسل باقی ہیں ۔ غریب بچے ابھی کس مپرسی کی حالت میں پڑے رہتے ہیں بجز اس کے کہ کوئی جنگ آکر انھیں باضابطہ لباس میں نمودار کردیتی ہے اور وہ ان لوگوں کی زبان سے تحسین کے الفاظ بھی سننے لگتے ہیں جن کی "دنیا" بچانے پر وہ مامور ہوتے ہیں تعلیم بھی ابھی غالباً ایک کھلی نقالی سے زیادہ آگے نہیں بڑھی ہے اور یہ حقیقت کہ "خدا کی نظر میں سب انسان مساوی ہیں" ابھی تختی کے ایک ایسے رخ پر لکھی ہوئی ہے جس کو پلٹ کر دیوار کی طرف کردیا گیا ہے ۔

لطیف احمد فاروقی

تعلیم کا مسئلہ :۔

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کی ایک جدید کتاب "تعلیم کا مسئلہ" شائع ہوئی ہے جس میں حسب ذیل عنوانات پر مفید اور ضروری معلومات درج ہیں :۔

(۱) تعلیم و تربیت کا مقصد (۲) تعلیم کی مدت (۳) موجودہ نظام تعلیم کے نتائج (۴) اعلیٰ تعلیم کا صحیح نصب العین (۵) علم کی وحدت (۶) انسانی وحدت کی تعلیم (۷) ایمان اور علم (۸) ابتدائی اور ثانوی تعلیم (۹) اعلیٰ تعلیم (۱۰) تعلیمی منزلیں اور نصاب (۱۱) جامعہ کے شعبہ جات (۱۲) طالب علم اور عملی سیاسیات ۔ قیمت عہ (ملنے کا پتہ) سب رس کتاب گھر ۔ خیرت آباد ۔ حیدرآباد دکن ۔

ایک دوست کی خودکشی پر

وقت کی زلف کے خم کون گنے، کون گنے
پیچ در پیچ ہے یہ سلسلۂ لیل و نہار

زلزلہ، قحط، وبا، معرکۂ جنگ و جدل
معجزہ ہائے مشیت کا ہے دشوار شمار

کون تاریخ میں بکھری ہوئی لاشیں ڈھونڈے
کہ تعفّن سے ہے لبریز یہ ایوانِ قدیم

آدم اخلاق کے غاروں سے اٹھا پر نہ اٹھا
سعیٔ ناکام کا افسانہ ہے یہ فنِ سلیم

ٹوٹے پھوٹے ہوئے اصنام کے بھونڈے انبار
آنکھیں پتھرائی ہوئی، مردنیاں چھائی ہوئی

مردہ تہذیب کے بوسیدہ عجائب گھر میں
وقت کی آہنی زنجیر ہے بل کھائی ہوئی

تیرہ و تار ہے ماضی کا شبستانِ جمال
جس کو یادوں کی چڑیلوں نے بسا رکھا ہے

کئی اسرار کے انبار، کہ جن کا افشا
علمِ یزداں نے قیامت پہ اٹھا رکھا ہے

وقت کے چرخ پہ صدیوں کی گھٹا چھائی ہے
لیکن اس محشرِ خاموش میں اک پیکرِ نور

گو گرفتار ہے اک حلقۂ ظلمت میں، مگر
میری مایوس نگاہی کا سہارا ہے ضرور

زہر نے جس کی محبت کو بقا بخشی تھی
جس نے تقدیر کے جبڑے سے لہو برسایا

آخری وقت مجھے جس نے کہا تھا، "اے دوست
تیرے دم سے مجھے اب نکتۂ فدا یاد آیا"

احمد ندیم قاسمی

گُل بوٹے

ملک کی انوکھی انجمن کی انوکھی کارروائیاں دیکھنے کا شوق ہمیں مکرر "انجمن انسدادِ بے رحمی بر نسواں" کے دفتر میں کشاں کشاں لے گیا، من کی جنرل سکریٹری کام میں بہت مصروف تھیں مگر جب ہم نے اپنا کارڈ بھیجا موصوفہ نے فوراً ہمیں اپنے آفس میں طلب کرلیا، انجمن کے کاروبار کی نسبت استفسار کرنے پر گزشتہ مہینے کی نوچندی جمعرات کو انجمن کا جو جلسہ عام ہوا تھا اس کی روئداد ہمارے سامنے رکھ دی۔ روئداد کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ اس قدر قلیل مدت میں اس انجمن نے ملک کے طول و عرض میں کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی ہے کوئی ڈھائی ہزار خواتین انجمن کی رکن بن چکی ہیں اور بے شمار مردوں کی درخواستیں وصول ہوگئی ہیں کہ

(۱) مردوں کو بھی اس انجمن کا رکن بننے کی اجازت دی جائے

(۲) شوہروں کی طرح بیویوں کے لئے بھی "احکام عشرہ" نافذ کئے جائیں۔

(۳) شوہروں کو بھی اپنی بیویوں کے خلاف انجمن کی عدالت ثالثی میں شکایات پیش کرنے کا حق عطا کیا جائے۔

(۴) انجمن کے نام میں خصوصیت سے تبدیلی کرکے "انجمن انسداد بے رحمی بر زنان و مرداں" انجمن کا نام قرار دیا جائے

مردوں کے ان مطالبات پر جلسۂ عام میں کامل غور کرنے کے بعد طے پایا کہ یہ مطالبات ایک حد تک جائز ہیں اس مسئلہ پر مجلس عاملہ میں غور کیا جائے۔ اجلاس عاملہ نے تو مشورہ کے بعد "احکام عشرہ" کا مسودہ آئندہ جلسۂ عام میں پیش کرنے کے لئے مجلس عاملہ نے اس اثنا میں "احکام عشرہ" کا مسودہ تیار کرلیا ہے۔ انجمن کے جلسۂ عام میں پیش کرنے سے پہلے مجلس عاملہ مناسب سمجھتی ہے کہ اس مسودہ کو ملک کے مشہور روزنامہ، دو روزہ، سہ روزہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ اخباروں اور ماہنامہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ رسالوں میں شائع کرایا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ مردوں اور عورتوں کی آراء اس مسودہ کی نسبت حاصل کی جاسکیں، آئندہ مہینے کی نوچندی جمعرات سے پہلے اس مسودہ کی نسبت اگر کسی کو کچھ اعتراض ہو تو انجمن کی جنرل سکریٹری کو مطلع کیا جائے۔ "احکام عشرہ" کا مسودہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

(۱) تونے اپنے والدین کے گھر کو خیرباد کہہ دیا ہے اور اب تو ایک ایسی ذات کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے جس سے بیاہ سے پہلے تجھ کو کوئی واسطہ نہ تھا، اب یہ سمجھ لے کہ تیرے والدین مرچکے ہیں، تیرے گھر سے اب تجھ کو کوئی واسطہ نہ رہا، اب تیری زندگی صرف ایک ہی شخص سے وابستہ ہے، اسے اپنی زندگی کا کل سمجھ لے اور خود اس کی زندگی کا جزو بن جا، اس کو یاد رکھ اور سب کو بھول جا، اس کی خدمت تیری عاقبت کا سودا ہے، یہ سودا اگر کچھ مہنگا بھی پڑے تو سستا ہے۔

(۲) تیرے شوہر کے کچھ عزیز و اقارب بھی ہیں اور کچھ دوست احباب بھی، یہ تیری زندگی کو خوش گوار بھی بنا سکتے ہیں اور ناخوش گوار بھی، اس لئے ان سب کو ہمیشہ خوش رکھ، وہ تجھ سے کبھی رنجیدہ نہ ہونے پائیں ورنہ تیرے آرام و چین کو وہ برباد کردیں گے۔

(۳) تجھ کو یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا میں انسان کی ہر امید بر نہیں آتی، اگر تیرا شوہر تیری توقعات کے مطابق نہیں ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں، دنیا میں یہ ہوتا آیا ہے، مثل مشہور ہے "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"، اگر تو دنیا میں سکھ چین سے رہنا چاہتی ہے تو اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے معیار کو گھٹا دے اور تیری جتنی بھی آرزوئیں پوری ہوں ان کے لئے شکر کر۔ تیرا شوہر اگر تیرے معیار کے مطابق نہیں ہے تو کیا، ہزاروں دوسرے شوہروں سے تو بہتر ہے۔ معیار کی مثال ربڑ جیسی ہے جسے اپنی مرضی کے موافق گھٹایا اور بڑھایا جا سکتا ہے

(۴) شوہر کی محبت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی، بیاہ کے وقت کچھ ہوتی ہے،

درمیان میں کچھ اور آخر عمر میں کچھ۔ بیاہ کے ابتدائی زمانے میں تیرے شوہر نے تجھ سے جو حد سے سوا محبت کی تھی اسے ایک جذباتی چیز سمجھ، بیاہ کا ابتدائی زمانہ گزرنے کے بعد اس محبت کو کبھی یاد نہ کر، بالکل بھول جا۔ اگر تو اس محبت کو یاد رکھے گی تو تیری زندگی بے لطف ہو جائے گی۔ درمیانی زندگی میں اگر تیرا شوہر تجھ سے کچھ کھنچا رہتا ہے تو پروا نہ کر انجان بن جا اور آخر عمر میں اگر وہ چڑچڑا ہو جائے تو اس کی ہر طرح مزاج داری اور نازبرداری کر کیونکہ عمر اور فطرت کا تقاضا یہی ہے۔

(۵) یہ سچ ہے کہ تو اپنے شوہر کی شریک حیات ہے، اس کی ہر چیز تیری ہے اور تجھے یہ حق حاصل ہے کہ اس کی آمدنی کا حساب دیکھے مگر تو ایسا نہ کرے تو بہتر ہے۔ سب سے زیادہ بہتر اور عقلمندی کی بات یہ ہے کہ جو کچھ وہ تجھ کو دے بس اسی کو اپنا سمجھ اور صبر و شکر سے کام لے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شوہر اپنا سب کچھ بیوی کی نذر کر دے۔

(۶) اگر تیرا شوہر بچوں سے زیادہ محبت نہیں کرتا ہے تو کچھ فکر نہ کر اور نہ اس کے اس فعل پر کبھی نکتہ چینی کر، ہزاروں شوہر ایسے ہیں کہ وہ بچوں سے کوئی انس نہیں رکھتے مگر ان کی زندگی میں ایک زمانہ ایسا بھی آتا ہے کہ ان میں بچوں کی اہمیت اور محبت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ تیرا فرض ہے کہ بچوں کے دل میں اپنے حسن عمل اور برتاؤ سے باپ کی عظمت اور وقار پیدا کرے۔ اگر تو ایسا نہ کرے گی تو خود تیری زندگی ایک دن برباد ہو جائے گی کیونکہ جو بچے باپ کا احترام نہیں کرتے وہ ماں کی عزت و حرمت کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ بچوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار کر کے ان کی زندگی کو تباہ نہ کر۔ بچے قوم کا سرمایہ ہیں اس لئے ان کو ملک اور قوم کے لئے کارآمد بنا نہ خود فضول خرچی کر نہ ان کو مسرف بنا فضول خرچ عورت شیطان کی بہن کہلاتی ہے۔

(۷) کبھی تو اپنے شوہر سے بدگمان نہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ جہاں محبت ہوتی ہے وہیں بدگمانیاں بھی پیدا ہوتی ہیں، مثل مشہور ہے "عشق است و ہزار بدگمانی"۔ اگر تو بدگمان ہو کر اس سے لڑتی جھگڑتی رہے گی اور طعنے دے گی تو تیرے اور اس کے درمیان ایک خلیج حائل ہو جائے گی جس پر سے گزر کر اس کو منانے اور اپنا کرنے کے لئے تجھ کو بڑی دشواری ہوگی، یاد رکھ جب تک تو اپنے شوہر پر بھروسہ نہ کرے گی تیری زندگی کبھی خوش گوار نہ ہوگی۔ کیوں اپنی زندگی کو خواہ مخواہ بے کیف بناتی ہے؟ اور کیوں اپنے شوہر کو ہاتھوں سے گنواتی ہے؟

(۸) شوہر کی محبت کو دولت کی ترازو میں نہ تول، ہزاروں لائق شوہر مفلس ہیں، دولت انسان کی قابلیت کا معیار نہیں ہو سکتی، دولت سے زیادہ ذاتی جوہروں کو پرکھ، یہ خوبیاں فنا نہیں ہوتیں دولت آج تیرے پاس ہے کل کسی اور کی ہو رہتی ہے، کیا تو بھی آج کسی کی اور کل کسی اور کی ہونا چاہتی ہے؟ اگر تو فضول خرچی نہ کرے، اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کو سادہ بنائے اپنی آمد و خرچ کے توازن کو گرنے نہ دے اور اپنے سے زیادہ آمدنی والی بیویوں کی نقل کرنے کی کوشش نہ کرے تو تیری زندگی نہایت خوش گوار اور پرسکون ہو سکتی ہے۔ جو بیویاں دولت کے لئے شوہروں سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں وہ انہیں مجبور کرتی ہیں کہ بے ایمانیاں سیکھیں اور ضمیر فروشی کریں یا دوسرے معنوں میں شیطان کے غلام بن جائیں، اس قسم کی بیویاں آج کل بہ کثرت پائی جاتی ہیں، مگر وہ "بیویاں" نہیں ہیں خوبصورت زہریلی ناگنیں ہیں۔

(۹) مذہبی اور دنیوی معاملوں میں تجھ میں اور تیرے شوہر میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر معاملے میں شوہر تیرا ہم خیال ہو، کبھی اس قسم کے اختلاف پر بحث نہ کر، اگر تیرا شوہر کبھی کسی مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے تو تیری عقلمندی اسی میں ہے کہ جتنی

ناخوش گواری کے ٹال جائے۔ چھوٹی باتیں بعض دفعہ بڑی کدورتوں کا سبب ہوتی ہیں۔

(۱۰) تجھ میں اتنی عقل اور سمجھ کی ضرورت ہے کہ تو اپنے شوہر کے جذبات کو سمجھ سکے، جو کچھ تیرے شوہر کے دل میں ہے تو اس کو اس کے چہرے سے پڑھ لے، اگر تو نے اپنے شوہر کے جذبات اور احساسات کو سمجھ لیا ہے تو ہمیشہ کے لئے شوہر تیرا ہوگا اور تو اس کی۔ کبھی شوہر کے دل کو نہ دکھا اور نہ اس کے احساسات کا خون کر۔ یاد رکھ زبان کے زخم تیر و نشتر کے زخموں سے زیادہ دل کو گھائل کرتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے!

"زباں کے زخم دل میں اک ذرا ابھرتے ہیں مشکل سے"

"باغبان"

رات کا بھولا اور دیگر افسانے ۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ۔ ایل ایل صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ، کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابل مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائیٹل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۶۸، قیمت عہ۔

حمیدہ مشرف کے نام

مری حسین مشرف وہ چاندنی راتیں — نظر میں کروٹیں لیتی تھیں جب جواں باتیں

وہ ایک رات وہ بہکی ہوئی سرور فروش — فلک پہ چاند ستاروں کی شمعیں طور بدوش

وہ مست مست نظارے وہ نیلگوں دریا — جوانیوں میں اشارے وہ نیلگوں دریا

ہزار حشر اٹھاتا ہوا شباب ترا — مچلنا، ناچنا، گاتا ہوا شباب ترا

مرے شباب سے کچھ اس طرح قریب ہوا — کہ جاگتے ہیں مجھے اونگھنا نصیب ہوا

کلی کلی نے تبسم کیا فضا جاگی — شگفتہ ساز سنبھالے ہوئے ہوا بھاگی

نشیلی لہروں نے بربط کے تار چھیڑ دیئے — زمیں پہ بوندوں نے میٹھے ملار چھیڑ دیئے

نشے میں چور ہواؤں نے گیت برسائے — نہائے پانی میں کرنوں کے سیمگوں سائے

لرزتے ہونٹوں سے میں نے تمہارا نام لیا! — قدم بڑھا کے تمہیں بازوؤں میں تھام لیا

دھڑک رہی تھی جوانی مچل رہا تھا شباب — مثالِ چشمۂ صحرا ابل رہا تھا شباب

تمہارا سر مرے زانو کو گدگداتا تھا! — تو آسماں مرے قدموں پہ سر جھکاتا تھا

وہ ہونٹوں ہونٹوں میں سرگوشیاں جو ہوتی تھیں — تصورات میں کچھ پھول سے پروتی تھیں

تمہارے گیسوؤں سے کھیلتا تھا ہاتھ مرا! — تو عطر بار ہوا دے رہی تھی ساتھ مرا

مگر نظر جو ملی تو چھلک پڑے آنسو! — یکایک آنکھوں سے اپنی ڈھلک پڑے آنسو

کسی خیال کی گہرائیوں میں ڈوب گئے — مآلِ عشق کی رسوائیوں میں ڈوب گئے

میں سوچتا تھا جدائی نہ تاکتی ہو ہمیں — خدا کے ساتھ خدائی نہ تاکتی ہو ہمیں

جوانیاں نہ کہیں سسکیوں میں بٹ جائیں — محبتوں کی حسیں ڈوریاں نہ کٹ جائیں

نہیں ملے ابھی جی بھر کے اور بچھڑ جائیں — کہیں سماج کے ہاتھوں نہ ہم اجڑ جائیں
مرے لئے کہیں تو بھی تباہ حال نہ ہو — ذرا سی عمر میں جینا تجھے وبال نہ ہو
وہ رات بیت گئی گزریں اور بھی راتیں — مگر وہ رات عطا کر گئی جو برساتیں
برستی رہتی ہیں آنکھیں مگر وہ رات کہاں — تمہارے ہونے سے جو بات تھی وہ بات کہاں
یہی خیال کہ بدنام تو نہ ہو جائے — مرے لئے کہیں بے آبرو نہ ہو جائے
تجھے وطن کی حسیں وادیوں سے لے آیا — شباب و شعر کی آبادیوں سے لے آیا
لہو کے گھونٹ شب و روز پی رہا ہوں میں — یہاں اداس فضاؤں میں جی رہا ہوں میں
ہے دور دور فضاؤں میں غم کا راج یہاں — نظر اٹھا نہیں سکتی مگر سماج یہاں
خزاں نصیب گلستاں میں آرہی ہے بہار — ہر ایک دل میں بغاوت کے اٹھ رہے ہیں شرار
شہنشہی کا گریباں ہے اور ہاتھ مرے — میں اب اکیلا نہیں اور بھی ہیں ساتھ مرے
مرے گروہ میں مزدور بھی کسان بھی ہیں — حوادثات سے کھیلے ہوئے جوان بھی ہیں
بھڑک رہی ہے مرے دل میں انتقام کی آگ — رگوں میں رینگتے پھرتے ہیں اضطراب کے ناگ
یہ کھانستی ہوئی رسمیں یہ ہانپتا قانون — یہ باغیوں کے ترانوں سے کانپتا قانون
یہ قید و بند یہ تقسیم کار کہنہ نظام! — ہے جس کے ہاتھ میں مدقوق زندگی کی زمام
اک انقلاب سے دو چار ہونے والا ہے — قضا کی گود میں سر رکھ کے سونے والا ہے

گرے ہوؤں کو اٹھا کر فلک مقام کیا
ہمارے عشق نے وہ لاجواب کام کیا

الطاف مشہدی

خسرو

موجودہ دور میں سینما نے کم از کم ہندوستان میں تھیٹر کو جس طرح نیچا دکھایا ہے اس سے اب کوئی بھی ناواقف نہیں۔ لیکن سالگنڈا ناٹک کمپنی کے ایک اداکار کی خود اپنی زبان سے اس تلخ حقیقت کے اعتراف پر مجھے حیرت سے زیادہ افسوس ہوا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ سینما کے ہاتھوں تھیٹر اور خصوصاً سالگنڈا کمپنی کی زبوں حالی اب خود فریبی کی حدوں سے بھی گزر چکی ہے۔ لیکن خستہ حالی کے باوجود اس کمپنی میں مجھے ایک ایسے اداکار کے کمالات دیکھنے کا فخر حاصل ہوا۔ جس کی ہمہ گیر قابلیت کا مجھے معترف ہونا پڑا۔ دراصل ساری سالگنڈا کمپنی ایک مرکز کی طرح اس عظیم المرتبت ہستی کے اطراف گھوم رہی تھی۔

موسم گرما کی غیر معمولی بارشوں کی وجہ سے یہ ایک بھیگی ہوئی رات تھی۔ کیمپ کے اطراف سیاسیات اور مذہبیات کے ہر عنوان پر بحث و مباحثہ اور کافی کے دور پر دور کے بعد اگرچہ نیند کا کوسوں تک پتہ نہ تھا تاہم آج شب سالگنڈا کمپنی کو ایک نظر دیکھنے کا پروگرام جو شام سے بن چکا تھا اس کو فسخ کرنے کی آرزو کو بمشکل روکا جا سکا۔

یہ اونڈہ کی جاترا تھی۔ اس جاترا میں ہر سال سفری سینما ایک سے زیادہ تعداد میں آتے تھے۔ لیکن اس سال کسی سینما کا نہ آنا اور اس کی بجائے سالگنڈا کمپنی کا اپنا راج رچانا سمجھ میں نہ آتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب باوجود ہیڈ ماسٹر صاحب کے اصرار کے ہمارے ساتھ تھیٹر نہ آئے۔ ان کا خیال تھا کہ دن میں کمپنی کے اداکاروں کا علاج معالجہ کرتے ہوئے ان کے دکھ درد کی داستان سنتے رہے ہیں اس لئے شب میں پھر ان ہی کی زبانی ان کے کارناموں کو سن کر کوئی ندرت محسوس نہ کریں گے۔ میں نے دیکھا اور جس کو مددگار صاحب نے بھی محسوس کیا کہ یہ کہتے ہوئے ایک معنی خیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔

چپراسی سامنے پٹرومکس لئے جا رہا تھا۔ ہم چار پانچ آدمی اس کی رہنمائی میں چل رہے تھے۔ یکایک نصف قنات اور نصف ٹاٹ کے پردوں کے ایک پست دو داخلوں والے احاطے کے پاس چپراسی رک گیا۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے یقین نہ آیا کہ یہی سالگنڈا کمپنی ہے۔ ہم درجہ اول کے دروازہ سے داخل ہوئے۔ اس وقت اسٹیج پر ایک اداکار ناچ رہی تھی۔ اب جب کہ میں لکھنے بیٹھ ہی گیا ہوں تو کہنا ہی پڑتا ہے ورنہ اس اداکار کے لباس کے میلے پن کے متعلق خاموشی بہتر ہوتی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ کسی مفلس اجڈ اور گنوار لڑکی کا پارٹ ادا کر رہی ہے لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ وزیر کی لڑکی کا پارٹ تھا

درجہ اول کا باب داخلہ اسٹیج کے سرے سے بالکل ملا ہوا تھا۔ اس دروازہ اور اسٹیج کے درمیان ایک شخص ترکی ٹوپی جس کا نچلا آدھا حصہ میل سے سیاہ ہو رہا تھا اس طرح دبا کر پہنے ہوئے تھا کہ ٹوپی قریب قریب آنکھوں تک سر پر منڈھ گئی تھی۔ یہ کمپنی کا مشہور اداکار خسرو تھا۔ اس وقت اسٹیج پر کوئی نقل ادا نہیں کی جا رہی تھی۔ پھر اسٹیج کے باہر خسرو کا اس طرح مسخروں کے لباس میں کھڑا رہنا ناقابل فہم تھا۔ ہم لوگ سامنے کی کرسیوں پر جو ہمارے لئے مخصوص کی گئی تھیں جا کر بیٹھ تو گئے۔ لیکن بیٹھتے بیٹھتے ہمارے جوتے نصف کے قریب کیچڑ سے خراب ہو چکے تھے۔ جو درجہ اول میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔

اصل واقعہ یہ تھا کہ نہ تو اسٹیج پر اور نہ ناظرین کے سروں پر شامیانہ یا کسی قسم کے سائبان کا کوئی انتظام تھا۔ گزشتہ شب کی بارش سے ہر طرف دلدل ہوگئی تھی۔ کرسیوں کی ناگوار نمائی کو ہم محسوس کرتے ہوئے بیٹھ گئے جب ہم آچکے تو خیرو باب الداخلہ پر ٹکٹ وصول کر رہا تھا۔ اس عرصے میں ایک اداکار نے جو نقل میں خیرو کی بیوی کا پارٹ ادا کر رہی تھی اسٹیج پر آکر پکارا "میاں او میاں اجی کیا مر گئے"۔ خیرو صاحب جو ٹکٹ اور آدمیوں کی گنتی میں مصروف تھے آدمیوں کو اشارہ سے گنتے ہوئے اسٹیج پر بھاگے اور نقل شروع ہوگئی۔

نقل ختم ہوتے ہی پردہ گرا اور خیرو نے پردے کے سامنے آکر ڈاکٹر اقبال کی یہ مشہور نظم سنائی۔

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں تو نے مجھے کیوں نہ لازوال کیا

نظم کے آخری شعر ؎

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

کے بعد خیرو نے کہا "معزز ناظرین سینما کے اس دور میں ناٹک کی بہار کا موسم چلا گیا۔ اب اس کی خزاں میں ہم جو ہدیۂ ناظرین کر سکتے ہیں کر رہے ہیں۔ ہماری بپتی اب ہم سے یہ بھی نہیں کہلواتی کہ آرٹ کی خدمت میں ہماری حوصلہ افزائی کی جائے بلکہ ہم فن کاروں کو فاقہ کشی کی موت سے بچایا جائے۔ اب تک ستی ساوتری کا کھیل چالو تھا۔ لیکن چونکہ آج کی محفل میں بعض صاحبان نظر تشریف فرما ہیں اس لئے ان کی ضیافت طبع کے لئے ہماری کمپنی کے مشہور و معروف ڈراما نورِ اسلام کا ایک سین ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا تاکہ آپ ہمارے آرٹ کی قدر اور خود کو محظوظ فرمالیں۔ آداب عرض ہے"۔

پردہ اٹھا اور نورِ اسلام کا پہلا سین شروع ہوا۔

اس ڈرامے میں سلطان صلاح الدین اور نیرو کی جنگ کے واقعات پیش کئے گئے تھے۔ خیرو سلطان صلاح الدین کا کردار ادا کر رہا تھا۔ لباس جو اس موقع پر استعمال کیا گیا اس میں دنگ رہ گیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ صلاح الدین کا رچوبی کلاہ پر مرغی کا پر لگا یا کرتا تھا۔ قبا اور کلاہ ہر دو نیلے مخمل پر کارچوبی کام کے تھے۔ گر مخمل اور کارچوب اپنی اصلیت اس قدر کھو چکے تھے کہ بمشکل انھیں اس نام سے پکارا جا سکتا تھا۔

تاہم شاید یہ ممکن ہوا ہو کہ نیرو سے جنگوں کے زمانے میں کسی بڑی فتح پر سلطان نے اس قسم کے لباس کے تعیش کی اجازت خود کو چند گھڑیوں کے لئے دے دی ہو لیکن ایک شے اب تک میری فہم و فراست کی حدوں سے بالاتر رہی ہے۔ وہ یہ کہ اس کلاہ اور قبا کے ساتھ ساتھ خیرو دھوتی زیب تن کئے ہوئے تھا۔

اسٹیج کے سامنے صرف ایک مرمت طلب پٹرومکس جل رہا تھا جس کی مدہم روشنی اسٹیج کے اندرونی گوشوں میں بمشکل پہونچ رہی تھی۔ روشنی کی اس کمی کو غالباً اسٹیج والوں نے بھی محسوس کیا اور خصوصاً خیرو کی دوررس نگاہ اس احساس سے قاصر نہ رہ سکی تھی۔ وہ اپنے کام کے درمیانی وقفہ میں اسٹیج سے باہر آیا اور چپراسی سے ایک تھوڑی سی اخلاقی غیر محسوس حصول اجازت کے بعد ہمارا روشن پٹرومکس اٹھا کر پہلے پٹرومکس کے برابر آویزاں کر دیا۔ اب اسٹیج بقعۂ نور ہوگیا۔

اس کے بعد کے سین میں صلاح الدین اور نیرو کا ایک

تیز و تند مکالمہ شروع ہوا۔ اس وقت مطلع کچھ ابر آلود ہو چلا تھا۔ اور ابھی کچھ گفتگو شروع ہوئی ہی تھی کہ یکایک ایک تیز آندھی چلنی شروع ہوئی۔ اسٹیج کے پردے جو کسی زمانہ میں اپنے نقش و نگار کی وجہ سے ضرور جاذبِ توجہ ہوں گے۔ اور اب جن پر ان نقوش کی جگہ میل کچیل لے چکا تھا، آندھی کے زور سے بُری طرح اڑنے لگے۔ یہاں تک کہ آخری پردہ بھی اس کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہا اور اس کے اڑنے سے پائیں۔ اسٹیج کے سین منظر عام پر آنے لگے۔ چنانچہ ایک اداکار کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ ایک دوسرا شخص اسٹیج کی طرف بے ڈھنگے پن سے پاؤں پھیلائے بے خبر سو رہا تھا۔ پہلے پہل تو سلطان صلاح الدین اور نیرو نے بڑے صبر و استقلال سے کام لیا لیکن آندھی کی رفتار اور پردوں کی بےطرح اڑان نے ان شیرانِ بیشۂ رزم کے پائے استقلال میں بھی لغزش پیدا کر دی اور اب پردوں کو تھامنے کے لئے ہر دو بُری طرح دوڑے۔ اس خلفشار کو پائیں اسٹیج کے اشخاص نے کمک پہونچا کر ایک ہڑبونگ کی شکل دے دی۔ صلاح الدین اور نیرو کو پردوں کے ساتھ ساتھ اپنی کلاہیں اور قبائیں بھی سنبھالنی پڑ رہی تھیں۔

خیر خدا خدا کر کے آندھی تھمی اور مکالمہ پھر شروع ہوا۔ صلاح الدین نیرو کے مظالم کی داستان نہایت موثر پیرایہ میں بیان کر رہا تھا۔ اس درمیان میں نیرو کوئی جملہ غصہ اور نفرت کا استعمال کرتا اور صلاح الدین کو اس کے جواب میں فرض کیجئے کہ ڈراما کے اصل متن میں "ارے ظالم نیرو" استعمال کرنا ہوتا تو خیر وہ اس کے ساتھ "ارے ظالم بدمعاش، کافر، کتے پاجی، شہدے نیرو" کہتا۔ نہ صرف ہر فقرے میں گالیوں کی بے تکلف اور بے تکان بوچھار تھی بلکہ اس قسم کے فقرے علی الحساب دوہرائے جا رہے تھے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی نامعلوم وجہ سے وقت گزاری کے لئے بھی ہو رہا تھا۔ مثلاً نیرو اس درمیان میں حلق سے ایک کریہہ نفرت کی آواز نکالتا اور کہتا "صلاح الدین تو جھوٹا ہے" یا "تو پاگل ہے" تو صلاح الدین پھر اسی طرح "ارے کمینہ، کم ظرف، نادان احمق نیرو" کی چاند ماری شروع کرتا اور چونکہ نیرو ناظرین میں کوئی نہایت ہر دلعزیز شخصیت نہ تھا، گالیوں کی بہتات سے فی الجملہ ڈراما پر کوئی بُرا اثر نہ پڑتا۔ بلکہ ناظرین اسی قدر زیادہ خوش ہو رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد آخرش اس وقت گزاری کی وجہ ظاہر ہوئی۔ اسٹیج پر دو اداکار عورتیں دوڑتی بالوں کو درست کرتی اس طرح داخل ہوئیں کہ گویا انھیں آنے میں کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ گفتگو میں اب انھوں نے بھی حصہ لیا۔ لیکن افسوس ہے کہ انھیں اپنا پارٹ اچھی طرح یاد نہ تھا اور بار بار رکتی تھیں۔ لیکن واہ رے نیرو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے پورا کا پورا ڈراما ازبر ہے۔ کیونکہ یہ انھیں آہستہ آہستہ وہیں ان کا حصہ یاد بھی دلاتا جاتا تھا اور پھر اپنی گفتگو کا حصہ بھی ادا کرتا تھا۔ لقمہ دینے والے کا کام بھی نیرو کو ہی انجام دینا پڑ رہا تھا۔

صلاح الدین کے طویل وقفۂ تقریر میں اسٹیج پر کھڑی ہوئی اداکار عورتیں آپس میں نہایت ہی خاموشی سے بات چیت اس طرح کر رہی تھیں کہ مجھے یقین ہے کہ یہ کچھ اپنے خانگی معاملات کا تذکرہ کر رہی ہوں گی۔ یا پھر ایک دوسرے کو بھولا ہوا سبق یاد دلا رہی ہوں گی۔

اب صلاح الدین کی آخری تقریر ختم کے قریب ہوئی اور اس وقت پردہ گرنا چاہیے تھا۔ لیکن غالباً پردہ گرانے

والا بھول گیا یا کسی ضروری کام پر چلا گیا، خیرو کو اپنی تقریر اور لاتبی کرنی پڑی۔ اس عرصے میں وہ پردہ گرانے کے لئے ہاتھ سے اشارے بھی کرتا جاتا تھا۔ غرض بڑی دقت کے بعد پردہ گرا اور کھیل ختم ہوا۔

خیرو آخر میں پردے کے سامنے آیا اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگا "معزز ناظرین ہماری کمپنی کا بہترین ڈراما نوراسلام ابھی ابھی آپ کے ملاحظہ میں پیش کیا گیا۔ امید ہے کہ پسند خاطر والا ہوا ہوگا۔ کل شب ہماری کمپنی کا مشہور و معروف ڈراما اندر سبھا نئے سین سنہری اور زرق برق لباس کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔ امید ہے کہ جس طرح آج کی تشریف آوری سے کمپنی کو مشکور فرمایا گیا ہے۔ کل بھی تکلیف فرما کر آرٹ کی دلجوئی اور کمپنی کو ممنون فرمایا جائے گا۔"

دوسرے دن صبح ہم سب تالاب کے کنارے بیٹھے خیرو کے ہرجہتی کمالات کا تذکرہ کررہے تھے کہ میں نے دیکھا چند اشخاص تماشا بجاتے ہوئے جاترا کے مجمع میں سے گزر رہے ہیں اور ان میں کا ایک شخص اشتہارات تقسیم کرتا جارہا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو یہ شخص خیرو تھا۔

محمد نجم الدین انصاری

علم اور عشق (کاچا اور دیویانی)

محض حصول علم روح کی تابندگی اور عرفان حقیقت کا ضامن نہیں ہے۔ علم کو جب سوز عشق کے پر لگتے ہیں تو وہ کامرانی کے آسمانوں تک پرواز کرتا ہے اور یہی انسانیت کی کامل فتح ہے۔ ٹیگور نے ذیل کے مکالمے میں علم وعشق کے اس لطیف تعلق کو واضح کیا ہے۔ (باری)

[نوجوان کاچا آسمانوں سے حیاتِ جاودانی کے راز ہائے سربستہ کا علم سیکھنے کی خاطر ایک رشی کے پاس آیا تھا جو منتروں کے سبق دیا کرتا تھا۔ رشی کی بیٹی دیویانی کاچا کے دامِ محبت کا شکار ہو چکی تھی] کاچا۔ دیویانی! وہ وقت آچکا ہے کہ اب میں تم سے رخصت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔ کافی مدت تک تمھارے والد کی شاگردی میں رہا مگر آج انھوں نے اپنے سلسلۂ تدریس کو مکمل کر دیا ہے۔ (شفقت آمیز لہجے میں) انہیں دیوتاؤں کی سرزمین کو لوٹ جانے کی اجازت دو جہاں سے میں آیا تھا۔

دیویانی ـــ تم نے جیسا کہ تمھاری خواہش تھی وہ نادر اور کمیاب علم حاصل کر لیا ہے جس کے حصول کی خواہش صرف دیوتاؤں ہی کا حصہ ہے۔ مگر ذرا سوچو کیا تمھیں اس کے علاوہ اور کسی چیز کی خواہش نہیں؟ کاچا ـــ نہیں۔

دیویانی ـــ مطلق نہیں! ذرا اپنے دل کی گہرائیوں کا جائزہ لو اور دیکھو کہ کوئی خوابیدہ خواہش تو پوشیدہ نہیں ہے ایسا نہ ہو کہ اس کا خون ہو جائے۔

کاچا ـــ میری کامرانی کا سورج پوری طرح طلوع ہو چکا ہے اور اب اس کی خیرہ کن روشنی سے تاروں کی آب تاب ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے۔ میں اب اس علم کا مالک ہوں جو زندگی بخشتا ہے۔

دیویانی ـــ تب تو تم اور صرف تم ہی کائنات کے واحد خوش بخت انسان ہو۔ افسوس! آج مجھے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ تمھیں اس پردیس میں نہ معلوم کیا کیا تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ گو کہ ہم نے مہماں نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی

کاچا ـــ اس قدر انکسار سے کام نہ لو! متبسم ہو کر مجھے خدا حافظ کہو۔

دیویانی ـــ تبسم! لیکن میرے دوست یہ دنیا تمھاری جنت نہیں ہے۔ یہاں تبسم اتنے سستے داموں نہیں بکتا۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں پیاس پھول کے کیڑے کی طرح دل کو چوس چوس کر خالی کر دیتی ہے۔ اور جہاں شکستہ تمناؤں کے بھوت امیدوں کے محلات کا طواف کرتے رہتے ہیں اور نادان یاد کبھی ان سرد آہوں کو نہیں بھلا سکی۔ جو اس کے سینے سے زوال پذیر مسرت کے لئے نکلا کرتی ہے۔

کاچا ـــ دیویانی! بتاؤ آخر میں نے تمھیں کیا تکلیف دی ہے۔

دیویانی ـــ کیا اس جنگل کو چھوڑ، دنیا تمھارے لیے اتنا آسان ہے جس کے سائے اور نغموں میں تم نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔ کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ ان جھلملاتے ہوئے سایوں میں ہوا کس طرح آہیں بھرتی ہوئی گزر رہی ہے۔ اور سوکھے پتے برباد امیدوں کی روحوں کی طرح ہوا میں محوِ گردش ہیں۔ جب کہ صرف تم ہم سب سے الگ تھلگ کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

کاچا ــــ یہ جنگل میرے لئے ایک دوسری ماں سے
کسی طرح کم نہیں۔ کیونکہ ان ہی کے سائے میں میں نے ایک نئی
اور دوسری زندگی پائی ہے۔ اس سے میری محبت میں کمی قطعی
ناممکن ہے۔ دیوایانی جب تم جانوروں کو چرانے لیجاتیں تو
سامنے والا کیلے کا درخت اپنی مہمان نوازی یا ہیں اس لئے پھیلا
دیتا کہ تم اُس کے سائے میں اپنے دھوپ کھائے ہوئے تھکے ماندے
جسم کو آرام دے سکو۔

کاچا ــــ
اے جنگل کی دیوی! میں تیرے آگے اپنا سر خم کرتا
ہوں۔ جب تیرے سائے میں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ
میں اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ میں دوسرے طالب علم اپنے
سبق یاد کرتے ہوں گے تو مجھے بھی یاد کر لینا۔

دیوایانی ــــ اور ہماری وتیومتی کو نہ بھولو
جس کا تیز پانی محبت کے گیتوں کا دھارا ہے۔

کاچا ــــ اس کی یاد ہمیشہ میرے دل میں باقی
رہے گی۔ میری مسافرت کی تنہا ساتھی جو ایک دیہاتی دوشیزہ
کی طرح ہمیشہ متبسم رہتی ہے اور سادہ گیت گنگناتی جاتی
ہے۔

دیوایانی ــــ لیکن دوست میں تمھاری
توجہ ایک اور ساتھی کی طرف مبذول کراتی ہوں جس کے تصورات
کی دنیا پر محض ایک ہی محیط رہتا تھا۔ اور وہ یہ کہ تم سے مسافرت
کی اجنبیت۔ کو دور کرکے اپنا بنا لے۔

کاچا ــــ اس کی یاد میری زندگی کا ایک جزو
بن چکی ہے۔

دیوایانی ــــ میں وہ دن یاد دلاتی ہوں جب کہ
تم ایک لڑکے سے کچھ ہی بڑے یہاں پہنچے تھے۔ تم وہاں باغ
کے احاطے کے قریب کھڑے تھے اور تمھاری آنکھوں میں تبسم
رقصاں تھا۔

کاچا ــــ اور میں نے تمھیں پھول چنتے ہوئے دیکھا
تھا۔ نور میں نہائی ہوئی صبح کی طرح تم سفید لباس میں ملبوس
تھیں اور میں نے کہا "مدد کرنے کی اجازت دے کر مجھے ممنون کیجئے"۔

دیوایانی ــــ میں نے متحیر ہو کر دریافت کیا تھا کہ تم
کون ہو۔ تم نے نرمی سے جواب دیا تھا کہ تم ورہسپتی کے بیٹے
ہو جو اندر دیوتا کے دربار میں ایک مقدس رشی ہیں اور تم میرے
والد سے مردوں کو جلانے کا پوشیدہ منتر سیکھنے کے متمنی ہو۔

کاچا ــــ میں خوف زدہ تھا کہ کہیں پوشیدہ منتروں
کو سکھانے والا استاد دیوتاؤں کی رقابت کی وجہ سے مجھے اپنی
شاگردی میں قبول کرنے سے انکار نہ کر دے۔

دیوایانی ــــ لیکن وہ مجھ سے اس قدر محبت کرتے
ہیں کہ جب میں خود تمھاری درخواست ان کے پاس لے گئی تو
انھوں نے بغیر انکار کئے اسے قبول کر لیا۔

کاچا ــــ تین مرتبہ حاسد جادوگروں نے اپنے
منتروں سے مجھے ہلاک کیا اور تین مرتبہ محض تمھاری کوشش
سے تمھارے والد نے مجھے زندہ کیا۔ تمھارا یہ احسان تادمِ مرگ
میں بھول نہ سکوں گا۔

دیوایانی ــــ احسان! یہ سب کچھ فراموش کردو
مجھے ان کا رنج نہیں ہے۔ کیا تمھیں صرف مہربانیاں ہی یاد ہیں۔
انھیں ختم کردو۔ اگر دن بھر کے سبق کے بعد شام کی تنہائی میں
کوئی نامانوس مسرت کا رعشہ تمھارے دل کو کپکپا دے تو اسے
یاد رکھو لیکن احسان کو نہیں۔ اگر کوئی گیت بالکل اسی تیزی
سے تمھارے دماغ سے نکلے جس طرح کوئی گزر جاتا ہے اور
وہ تمھارے دل میں جاگزیں ہو جائے یا رشتۂ محبت کی

گرہ انبساط شوق سے تمہاری ریاضت میں خلل پیدا کردے
توتم اپنی فرصت کے وقت اپنی جنت میں یاد کرنا۔ صرف مہربانیوں
کو کیوں یاد کرتے ہو۔ نہ محبت اور نہ حسن۔ !

کاچا ــــــ بعض باتوں کے بیان کرنے کی الفاظ میں
طاقت نہیں ہوتی۔

دیوایانی ــــــ ہاں ہاں میں جانتی ہوں میری
محبت تمہارے دل کی گہرائیوں میں پنہاں ہے۔ اور وہ
مجھے جسارت بخشتی ہے کہ میں تمہارے حجاب کے پردے کو
چاک کردوں! مجھ سے ہرگز جدا نہ ہو۔ مجھ سے قریب رہو۔
شہرت مسرت کی ضامن نہیں ہوسکتی۔ دوست! اب تم
مجھ سے جدا نہیں ہوسکتے کیونکہ اب تمہارا راز میرا ہوچکا ہے۔

کاچا ــــــ نہیں! نہیں! دیوایانی۔

دیوایانی ــــــ نہیں کیسے؟ مجھ سے جھوٹ
نہ کہو محبت سے انسان کی آگاہی قدرتی امر ہے۔ روز بروز
تمہارے سر کی جنبش سے تمہاری نگاہوں کے رقص سے اور
تمہارے ہاتھوں کی حرکت سے تمہاری محبت جس طرح کہ
سمندر کی زبان اس کی موجیں ہوا کرتی ہیں گویا تھی۔ اچانک
میری آواز سے تمہارا دل لرزہ براندام ہوجائے گا۔۔۔۔۔
کیا میں نے یہ کبھی دیکھا بھی ہے۔ میں تم سے آشنا ہوں اور
اس لئے اب تم ہمیشہ کے لئے میرے ہو۔ تمہارے دیوتاؤں
کا بادشاہ بھی اس رشتہ کو نہیں توڑ سکتا۔

کاچا ــــــ دیوایانی کیا یہ سب کچھ اسی کے لئے
تھا جو میں نے اتنی مدت اپنے وطن اور عزیزوں سے دور
رہ کر مشقت وریاضت میں گزاردی۔

دیوایانی ــــــ کیوں نہیں۔ کیا صرف علم ہی قیمتی
ہوتا ہے۔ کیا محبت کی کوئی قیمت نہیں۔ خدا یہاں پردم لے کر
سوچو، ہمت کرو اور سمجھو عورت کے دل کی قیمت کا کفارہ اس
کفارہ سے کچھ کم نہیں ہے۔ جسے مرد قوتِ علم اور شہرت
کی خاطر اپنے سر لیتے ہیں۔

کاچا ــــــ میں نے دیوتاؤں سے پکا وعدہ کرلیا
ہے کہ میں انھیں زندگیٔ جاوید کا علم ضرور لاکر دوں گا۔

دیوایانی ــــــ لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ تمہاری آنکھیں
محض کتابوں ہی کے لئے وقف تھیں کیا تم نے اپنے مطالعہ
میں کبھی صرف پھول پیش کرنے کی خاطر تعطل نہیں پیدا کیا اور
کیا تمہیں اس شام کا انتظار نہیں ہوتا تھا جب کہ تم میرے کام میں
ہاتھ بٹانے کی خاطر میری پھلواریوں کے واسطے پانی لانے کے لئے
کبھی نہ کبھی موقع کے منتظر رہتے تھے۔ وہ کیا چیز تھی جو تمہیں میرے
نزدیک سبزہ پر بٹھائے رکھتی اور تم وہ گیت گاتے جو تم آسمان
کے تاروں سے لے آئے ہو۔ جب کہ ہر طرف دریا کے کنارے
اندھیرا اس طرح مسلط ہوتا جیسے محبت اپنی رنجیدہ خاموشی میں
گم ہوجاتی ہے۔ کیا سب چیزیں اس جان لیوا سازش سے
تو تعلق نہیں رکھتیں جو تمہاری جنت میں قبل از قبل ہوچکی
تھیں۔ کیا یہ سب میرے والد کے دل کو موہ لینے کے لئے کیا گیا
تھا۔ اور کامیابی کے بعد تم محض چند حقیر تشکر آمیز الفاظ کہہ کر واپس
ہورہے ہو بالکل اس طرح جس طرح کہ ایک دربان کو چند سکوں
کے عوض دھوکا دیا جاتا ہے۔

کاچا ــــــ اے مغرور عورت! صداقت کے معلوم
کرنے میں کیا فائدہ ہے؟ اگر میں والہانہ جذبۂ پرستش سے
جو میرے دل میں پرورش پا رہا تھا۔ تمہاری خدمت گزاری
کرنے میں غلطی پر تھا تو اس غلطی کی کافی سزا بھی مجھے مل چکی ہے۔
یہ موقع میری محبت کی صداقت کے امتحان کا نہیں۔ میری
زندگی کا اصل فرض میرا منتظر ہے۔ گو میرا دل اب سے ایک

سرخ شعلہ کو لئے ہوئے ہر چند خلا کو ختم کرنے کی کوشش میں لگا رہے گا۔ اس کے باوجود مجھے جنت کو واپس جانا ہے۔ جواب میرے لئے جنت باقی نہیں رہے گی۔ مجھے دیوتاؤں کو ایک نیا علم دینا ہے جو میری سخت کاوشوں اور ریاضتوں کے باعث حاصل ہوا ہے۔ اس وقت میں خوشی و اطمینان کا سانس لے سکوں گا۔

دیوایانی! مجھے معاف کر دو اور یقین مانو اس درد سے جو تمہیں بادلِ ناخواستہ دے رہا ہوں میری تکلیفوں میں دو چند اضافہ ہو گیا ہے۔

دیوایانی ــــ معذرت! تم نے مجھے اس قدر غصہ دلایا ہے کہ اب میرا دل پتھر کی طرح سخت ہو گیا اور برق کی طرح شعلہ فشاں ہے۔ تم اب اپنے کام اور اپنی کامرانی کی جستجو میں جا سکتے ہو لیکن میرے لئے کیا رہ گیا ہے۔ یاد مجھے پیہم ستانے کے لئے باقی رہے گی اور پوشیدہ شرمندگی میری زندگی کی جڑوں کو کھوکھلا کرے گی تم ایک راہ گیر کی طرح آئے۔ میرے باغ کے سائے میں بیٹھ کر آرام کیا۔ وقت گزارنے کے لئے باغ کے تمام پھول توڑ کر ان سے ایک مالا تیار کی اور اب رخصت ہوتے ہوئے مالا کو توڑ کر ان کو فرشِ خاک پر گرا کر جا رہے ہو۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ تم نے محبت کے رشتے کو توڑ دیا ہے۔ تم نے جو عظیم الشان علم حاصل کیا ہے اسے میں سراب دیتی ہوں۔ یہ تمہارے سر پر ایک بوجھ بنا رہے گا۔ گو دوسرے بھی اس میں برابر کے شریک ہیں لیکن تمہارا سر اس کے بوجھ سے کبھی ہلکا نہ ہو سکے گا۔ محبت کے فقدان کی وجہ سے یہ تمہاری زندگی کے لئے اتنا ہی غیر مانوس رہے گا جتنا کہ سرد تارے دوشیزۂ شب کی کامل تاریکی کے لئے اجنبی ہوتے ہیں۔

عبدالباری خاں سجانی

تریپنواں سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ بمقام جبل پور (سی پی)

خطبۂ صدارت شعبۂ تصنیف و تالیف (اردو)

معزز خواتین و حاضرین!

صدارت شعبۂ تصنیف و تالیف اُردو کے فرائض سپرد کرکے ارباب کانفرنس نے مجھ کو جو عزت بخشی ہے اس کا شکریہ ادا کرنا سہل ہے لیکن اُن ذمہ داریوں کی بجا آوری آسان نہیں ہے جو اس سلسلے میں مجھ پر عاید کی گئی ہیں۔ اس لئے کہ دنیائے اُردو کے مسائل گزشتہ ربع صدی میں اتنے پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ ان کا سلجھنا روز بروز دشوار ہوتا جا رہا ہے اور ملک کے سیاسی، اور اردو بولنے والوں کے ذہنی رجحانات کچھ ایسے ناخوش گوار اور بھیانک ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کو سنوارنے اور سلجھانے کی جتنی کوششیں کی جاتی ہیں اتنی ہی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کے اسباب یوں تو کئی ہیں لیکن بڑے سبب صرف دو ہیں:۔

(۱) اُردو بولنے والوں کی غفلت و سہل انگاری۔ (۲) ناخدایانِ اردو کی خود غرضی و غلط راہ روی

یہ دونوں اسباب ایک دوسرے سے اتنے وابستہ ہیں کہ ان کو صحیح معنوں میں دو سمجھنا ہی نہ چاہئے۔ یہ اصل میں ایک ہی ہیں۔ کیونکہ جو لوگ اپنی زبان اور ادب سے غفلت برتتے ہیں وہ ہرگز توقع نہیں رکھ سکتے کہ ان میں سے فرض شناس بے لوث اور مخلص خادم زبان و ادب پیدا ہو سکیں گے۔ اور اگر کوئی ان کا ہمدرد خلوص و ایثار اور صحیح نقطۂ نظر لے کر اٹھے گا بھی تو وہ لوگ اس کو پنپنے نہ دیں گے جو محض اپنی عظمت و اقتدار کے مظاہروں کی خاطر زبان و ادب کے رہنما اور قائد بن بیٹھتے ہیں اور ان کی غافل قوم کی آنکھیں ان کی سیاست و اقتدار کی جلوہ گری سے چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ جب تک احتسابی قوتیں شل رہیں گی صحیح رہنمائی ممکن نہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ نیک نیت رہنما بھی رفتہ رفتہ رہزن بن جائیں۔

اس لئے سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ اردو بولنے والوں میں اپنی زبان اور ادب کی سچی محبت کا احساس پیدا ہو۔ اور وہ واقعی محسوس کریں کہ زبان اور ادب کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بننے یا بگڑنے سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ جب تک یہ احساس پیدا نہ ہوگا نہ زبان ہی ترقی کر سکے گی اور نہ اس کے بولنے والے اور اس احساس کی صحت مند نشو و نما دوسری زبانوں سے نفرت پیدا کر کے یا دوسری زبان کے ہمدردوں سے دشمنی مول لینے کی وجہ سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک تخریبی طریقہ ہے اور اگرچہ تخریبی کام بالعموم جوش و جذبہ کے تحت بہ آسانی کرائے جا سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے قیادت اور رہنمائی کا مرتبہ بھی جلد اور آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن نہ ایسی قیادت دیرپا ہوتی ہے اور نہ ایسے کام مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے ہمسایے کے باغ میں درخت اور کیاریاں سرسبز و شاداب ہیں اور آپ کے باغ میں پھلوں اور پھولوں اور شادابی کی کمی ہے تو یہ کمی اس طرح دور نہیں ہو سکتی کہ آپ اپنے ہمسایے کو گالیاں دیں اور اس کے درختوں اور روشوں پر پتھر پھینکیں بلکہ آپ کا باغ اسی وقت ہمسایے کے چمن سے ہمسری کر سکے گا جب کہ آپ اس کے لئے ویسی ہی مشقت و محنت کریں جیسی کہ وہ اپنے باغ کے لئے کرتا ہے۔ پس اردو کے چمن کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے ہندی یا بنگالی یا پنجابی زبانوں کی مخالفت اور ان کی آبیاری کرنے والوں سے جھگڑا مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم بھی ان ہی ذریعوں اور طریقوں کو سمجھیں اور سیکھیں جن سے یہ زبانیں بار آور ہو رہی ہیں۔

یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے اس کے بعض بہی خواہ تعمیری کی بجائے تخریبی اسالیب کار اختیار کر رہے ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ میں کبھی یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا تھا اور اندیشہ ہے کہ اگر ہم اسی ذہنیت کے ساتھ نشو و نما حاصل کرتے رہے تو ہماری زبان اور ادب کی وہ مقبولیت بہت جلد ختم ہو جائے گی جو ہمارے صلح کل صوفیوں اور زندہ دل شاعروں اور آزاد مشرب ادیبوں کی وجہ سے ہندوستان کے اس وسیع براعظم کے دور دراز کے علاقوں میں پیدا ہوئی تھی۔ اردو بولنے اور سمجھنے والے کشمیر سے لنکا تک اور بلوچستان سے آسام تک محض اسی لئے اب بھی مل جاتے ہیں کہ ان کے اسلاف نے صلح جویانہ مسلک اختیار کیا

اور کبھی کسی مقامی یا دوسری زبان کی مخالفت نہیں کی، حالانکہ اس زبان کی تاریخ میں ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے کہ اس کے بولنے والے صاحبانِ تخت و تاج تھے اور ہر طرح کا سیاسی و سماجی اقتدار رکھتے تھے۔

عہد حاضر میں جب کہ ہر طرف انفرادی و اجتماعی آزادی کے چرچے ہیں اگر اردو کے مصنفین و مولفین ایک ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیں گے جو اس کی دیرینہ روایات کے خلاف ہے اور جس پر اپنے حاکمانہ اقتدار کے زمانہ میں بھی ارباب اردو نے عمل نہیں کیا تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا نتیجہ اردو کے حق میں مفید نہ ہوگا اور اہل اردو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے بدنام ہو جائیں گے۔ اگر ہم میں سے بعض ایسے ہیں جو اب اردو کے نام یا اس کے رسم الخط کو پسند نہیں کرتے تو ہم انھیں کیونکر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اس کو پسند کریں؟ اور اگر ایسے لوگ خود اردو سے برگشتہ ہو کر دوسروں کو بھی اس سے برگشتہ کرانا چاہتے ہیں تو اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے اخباروں یا رسالوں میں چند حقارت آمیز یا مخالفانہ مضامین لکھ کر یہ سمجھ لیں کہ ہم نے اپنی زبان کی بڑی خدمت کی اور مخالفوں کے خلاف اہل اردو میں نفرت پیدا کر کے کوئی خاص کامیابی حاصل کی۔

ایسے وقت میں سچے اور مخلص ہمدردان اردو کا اصل کام تو یہ ہے کہ ان لاکھوں اردو بولنے والوں کو صحیح معنوں میں اردو داں بنانے کی کوشش کریں جو ارباب اردو کی غفلت و نادانی اور دوسروں کی دانائی کی بنا پر بہت جلد اردو دنیا سے علٰحدہ ہو سکیں گے۔ کیونکہ تقریباً ہر صوبہ میں ایسے لاکھوں غریب اور پریشان حال موجود ہیں جو پڑھنے لکھنے کی دولت سے محروم ہیں اگر اہل اردو چاہتے ہیں کہ ان کی زبان بولنے والوں کی تعداد میں مستقبل قریب میں معتدبہ کمی نہ ہونے پائے تو ان کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ ہر شہر اور ہر گاؤں میں تعلیم بالغاں کی مہم کا آغاز کریں۔ اگر ہندی کے حامی خواہ ان پڑھوں کو ہندی رسم الخط میں پڑھنا لکھنا سکھا کر اپنی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں تو وہ نہ صرف اپنا فرض ادا کر رہے ہیں بلکہ ہندوستان کی شہرۂ آفاق ناخواندگی کو دور کرنے کی سعی کر کے اپنے ملک کے سچے محسنوں کی صف میں بھی شامل ہو رہے ہیں۔

تعلیم بالغاں کی مہم بجائے خود جو اہمیت رکھتی ہے اس کی نسبت تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کام سے ہم دوگونہ فوائد حاصل کریں گے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ اس طرح تعلیم کو عام کر کے ہم جہالت کی ان گھنگھور گھٹاؤں کو دور کر سکیں گے جو ہمارے ملک پر چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں۔ اور جن کی تاریکی میں ہمارے کروڑوں بھائی بھلے اور برے اور سچ اور جھوٹ کے مابین امتیاز نہیں کر سکتے اور اسی لئے وہ آسانی سے ایسے غلط بیانات باور کر سکتے ہیں کہ اردو قرآن شریف کی زبان ہے اور اس کو مسلمان حملہ آور اپنی تلوار کے ساتھ باہر سے ہندوستان میں لے آئے ہیں۔

تعلیم بالغاں کا دوسرا فائدہ پہلے فائدہ سے بھی زیادہ اہم ہے اس لئے کہ ہماری اس مہم کے ساتھ ساتھ خود اردو کی بھی اشاعت ہوتی جائے گی۔ ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ہماری زبان کی بقا اور اشاعت کے سلسلے میں فی الوقت تعلیم بالغاں کو جو اہمیت حاصل ہے اتنی کسی اور مسئلہ کو حاصل نہیں۔ ان پڑھ لوگوں کو اس وقت جس زبان میں بھی پڑھنا لکھنا سکھا دیا جائے گا ان کی اولاد بھی وہی زبان اختیار کرے گی۔ خاص کر صوبۂ متحدہ اور صوبۂ متوسط اور ان کے اطراف و اکناف کے اکثر علاقوں کے باشندے ایسی زبان یا بولیاں بولتے ہیں جو محض رسم الخط سیکھنے کے بعد یا تو اردو بن جاتی ہیں یا ہندی۔ اس لئے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ کوشش انہی مقامات پر تعلیم بالغاں کے سلسلے میں ہونی ضروری ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہی علاقوں میں اردو کی تعلیم بالغاں سے غفلت برتی جا رہی ہے اور ہمدردی اردو کے سارے مظاہرے محض نمود و نمایش اور مجلس آرائی کی حد تک آ کر ختم ہو جاتے ہیں جو لوگ اردو کی محبت کے دعوے دار ہیں اور اردو کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیبی اور سماجی بہبودی کے بھی خواہشمند ہیں انھیں چاہیئے کہ اپنے اپنے قریوں، محلوں، گلیوں، اور بازاروں میں تعلیم بالغاں کے مدارس قائم کریں اور متحدہ طور پر سعی کریں کہ ان کے گاؤں یا محلے یا گلی میں کوئی شخص ایسا نہ رہے کہ جس کو اردو پڑھنا لکھنا نہ آتا ہو۔ اور اگر متحد ہو کر کام کرنا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو (جس کا امکان زیادہ ہے) تو ہر شخص انفرادی طور پر کوشش کرے کہ وہ سال بھر میں کم از کم ایک مرد یا عورت کو پڑھا لکھا بنا کر چھوڑے گا۔ اردو کے ہر پڑھے لکھے آدمی کا یہ ایک ایسا مقدس فریضہ ہے جس کی

پابجائی کے بغیر اس کا ضمیر مطمئن نہیں ہو سکتا۔

یہ کام مشکل بھی نہیں ہے اور اس کے لئے نہ کسی اُجرت کی ضرورت ہے۔ چندوں کی اور نہ کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کی لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری طبیعتیں ایسے ہی کاموں میں لگتی ہیں جن میں انجمن آرائی ہو یا ہنگامہ پرور ہو۔ ہم خاموش اور مخلص کام کے ابھی عادی نہیں ہوئے ہیں اسی لئے جو لوگ خاموشی اور خلوص و ایثار کے ساتھ اپنی زبان کی ترقی اور اشاعت کر رہے ہیں وہ برق رفتاری کے ساتھ ہم سے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

خوش قسمتی سے ہم میں مولوی محمد سجاد مرزا صاحب جیسے ماہرین تعلیم موجود ہیں جنھوں نے تجربوں اور معلومات کے بعد تعلیم بالغان کی آسان کتابیں اپنی ذاتی نگرانی میں مرتب کرائی ہیں اور جن کو عملی تجربہ کی خاطر ادارۂ ادبیات اردو نے اپنی تعلیم بالغان کی مہم میں استعمال کر کے اندازہ لگایا ہے کہ ہندوستان کے ہر علاقہ میں اَن پڑھوں کو بہت جلد پڑھا لکھا بنایا جا سکتا ہے۔ یہ کتابیں نہ صرف حیدرآباد بلکہ میسور اور جوناگڑھ کی ریاستوں اور بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں بھی روشناس ہوئیں اور تعلیم بالغان کے لئے مفید اور مقبول سمجھی جا رہی ہیں۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی ان کے ذریعہ سے کسی اَن پڑھ آدمی کو اردو نوشت و خواند سے واقف کرا سکتا ہے۔ چنانچہ جہاں جہاں ادارۂ ادبیات اردو نے اس نصاب کو روشناس کیا بیسیوں اَن پڑھ لوگ پڑھے لکھے بن گئے اور ادارے کے اردو امتحانات میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی۔ ادارے کی تعلیم بالغان کی مہم اتنی کامیاب ثابت ہوئی ہے کہ سنہ ۱۹۴۳ء میں ریاست کے تقریباً دو ہزار اَن پڑھوں نے اس کے امتحان اردو دانی میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی۔ اور اس امتحان کے مرکز ریاست حیدرآباد کے باہر بھی مقرر کرنے پڑے چنانچہ گزشتہ سال بمبئی جیسا بڑا شہر بھی ایک مرکز تھا۔

غرض اس تجربے سے ثابت ہوا کہ اردو میں تعلیم بالغان کا کام بہت آسانی سے انجام پا سکتا ہے۔ اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے رہنے بسنے والے اگر توجہ کریں تو نہ صرف اپنے علاقہ سے ناخواندگی کی وبا کو دور کر سکتے ہیں بلکہ اہل اردو کی تعداد میں اضافے کا باعث اور اپنی زبان کے استحکام و اشاعت کا موجب بھی بن سکتے ہیں۔

اردو کی تقویت اور استحکام کا ایک دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ اہل اُردو مطالعہ کی عادت ڈالیں۔ مطالعہ کے گوناگوں فوائد سے یوں تو کسی کو انکار نہ ہوگا لیکن عہد حاضر میں اردو کی بقا و ترقی کے لئے یہ ایک زود اثر اور مفید ترین حربہ ثابت ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی غیبی طاقت ہر اردو پڑھے لکھے مرد یا عورت کو اس امر کے التزام پر مجبور کرے کہ وہ روزانہ تھوڑی دیر (دس پانچ منٹ ہی سہی) کسی نہ کسی کتاب یا اخبار کا کچھ حصہ پڑھ لیا کرے تو اردو تصنیف و تالیف کی تاریخ میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر کس و ناکس سے ایک ایسے التزام کی توقع نہیں کی جا سکتی اس لئے ایک ایسے انقلاب کی امید رکھنا بھی فضول ہے۔ البتہ سمجھ بوجھ رکھنے والے حامی و بہی خواہان اردو کو کوشش کرنی چاہئے کہ خود ہی اس امر کا التزام کریں اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس ذوق کو پھیلائیں۔ وہ دن اردو ادب کے لئے بڑا مبارک دن ہوگا جب اردو بولنے والوں کے ہر محلہ اور ہر گلی میں ایک کتب خانہ یا دار المطالعہ موجود رہے گا۔ لیکن ایک ایسا یوم عید اس وقت تک نہ آئے گا جب تک کہ اردو بولنے والوں میں آزاد اور صحیح قسم کا سیاسی شعور پیدا نہ ہوگا اور ان کی معاشی پستی دور نہ ہوگی۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ حالات کے تحت ہر گلی میں ایک باضابطہ دار المطالعہ قائم نہ ہو سکے ایسی حالت میں ایک عملی صورت یہ اختیار کی جا سکتی ہے کہ اپنے محلے یا گلی کے کسی ایک گھر کو منتخب کر کے اس میں دو چار اخبار اور رسالے اور چند کتابیں مطالعہ کے لئے جمع کر لی جائیں اور فرصت کے اوقات میں پڑھے لکھے لوگ وہاں جایا کریں۔ مسجدوں اور معبدوں سے بھی یہ کام بڑی خوبی سے لیا جا سکتا ہے۔

بہرحال جہاں اور جس طرح بن پڑے دار المطالعے قائم کئے جائیں اور پڑھے لکھے لوگ اپنی زبان کے ادب سے استفادہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاں ایک طرف اردو ادب کا ذوق عام ہوگا دوسری طرف اُردو کے اخبار رسالے اور تصنیفات و تالیفات زیادہ سے زیادہ تعداد میں چھپیں گی اور ان کے مصنفوں، مرتبوں اور ناشروں کی ہمت افزائی اور امداد ہوگی۔ جو اصحاب اردو اخبارات و رسائل کی کم مائگی اور کتب کی بے رونقی اور گھٹیا معیار کی شکایت

کرتے ہیں وہ کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ اس کا سبب وہ خود ہیں۔ جب تک اُردو کی مطبوعات زیادہ تعداد میں صرف نہ ہوں گی نہ ان کے مصنفوں اور ناشروں کو انھیں بہتر بنانے اور چھاپنے کی ہمت ہوگی اور نہ ان کی قیمتیں کم ہو سکیں گی۔ طلب اور رسد کا یہ ایک ایسا موٹا مسئلہ ہے جس کی وضاحت غیر ضروری ہے۔ کتنے رنج کا مقام ہے کہ جس زبان کے بولنے والوں کی تعداد نخرو مباہات کے ساتھ آٹھ دس کروڑ سے زیادہ بتائی جاتی ہے اس کا کوئی اخبار یا رسالہ پانچ ہزار سے زیادہ تعداد میں نہیں چھپ سکتا۔ اور اس کی کسی مفید سے مفید کتاب کے بھی ہزار دو ہزار سے زیادہ نسخے شائع ہونے نہیں پاتے۔ اہل اُردو کے لئے یہ کیسی شرم کی بات ہے کہ اس کے اکثر رسالوں کے مدیر اپنے مضمون نگاروں کو کوئی معاوضہ نہیں دے سکتے معاوضہ دینا تو درکنار اکثر و بیشتر رسائل ایسے ہیں جو کاغذ و طباعت ہی کے اخراجات کو ترستے رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں مضامین کے معیار میں اضافہ اور رسائل کی ترتیب و دیدہ زیبی میں ترقی کیونکہ ممکن ہے۔ کسی زبان کی پستی اور اہل زبان کی بے دردی کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ ہم کو دوسری ہمسایہ زبانوں اور ان کے بہی خواہوں پر اعتراض کرنے کا کیا حق حاصل ہے جب کہ ہم خود اپنی زبان اور ادب سے غافل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری زبان کو ہماری اس بے حسی اور کم شعوری سے جتنا نقصان پہنچ رہا ہے دوسروں کی معاندانہ سرگرمیوں سے کبھی نہیں پہنچ سکتا ایسے ہی مواقع کے لئے شاید کہا گیا تھا کہ ازماست کہ برماست۔

ہماری زبان کے ادیب اور شاعر اپنی ذہانت، محنت اور فن کارانہ کمال میں بڑی سے بڑی اور مہذب ترین زبان کے ادیبوں اور شاعروں سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن جس زبان کے بولنے والے خواہ امیر ہوں کہ غریب، بلکہ غریبوں سے زیادہ امیر، قدردانی کے فن سے عاری اور ادبی ذوق سے بے بہرہ ہوں اس میں علم و فن اور شعر و ادب پروان چڑھے تو کیونکر۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صاحبان علم اردو کی جگہ انگریزی اور ہندی میں لکھنے کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ جب ہم میں سے اکثروں کی ذہنیت کا یہ عالم ہو کہ ہم انگریزی زبان میں چھپی ہوئی تحریر کو زیادہ مستند اور دلچسپ سمجھتے ہیں تو پھر اردو میں کون لکھے گا۔ یہ ایک میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب کوئی کتاب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپتی ہے تو لوگ اس کے انگریزی نسخے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور اردو نسخہ دوسری اردو کتابوں کی طرح برسوں طاقِ نسیاں میں دھرا رہتا ہے اور بے چارے مصنف کو پھر کبھی کوئی کتاب اردو میں چھپوانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ غرض جب اپنے شاعروں اور ادیبوں کی خود ہم قدر نہ کریں گے تو دوسرے ان کی طرف کیوں متوجہ ہوں اور پھر ہم کیوں توقع رکھیں کہ ترکی کے صحیفہ نگار سیاح، یا ایرانی ثقافتی وفد کے ارکان بنگالی کے شاعر ٹیگور کے مقابلہ میں اردو کے شاعر اقبالؔ سے زیادہ واقف ہوں گے۔

اس لئے اردو کے تمام ہمدردوں کو تہیہ کر لینا چاہئے کہ وہ اپنی آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ اردو کتب و رسائل کی خریدی کے لئے ہر مہینے لازمی طور پر خرچ کریں گے۔ اگر دس کروڑ سے زیادہ انسانوں میں بولی جانے والی زبان میں دس لاکھ آدمی بھی ایسے نہ مل سکیں جو اپنی زبان کی کتابوں اور رسالوں کو پابندی اور شوق سے خریدتے ہوں اور دس بارہ صاحبان مقدرت ایسے مہیا نہ ہو سکیں جو اردو تصنیفات و تالیفات پر انعام و اکرام دینے اور اردو کے ارباب علم کی شایان شان سرپرستی کرنے کا ارادہ نہ کر سکیں تو پھر کثرت تعداد پر فخر کرنے اور اپنی زبان کی فضیلت و وسعت جتانے سے کیا فائدہ؟ اہل اردو کو اس کا قلق ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ کچھ لوگ اردو چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اصل غم تو اس کا ہے کہ جو لوگ اردو کو کسی طرح بھی چھوڑ نہیں سکتے وہ اس زبان کا کوئی درد نہیں رکھتے۔ اگر ہم جانے والوں سے جھگڑنے کی جگہ رہنے والوں کو صحیح معنوں میں زندہ اور اردو ادب کے دلدادہ بنا دیں تو پھر ہم کو نہ انگریزی سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہندی یا پنجابی سے۔

غرض جس طرح ان پڑھوں کے لئے تعلیم بالغاں کی مہم کا آغاز ہمارے اولین فرائض میں داخل ہے اسی طرح پڑھے لکھے لوگوں کے لئے دارالمطالعوں کے قیام اور نتیجتاً اردو ادب کے اشاعت کی بھی ایک علحدہ مہم جاری کرنا ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔ اور یہ دونوں کام ایسے بھی نہیں ہیں جو کسی بڑی تنظیم یا سرمایہ کے بغیر نہ چل سکیں گے۔ ہر بہی خواہ اُردو بحالت مجبوری انفرادی طور پر بھی ان کو آسانی سے

چلاسکتا ہے۔ اور اگر ان کی خاطر ملک کے مختلف حصوں میں اجتماعی طور پر کام شروع ہوسکے تو اردو زبان کی اس سے بڑھ کر خوش قسمتی عہد حاضر میں اور کوئی نہیں ہوسکتی ۔

اردو تصنیف و تالیف کی ایک نمایاں بدقسمتی جس کی طرف بھی ابھی اشارہ کیا گیا تھا یہ ہے کہ عوام کی بے حسی اور ناقدری کے ساتھ ساتھ بعض خاصان ادب میں بھی ایسی خرابیاں نمودار ہوگئی ہیں جو زبان کی ترقی اور ادب کے نشو و نما کے لئے سم قاتل کا اثر رکھتی ہیں جو مصنفین مولفین بخت و اتفاق سے کسی مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ دوسرے بھی اس درجہ تک پہنچنے کے اہل ثابت ہوں جس طرح میں نے آج سے چار سال قبل فروری ۱۹۴۱ء میں جامعہ عثمانیہ کی اردو کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا " اب زمانہ بدل رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی ٹھیکے بھی ختم ہوتے جارہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان ٹھیکہ داروں کی ذہنیت کے بدلنے میں ابھی کچھ عرصہ درکار ہو۔ لیکن اردو کے جوان ہمت خدمت گزاروں کو بددل نہ ہونا چاہئے ۔ ان کے آگے وسیع میدان ہے ۔ وہ اگر چاہیں تو اپنی دنیا آپ پیدا کرسکتے ہیں وہ بوسیدہ مزاروں کے ان سجادہ نشینوں کے ظاہری یا باطنی فیوض کے بغیر ہی اپنی ذاتی کدو کاوش سے اپنے ویرانوں میں چراغاں کرسکتے ہیں"۔

ایک طرف پختہ مشق ادیبوں کی علمی امارت اور سرمایہ داری کی ذہنیت بڑھتی جارہی ہے اور دوسری طرف عدم احتساب اور اہل زبان کی کم شعوری کے باعث اردو کا ہر طفل مکتب خود کو ایک بڑا ادیب اور شاعر سمجھنے لگا ہے ۔ گویا اردو ادب کی دنیا آج ایک ایسی لنکا بنی ہوئی ہے جس میں ہر شخص باون گز کا ہے جس محفل میں نہ بڑوں کو چھوٹوں کا خیال رہے اور نہ چھوٹوں کو بڑوں کا لحاظ تو اس کے بگڑنے اور اجڑنے کا انتظار ہی بے کار ہے ۔

ایک اور عیب جس نے اس زبان کی تصنیف و تالیف کے راستہ میں شروع ہی سے کانٹے بو رکھے ہیں صوبہ جاتی تعصب ہے ۔ اگرچہ تعصب خواہ وہ کسی قسم کا ہو معیوب ہے لیکن علمی و ادبی فضا میں تو وہ سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے ۔ پہلے پہل تو صرف دلی اور لکھنو والے ہی اس تفاخر میں مست تھے اور دوسرے صوبوں کی اردو کو اردو ہی نہیں ماننا چاہتے تھے ۔ لیکن اب تو اکثر اردو بولنے والے علاقوں میں تعصب کا بازار گرم ہے ۔ اور ہر جگہ روز بروز جتھا بندی بڑھتی جارہی ہے ۔ چنانچہ بعض صوبوں میں منظم پیش بندی کی جاتی ہے کہ خواہ ذوق و انصاف کا خون ہی کیوں نہ ہو لیکن اپنے علاقے کے شاعر اور ادیب کے مقابلہ میں دوسرے مقام کے صاحبان کمال کو ترجیح نہ حاصل ہونے پائے ۔ اس رجحان سے اردو کی ہمہ گیری کو بڑا صدمہ پہنچے گا ۔ اور ایک ایسی بھیانک فضا چھا جائے گی جس میں کمال فن اور جمال ادب کے جلوے شاید ہی نمودار ہوسکیں ۔ جو لوگ دوسروں سے بحث کرتے وقت دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو اہل ہند کی ایک مشترکہ میراث ہے اور اپنی اعلیٰ خصوصیات کے باعث ہندوستان کی عام زبان کہلانے کا حق اسی کو حاصل ہے انہیں چاہئے کہ ذرا اپنے دامن کو بھی دیکھیں اور ان درون خانہ جھگڑوں کو جلد سے جلد محسوس کرکے صوبہ واری تعصبات کا فراخ دلی کے ساتھ سد باب کریں ۔

اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو زبان و ادب اردو کی تشکیل و ارتقاء میں ہندوستان کے اکثر و بیشتر علاقوں نے برابر کا حصہ لیا ہے ۔ ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا اپنی زبان کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت بہم پہنچانا ہے ۔ پنجاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے غزنوی سلطنت کے زمانہ میں اردو کا بیج بویا ۔ جب دلی میں ترک غلاموں کی سلطنت قائم ہوئی تو علاقہ برج (یعنے آگرہ ۔ گوالیار اور دلی) کی زبان اور تہذیب نے اس کی آبیاری کی پھر گجرات کی مظفر شاہی اور دکن کی بہمنی (اور بعد کو اس کی جانشین قطب شاہی اور عادل شاہی) سلطنتوں نے پنجاب اور دو آبۂ گنگ و جمن کے اس پودے کی ایسی اچھی پرداخت کی کہ اس میں پھول اور پھل نکل آئے اور احمد نگر، گولکنڈہ اور بیجاپور اردو ادب کے ابتدائی گہوارے کہلائے ۔

عہد اورنگ زیب تک شمالی ہند میں اردو صرف بازاروں اور لشکروں کی عام بول چال کی زبان رہی لیکن اورنگ آباد کے ایک زندہ دل شاعر ولی کی کرامت نے شاہجہاں آباد کے شاعروں سے فارسی گوئی ترک کرا کے ان کو اردو کا گرویدہ بنا دیا جب دلی والوں نے اس زبان کو ادب کے لئے استعمال کرنا شروع کیا تو اس نے رفتہ رفتہ ایک ایسی معیاری زبان کی شکل اختیار کرلی کہ بعد کو خود گجرات اور دکن والے بھی اپنا قدیم اسلوب چھوڑ کر اسی کی تقلید پر مجبور ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد جب شعرائے دہلی اس معیاری زبان کو لے کر مشرقی ہندوستان میں پہنچے تو اودھ، بہار اور بنگالہ کے صاحبان ذوق نے اپنی مقامی زبانوں کی جگہ اسی کو اپنی ادیبانہ قوتوں کے مظاہرہ کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ اودھ اور بہار کی السنہ کی سرزمینوں سے اردو کے بڑے بڑے صاحبانِ کمال اٹھے فیض آباد، لکھنو، پٹنہ اور مرشد آباد اردو کے وہ مرکز ہیں جن کے تذکرہ کے بغیر ادب اردو کی کوئی تاریخ مکمل نہیں سمجھی جاسکتی۔ خاص کر اردو شاعری کا دامن وہاں کے شعراء نے ایسے گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیا جن کی شگفتگی ہمیشہ باقی رہے گی۔

برطانوی راج کے آغاز کے بعد جب ہندوستان کے علوم و فنون نے نشاۃ ثانیہ حاصل کی تو دوبارہ پنجاب اور دکن ہی نے گیسوئے اردو کے سنوارنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ چنانچہ پنجاب میں جدید اُردو ادب نے جنم لیا اور آزاد اور حالی جیسے باکمالوں کے دماغ وہیں جدید شاعری اور جدید نثر کے سانچوں سے روشناس ہوئے۔ ساتھ ہی حیدرآباد میں پہلے نواب شمس الامراکی اور بعد کو جامعہ عثمانیہ کی سرپرستی میں اردو کا خزانہ مغربی علوم و فنون خاص کر سائنس کے مضامین سے مالامال ہوگیا۔ اُدھر سرسید احمد خاں نے دلی اور پھر علی گڑھ میں ہماری زبان کو انگریزی کا ہم پلہ بنانے کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس کو ان کے صاحب کمال ساتھیوں نے اس خوبی سے نبھایا کہ اردو واقعی ایک مہذب زبان بن گئی اور اس کا شمار دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں کیا جانے لگا۔

عہد حاضر میں بھی اردو زبان و ادب کی جو اجتماعی و انفرادی خدمات انجام دی جا رہی ہیں وہ بھی کسی ایک خطۂ ملک تک محدود نہیں ہیں۔ یہ اردو کی ہمہ گیری کا ایک نمایاں ثبوت ہے کہ اس کے ارتقا میں ہندوستان کے اکثر و بیشتر صوبوں کے باشندے ابھی اپنے اپنے طور پر برابر سرگرم عمل ہیں۔ اور یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جو ہندوستان کی کسی اور زبان کو خواہ وہ اردو کی حریف مقابل ہی کیوں نہ ہو نصیب نہیں ہوسکتی۔

اردو کی اجتماعی خدمات میں سب سے پہلے **جامعہ عثمانیہ** اور اس کے دار الترجمہ کا ذکر ضروری ہے یہ جامعہ سلطان العلوم اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع کی مسیحا نفسی کا ایک ایسا کرشمہ ہے جس نے ہماری زبان کے علم و فضل اور ہمارے فخر و مباہات میں چار چاند لگا دئے۔ جامعۂ عثمانیہ ایک ایسا آفتاب ہے جس کی ضو پاشیوں سے اردو کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ اس لئے میں اس جامعہ سے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل سمجھتا ہوں۔

جامعہ عثمانیہ کے بعد **انجمن ترقی اُردو** ہماری زبان کی وہ واحد انجمن ہے جس کی طرف ہر خطۂ ملک کے اردو والوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ انجمن نہ صرف اپنی قدامت بلکہ اپنے وسائل کے لحاظ سے بھی اردو کی دوسری انجمنوں اور اداروں پر فضیلت رکھتی ہے۔ اس نے اردو شاعروں کے تذکرے اور مختلف فنون کی اصطلاحات اور لغت شائع کرکے اُردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ اسی کل ہند اسلامی تعلیمی کانفرنس کے شعبۂ تصنیف و تالیف اُردو کی حیثیت سے اس کا آغاز ہوا اور اس کو علامہ شبلی۔ مولنا حبیب الرحمن خاں صدر یار جنگ بہادر شروانی۔ مولوی عزیز مرزا۔ اور مولوی ڈاکٹر عبد الحق جیسے فاضل اور سرگرم عمل معتمد نصیب ہوئے۔ اگرچہ کانفرنس کے اس شعبہ نے بڑھ کر انجمن ترقی اردو کی ایک جداگانہ شکل اختیار کرلی لیکن بڑی مسرت کا مقام ہے کہ اس کانفرنس نے اپنے اس شعبہ کو بھی برابر قائم رکھا۔ چنانچہ آج کل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اُردو کے صدر پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے صاحب ذوق اس کے معتمد ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر موصوف ہی کی نگرانی میں علی گڑھ کی مشہور و قدیم انجمن اردوئے معلیٰ بھی ایک جاری سرگرم عمل ہے۔ اور علی گڑھ کی وہ قدیم علمی و ادبی روایات بھی برقرار ہیں جن پر اردو دنیا جتنا فخر کرے کم ہے۔

اردو کی دوسری اجتماعی خدمات میں دار المصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد، ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد، مجلس مصنفین علی گڑھ خاص کر

قابل ذکر ہیں ۔ **دار المصنفین** علامہ شبلی کی ایک صحیح یادگار ہے اور اس کے کارکن اسی مستحسن روش پر چلنا اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں جو اردو کے اس بڑے ادیب اور مورخ نے اختیار کی تھی۔ شبلی کے جانشینوں کو تاریخ و علوم اسلامی کا اچھا اور پختہ ذوق حاصل ہے لیکن شبلی کا وہ دلچسپ اسلوب بیان ان کو ورثہ میں نہ مل سکا جس کے باعث شبلی؛ صرف ایک اعلیٰ مورخ اور سوانح نگار ہی نہیں بلکہ اردو کے اُن چوٹی کے ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں جنھوں نے اس زبان کو اپنے پر شوکت اور رنگین اسلوب بیان کی وجہ سے ایک ایسی ہمہ گیری بخشی کہ یہ زبان اب ہر خطہ ملک کے لکھنے والوں کے لئے آسان بن گئی اس جماعت کے روح رواں مولانا سید سلیمان ندوی نے حال ہی میں حیات شبلی شائع کرکے مولانا حالی کی وہ فضیلت چھین لی جو ان کو حیات جاوید لکھنے کے بعد اردو ادب میں حاصل تھی ۔

ہندوستانی اکیڈمی صوبۂ متحدہ کی حکومت کی اس خواہش کی بنا پر قائم ہوئی تھی کہ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی تصنیف و تالیف کا مفید کام ہوسکے ۔ لیکن کچھ تو حکومتی اور سیاسی الجھنوں کی بنا پر اور کچھ اس وجہ سے کہ اس تنظیم کے پیچھے اردو کے کسی بڑے ادیب اور مخلص رہنما کا سہارا نہ تھا یہ اکیڈمی ارباب اردو کی توقعات کے مطابق کامیاب ثابت نہ ہوسکی اگرچہ حکومت نے اس کے تماہی رسالے کی ادارت یکے بعد دیگرے کئی قابل اصحاب کے سپرد کی اور اس کی مجلس منتظمہ میں بعض لائق لوگوں کو بھی شریک رکھا ۔ پھر بھی تصنیف و تالیف کا جو کچھ کام ہوا ہے ایک حد تک غنیمت ہے اور توقع ہے کہ آئندہ اس سے بہتر کام ہوسکے گا۔

ادارۂ ادبیات اُردو بھی تقریباً اسی زمانہ میں قائم ہوا جس زمانہ میں ہندوستانی اکیڈمی قائم ہوئی تھی ۔ لیکن یہ ایک بالکل خانگی ادارہ ہے اور اس کے بانیوں نے حکومت یا عوام کے آگے امداد کے لئے دست طلب دراز کئے بغیر اپنے کام کا آغاز کر دیا ۔ اور کٹھن سے کٹھن گھڑیوں میں بھی ہمت و استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا ۔ اسی لئے اس کی جانب سے ماہ ناموں کے علاوہ اب تک سوا سو سے زیادہ تاریخی و ادبی کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور کچھ عرصے سے وہ ایک مخزن علوم یعنے اُردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب میں بھی مصروف ہے جس کی پہلی جلد چھپ رہی ہے ۔ اس ادارے نے تعلیم بالغان کی جس مہم کا آغاز کیا اس کا ذکر اس سے قبل گزر چکا ہے ۔

ادارۂ ادبیات اردو نے جس چھوٹے پیمانے پر خلوص اور خاموشی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا تھا اسی طرح دو سال قبل علی گڑھ میں **مجلس مصنفین** نے اردو کی خدمت کا آغاز کیا ہے ۔ اس کے لائق اور مخلص معتمد مولوی الطاف علی صاحب بریلوی بی اے ہیں ۔ جو اس مجلس کے ترجمان مجلۂ مصنف کے مدیر بھی ہیں ۔ یہ رسالہ ادب و تاریخ کے ان بلند پایہ مقالوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اس مجلس کے جلسوں میں ہر ماہ پڑھے جاتے ہیں ۔ چونکہ یہ مجلس خلوص اور صحیح ذوق کے تحت کام کر رہی ہے اس لئے یقین ہے کہ اردو ادب کی اجتماعی خدمات کی تاریخ میں اپنے لئے ایک نمایاں جگہ مخصوص کرے گی ۔

دہلی میں بھی ایک **اُردو مجلس** خواجہ محمد شفیع صاحب کی ذاتی دلچسپی کی بنا پر قائم ہوئی ہے جس کے اجلاس ہر مہینے منعقد ہوتے ہیں اور اس میں بھی اچھے مضامین اور نظمیں سنائی جاتی ہیں لیکن اس مجلس کی جانب سے کوئی رسالہ شائع نہیں ہوتا ۔ گزشتہ دو تین ماہ سے حیدرآباد میں بھی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے ایک ایسی ہی مجلس کا افتتاح کیا ہے ۔ اگر یہ مجلسیں یوں ہی خوش اسلوبی سے منعقد ہوتی رہیں اور ارباب ذوق اسی طرح ایک دوسرے سے استفادہ کرتے رہیں تو یقین ہے کہ اردو ادب کا اچھا ذوق پھیل سکے گا اور لوگوں میں اپنی زبان اور ادب کے مختلف مسائل سے دلچسپی پیدا ہو کر وہ غفلت دور ہوسکے گی جس کی خرابیوں کی تفصیل اس سے قبل بیان ہوچکی ہے ۔

اجتماعی کوششوں کے سلسلہ میں سب سے آخر میں **ترقی پسند مصنفین** کی جماعت کا ذکر ضروری ہے اس جماعت کے افراد میں جو باغیانہ ذہنیت عام طور پر محسوس کی جا رہی ہے وہ دراصل ردعمل ہے علم دوست داناؤں کے اس جمود و غفلت اور خاصانِ اردو کی اس سرمایہ دارانہ

ذہنیت کا جس کا تفصیلی تذکرہ میں پہلے کرچکا ہوں ۔ دنیائے اردو میں گزشتہ ربع صدی کے اندر جو مایوس کن فضا پیدا ہوگئی تھی میری نظر میں اس کا فطری اقتضا یہی تھا کہ ایک ایسی جماعت پیدا ہوتی جو اپنے ادب کے تمام رجعت پسندانہ خصوصیات اور گوناگوں جکڑبندیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ مرض جتنا شدید ہوتا ہے اس کے علاج میں بھی اتنی ہی تلخ و تند دوائیں تجویز کرنی پڑتی ہیں ۔ اور شاید اسی خیال کے پیش نظر ترقی پسنداویبوں نے اپنے لہجے کو ترش اور تیز بنانے کی کوشش کی لیکن ان میں بعض ایسے گم کردہ راہ اور برخود غلط نوجوان بھی شامل ہوگئے جنھوں نے اصل مقصد سے ہٹ کر یا تو اشتراکیت کی تبلیغ شروع کردی یا فحش گوئی پر اتر آئے ۔ یہ دونوں رجحانات اصل میں ہماری موجودہ معاشرت ہی کا نتیجہ ہیں اور ان سے واضح ہوتا ہے کہ اردو بولنے والوں کے ذہن آج کل کسی سیاسی اور سماجی بے چینی میں مبتلا ہیں ۔ نیز ہمارے نوجوان اخلاقی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے کس پست درجہ تک پہنچ چکے ہیں ۔ غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک جاری ہوتے ہی کسی قید خانے سے اچھے اور بُرے ہر قسم کے قیدی اپنی اپنی زنجیروں کو توڑ کر باہر نکل آئے ہیں ، جو بھلے ہیں وہ اس امر کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ خیال اور زبان آزاد رہ کر ادب اور زندگی کو وہ فائدہ پہنچا سکیں جو ہماری کم فہم سماج کی عاید کردہ جکڑ بندیوں کی وجہ سے بحالت موجودہ نہیں پہنچ سکتا اور جو بُرے ہیں انھیں ترقی پسندی کی آڑ میں اپنی گندگیوں کو پھیلانے کی آزادی حاصل ہوگئی ہے ۔ گویا ایک ایسا میلہ لگا ہوا ہے جس میں اوباشوں کی وجہ سے شریفوں کی بدنامی ہو رہی ہے اور شریفوں کا بھیس لے کر اوباش جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں ۔ ان دونوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے میں کچھ عرصہ درکار ہوگا اور جب یہ مجمع کچھ دن خوش فعلیاں کر چکے گا اور بروں کی برائیاں اور بھلوں کی بھلائیاں الگ الگ نظر آنے لگیں گی تو اس تحریک کی قدر و قیمت متعین ہوسکے گی ۔ اور اگر اس کے چلانے والوں نے جرأت و استقلال کے ساتھ اعلیٰ کردار کا بھی مظاہرہ کیا تو امید ہے کہ موجودہ افراتفری کا سدباب ہو کر یہ تحریک صحیح معنوں میں ترقی پسند ثابت ہوگی اور اس سے اردو ادب کو فائدہ پہنچے گا ورنہ یقین ہے کہ تاریخ ادب اردو میں اس کو ایک ہنگامۂ ناؤ نوش سے بڑھ کر اہمیت حاصل نہ ہوسکے گی ۔

ان چند اجتماعی تحریکوں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف اقطاع میں اور بھی انجمنیں اور جماعتیں اردو و تصنیف و تالیف کی خدمت کر رہی ہیں ۔ اور ان کے علاوہ بعض اصحاب ایسے بھی ہیں جو اگرچہ تنہا کام کر رہے ہیں لیکن بجائے خود ایک انجمن کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان سب کی اردو خدمات پر تبصرہ کرنے کی نہ اس وقت ضرورت ہے اور نہ فرصت ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی بے بساطی اور مصروفیت کے باعث اس وقت بعض ایسے مسائل کی طرف بھی آپ حضرات کی توجہ منعطف نہ کرا سکا جن کی نسبت بعض صاحبان ذوق غور و خوض کر رہے ہیں مثلاً رسم الخط میں اصلاح لیتھو کی جگہ ٹائپ کا انتخاب ۔ اور زبان کی سلاست و سادگی وغیرہ ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اب تک جو کچھ سمع خراشی کی گئی ہے وہی ناگوار خاطر نہ ہوئی ہو ۔ لیکن اتنا یقین ہے کہ یہ صدا بہ صحرا ثابت نہ ہوگی اور اردو کے مسئلہ کو ہم سب اپنا ذاتی معاملہ سمجھیں گے ۔ اور جس طرح ہم اپنے ذاتی کام کو بہرصورت انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس امید میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہتے کہ دوسرے دست تعاون دراز کریں گے تو ہم بھی اٹھیں گے اسی طرح اردو کے کام کے لئے بھی ہم میں سے ہر ایک تن تنہا میدان عمل میں نکل آئے گا ۔ ہمیں اردو کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے ۔ اس لئے جس شخص سے جتنا بھی بن پڑے غنیمت ہے ۔ اُردو ہم سے صرف اتنا ہی چاہتی ہے ۔ وہ دنیا کی ان زبانوں میں سے ہے جن میں زندہ رہنے کی سکت ہوتی ہے ۔ اور جو تمام مخالفتوں اور مصیبتوں کا خود ہی اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے مقابلہ کر لیتی ہیں ۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اس کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور اپنی زندگی کو شگفتہ، تمدن کو پاکیزہ، اور قوم کو وسیع و مستحکم بنانے میں اپنی زبان کے مقبولِ عام اور ہمہ گیر اوصاف کو بطور حربہ استعمال کریں ۔ ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے اسلاف کے ورثہ میں ہمیں اردو کی صورت میں ایک ایسی عمدہ تلوار ملی ہے جس کے جوہر اتنے ہی زیادہ نمایاں ہوں گے جتنا زیادہ ہم اس کو استعمال کریں گے ۔ اگر ہم اس کو میان ہی میں پڑی رہنے دیں اور سمجھ لیں کہ یہ خود بخود ہماری تہذیب و تمدن بلکہ ہمارے قومی وجود کی حفاظت کے لئے اٹھے گی تو ہم سے بڑھ کر کم فہم اور غافل کوئی نہیں ہوسکتا ۔

سید محی الدین قادری زورؔ

فن تنقید

حضرت داغ کا ایک شعر ہے اور خوب شعر ہے۔

ان کے جلوے کے تو کیا کہنے مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

دنیا میں حسن بڑی چیز ہے لیکن حسن سے بڑی چیز اس کا دیکھنے والا ہے۔ اگر دیکھنے والا نہ ہو، پہچاننے والا نہ ہو، پرکھنے والا نہ ہو تو حسن کی چھچھا لیدا ہو جاتی ہے۔ ہندی کے ایک پرانے شاعر نے اس بات کو ایک دوسرے ڈھنگ سے کہا ہے۔

گن نہ ہِرانو گن گاہک ہِرانو ہے

یعنی گن خوبی یا حسن کبھی حیران نہیں ہوتا۔ حیران ہوتا ہے اس گن کا اس حسن کا گاہک اس کا سمجھنے والا اسے لینے والا اس کی قدر کرنے والا۔ کوئی خوبی خود اپنے اوپر تھوڑے ہی ریجھ سکتی ہے۔ حسن کے ناز و انداز اس کی تعریف کرنے والے کے ساتھ ہی شروع ہوتے ہیں۔ اگر آنکھ نہ ہوتی تو حسن گھاس کے ان ننھے اور نازک پھولوں کی طرح جو دھرتی کی چھاتی سے لپٹے رہتے ہیں بے حس راستہ چلنے والوں کے سخت اور بڑے پیروں سے کچل دیا جاتا اور جس طرح ان کچلے ہوئے پھولوں کی بدنصیبی پر کوئی ترس کھانے والا نہیں ہوتا اس طرح حسن کی بے قدری اور پامالی پر کوئی افسوس کرنے والا نہ ہوتا۔

ادب حسن ہے تنقید آنکھ۔ ادب گن ہے اور تنقید حیران گاہک جب تنقید میں آنکھیں پھوٹی ہوئی ہوں وہاں ادب کے نصیب پھوٹ جاتے ہیں۔ ادب ایک نازک سی چیز ہے اس لئے اگر تنقید میں نزاکت نہ ہو، لطافت نہ ہو تو نہ صرف اس میں ادب کے حسن کا جلوہ نمایاں نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک ایسا بے جوڑ پن آجاتا ہے جو بد مزگی پیدا کر دیتا ہے اس لئے ادب میں جتنی نزاکت ہوتی ہے تنقید میں بھی اتنی ہی نزاکت ہونی چاہیے۔

آپ جانتے ہیں کہ نازک چیز وہی ہوتی ہے جو ایک ذرا سی ہیر پھیر سے کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے جن لوگوں کی طبیعت نازک ہوتی ہے ان پر ذرا سی سردی اور ذرا سی گرمی بھی اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی۔ انگریزی میں کھانے کی عمدہ اشیاء کو (delicacies) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو کھانے کا لطف جانتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ ذرا سی کوئی چیز کم پڑ گئی یا زیادہ ہو گئی، آنچ ذرا کم دی گئی یا زیادہ پانی ذرا زیادہ پڑ گیا یا کم اسی طرح کہیں ذرا سی بھی لاپروائی ہو گئی تو چیز کا مزا بدل جاتا اور بگڑ جاتا ہے اس وجہ سے جو عمدہ پکانے کے ماہر ہیں کہا کرتے ہیں کہ باورچی خانہ میں چھوٹے بڑے کئی قسم کے ترازو لگائے جانے چاہئیں اور ایسی کوشش کی جانی چاہیے کہ سب چیزوں کی ٹھیک مقدار ڈالی جا سکے اور انھیں اس طرح پکایا جا سکے کہ ذرا سی بھی بے پروائی اور غلطی نہ ہو سکے۔ کیونکہ ذرا سی غلطی کا اثر مزے کو خراب کر دیتا ہے لیکن اس ذرا سی غلطی کو پہچانے گا کون؟ وہی کہ جس کا ذوق صحیح ہے۔ وہ نہیں جو پیٹو اور بہت کھانے والا ہے جس طرح غلطی ذرا سی ہوتی ہے اسی طرح لطف بھی ذرا سا ہوتا ہے۔ مگر اس ذرا سے لطف میں ہی تو لطف کا سارا مزا ہوتا ہے۔

ہماری زبانوں میں جو ادب کی تنقید کی جا رہی ہے اس میں اس ذرا سی چیز کو نظر انداز کر دیا جا رہا ہے جو تنقید کی جا رہی ہے

اس میں نزاکت اور لطافت نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا موٹا پن اور بھدا پن ہے۔ اسی وجہ سے ہم اپنے ادب کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتے۔ اگر تعریف شروع ہو جائے گی تو تعریف کے پل باندھ دیے جائیں گے اور اگر ملامت کی جائے گی تو پھر بیچارے شاعر یا مصنف کا کچومر ہی نکال دیا جائے گا۔

ہندی میں بہاری لال پر ایک تنقیدی کتاب لکھی گئی ہے جو بہت مشہور ہے۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بہاری لال کے جوڑ کا شاعر نہ پیدا ہوا ہے نہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہاری لال ہندی کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں لیکن ان کی تعریف کے یہ معنی نہیں ہونے چاہییں کہ ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ کوئی شاعر ان کے مقابلہ میں ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اس کتاب کے مصنف نے بہاری لال کی شاعری کا مقابلہ سنسکرت، ہندی اور اردو کے مشہور شاعروں کے کلام سے کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ کس طرح بہاری لال کی شاعری سب سے بہتر زیادہ لطیف اور پر لطف ہے۔ میں اس طرح کی تنقید کو ایک قسم کی ادبی گھوڑ دوڑ کہتا ہوں اس میں سب شاعروں کے گھوڑے کھڑے کر دیے جاتے ہیں اور جب گھوڑ دوڑ شروع ہوتی ہے تو بہاری لال کی شاعری کا گھوڑا سب سے آگے نکل جاتا ہے اور واہ واہ کی دھوم مچ جاتی ہے۔ یہی حال شاید آپ نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تصنیف میں ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

جن شاعروں یا مصنفین کی ملامت کی جاتی ہے، انہیں ہر طرح نالائق بیکار بودا اور فضول ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہتے ہیں "اجی انہیں کیا آتا ہے۔ ان کا کلام دو کوڑی کا نہیں ہے"۔ اس طرح بیچارے مصنف کو جتنا زیادہ سے زیادہ گرایا جا سکتا ہے گرایا جاتا ہے اور اس میں تنقید کی کامیابی سمجھی جاتی ہے۔ برعکس ادب کے آپ سائنس کے میدان میں دیکھیے کئی پرانے سائنس دانوں کے نظریئے غلط ثابت ہو جاتے ہیں انھیں کوئی جدید سائنس داں نہیں جانتا لیکن جب ان کی تنقید کی جاتی ہے تو انھیں کوئی بیکار یا بیوقوف نہیں کہتا۔ آج کل نیوٹن کا (Law of mass Gravitation) غلط ثابت ہو گیا ہے۔ لیکن کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ نیوٹن ایک بڑا سائنس داں نہیں تھا۔ کیا کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ وہ بیکار اور بیوقوف تھا۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد بھی کہ (Gravitation) کا نظریہ غلط ہے۔ نیوٹن کا ذکر اپنی جگہ پوری عزت اور تعریف کے ساتھ کیا جاتا ہے اور یہی سچی تنقید ہے۔

یہ سمجھنا کہ بڑے شاعروں سے کہیں غلطی نہیں ہوتی محض ایک غلطی ہے اور یہ سمجھنا کہ معمولی سے معمولی شاعر میں جسے شاعر کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے کوئی خوبی نہیں ہوتی اتنی ہی بڑی حماقت ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا دریا ہر جگہ گہرا نہیں ہوتا جنھوں نے کسی بڑے دریا میں جہاز میں بیٹھ کر سفر کیا ہے انھیں معلوم ہے کہ کئی مرتبہ جہاز یکایک رک جاتا ہے۔ سبب یہ ہوتا ہے کہ پانی اتنا تھوڑا ہوتا ہے کہ جہاز ایک دم رک جاتا ہے یا تو پانی کا سیلاب آ جانے تب ہی جہاز آگے بڑھ جاتا ہے۔ یا پھر مٹی کو کھود کر آس پاس کی جگہ کو اتنا گہرا کرنا پڑتا ہے کہ جہاز آگے گہرے پانی میں اتر سکے۔ لیکن ان اتھلے مقامات کے آ جانے کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دریا بڑا یا گہرا نہیں ہے۔

کوئی بھی بڑے سے بڑا دریا ہر جگہ یکساں گہرا نہیں ہو سکتا۔ یہی قدرتی بات بھی ہے اسی طرح ایک چھوٹا سا چشمہ جس میں ذرا سا پانی ہو اس لئے حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ وہ چھوٹا ہے چھوٹا ہونے پر بھی اس کا پانی اتنا میٹھا اور صحت بخش ہو سکتا ہے اور اس کا موقع محل ایسی جگہ ہو سکتا ہے جہاں کا نظارہ ایسا عظیم الشان ہو کہ وہاں دل و دماغ دونوں ہرے بھرے ہو جائیں۔ حقیقی بات تو یہ ہے کہ "چھوٹا بڑا" "لیبل" لگانا سچی تنقید نہیں ہے جس شاعر یا ادیب نے جو بھی اضافے کئے ہوں، ادب میں اس کا پتہ لگانا اس کی وجہ سے ادب میں جو نئی خوبیاں پیدا ہوگئیں جو نئے خیالات طرز بیان، نئے ترانے اور نئے ادبی معیار قائم ہو گئے اور زبان کی جو ترقی ہوئی اس قسم کی تمام باتوں کا ہر قسم کے حالات کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے مطالعہ کرنا ہی اصلی تنقید ہے۔ جس طرح تاریخ میں کسی واقعہ کو سمجھنے کے لئے چاروں طرف کے حالات کی پوری چھان بین کرنی پڑتی ہے، اس لئے ہر بڑے سے بڑا واقعہ حالات کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے، اسی طرح ادبی چیزوں کو بھی انسان کے بھی حالات پیدا کرتے ہیں انہی حالات میں ادب کو پیدا کرنے والے نتیج ہوتے ہیں۔ ادب کو صرف ایک خاص شخص کے دماغ کی اپج سمجھنا بہت محدود تنگ اور نقلی حالات میں رکھ کر دیکھنا ہے۔ اس سے صرف ادب کو ہی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ زبان کی ترقی کو بھی سخت نقصان پہنچا ہے۔ کوئی بھی زبان جو محاوروں میں الفاظ میں اور طرح طرح کے طرز ادا میں مالا مال ہوتی ہے ان میں یہ کون پتہ لگا سکتا ہے کہ فلاں محاورہ یا فلاں طریقہ ادا کس وجہ سے اور کس طرح رائج ہوا۔

ہر ایک سچا ادیب کسی نہ کسی طرح تھوڑا یا بہت اپنے ڈھنگ پر زبان کو مالا مال کرتا ہے لیکن اس چھوٹے بڑے کے امتیازی چکر میں ادیبوں کی زیادہ تر تعداد کو بھلا دیا جاتا ہے جس سے زبان کی ترقی کی بندھی ہوئی تاریخی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ کسی بھی زبان میں بہت سے گانے یا نظمیں ملیں گی جن کے متعلق یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا لکھنے والا کون ہے مگر وہ گانے اور نظمیں بڑے شوق سے پڑھی اور گائی جاتی ہیں۔

جب کچھ تھوڑے سے شاعر اور ادیب بھی کسی زبان کی کامل ترقی کے ٹھیکہ دار بنا دیے جاتے ہیں، تو زبان اور اس کا ادب محدود سا ہونے لگتا ہے۔ اس کی حرکت رک جاتی ہے اور وہ اپنے کو گھسی ہوئی طرز عمل میں دہرانے لگ جاتا ہے۔ صدیوں تک وہی قصے اور وہی کہانیاں الفاظ کے ہیر پھیر سے اتنی دہرائی جاتی ہیں کہ آہستہ آہستہ وہ بے جان سی ہو جاتی ہیں۔ ایسا نہیں کہ ان حالات میں بھی زبان میں جدت پیدا کرنے والے ادیب پیدا نہیں ہوتے لیکن ان کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زبان کی ترقی کی رفتار رک جاتی ہے۔

جب تک ادب کی تنقید چھوٹے بڑے کے تنگ اور غیر قدرتی حصے بنا کر کی جائے گی تب تک نہ صرف زبان و ادب کی بلکہ خود زبان کی بھی ترقی رک جائے گی جس طرح سمندر میں ہزاروں دریا آکر مل جاتے ہیں وہاں یہ تھوڑا ہی معلوم ہوتا ہے کہ کونسا دریا اس میں آکر مل گیا ہے وہاں تو سب ایک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کسی زبان کے ادب کے

سمندر میں سب ادیب شاعر ایک ہو جاتے ہیں وہاں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہیں ہو سکتا۔

اس لئے ادب میں جب تک تنقید صحیح اصولوں پر نہیں کی جائے گی زبان اپنی ترقی کا راستہ کھو بیٹھے گی۔ وہ زبان بڑی خوش نصیب ہے جسے اچھے ادیب اور اچھے نقاد میسر ہو جائیں۔ اگر ادیب زبان کے بنانے والے ہوتے ہیں تو نقاد زبان کی ترقی کے راستہ کو پہچاننے والے اور راستہ دکھانے والے ہوتے ہیں۔ ادب حسن ہے اور صحیح تنقید آنکھیں ہیں۔ اگر یہ آنکھیں نہ ہوں تو حسن بیکار ہو جاتا ہے اور اندھوں کا تماشا بن جاتا ہے۔

ونشی دھر ودیا النکار

غزل

کیا التفاتِ حسن کی جلوہ گری رہی
میری نظر سے ان کی نظر کھیلتی رہی

احساسِ غم رہا نہ تمیزِ خوشی رہی
کتنی جنوں نواز مری زندگی رہی

وہ پاس بھی رہے نظرِ خاص بھی رہی
سب کچھ ہوا، مگر خلش دل وہی رہی

ہر چند آفتاب نے گھونگٹ اٹھا دیا
مایوس دل کو پھر بھی تری لو لگی رہی

کہتے ہیں جس کو اہلِ نظر جانِ جستجو
سرخی مرے فسانۂ غم کی وہی رہی

غربت میں سب رفیق جدا ہو گئے مگر
ہر حال میں شریک مری بیکسی رہی

اٹھتی ہیں تیرے نام سے اب مجھ پہ انگلیاں
کہتے ہیں لوگ ان سے بڑی دوستی رہی

ہر لحظہ سکون تھا فانوسِ اضطراب
لیکن حیاتِ شوق سکوں ڈھونڈتی رہی

ان کے سوا سمجھ نہ سکا کوئی بزم میں
پہروں شکست دل کی صدا گونجتی رہی

بجلی کو لاگ میرے نشیمن سے تھی فقط
ہر شاخ ورنہ اپنی جگہ پر ہری رہی

سوزِ دروں نے پھونک دئے تھے دل و جگر
آنکھوں کے دم سے کشتِ محبت ہری رہی

نصاح مرو، اھد مالی

نئی کتابیں

۱ ۔ پیکر ایاں (افسانے) از محمد رحیم جمن دہلوی حجم ۱۰۷ صفحے قیمت عالی پتہ انڈیا بک ہاؤس ۔ عابد روڈ حیدر آباد دکن۔
۲ ۔ چاند کا گناہ (انگریزی افسانوں کا ترجمہ) دوسرا ایڈیشن از راجہ مہدی علیخاں قیمت ے ۔ انڈیا بک ہاؤس عابد روڈ
۳ ۔ دھڑکن (ناول) از شام سندر پرویز حجم ۱۹۲ صفحے قیمت عالی ۔ انڈیا بک ہاؤس ۔ عابد روڈ ۔ حیدر آباد دکن
۴ ۔ چٹان (افسانے) از اپندر ناتھ اشک حجم ۱۶۰ صفحے قیمت عسہ ۔ " " "
۵ ۔ ہندوستان کے زیر جنگ کے اثرات از محمد احمد خاں قیمت عہ ۸۰ صفحے ۔ " " "
۶ ۔ جنگ اور غذا کا مسئلہ از شفیق الرحمٰن ۴۴ صفحے قیمت ۱۲ " " " "
۷ ۔ فروزاں (مجموعۂ کلام) از معین احسن جذبی قیمت عہ ۔ مکتبہ اردو ۔ لاہور
۸ ۔ پردۂ سیمیں (افسانے) از ڈاکٹر محمد نصیر الدین " " "
۹ ۔ بکواس (مزاحیہ ناول) از شوکت تھانوی قیمت عالی ۔ اردو بک اسٹال ۔ بیرون لوہاری دروازہ ۔ لاہور
۱۰ ۔ اسکی کہانی از شام سندر پرویز قیمت عالی ۔ نرائن دت سہگل ۔ کتب فروش ۔ لاہور ۔
۱۱ ۔ نورونار (افسانہ) از شام سندر پرویز قیمت عالی ۔ " " " "
۱۲ ۔ سرخ سویرا (مجموعۂ کلام) از مخدوم محی الدین ۱۲۴ صفحے قیمت عہ ۔ دکن بک ڈپو ۔ عابد روڈ ۔ حیدر آباد دکن
۱۳ ۔ ہل اور تلوار بالتصویر (ہندوستانی فوج کی سماجی قوت) مرتبہ ادارۂ مطبوعات متحدہ ۔ پوسٹ بکس ۱۱۱۱ ۔ دہلی
۱۴ ۔ آبشار (ادب لطیف) از محمودہ رضویہ ۱۸۸ صفحے قیمت عالی ۔ انجمن ترقی اردو ۔ کراچی ۔
۱۵ ۔ ہست و بود (افسانے) " " ۲۰۶ " " عالی "
۱۶ ۔ تذکرۂ دار العلوم از نصیر الدین ہاشمی ۱۲۰ صفحے قیمت عہ ۔ ڈاکٹر حمید اللہ ۔ کٹلمنڈی ۔ حیدر آباد دکن
۱۷ ۔ اپنے خواب (افسانے) از سید کاظم علی ۲۰۰ " عالی ۔ رسالہ کہکشاں ۔ گلی شاہ تارا ۔ دہلی ۔
۱۸ ۔ دل کی باتیں (افسانے دوسرا ایڈیشن) از سید کاظم علی ۲۲۵ صفحے قیمت عالی ۔ رسالہ کہکشاں ۔ گلی شاہ تارا ۔ دہلی
۱۹ ۔ ناسور (افسانے) از اوپندر ناتھ اشک قیمت عالی ۔ ساقی بک ڈپو ۔ دہلی ۔
۲۰ ۔ جزیرے ۔ (افسانے) از محمد حسین عسکری " عالی ۔ " "
۲۱ ۔ فرعون (ناول) از فضل حق قریشی قیمت عہ ۔ " "
۲۲ ۔ نئے افسانے مرتبہ کرشن چندر ۔ قیمت ملعہ " " "
۲۳ ۔ دریچے (افسانے) از ظفر قریشی دہلوی قیمت عالی " "
۲۴ ۔ دھنک " از صادق الخیری قیمت عالی " "

مرزا سیف علیخاں

تنقید و تبصرہ

مشاہیر کے رومان ۔ از عبدالرحیم شبلی بی کام۔ قیمت عـا۔ حجم ۲۲۰ صفحے ملنے کا پتہ :۔ ادارۂ ادب جدید۔ شاہراہ عثمانی حیدرآباد

(۲۹) سنسنی خیز ادبی رومان کا دلنواز ترین مجموعہ۔ بادشاہ، ڈکٹیٹر، شہزادے اور سیاست دانوں کے دلچسپ رومان۔ دل بہلائی کا ایک بہترین سرمایہ۔ شبلی بی کام کی ایک کامیاب تصنیف ہے

اپنے خواب ۔ سید کاظم علی دہلوی ایڈیٹر کہکشاں دہلی کے ۱۲ طبع زاد افسانے۔ قیمت عـا۔ حجم ۱۹۹ صفحے۔ ملنے کا پتہ ۔ منیجر رسالہ کہکشاں گلی شاہ تارا۔ دہلی۔

صرف افسانے نہیں بلکہ جیون کے دھندلکے ہیں کہیں امیدوں کا جگمگاتا ہوا عکس، کہیں آس و نراس کی پرچھائیاں، ارمانوں کا جنازہ، تمناؤں کا خون، آرزوں کی پامالی، زندگی کی گھٹی گھٹی فضاؤں میں بھی زندگی کے مقاصد کا حل، غرض یہ رہی ان افسانوں کی تفصیل جن میں زندگی بولتی ہوئی، سنناتی ہوئی، تڑپتی ہوئی اپنے مراحل طے کرتی ہے اور پھر ختم ہو جاتی ہے بیان کی شستگی، روانی، انداز تخیل کی پاکیزگی ان افسانوں کی خصوصیت میں چار چاند لگا دیتی ہے۔

ایک چیز جو اکل ہے جو ڑسی ۔ ہے وہ ہمدرد دواخانہ دہلی کا اشتہار ہے جو افسانوں کے حجم میں دخل در معقولات بن کر کہیں کہیں حائل ہو گیا ہے۔ ان اشتہاروں کو کتاب کے خاتمہ پر بھی جگہ دی جا سکتی تھی۔

آبشار ۔ از محترمہ آنسہ محمودہ صاحبہ رضویہ۔ مدیرہ مجلہ ہندوستانی۔ انجمن ترقی اردو کراچی۔ حجم ۱۰۷ صفحے۔ قیمت عا (جو بہت زیادہ ہے) الکسو تخیلی چھوٹے چھوٹے مضامین کی ایک مالا ہے۔ یہ ٹیگور کے رنگ کا ادب لطیف فی زمانہ سازگار نہیں۔ اس وقت دنیا ایک ایسے دور سے گزر رہی ہے جس میں زندگی کی جدوجہد کے اسباب و علل، معاشرتی کارگر و مفید نسخے، یا اسی قسم کی گتھیوں کے سلجھاؤ کے مضامین، جینے اور سانس لینے کے ڈھنگ، سماج کی اصلاح، اس کی دکھتی رگ کو پکڑنے کے طریقے، کچھ ایسی سہولتوں کے تجربے جن کے بغیر زندگی دشوار ہو گئی ہے۔ کچھ اخلاقی کمزوریوں کی گرفت کی عکاسی، غرض یہ اور ایسے صدہا موضوع ہو سکتے ہیں جن سے زندگی بنتی، سنبھلتی اور پنپ سکتی ہے۔ زندگی محض تخیل کی جولانگاہ ہی نہیں۔

ہست و بود ۔ محترمہ متذکرۂ بالا کے ۱۶ افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عـا حجم ۲۰۵ صفحے۔ ان افسانوں میں زندگی کو سمجھنے اور اس کو ذرا قریب سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ان میں بھی ذرا اور جان پڑنے کی ضرورت ہے جس کا واحد ذریعہ مشاہیر کے ادبی کارناموں کا مطالعہ ہے۔ زندگی کو سمجھنے کا نام ہی شاید ادب ہے۔ افسانے اچھے ہیں۔ لیکن ان میں "بہت اچھے" ہونے کی بھی گنجائش ہے جس کے لئے محنت اور مطالعہ ضروری ہیں۔ خوب سے ہے خوب تر کہاں کے مصداق۔ "ج"

تذکرۂ دار العلوم از نصیر الدین ہاشمی حجم ۱۴۰ صفحے قیمت عـہ ۴ر پتہ ڈاکٹر حمید اللہ۔ کٹلمنڈی حیدرآباد دکن۔

زیر نظر کتاب مدرسہ دار العلوم کی نود سالہ سرگزشت ہے جو مدرسے کے جشن نود سالہ کے موقع پر لکھی گئی ہے۔ جناب مولف اس مدرسہ کے قدیم طالب علم ہیں۔ اس سرگزشت کو آپ نے بڑی قابلیت اور محنت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس میں اس مدرسہ کے مختلف ارتقائی دور بتائے گئے ہیں کہ کس طرح بتدریج اس نے ترقی کرتے کرتے کالج کی شکل اختیار کی۔

جنگ اور نوا کا مسئلہ از شفیق الرحمن (عثمانیہ) حجم ۶۴ صفحے قیمت ۲ر پتہ انڈین بک ہاؤس عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

غذا کے مسئلہ کی اہمیت اس وقت جیسی کچھ ہے وہ ظاہر ہے۔ آغاز جنگ ہی سے یہ مسئلہ نازک ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ جاپان سے جنگ شروع ہونے کے بعد اس نے جو خوفناک شکل اختیار کی اس کی نظیر بنگال کی تباہی اور عالمگیر پریشانی ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھانے کے لئے مولف نے اجناس کی پیداوار، جاپان کی جنگ میں شرکت اور اس کے اثرات، حکومت کی مشکلات، در آمد برآمد فوجی اغراض کے لئے خریداریاں، زیادہ غلہ اگاؤ کی مہم اور رسد بندی وغیرہ پر کافی روشنی ڈالی ہے اور سلیس زبان میں اس مسئلہ کو سمجھانے کی جو کوشش کی ہے اس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

ہندوستان کے زر پر جنگ کے اثرات از محمد احمد خاں (عثمانیہ) حجم ۹۰ صفحے قیمت عہ پتہ انڈیا بک ہاؤس، عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

افراط زر کے مسئلہ پر بڑی قابلیت کے ساتھ یہ مقالہ لکھا گیا ہے ہندوستان کے مرکزی بنک کا طریقہ بنک کاری اور شعبہ اجرائی زر کا مذی، جنگ سے قبل اور زمانہ جنگ میں ہندوستانی کرنسی کی حالت، دوران جنگ کے ہر سال میں ماہواری اعداد و شمار کے ساتھ زر کی مختلف شکلیں، افراط زر کے اسباب اور اس کے اثرات اور انسداد افراط زر وغیرہ جیسے اہم مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس وقت اس کتاب کے مطالعہ کی ہر شخص کو سخت ضرورت ہے۔ "س"

مداوا۔ از فرقت کاکوروی ناشر یوسفی پریس لکھنؤ۔

یہ چار سو سے زیادہ صفحات کا ایک ضخیم مجموعہ ہے جس میں ترقی پسند ادب کے متعلق مخالفانہ مضامین اور نظمیں شایع کی گئی ہیں۔ پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک پیش لفظ ہے جس کے بعد ترقی پسند ادب پر مزاحیہ مضمون شریک کئے گئے ہیں۔ مصنف نے مشہور ترقی پسند ادیبوں کی نظموں سے متاثر ہو کر خود بھی بہت سی نظمیں قلمبند کی ہیں جن کے ذریعہ سے آزاد نظموں کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں اردو کے متعدد ادیبوں اور شاعروں کے پیغامات اور نئے ادب کے خلاف مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ گویا اس طرح سے یہ ایک اجتماعی کوشش ہے جس کے ذریعہ سے ترقی پسند ادب کے خلاف ایک محاذ قائم کیا گیا ہے۔

اس مجموعۂ نظم و نثر کے مطالعہ سے ترقی پسند ادیبوں کے وہ افراد جو اس تحریک کو سنجیدگی اور خوش اسلوبی سے چلانا چاہتے ہیں بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ورنہ اندیشہ تھا کہ اپنی جماعت کی توسیع و ترقی کے تفاخر میں مست ہو کر وہ لوگ بھی صحیح راستے سے بھٹک جائیں۔

خانقاہ۔ از ایم اسلم۔ ناشر عبدالحق اکیڈیمی۔ حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب پنجاب کے مشہور افسانہ نگار ایم اسلم کے نو افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں اس مصنف کے عام طرز کے ایسے افسانے شریک ہیں جن میں زبان کی روانی اور واقعات کی ہم آہنگی پر خاص طور پر زور دیا جاتا ہے۔ ایم اسلم کے کردار روزمرہ زندگی سے بہت قریب ہوتے ہیں اور اس خصوص میں انھوں نے پریم چند کی اچھی تقلید کی ہے۔ لیکن پریم چند ایک درد آشنا دل رکھتے تھے اور ان کے افسانے سوز و گداز کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔ ایم اسلم ایک زندہ دل ادیب ہیں اور اسی لئے ان کے اسلوب اور مضامین میں شگفتگی اور بے پروائی پائی جاتی ہے۔ اس مجموعہ کے افسانوں کا بھی یہی رنگ ہے۔

مشرق بعید۔ از شاہد حسین رزاقی ناشر دار الاشاعت سیاست حیدرآباد دکن۔ موجودہ جنگ عظیم میں مشرق بعید کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی موجودہ جنگ میں اتحادین کو اس وقت صحیح معنوں میں کامیابی

حاصل ہوگی جب وہ مشرق بعید پر اپنا پورا تسلط قائم کرلیں گے۔
کیونکہ اس خطہ میں جاپان ان کا ایک ایسا حریف پیدا ہوگیا
ہے جس نے اچانک حملہ کرکے بساط جنگ کو اس طرح بدل ڈالا
کہ تمام دنیا کی نظریں اس وقت اسی علاقہ پر لگی ہوئی ہیں۔
کتاب بہت محنت اور تحقیق سے لکھی گئی ہے اور
اپنے موضوع پر اردو زبان میں پہلی مبسوط کتاب سمجھی جاسکتی ہے۔

خمارستان۔ از آغا شاعر دہلوی ناشر حالی پبلشنگ
ہاؤس دہلی۔

آغا شاعر مرزا داغ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے
ان کی طبیعت میں بلا کی جودت اور قلم میں بے انتہا روانی
تھی۔ اسی لئے ان کی شاعری کی طرح ان کی نثر بھی بے ساختگی
اور زندہ دلی کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ وہ خیال اور مضمون کی
گہرائیوں میں جانا ہی نہ چاہتے تھے اور جو کچھ زبان قلم پر
آتا بے تکلف ظاہر کردیتے تھے۔
اس مجموعے میں ان کے (۳۰) چھوٹے چھوٹے مضمون
ہیں جو اپنے دلچسپ اسلوب اور دہلی کی روزمرہ کی زبان کے
باعث دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

اسٹالن۔ از محمد آصف علی ناشر مکتبۂ جامعہ دہلی۔

یہ اصل میں اسٹیفن گراہم کی مشہور کتاب کا اردو
ترجمہ ہے جو ایک مشہور کانگریسی لیڈر محمد آصف علی بیرسٹر
کا نتیجۂ قلم ہے۔ ابتدا میں قابل مترجم نے ایک طویل مقدمہ
تحریر کیا ہے جو بجائے خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے اس
میں مصنف نے روس کے انقلاب اور اس کے اثرات پر
نہایت خوبی اور سنجیدگی کے ساتھ نظر ڈالی ہے۔ جو لوگ
اشتراکیت سے متعلق صحیح اور جدید ترین معلومات حاصل
کرنا چاہتے ہیں وہ اس مقدمہ سے خاص طور پر استفادہ
کرسکیں گے۔ اصل کتاب صفحہ ۲۰ سے شروع ہوتی ہے اس
میں اٹھائیس ابواب کے تحت روس کے اس عظیم الشان
قائد کے تفصیلی حالات اور کارنامے درج کئے گئے ہیں۔
اس کی اشاعت سے اردو سوانح عمریوں میں ایک بیش بہا
اضافہ ہوا جس کے لئے مکتبۂ جامعہ قابل مبارکباد ہے۔

گدھوں میں بیداری۔ از سید ابوتمیم فریدآبادی
ناشر بک ڈپو انجمن ترقی اردو۔ دہلی۔

یہ چھوٹی سے کتاب بارہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ
ہے۔ اس صنف ادب کو عہد حاضر میں بڑی مقبولیت حاصل
ہوتی جارہی ہے اس لئے کہ بعض اچھے ادیبوں نے
مذاق کے پیرایہ میں کام کی باتیں بڑی کامیابی سے بیان
کی ہیں۔ اس مجموعہ میں بھی ایسی ہی کوشش کی گئی ہے
لیکن اس کی اصل خوبی اس کی زبان اور مکالموں کی
روانی اور برجستگی میں نمایاں ہے۔ مزاح نگاری جتنی
آسان ہے اتنی ہی مشکل بھی ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ اردو
کے نوجوان اہل قلم اس کے کسی آسان پہلو کے پیش نظر اس
راہ میں بھٹک نہ جائیں۔

قدرت کے کرشمے۔ مرتبہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔ اس چھوٹی
سی کتاب میں ہوا۔ بادل اور
بجلی کے علاوہ چشموں۔ ٹوٹنے والے تاروں۔ اور آتش فشاں
پہاڑوں پر بچوں اور معمولی استعداد کے لوگوں کے لئے
نہایت مفید اور دلچسپ مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ یہ تمام
مضامین اصل میں رسالہ پیام تعلیم میں شائع ہوئے تھے۔
یہ کتاب بالتصویر ہے۔ اور اس قابل کہ بچوں اور ان بالغوں کو پڑھنے
کے لئے دی جائے جو تعلیم سے نئے نئے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

"ق"

ادارے کی خبریں

مجلس انتظامی ادارۂ ادبیات اُردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس چہارشنبہ ۸ خورداد ۱۳۵۳ف مطابق ۲ اپریل ۱۹۴۴ء شام کے ساڑھے چھے بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی:۔

نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات و باب حکومت سرکار عالی
نواب زین یار جنگ بہادر چیف آرکٹکٹ سرکار عالی
مولوی سید محمد اعظم صاحب ناظم تعلیمات سرکار عالی
مولوی سید علی اکبر صاحب پرنسپل نظام کالج
مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ۔ معتمد

نواب لیاقت جنگ بہادر کے تشریف نہ لانے کی وجہ سے نواب معین نواز جنگ بہادر نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔
مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی نے بوجہ معروفیت بذریعہ ٹیلی فون شرکت سے معذرت چاہتی۔

گزشتہ اجلاس کی روئداد پڑھ کر سنائی گئی اور اس کی توثیق عمل میں آئی۔

معتمد ادارہ نے واضح کیا کہ گزشتہ مجلس انتظامی کے تصفیہ کے مطابق مجلس انتظامی کے ایک وفد نے جس میں نواب زین یار جنگ بہادر۔ مولوی سید علی اکبر صاحب اور معتمد ادارہ شامل تھے عالی جناب سر صدر اعظم بہادر سے ملاقات کی اس موقع پر نواب معین نواز جنگ بہادر بھی تشریف فرما تھے۔ وفد کی خواہش پر سر صدر اعظم بہادر نے اردو کانفرنس کی سرپرستی کرنے اور ایک اجلاس میں شرکت کی استدعا کو قبول فرمایا ہے اور ڈھائی ہزار روپے کا عطیہ بھی اس کام میں دینے کا وعدہ فرمایا۔ نیز مجلس استقبالیہ وغیرہ کی ترتیب کے بارے میں جو ہدایتیں کی ہیں ان کو روبہ عمل لانے اور دیگر انتظامی امور کے تصفیہ کے لئے یہ اجلاس منعقد ہوا ہے۔

نواب معین نواز جنگ بہادر اور نواب زین یار جنگ بہادر نے بھی ان امور کی مزید وضاحت فرمائی۔ جس کے بعد معتمد نے کانفرنس کے قواعد کا مسودہ بغرض منظوری پڑھ کر سنایا۔ جو کافی غور و خوض کے بعد بعد ترمیم منظور کیا گیا۔

نواب زین یار جنگ بہادر کی تحریک پر ارباب اُردو کے اس اجتماع کا نام آل انڈیا اُردو کانگریس تجویز کیا گیا۔

طے پایا کہ ہز اکسلنسی سر صدر اعظم بہادر اس کانگریس کے سرپرست اعلیٰ رہیں گے اور حسب ذیل اصحاب کو اس کے سرپرست بننے کی دعوت دی جائے۔۔
نواب سالار جنگ بہادر، نواب ظہیر یار جنگ بہادر، راجہ دھرم کرن بہادر، خان بہادر احمد نواز جنگ (احمد علاء الدین) مولوی میر لائق علی صاحب قائد ملت نواب محمد بہادر خاں صاحب، پنڈت سری پت راؤ صاحب

مجلس استقبالیہ کے صدر آنریبل ڈاکٹر نواب سر مہدی یار جنگ بہادر صدر ادارہ رہیں گے۔

کانگریس کے ۱۹۴۴ء و ۱۹۴۵ء کی مجلس عاملہ کے لئے معتمد نے جو نام پیش کئے تھے ان کی منظوری دی گئی۔

طے پایا کہ مجلس استقبالیہ کا چندۂ رکنیت پانچ روپے اور عام رکنیت کانگریس کا چندہ ایک روپیہ مقرر کیا جائے۔

کانگریس کے انعقاد کے لئے مقامی مجلس استقبالیہ کا حسب ذیل انتخاب کیا گیا۔

صدر۔ نواب زین یار جنگ بہادر چیف آرکٹکٹ سرکار عالی

معتمد۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ
نائب معتمدین۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
مولوی بادشاہ حسین صاحب
ارکان ۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی
نواب دوست محمد خاں صاحب جاگیردار
مولوی میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر
قاضی محمد عبدالغفار صاحب مدیر پیام
مولوی عبدالواحد صاحب ناظم جنگلات
پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی
کرنل نذیر الاسلام خاں صاحب
رائے ہربنس چند صاحب ناظم بلدیہ
مولوی ابوالحسن سید علی صاحب ایڈوکیٹ
مولوی فرحت اللہ بیگ صاحب
ڈاکٹر سید حسین صاحب مسجل جامعہ عثمانیہ
مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی
مولوی سید محمد صاحب ایم اے

طے پایا کہ یہ اُردو کانگرس ۱۴ تا ۱۶ یا ۲۸ تا ۳۰ جون (ترجیحاً) کی تاریخوں میں منعقد کی جائے۔

مجلس مشاورت تاریخ دکن کانفرنس تاریخ دکن کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں ایک مجلس مشاورت بہ صدارت عالی جناب نواب علی یاور جنگ بہادر ایم اے (آکسن) ۳۰ راپریل شام کے پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوئی جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

مولوی غلام یزدانی صاحب ایم اے۔ او بی ای
پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی ایم اے۔ بیرسٹر اٹ لا
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایم اے پی ایچ ڈی
ڈاکٹر یوسف حسین خاں بی اے۔ ڈی لٹ۔
مولوی خواجہ محمد احمد صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی
مولوی میر محمود علی صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی
مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی
مولوی علی اصغر صاحب بلگرامی صوبہ دار اورنگ آباد

پروفیسر ہنمنت راؤ صاحب نظام کالج اور پنڈت آر۔ ایم۔ جوشی ایم اے۔ مہتمم آثار قدیمہ بیدر نے بذریعہ تحریر شہر میں موجود نہ ہونے کی بنا پر شرکت سے معذرت چاہی۔

ابتدا میں جناب صدر نواب علی یاور جنگ بہادر نے اس جلسہ کے مقاصد و اغراض کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس قسم کی کانفرنس کا انعقاد ضروری ہے۔ اور اس کی افادیت میں اضافہ کرنے اور اس کو معیاری بنانے کے لئے بیرون حیدرآباد سے تاریخ دکن پر کام کرنے والے اصحاب کو نشستوں کی صدارت اور مقالے پڑھنے کے لئے مدعو کیا جائے۔ نیز مقامی طور پر جو انجمنیں تاریخ دکن کا کام کر رہی ہیں ان کا اشتراک عمل حاصل کرنا بھی مناسب ہے۔ نیز اس کانفرنس کو معیاری اور مفید بنانے کی خاطر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کو قریبی تاریخوں میں منعقد نہ کیا جائے بلکہ اس کی تیاری میں کافی وقت لیا جائے۔

اپنی افتتاحی تقریر کے بعد جناب صدر نے حاضرین کو فرداً فرداً اپنے خیالات ظاہر کرنے کا موقع دیا۔

کافی غور و خوص اور بحث و تمحیص کے بعد متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ تاریخ دکن کانفرنس کا انعقاد ضروری ہے اور اس کو فروری ۱۹۴۵ء کے پہلے ہفتہ میں منعقد کیا جائے اور حسب ذیل ادارہ جات کو اشتراک عمل کے لئے مدعو کیا جائے۔

(۱) انجمن تاریخ و اثریات حیدرآباد

(۲) جامعۂ عثمانیہ

(۳) دفتر دیوانی و مال و ملکی سرکار عالی

(۴) محکمۂ آثار قدیمہ سرکار عالی

(۵) بزم تاریخ جامعۂ عثمانیہ

(۶) بزم تاریخ نظام کالج حیدرآباد

دعوت نامے کا مضمون حسب ذیل ہو :-

"شعبۂ تاریخ ادارۂ ادبیات اُردو کا خیال ہے کہ تاریخ دکن کی ایک کانفرنس ہر دو سال میں منعقد ہو چونکہ حیدرآباد میں اور بھی انجمنیں ہیں جو تاریخ دکن کا کام انجام دے رہی ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان سب کو اشتراک عمل کی دعوت دی جائے۔ تاکہ کانفرنس کے انعقاد کے متعلق تفصیلی امور طے پائیں اور کانفرنس کی تنظیم کے لئے ایک مشترکہ کمیٹی قائم ہو۔ پہلی کانفرنس ماہ فروری ۱۹۴۵ء میں منعقد ہوگی اور آپ کی انجمن کا بھی اس کام میں تعاون مفید ہوگا۔ اس لئے استدعا کی جاتی ہے کہ اس دعوت کو قبول فرما کر اس مجلس منتظمہ کے لئے اپنا ایک نمائندہ روانہ فرمائیں۔

اس مشترکہ مجلس منتظمہ کا اجلاس جولائی کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوگا۔ جس کا دعوت نامہ بعد میں ارسال خدمت ہوگا"

شاخ ایوت محل برار | ادارۂ ادبیات اُردو شاخ ایوت محل کی سالانہ کارگزاریوں کی مختصر روئداد درج ذیل ہے:-

شاخ کے قیام کے ڈیڑھ ماہ بعد دارالمطالعہ کا قیام عمل میں آیا جس میں مندرجۂ ذیل اخبارات و رسائل باقاعدہ آتے رہتے ہیں۔

(الف) روزنامۂ خلافت، ہفتہ وار اخبار "الفاروق" کامٹی۔ ہفتہ وار اخبار "البرہان" اکولہ "سب رس" حیدرآباد۔ "پھول کا سب رس" حیدرآباد۔ "تنویر" بمبئی "عالمگیر" لاہور۔ "ہمایوں" لاہور۔ ادارہ کی مالی حالت میں اضافہ ہونے پر اور اخبارات و رسائل منگائے جاسکیں گے۔

(ب) تین مرتبہ مجلس مباحثہ زیر اہتمام ادارۂ ادبیات اُردو شاخ ایوت محل منعقد ہوئی جس کی صدارت مولوی بشیر احمد صاحب بی اے۔ شہید ملکاپوری (حال مقیم ایوت محل) فرماتے رہے۔

بحث کے موضوعات :۔ تعلیم نسواں فی زمانہ ازبس ضروری ہے۔

موجودہ جنگ سے مستقبل میں امن و امان ہوگا۔

سائنس کی جدید ترقی تہذیب قدیم کی دشمن ہے۔

(ج) بتاریخ ۱۴ رمئی ۱۹۴۴ء کو ایوت محل میں ادارۂ مذکور کے اہتمام سے آل برار مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے جس کی صدارت پروفیسر منظور حسین ایم اے شور ناگپور نے منظور فرمالی ہے۔

مصرعہائے طرح و صر (۱) نقاب رخ اٹھایا جارہا ہے

(۲) لہو دل کا تبسم میں نمایاں ہوتا جاتا ہے۔

(۳) موج نے پھینکا تو ٹکرا جائیں گے ساحل سے ہم

(۴) "دور حاضر" عنوان برائے نظم

ادارہ کے دارالمطالعہ، مجالس مباحثہ اور دیگر ادبی سرگرمیوں میں مولوی بشیر احمد صاحب شہید بی اے جو فوقانیہ جماعتوں کو اُردو و فارسی کی تعلیم دیتے ہیں سب سے زیادہ دلچسپی لیتے رہتے ہیں اور ادارہ کی روح رواں ہیں۔

خلیل الرحمٰن معتمد اعزازی

جلسۂ تقسیم اسناد شاخ نظام آباد | بتاریخ ۱۱ رخورداد ۱۳۵۳ف بوقت ۶ تا ۹ ساعت شام جلسۂ تقسیم اسناد و تمغہ جات بصدارت عالی جناب مولوی غلام حیدر صاحب اول تعلقدار ضلع ہذا بمقام ٹاؤن ہال منعقد ہوا۔ معزز حکام مقامی و اصحاب ذوق ادب و دیگر خواتین وغیرہ سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حمد و نعت کے بعد جلسہ کی کارروائی کو مولوی غلام احمد صاحب وکیل کاشانہ نے

آغاز فرمایا اور تحریک صدارت پیش کی جس کی تائید مولوی محمود عالم حسینی سالک نائب معتمد ادارہ نے فرمائی ۔ من بعد تفصیلی رپورٹ سالانہ مولوی محمد حسین خاں معتمد ادارہ نے سنائی اور اسی وقت جدید اراکین عاملہ و انتظامی کی توثیق حاصل کی گئی ۔ جناب مولوی محمد داؤد حسین صاحب وکیل نے ایک پُر از معلومات تقریر سے حاضرین کو محظوظ فرمایا اور جناب عابد صاحب نے اُردو پر ایک مختصر اور نہایت جامع تقریر فرمائی ۔ زاں بعد جناب صدر جلسہ نے تمغہ جات اور اسناد کی تقسیم فرمائی ۔ اور اپنی پُر مغز تقریر صدارت میں ادارہ کے امید افزا نتائج خصوصاً معتمد صاحب کی حسن کارگزاری پر مسرت کا اظہار فرمایا ۔ اس کے بعد بزم مشاعرہ منعقد ہوئی ۔ جس میں مقامی شعرا خصوصاً جناب حامد صاحب مددگار مال اور جناب ہادی و ساحر و ذبیح رضی و سالک و رزمی و عابد وغیرہ نے اپنا اپنا کلام سنا کر معزز حاضرین سے خراج تحسین حاصل کیا اور جلسہ کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا ۔

شاخ کیل بتاریخ ۱۴ اردی بہشت ۱۳۵۱ف بصدارت مولوی سید مصطفےٰ حسین صاحب ایم اے (علیگ) صدر ادارہ مجلس عاملہ کا ایک جلسہ بہ مکان جناب مولوی محمد رحمت اللہ صاحب ایم اے ۔ ایل ایل بی منصف طلب کیا گیا اور حسب ذیل حضرات نے شرکت فرمائی : —

۱ ۔ جناب محمد رحمت اللہ صاحب ایم اے ۔ ایل ایل بی منصف (نائب صدر ادارہ)

۲ ۔ جناب سید ممتاز علی صاحب وارثی بی اے ۔ رکن عاملہ

۳ ۔ جناب حمید الدین صاحب بی ایس سی ۔ بی ٹی ۔ اول مددگار رکن عاملہ

۴ ۔ جناب سید فیض علی صاحب مولوی کامل مددگار مدرس ۔ شریک معتمد

۵ ۔ جناب محمد حسین صاحب ۔ مددگار مدرس وظیفہ یاب رکن عاملہ

مندرجۂ ذیل امور بہ اتفاق آرا طے پائے : —

(۱) رجسٹرات ذیل فوری تیار کرلئے جائیں ۔

(۱) رجسٹر روئداد کمیٹی (۲) رجسٹر کارگزاری (۳) رجسٹر اسمائے اراکین معہ صراحت چندہ وعطایا (۴) رجسٹر شرکا و امتحانات

(۲) وصولی چندہ کے لئے یہ طے پایا کہ ایک وفد جو مندرجۂ ذیل اصحاب پر مشتمل ہوگا زیر قیادت جناب سید ممتاز علی صاحب وارثی سررشتہ دار کروڑگیری ۔ اراکین کے یہاں جاکر چندہ وصول کرے وفد خورداد کے پہلے ہفتہ میں اپنا کام شروع کردے ۔

اراکین وفد : —

۱ ۔ جناب سید ممتاز علی صاحب سررشتہ دار کروڑگیری

۲ ۔ جناب محمد اختر علی صاحب مددگار مدرس

۳ ۔ جناب سی راگھویندر راؤ صاحب وکیل

۴ ۔ جناب اگرٹی ایرنا صاحب ساہو ۔

(۳) شرکا کی تعلیم کے لئے جناب سنگپا صاحب ساہو کا بنگلہ متصل عمارت مدرسہ فوقانیہ منتخب کیا گیا اس ضمن میں جناب محمد رحمت اللہ صاحب منصف نے ساہو مذکور سے سفارش فرمانے کا وعدہ فرمایا اوقات تعلیم ۸ تا ۱۰ شب ہوں گے ۔ ادارہ جناب منصف صاحب کی اس سعی کا بدل مشکور ہے ۔

(۴) ہر سررشتہ کے متعلقہ عہدہ دار صاحبین سے یہ استدعا کی جائے کہ وہ اپنے اپنے محکمہ جات سے ماتحتین کو ترغیب دلاکر ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات میں شریک کرائیں چنانچہ جناب محمد رحمت اللہ صاحب ایم اے ۔ ایل ایل بی منصف و جناب سید ممتاز علی صاحب وارثی سررشتہ دار کروڑگیری نے اس قسم کی فہرست شرکا کے ناموں کی اپنے اپنے محکمہ جات سے روانہ فرمانے کا وعدہ فرمایا ۔ یکم خورداد سے قبل ہی اس قسم کی فہرستیں دیگر محکمہ جات سے بھی حاصل کرلی جائیں ۔

(۵) حسب ذیل حضرات نے رضاکارانہ طور پر شرکا کی تعلیم کے لئے

اپنی خدمات پیش کیں جس کے لئے ادارہ مشکور ہے۔

۱۔ جناب محمد حسین صاحب وظیفہ یاب مدرس (مستقل طور پر وقت دیں گے)

۲۔ جناب محمد اختر حسین صاحب مددگار مدرس (" " ")

۳۔ جناب محمد فیض علی صاحب شریک معتمد ادارہ (" " ")

۴۔ جناب محمد مصطفےٰ حسین صاحب ایم اے۔ صدر ادارہ (فرصت کے اوقات میں)

۵۔ جناب محمد رحمت اللہ صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی منصف (" " ")

۶۔ جناب محمد حمید الدین صاحب بی ایس سی۔ بی ٹی (" " ")

۷۔ جناب سید ممتاز علی صاحب وارثی سررشتہ دار کروڑگیری (" " ")

(۶) ایک دارالمطالعہ عام قائم کیا جائے اور اس غرض کے لئے جناب سنگپا صاحب ساہو کا بنگلہ منتخب کیا گیا۔ اور جن حضرات کے پاس اخبارات و رسائل آتے ہوں ان سے دارالمطالعہ کے لئے اخبارات و رسائل حاصل کرلئے جائیں اور سب رسالہ جات و اخبارات معتمد صاحب ادارہ کے یہاں ان ہی کی نگرانی میں رکھے جائیں۔ اسی ضمن میں جناب محمد حسن الزماں صاحب وکیل ہائی کورٹ نے رہبر دکن (۲) اقبال ہفت روزہ (۳) مملکت ہفت روزہ (۴) کامیاب ماہانہ۔ دارالمطالعہ کے لئے دینے کا وعدہ فرمایا جس کے لئے ادارہ صاحب موصوف کا ممنون ہے۔

(۷) ادارہ کے کاروبار کی انجام دہی کے لئے ایک ملازم رکھ لیا جائے جس کی تنخواہ زیادہ سے زیادہ سات روپے کلدار ہو۔

(۸) فی الوقت تیاری رجسٹرات وغیرہ کے لئے مبلغ (عـــہ) روپے جمع شدہ جناب سی راگھویندر راؤ صاحب وکیل اگڑی ایرنا صاحب سے حاصل کرکے صرف کئے جائیں۔

شاخ پرینڈہ | بتاریخ ۹ ارخورداد ۱۳۵۳ف ادارۂ ادبیات اردو تعلقہ پرینڈہ کا جلسۂ عام بغرض انتخابات سال ۱۳۵۳ف منعقد ہوا جس میں علاوہ اراکان و عہدہ داران ادارہ کے مستقر کے معززین دیہی خواہان اردو شریک تھے بالاتفاق آرا

سال حال کے لئے حسب ذیل عہدہ داران و ارکان کا انتخاب عمل میں آیا:۔

(۱) مولوی محمد رحمت اللہ خاں صاحب۔ صدر۔ (۲) سید غلام علی صاحب۔ معتمد

(۳) مولوی محمد یونس صاحب۔ رکن۔ (۴) مولوی محمد بدرالدین صاحب۔ رکن

(۵) مولوی محمد وزیر صاحب۔ رکن (۶) مولوی سید شاہ ظہیر ہاشمی صاحب۔ "

جلسۂ تقسیم اسناد و عطائے تمغہ جات شاخ ویجاپور | بتاریخ ۲ ارخورداد ۱۳۵۳ف یوم جمعہ بمقام ویجاپور بصدارت عالی جناب مولوی محمد غلام مصطفےٰ صاحب اول تعلقدار ضلع اورنگ آباد منعقد ہوا۔

مولوی سید شاہ نصیرالدین احمد صاحب نہری جاگیردار و منصف ویجاپور نے نہایت جامع الفاظ میں ادارۂ ادبیات اُردو کے واقعات اور ترقی و بزرگان دین کی مثال کہ زمانۂ ماضیہ میں جس کسر نفسی اور عرق ریزی سے کوشش کی گئی اوسی کی پیروی کی جارہی ہے اور صدارت کے لئے عالی جناب مولوی محمد غلام مصطفےٰ صاحب اول تعلقدار کو جو بہ تقریب دورہ تشریف فرما تھے توجہ دلائی اور خواہش ظاہر کی گئی جس کی تائید مولوی غلام محمود صاحب وکیل نے کی۔ جناب صدر کے کرسی صدارت پر تشریف لانے کے بعد میر حسن علی صاحب صدر شاخ ادارۂ ادبیات اُردو نے روئداد پڑھ کر سنائی جس کی نقل منسلک ہے۔

نظم اُردو کی راج دہانی از محترمہ بشیر النسا بیگم صاحبہ۔ سالم صاحب دوم کارکن کروڑگیری نے خوش الحانی سے پڑھی۔

"بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو اٹھو اہل وطن کے دوست بنو"

بی زیب النسا بیگم صاحبہ نہری کم عمر دختر جناب منصف صاحب نے ادا کے ساتھ سنائی۔

نظم دکن کے فن کار سے از محترمہ بشیر النسا بیگم صاحبہ۔ محمد علی صاحب اول کارکن کروڑگیری نے ترنم سے سنائی۔

دعا۔ روح اقبال اے میرے بندہ نواز دے۔ مولوی فیاض الدین صاحب

نے پُرزور لہجہ میں پڑھ کر جلسہ کو محظوظ کیا۔ جناب مولوی سید عارف الدین حسین صاحب دوم تعلقدار رفیق ادارہ نے ادارہ کے حالات بیان فرما کر آئندہ مزید ترقی کی تمنا ظاہر کرتے ہوئے تقسیم اسناد و تمغہ جات کے لئے جناب صدر صاحب سے درخواست کی ۔

جناب صدر صاحب نے فرداً فرداً ہر ایک کامیاب امیدوار امتحان کو سند اپنے دست مبارک سے دی اور جو مرکز کے امتحانات اردو عالم وغیرہ میں اول آئے تھے انھیں تمغہ جات عطا فرمائے ۔

اس کے بعد مولوی عیسیٰ خاں صاحب وکیل رکن ادارۂ ادبیات اُردو نے ادارہ اور اس کے واقعات اور آئندہ ترقی کے لئے وسیع معلومات سے آشنا کرتے ہوئے دلپذیر تقریر کی ۔

جن شرکا و امتحان کو اسناد اور تمغہ جات عطا کئے گئے ان کی جانب سے مسٹر گنگا دھر راؤ نے ادارہ کو مفید تبلاتے ہوئے سرپرستان اور کارکنان ادارہ کا شکریہ ادا کیا ۔

جناب صدر صاحب نے اردو زبان کے متعلق فرمایا کہ یہ سب کی عام مقبول زبان ہے اس میں متفقہ کوشش کرنی چاہئیے میں بھی امداد دینے تیار ہوں ۔ نہایت محبت بھرے لہجہ میں حاضرین جلسہ کو متوجہ کرکے ترغیب اور جوش دلایا ۔

سالم صاحب نے ترانہ میں ملک اور مالک کے لئے دعا مانگی ۔

نارائن راؤ صاحب وکیل رکن ادارہ نے حاضرین جلسہ اور جناب صدر صاحب کا شکریہ ادا کیا ۔ بعد ازاں صدر صاحب نے جلسہ کے برخاست کا اعلان کیا ۔

کارگزاری شاخ ویجاپور | جو جلسۂ تقسیم اسناد میں ۷ ار خورداد ۱۳۵۳ف کو بصدارت عالی جناب مولوی محمد غلام مصطفےٰ صاحب اول تعلقدار بمقام ویجاپور پڑھی گئی ۔

محترم صدر و معزز حاضرین !

ادارۂ ادبیات اردو شاخ ویجاپور کا قیام بتاریخ ۸ ار تیر ۱۳۵۲ف جناب مولوی سید عارف الدین حسن صاحب دوم تعلقدار ڈویژن ضلع اورنگ آباد کی جد و جہد اور دست مبارک سے ہوا ہے۔ اس کے سرپرست مولوی سید شاہ نصیر الدین احمد صاحب نہری جاگیردار و منصف ویجاپور اور مسٹر سیتا رام بی اے۔ ایل ایل بی تحصیلدار ہیں۔ تحصیلدار صاحب کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ جناب منصف صاحب نے شرکت امیدواران و فراہمی اساتذہ و درس تعلیم میں بے حد دلچسپی و سعی و تبلیغ سے کام لیا۔ مولوی عیسیٰ خاں صاحب وکیل نے جو اس ادارہ کے نائب صدر ہیں ہر کٹھن وقت پر امداد فرمائی۔ اس کے معتمد نارائن راؤ صاحب نقدی نویس ہیں انہیں اپنے ادائی فرائض میں کم موقع ملا۔ با ایں ہمہ بوقت فرصت امداد میں دریغ نہ فرمایا۔ منجملہ اراکین کے مولوی غلام محمود صاحب وکیل نے شرکا اردو عالم کو روزانہ پابندی سے کافی تعلیم دیکر امتحان کے لئے تیار فرمایا ۔

یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مولوی سید عارف الدین حسن صاحب دوم تعلقدار نے غریب شرکا ادارۂ ادبیات اُردو کی نہ صرف دل افزائی فرمائی بلکہ فیس امتحان مبلغ عہ روپے بزم زنداں شاخ اورنگ آباد سے اعانت فرماکر دستگیری کی۔ اور نصابی کتب بھی مفت دے کر شوق بڑھایا ۔

شاخ ویجاپور سے امتحان اُردو عالم میں (۱۶) اردو زباندانی میں (۱۷) اردو دانی میں (۱۶) اور خوش نویسی میں ایک اور ایک امیدوار مرکز اورنگ آباد سے مرکز امتحان ویجاپور منتقل ہو جانے سے جملہ تعداد شرکاء امتحان (۵۱) ہو گئی ۔ شرکاء امتحان کو مولوی غلام محمود صاحب وکیل کے سوا ۔ مولوی محمد ہاشم صاحب وکیل ۔ مسٹر رنچھوڑ داس وکیل ۔ پنڈت کھنڈے راؤ صاحب مدرس ۔ مولوی محمد امین خاں صاحب مدرس مولوی نور محی الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ

مولوی شیخ احمد صاحب مدرس۔ مولوی کریم خاں صاحب وظیفہ یاب مدرس وصدر معلمہ صاحبہ مدرسۂ نسوان ویجاپور۔ نیز مولوی محمد عبدالکریم صاحب سررشتہ دار عدالت نے بھی نہایت توجہ کے ساتھ مختلف کتب کا درس دیا ہے۔ مولوی انوار اللہ صاحب بی اے۔ بی ٹی صدر مدرس مدرسۂ وسطانیہ ویجاپور نے امتحان گاہ کے لئے مدرسہ کے مکان کی اجازت دی۔ موجودگی فرش و فرنیچر کی وجہ سے بے حد سہولت ہوئی۔ جناب منصف صاحب ویجاپور سرپرست ادارہ نے امتحان گاہ میں شرکا، امتحان کی نشست و انتظام میں غیر معمولی طور پر حصہ لیا۔ اور مولوی ببر علی صاحب ڈرائنگ ماسٹر نے صاحب ممدوح کے کام میں ہاتھ بٹایا۔ جناب مولوی عیسیٰ خاں صاحب مولوی قاضی امیرالدین صاحب، مولوی محمد ہاشم صاحب وکلاء عدالت مولوی احمد محی الدین صاحب سب رجسٹرار اور محترمہ بیگم صاحبہ منصف صاحب و جناب صدر معلمہ صاحبہ اور جناب بیگم صاحبہ مولوی عیسیٰ خاں صاحب وکیل و مولوی احمد محی الدین صاحب سب رجسٹرار نے اپنا قیمتی عزیز وقت نگرانی امتحان گاہ میں صرف فرمایا۔ ادارہ ان سب صاحبان محترم اور بیگمات مکرمہ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے۔

قابل احترام ہیں وہ ہستیاں جو بلا معاوضہ ہمدردئی بنی نوع انسان کی خاطر زحمت گوارا فرما کر ترقی تعلیم میں دلچسپی اور حصہ لیتی ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد شرف الدین صاحب بی اے۔ بی ٹی۔ ممتحن امتحان گاہ میں وقت مقررہ کے قبل بمعیت مولوی سید عارف الدین حسن صاحب دوم تعلقدار رفیق ادارہ تشریف لاتے ہیں اور نہایت باقاعدگی سے پرچہ جات سوالات کی تقسیم اور نگرانی میں منہمک رہتے ہیں کہ اس دوران میں مولوی مہدی حسن صاحب زبیری مہتمم تعلیمات بھی امتحان گاہ تشریف لاکر انتظامات کا معائنہ فرماتے ہیں یہ دلچسپیاں ادارہ کے ساتھ غیر معمولی محبت پر دال ہیں۔

شرکا، امتحان اردو عالم میں (۱۶) کے منجملہ (۸) کامیاب اردو زبان دانی میں (۱۸) کے منجملہ (۷) کامیاب۔ اردو دانی میں (۱۷) کے منجملہ (۱۰) کامیاب اور خوش نویسی میں ایک شریک ایک کامیاب جملہ تعداد شرکا (۵۱) حاضر امتحان (۴۸) غیر موجود (۳) رہے۔

لائق ذکر ہیں وہ علم دوست قدرداں حضرات جنھوں نے کامیاب امیدواروں کے منجملہ جو مرکز میں اول آئے ان کو نقروی تمغہ جات عطا فرمائے۔

امتحان اردو عالم کے لئے۔ نقروی تمغہ یک۔ عطیہ مولوی عیسیٰ خاں صاحب وکیل
امتحان اردو زبان دانی ذکور کے لئے۔ نقروی تمغہ یک۔ عطیہ بیگم صاحبہ مولوی سید شاہ نصیرالدین احمد صاحب نہری جاگیردار منصف ویجاپور
امتحان اردو زبان دانی اناث کے لئے۔ نقروی تمغہ یک۔ عطیہ مولوی محمد سعد اللہ خاں صاحب وکیل۔
امتحان اردو دانی کے لئے۔ نقروی تمغہ یک عطیہ میر حسن علی صاحب وظیفہ یاب امین کروڑگیری۔

تمغوں پر نام معطیان کندہ ہیں۔ جو الحی جناب صدر صاحب کے دست مبارک سے عطا ہوں گے۔ اردو دانی میں مرکز میں سب سے اول غلام دستگیر خاں طالب علم۔ اردو زبان دانی ذکور میں معین الدین صاحب چپراسی تحصیل اور اناث میں بی نصرت النسا بیگم عرف حاجی بیگم صاحبہ بنت مولوی سید شاہ نصیرالدین صاحب نہری جاگیردار و منصف ویجاپور اور اردو عالم میں حبیب احمد صاحب الجیلانی نقل نویس ویجاپور آئے ہیں۔

ادارہ کو قائم ہو کر قریب (۱۳) سال ہوتے ہیں مختلف اضلاع و مضافات میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ ویجاپور میں ۵۲ سنہ میں اس کی شاخ قائم ہوئی اور یہ پہلا سال تھا جس کا

نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ اس ادارہ کے بانی اور روح رواں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ہیں۔ صاحب موصوف نے ادارہ میں شعبۂ امتحانات کا اضافہ کرکے ایک بڑی تعلیمی اور علمی خدمت انجام دی ہے یہ بڑا کارنامہ ہے کہ آپ نے ملک کے ناخواندہ اشخاص کو اردو سے واقف کرانے کی کوشش اور تنظیم فرمائی ہے۔ اردو جو ایک زبان عام اور مقبول ہے اس سے ہر اس شخص کو جو ناخواندہ ہے آشنا کرایا جائے۔ تاکہ وہ اپنی روزانہ زندگی میں نوشت وخواند سے بے بہرہ اور دوسرے کا دست نگر نہ رہے اور ناخواندگی کا داغ اس سے مٹ جاوے۔ اگر کسی کو شوق ذوق ہے تو وہ آخر نصاب تعلیم اردو فاضل تک تعلیم پاسکتا ہے جس میں اردو کے اعلیٰ کتب کا انتہائی کورس ہے جس کے بعد اردو قابلیت میں کوئی حجت باقی نہیں رہتی۔

حضرات! اس ادارہ کے سرپرست اعلیٰ

ہزہائی نس والاشان ڈاکٹر سر اعظم جاہ بہادر۔ ایل ایل ڈی۔ جی بی ای۔ شہزادہ برار سپہ سالار افواج آصفی و ولی عہد سلطنت آصفیہ نیز معزز سرپرست۔ ہز اکسلنسی کرنل ڈاکٹر حافظ سر محمد احمد سعید خاں بہادر نواب چھتاری صدر اعظم دولت آصفیہ عالی جناب نواب میر یوسف علی خاں بہادر سالار جنگ ثالث سابق مدار المہام سرکار عالی

عالیجناب آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر۔ ایچ سی ایس۔ صدر المہام تعمیرات سرکار عالی

صدر۔ عالی جناب آنریبل ڈاکٹر سر نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے۔ ڈی لٹ معین امیر جامعہ عثمانیہ و صدر المہام تعلیمات وعدالت سرکار عالی۔

معتمد۔ عالی جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ۔

ارکان مجلس انتظامی اور معاونین میں عموماً جلیل القدر عہدہ داران سرکار عالی شریک ہیں اس دلچسپی سے واضح ہے کہ ملک میں حتی الوسع کوئی ناخواندہ نہ رہے مقصود ہے۔

سامعین محترم!

ادارہ شاخ وریجاپور کی جو روداد تھی وہ مختصر طور پر عرض کی گئی ہے آپ صاحبوں نے اس جانب جو توجہ فرمائی اس کا شکریہ بجالاتا ہوں

میر حسن علی صدر ادارہ شاخ وریجاپور

نئی مطبوعات اس اثناء میں ادارے کی جانب سے حسب ذیل تین کتابیں شائع ہوچکی ہیں:۔

(۱) میر محبوب علی خاں غفران مکاں آصف جاہ سادس از سید مراد علی صاحب طالع قیمت ۱۲؍

اس کتاب کی اشاعت سے سلاطین آصفیہ کا سٹ مکمل ہوگیا ہے۔ جملہ ۷ کتابیں اس سلسلے میں چھپی ہیں۔ حضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع کے درخشاں عہد کے حالات بھی عوام اور طلبہ کے لئے مرتب کرائے جارہے ہیں لیکن ماسبق سلاطین آصفی کا مکمل سٹ ہر محب وطن کے گھر میں ہونا ضروری ہے۔ پوری چھے کتابوں کی قیمت یوں تو عہ ہوتی ہے لیکن جو اصحاب مکمل سٹ منگوانا چاہیں انہیں ۵؍ میں دیا جائے گا۔

(۲) تاریخ سیاسیات۔ از پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی صفحے (۲۷۱) قیمت ۱۲؍ اس کی تفصیلات اس سے قبل شائع ہوچکی ہیں۔

(۳) یورپ جنگ سے پہلے از پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی صفحات قیمت ( )

یہ کتاب بالتصویر شائع ہوئی ہے اور اس میں یورپ کے اہم مقامات کی عکسی تصویریں قیمتی آرٹ پیپر پر چھاپی گئی ہیں۔

اردو امتحانات ادارے کے چوتھے اردو امتحانات ۲ ار تا ۱۴ ارشہریور ۱۳۵۳ف م ۸ ار تا ۲۰ جولائی ۱۹۴۴ء مختلف مرکزوں میں ایک ساتھ لئے جائیں گے۔ شرکت کی درخواستیں اور فیس ۱۰ ار تیر ۵۳ف م ۱۵ ار مئی تک دفتر ادارہ میں وصول ہوجانی چاہئیے مرکز کے لئے کم از کم (۳۰) امیدواروں کی شرکت ضروری ہے۔

ادارہ

ادارۂ ادبیات اُردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت: روپیہ	آنہ	پائی
من کی بینا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ...	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۹۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ..	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	۰
" " دوسری کتاب	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد .	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن ...	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی ...	۸۰	۰	۱۰	۰
مہ لقا ...	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان ..	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت: روپیہ	آنہ	پائی
سچ کا جادو ..	۴۸	۰	۴	۰
طبعیاتی کائنات ...	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ..	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
بدر ولی ..	۲۴۸	۲	۸	۰
گوہر و نسیم ..	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۶۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
بدر دکن .	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب .	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ..	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان ...	۳۲	۰	۳	۰
خطابات ...	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
حیوانی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا ...	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ ...	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت ...	۵۶	۰	۸	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۲ع میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خان	۳۲	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

(ماہ نامہ)

سب رس

۱۹۴۴ء

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۴
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۸؍

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

سب رس

جلد (۷) بابت ماہ جون سنہ ۱۹۴۴ء شمارہ (۶)

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

"شاید"۔ کنول نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "بڑے زود حس ہو گئے ہو۔" ارشد مسکرا کر بولا "بھئی بات یہ تھی کہ میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔" "خواب! کیا خواب؟" کنول نے چلتے ہوئے پوچھا۔ "یہی" ارشد نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "سوچ رہا تھا ہمیں آزادی مل گئی تو ——"۔ "تم سوچتے ہی رہتے ہو یا کچھ کرتے بھی ہو؟" کنول نے بات کاٹ کر پوچھا ——"ارے کنول۔ کاش تم مجھے سمجھ سکتے۔ مجھ میں ایک انجن کی کمی ہے جو مجھے کھینچ لے جائے۔ کیا سمجھے؟" ارشد نے جواب دیا۔ "خوب! اگر میں انجن مہیا کروں تو؟" کنول نے بڑے شوق سے پوچھا۔ "تو پھر دیکھ لینا تم۔ اور ہاں تمھاری اس خفیہ سوسائٹی کا —— ....."

قبل اس کے کہ ارشد جملہ پورا کر سکتا کنول نے اس کا منہ بند کر دیا۔ "ہش۔ یہاں نہیں۔ چلو میں تم کو سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔ تمھاری سخت ضرورت ہے ارشد" —— کنول نے سرگوشی میں کہا۔ اس کی چال سے لگ رہا تھا کہ وہ بڑی جلدی میں ہے۔ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ایک اندھیری گلی میں مڑ گئے۔

× × × ×

ارشد اور کنول بچپن سے گہرے دوست تھے۔ ارشد کے خلاف کنول بہت کم سوچتا تھا۔ وہ طبعاً جلد باز واقع ہوا تھا اور ہر ارادے کی عملی تشکیل دیکھنے کا متقاضی ان دنوں دونوں بہت مصروف رہے تھے اس لئے ایک عرصے سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

× × × ×

ایک اندھیرے مکان پر پہنچ کر کنول نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا اور کسی نے دروازہ کھول دیا۔ اندر داخل ہو کر ارشد نے کمرہ پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ ایک پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حاضرین میں مرد و خواتین دونوں شامل تھے جن کے چہروں سے عزم و سنجیدگی عیاں تھی۔

دروازوں اور دریچوں پر بھاری سیاہ پردے پڑے تھے تاکہ روشنی کو باہر جانے سے روکیں۔ ارشد اس ماحول سے کچھ گھبرا سا گیا۔ اتنے میں کنول نے کہنا شروع کیا "دوستو! یہی وہ بہادر نوجوان ہے جو ایسے نازک وقت ہماری مدد کریگا۔ کام سخت ہے ارشد اور تمھارے فرض و محبت میں ٹکر۔" ایک دم ارشد نے اپنے کاندھوں پر ایک نامعلوم سا بوجھ محسوس کیا۔ "وقت کم ہے اس لئے تفصیل نہیں بتا سکتا۔ ہماری خفیہ سوسائٹی نے ملک کے طول و عرض میں ۲۲ مارچ کو بہت بڑے پیمانے پر انقلاب کرنے کی تیاری کر لی ہے۔ یہ ایسا طوفان ہوگا جس میں موجودہ حکومت بہہ جائے گی اور قومی حکومت قائم ہوگی۔ اس خفیہ تنظیم کا پتہ تمھارے چچا کو ابھی ابھی ملا ہے۔ وہ گھر کی طرف گئے ہیں اور قبل اس کے کہ وہ کوئی کارروائی کریں تمھیں ان کو ہمیشہ کے لئے چپ کرنا ہوگا۔ سمجھے؟ —— بتاؤ ۲۲ مارچ کو ہم وطنوں کا قتل عام اور غلامی چاہتے ہو یا انقلاب و آزادی؟" "آزادی" ارشد کے منہ سے بیساختہ نکلا۔ "مجھے تم سے یہی امید تھی ارشد!" کنول نے مطمئن لہجہ میں کہا۔ "لو یہ پستول"۔ اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

× × × ×

اتفاق کی بات کہ اس روز نجمہ اپنی کسی سہیلی کی شادی میں گئی ہوئی تھی۔ اس کے ابا نے اسی وقت دفتر کے کمرہ میں داخل ہوکر دروازہ بند کیا تھا کہ ارشد نے باہر سے کھٹکھٹایا۔ "کون؟" انھوں نے پوچھا۔ "جی میں ہوں۔ ایک ضروری بات پوچھنی ہے۔" "کیا بات ہے؟" انھوں نے کواڑ کھول کر پوچھا۔ "آپ کو خاموشی اختیار کرنی ہوگی اس خبر کے بارے میں جو ابھی آپ کو ملی ہے۔" ارشد سے یہ سن کر اور اس کے پریشان چہرے پر جوشیلے جذبات کی ٹمٹماہٹ دیکھ کر اس کے چچا کو اچنبھا ہوا۔ کچھ سوچ کر انھوں نے کہا "یہ میری ڈیوٹی ہے ارشد ـــ اور پھر میرا استقبل کتنا شاندار ہو جائیگا!" "تو یہ آپ کا اٹل فیصلہ ہے؟" "بالکل" ـــ ایک دھماکا ہوا اور چچا کی لاش زمین پر پڑی تھی۔

ارشد جونہی پلٹا اس کے دماغ میں ایک دھماکا ہوا ـــ نجمہ ـــ نجمہ کا خیال ابتک اسے نہ آیا تھا۔ "اچھا ہی ہوا" اس نے سوچا "ورنہ فرض پورا نہ ہوتا۔" وہ گھر سے بغیر کسی مقصد کے ایک طرف چل پڑا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات عجیب بے ترتیبی اور تیزی سے آرہے تھے۔ وطن۔ محبت۔ غربت۔ انقلاب۔ آزادی۔ فرض اور نجمہ۔ نجمہ۔ نجمہ۔ اس کے سر میں بم کے گولے پھٹ رہے تھے۔ نجمہ نجمہ اسے اپنے دل کے گوشے میں کہیں دور اور پھر ہر طرف نجمہ اپنے باپ کی تلاش میں نظر آئی۔ اس کا سر درد کی شدت سے پھٹنے لگا۔ ارشد کی چال تیز ہونی گئی

رات اب زیادہ زیادہ سنسان ہوگئی تھی اور ایسی پراسرار خاموشی مسلط تھی جو کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوتی تھی۔ ایسے وقت کوئی رنگین مزاج راہگیر نہایت بے پروائی سے لوچدار آواز میں ؎

کس قدر تاریک ہے دنیا مری ؛ صبح بھی میری نظر میں شام ہے
دھڑکنوں سے دل کی یہ سمجھا ہوں میں ؛ کیا محبت کا یہی انجام ہے

گاتا ہوا ارشد کے پاس سے گزرا ارشد کے کانوں میں جیسے کوئی پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہا ہو۔ اس کی چال تیز تیز اور راہگیر کی آواز دھیمی ہوتی گئی اور وہ ایک ایسی نامعلوم منزل کی طرف چل دیا جس کی کوئی حد ہی نہ تھی۔

× × × ×

صبح ارشد کی لاش پائی گئی غریب مزدوروں کی آنسو بھری آنکھیں اور کنول اور اس کے ساتھیوں کی عقیدت مندانہ نظریں ارشد کو آخری بار دیکھ رہی تھیں۔ اس کے مضمحل چہرہ پر اب بھی ہونٹوں کے کونوں میں ایک مسلسل مسکراہٹ کھیل رہی تھی! ـــ

× × × ×

دوسری صبح ندی پر اشنان کرتی ہوئی عورتیں کسی بہتی ہوئی ڈراؤنی چیز کو دیکھ کر سہم گئیں۔ یہ نجمہ کی لاش تھی۔

سروری امیر احمد

سائینٹفک سوسائیٹی (علی گڑھ)

(اردو میں سائنسی ادب کا ایک حصہ)

سرسید نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد اپنے ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے جو کوششیں کیں ان میں ہندوستان کی تعلیم کا مسئلہ بھی تھا۔ جب سرسید کو یقین ہو گیا کہ جس وقت تک ملک میں جدید علوم کی اشاعت نہ ہو ہندوستانیوں کی بھلائی کی سب تدبیریں بیکار ہیں تو انھوں نے اردو میں مغربی علوم و فنون کی اشاعت کے لئے ایک انجمن قایم کرنے کا قصد کر لیا اور اس کو عملی جامہ پہنایا۔

۱۸۶۴ء میں غازی پور میں سائینٹفک سوسائٹی قایم کی اور ڈیوک آف آرگائیل نے اس کی سرپرستی قبول کی۔ سرسید کی کوشش سے تھوڑے ہی عرصے میں ارکان کی کافی تعداد مہیا ہو گئی۔ ان میں انگریز اور ہندوستانی برابر کے شریک تھے۔ خود سرسید اس سوسائیٹی کے اعزازی معتمد تھے۔ انگریزی سے علمی کتابوں کے ترجمہ کا کام شروع ہو گیا۔ ۱۸۶۷ء میں سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تو سوسائیٹی بھی اپنے جملہ ساز و سامان اور کارپردازوں کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہو گئی۔ سوسائیٹی کے کام کی رفتار تیز سے تیز تر ہو گئی۔ سرسید نے تقریباً (۳۰) ہزار روپے کے صرفے سے اس کے لئے ایک نہایت عمدہ عمارت تعمیر کرائی جو اب تک موجود ہے۔ تقریباً (۵۰۰) روپے کے تنخواہ دار مترجمین اور ملازمین سوسائیٹی کے کام پر متعین کئے گئے تھے۔ سرسید نے ۸ ہزار کا اپنا ذاتی مطبع سوسائیٹی کے لئے وقف کر دیا۔ ہز ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال نے ایک ہزار کی الماس کی انگوٹھی بطور تحفہ دی تھی سرسید نے اسے بھی سوسائیٹی کے نذر کر دی۔

سائینٹفک سوسائیٹی کے زیر اہتمام ہر مہینہ متعدد علمی جلسے منعقد ہوتے تھے جن میں جدید موضوعوں پر تقریریں ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر ککلی نامی ایک سائنس داں ہر مہینے ایک تقریر کر کے مختلف سائنسی تجربوں کا مظاہرہ کرتا تھا۔ سوسائیٹی کی طرف سے "انسٹیٹیوٹ گزٹ" کے نام سے ایک رسالہ بھی نکلتا تھا۔

اس سوسائیٹی نے تقریباً (۴۰) علمی و تاریخی کتابوں کو انگریزی سے اُردو زبان میں منتقل کیا۔ سائنس کی کتابوں کے جو ترجمے کرائے گئے وہ حسب ذیل ہیں

(۱) رسالہ علم فلاحت مصنفہ رابرٹ اسکاٹ برن　　　(۲) رسالہ علم برق مصنفہ سر ولیم اسنو ہیرس

اس سوسائیٹی کی طرف سے جو ترجمے شائع ہوئے وہ عام طور پر کامیاب ثابت ہوئے بلکہ بعض کتابوں کے دو دو ایڈیشن طبع کرنے پڑے۔ ترجموں کی زبان عام فہم اور سلیس ہے۔ ترجمہ پن بہت کم پایا جاتا ہے۔ اصل کتابوں کے اشارات اور تلمیحات کو جن سے ہندوستانی ناواقف تھے ترجموں میں طویل حاشیے دے کر سمجھایا گیا ہے۔ ۱۸۷۷ء تک یہ سوسائیٹی قائم رہی اور جب علی گڑھ کالج کا قیام عمل میں آیا تو سرسید اس طرف لگ گئے اور سوسائیٹی کا کام رک گیا۔

رسالہ علم فلاحت تقطیع ۹½"/۵" صفحات (۲۵۸) سنہ طباعت ۱۸۶۵ء قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

سائینٹفک سوسائیٹی کی مطبوعات کے سلسلے کی یہ ساتویں کڑی ہے جو رابرٹ اسکاٹ برن کی انگریزی کتاب

(Outlines of Modern Farming) کا ترجمہ ہے۔ مترجم کا نام درج نہیں اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ کسی ایک شخص نے کیا یا کئی لوگوں نے مل کر کیا۔ یہ کتاب انسٹیٹیوٹ پریس علی گڑھ میں ٹائپ میں چھپی اور سنہ ۱۹۰۶ء میں بک ڈپو مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے اسے دوبارہ چھپوایا۔ متعلقہ صفحات کے محاذی ترکاریوں اور اجناس کی تصویروں کے صفحات لگا دیے گئے ہیں۔ یہ تصویریں لیتھو میں چھپی ہیں۔ کتاب کے سرورق پر انگریزی اور اردو زبانوں میں کتاب، مصنف اور مطبع وغیرہ کے نام درج ہیں۔ سوسائٹی نے اس کتاب کو ڈیوک آف ارگائیل کے نام سے معنون کیا ہے۔ پوری کتاب آٹھ حصوں اور ایک تتمہ پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں زمین کی اقسام۔ پیداوار اور زمین کو قابل کاشت بنانے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں کھاد کا بیان ہے تیسرے میں گیہوں اور جو کے بونے۔ جوتنے اور کاٹنے کے طریقوں کو سمجھایا گیا ہے۔ چوتھے میں ایسی فصلوں کا ذکر ہے جو پھلیاں لاتی ہیں مثلاً مٹر وغیرہ۔ پانچویں میں شلغم۔ گوبی اور آلو وغیرہ کی کاشت کو سمجھایا گیا ہے چھٹا حصہ ایسی فصلوں کے لئے وقف ہے جن سے مویشیوں کا چارہ مطلوب ہوتا ہے۔ ساتواں حصہ گھاس اور چراگاہوں پر مشتمل ہے۔ آٹھویں فصل میں سن اور السی کا بیان ہے "تتمہ" میں کھیت کے تجربوں کے عمدہ طریقے بیان کئے ہیں۔

اس کتاب میں جابجا انگریزی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں مثلاً "کلورو ہائیڈرک ایسڈ۔ نائیٹریٹ آف سوڈا۔ سلفیٹ آف امونیا۔ فاسفیٹ۔ جیالوجی۔ پوٹاش وغیرہ"۔ جن اصطلاحات کے ترجمے کر لئے گئے تھے وہ یہ ہیں :-

کمسٹری (کیمیا) سلفیٹ (تیزاب گندک) ۔ نائٹرک ایسڈ (شورہ کا تیزاب) اکسائیڈ آف ایرن (لوہے کے زنگ)۔

اصل کتاب میں جہاں ایسے مقامات اور اصطلاحوں کا ذکر ہے جن سے ہندوستانی ناواقف ہیں ان کو کتاب کے حاشیہ پر سمجھایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر علم کیمیا اور فزیالوجی کی جو تشریح کی گئی ہے یہاں لکھی جاتی ہے :-

"علم کیمیا جس کو انگریزی میں کمسٹری کہتے ہیں ایک نہایت عمدہ علم ہے فرنگستان کے سوا اور ملکوں کے لوگ علم کیمیا اس کو کہتے تھے جس کے ذریعہ سے کم قدر دھاتوں کو جیسے تانبا۔ رانگ۔ پارہ، سونا۔ چاندی بنالیں۔ انگریزوں نے بھی اول اول اس پر کوشش کی اور معلوم ہوا کہ یہ ایک محض لغویات ہے الا اس کے تلاش اور تجربوں سے ایک نیا اور نہایت مفید علم نکل آیا جس کا اب نام علم کیمیا ہے۔ یہ علم وہ ہے جس سے تمام جسموں کی خاصیت اور اوصاف بذریعہ تفریق اور اجتماع ان کے اجزا کے دریافت ہوتے ہیں۔"

"فزیالوجی کے معنی اصل یونانی میں قدرتی چیزوں پر بحث کرنے کے ہیں اور زمانہ حال میں اس کے معنی زیادہ محدود لیے ہیں یعنی اس علم کو کہتے ہیں جس میں حیوانوں اور درختوں کے تمام مختلف حصوں اور اعضاء کے کاموں کا حال معلوم ہوتا ہے"

اس رسالے کی زبان عام فہم اور انداز بیان دلچسپ ہے۔ جملوں کی ساخت اور املا میں قدامت پائی جاتی ہے۔ صفحہ (۸۰) کی عبارت کا اقتباس یہ ہے :-

"نائیٹریٹ آف سوڈا اور سلفیٹ آف سوڈا اور سلفیٹ آف امونیا کا بیان"

"وہ مصنوعی اور خاص کھاتیں کہ استعمال ان کا فی زمانہ رائج ہے منجملہ ان کے یہ کھاتیں بہت مستعمل ہیں اور ان کھاتوں میں سے

نائیٹریٹ آف سوڈا خصوصاً ملک پیرو سے ہاتھ آتی ہے اور قیسیم صرف شورہ کا تیزاب بنانے کے کام آتی ہے گر باروت کے بنانے میں اس سبب سے فتور نہیں ہوتی کہ وہ نمی کو بہت مانتی ہے اور چراگاہوں میں چھڑکنے کے واسطے اور جئی کے لئے نہایت مفید ہے اور سلفٹ آف سوڈا تیزاب گندھک اور سوڈا سے بنتا ہے اور اناج کی فصلوں اور ترکاریوں اور چراگاہوں پر پھیلانے کے واسطے بہت عمدہ ہوتا ہے اور سلفٹ آف امونیا تیزاب گندھک اور امونیا سے بنتا ہے اور اناج اور گھاس کی فصلوں کے لئے استعمال اس کا ہوتا ہے۔"

کتاب کے آخر میں ان انگریزی الفاظ کی فرہنگ دی گئی ہے جو کتاب میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس میں "جیالوجی" کی اس طرح تشریح کی گئی ہے۔

"جیالوجی ایک نیا علم فرنگستان میں نکلا ہے جس میں مرکبات جادیہ اور اجزا و زمین اور ان کے تعلقات باہمی اور ترکیب و صورت کے حالات و عوارض بیان کئے جاتے ہیں۔" (نمبر کتاب ۶۳۱ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ) ب ع

رسالہ علم برقی تقطیع $5'' \frac{1}{2} / 9'' \frac{1}{2}$ صفحات (۲۸۴) ۔ سنہ طباعت ۱۸۶۹ء مطبوعہ انسٹیٹیوٹ پریس علی گڑھ قیمت دو روپیہ

یہ رسالہ سائینٹفک سوسائیٹی کے سلسلہ کی دسویں کڑی ہے اس میں سر ولیم اسنو ہیرس کی کتاب Electricity کا اردو ترجمہ چند مفید حاشیوں کے اضافے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کو بھی ڈیلوک آف ارگائل کے نام سے معنون کیا گیا ہے مترجم کے نام کا پتہ نہیں چل سکا۔ البتہ حاشیوں پر جو نوٹ دیے گئے ہیں ان کے نیچے صرف لفظ "مترجم" لکھا ہوا ہے اس میں جملہ آٹھ ابواب ہیں جن میں برقی قوت۔ برقی آلے۔ قدرتی برق اور برق کے استعمال کے طریقے غرض جملہ امور کو نہایت تفصیل سے سمجھایا گیا ہے۔ ہر مسئلے کو ثابت کرنے کے لئے تجربے اور اشکال دی گئی ہیں۔ چنانچہ پورے رسالہ میں (۶۵) تجربے اور (۶۹) اشکال درج ہیں۔

انگریزی اصطلاحوں کا بہت کم استعمال ہوا ہے۔ سائنس کی اکثر اصطلاحوں اور آلوں کے ناموں کے ترجمے کر لئے گئے تھے بطور مثال کے طور پر چند یہاں لکھے جاتے ہیں۔

"برق نما آلہ۔ انفراج برقی۔ برقی مرتبان۔ میزان البرق ریسمانی۔ میزان البرق پیچاں۔ ایصال برق۔ برق مستقر برق مستدیر۔ تیزاب شورہ۔ تیزاب گوگرد" وغیرہ

بعض اصطلاحوں کے ترجمے نہیں کیے گئے بلکہ انگریزی تلفظ کے لحاظ سے اردو میں منتقل کر لیے گئے تھے مثلاً

"کاربون گاس" Corbon gas "ہائیڈروجن گاس" Hydrogen

مادی اشیاء کے پھیلنے کے لئے حسب ذیل دو اصطلاحیں بنائی گئی تھیں "تکاثف و تخلخل"

ترجمہ کی بعض اصطلاحوں کی حسب ذیل تشریح کی گئی ہے:۔

برقی قوت۔ الیکٹریسٹی کا ترجمہ ہے۔ اشیائے برقیہ۔ جن چیزوں میں یہ خاصیت پائی جائے۔ معمول برقی قوت جن میں رگڑ سے وہ قوت پیدا ہوتی ہے تحریک برقی۔ وہ ترکیب جس کے ذریعہ سے وہ قوت پیدا ہوتی ہے جذب برق۔ برق کے اثر کو کہتے ہیں۔

اس رسالے کی زبان عام فہم ہے۔ پڑھنے والے کو یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ وہ کوئی علمیاتی کتاب پڑھ رہا ہے۔ مترجم نے اس خوبی سے ترجمہ کیا ہے کہ عبارت میں ترجمہ پن نہیں پایا جاتا۔ فارسی اور عربی ترکیبوں کا بہت کم استعمال ہوا ہے۔ کہیں کہیں قدیم الفاظ ملتے ہیں۔ سیدھی سادھی زبان میں مسائل کو بیان کیا گیا ہے اکثر جملے طویل ہیں جن کو الفاظ "جن۔ جو اور" سے جوڑ دیا گیا ہے:۔

خواجہ حمید الدین ایم اے

دکن کی اسلامی تاریخ کی اہمیت

عام طور پر اب بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دکن کی اسلامی تاریخ کی ابتدا علاءالدین خلجی کے حملوں (پہلا حملہ ۶۹۴ھ / ۱۲۹۴ء) سے ہوتی ہے۔ لیکن عرصہ ہوا اس خیال کی تردید ہو چکی اور تاریخ ہند کے علماء نے ثابت کر دیا کہ اسلامی دکن کی تاریخ کی ابتدا اس سے بھی بہت پہلے سے ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قدیم الایام سے دکن کے تعلقات بیرونی ممالک سے رہے ہیں۔ پلینی، اسٹرابو اور ہیرو ڈوٹس اپنی تصانیف میں دکن کے مشہور مقامات کے نام لیتے ہیں۔ دکن سے جن ملکوں کے تعلقات رہے ہیں ان میں خاص طور پر عرب کو نمایاں خصوصیت حاصل رہی ہے۔ سواحل بحرین اور عمان کے تاجر ظہور اسلام سے بھی پہلے تجارتی اغراض کے سلسلہ میں دکن آتے جاتے تھے۔ ظہور اسلام کے ساتھ یہ عرب تاجر مسلمان ہوئے اور انہیں مسلمان عرب تاجروں سے اسلامی دکن کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان عرب تاجروں کو سیاسی سیادت حاصل نہ ہوئی، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں دکن کی ہندو ریاستوں میں خصوصی مراعات حاصل رہیں جن سے دکن میں اسلام کی اشاعت میں کافی مدد ملی۔ آج بھی ان عرب تاجروں کی اولاد سواحل ملیبار، کوچین، ٹراونکور اور مدراس میں موپلا، نینار، نوائت وغیرہ جیسے ناموں کے ساتھ باقی چلی آتی ہے۔

ایک طرف اگر دکن کے تعلقات کا ایک سرا عرب سے جڑا ہوا تھا تو اس کا دوسرا سرا جزائر شرق الہند، جاوا، سماٹرا، ملایا اور لنکا سے ملا ہوا تھا۔ مسلمان تاجروں نے دکن کو اپنا مرکز بنا لیا تو اس رشتہ کے ذریعہ ان کے قدم بہ قدم اسلام بھی ان مقامات پر پہنچا۔ چنانچہ ان دور دست مقامات کے مسلمان باشندے

(یہ مقالہ آل انڈیا مسلم ہسٹری کانفرنس کے دوسرے اجلاس منعقدہ پشاور میں پڑھا گیا)

آج بھی گہوارۂ اسلام اور اپنے وطن کے درمیان دکن کو اپنی ایک منزل سمجھتے ہیں۔

دکن پر علاءالدین خلجی کے حملے (۶۹۴ھ / ۱۲۹۴ء، ۷۱۹ھ / ۱۳۱۹ء) فوجی مہموں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، دکن میں اسلامی سیادت کا آغاز اس "جرأت رندانہ" سے ہوتا ہے جو سلطان محمد تغلق رحمۃ اللہ علیہ نے ۷۴۵ھ / ۱۳۴۵ء میں دہلی کو اجاڑ دیوگری یا دولت آباد کو اپنا پایۂ تخت بنا کر دکھائی تھی۔ اب چاہے مورخ سلطان کی اس حرکت کی کچھ ہی توجیہہ کریں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسی "شوق فضول" نے دکن میں اسلامی سیادت کا سکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بٹھا دیا، اور آج بھی جب کہ ہندوستان سے اسلامی سیادت رخصت ہو چکی ہے، دکن ہی میں اس کی سب سے بڑی یادگار باقی وسلامت ہے۔

شہنشاہ ہند کے لئے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ دولت آباد میں رہ کر پورے ہندوستان پر حکومت کرتے۔ ہندوستان کے جغرافی تنوع، اس کی وسعت، اور اس زمانے کے ذرائع حمل و نقل کا خیال کیجئے تو یہ ممکن بھی نظر نہیں آتا۔ چنانچہ آنے والے زمانے میں اورنگ زیب کے بعد دکن کا یہی حال ہوا۔ بہرحال سلطان محمد تغلق کو پھر سے دہلی بسانی پڑی، لیکن دولت آباد کو دارالحکومت بنانے میں جتنی اسلامی آبادی دکن پہنچ چکی تھی، وہ سب کی سب واپس نہ ہو سکی، اسی آبادی نے آیندہ اسلامی تاریخ دکن کے بنانے میں زبردست حصہ لیا ہے۔

علاءالدین خلجی کے پہلے حملہ دکن کی نصف صدی کے اندر اندر خود سلطان محمد تغلق کی زندگی میں دکن کی پہلی زبردست

اسلامی حکومت سلطنت بہمنیہ عالم وجود میں آگئی (۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء) اس کے بانی سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی کی جفاکشی، عدل پروری اور دور اندیشی تاریخ دکن میں اپنی آپ نظیر ہے۔ علاء الدین کے بعد محمد شاہ اول (۷۶۱ھ / ۱۳۶۰ء - ۷۷۶ھ / ۱۳۷۵ء) کے عہد میں بہمنی سلطنت کو پورا پورا استحکام نصیب ہوا۔ محمود اول (۷۸۰ھ / ۱۳۷۸ء - ۷۹۹ھ / ۱۳۹۶ء) کے زمانے میں دکن میں علمی اور ادبی چرچے اپنے منتہا کو پہونچے اور سلاطین بہمنیہ کا پائے تخت گلبرگہ تمام ممالک اسلام کے علما و ادبا کا ماوا و ملجا بن گیا، خواجہ حافظ بھی اسی عہد میں دکن کا ارادہ کرتے کرتے رہ گئے۔ فیروز شاہ (۸۱۶ھ / ۱۴۱۴ء - ۸۲۵ھ / ۱۴۲۲ء) ایک بہترین جرنل تھا، جس نے اپنی حریف ہمسایہ سلطنت وجیانگر کی کمر توڑ ڈالی تھی۔ احمد شاہ ولی (۸۲۵ھ / ۱۴۲۲ء - ۸۳۸ھ / ۱۴۳۴ء) گلبرگہ سے بیدر اپنا پائے تخت تبدیل کیا، اور یہیں محمد شاہ کے عہد میں اس کے مشہور و معروف وزیر محمود گاواں (مقتول ۸۸۶ھ / ۱۴۸۱ء) نے ہندوستان میں سب سے پہلا اسلامی مدرسہ قائم کیا جو آج تک اطراف ہند میں اس کے نام کو زندہ کئے ہوئے ہے۔

بہمنی سلطنت کا سب سے زبردست کارنامہ دکن میں اسلامی سیادت قائم کرنا اور اسے محکم اور استوار کرنا ہے۔ اس نے چھوٹی ہندو ریاستوں کا خاتمہ کرکے اپنی سلطنت کو وسعت دی اور وجیانگر کی زبردست ہندو سلطنت سے ہمیشہ مقابلہ کرکے اسے اپنے حدود سے آگے بڑھنے نہ دیا۔ اس کا دوسرا کارنامہ دکن میں اسلام اور اسلامی علوم کی نشر و اشاعت ہے۔ بہمنی سلطنت نے دکن کو ایک مخصوص اسلامی تہذیب و تمدن، ایک خاص فن تعمیر، اور ایک نیا قانون حکومت عطا کیا جس کی ابتدا، اس کی جانشین تمام دکنی سلطنتیں کرتی آئی ہیں۔

تقریباً ڈیڑھ سو سال کے ایک شاندار دور کے بعد ۹۲۴ھ / ۱۵۱۸ء میں بہمنی سلطنت کو زوال ہوگیا اور اس کے پانچ حصے ہوگئے۔ ان حصوں پر حکومت کے مقرر کردہ صوبہ دار خود مختار ہوگئے، اور عادل شاہی، قطب شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی اور برید شاہی سلطنتیں عالم وجود میں آئیں۔ ان میں سے اول الذکر تین سلطنتیں نسبتاً بڑی تھیں۔ اور بقیہ دو چھوٹی چھوٹی۔ ان کے پائے تخت علی الترتیب بیجاپور، گول کنڈہ (حیدرآباد)، احمد نگر، ایلچ پور، اور بیدر تھے۔ عماد شاہی سلطنت کا خاتمہ ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء میں نظام شاہی سلطنت نے کر دیا اور برید شاہی سلطنت کو ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۶ء میں عادل شاہی سلطنت نے ختم کر دیا۔ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتیں تقریباً دو سو (۲۰۰) سال تک حکمران رہیں اور بالآخر اورنگ زیب کے زبردست ہاتھوں سترہویں صدی کے آخری دہے میں یہ بھی ختم ہوگئیں۔

دکن کی یہ اسلامی سلطنتیں اگرچہ آپس میں ہمیشہ لڑتی بھڑتی رہتی تھیں، لیکن تاریخ میں یہ ایک عدیم المثال واقعہ ہے کہ انہی سلطنتوں نے آپس میں اتحاد کرکے اپنی سب سے بڑی حریف سلطنت وجیانگر کا خاتمہ کر دیا۔ جنگ تالی کوٹہ (۱۲۶۲ھ / ۱۶۵۶ء) میں دکن کی چار اسلامی سلطنتوں نے متحدہ طور پر راجہ راج والی وجیانگر کو ایسی فاش شکست دی کہ وجیانگر کی چار سو سالہ پرانی اور سب سے مستحکم ہندو سلطنت بالکل پارہ پارہ ہوگئی، اور اس کے بل بوتے پر دکن میں ہندو سیادت کا جو خواب دیکھا جا رہا تھا وہ کبھی شرمندۂ معنی نہ ہو سکا۔

دکن کی ان اسلامی سلطنتوں کے فرماں روا اپنی علمی سرپرستی کے لئے اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ عادل شاہیوں کا پائے تخت بیجاپور ہر طرح کے علما، فضلا، ادبا، سادات، اور مشائخین اور باکمال لوگوں سے معمور رہتا تھا۔ یہی حال نظام شاہیوں کے دارالسلطنت احمد نگر اور قطب شاہیوں کے پائے تخت

گولکنڈہ حیدرآباد کا تھا۔ گویا یہ شہر اپنے وقت کے بغداد اور قاہرہ تھے۔ انہی دو درباروں میں ہندوستانی یا اردو جیسے پورے ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان ہونے کا دعویٰ ہے پہلی مرتبہ ادبی رتبے کو پہنچی۔ نصرتی، غواصی، ملک خوشنود جیسے کتنے ہی دکنی شعرا اور صوفیا نے ان سلطنتوں کے زیر سایہ پرورش پائی اور اردو کو ادبی زبان بنانے کی سعی بلیغ کی۔ یہ حکمران صرف علم و ادب کے بڑے سرپرست ہی نہ تھے بلکہ خود بھی نہایت اچھا ذوق ادب رکھتے تھے، اور اعلیٰ درجہ کے شاعر اور ادیب تھے۔ قطب شاہی سلاطین میں سلطان محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، اور عبداللہ قطب شاہ اردو اور فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ عادل شاہیوں میں ابراہیم عادل شاہ، علی عادل شاہ اردو اور فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔

ادبی خدمت کے ساتھ ساتھ ان سلطنتوں نے ہندستانی تمدن کی بھی زبردست خدمت کی ہے۔ ایک طرف انھوں نے ہندوستان کو ایک کل ہند زبان عطا کی تو دوسری طرف اسے ایک کل ہند تمدن بھی عطا کیا۔ اس تمدن کی خصوصیت اردو زبان کی طرح ہندی اور اسلامی تمدنوں کا خوشگوار امتزاج تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ایسی ہی زبان اور ایسا ہی تمدن کل ہند سیادت کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ ان کا طرز تعمیر بھی اسی خصوصیت کا اظہار کرتا ہے۔ ان خصوصیات پر بحث کرنے کی یہاں گنجایش نہیں، صرف اسی اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب نے اگرچہ دکن کی اسلامی سلطنتوں کا خاتمہ کردیا لیکن ان کے جانشینوں سے یہ وسیع سلطنت سنبھل نہ سکی۔ یہ مسلمانان دکن کی محض خوش بختی تھی کہ خاندان آصفیہ کے بانی حضرت آصف جاہ اول جیسا دور اندیش اور دوربین مدبر کو دکن کا صوبہ دار بنا کر بھیجا گیا۔ موجودہ سلطنت آصفیہ کی ابتدا حضرت آصف جاہ اول کی صوبہ داری دکن پر مامور ہونے سے ہوتی ہے (سنہ ۱۱۲۳ھ / ۱۷۱۲ء)۔ سلطنت مغلیہ کے خاتمہ اور انگریزی سیادت کی انتہا تک جیسا پر آشوب زمانہ ہندوستان پر گزرا ہے اس میں سے اپنی سلطنت کو صحیح و سالم نکال لے جانا، سلاطین آصفیہ کا سب سے زبردست اور زندہ کارنامہ ہے۔

سلطنت آصفیہ حیدرآباد کے زیر نگیں آج اتنا ہی علاقہ ہے جو کبھی دکن کی پانچ سلطنتوں کے قبضہ میں تھا، یا بہ الفاظ دیگر کبھی سلطنت بہمنیہ کے زیر تسلط تھا۔ اس طرح سلطنت آصفیہ سلاطین دکن اور سلاطین بہمنیہ کی جانشین ہے۔ اس سلطنت ابد مدت نے بھی ان قدیم روایات کو جو دکن کا طرۂ امتیاز تھے، صرف زندہ ہی نہیں رکھا ہے بلکہ اپنی طرف سے ان میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

دکن کے فرماں روا ہمیشہ سے وسیع النظر اور دور اندیش رہے ہیں، انھوں نے بیرونی دنیا سے علحدگی کے تنگ نظر طرز عمل کو کبھی پسند نہیں کیا۔ ان کے تعلقات ہمیشہ سے بیرونی دنیا سے برقرار رہے ہیں۔ ایک طرف شمالی ہند، ایران، عرب، حبشہ اور افغانستان سے تو دوسری طرف لنکا، جاوا، ملایا، سماٹرا، اور جزائر شرق الہند سے ان کے تعلقات کا رشتہ جڑا رہا۔ ان تعلقات کو اب تک سلطنت آصفیہ نے نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ ان کو اور وسعت دے کر دکن کو سارے عالم میں مشہور و مفتخر کردیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کی کوئی ایسی معاشرتی، علمی، ادبی اور ایک حد تک سیاسی تحریک نہیں جس میں دکن کا زبردست ہاتھ شریک نہ رہتا ہو۔

افسوس سا ہے کہ دکن کی تاریخ کو عام طور پر مدارس اور

جامعات میں شمالی ہند کی تاریخ کے ذیل میں ضمناً پڑھایا جاتا ہے۔ یہ مقالہ نگار اکثر سوچتا ہے کہ جغرافیہ کی کتابوں میں ہندوستان جیسے طویل و عریض ملک کو ایک مستقل براعظم کیوں قرار نہیں دیا جاتا۔ روس کو چھوڑ کر جو ملک پورے براعظم یورپ کے برابر ہو ظاہر ہے کہ اس کے مختلف طویل و عریض اقطاع کی تاریخ بھی ویسی ہی مختلف عناصر سے مملو نظر آئے گی۔ ضرورت ہے کہ دکن کی تاریخ کا مطالعہ مستقل طور پر ایک علیحدہ ملک کی تاریخ کی حیثیت سے کیا جائے۔ تاریخ دکن کو شمالی ہند کی تاریخ کے ذیل میں پڑھنے کی وجہ سے اب تک اس کی طرف کافی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ یہ بھی نہیں کہ اسلامی تاریخ دکن کے ماخذ قدیم تاریخ ہند کے ماخذوں کی طرح سرے سے موجود ہی نہ ہوں، یا نایید ہوں۔ مسلمان جہاں بھی گئے ہیں اہل ہند کے برعکس تاریخ نگاری اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ دکن کے مسلمان فرماں روا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، دکنی سلاطین کی سرپرستی میں دیگر علمی اور ادبی کتابوں کی طرح متعدد اہم تاریخیں فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں اور اپنے طور پر بھی متعدد مورخوں نے اپنی تاریخیں یادگار چھوڑی ہیں۔ لیکن تاریخ دکن سے مسلمانوں کی عام بے توجہی نے انھیں گوشۂ گمنامی میں ڈال دیا ہے اور یہ اہم ماخذ پراگندہ و منتشر ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ ضرورت ہے کہ علما ان کی طرف متوجہ ہوں اور انھیں تحقیق و تدقیق کے جدید ترین سائنٹفک اصولوں پر مرتب اور مہذب کرکے منظر عام پر لائیں۔

جامعۂ عثمانیہ اور اس کے سررشتۂ تالیف و ترجمہ اور دکن کے دوسرے اداروں نے اس کی طرف توجہ کی ہے لیکن یہ بھی کافی نہیں۔ جامعۂ عثمانیہ ہندوستان کی واحد جامعہ ہے جہاں اردو یا ہندوستانی کے ذریعہ قدیم و جدید علوم و فنون کی انتہائی تعلیم دی جارہی ہے۔ اس کا سررشتۂ تالیف و ترجمہ جدید ترین اصطلاحاتِ علمیہ اور علوم و فنون کو اردو کا جامہ پہنا کر ہندوستان کی سب سے بڑی علمی خدمت انجام دے رہا۔ اگر ایک طرف دکن ہی نے گزشتہ زمانہ میں ہندوستان کو ایک ادبی زبان عطا کی تھی تو دوسری طرف اسی زبان کو انتہائی علمی اور سائنٹفک بنانے میں دکن ہی سب سے پیش پیش ہے۔ جامعۂ عثمانیہ تمام ملک کی جامعات کے لئے ایک مثال اور ایک بہترین تجربہ ہے۔

جدید حیدرآباد ایک نشاۃ ثانیہ کے دور سے گزر رہا ہے اور ایک ایسی تاریخ بنا رہا ہے جسے آئندہ والے مورخ آب زر سے لکھیں گے۔ ایک طرف اگر وہ دکن کی قدیم روایات کو زندہ کئے ہوئے ہے تو دوسری طرف جدید ترین علوم و فنون کو اپنے دامن میں جگہ دے کر وہ سارے ہندوستان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ اس نہضت جدیدہ کی روح رواں اعلیٰ حضرت سلطان العلوم میر عثمان علی خاں بہادر نظام الملک آصفجاہ سابع کی ذات والاصفات ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نشاۃ ثانیہ کا دور اعلیٰ حضرت ہی کی مبارک تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے۔ اس مبارک ہستی کے مقدم سے دکن کے علمی اور تمدنی سرچشمے ابلنے لگے ہیں اور اہل اہل کو صرف دکن ہی کو نہیں بلکہ سارے ہندوستان کو سیراب کر رہے ہیں ؎ چوں مسیحا زندہ کردی علم و فن را اور دکن ۔ زندہ باد اے حضرت عثمان علی خاں زندہ باد!

سید مبارز الدین رفعت

فلسفی دوسروں کی نظر میں

مشہور شاعر برنز (Burns) کا ایک شعر مشہور ہے جس میں وہ دعا کرتا ہے کہ الٰہی مجھے ایسی نظر عطا ہو کہ میں اپنے آپ کو اس طرح دیکھ سکوں جس طرح دوسرے مجھ کو دیکھتے ہیں اگر کسی کو ایسی نظر مبدء فیاض سے عطا ہو جائے تو معلوم نہیں کہ کہاں تک اس کے لئے سکونِ قلب اور کہاں تک سوہانِ روح کا باعث بن جائے۔ کسی دولت مند کو اگر خوشامدیوں کی مسلسل تقریروں سے اتنا گہرا اشتغال ہو چکا ہے کہ وہ اپنے تئیں عقل میں افلاطون اخلاق میں ولی اللہ اور سخاوت میں حاتم سمجھنے لگا ہے اور اس حالت میں اس کو برنز کی طلب کردہ نظر مل جائے تو وہ ذہنی صدمے سے پاگل ہو جائے جب اس کو معلوم ہو کہ لوگ در اصل اس کو احمق کندۂ ناتراش ہوس پرست کمینہ اور ظالم سمجھتے ہیں کسی کو اس نظر سے یہ دکھائی دے کہ میرے گہرے دوست دل میں میری طرف سے حسد اور بغض رکھتے ہیں یا یہ کہ میری اولاد میری دشمن ہے۔ خدائے کریم غفار اور پردہ پوش ہے اسی لئے اس نے انسانوں کو عام طور پر یہ نظر عطا نہیں کی اس لئے بہ تقاضائے مشیت اکثر لوگ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں شائد اسی میں دنیا کی بھلائی ہے۔ اگر مجھ سے میری ذات کی نسبت یہ سوال کیا جائے کہ بتاؤ کہ لوگ تم کو کیا سمجھتے ہیں تو سوال بڑا ٹیڑھا اور ناقابل جواب ہوتا اور اگر میں اس کا جواب دیتا بھی تو اس کی صحت کی کیا ضمانت ہوتی۔ کہتے ہیں کہ ہر شخص میں شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو دوسرے اس کو سمجھتے ہیں دوسرے وہ جو وہ خود اپنے تئیں سمجھتا ہے اور تیسرے وہ جو در اصل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ دوسرے اس کو کیا سمجھتے ہیں اس رائے میں کوئی یکسانی نہیں ہو سکتی یہ انسان کی رائے کا مدار اس کے جذبات اور تعلقات اور اغراض پر ہے۔ اگر کسی شخص کو آپ سے محبت ہے تو وہ شائد آپ کو حسین بھی سمجھتا ہو اور اگر خدانخواستہ کسی کو آپ سے نفرت ہو تو آپ کا حسن اس کو بدصورتی نظر آئے گا۔ انسانوں کی رائے ایک دوسرے کے متعلق اضافی اور اعتباری ہوتی ہے۔ تعلق کے بدلنے کے ساتھ ہی نگاہ بھی بدل جاتی ہے۔ علاوہ ازیں رائے قائم کرنے والے کی عقل اور تجربہ بھی اس میں کارفرما ہوتا ہے۔ محدود عقل و تجربہ کا شخص آپ کی نسبت جو رائے رکھے گا وہ اس سے مختلف ہو گی جو وسیع عقل و تجربہ کا شخص قائم کرے گا شخصیت کی دوسری حیثیت کہ آپ اپنے تئیں کیا سمجھتے ہیں یہ بھی بہت پھسلنے کا مقام ہے خود اپنی نسبت انسان مستقل رائے نہیں رکھتا۔ سوا کسی ایسے مجنون یا جاہل مطلق کے جس کے دماغ میں اپنی بابت کوئی ایسا خیال جم گیا ہو کہ پتھر پر لکیر ہو گیا ہو۔ عام طور پر صحت میں انسان اپنی نسبت کچھ رائے رکھتا ہے اور بیماری میں کچھ اور۔ اس میں معدے کا بہت کچھ تعلق ہے ہاضمہ درست ہو نیند اچھی طرح آتی ہو زندگی کی رَو ہر رگ میں بے رکاوٹ بہتی ہو تو انسان محسوس کرنے لگتا ہے کہ میں کسی سے کم نہیں میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میری عقل میں کوئی فتور نہیں۔ میری نظر میں کوئی قصور نہیں۔ میں ایک غیر معمولی آدمی ہوں۔ اگر ابھی تک دوسروں پر میرے کمال کا اظہار نہیں ہو سکا تو اس میں ان کی نظر کی کوتاہی ہے یا محض نامساعد حالات کی وجہ سے یہ کندن ابھی خاک میں ملا ہوا ہے اور ہر ظہور کے لئے وقت مقرر ہے ۔

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

لیکن اگر ہاضمہ خراب ہو جائے نیند اڑ کر گدھے کے
سر کے سینگ بن جائے وہ ایک مرتبہ امتحان میں ناکامی یا تلاش
روزگار میں مایوسی ہونے لگے تو پڑا بالکل دوسری طرف جھک
جاتا ہے۔ وہی شخص کہنے لگتا ہے کہ میں نہایت بے ہمت شخص
ہوں، گنہگار ہوں، ہوس پرست ہوں. مجھ سے کچھ نہیں
ہوسکتا اور یہ خیال ترقی کرتا کرتا بعض اوقات خودکشی تک
لے جاتا ہے۔ اب بتلائیے کہ انسان کی اپنی نسبت جو رائے ہے
اس کا کیا اعتبار ہے، شدید بھوک لگی ہو تو رائے اور ہوتی
ہے اور پیٹ بھر جائے تو رائے اور ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات
ایک چائے کی پیالی سے تمام نظریۂ کائنات بدل جاتا ہے۔
میں نے یورپ میں دیکھا کہ فرانسیسی بیوپاری اس حقیقت سے
خوب آگاہ معلوم ہوتے ہیں. جب ان کو بڑا سودا کرنا منظور ہوتا
ہے تو ان میں سے ایک دوسرے کو کسی رسٹورنٹ میں مدعو
کرتا ہے کبھی چائے قہوہ یا شراب پر کبھی کھانے پر۔ جب پیٹ
کے جہنم میں کچھ ایندھن پڑ جاتا ہے تو دل و دماغ میں جنت
کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ اعصاب میں سکون آجاتا
ہے۔ سودا کرنے میں جھگڑے کا میلان کم ہو جاتا ہے اور
اتفاق اور سمجھوتے کا جذبہ غالب آجاتا ہے اگر آتش سیال
رگوں میں دوڑنے پھرنے لگے تو بعض اوقات بخیل بھی
غیر معمولی فیاضی پر تیار ہو جاتا ہے۔ وقت کے حدود کے مدنظر
ہم اس تمہید کو طول نہیں دے سکتے اسی انداز پر باقی خود
سوچ لیجئے گا۔ تیسری حقیقت یہ کہ انسان خود در اصل کیا
ہے تو اس کا علم سوا خدا کے کس کو ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ
خدا یہ علم کسی کسی برگزیدہ بندے کو عطا کر دیتا ہے اگر یہ واقعہ
ہے تو اس سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

اب ہم اصل عنوان کی طرف آتے ہیں. فلسفی دوسروں
کی نظر میں ایک فلسفی جس کا نام سقراط تھا اور جس کی حکمت
لوگوں کو ایسی ناگوار معلوم ہوئی کہ اس کو زہر پلا دیا، اس نے
بڑی بڑی گُر کی باتیں کہی ہیں جن میں سب سے پہلی اور سب سے
مقدم یہ ہے کہ بحث سے پہلے الفاظ اور اصطلاح کی تعریف
اور تحدید کر لیا کیجئے ورنہ بحث مبہم رہتی ہے اور خبط بحث کے
سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے
فدا یہ سمجھ لیں کہ فلسفی کسے کہتے ہیں۔ فلسفے کا عروج مغرب میں
زیادہ تر یونان میں ہوا۔ یہ لفظ بھی یونانی ہے اس کے معنی
ہیں عقل سے محبت کرنے والا۔ انسان اپنے آپ کو عاقل حیوان
کہتا ہے۔ عقل تھوڑی بہت سب میں ہوتی ہے اور ہر شخص کو
اپنی عقل دوسرے کی عقل سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔ یونانی
حکماء عقل کو جوہر انسان اور اصل حیات سمجھتے تھے۔ عقل کی
تلاش اور عقل کے مطابق زندگی کو ڈھالنا ان کا بلند ترین
مقصد تھا جس طرح اور قوموں میں رشی یا نبی یا ولی کا مرتبہ
بلند شمار ہوتا ہے اسی طرح یونان میں عاقل یا حکیم یا فلسفی انسانیت
کی معراج تصور ہوتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ گہری سوچ والا آدمی عام معیارات کے مطابق
خبطی سا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ انسان کی توجہ اسی وقت بڑے
بڑے نتائج پیدا کرتی ہے جب وہ گردوپیش سے بےخبر ہو کر
ایک چیز پر مرتکز ہو جائے۔ رسم و رواج کی پابندی اور اعتدال
ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ اپنے خاص کام کو چھوڑ کر باقی چیزوں
کے لئے انسان مجنون اور احمق سا بن جاتا ہے یا کم از کم ایسا
معلوم ہوتا ہے۔ سقراط کو لیجئے جو یونان کے فلاسفہ میں نہایت
برگزیدہ شمار ہوتا ہے۔ عام لوگ کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرتے ہیں۔

یہ شخص کوئی کام نہیں کرتا تھا اور اپنا پیشہ تلاش حقیقت بتاتا تھا۔ فقط باتیں کرتا تھا اور عام لوگوں کو ایک سخن فروش معلوم ہوتا تھا۔ کہیں کسی سوچ میں کھڑے ہیں تو بارہ گھنٹے رات کے گزر گئے ایک جگہ سے نہیں ہلے۔۔ ایسے نکھٹو شخص کی بیوی اس کا بھلا کیا حشر نہ کرتی ہوگی۔ کمائی ندارد کسی بحث مباحثے کی محفل میں دو دو راتیں گھر سے بے اطلاع غائب۔

کہتے ہیں کہ سقراط کی بیوی بہت تلخ مزاج اور بد زبان تھی اور اس کا براحال کرتی تھی۔ اس کا نام زنتھپ تھا۔ بیگم صاحبہ کو اس پر اور غصہ آتا تھا کہ گالی کا جواب گالی یا طمانچہ سے نہیں دیتا بلکہ خاموش رہتا ہے یا مسکرا دیتا ہے۔

ایک مرتبہ دیر تک غائب رہ کر گھر تشریف لائے تو بیوی ایسی گرمیں کہ الاماں۔ جب میاں ٹس سے مس نہ ہوئے تو اس نے پانی کا ایک گھڑا ان پر الٹ دیا کہ اب تو اس کو غصہ آئے گا اور کچھ تو تو میں میں ہوگی۔ پانی پڑتے ہی وہ ہنس پڑا فرمایا کہ اس قدر گرجنے کے بعد تھوڑا بہت برسنا لازمی امر تھا۔ شیخ سعدی عام طور پر فقط شاعر مشہور ہیں لیکن تھے وہ بھی بڑے فلسفی۔ فلسفے اور شعر کا امتزاج ہو جائے تو دنیا کے مقررہ نظامات میں ایسے مرکب کا بھلا کیا ٹھکانا۔ ان کی جہاں گردی میں ایک مرتبہ فرنگیوں نے گرفتار کر لیا اور بطور غلام طرابلس میں ایک شخص کے ہاتھ کچھ رقم کے عوض بیچ دیا۔ خریدنے والے کی ایک بدمزاج بیٹی کہیں قبول نہیں کی جاتی تھی۔ سعدی کو آمادہ کرکے اس سے نکاح پڑھا دیا اب بتائیے کہ ایسی عورت اس کے فلسفے اور شعر کی کیا داد دیتی۔ بیچارے سعدی کی جو آئی شامت کسی دوست کو گھر ہمراہ لے آئے اور اندر کہلوا بھیجا کہ دو آدمیوں کے لئے کھانا تیار کر دیجیے۔ تاخیر معلوم ہوئی تو خود اندر گئے۔ بیوی نے خالی ہنڈیا سر پر دے ماری تلا ٹوٹ کر حلقہ گلے میں پڑ گیا۔ اسی طرح باہر دوست کے پاس تشریف لائے، دوست نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا تماشا ہے فرمایا کہ "دو گلو یم سنتِ پیغمبریست"

اس قسم کے اور کئی واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفی گھریلو زندگی کے لئے موزوں نہیں ہوتا اس کی بھی وجہ وہی ہے کہ جن چیزوں میں وہ منہمک ہوتا ہے وہ تلاش روزگار اور بیوی کو خوش رکھنے کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں رکھتیں۔

ایک مصنف نے تیس بڑے فلسفیوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ نصف کے قریب ایسے تھے جنھوں نے یہ عقلمندی کی کہ شادی ہی نہیں کی جنھوں نے کی ان میں سے زیادہ تعداد ایسی تھی جو اس زندگی کو خوش اسلوبی سے نہیں نباہ سکے۔

غرض یہ کہ اس نوع کی نظیریں ہیں۔ جبھی کہتے ہیں فلسفی ایک نہایت نامعقول انسان کو کہتے ہیں۔

اسی طرح ان میں سے شاید دس میں سے ایک ایسا ہو جو جاہ و مال بھی پیدا کر سکا ہو یا اس کو سنبھال سکا ہو۔ یا روزمرہ کی زندگی میں اس کی سمجھ بوجھ صحیح رہی ہو۔

نیوٹن کی نسبت عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ اس کو یاد نہیں رہتا تھا کہ کھانا کھایا یا نہیں ایک مرتبہ ملازم کھانا رکھ گیا ان کو خبر بھی نہ ہوئی ایک دوست آیا اور وہ ان کا کھانا کھا گیا بعد میں برتن اور کچھ پس خوردہ دیکھ کر نیوٹن نے خیال کیا کہ میں نے کھانا کھا لیا ہے اور اس نفسیاتی دھوکے سے غالباً سیری بھی محسوس ہونے لگی۔ ایک طرف وہ عقل ہے کہ شمس و قمر کے فاصلے ناپ رہی ہے اور اجرام فلکی کو ترازو میں تول رہی ہے۔ دوسری طرف یہ حال ہے کہ رات کو باغ کا

پھاٹک بند ہوجاتا تھا تو ان کی بلی اور اس کے بچے باہر سڑک
پر میاؤں میاؤں کرکے ان کے ذہنی مشغلے میں خلل انداز ہوتے
تھے سردی میں رات کو خود اٹھ کر پھاٹک کھول کر ان کو اندر
کرنا پڑتا تھا۔ سوچا کہ اس زحمت سے کس طرح نجات ہو۔
بڑھئی کو بلایا کہ اس پھاٹک میں ایک بڑا سوراخ اور دو چار
چھوٹے چھوٹے سوراخ کردو۔ بڑھئی نے حسب الحکم یہ خدمت
انجام دے دی دوسرے روز ایک دوست آئے اور انھوں نے
پوچھا کہ آپ نے پھاٹک میں یہ بڑے چھوٹے سوراخ کیوں
کروائے۔ جواب ملا کہ بلی اور اس کے بچوں کا دھندا تھا۔
باہر رہ جاتے تھے تو رات کو اٹھ کر پھاٹک کھولنا پڑتا تھا۔
بڑا سوراخ بلی کے لئے اور چھوٹے سوراخ بچوں کے لئے
کرائے ہیں۔ دوست نے کہا کہ کیا بڑے سوراخ میں سے
بلی اندر آسکتی ہے تو بچے اسی سوراخ سے اندر نہیں آسکتے؟
ایک بڑا سوراخ کافی تھا چھوٹے سوراخوں کی کیا ضرورت تھی۔
نیوٹن کہنے لگے کہ بھائی سچ کہا لیکن یہ حکمت مجھے نہیں سوجھی
اب بتائیے کہ لوگ ایسے فلسفی کو کیا سمجھیں اس کی ریاضی اس کی
فلک پیمائی اور قانون تجاذب تو کوئی پروفیسر ہی سمجھے گا اور
داد دے گا جو چیز عام لوگوں کو سرراہ نظر آئے گی وہ فقط
اس کی غائب نفسی اور حماقت ہے۔ فلسفیوں کی غائب نفسی کے
سیکڑوں قصے مشہور ہیں کوئی بہت تھکا ہوا باہر سے آتا ہے
عصا کو بستر میں لٹا دیتا ہے اور خود عصا کی جگہ کونے میں کھڑا ہوجاتا
ہے۔ گھڑی دیکھ کر انڈا ابالنے بیٹھتا ہے تاکہ انڈا نیم جوش
رہے۔ گھڑی کو کیتلی میں ڈال دیتا ہے اور انڈا ہاتھ میں
لے کر ٹکٹکی باندھے سوچنے لگتا ہے۔ کسی ساقی کے ہوش تو
معشوق کے حسن سے اڑ گئے تھے

کسی کے آنے سے ساقی کے ایسے ہوش اڑے
شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشے میں

لیکن یہاں کسی مسئلے کے حسن نے وہی کیفیت پیدا کردی فلسفی
باہر سے خود موٹر چلاتا ہوا گھر پہنچتا ہے۔ دوسرے موٹر خانے
کا پھاٹک کھلا ہوا اور موٹر خانہ خالی دکھائی دیتا ہے تو بھک سے
رہ جاتا ہے کہ میرا موٹر کوئی لے گیا۔ کبھی عینک لگا کر اس عینک کو
تمام گھر میں تلاش کرتا پھرتا ہے۔

ایک عام خیال فلسفیوں کے متعلق یہ ہے کہ وہ بال
کی کھال نکالنے اور کج بحثی کے عادی ہوجاتے ہیں۔ مہمل سے
مہمل چیز کو صحیح ثابت کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ ایک
برخوردار منطق پڑھنے لگے۔ فن استدلال کی شدھ بدھ
پر بہت اترانے لگے۔ دسترخوان پر سب کنبہ کھانے کے لئے
بیٹھا والد ماجد نے پوچھا کہ برخوردار کیا پڑھتے ہو جواب ملا
کہ منطق۔ باپ نے پوچھا وہ کیا علم ہے اور کس کام آتا ہے؟
فرمایا کہ بحث و استدلال کے کام آتا ہے اور انسان جو کچھ
چاہے ثابت کرسکتا ہے اور جس کو چاہے جھٹلا سکتا ہے۔
استدلال کی دنیا میں وہ سیاہ و سفید کا مالک ہے جب چاہے
سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید ثابت کردے۔ باپ نے پوچھا
کہ کوئی مثال تو دو۔ بیٹے نے کہا کہ دیکھیے یہ کتنے انڈے دسترخوان
پر پڑے ہیں۔ جواب ملا کہ دو۔ بیٹے نے کہا کہ اگر میں چاہوں
تو ثابت کردوں کہ تین ہیں پوچھا وہ کیسے؟ کہنے لگا دیکھیے میں
گنتا ہوں: ایک، یہ دو، ایک اور دو تین۔ باپ عملی آدمی تھے دونوں
انڈے اٹھا کر کھا گئے اور کہا وہ ثابت کردہ تیسرا منطقی انڈا تم کھالو۔

۱۹۲۳ء میں میں جرمنی میں گیا سنا کہ ایک اچھا
سرکس یہاں آیا ہوا ہے شام کو تفریح کے لئے میں تماشا

دیکھنے گیا۔ عام رواج ہے کہ سرکس میں ایک مسخرہ ہوتا ہے جو جانوروں کے کھیل اور بازیگری کے درمیانی وقفوں میں حاضرین کو اپنے تمسخر سے ہنساتا رہتا ہے۔ وہ مسخرہ آیا اور اس کے ساتھ اس کا ایک دوست تھا۔ دوست نے مسخرے سے پوچھا کہو بھئی آج کل کیا مشغلہ ہے جواب ملا کہ فلسفہ پڑھتا ہوں۔ بھائی وہ کیا علم ہے۔ مسخرے نے کہا کہ علم کیا ہے کرامات ہے اور جادو ہے جو چاہیں ثابت کردیں جس کے منہ سے جو چاہیں کہلوادیں۔ دوست نے کہا کہ اچھا ایک نمونہ ہو جائے۔ مسخرے نے کہا کہ میں یہ ثابت کر دیتا ہوں کہ تم یہاں نہیں ہو اور جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے خود تمہارے منہ سے کہلوادوں گا۔ دوست نے کہا کہ اچھا شروع کرو ہم بھی کچھ ایسی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہیں۔ مسخرے نے کہا کہ میں جو سوال پوچھوں جلدی جلدی اس کا جواب دیتے جاؤ۔ یہ سرکس فرائبرگ میں تھا۔ اس نے کہا کہ اچھا کیا تم اس وقت جاپان میں ہو اس نے کہا نہیں چین میں ہو اس نے کہا نہیں لندن میں ہو نہیں اچھا بتاؤ پیرس میں یا روم میں ہو یا کہیں اور۔ اس نے کہا پیرس یا روم میں نہیں ہوں کہیں اور ہوں۔ مسخرے نے کہا کہ کہیں اور ہو تو پھر ظاہر ہے کہ یہاں نہیں ہو۔

غرض یہ کہ فلسفیوں کی نسبت ایسے خیالات بہت عام ہیں کہتے ہیں کہ کسی اونچی دیوار پر گوبر کے اپلے تھپے ہوئے دیکھ کر ایک فلسفی حیران کھڑا تھا کہ اس سیدھی دیوار پر گائے کیسے چڑھی کوئی کہتا ہے کہ فلسفہ اس بحث کا نام ہے کہ مرغی انڈے سے نکلی یا انڈا مرغی سے۔

مذہب والوں کو جو فلسفیوں سے بغض ہے اس کے اسباب بالکل الگ ہیں۔ مذہب کے حقائق عقل کی گرفت میں نہیں آتے اسی لئے مذہب کی بنا کچھ ایمان پر ہے اور کچھ وجدان پر۔ عام طور پر فلسفی عقل کو ایمان اور وجدان دونوں سے بہتر رہنما سمجھتے ہیں۔ انتہائی مسائل میں عقل چکر کھاتی رہتی ہے۔ مذہبی لوگ فلسفیوں کو عام طور پر کافر یا متشکک سمجھتے ہیں۔ ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

اب سوال یہ ہے کہ ان عقل کے عاشقوں کو دوسرے کیا سمجھتے تھے۔ پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ دوسروں کے نقطے میں کتنے طبقے ہیں ایک عوام کالانعام کا طبقہ ہے۔ اکثر بزرگ یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ عوام گدھے ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی بھی یہی رائے تھی فرماتے ہیں کہ اکثر لوگ گودن ہوتے ہیں لیکن گدھے گدھے میں بھی فرق ہوتا ہے کوئی خر عیسیٰ ہے اور کوئی خر دجال اگر گدھوں کی تیسری قسم کا ذکر بھی کر دیتے تو اچھا ہوتا جن کو نہ عیسیٰ کا گدھا ہونے کا ثواب حاصل ہے اور نہ دجال کے گدھے ہونے کا امتیاز۔ محض بار برداری اور اجرت میں پشت پر چوب زنی۔ یہی مرزا غالب تھے جنہوں نے روح القدس سے پوچھ کر حین حیات میں ہی تاریخ وفات بھی کہہ ڈالی تھی اس سال میں وصال نہ ہوا تو لوگوں نے کہا کہ حضرت پیشین گوئی غلط ہوگئی فرمانے لگے کہ پیش گوئی میں کوئی غلطی نہیں تھی موت اسی سال مقرر تھی لیکن سوء اتفاق سے وبائے عام پھیل گئی اور میں نے عوام کے ساتھ وبائے عام میں مرنا ہتک سمجھا اس لئے مرنا ملتوی کر دیا۔ اب عوام کو چھوڑ کر خاص لوگوں کو لیجئے۔

امرا عام طور پر علم دوست نہیں ہوتے لیکن بعض عالم دوست ہوتے ہیں اپنے درباروں اور محفلوں کی آرائش و رونق کے لئے علما ادبا شعرا اور حکما کی تھوڑی بہت قدر دانی کرتے ہیں زر و مال سے علم و فن کی داد دے لیتے ہیں ان تحسین ناشناس سے ارباب علم و فن کو کچھ کچھ فائدہ پہنچ جاتا ہے اور کبھی کبھی تختہ بھی الٹ جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ دوسروں کے وسیع لفظ میں یہ سب طبقے شامل ہیں اب ہم ایک سرسری نظر اس پر ڈالیں گے کہ غیر فلسفی لوگ جن میں امیر اور غریب عملی اور غیر عملی مذہبی اور غیر مذہبی سبھی قسم کے لوگ شامل ہیں اس نوع کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں جس کو فلسفی کہتے ہیں۔

مولانا روم فرماتے ہیں ؎

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت
ہاں بگو او را سوئے گنج است پشت

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ اگر دین استدلال ہوتا تو فخرالدین رازی جیسا منطقی راز دار دین ہوتا۔ استدلالیوں کی ٹانگیں لکڑی کی ہوتی ہیں۔ نہ لڑکھڑانے کے بغیر کھڑے ہو سکتے ہیں نہ دوڑ سکتے ہیں ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم

بس فلسفی یہیں تک پہنچا ہے کہ کائنات ایک پرانی کتاب ہے جس کے پہلے اور آخری اوراق گر گئے ہیں نہ مصنف کا پتہ نہ ابتدائی باب معلوم اور نہ کہانی کے انجام کا پتہ۔ ایسی حالت میں صوفی یا مومن فلسفی کو کیسے صاحب بصیرت قرار دے سکتا ہے۔ پوچھا جائے گا کہ جب عوام فلسفیوں کو احمق سمجھتے ہیں اور عملی آدمی ان کو کج فہم اور کج عمل اور اہل دین ان کو گمراہ خیال کرتے ہیں تو ان کو عاقل سمجھ کر قدر کرنے والا کون طبقہ باقی رہ جاتا ہے اس کا جواب شائد پہلے یہ سوجھے کہ عاشق کی قدر عاشق ہی کر سکتا ہے اسی طرح فلسفی کی قدر فلسفی ہی کر سکتا ہے تو یہ جواب بھی تشفی بخش نہیں ہو سکتا ہے اس لئے کہ ہر فلسفی دوسرے فلسفی کو احمق ثابت کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ فلسفے کے مباحث میدان کارزار بنے ہوئے ہیں ہر بڑے فلسفی کو کسی دوسرے بڑے فلسفی نے غلط ثابت کرنے میں تمام عمر صرف کر دی معلوم ہوا کہ فلسفی بھی فلسفی کی قدر نہیں کرتا۔ باقی ایک ہی بات رہ جاتی ہے کہ کوئی قدر نہیں کرتا تو چلو ہم خود ہی اپنی قدر کریں ؎

لائق مدح در زمانہ چو نیست
خویشتن را ہمی سپاس کنم

(دکن ریڈیو کی ایک تقریر)

خلیفہ عبدالحکیم

تعلیم کا مسئلہ:۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ قیمت عہ

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کی ایک جدید کتاب "تعلیم کا مسئلہ" شائع ہوئی ہے۔ جس میں حسب ذیل عنوانات پر مفید اور ضروری معلومات درج ہیں۔

۱۔ تعلیم و تربیت کا مقصد ۲۔ تعلیم کی مدت ۳۔ موجودہ نظام تعلیم کے نتائج و نقائص ۴۔ اعلیٰ تعلیم کا صحیح نصب العین ۵۔ علم کی وحدت ۶۔ انسانی وحدت کی تعلیم ۷۔ ایمان اور علم ۸۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم ۹۔ تعلیمی تدریس اور نصاب ۱۱۔ جامعہ کے شعبہ جات ۱۲۔ طالب علم اور عملی سیاسیات۔

صبیحہ

بدنصیب لڑکی! اس نے کسی وقت سکھ نہ پایا۔ ابھی وہ کم سن ہی تھی کہ اس کی ماں اس سے جدا ہوگئی۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوئی اس کی مصیبتوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کے مظالم اسی امید پر سہتی رہی کہ شادی کے بعد وہ خوشی اور چین کی زندگی بسر کر سکے گی۔ مگر شائد وہ پیدا ہوئی تھی غم اور دکھ سہنے کے لئے اس کی شادی ایک متوسط گھرانے میں کر دی گئی۔ لیکن وہاں بھی وہ سکھی نہ رہ سکی۔ اس کا شوہر اس کو اپنی بوڑھی ماں کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لئے مجبوراً بیاہ کر لایا تھا۔ وسیم صبیحہ سے رکا رکا سا رہتا۔ مگر وہ اس سے بیحد محبت کرتی۔ وسیم ہمیشہ کسی خیال میں کھویا ہوا اور اداس نظر آتا۔ صبیحہ کو یہ محسوس کر کے بہت رنج ہوتا وہ سوچا کرتی کہ اس نے شادی سے پہلے اپنی آئندہ زندگی کے متعلق کتنے حسین خواب دیکھے تھے۔ شائد ان کی یہی تعبیر ہو۔ اب اس کو یقین ہو چلا تھا کہ وسیم کی زندگی سے ضرور کوئی رومان وابستہ ہے۔ وہ اس کو معلوم کرنے کی کوشش میں ہمیشہ ناکام رہتی۔ ایک روز صبیحہ کے اصرار پر وسیم نے اس سے سب کچھ کہہ دینے کا ارادہ کر لیا۔ اسی خیال سے کہ شائد وہ اس کے غم میں شریک ہو سکے وسیم کہہ رہا تھا صبیحہ! میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔ میں تمہاری محبت کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ مگر میں اس کا جواب دینے سے مجبور ہوں۔ تمہارے دکھ کا مجھے اچھی طرح احساس ہے۔ کیونکہ میں نے بھی محبت کی ہے۔ شیاما سے۔ جو میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ کیونکہ انسان اپنی زندگی میں صرف ایک دفعہ محبت کرتا ہے۔ شیاما حسین اور سندر شیاما! وہ ہمارے کالج کی ایک ہونہار اور ذہین لڑکی تھی۔ اس کے اور میرے خیالات کچھ ایک سے واقع ہوئے تھے اسی وجہ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ مطالعہ کے سوا ہم دونوں کا محبوب ترین مشغلہ مصوری اور شاعری تھا وہ قدرتی مناظر کی تصویریں کھینچ کر لاتی میں گھنٹوں ان کی نفاست اور باریکیوں کی داد دیتا۔ اور ان ہی مناظر کو شاعری میں پیش کرتا جس کو وہ اپنی بنائی ہوئی تصویر کا عکس کہتی۔ سچ جانو صبیحہ! کسی وقت بھی ہم دونوں نے ایک دوسرے سے اظہار محبت نہیں کیا۔ زبان محبت کی ترجمانی نہیں کر سکتی۔ ہم دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پوجتے رہے۔ کالج میں بھی آپس میں باتیں نہ کرتے مگر کلاس میں اکثر ہمارے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی رہتیں۔ کالج کے ہر مباحثے میں ہم حصہ لیتے اور مقابلے میں انعام ہم دونوں ہی کو ملتا۔ تمام لڑکے اور لڑکیاں ہمیں کالج کا ہیرو اور ہیروئن کہتیں۔ اور ہم ایک دوسرے کی کامیابی پر دل ہی دل میں خوش ہوتے۔ کاش! اس حسین شام کی کبھی صبح نہ ہوتی۔ مگر صبیحہ! انسان کی ہر خواہش اگر اسی طرح پوری ہو جاتی تو دنیا میں رنج اور غم کا وجود ہی نہ ہوتا جس سے ہر ایک کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کالج کی تعلیم ختم ہونے کے بعد میں تلاش معاش میں سرگرداں رہا۔ مجھے زمانے تک شیاما کو دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ لیکن ہمیشہ اس کی محبت میرے دل میں بسی رہی۔ میں اکثر اسی کے گھر جانے کا ارادہ کرتا۔ مگر یہ

سوچ کر کہیں اس کے پتا آنے سے منع نہ کردیں نہ جاتا۔ آخر ایک دن میں شیاما کے گھر گیا۔ اس کے پتا گھر پر موجود تھے۔ میں نے اپنا نام اور پتہ بتلایا اور شیاما سے ملنے کی خواہش کی۔ انھوں نے وہیں سے آواز دی۔ "شیاما تمھارے کالج کا کوئی لڑکا وسیم تم سے ملنے آیا ہے۔" یہ سنتے ہی وہ دوڑتی ہوئی آئی اور مجھے دیکھ کر نظریں نیچی کرلیں۔ میں اس کو دیکھ کر پہچان نہ سکا کہ یہ وہی شیاما ہے جس کا چہرہ ہمیشہ کنول کی طرح لہلہا رہا تھا۔ وہ اب غم کی مجسم تصویر معلوم ہورہی تھی۔ ہم ابھی ایک دوسرے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ شیاما کے پتا نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا "بھگوان داس کو جانتے ہو نا۔ ؟ وہی جن کی بہت سی کوٹھیاں اس محلہ میں بنی ہیں ان ہی سے شیاما کا بیاہ طے پاگیا ہے۔" یہ سن کر میں نے ایک حسرت بھری نگاہ شیاما پر ڈالی اس نے بھی مجھے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا اور پتا کی آنکھ بچا کر ان آنسوؤں کو پونچھ ڈالا۔ نہیں کہہ سکتا صبیحہ!! ـــ کہ میں نے ان آنکھوں میں کیا دیکھا۔ میں زیادہ دیر وہاں نہ ٹھیر سکا۔ واپس چلا آیا۔ پھر میری ہمت نہ ہوئی کہ اس کو جا کر دیکھوں۔ چند دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس کا بیاہ ہوچکا۔ اسی اثناء میں والدہ سخت بیمار ہوگئیں اور انھوں نے اپنی دیرینہ آرزو کو پورا کرنے کی آخری خواہش کی۔ میں نے تم کو بیاہ کر ان کی یہ خواہش پوری کردی۔ ان کی روح تو یقینی مطمئن ہوگی۔ مگر صبیحہ! میں نے تم پر بڑا ظلم کیا۔ کیا تم مجھے معاف نہ کروگی ـــ؟ صبیحہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے "معاف ـــ" وہ تو وسیم کے لئے اپنی جان تک دینے کو تیار ہوگئی ـــ مگر وہ کس طرح اس کی مدد کرے ـــ؟ جب کہ شیاما کا بیاہ بھی ہوچکا ہو۔ بے چاری ـــ بدنصیب صبیحہ!

صغریٰ عبدالرحیم

رات کا بھولا اور دیگر افسانے۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی۔ صدر شعبہ اردو، فارسی و عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائیٹل ملک کے بلند پایہ حسن کار مظہر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے صفحات ۱۹۸ قیمت عہ

محبت کی چھاؤں۔ مرزا ظفرالحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں ہر افسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العین معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

۱۳۰ صفحات قیمت مجلد سہ

مٹھاس کی تلخی

بہت زیادہ میٹھی چیزیں بھی آخر میں کتنی تلخ اور کڑوی ہوجاتی ہیں۔ بہت زیادہ ملنے جلنے سے وقعت وعزت گھٹ جاتی ہے۔ آپس میں شکر رنجی، نوک جھونک طعن وطنز، غرض کیا کچھ نہیں ہوجاتا۔

اعتدال زندگی کے ہر زاویہ پر مناسب جگہ بناتا ہے۔ چاند کمال کو پہنچ کر گھٹنے لگتا ہے۔ دریا میں طغیانی آتی ہے تو ساحل بھی پاش پاش ہوجاتا ہے خوشی کے آنسو بھی کھارے ہوتے ہیں۔ محبت کا درجۂ حرارت جب حد سے سوا ہوجاتا ہے تو چشمِ فلک میں یہ دونوں محبت کرنے والے خار بن کر کھٹکنے لگتے ہیں۔ کمند ٹوٹ جاتی ہے زینہ گر جاتا ہے۔

آفتاب اپنی پوری تمازت کے ساتھ جب چمکنے لگتا ہے تو ساری دنیا کو جھلسا دیتا ہے۔ ہوا کا عنصر انسانی زندگی کے لئے کتنا ضروری ہے۔ لیکن اس کی تیزی اور تندی انسان کے قدم جمنے نہیں دیتی۔ تناور درخت جڑ پیڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ اونچی اونچی سربفلک عمارتیں قدم بوس ہوجاتی ہیں۔

بڑی سی بڑی مسرت کو حاصل کرنے کے بعد دل کیوں مطمئن و آسودہ نہیں رہتا؟ عیش وطرب کی فراوانی میں ایک پستی کا سا کمتا احساس کیوں ہونے لگتا ہے؟ یہ مٹھاس کی تلخی نہیں تو پھر کیا ہے؟ بڑی سی بڑی کامیابی و کامرانی پر بھی دل کی بستی کا ایک حصہ خالی خالی سا محسوس ہوتا ہے۔ اس موہوم سے جذبے کو کیا کہتے ہیں؟ اس کیفیت کا کیا نام ہے؟ اس حقیقت پر کون روشنی ڈال سکتا ہے؟

ایک پُرخلوص اور سچے دوست سے بھی تم کو تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ اس رنجیدہ احساس کے کیا اسباب ہیں؟ نہ جانے یہ سب کیوں ہوتا ہے!

جو تم کو بے حد و انتہا یاد آتا ہے وہی تم کو بھول جاتا ہے۔ تم اپنے بھول جانے والے کو کیوں یاد کرتے ہو؟ اس سعیٔ لاحاصل پر کیوں لاشعوری طور پر مجبور رہو۔ مسرتوں کے ہجوم میں تم کھوئے کھوئے سے کیوں رہتے ہو؟ وہ چیز جو تمہیں حاصل ہونے کی تھی۔ مل چکی۔ پھر اور وہ کونسی چیز ہے جس کے ملنے کا تمہیں احساس ہے؟ یہ سب کیا اور کیوں ہماری تمہاری زندگی سے کتنے قریب رہتے ہیں۔ نہ جانے کیوں۔ ہتے ہیں

بہت زیادہ اچھی چیزیں بہت زیادہ مضر وخطرناک ہوتی ہیں۔ بعض وقت تو مہلک بھی۔ ایک: ہیرا دوسرا زہر ان سے پہنچایا جاتا ہے حُسن کی قربت سے ہی کچھ تو ہوتا ہے یعنی

ع جس کو جتنا ہوش ہے اتنا ہی وہ بیہوش ہے

یہی چاندنی راتیں، کتنی سہانی اور روح پرور کیفیت کا نام ہے۔ لیکن یہی کیفیت دیوانہ بھی بنا دیتی ہے۔ جذبات میں تلاطم، دماغ میں ہیجان، دل میں ایک ہذیانی سی نوعیت کا احساس، اعضاء میں کشاکش بہم۔ اور جانے کیا کیا۔ بیمار جب سنبھالا لیتا ہے اس کا وقت آچکتا ہے۔ زخم جب سوکھنے لگتا ہے، اس میں زیادہ گدگداہٹ ہونے لگتی ہے۔ چراغ جب بجھنے کو ہوتا ہے اس کی لو جگمگ جگمگ کرنے

لگتی ہے۔ شمع کا التزام یہ ہے کہ وہ بکھر جائے۔ محبت کی انتہا شاید اسی لئے باعثِ نفرت ہے۔ اچھے بھلے ہیں وہ جو اس آگ سے دور رہتے ہیں۔ ایک چٹان کی طرح مضبوط و مستحکم۔ جیسے ان تلوں تیل ہی نہیں۔ لیکن شاید بارود کا ڈھیر سلگنے سے پہلے بجھا بجھا ہی رہتا ہے۔

یہ شاعر نہ ہوں تو ہماری زندگی ہی ختم ہو جائے۔ زندگی کے ان حقائق پر وہی کچھ کہہ سکتا ہے۔ دکھے ہوئے مایوس و افسردہ دلوں کے لئے شاعری کتنا بڑا سہارا ہے۔ کتنی ڈھارس ہوتی ہے اور پھر اس شعریت سے بھری ہوئی دنیائے رنگ و بو میں کوئی شعر ایسا مل جاتا ہے جو تمہارے مضطرب دل کو اور زیادہ مضطرب کر دیتا ہے تو تم بے اختیار کہنے لگتے ہو ؎

کس طرف جاؤں، کدھر دیکھوں، کسے آواز دوں؟
اے ہجومِ نامرادی، جی بہت گھبرائے ہے

غالب کی شاعری زندگی کے ہر پہلو پر محل محل کر دھاوے کرتی ہے۔ اس کے دیوان میں ہر موضوع کا شعر ملتا ہے۔ یہ ہماری تمھاری زندگی کے ہر واقعہ سے کھیلتا ہے۔ بعض وقت تو ہماری زندگی پر اس کے خیالات اتنے چسپاں ہوتے ہیں کہ خود اس کی "اپنی" زندگی پر بھی شاید نہ ہوئے ہوں گے۔ مثلاً یہ شعر ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، وہ پریشاں نکلا

میر اپنی محبت کو چھپانا چاہتے ہیں ؎

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

سودا کتنی سنجیدگی و اطمینان سے اس اعتراض کو سن لیتا ہے۔ لیکن اپنے انتخاب پر اس کو ناز ہے ؎

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

میر درد کی مایوسی و بدگمانی کی تحقیقاتی فیصلہ کن تشریح یہ ہے ؎

یہ تحقیق ہے یا کہ افواہ ہے
کہ دل کے تئیں دل سے بھی راہ ہے

ان میٹھی میٹھی باتوں میں کتنی تلخی ہے۔ یہ درد بھرے بول بظاہر کتنے اچھے ہیں۔ لیکن ان کے تاثرات کی تلخیوں کی سہار کس میں ہے۔

یہ جہاں آفریں کی کیسی کارفرمائی ہے۔ دل دیا، اس سے اطمینان چھین لیا دماغ دیا، اس سے سکون لوٹ لیا۔ ایک مشتِ خاک کو انسان بنا کے خواہ مخواہ اس کی مٹی پلید کر دی

ان خیالات میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ ایک تخیل دوسرے سے نہیں ملتا۔ لیکن بقول مولانا نیاز فتحپوری "مجھے تو موتی کچھ بکھرے ہوئے ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔"

پابندیوں سے انسان کتنا گھبراتا ہے۔ سلکِ تخیل کو جا بجا سے ٹوٹ ہی جانا چاہیے۔ ترتیب، تنظیم، سلیقہ یہ سب پرسکون اطمینان کی باتیں ہیں جو دل مطمئن نہیں وہ بس یہی کہہ سکتا ہے ایک شعر ہے کسی کا اور غالباً یہ بحث اب اسی پر ختم ؎

اے کاش کوئی کہہ دے مل کر یہ باغباں سے
گل مطمئن نہیں ہے، ترتیبِ گلستاں سے

جہاں بانو بیگم

روسو کے اقوال

انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پابزنجیر ہے۔

فطرت کے معنی ہیں، سادگی، بھلائی، مساوات اور سب سے بڑھ کر آزادی۔ برخلاف اس کے تہذیب و تمدن کے لوازمات ہیں، تعیش، بد اخلاقی، غلامی اور ایمان و یقین کی کمزوری۔

جس قدر ہمارے علوم و فنون ترقی کرتے جاتے ہیں اسی قدر ہماری روحانی زندگی برباد ہوتی جاتی ہے۔

عشق ــــــ! انسان کی بے غرضانہ محبت ہے۔

قوم اپنے برُے بھلے کی مختار ہونی چاہیے۔

ایسا دستور ترتیب دینا ناممکن ہے جو ہر ملک کے لئے یکساں طور پر موزوں ہو۔

غیر ملکی کبھی کسی ملک کے لئے مناسب قوانین وضع نہیں کر سکتا۔

تعلیم کا مقصد ہے سمجھدار انسان پیدا کرنا۔

ضمیر انسان کے دل کی آواز ہے۔

آزادی۔ غیر ذمہ دارانہ بے لگامی کا نام نہیں۔ آزادی کی لازمی شرط ہے پابندی۔ مگر وہ پابندی جو خود اپنی خوشی سے ہو۔

سماج کو سمجھنے کے لئے انسانوں کا پرکھنا ضروری ہے۔

ہر وہ حکومت جو قانوناً جائز ہو جمہوری حکومت ہے۔

بہت سے لوگ اپنے آپ کو دوسروں کا مالک سمجھتے ہیں حالانکہ وہ خود ان سے بڑھ کر غلام ہیں۔

انسان کے نزدیک پہلا قانون اپنی بقا ہے۔

غلام اپنی غلامی میں سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔ یہاں تک کہ غلامی سے نجات پانے کی خواہش بھی۔

زور سے زیر ہونا، رضامندی کا نہیں مجبوری کا فعل ہے۔

قوت کی بنا پر حق قائم نہیں ہوتا۔ اور جائز قوتوں کے سوا کسی کی اطاعت ہم پر فرض نہیں۔

کسی کا اپنی آزادی سے دست بردار ہو جانا انسانیت سے دست بردار ہو جانے کے مرادف ہے۔

انسان فطرتاً باہم دشمن نہیں ہے۔ جنگ اشخاص کے تعلقات کی وجہ سے نہیں بلکہ اشیاء کی بنا پر ظہور میں آتی ہے۔

انسان کو مدنی زندگی میں اخلاقی آزادی ملتی ہے۔

انسان گو جسمانی اور دماغی حیثیت سے ایک دوسرے کے برابر نہیں مگر معاہدے اور قانون کی رو سے برابری حاصل کر لیتے ہیں

عام خاموشی سے مراد قوم کی رضامندی ہوتی ہے۔

سچائی کے ذریعہ دولت حاصل نہیں ہوا کرتی۔

رعایا نہ تو سفارتیں عطا کر سکتی ہیں نہ پروفیسری اور نہ پنشن۔

ہمارا ارادہ ہمیشہ ہماری بھلائی چاہتا ہے مگر ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہماری بھلائی کس چیز میں ہے۔

قوم کبھی خراب نہیں ہوتی مگر وہ اکثر دھوکا کھا جاتی ہے۔

ریاست کی ہر وہ خدمت جو ایک شہری کے لئے ممکن ہو اُسے فوراً انجام دینا چاہیے۔

سزائے موت کا بار بار دیا جانا لازمی طور پر حکومت کی کمزوری یا غفلت کا نتیجہ ہے۔

دنیا میں ایسا بدکردار کوئی نہیں جس سے کوئی بھی مفید کام نہ لیا جا سکے۔

ایسی ریاست میں جس کا نظام اچھا ہو سزائیں کم دی جاتی ہیں۔

معافیوں کی بہتات کے یہ معنی ہیں کہ جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے جب جرم کی حاجت باقی نہ رہے گی۔

عدل و انصاف خدا کی جانب سے ہے وہی اس کا واحد سرچشمہ ہے۔

آزادی حاصل کی جا سکتی ہے، مگر کھو جائے تو پھر واپس نہیں لی جا سکتی۔

جب ایک قوم خود اپنے لئے احکام صادر کرے تو اس کے پیش نظر اپنی ہی ہستی ہوتی ہے۔

قانون صحیح معنوں میں مدنی اجتماع کی شرائط کا نام ہے۔

رعایا چونکہ قوانین کے ماتحت ہوتی ہے اس لئے اسے قوانین بنانے کا بھی حق ہونا چاہیے۔

انسانوں کے قوانین مرتب کرنے کے لئے خدائی ہستی درکار ہے۔

قوم اس وقت جا کر مشہور ہوتی ہے جب اس کے ہاں قانون سازی کا زوال شروع ہو جائے۔

جو شخص کسی قوم کے اداروں کی تربیت کی جرأت کرتا ہے وہ گویا اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہے کہ انسانی فطرت کو بدل دے۔

قانون ساز ہر اعتبار سے مملکت میں دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔

جسے قانون سازی کا حق ہوا سے انسانوں پر حکومت کا حق نہ ہونا چاہیے۔

قوموں کی ابتدائی زندگی میں مذہب کو سیاسی اغراض کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

جب ایک مرتبہ رسوم قائم ہو جائیں اور تعصبات اچھی طرح جڑ پکڑ لیں تو پھر ان کی اصلاح کی کوشش بیکار اور ساتھ ہی ساتھ خطرناک بھی ہے۔

قومیں بے وقوف مریضوں کی طرح جو طبیب کو دیکھتے ہی کپکپانے لگتے ہیں، اس کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتیں کہ کوئی بھی ان کی خرابیوں کی اصلاح کی غرض سے ہاتھ بڑھائے۔

روسی صحیح معنوں میں کبھی مہذب نہیں ہونے پائیں گے یہ اس لئے کہ انھوں نے وقت سے پہلے تہذیب حاصل کر لی (اشارہ ہے پیٹر اعظم کی ان کوششوں کی طرف جو اس نے روس میں مغربی تہذیب پھیلانے کے لئے کیں)

جب مملکت بڑی ہو جاتی ہے تو اس کی قوت گھٹ جاتی ہے۔ عمرانی تعلق جتنا زیادہ وسیع کیا جاتا ہے اسی قدر کمزور ہوتا ہے اور عموماً چھوٹی ریاست بڑی ریاست سے نسبتاً زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔

سب سے پہلی چیز جس کی فکر کرنی چاہئے وہ ایک مستحکم اور مفید دستور ہے۔

تاریخ میں ایسی مملکتوں کی مثالیں ملتی ہیں کہ دوسرے ملک فتح کرنے پر اپنی بقا کے لئے مجبور تھیں۔ مگر یہ ضرورت ایسی تھی جو ان کی غفلت کی حدود کے علاوہ ان کے ناگزیر زوال کی طرف بھی اشارہ کرتی تھی

فرید انصاری

ایڈیٹر کی زندگی کا ایک دن

(پنجاب یونیورسٹی کے طلبہ صحافت کے سامنے پڑھا گیا)

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ایک ماہوار رسالے کے ایڈیٹر کی زندگی ایک نہایت آسان زندگی ہوتی ہے اور رسالے کا ایڈیٹر اپنی فراغت اور بیکاری کے اعتبار سے سوسائٹی کا ایک نہایت مجہول اور غیر عامل فرد ہوتا ہے۔ غالباً آپ میں سے بھی بیشتر حضرات کا یہی خیال ہوگا۔ معلوم نہیں یہ خیال کیونکر پھیلا، مگر میں بعض دفعہ محسوس کرتا ہوں کہ اس غلط فہمی کی سب سے بڑی وجہ خود بعض ایڈیٹر حضرات کی روشِ زندگی ہے۔

ہمارے ہاں ماہانہ صحافت کی سرپرست پبلک کا ذوق ابھی اتنا نہیں نکھرا کہ وہ ایک ایسے رسالے میں جو محنت، کاوش اور ترتیب کے ایک بلند معیار کے مطابق مرتب کیا جاتا ہے اور ایک ایسے پرچے میں جو ہفتے بھر میں ایڈٹ ہو جاتا ہے، عام طور پر تمیز کر سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ناظرین کی ایک خاصی تعداد ایک اچھے اور ادنیٰ رسالے کے فرق کو بخوبی سمجھتی ہے، لیکن ہم اسے اپنی پبلک قرار نہیں دے سکتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ جماعت ہماری پبلک کی ایک اہم اقلیت کا درجہ رکھتی ہے۔ پبلک کی ایک بہت بڑی تعداد جیسا کہ میں ابھی عرض کیا، ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کی ترتیب اور اچھے اور برے مواد کے باہمی فرق کو نمایاں طور پر محسوس نہیں کرتی۔ اور رسالے سفر کاٹنے کے لئے یا سونے کے لئے پڑھتی ہے۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ریلوے اسٹیشنوں کے بک سٹال زیادہ تر ادنیٰ درجے کے رسائل سے معمور رہتے ہیں اور ایک اوسط درجے کے مسافر کو جس رسالے کا سرورق پسند آ جاتا ہے، وہ اُسے خرید لیتا ہے۔ اس درجے کے رسائل عموماً ایک سے ہوتے ہیں اور اگر ایک رسالے کا سرورق اتار کر دوسرے پر لگا دیا جائے تو بعض شاید ان کے مدیر بھی نہیں بتا سکتے کہ کونسا پرچہ ان کا ہے اور کونسا دوسرے کا۔ اور از بسکہ ان کی ایڈیٹنگ کا بیشتر حصہ قلم کی بجائے قینچی کا رہین ہوتا ہے، اس لئے یہ فرق اور بھی غیر محسوس ہو جاتا ہے۔ ان پرچوں کے مدیر حضرات تو واقعی فراغت اور بیکاری کے لحاظ سے ایک مثالی زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ خریدار بنانے اور اشتہارات جمع کرنے میں صرف کرتے ہیں چونکہ ان میں سے بیشتر اصحاب اپنے رسائل کے مالک بھی خود ہی ہوتے ہیں، اس لئے ان کے اوقاتِ گرامی کا جس قدر حصہ رسائل کے مقصدِ زندگی یعنی جلبِ زر کے براہِ راست حصول میں صرف ہوتا ہے، وہی اُن کی نگاہ میں، اور ایک حد تک پبلک کی نگاہ میں بھی ان کی صحافتی زندگی کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے۔ ان سے کچھ ہٹ کر ایسے رسائل کا درجہ ہے جو ملک میں اگرچہ ادبی یا علمی جریدوں کے نام سے معروف ہیں، لیکن ان کے مدیران کی ترتیب و تدوین کو وہ سنجیدہ حیثیت نہیں دیتے، جس کی وہ حق دار ہے۔ مواد کی جانچ پرکھ تو خیر ایک جدا چیز ہے، مضامین کی زبان درست کرنا جو ایک ایڈیٹر کا سب سے پہلا فرض ہے، وہ بھی ان کی توجہ یا شاید مقدرت کے احاطے میں نہیں آتا۔

مجھے ایک ایڈیٹر صاحب کی وہ بھولی بھالی کیفیت نہیں بھولتی، جب میں ایک روز اُن سے ملاقات کے لئے گیا تو وہ اپنے کتب خانے کا حساب دیکھ رہے تھے، ان کے پاس ہی ایک بزرگ کھڑے تھے، میلی سی اچکن میں ملبوس کان پر قلم اور کلے میں یہ بڑا پان۔ دانت پان اور زردے کے متواتر استعمال سے سیاہ ہو چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ایڈیٹر صاحب کہنے لگے " اخاہ، کیسے اچھے وقت آئے آپ، لیجئے ان سے ملئے، یہ ہیں ہمارے نئے کاتب، شمیم ملہوتوی۔ خاص ملہوتے کے رہنے والے ہیں، خاص ملہوتے کے"۔ میں حیران، کہ الٰہی ملہوتے کی سکونت فنِ کتابت کی وہ کونسی باریکی ہے جس پر ایڈیٹر صاحب اتنا زور دے رہے ہیں اور جب میرے چہرے سے ان کا مطلب سمجھ جانے کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی تو مجھے ایک طرف کھینچ کر میرے کان میں نہایت رازدارانہ طریقے سے کہنے لگے " آپ زبان، زبان کا اتنا

شور مچایا کرتے ہیں تاہم نمبر نے یہ سارا قصہ ہی چکا دیا ہے۔ یہ ہیں اہلِ زبان خاص ملہونہ ضلع پرتاپ گڈھ کے رہنے والے۔ خطا تو ان کا واجبی ہی ہے۔ مگر وہ زبان کا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ میں نے مضامین کا لفافہ ان کے حوالے کر دیا ہے اور تاکید کر دی ہے کہ مضمون نقل کرتے کرتے زبان کی جو غلطی ملے اسے کتابت ہی میں درست کرتے جائیں۔ کیوں ہے نا استادانہ بات! ع چہ خوش بود کہ برآید زیک کرشمہ دو کار" (ایڈیٹر صاحب بات بات پر شعر پڑھنے کے عادی تھے) اور ویسے بھی دن میں دو ایک مرتبہ چلتے پھرتے "ہانک لگا دیتا ہوں' ہاں منشی جی! ذرا زبان پر نگاہ رہے' زبان پر' اور آدمی ایسا بھلا ہے مجھے انتخاب کی بھی زحمت نہیں دیتا۔ جو مضمون جتنی جگہ میں آسکتا ہے' اپنا خود ہی دیکھ کے لگا دیتا ہے"! ایڈیٹر صاحب تو اتنا کہہ کر داد طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگے اور میری یہ کیفیت کہ نہ بولنے کا یارا نہ چپ رہنے کا۔ بس اتنا کہا کہ حضور جائے استاد واقعی ہمیشہ خالی رہتی ہے اور ان سے رخصت ہو کر چلا آیا۔

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بعض ایڈیٹروں کی زندگی کے دن واقعی ایسی ہی آسانی' سہولت اور فراغت سے گزرتے ہیں' لیکن بات یہیں بس نہیں ہو جاتی۔ اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے اور اس میں آپ عموماً ایک منحنی سے شخص کو دیکھیں گے' جو ہر صبح ٹھیک دس بجے اپنے میز کے سامنے بیٹھا نظر آتا ہے اور اگر کبھی اتفاق سے آپ شام کے سات بجے اس کے دفتر کے سامنے سے گزریں تو آپ اس کے کمرے میں چراغ سرِ شام جلتا ہوا پائیں گے۔ دن کے نو گھنٹے' ہفتے کے چھے روز اور مہینے کے تیسوں دن آپ اسے کام میں مصروف پائیں گے۔ کام' کام' کام اور اس کا انجام سوائے اس کے کچھ نہیں کہ مہینے بھر میں ایک ستر اسی صفحے کا رسالہ' کبھی کبھار کوئی خاص نمبر' اور جن دنوں کا غذ ملتا تھا' اس زمانے میں سال کے سال ایک سالنامہ اور اس کے بعد تین چار ہفتے کی یقینی علالت' جو عموماً برداشت سے زیادہ محنت کا نتیجہ ہوتی تھی۔

قدرتی طور پر آپ سوال کریں گے کہ آخر ایک ایسے معمولی نتیجے کے لئے اتنا کام کیوں کرنا پڑتا ہے اور اتنی محنت کس لئے روا رکھی جاتی ہے کہ ماہ نامے کا ایڈیٹر ایک شہیدِ کار کا درجہ اختیار کر لیتا ہے لیجیے' سنئے'

ایک اچھے ماہ نامے کی روزانہ ڈاک کا اوسط حسب ذیل ہوتا ہے:۔ افسانے اور ڈرامے (۶) مقالے اور مضامین (۳) نظمیں (۱۵) کتاب برائے تبصرہ ایک۔ رسائل (۲) اخبارات (۵) قلمی احباب کے جواب طلب خطوط (۵) ادبی شہرت کے خواہشمندوں کے خطوط (۲۰) یاد دہانیاں بے شمار۔ خرافات' جس میں ہر قسم کے لچر مضامین نظم و نثر شامل ہیں ۵۰ء۔

ایڈیٹر اگر اپنے ضمیر کو بالکل جواب نہیں دے چکا اور کچھ پاسِ خاطر احباب بھی رکھتا ہے تو اسے معقول مضامین کی رسید اور ضروری خطوط کا جواب دینے کے لئے کم و بیش تین گھنٹے ہر روز درکار ہوتے ہیں۔ اس میں مضامین پڑھنے کا وقت شامل نہیں۔ چونکہ رسالے کا زیادہ حصہ مضمون نگاروں کی کاوشوں کا رہین ہوتا ہے اور روزانہ صحافت کے برعکس اس میں ظاہری طور پر ایڈیٹر کے اپنے مضامین نسبتاً بہت کم نظر آتے ہیں' اس لئے ناواقف حضرات یہی سمجھتے ہیں کہ ایڈیٹر کو تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا۔ لوگ مضمون بھیجتے ہیں اور یہ انہیں چھاپ دیتا ہے' اللہ اللہ خیر سلّا۔ مگر یہ کسے معلوم ہے کہ خود مضمون لکھنا دوسروں کے مضامین چننے' پڑھنے اور سنوارنے سے نسبتاً آسان بات ہے۔ روزناموں کی طرح ہر اچھے رسالے کی بھی ایک پالیسی ہوتی ہے۔ اور ایڈیٹر اپنے مضامین کا انتخاب اسی پالیسی کے مطابق کرتا ہے۔ اگر ان

مضامین میں سے جو خود بخود اس کے پاس پہنچتے رہتے ہیں، کسی خاص موضوع پر اس کے کام کا مضمون نہیں ملتا، تو وہ اسے اُس لکھنے والے سے حاصل کرتا ہے جو اس کے خیال میں اس موضوع پر سب سے بہتر لکھ سکتا ہے۔ ڈاک سے فارغ ہو کر وہ مضامین کے انبار کا رخ کرتا ہے، جو رسد کے طلب سے زائد ہونے کے باعث ہمارے افلاس کی طرح ہر روز بڑھتا رہتا ہے۔ ہر روز موصول ہونے والے مضامین میں اگرچہ کام کی چیزیں سَو میں سے دس بھی نہیں نکلتیں مگر مصیبت یہ ہے کہ انہیں چھانٹنے کے لئے باقی نوّے بھی پڑھنی پڑتی ہیں اور انہیں پڑھنا اور اپنے ہوش و حواس بجا رکھنا بجائے خود ایک جہاد سے کم مرتبہ نہیں رکھتا۔ جس طرح ہمارے پڑھنے والوں کی ایک پبلک ہے، اسی طرح ہمارے لکھنے والوں کی بھی ایک پبلک ہے۔ جو پڑھنے والی پبلک کی بہ نسبت ایک نہایت آزار رساں اور مصیبت افزا طبقہ ہے اور ایڈیٹر کی زندگی کو تلخ اور مختصر کرنے میں جتنا حصہ یہ فرقہ لیتا ہے، وہ کاتبوں اور سنگ سازوں کی مجموعی کوششوں سے بھی زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔ اگر آپ ان حضرات کی کرم فرمائیوں کے نمونے دیکھنا چاہیں تو میں انہیں ہزاروں کی تعداد میں آپ کو دکھا سکتا ہوں، مگر مجھے آپ کی سلامتی کا ڈر ہے۔ بہرحال تازہ ڈاک میں سے ایک دو مختصر نمونے اصلاً حاضر ہیں:۔

افسانہ:۔ **شنکرات** ۔ صبح ہی خاموش فضا میں پہلی آواز گونجی "وہ کاٹا ہے" اور دوسری طرف سے بھی یہی..... ایک کمزور بھوکوں کا مارا غریب لڑکا ایک پتنگ والے کی دکان کی طرف حسرت بھری نظریں ڈال رہا تھا۔ یکایک اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور دیوانہ وار دکان میں گھس گیا۔ ایک لمحہ بعد وہ دو پتنگ اور ایک چرخی لئے سامنے کی طرف دوڑ رہا تھا...... ایک کانسٹبل نے اس کا پیچھا کیا اور اسے جا لیا۔ ایک ڈنڈا مارا اور ایک آواز پھر گونجی "وہ کاٹا ہے" اور دوسری طرف سے "ہائے مرا رے"۔ پتنگ والے نے کہا "ایک میری طرف سے اور" کانسٹبل نے اسے اپنی شان سمجھ کر ایک اور ڈنڈا اور مارا ایک اور آواز آئی "ہائے مرا رے"! اور لڑکا زمین پر گر پڑا اور پتنگ اور شنکرات کیا اپنی دنیا سے ہی نکل گیا۔ اس کی بیوہ ماں نے یہ خبر سنی اور اس کو رٹ لگ گئی "ہائے میری پونجی لٹ گئی"۔ اور اسی رٹ میں جلد ہی ختم ہو گئی۔

لیکن فضا پھر بھی "وہ کاٹا ہے" سے معمور رہی۔ ؎ خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

امیدوار محمود اقبال

مکرمی معظمی جناب ایڈیٹر صاحب ادبی دنیا۔ تسلیم۔ مزاج شریف۔ میں نے آپ کا اشتہار نئے مضمون نگاروں کی بابت ماہ دسمبر ۱۹۴۳ء کے رسالہ میں پڑھا تھا۔ پہلے میں آپ کو اپنی واقفیت کرانا چاہتا ہوں۔ نہ تو میں ایسا کوئی مضمون نگار ہوں اور نہ شاعر ہوں فقط بات یہ ہے کہ میں ہندوستان کے تمام رسالوں کا مطالعہ شوق کے ساتھ کرتا ہوں۔ اسی لئے مجھے شاعری اور مضمون نگاری سے دلچسپی ہو گئی ہے اور ٹوٹی پھوٹی شاعری اور مضمون نگاری بھی کر سکتا ہوں۔ جیسا کہ آپ کے سامنے پیش ہے۔ اور میں زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں ہوں۔ کل مارے باندھے سے ۸ کلاس تک پڑھا ہوں۔ اگر آپ کو میری چیزیں پسند آئیں تو درست کر کے رسالے کی نظر کر دیں ورنہ میں جوابی لفافہ اسی لفافے کے اندر رکھ رہا ہوں واپس کر دیں اور میں ابھی افسانہ وغیرہ نہیں بھیج سکتا کیونکہ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے بہت مشکل کا سامنا ہے کیونکہ افسانہ بنانے کے لئے کاغذ کی ضرورت ہے۔ موجودہ جنگِ عظیم ایک عظیم جنگ ہے جس کی وجہ سے ناک سب چیزیں گراں ہو گئیں بلکہ اپنے عزیز بھی ہم سے بچھڑ گئے۔ موجودہ جنگ نے تمام تمام ہندوستان کے شہروں کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ اور اب بھی صبر نہیں آتا۔ روزانہ بھرتی ہو رہی ہے۔ برطانیہ کا سیدھا ہاتھ ہندوستان ہی ہے۔ جس نے جرمن کی ناک میں نکیل ڈال دی ہے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ جرمن کی شکست ہو گی اور ہندوستان کی فتح اور

جرمن والے دونوں پر ہندوستان جیسا شہسوار رونق افروز ہوگا فقط

لاحول ولاقوۃ میں مضمون کو کہاں کا کہاں لے گیا۔ ہاں تو میں ابھی افسانہ نہیں بھیج سکتا۔ چھوٹی چھوٹی غزلیں اشعار وغیرہ بھیجوں گا۔ بشرطیکہ آپ قبول فرمائیں۔ اس کے بعد گیت ارسال کروں گا دو گیت ہوں گے جو بہت سوز کے ساتھ لکھے ہیں۔ جو میں پہلے رسالہ شاہکار کو عنایت کرچکا ہوں اگر وہ آپ کی نظر سے گزرے ہوں تو لکھئے، اگر نہیں گزرے تو میں ان کو آپ کے رسالے کے لئے ارسال کردوں۔ برائے مہربانی جوابی لفافہ میں تبلہ حنایت تحریر فرمائیں اور ہر ایک طرح کی تاکید میرے لئے تحریر کریں۔ عین نوازش ہوگی۔ چیز پسند نہ آنے پر واپس کرسکتے ہیں دو گیت جو میں ارسال کروں گا وہ کبوتر اور کوے پر ہوں گے۔ جو میں نے ایک شوشہ لے کر بنائے ہیں۔ فقط جملہ ارکان ادارہ رسالہ ہذا کو السلام علیکم۔ جواب سے جلدی مطلع کرنا۔ نیاز کیش۔ عزیز الدین عزیز بلب گڑھ ضلع گوڑ گانوہ

غزل (مرتبہ عزیز الدین عزیز بلب گڑھی)

وہ روزانہ نئے خنجر ایجاد کرتے ہیں　　ستم ایجاد کرتے ہیں عجب بیداد کرتے ہیں

لئے ہیں قید لاکھوں ہی انہوں نے جال گیسو میں　　جسے وہ چاہتے ہیں وہ اسے آزاد کرتے ہیں

لٹے ہیں لاکھوں ہی برباد پھنسا کر دام گیسو میں　　جسے وہ چاہتے ہیں وہ اسے آباد کرتے ہیں

زرا تو اے دلِ ناشاد فلک کی خوبیاں تو دیکھ　　وہ اپنے چاہنے والوں کو اب پھر یاد کرتے ہیں

ہو کیا تعریف ان کی وہ ہیں بحرِ بیکراں ایسے　　کسی کو شاد کرتے ہیں کسی کو ناشاد کرتے ہیں

نہیں ہے ان کے ستم کی انتہا اے عزیز　　وہ روزانہ نئے ظلم و ستم ایجاد کرتے ہیں

واضح رہے کہ اگرچہ ان کے مطالعے کے بعد منطقی طور پر آپ انہیں ایک ہی جگہ بھجوا سکتے ہیں، یعنی ردّی کی ٹوکری میں۔ لیکن ایڈیٹر ڈرتا ہے کہ اگر اس نے یہ حرکت کی اور ان صاحب کو ان کا مضمون مع ایک عدد لجاجی ہوئی معذرت کے واپس نہ کیا، تو ان کا ایک ریمائنڈر آجائے گا اور پھر ایک کے بعد دوسرا اور معمولی کے بعد رجسٹرڈ اور پھر اسے اس ہیبت ناک انبار میں سے جسے اس کا مقدر چپکے چپکے بڑھاتا رہتا ہے، تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ ہوگا۔ مگر قسمت کی کوتاہی دیکھئے کہ تقریباً ہر روز یہی قصہ پیش آتا ہے، ہم روز غرق ندامت میں غرق ہوتے ہیں، مگر عبرت نہیں پکڑتے۔

یاد دہانیوں کی ایک زیادہ اذیّت دہ قسم یاد دہانی بہ نفسِ نفیس ہے۔ یعنی مضمون بھیجنے کے چند روز بعد صاحب مضمون ذاتی طور پر آپ سے اس بات کا جواب طلب کرنے کے لئے آموجود ہوتے ہیں کہ آپ نے ان کا مضمون کیوں نہیں چھاپا اور نہیں چھاپا تو اس کی وجہ کیوں نہیں پیش کیں۔ اب آپ ہزار معذرت کیجئے کہ صاحب میں اکیلا آدمی ہوں، ابھی آپ کے مضمون کے دیکھے جانے کی باری نہیں آئی۔ میں خود ہی چند روز میں آپ کو اس کی نسبت لکھ دوں گا۔ مگر وہ کب مانتے ہیں "نہیں جناب آپ اسے ابھی دیکھ دیجئے اور مجھے ابھی سمجھا دیجئے کہ اس میں کون کون سی باتیں اصلاح طلب ہیں"۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ مضمون اس وقت ہاتھ تلے نہیں اس پر وہ اور بگڑتے ہیں کہ "لو جی ایک تو ہم خونِ جگر پئیں اور اس پر آپ اس کی ایسی ناقدری کریں کہ مسودہ تک گم کر بیٹھیں۔ یہ اچھی ہوئی۔ مگر اس میں آپ کا قصور نہیں، دور کے سبھی ڈھول سہانے ہوتے ہیں"۔ اور اگر خدا کا فضل شامل حال ہے تو وہ محض بڑبڑاتے ہوئے آپ کے

دفتر سے نکل جاتے ہیں۔ آپ ابھی کلمۂ شکر پڑھ کر آج کی باعزت خلاصی پر دو نفل گزارنے کی نیت کر ہی رہے ہوتے ہیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے (جی) خاکسار ہی بول رہا ہے"۔ "اچھا تو ہماری نظم اب تک کیوں نہیں چھپی"۔ "حضور کون سی نظم" "ہماری اور کس کی" "مگر حضور ابھی اس شہر میں ٹیلی ویژن کا رواج نہیں ہوا۔ میں جناب کو کیسے شناخت کروں"۔ "اوہ ۔ میرا نام ہے عاصی سیتاپوری 'میں نے دو ہفتے ہوئے اپنی نظم آپ کو خود دفتر میں آ کر دی تھی"۔ "بجا ہے 'لیکن یہاں تو ابھی ان نظموں کی باری بھی نہیں آئی جو دو برس ہوئے موصول ہوئی تھیں"۔ "یعنی؟" "یعنی یہ کہ خدا جھوٹ نہ بلائے تو ساڑھے چار سو نظمیں ہر مہینے ہمیں عنایت ہوتی ہیں اور ساڑھے چار چھپتی ہیں۔ بتائیے میں آپ کی نظم شایع کرنے کا فخر ایسی جلدی کیونکر حاصل کر سکتا ہوں؟" اور وہ ایک تلخ ہوں کے ساتھ وہ ٹیلی فون کا ریسیور کھٹ سے ہک پر پٹک دیتے ہیں۔ الٰہی تیرا شکر' کم از کم اگلی یاد دہانی تک ہزار بار شکر۔

ان شیدائیان فن کے علاوہ 'لکھنے والوں کا ایک اور دلچسپ فریق ہے جو مضمون نگار بننے سے پہلے ایڈیٹر سے دوستی پیدا کرنا کامیاب مضمون نگاری کے لئے نہایت ضروری سمجھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ حضرات اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب رہتے ہیں۔ ایڈیٹر ایک نہایت ضروری مقالہ لکھ رہا ہے اور یہ صاحب بغیر اجازت کے وارد ہو جاتے ہیں اور اس پر اس طرح نظریں گاڑ دیتے ہیں کہ وہ قلم چھوڑ کر ہمہ تن ان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ کوئی عادتاً ہی اس کا چھٹکارا کرائے تو کرائے ورنہ وہیں اخبار پڑھتے ہیں' وہیں رسالے دیکھتے ہیں' اور ایڈیٹر اگر چائے پینے کی بدعادت میں مبتلا ہے تو اس میں بھی اس کا ساتھ دیتے ہیں' مجھے یاد ہے کہ ابھی میں نے ادبی دنیا کی ادارت کا چارج منصور احمد مرحوم سے نہیں لیا تھا اور وہ بیماری میں بھی دوسرے تیسرے دن دفتر آ کر ضروری کام کسی نہ کسی طرح ختم کر جاتے تھے کہ ایک صاحب' جو آج کل اردو کے مشہور افسانہ نگاروں میں ہیں' نہایت باقاعدگی سے اُن سے ملنے آتے تھے' اور آتے ہی کوئی نہ کوئی ناممکن فرمائش ان سے کر ڈالتے تھے۔ ایک دن بانگ درا کا ایک نسخہ اپنے ساتھ لیتے آئے' اور بیٹھتے ہی کہنے لگے' مولانا آج تو میں آپ کے ساتھ اقبال کا مطالعہ کروں گا اور مولانا کے جواب کا انتظار کئے بغیر پڑھنے لگے ع اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں۔ یہ کشور کسے کہتے ہیں۔ منصور مرحوم کو خدا نے بہت بڑا جگر دیا تھا' وہ قلم رکھ کر بیٹھ گئے اور ساری نظم انھیں پڑھا ڈالی۔ آپ حیران ہوں گے اور کہیں گے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے' اُردو کا مشہور افسانہ نگار اور کشور کے معنی نہیں جانتا تھا' جی ہاں یہ پردے کے پیچھے کی باتیں ہیں' انھیں منظر عام پر لانا اچھا نہیں' ورنہ فن کا سارا رومان ختم ہو کر رہ جائے گا' مگر ایک تازہ لطیفہ آپ کو سنائے دیتا ہوں۔ چند روز کی بات ہے میرے پاس اردو کتابوں کے ایک بڑے پبلشر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی ماشاءاللہ خوب پڑھے لکھے ہیں اور اس لحاظ سے ناشرین میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ایک صاحب کا مسودہ درست کر رہا تھا' انہوں نے گردن بڑھا کر چند ترمیمات دیکھ لیں۔ اس بات سے چند دن پہلے میں نے ان کی فرمائش پر ایک صاحب سے سفارش کی تھی کہ وہ اپنی کہانیوں کا مجموعہ انھیں اشاعت کے لئے دیں۔ اور انہوں نے از راہِ نوازش میری بات مان لی تھی۔ میں نے مسودہ دیکھتے دیکھتے ورق جو پلٹا تو میرے دوست نے لکھنے والے کا نام بھی دیکھ لیا۔ کہنے لگا یہ کون صاحب ہیں' میں نے بے خیالی میں کہہ دیا کہ وہی جن کے افسانے آپ نے مانگے تھے۔ اتنا سننا تھا کہ جیسے انھیں بجلی کا ایک جھٹکا سا لگا۔ فوراً کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے لاحول ولاقوۃ' یہ ہے اس شخص کی اصل تحریر توبہ توبہ! مجھے تو نفرت ہو گئی۔ آپ مہربانی سے انھیں لکھ دیجئے کہ مسودہ بھیجنے کی تکلیف نہ کریں۔ میں بڑا نادم ہوا۔ اب انھیں ہزار سمجھاتا ہوں کہ صاحب! اصل چیز تو مواد ہے۔ اگر ہم لوگ کسی تحریر کی نوک پلک سنوار دیں تو اس سے

کیا ہوتا ہے۔ مگر نہیں صاحب نہ انھیں ماننا تھا اور نہ مانے اور یہی کہتے رہے کہ مجھے کیا معلوم تھا۔ ان لوگوں کی سیاہی کے ساتھ ایڈیٹر کے خون جگر کی سرخی مل کر کیا رنگ لاتی ہے۔ اور پھر مجھے اس کارِ بے داد پر ایک طویل لکچر دے ڈالا اور تان اس پر توڑی کہ حیف ہے تمہاری زندگی پر کہ جیتے جی تمہارا کام کوئی دیکھتا ہے اور نہ مرے پیچھے کوئی یاد کرے گا۔ بات کچھ کچھ ٹھیک تھی۔ اس لئے میں نے خاموشی ہی میں پناہ لی۔ مگر اب سوچتا ہوں تو اس زحمتِ بے داد کو بجائے خود ایک داد سمجھتا ہوں جو چھپ کے دی جاتی ہے اور چھپ ہی کے لی جاتی ہے اور ہمارے صبح وشام اسی طرح گزرے چلے جاتے ہیں۔

(ماخوذ از ادبی دنیا لاہور) فرصت کی تمنا میں یوں عمر گزرتی ہے **صلاح الدین احمد**

(ایوان الادب فیروز آباد)

عرصہ سے خدماتِ انجام دے رہا ہے۔ مضامین نظم ونثر کی اصلاح کا واحد ادارہ ہے۔ استادی شاگردی کی زحمت سے محفوظ رہنے کے لئے ضرور یاد کیجئے۔ ہر قسم کی خط وکتابت بصیغۂ راز رکھی جاتی ہے۔ ضرورت مندِ اہلِ مذاق اصول وقواعد کے لئے خط وکتابت فرمائیں

(نیاز مند)

سکرٹری۔ ایوان الادب۔ فیروز آباد۔ یو پی

دو باتیں

انیسہ - بی بی آپا!

بی بی آپا ——— ہُوں

انیسہ ——— کیا پڑھ رہی ہیں، آپ؟

ثریا ——— توبہ، بڑی! سو بار کہا۔ کوئی پڑھتا ہو تو بیچ میں نہیں بولتے۔

لالہ ——— ہزار بار کہو یہ نہیں مانیں گی!

ثریا ——— بری بات!

پرسوں یہ بہنیں آپس میں باتیں کرتی بیٹھی تھیں کہ بی بی آپا نے پڑھتے پڑھتے کتاب بند کی اور کہا کہ یہ کتاب جو میں پڑھ رہی ہوں اس میں لکھا ہے کہ ہمیں خوش کیسے رہنا چاہئے۔ آؤ، آج تمہیں بھی بتائیں۔ یہ سن کے انیسہ، ثریا، لالہ نے دوڑ کے بی بی آپا کو گھیر لیا کہ وہ کہیں اور یہ سنیں اور انھوں نے یوں کہنا شروع کیا:-

"دیکھو! یہ تم بھی جانتی ہو کہ دنیا میں ہر ایک خوش رہنا چاہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیسے خوش رہے۔ کیا ہمارے سامنے کوئی روپیوں کا ڈھیر لگا دے تو ہم خوش رہیں گے؟ کیا ہماری ہمجولیاں، سہیلیاں، دن رات، سردی گرمی، زمین آسمان ہمیں خوش رکھ سکتے ہیں؟ ان سب باتوں کا جواب اس کتاب میں یہ ہے کہ نہیں۔ ہمیں کوئی دوسرا خوش نہیں رکھ سکتا۔ ہم خود ہی چاہیں تو اپنے تئیں خوش رکھ سکتے ہیں۔ یہ گُر جو جان گیا وہ سدا خوش رہے گا۔

" اور وہ گُر یہ ہے کہ تم اپنی طبیعت پر پورا پورا قابو پاؤ۔ تم میں یہ بات نہ ہونی چاہئے کہ ذرا کسی نے لالچ دیا اور تم اسی کی ہو گئیں۔ یا کوئی غصہ کی بات ہوئی اور تم آپے سے باہر ہو گئیں۔ اس طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں جو زندگی میں آدمی کو پیش آتی رہتی ہیں۔ کبھی اسے آس ہوتی ہے، کبھی نراس۔ کبھی کامیاب ہوتا ہے، کبھی ناکام۔ کبھی اس کے لئے خوشی ہے، کبھی غمی۔ کبھی محبت، کبھی نفرت، سمجھدار وہی ہے جو ایسی باتوں کے لئے اپنے میں ایک ضبط اور ایک قابو رکھے۔ یہ نہیں کہ ان باتوں کے ساتھ بہہ جائے۔ جو لوگ اس طرح بہہ جاتے ہیں وہ ایک فٹ بال کے مانند ہیں، جنھیں زمانے کے اتار چڑھاؤ ٹھوکریں لگاتے ہیں اور وہ ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر لڑھکتے رہتے ہیں۔

" اسی گُر کو ٹھیک ٹھیک یوں برتنا پڑتا ہے کہ آدمی جو بات کرے اس میں اپنے دل دماغ دونوں سے کام لے، اور ڈٹ کے کام لے، جب بات بنتی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ ایک ناسمجھ تم سے کہے کہ دنیا میں مسلمان سب سے اچھے ہیں، باقی جو ہیں، سب برے ہیں۔ تم مسلمان ہو، یہ بات سنتی ہو، تمہارے دل کو بھاتی ہے، وہ پھولے نہیں سماتا۔ بس یہیں سے وہ بھولاوا دیتا ہے، اور تم اپنے کو اچھا اور دوسرے کو برا سمجھنے لگتی ہو، اور اپنی سمجھ کھو بیٹھتی ہو۔ سمجھ سے بھی کام لو تو تم دیکھو کہ مسلمانوں میں بھی سب اچھے نہیں، برے بھی ہیں۔ اسی طرح وہ جو مسلمان نہیں ہیں، ان میں بھی سب برے نہیں، اچھے بھی ہیں۔ میں نے ایک مثال دی۔ زندگی میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں، جن میں ہم دل سے زیادہ کام لیتے ہیں یا دماغ سے۔ جس سے ہماری زندگی کا نٹا تول نہیں رہتی۔ کبھی ایک پلڑا جھک جاتا ہے، کبھی دوسرا۔ ہمیں چاہئے کہ نہ ہم دل کی باتوں میں آئیں، نہ دماغ کی الجھنوں میں جائیں دونوں کو سدھائیں اور ساتھ ساتھ لے چلیں۔ مگر جیسا میں نے اوپر کہا، یہ کام ڈٹ کے کرنے کا ہے۔ وہ جو اپنی طبیعت پر قابو پاتے ہیں، وہی ایسا کر سکتے ہیں۔ وہی زندگی کے پہلوان ہیں۔ کمزور بھسڈی ایسا نہیں کر سکتے۔

" اگلے زمانے کا ایک قصہ مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ زمین آسمان بنالئے تو فرشتوں کو حکم دیا کہ بنی آدم کو چیریں

تقسیم ہوں کہ وہ دنیا میں جاکے رہے سہیں۔ فرشتوں نے تقسیم شروع کی۔ کاشتکار کو کھیت، تاجر کو سامان تجارت ملا۔ بادشاہ کو تاج فقیر کو کشکول گدائی ملا۔ یوں ساری چیزیں تقسیم ہوگئیں تو ایک شخص اور آیا اور اس نے کہا کہ ابھی تک میں اس سوچ میں ہوں کہ داتا سے مانگوں تو کیا مانگوں۔ یہاں چیزیں ختم ہوچکیں، دیکھوں اب مجھے کیا ملتا ہے۔ یہ سن کے فرشتوں کو بڑی حیرت ہوئی اور انھوں نے آپس میں کہا کہ یہ بھی عجیب بندہ ہے جو خدا سے ایسی باتیں کرتا ہے۔ مگر اللہ کو یہ بات بہت بھائی۔ فرمایا "جا ہم نے تجھے طبیعت پر قابو پانے کا حوصلہ دیا۔ یہ وہ شئے ہے جو اچھے اچھوں کو نصیب نہیں۔ دیکھ، دنیا میں جتنا دل سے کام لیجو، اتنا ہی دماغ سے بھی کام لیجو۔ اس سے تیرے جیون میں چاند کی چاندنی اور سورج کی دھوپ سی کھلی رہا کرے گی اور تجھے سدا اسدا کو خوش رکھے گی"!

بی بی آپا نے یہاں تک کتاب کی باتیں سنائی تھیں کہ ماما نے آکر کہا کہ بی بی کھانا لاؤں۔ اس پر انیسہ نے بگڑ کے کہا "نہیں کھاتے، جاؤ۔ بیکار کو باتوں میں خلل ڈالا"۔ ثریا نے انیسہ کو بگڑتے دیکھا تو کہا "واہ جناب! ابھی آپ نے اتنا کچھ سنا اور ابھی آپ غصہ کی رَو میں بہہ گئیں"۔ اس پر بی بی آپا مسکرائیں، اور لالہ نے بھاری آواز میں ایک فرمایشی قہقہہ لگایا، جس سے انیسہ جزبز ہوکے رہ گئیں۔ بی بی آپا نے کن انکھیوں سے انیسہ کو دیکھتے ہوئے کہا "ثریا ٹھیک کہتی ہیں"! انیسہ نے بھی سوچا بات جب ہے کہ جو کچھ سنا وہ ٹھیک ہے تو اس پر عمل کیجئے، اور آج ہی سے عمل کیجئے اور ڈٹ کے عمل کیجئے۔ اس لئے بی انیسہ آج گاندھی جی بن گئیں اور بھوک ہڑتال فرمائی! سب نے ہزار کہا کہ پہلی دفعہ ہے آئندہ را احتیاط! مگر انیسہ نے ایک نہیں سنی اور ہنس کے کہا

"سچ یہ ہے، اس وقت جو کچھ میں نے ماما سے کہا وہ جذبہ میں تھا، اس میں سمجھ سے کام نہیں لیا۔ اسی کے لئے یہ بھوک ہڑتال ہے۔ بھوک کی کوفت آئندہ کو یہ بات اچھی طرح سمجھا سمجھا دے گی۔ ہم یہ کیوں کہوائیں کہ ہم میں طبیعت پر قابو پانے کا حوصلہ نہیں ہے۔ آج سے یہی کر دکھانا ہے اور خدا نے چاہا تو سدا کو خوش رہنا ہے"!

مسز اسد الزماں خاں

حیدرآباد ۔ اس کتاب میں عوام اور بچوں کے لئے شہر اور ریاست حیدرآباد کے ضروری حالات سادہ اور سلیس زبان میں درج کئے گئے ہیں۔ اس کے کئی ابواب ہیں جن میں آب و ہوا، پہاڑ و دریا، پیداوار، تاریخ، طرز معاشرت، صنعتیں، زبانیں، طرز حکومت، آثار قدیمہ اور ذرائع حمل ونقل کو خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مرتبہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ بی اے۔ جامعہ عثمانیہ ہیں جن کو انشاپردازی کا خاص ذوق ہے۔ قیمت ۱۰/

اشوک اعظم ۔ یہ کتاب مجلس ادبیات اطفال کی طرف سے طلبہ اور عوام کے لئے سلیس اور سادہ زبان میں لکھائی گئی ہے۔ محترمہ سیدہ مہدی جعفری صاحبہ متعلمہ زنانہ کالج نے ہندوستان کے اس مشہور فرماں روا کے حالات زندگی اور کارنامے دلچسپ پیرائے میں قلمبند کئے ہیں۔ کتاب باتصویر ہے۔ قیمت ۸/

عرب اور عربستان ۔ شعبۂ ادبیات اطفال کی طرف سے یہ باتصویر کتاب شائع کی گئی ہے۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے نے نہایت دلچسپ، سلیس انداز میں مرتب کیا ہے۔ تقریباً ہر صفحہ پر تصویر دی گئی ہے۔ صفحات (۵۶) قیمت صرف ۱۰/

اُردو کے علمی وادبی رسائل

یہ موضوع اتنا وسیع اور دلچسپ ہے کہ اس پر ایک مبسوط کتاب قلم بند کی جا سکتی ہے اور اس کی اب ضرورت بھی ہے۔ اس لئے کہ اردو میں علمی وادبی رسائل کا آغاز ہوئے تقریباً ایک صدی کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس اثناء میں سیکڑوں رسائل مختلف مقامات سے جاری ہوئے اور اپنی اپنی زندگی گزار کر ختم ہوتے گئے۔ ان میں سے بعضوں نے تو عمر طبعی پائی اور بہت سے بن کھلے ہی مرجھا گئے۔ چونکہ ہندوستان میں کمسنی کی اموات زیادہ ہوتی ہیں اس لئے اس ملک کی اس عام اور مشترک زبان کے رسالے بھی شاید اس کلیہ کی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔

ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں اس پوری صدی کے جن اردو رسالوں کی جلدیں اور مختلف شمارے اس وقت تک فراہم ہو سکے ہیں ان کی فہرست مرتب کرنے پر اندازہ ہوا کہ ہماری زبان میں اب تک پانچ سو سے زیادہ رسائل مختلف شہروں میں مختلف اوقات میں نکل چکے ہیں۔ اس فہرست کو سنین اشاعت کے لحاظ سے ترتیب دیا جارہا ہے لیکن ابھی یہ کام نامکمل ہے۔

اردو رسائل کو ان کی خصوصیات کے پیش نظر پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور

پہلے دور میں وہ رسائل وجرائد شامل ہیں جو ۱۸۵۷ء سے قبل اردو میں شائع ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں اگرچہ کچھ زیادہ رسالے جاری نہیں ہوئے لیکن اس عہد کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس وقت بعض جرائد ایسے نکلتے تھے جو اخبار اور رسالہ دونوں کا کام دیتے تھے۔ ان میں دہلی اردو اخبار، اخبار الحقائق، خیرخواہ ہند، محب ہند، نور علی نور، مظہر الاخبار اور اعظم الاخبار وغیرہ خاص کر قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس دور میں خالص علمی و ادبی رسائل کا وجود ہی نہ تھا۔ اس زمانے میں اس قسم کے رسالے بھی جاری ہوئے جن میں رام چندر کے فوائد الناظرین، دھرم نرائن کے قران السعدین اور ڈاکٹر فلیمنگ کے رسالۂ طبی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ نوخز الذکر ایک فنی رسالہ تھا جو حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا۔ لیکن اول الذکر دونوں رسالوں میں نہ صرف عام دلچسپی کے تاریخی اور تنقیدی مضامین شریک رہتے تھے بلکہ ان میں علوم جدیدہ کی طرف بھی کافی توجہ کی جاتی تھی اور سائنسی موضوعوں پر باتصویر مضامین التزام کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔

فوائد الناظرین اور قران السعدین دونوں دلّی سے نکلتے تھے اور اگرچہ ان کی زبان میں اب کچھ قدامت محسوس ہوتی ہے لیکن طبیعیات، ہیئت، کیمیا اور انجینیری کے مسائل پر اُن میں تصویروں اور نقشوں سے مدد لے کر جس وضاحت اور خوش اسلوبی سے جدید ترین معلومات پیش کی گئی ہیں وہ اس زمانہ کے لحاظ سے بہت قابل قدر اور لائق ستائش تھیں۔ ان کے مہتمم یعنے مدیر اور اکثر مضمون نگار دہلی کالج کے فیض یافتہ تھے۔ افسوس ہے کہ اس کالج اور اس کے سپوتوں کو بہت جلد کسی کی بری نظر کھا گئی ورنہ اگر یہی فضا کچھ اور دن باقی رہتی تو اردو رسالے اپنی ارتقائی منزلوں کو اور زیادہ سرعت کے ساتھ طے کر لیتے۔

دہلی کے اس قسم کے رسائل وجرائد کی چند مکمل جلدیں اور ان کے ساتھ مدراس کے عمدۃ الاخبار اور اعظم الاخبار کی فائلیں بھی حسن اتفاق سے حیدرآباد میں محفوظ حالت میں مل گئیں۔

برطانوی ہند میں اب تک اس عہد کے رسائل و جرائد کے چیدہ ہی شمارے دستیاب ہوئے ہیں اور انہی سے مدد لے کر بعض صاحبوں مثلاً پنڈت کیفی (دہلی)۔ ڈاکٹر عبدالحق (مدراس) اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (علی گڑھ) نے اس موضوع پر مضامین بھی لکھے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے شمالی ہند میں جو تہلکہ مچایا اور وہاں کے سرکاری اور نجی کتب خانوں کو تباہ و برباد کیا اس کی وجہ سے اردو کی کئی مطبوعات یا تو سرے سے ناپید ہو گئیں یا ایسی نامکمل حالت میں دستیاب ہو رہی ہیں کہ ان کی مدد سے اس "رستخیز بیجا" سے قبل کی اردو کتابوں اور خاص کر رسائل و جرائد کی تاریخ مکمل اور قطعی طور پر نہیں لکھی جا سکتی۔ اگرچہ مشہور فرانسیسی محب اردو گارساں د تاسی کی تحریروں میں اس دور کے رسائل کی نسبت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں لیکن وہ بھی اس درجہ ناکافی ہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد ہماری تشنگی میں اور اضافہ ہی ہو جاتا ہے۔

دوسرا دور

اردو رسائل کا دوسرا دور ۱۸۵۷ء سے شروع ہو کر ۱۹۰۰ء پر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اردو رسائل کی دنیا میں ایک بڑا انقلاب آیا جس کا ذکر ۱۹۰۰ء کے بعد کے رسائل کے سلسلے میں کیا جائے گا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب امن و اطمینان نصیب ہوا تو اکثر مقامات سے اردو میں رسالے جاری ہونے شروع ہوئے۔ ان میں اسباب بغاوت ہند، مفرح القلوب، تہذیب الاخلاق، کارنامہ، اور حیدرآباد کے افسر، فنون، رفیق دکن، حسن، معلم نسواں، نسیم دکن، مخزن الفوائد، منتخب روزگار، جلوۂ محبوب، دبدبۂ آصفی، مدراس کا جلوۂ سخن، علی گڑھ کا معارف۔ واحد علی بسمل کا دامن گلچیں (لکھنؤ) سید علی حیدر کا اصلاح (پٹنہ)۔ سید محمد مصطفےٰ خورشید کا انتخاب (لکھنؤ)۔ قادر شریف صابر کا دلسوز (بنگلور)۔ محمد حامد کا خیالات احباب (جے پور)۔ محمد ظفریاب کا نور بصیرت (کلکتہ)۔ فضل الدین کا اشاعت (لاہور) اور قطب الدین احمد قمر کا نور قمر کوٹا (راجپوتانہ) بہت اچھے رسالے ہیں۔

اس دور کے تقریباً پچاس رسالوں کا پتہ چلا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ان میں زیادہ تعداد حیدرآباد ہی سے شایع ہونے والے رسالوں کی ہے جن میں بعض کی نسبت اتنا کہنا کافی ہے کہ افسر ۱۸۹۶ء میں محب حسین کی ادارت میں جاری ہوا اس کا سالانہ چندہ چار روپے تھا۔ بعد کو جب یہ بند ہو گیا تو ۱۹۱۰ء سے اسی نام کا ایک دوسرا رسالہ ممتاز یار جنگ کے اہتمام سے نکلنے لگا جس میں مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو نے اپنے قیام حیدرآباد کے ابتدائی زمانہ میں کام کیا تھا۔ افسر سے پہلے ایک صاحب رسالۂ فنون شایع کیا کرتے تھے جن کا نام ایم یونس اور رونق تخلص تھا۔ یہ رسالہ ۱۸۸۳ء میں نکلا اور کئی سال تک جاری رہا چنانچہ اس کے ۱۸۸۶ء کے شمارے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کا سالانہ چندہ تین روپے چھ آنے تھا۔ افسر کے بعد محب حسین نے معلم نسواں جاری کیا جو سالہا سال تک حیدرآباد میں طبقۂ اناث کی تعلیم و تہذیب کے لئے کام کرتا رہا۔ اسی زمانہ میں محمد عزیز الدین مدرس سررشتۂ تعلیمات نے ایک رسالہ رفیق دکن بھی شایع کیا تھا جو زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ رفیق دکن کے مقابلہ میں نسیم دکن تقریباً دس سال تک شایع ہوتا رہا اس کے مدیر میر نادر علی برتر تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا دبدبۂ آصفی دراصل مہاراجہ کشن پرشاد کے ابتدائی ذوق انشا پردازی کا نتیجہ تھا۔ اسی ذوق کے باعث مہاراجہ بعد میں

بھی کئی رسائل مثلاً محبوب الکلام، جلوۂ محبوب اور جشن عثمانی وغیرہ خود مرتب کرتے اور دوسروں سے مرتب کراتے رہے۔

اس زمانہ کے ابتدائی رسائل میں مخزن الفوائد اور حسن کو خاص اہمیت حاصل ہے اول الذکر کے ایڈیٹر سید حسین بلگرامی عماد الملک تھے۔ اس کی سالانہ قیمت نو روپے تھی اور اس میں سائینسی موضوعوں پر بھی مضامین درج کئے جاتے تھے۔ موخر الذکر کے ایڈیٹر حسن بن عبد اللہ عماد نواز جنگ تھے۔ یہ سلسل سات سال تک جاری رہا۔ اس کا سالانہ چندہ بارہ روپے تھا اور اس کی یہ خصوصیت اب تک ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے کہ اس کے ہر اچھے مضمون پر لکھنے والے کو ایک اشرفی انعام میں دی جاتی تھی۔

اردو رسائل کے اس دوسرے دور میں حیدرآباد سے باہر جو رسالے شایع ہوتے تھے ان میں اسباب بغاوت ہند اور مشہور و معروف تہذیب الاخلاق کے بعد معارف علی گڑھ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا چندہ چار روپے سالانہ تھا اور اس کے مدیر مولوی وحید الدین سلیم بعد کو اردو کی علمی دنیا میں خاص شہرت کے مالک ہوئے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ آج کل مولنا سید سلیمان ندوی جو رسالۂ معارف نکالتے ہیں وہ بہت بعد میں جاری ہوا اور اس کو مولنا سلیم کے معارف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس دور کا گل سرسبد سرسید کا تہذیب الاخلاق ہے جس نے نہ صرف رسالوں بلکہ اردو نثر کی تاریخ میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا۔ یہ رسالہ اتنا مقبول اور مفید ثابت ہوا کہ نہ صرف اس کے جواب میں کئی رسالے نکالے گئے بلکہ اس کی جلدوں کو بار بار چھپوایا بھی گیا۔ اردو صحافت کی تاریخ میں ایسی مثال کوئی اور نہیں ملتی کہ رسالے کے جملہ شمارے کو بہ تمام و کمال چھپوایا گیا ہو۔ البتہ بعض رسالوں کے انتخابات شایع ہوئے ہیں جن میں شیخ عبد القادر کے رسالۂ مخزن کے انتخاب خاص کر قابل ذکر ہیں۔

تیسرا دور

اردو رسائل کا تیسرا دور ۱۹۰۰ء کے اختتام سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۲۰ء پر ختم اس مدت کا تعین اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے اندر اردو کے بعض نہایت بلند پایہ رسائل جاری ہوئے سالہا سال تک چھپتے رہے اور بند بھی ہوگئے۔ مولنا ظفر علی خاں کے رسائل افسانہ۔ دکن ریویو اور پنجاب ریویو، سید ناظر الحسن بلگرامی ہوش یار جنگ کا ذخیرہ پیارے لال شاکر میرٹھی کے ادیب اور العصر۔ خان بہادر میر ناصر علی کا صلائے عام۔ خواجہ غلام الثقلین کا عصر جدید خواجہ حسن نظامی کا نظام المشائخ۔ شیخ عبد القادر کا مخزن محمد عباس قادری کا تمدن۔ محمد نصیر الدین بیخود کا المضمون ممتاز یار جنگ کا افسر۔ حسرت موہانی کا اردوئے معلی۔ احسن مارہروی کا فصیح الملک محمد امین زبیری کا ظل السلطان۔ علامہ شبلی کا الندوہ۔ حبیب الرحمن خاں شروانی صدر یار جنگ کے القاسم اور الرشید۔ راشد الخیری کا عصمت۔ نظام شاہ لبیب کا افادہ۔ مولنا عبد اللہ العمادی کا البیان۔ غلام محمد وفا کا تاج۔ تاجور نجیب آبادی کا تاج الکلام۔ عبد الحلیم شرر کا دلگداز۔ اکبر علی کا صحیفہ اور ظفریاب خاں کا ادیب اور ان کے علاوہ متعدد رسالے اسی زمانے میں جاری ہوئے اور اپنا اپنا وقت پورا کرکے ختم ہوتے گئے۔

اس زمانہ میں واقعہ یہ ہے کہ اردو صحافت اور انشا پردازی معراج کمال کو پہنچ گئی اور دلی، آگرہ، لکھنؤ، مدراس اور حیدرآباد کے علاوہ متعدد دوسرے مقامات سے بھی

اردو رسالے اور اخبار نکلنے شروع ہوئے ۔ یہ اردو رسائل کا ایک زرین دور تھا اور اسی زمانہ میں بعض ایسے رسالے بھی شایع ہوئے جو اس دور کے بعد برسوں تک جاری رہے اور بعض اب تک بھی جاری ہیں جن میں معارف، زمانہ، اردو سہ ماہی، شباب اردو، الناظر وغیرہ خاص کر قابل ذکر ہیں ۔

اس دور کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جن اصحاب نے رسالوں کی ادارت کی طرف توجہ کی ان میں سے اکثر اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے اور انھوں نے ایڈیٹر ہونے کے علاوہ مصنف، انشاپرداز، مورخ اور نقاد کی حیثیت سے بھی اردو دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی ۔

یہ دراصل ایک انقلابی دور تھا اس سے قبل کے دور میں سرسید احمد خاں اور ان کے معاصرین نے اردو صحافت اور انشا پردازی کے جو بیج بوئے وہ اس اثنا میں بڑے بڑے تناور درختوں کی شکل میں منتقل ہو چکے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں جو رسالے شایع ہوئے وہ انہی درختوں کے پھل پھول تھے ۔ اس عہد کے جو رسالے اب جاری نہیں ہیں ان میں خاص طور پر دکن ریویو حیدرآباد ۔ مخزن لاہور ۔ صلائے عام دلی ۔ الندوہ لکھنؤ ۔ ذخیرہ حیدرآباد ۔ دلگداز لکھنؤ ۔ ادیب الہ آباد ۔ البیان لکھنؤ ۔ العصر الہ آباد اور تاج حیدرآباد کے نام اردو رسائل کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے ان رسالوں نے اپنے مختلف شماروں میں اردو نثر و نظم کا ایک ایسا اچھا معیار پیش کیا اور ترتیب و دیدہ زیبی میں ایسی شائستگی کا ثبوت دیا کہ اردو کی صحافت نے ہندوستان کی علمی و ادبی تاریخ میں صدیوں کے لئے ایک نمایاں مقام حاصل کرلیا ۔

چوتھا دور

اردو رسائل کا چوتھا دور سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۴۷ء کے درمیانی زمانہ پر مشتمل ہے ۔ اس دور کو سنہ ۱۹۴۷ء پر اس لئے ختم کردیا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد ہی اردو ادب کی تاریخ میں نئے نئے رجحانات شروع ہونے لگتے ہیں ۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں وہ ہماری نظر میں اتنا نیا اور اہم نہ ہو جتنا کہ ہماری آنے والی نسلوں کو نظر آئے گا ۔

اردو رسائل کے چوتھے دور کو سنہ ۱۹۴۷ء پر ختم کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں سیکڑوں رسالے حشرات الارض کی طرح پیدا ہوئے اور ان میں سے اکثر پھر اس طرح نابید ہوگئے کہ ان کے وجود و عدم کا احساس بھی نہ ہونے پایا ۔ اس زمانہ میں زیادہ تر زندہ دلان پنجاب نے اردو رسالوں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی اور ان کی دیدہ زیبی، وضع قطع، حجم اور خاص خاص شماروں کی اشاعت میں وہ رنگا رنگی اور جدت و شگفتگی پیدا کی کہ اردو رسائل انگریزی رسالوں کے ہم پلہ نظر آنے لگے ۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے رسالوں کی یہ درخشانی ایک شعلۂ مستعجل ثابت ہوئی اور ان کا وہ طمطراق زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا ۔ بلکہ اسی دور کے اندر ایسا ختم ہوا کہ شاید ایک عرصہ تک پھر اس کے چمکنے کی توقع نہیں ۔

اس دور میں جو اچھے رسالے جاری ہوئے ان میں نیاز فتح پوری کے نگار ۔ میاں بشیر احمد کے ہمایوں ۔ حافظ محمد عالم کے عالمگیر ۔ شوکت علی فہمی کے دین و دنیا ۔ تاجور کے شہکار ۔ ضامن کنتوری کے لسان الملک ۔ محمد حبیب کے شمع حکیم یوسف حسین کے نیرنگ خیال ۔ مرزا رفیق بیگ کے نمائش ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ کے مکتبہ ۔ محکمۂ تعلیمات کے المعلم ۔ ادبی دنیا ۔

شاہد احمد کے ساقی۔ انجمن ارباب اردو سرور نگر کے تحفہ۔
جامعہ ملیہ کے جامعہ۔ ہندوستانی اکیڈیمی کے ہندستانی، ادارۂ
ادبیات اردو کے سب رس۔ بیگم خوشگی کے ہجولی وغیرہ نے اردو
رسائل کے ترقی یافتہ معیار کے قائم رکھنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔
لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیسرے دور میں اردو رسائل
بہ حیثیت مجموعی جس اعلیٰ معیار تک پہنچ چکے تھے چوتھے دور کے
رسالے اس معیار سے آگے نہ بڑھ سکے۔

اس امر کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے کہ کثرت تعداد
کے لحاظ سے ہمارے رسالوں کا یہ چوتھا دور بہت نمایاں ہے۔
اور ان بتیس سالوں کے اندر جو پچاسوں اردو رسالے جاری
ہوئے ان کی فہرست ہی کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے۔
لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں نصف سے زیادہ تعداد ایسے رسائل
کی ہے جن کے صرف نام ہی نام رہ گئے ہیں۔ عجیب عجیب ناموں
کا یہ طومار ہمارے نوجوانوں کی اس وحشتناک ذہنیت کا آئینہ دار
ہے کہ خدا خدا کر کے جہاں پڑھنے لکھنے کے سلیقہ سے روشناس ہوئے
اور رسالہ نکالنے کا بھوت سر پر سوار ہو گیا۔ اگر کوئی اس عہد کے
رسالوں کی طویل فہرست پر نظر دوڑانے کی زحمت گوارا کرے تو
اس کو محسوس ہوگا کہ اکثر و بیشتر رسائل کے ایڈیٹروں کے نام
ان رسائل کے ناموں سے زیادہ غیر معروف ہیں۔ جن لوگوں نے
کبھی کوئی مضمون کسی رسالے میں نہیں چھپوایا اور اپنی انشاپردازی
کا آغاز اپنے ہی ذاتی رسالے سے کرنا چاہتے ہوں تو ظاہر ہے کہ
ان کا رسالہ کیونکر چل سکتا ہے۔ جو شخص ایک سوار بن کر رسالوں
کے میدان میں اترنے سے پہلے ہی شہسواری کے کرتب دکھانا
چاہتا ہو تو اس کا جو حشر ہو سکتا ہے وہی ان ایڈیٹروں کو
بھی نصیب ہوا۔ چنانچہ اس قسم کی جرأت رندانہ سے کام لینے
والوں کے سارے رسالے اڑیل ٹٹو ثابت ہوئے اور نتیجہ یہ ہوا
کہ نہ ایڈیٹر شہسوار بن سکا اور نہ رسالہ آگے بڑھ سکا۔

پانچواں دور

اردو رسائل کا پانچواں دور دور حاضر ہے جس پر ابھی
کچھ عرصہ بعد تفصیل سے کہا جا سکے گا۔ اتنا تو اس وقت بھی
واضح ہے کہ ایک نیا دور شروع ہو چکا ہے۔ اگرچہ ہم میں سے اکثر
اس کو ناپسند کرتے ہیں۔ لیکن اب پسند اور ناپسند کا زمانہ
نہیں رہا۔ مجبوراً زہر کے گھونٹ بھی بعض وقت گوارا کرنے پڑتے
ہیں اور کیا تعجب کہ بعض نیم مردہ جسموں کے لئے یہ زہر ہی تریاق
کا کام کر جائے۔ جب چور مارکٹ بند ہو جائیں گے تو مجبوراً سب
کو لال چاول ہی کھانے پڑیں گے۔ اور اس ناخوش گوار تبدیلی
سے پرانے پرانے روگیوں کو ممکن ہے کہ فائدہ ہی پہنچے۔

یوں تو عہد حاضر کے اکثر و بیشتر رسائل کا رنگ بدلتا جا رہا ہے
اور ان سب میں ادب برائے زندگی کے نظریہ کی طرف میلان
ترقی پذیر ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ نیا ادب، ادب لطیف،
ساقی، منزل اور ایشیا۔ بدلتے ہوئے رجحانات کی علمبرداری
کر رہے ہیں۔ اور چونکہ یہ رنگ ابھی پختہ نہیں ہوا ہے اس لئے
بعض دفعہ اردو رسالوں میں ترقی پسندی کے بہانے سے ایسی
نظمیں، افسانے اور مضامین بھی شائع ہو رہے ہیں جو ترقی پسندوں
کے مسلک کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور قدامت پسندوں کے
جذبات اور احساس شائستگی کو ٹھیس لگ رہی ہے۔

جو رسالے اپنی قدیم روش پر قائم ہیں ان میں سے بعض
ایسے ہیں جو خاص خاص طبقوں اور گروہوں کے مفاد کو پیش نظر
رکھنے کے باعث کافی سے زیادہ بدنام ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے ہی
صوبے یا جتھے کے ادیبوں کے نام اور کاموں کو چمکانے میں
منہمک ہیں اور دوسروں کے بہتر سے بہتر کارنامے ان کے
رسالے کی عینک میں انھیں حقیر ہی نظر آتے ہیں۔ یہ ایک

مضر رجحان ہے جو گزشتہ دس پندرہ سال سے رونما ہوا ہے۔ اور اس رجحان نے اردو ادب اور فن تنقید کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

اس قسم کے بدنام رسالوں میں پنجاب کے بعض اوسط درجہ کے رسائل کے ساتھ ساتھ پٹنہ کا معاصر اور انجمن ترقی اردو کا اردو جیسے وقیع رسائل بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض ایسے رسالوں کا تذکرہ غیر ضروری ہے جو کسی بک ڈپو یا اشاعت گھر کی مطبوعات کی تشہیر کے لئے شایع کئے جا رہے ہیں۔ ان حالات کے تحت صرف چند ہی رسائل ایسے نظر آتے ہیں جن سے اردو صحافت کا وقار قائم ہے اور توقع ہے کہ آئندہ بھی باقی رہے گا۔ ان میں معارف، زمانہ، جامعہ، نگار، عصمت، سیاست، مصنف، سائینس۔ اور نئی زندگی۔ خاص کر قابل ذکر ہیں۔

(اردو مجلس میں پڑھا گیا) **سید محی الدین قادری زور**

نئی کتابیں

۱۔ کتاب العلم۔ باتصویر (اردو کی انسائیکلوپیڈیا) قیمت ۱۲ روپے
پتہ۔ ایسٹرن پبلشنگ اینڈ اسٹیشنری لمیٹڈ۔ ایڈورڈ روڈ۔ لاہور

۲۔ ملک خطا کے شہزادے۔ از وصی احمد بلگرامی قیمت ۸ آنے۔ پتہ منیجر نگار لکھنو۔

۳۔ دو جزر (افسانے) از شفیق الرحمٰن قیمت عا۔ پتہ۔ مکتبۂ جدید۔ لاہور

۴۔ دستور الفصاحت (اردو زبان کے قواعد) از امتیاز علی خاں عرشی ۲۶۷ صفحے۔ پتہ ناظم کتب خانہ۔ رام پور۔

۵۔ طلوع سحر (نظمیں) از گویا جہاں آبادی حجم ۲۲۰ صفحے قیمت عہ
پتہ۔ نظامی پریس بک ایجنسی۔ بدایوں۔

۶۔ جالے (افسانے) از شمشیر سنگھ نرولا حجم ۱۶۰ صفحے قیمت عہ
پتہ۔ انڈیا بک ہاؤس۔ عابد روڈ۔ حیدر آباد دکن۔

۷۔ سائے (افسانے) از بشیر محمد اختر حجم ۱۳۶ صفحے قیمت عہ پتہ انڈیا بک ہاؤس عابد روڈ حیدر آباد

۸۔ سودائی (ناول) از رشید اختر ,, ۲۲۴ ,, قیمت ,, ,, ,, ,,

۹۔ جھلکیاں (افسانے) از سید یوسف بخاری ,, ۲۰۸ ,, ,, ,, ,, ,,

۱۰۔ جہاں آرا (ناول) از ظفر قریشی ,, ۲۴۴ ,, ,, ,, ,, ,,

۱۱۔ طوق و زنجیر (کہانیاں) از جہاتما گاندھی حجم ۱۲۵ صفحے قیمت ,, ,,

۱۲۔ واہمہ (افسانے) از بشیر محمد اختر۔ حجم ۱۲۸ صفحے۔ قیمت ,, ,,

۱۳۔ اقبال اور آرٹ از لطیف فاروقی قیمت ۱۲ پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ۔ حیدر آباد

۱۴۔ [illegible]

۱۵۔ دنیا کے روایتی افسانے۔ از احمد حسین خاں۔ قیمت ۱۲ روپے
پتہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ۔ حیدر آباد دکن۔

۱۶۔ نراس (افسانے) از نور الحسن بی اے۔ قیمت ۱۲
پتہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ۔ حیدر آباد دکن

۱۷۔ شعور۔ (ڈراما) چودھری افضل حق۔ قیمت ۸ آنے۔ پتہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ۔ حیدر آباد دکن۔

۱۸۔ میراجی کی نظمیں۔ از میراجی۔ حجم ۲۰۰ صفحے قیمت عا
پتہ۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی۔

۱۹۔ لندن سے آداب عرض۔ از آغا اشرف۔ قیمت عہ
پتہ۔ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔

۲۰۔ بچوں کا لندن (لندن کے حالات) از آغا اشرف۔ قیمت عہ پتہ۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

۲۱۔ لہو ترنگ (مجموعۂ کلام) از سکندر علی وجد حجم ۱۶۰ صفحے۔ قیمت ۲ روپے
پتہ۔ کتاب خانہ انجمن ترقی اردو۔ عابد روڈ۔ حیدر آباد دکن۔

۲۲۔ خانقاہ (افسانے) از ایم اسلم۔ حجم ۲۶۴ صفحے۔ قیمت عا
پتہ۔ کتاب خانہ انجمن ترقی اردو۔ عابد روڈ۔ حیدر آباد دکن

۲۳۔ کنول (افسانے) از اعظم کریوی۔ حجم ۲۵۶ صفحے قیمت عا
پتہ۔ کتاب خانہ انجمن ترقی اردو۔ عابد روڈ۔ حیدر آباد دکن

۲۴۔ مضامین اقبال (مقالات اور تقاریر) حجم ۲۱۶ صفحے۔ قیمت عہ
پتہ۔ احمد حسین جعفر علی تاجر کتب۔ چار مینار۔ حیدر آباد دکن

مرزا سعیت علی خاں

تنقید و تبصرہ

چوبینے کی ہوائی پختگی | از سید عبدالواحد ناظم جنگلات
ناشر محکمۂ جنگلات سرکار عالی حیدرآباد کے سررشتۂ جنگلات نے
عام معلومات کے کتابچوں کا ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے جس کا
آغاز زیر نظر رسالے کی اشاعت سے ہوتا ہے ۔ یہ اگرچہ ایک فنی
موضوع ہے لیکن اس کے صاحب ذوق مولف نے نہایت سہل
اور دلچسپ اسلوب بیان کے ذریعہ سے اس رسالے کو عام فہم
بنا دیا ہے ۔ ہمارے ملک میں جنگلوں کی کمی نہیں اور افسوس اس کا
ہے کہ ہم لوگ ان سے فائدہ اٹھانے کے طریقوں سے ناواقف
ہیں ۔ اس رسالے کے مطالعے سے یہ معلوم ہوجائے گا کہ لکڑی
کے تختوں اور کڑیوں کو ہوا کے ذریعہ سے کیونکر پختہ کیا جا سکتا ہے ۔

اس کتاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس رسالے کے
آخر میں مختلف درختوں اور چوبینے کے متعلق اصطلاحات
کی ایک انگریزی' اردو فرہنگ بھی شریک کی گئی ہے جو اردو
کے لئے بہت مفید ہے ۔

انشا | از مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی ناشر مکتبۂ جامعہ دہلی

اس چھوٹی سی کتاب میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب
نے اپنے خاص شگفتہ اسلوب میں اردو کے مشہور شگفتہ مزاج
شاعر انشاء اللہ خاں انشا کے حالات زندگی قلم بند کئے ہیں
اور ساتھ ہی ان کے کلام کے پرلطف نمونے بھی درمیان میں
پیش کرتے گئے ہیں ۔

مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کی طبیعت اور اسلوب
بیان بھی انشا سے بہت مشابہت رکھتا ہے اور انھوں نے
اسی موزونیت کی بناء پر اپنے لئے ایک اچھا موضوع منتخب
کیا اور انشا کے حالات نہایت دلچسپ پیرائے میں لکھ کر اردو
میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ کیا ۔

مذہب اور تمدن | از مولوی سید ابوالحسن علی صاحب ندوی
ناشر مکتبۂ جامعہ دہلی

اس کتاب میں مذہب' فلسفہ اور تمدن کے ان چند
مشترک سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے جو اس
کائنات کے آغاز و انجام سے متعلق مختلف حلقوں میں کئے
جاتے ہیں ۔ کتاب سولہ عنوانات میں تقسیم کی گئی ہے اور اس کا
مقصد یہ ہے کہ عقل و فلسفہ کے ذریعہ سے مذہب کو سمجھانے
کی کوشش کی جائے ۔

مولف کی معلومات وسیع ہیں اور ان کو عام فہم اسلوب
میں ظاہر کیا گیا ہے ۔ جو اصحاب اسلام کو عقل اور تمدن کی
روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب خاص طور پر
مفید ثابت ہوگی ۔

معاشیات کے رسائل | ڈاکٹر انور اقبال قریشی کی
نگرانی میں جامعہ عثمانیہ کے طلبہ و اساتذہ نے ایک سلسلۂ
مطبوعات بزم معاشیات قائم کیا ہے ۔ جس کی جانب سے
اب تک بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔ جن کے نام یہ ہیں :-

ہندوستان کے زر پر جنگ کے اثرات ۔ از محمد احمد خاں
بی اے (عثمانیہ) ایل ایل بی (علیگ)

جنگ اور غذا کا مسئلہ از شفیق الرحمٰن (عثمانیہ)

حیدرآباد کی صنعتوں پر جنگ کے اثرات از محمد نظام الدین احمد (عثمانیہ)

حیدرآباد اور قصبوں کی نگرانی ۔ از احمد عبدالماجد (عثمانیہ)

جنگ اور ہندوستان کا قومی قرضہ ۔ از محمد احمد خاں

انگلستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے ۔ مترجمہ
محمد احمد خاں ۔

امریکہ اور بین الاقوامی زر کے منصوبے ۔ مترجمہ عطاء الرحمٰن علوی بی اے

کینیڈا اور بین الاقوامی زر کے منصوبے ۔ مترجمہ خواجہ محمد شمس الدین بی اے

ہندوستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے از سعید احمد مینائی بی اے ۔

محصول منافع زاید از سعید احمد مینائی بی اے

ہندوستان کی معاشی ترقی کے لئے ایک لائحہ عمل مترجمہ سعید احمد مینائی ۔

ان میں سے ہر کتاب پر ڈاکٹر انور اقبال قریشی نے نے ایک پیش لفظ تحریر کیا ہے جس میں ہر کتاب کی خصوصیات اور اس کی افادیت پر نظر ڈالی ہے۔ اردو زبان میں معاشیات کے موضوع پر بہت کم کتابیں اس وقت تک لکھی گئی تھیں ۔ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ اس کمی کو جامعہ عثمانیہ کے طلبہ نے ان رسائل کے ذریعہ سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کوشش کے لئے اس سلسلہ مطبوعات کے نگران ڈاکٹر قریشی قابل مبارک باد ہیں

ادارہ

نشر گاہ حیدر آباد

مرحوم سر اکبر حیدری نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ حیدر آباد کے نشری ادارے عوام میں ذہنی تربیت کا کم و بیش وہی فرض انجام دیں گے جو جامعہ عثمانیہ کے سپرد ہے ۔ اورنگ آباد کی نشرگاہ کے افتتاح کی تقریب میں مرحوم نے فرمایا تھا کہ نشرگاہ کا اسٹاف ملکی قابل نوجوانوں پر مشتمل ہے ۔ ہمیں خوشی ہے کہ مولوی محمد فضل الرحمن صاحب ناظم لاسلکی کی قیادت میں جو ایک صاحب ذوق ادیب، ڈراما نگار اور شاعر ہیں، یہ محکمہ بہمہ وجوہ ملک کی علمی و ادبی خدمت انجام دے رہا ہے۔ مولوی محبوب علی صاحب طاہر مہتمم نشرگاہ اورنگ آباد بھی ایک سرگرم عمل اور صاحبِ ذوق عہدہ دار ہیں جن کی رہنمائی میں نشرگاہ حیدر آباد سے اردو ادب کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔ نشرگاہ میں جامعہ عثمانیہ کے ایسے فرزند کام کر رہے ہیں جن سے بہتر توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں اور ان کی مساعی سے نشرگاہ کی تقریری اور ڈرامائی پروگراموں کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہم نے اس سے پہلے ایک "ریڈیو نمبر" شائع کیا تھا اور اس میں بہت سی ایسی تقریریں جمع کی تھیں جو مختلف موضوعات پر نشرگاہ حیدر آباد سے نشر ہوئیں۔ ہمارا اپریل کا شمارہ بھی زیادہ تر ایسی ہی تقریروں پر مشتمل تھا جو ملک کے مختلف ادیبوں نے مقامی نشرگاہ سے کیں ۔ ان کے ملاحظہ سے واضح ہوا ہوگا کہ حیدر آباد کی نشرگاہ نے ایسا نشری ادب پیش کیا ہے جو اردو ادب میں اپنا مقام رکھتا ہے "سب رس" کے علاوہ ملک کے مختلف رسالوں اور اخباروں میں بھی نشری تقریریں چھپتی رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں بعض کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جن میں "جنگ زدہ ممالک" اور "سائنس کے کرشمے" قابل ذکر ہیں ۔ موخر الذکر کتاب، ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہوئی ہے ۔ اس کے علاوہ شجاع احمد صاحب تمنا کی بچوں کے لئے ایک درجن کتابیں چھپی ہیں جن میں وہ کہانیاں، ڈرامے اور نیچر جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے نشرگاہ کے لئے لکھے تھے ۔

بہرحال یہ امر قابلِ مسرت ہے کہ نشرگاہ حیدر آباد، عوام اور بچوں کی ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی بھی قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ حیدر آباد کے ان خدمت گزار اداروں میں جو اردو کی خدمت کر رہے ہیں، نشرگاہ حیدر آباد کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ادارہ

جلسۂ تقسیم اسناد شعبۂ نسواں

ادارۂ ادبیات اُردو کے شعبۂ نسواں کا جلسۂ تقسیم اسناد لیڈی حیدری کلب بشیر باغ میں بتاریخ ۱۰ مئی ۱۹۴۱ء شام کے ۶ بجے سے محترمہ بیگم صاحبہ ولی الدولہ بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا۔

جلسہ کا آغاز قرأت سے کیا گیا جس کے بعد رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبۂ نسواں نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں بیگم ولی الدولہ بہادر کی صدارت کی تحریک کی جس کی تائید محترمہ عظمت النساء بیگم صاحبہ نے کی۔ بیگم ولی الدولہ کے خطبۂ صدارت کے بعد محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر نے ایک نظم "بیداریٔ اناث" سنائی۔

اس اجلاس میں صرف بلدہ حیدرآباد کی کامیاب امیدواران اناث کی اسناد اور تمغے تقسیم کئے گئے اور حسب ذیل انعامات بھی عطا کئے گئے:۔

اُردو عالم
- لطف النساء بیگم - اُردو عالم - مرکز میں اول - (انعامی کتب عطیۂ لیڈی سر مہدی یار جنگ بہادر)
- امتہ الرؤف - تاریخ ادب اردو میں اول (رجسی نندی یادگار تمغہ - عطیۂ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی)

اُردو زباندانی
- حفیظ النساء بیگم - مرکز میں اول - (انعامی کتب عطیۂ مسز امیر حسن صاحب)

اُردو دانی
- کریم النساء بیگم - ممالک محروسہ میں اول آنے والی امیدوارہ (نقرئی تمغہ) عطیۂ سکینہ بیگم صاحبہ۔
- اقبال بیگم - مرکز میں اول آنے والی امیدوارہ (انعامی کتب عطیۂ مسز امیر حسن صاحب)

اس دلچسپ ادبی صحبت میں زنانہ کالج حیدرآباد کی طالبات نے ایک مرقع حالی بھی پیش کیا۔

خطبۂ استقبالیہ

محترم صدر صاحبہ اور معزز خواتین!

کس قدر خوشی و مسرت کا مقام ہے کہ آج آپ اپنی تشریف آوری سے پھر ہم پر کرم فرما ہیں۔ اور ہم پھر اپنے گہرے جذبات ممنونیت سے آپ کے ساتھ مصروف شکریہ! ؂ بحمد اللہ وقت امتنان ہے   زبان شکر پھر شکر فشاں ہے

شعبۂ نسواں کا سالانہ اجلاس آپ کی صحبت بابرکت سے بہرہ اندوز ہونے کا ایک خوش گوار و لطیف واسطہ ہے۔ جب میں محسوس کرتی ہوں کہ آپ کی زحمت فرمائی نہ صرف ہمارے لئے بہجت و مسرت کا باعث ہے، نہ صرف ہمارے دلوں کو جذبۂ تشکر سے مملو کرتی ہے، نہ صرف ہم میں جوش عمل پیدا کرنے والی حقیقت ہے، نہ صرف ہماری ہمتوں میں بلندی اور عزم میں استحکام کا ذریعہ ہے، بلکہ درخواست تعاون اور سرزمین دکن و زبان اردو کی خدمت کے لئے دعوت عمل کا موقع بخشتی ہے۔ تو آپ کی شرکت مسرت کے ساتھ عظمت بھی ہمارے دل کی گہرائیوں میں اپنی جگہ پیدا کر دیتی ہے۔ کیونکہ پیغام عمل پر صدائے لبیک قوم کے لئے آثار زندگی اور مژدۂ حیات ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آمد کی تکلیف اٹھا کر آپ بھی اتنی ہی محظوظ و مسرور ہوں گی جتنا کہ ہم "خوش آمدید" کا نعرہ سنا کر مشکور و مفتخر ہیں۔

بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ بہادر نے ازراہِ کرم گستری و علم پروری اجلاس ہذا کی کرسیٔ صدارت کو قبول فرما کر تقسیم اسناد کے لئے اس موسم گرما میں جو زحمت گوارا فرمائی ہے اس کے ہم سب ارکان شعبہ بدل ممنون ہیں اور صاحبۂ موصوفہ کی خدمت میں نہایت خلوص کے ساتھ ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔ آپ کی سادہ مزاجی نیک دلی علم دوستی، عمل پسندی، محتاج بیان نہیں۔ شعبہ کے ساتھ آپ کی دلچسپی ارکان شعبہ کی نہ صرف مسرت و ممنونیت کا بلکہ ان کی ہمت افزائی کا سبب ہے۔ اب میں اپنے خوش گوار فرض خیر مقدم و ادائی شکریہ کے بعد شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیات اُردو کی مختصر رپورٹ پر آپ کی توجہ مبذول کرتی ہوں۔ پچھلے پانچ سال سے یہ شعبہ اپنے بنیادی مقصد زبان اُردو کی ترویج و اشاعت میں مائل بہ جدوجہد اور سرگرم عمل رہا ہے۔ مجلس عاملہ کے اجلاس اپنے وقت پر منعقد اور مسائل متعلقہ طے ہوتے رہے۔ گزشتہ اجلاس سالانہ میں آپ کو یاد ہوگا کہ زبان اردو کی ترقی و توسیع کے مدنظر شعبہ کے اجلاس سہ ماہیہ موسوم "بہ بزم ادب" کی منظورہ قرار داد کی آپ کو اطلاع دی گئی تھی۔ بزم ادب کے دو اجلاس زیر اہتمام محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ اور محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ بہت کامیابی کے ساتھ سرانجام پا چکے ہیں جن میں مولانا حالی، اور سر اقبال کی باکمال ہستیوں سے بہت سی صاحب ذوق خواتین مستفید و مستفیض ہو سکیں مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی ہماری بزم ادب اردو کی خدمات کا حق ادا کرنے میں کما حقہٗ سرخرو رہے گی۔

مدرسۂ بالغات اور مدرسۂ اطفال اپنی جگہ مصروف بہ کار رہے۔ ۱۳۵۲ف میں بالغات کی تعداد حاضری پچیس اور تیس کے درمیان تھی سرکاری مجوزہ نصاب کے مطابق تعلیم جاری رکھی گئی۔ ۱۴ طالبات امتحان اردو دانی کے لئے منتخب ہوئیں جن میں سے ایک موقع پر غیر حاضر۔ پانچ بدرجۂ امتیاز کامیاب، اور آٹھ کامیاب ہوئیں۔

اردو زبان دانی کی امیدوار بھی اپنے طور پر تعلیم حاصل کر کے اسی مدرسہ کے ذریعہ شریک امتحان اور کامیاب ہوئیں۔ لیکن مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ رقمی عدم گنجائش کے باعث سردست مدرسۂ بالغات کو بند کر دینا پڑا اب تعطیلات گرما کے بعد توقع ہے کہ زیادہ عمدگی کے ساتھ ہم اس مدرسہ کو چلا سکیں گے کیونکہ موجودہ ناظم صاحب تعلیمات نے بہ وجہ اپنی مہربانی اور علم دوستی کے کافی امداد کا وعدہ فرمایا ہے۔

مدرسۂ اطفال بدستور قائم ہے۔ اس لئے کہ چھوٹے بچے بلا سواری بھی بلائے جا سکتے ہیں۔ ۱۳۵۲ف میں اطفال کی تعداد ۴۰، ۵۴ کے مابین رہی ہے۔

مجلس عاملہ کے اجلاس میں طے پایا تھا کہ اجلاس عام کے موقع پر شعبہ کا موازنہ پیش کر کے آپ کے قیمتی وقت کو متاثر نہ ہونے دینا چاہئے بلکہ معتمد صاحبہ ماہ نامہ سب رس میں اسے شائع کر دیں لہٰذا اس وقت اس کو موقوف رکھا گیا۔

اب میں اپنے محترم [illegible] کو [illegible] کرنا ضروری خیال کرتی ہوں۔ ادارۂ ادبیات اُردو کی افادیت اور [illegible] عام "[illegible]" کی مثال ظاہر [illegible] ادارہ کی وسیع خدمات بالخصوص تعلیم بالغہ سے

متعلق اس کی سرگرمی اور جوش عمل مستغنی از بیان ہے۔ تعلیم بالغہ کی اسکیم الحمدللہ بسرعت تمام بام ترقی کے زینے طے کر رہی ہے۔ ۱۹۴۳ء میں امیدواران کی کثرت تعداد کی وجہ سے امتحان کے دو میقات اگست اور ڈسمبر مقرر کرنے پڑے۔ زاید از دو ہزار طلبہ نے امتحانات اردو فاضل، اردو عالم، اردو زبان دانی اور اردو دانی میں اکثر ممتاز کامیابیاں حاصل کیں۔ اندرون ریاست حیدرآباد مثلاً میدک، نظام آباد، اودگیر وغیرہ اور بیرون ریاست بمبئی مرکز مقرر ہوئے علاوہ ازیں مختلف حصص جیسے پربھنی۔ گلبرگہ، بٹن وغیرہ چالیس پینتالیس مقامات میں اس کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور تمام مرکز اور شعبہ جات، اردو کی خدمت یعنی تعلیم کا انتظام، تیاری امتحان، قیام شعبہ جات اور تقسیم اسناد کے اجلاس وغیرہ کے کاروبار میں مصروف ہیں۔

صوبۂ متوسط و برار، صوبۂ مدراس اور ریاست میسور میں بھی بالغوں میں حصول تعلیم کا شوق پیدا ہو چلا ہے۔ جناب عبدالقادر سروری صاحب میسور میں ادارہ کے فیض کو عام کرنے میں بدل ساعی ہیں۔

بنگلور، پرلی، اور ہنگولی میں شعبۂ نسوان کی شاخیں، تعلیم بالغہ کی اشاعت اور اردو کی دیگر خدمات میں مصروف کار ہیں۔ ہمیں زور صاحب اور ان کے رفقاء کا بدل شکر گزار ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ آپ ہی کے جذبۂ عمل اور ان تھک کوششوں کا سبب ہے کہ اردو کے پیکر کو تازہ زندگی حاصل کرنے کے مواقع میسر ہوئے۔

اب اپنی بہنوں کی کافی سمع خراشی کے بعد اجازت چاہتے ہوئے کہ "احباب زندہ صحبت باقی"

میں بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ بہادر سے استدعا کرتی ہوں کہ کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہو کر عطائے اسناد سے ہم ارکان شعبہ کو ممنون و مسرور فرمائیں۔

رابعہ بیگم (مسز انواراللہ معتمد تجہیزات)

سوتیلی ماں ۔ اس کتاب میں محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ نے اصلاح معاشرت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ سوتیلی ماں اور سوتیلے بچوں کے تعلقات کو خوش گوار بنانے کے مفید طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر وہ مرد جو اپنے بچوں کے لئے سوتیلی ماں لانے پر مجبور رہا ہو اور ہر وہ خاتون جو سوتیلی ماں بن چکی ہو یا بننے والی ہو اور وہ ذی شعور بچے جو سوتیلی ماں کے زیر سایہ آچکے ہوں خصوصیت کے ساتھ اس کتاب کو غور سے پڑھیں اور اپنی زندگیوں اور گھر کی فضا کو خوش گوار بنائیں۔ صفحات ۵۶ چھوٹی تقطیع قیمت صرف ۴ر

نذر دکن ۔ سب رس کی مجلس ادارت کی رکن محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے اس مجموعہ کو مرتب کر کے اپنی خوش مذاقی اور ادبی ذوق کا ثبوت دیا۔ اس مجموعے میں دکن سے متعلق صنف نازک کے مضامین اور نظمیں شایع کی گئی ہیں۔ اگرچہ اپنی نوعیت کی یہ پہلی کوشش تھی لیکن بہت کامیاب رہی۔ خواتین دکن کا یہ گلدستۂ رنگ و بو تعلیم یافتہ گھرانوں کی زینت بننے کے لایق ہے (۱۰۴) صفحات قیمت ۱۲ر

سب رس کتاب گھر

اردو ادب کی ہر قسم اور ہر مذاق کی کتابیں موجود ہیں صرف ایک خط لکھ کر بذریعۂ وی پی طلب فرمالیجئے۔ اس کے علاوہ جس کتاب کی ضرورت ہو آرڈر دینے پر فراہم کر دی جائے گی۔

خطبۂ صدارت

محترمہ بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ بہادر

معزز خواتین!

ارباب شعبہ نے اس جلسے یعنی ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کی تقسیم اسناد کے لئے جو مجھے مدعو کیا ہے اس کی میں ممنون ہوں۔ سکینہ بیگم صاحبہ مسز رحمت اللہ کے مجھ سے دیرینہ تعلقات ہیں اور ان کے علمی و ادبی فرائض جو وہ نہایت خاموشی سے انجام دیتی ہیں ان کی قدر و منزلت ہمیشہ میرے دل میں رہی ہے۔ ان کی خاطر آج کی عزت کو قبول کرکے میں نے اس دشواری کو محسوس کیا کہ آپ کے عمدہ کارناموں کو بہ حیثیت صدر متعارف کرنے سے قاصر رہوں گی۔ کیونکہ آپ کے ساتھ شرکت کا میرے لئے یہ پہلا ہی موقع ہے۔

میں نہایت مسرت سے کہتی ہوں کہ اس ادارہ نے اپنے مختصر زمانۂ تنظیم و ترویج میں مختلف شعبوں میں اپنی افادیت کا ثبوت دیا جس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ ان شعبوں میں زیادہ عمر والے بچوں، بڑوں، مردوں اور عورتوں کے لئے تعلیم اور امتحانات کا شعبہ خاص کر وزن رکھتا ہے۔ یہی وہ شعبہ ہے جس کی فائدہ رسانی کی طاقت مسلمہ ہے اور یہی وجہ طاقت ہے، جو اتفاق و اتحاد اور عمدہ شہری بننے کے لئے خواہ مرد ہوں یا عورتیں بہت ضروری ہے۔

اس شعبہ کے قائم کرنے کی غرض و غایت یہ ہے کہ ایسے مرد و خواتین جو مدرسہ میں پڑھنے کی عمر سے متجاوز ہوچکے ہیں اور رزق بہم پہنچانے کے سخت کاموں میں مصروف ہیں بوقت فرصت اردو لکھنے پڑھنے سے واقف ہوجائیں اور ان میں ایسی دلچسپی اور خود اعتمادی پیدا ہو کہ آئندہ لکھنے اور پڑھنے کا سلسلہ بطور خود جاری رکھ سکیں ایسی تعلیم کے لئے ادارے نے خاص کتابیں لکھوائیں اور امتحانات کا اہتمام کرکے مختلف مرکز قائم کئے۔

یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ عوام نے اس تعلیم میں بڑے شوق اور رغبت سے حصہ لیا۔ گزشتہ سال یعنی سنہ ۱۹۴۳ء میں جس کی تقسیم انعامات کا یہ جلسہ ہے ماہ اگست میں امتحان منعقد ہوا۔ مگر اس کے بعد ہی محسوس ہوا کہ ایک اور جماعت جس میں مردوں کے ساتھ خواتین بھی کثرت سے شامل ہیں دوسرے امتحان کے لئے تیار اور شرکت کی خواہش مند ہے۔ چنانچہ ڈسمبر ۱۹۴۳ء میں پھر اسی سال کا دوسرا امتحان اردو دانی منعقد کیا گیا۔ امتحانات کے نتائج سے معلوم ہوا کہ طبقۂ اناث نے اردو دانی اور اردو زباں دانی دونوں میں بڑی تعداد میں کامیابی حاصل کی اور ان میں وہ تعداد بھی بہت نمایاں ہے جس نے درجۂ امتیاز حاصل کیا۔ نتائج مذکورۂ بالا میں اس عجیب واقعہ نے بڑی دلچسپی پیدا کردی کہ اردو دانی کے پہلے امتحان میں سب سے زائد نمبر پانے والی خواتین ہی تھیں اور بلحاظ ترتیب درجۂ امتیازی میں بھی خواتین ہی اول رہیں۔

درجۂ امتیازی میں کریم النسا بیگم (چنتا پلی) اول۔ عظیم النسا بیگم (چنتا پلی) دوم اور کلیم النسا بیگم (نظام آباد) سوم۔

اسی طرح اردو زباں دانی کے امتحان میں زہرہ بیگم (جولہ نظام الدین) نے سب سے زاید نمبر حاصل کئے اور امتحان میں اول آئیں۔

پھر اسی سال کے ڈسمبر والے امتحان میں سوم نمبر پر کبریٰ بی نامی ایک خاتون ہی آئیں ۔ اس کا تیسرا نمبر بھی بڑی وقعت اور قدر وقیمت سے دیکھے جانے کے قابل ہے جب مقابلے میں ایسی قابلیت کے اشخاص رہے ہوں جیسے۔

میجر تاج احمد خاں (بلدہ فوج) اور عبدالبصیر (داور واڑی) جو اول و دوم آئے تیسرا نمبر کبریٰ بی کا رہا۔

آخر میں یہ بھی ظاہر کردینا مناسب ہے کہ ادارے کی تعلیم و امتحانات کا حلقہ کافی وسیع ہوچکا ہے اس وقت ممالک محروسہ و بیرون ملک مختلف مقامات پر ۲۴ مرکز قائم ہوچکے ہیں کم از کم سال میں ایک بار نامزد شدہ اصحاب اپنے مرکز پر جاتے وہاں کی تعلیمی دلچسپیوں میں حصہ لیتے اور ضروری حالات کے متعلق صدر ادارہ کو رپورٹ دیتے ہیں ان مرکزوں میں بلدہ کا مرکز بہت وسیع ہے۔ ہر مرکز میں امیدواران ذکور و اناث شریک امتحان ہوتے ہیں بیرون ملک کے مرکزوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں بنگلور، میسور، بمبئی، ناگپور وغیرہ ۔

پہلے امتحان میں کامیاب امیدواروں کی مجموعی تعداد ۳۲۶ تھی اور دوسرے امتحان میں کامیاب امیدواروں کی تعداد ۶۲۳ تھی۔ پہلے امتحان کے ۳۲۶ کامیاب امیدواروں میں اناث کی تعداد ۱۳۷ تھی دوسرے امتحان کی تفصیل ذکور و اناث معلوم نہ ہوسکی ۔ مگر نسبت میں شاید نمایاں فرق نہ ہوگا ۔ اس لئے دوسرے امتحان میں بھی اناث کی نصف تعداد تسلیم کی جاسکتی ہے۔ اگر اس نسبت میں کوئی غیر معمولی فرق نہیں ہے تو مجموعی طور پر اناث کے نتائج بہت حوصلہ افزا ہیں ۔

میں ان تمام کامیاب شرکائے امتحان کو دلی مبارکباد دیتی ہوں خاص کر طبقۂ اناث میں ان کو جنہوں نے امتیازی درجہ میں کامیابی حاصل کرکے اپنے کو مستحق انعام ثابت کیا ہے مجھے قطعی امید ہے کہ تمام کامیاب شرکائے امتحان اپنی زباں دانی اور علمی معلومات میں روز بروز اضافہ کرتے رہیں گے اور ہرگز اس ہمت کو پس پشت نہ ڈالیں گے جو لکھنے پڑھنے کی مہارت سے انھیں حاصل ہوئی ہے ۔

اس موقع پر میں ادارے کی دیگر دلچسپیوں کا بھی ذکر کرنا چاہتی ہوں کیونکہ میرے خیال میں ایسی بہت سی خواتین ہیں جنھیں ادارہ کے متعلق معلومات حاصل نہیں اور جو اسی لاعلمی کی وجہ سے اس میں دلچسپی اور اس کے کاموں میں تعاون نہ کرسکیں۔ ادارہ کو کامیاب بنانے کے لئے ضرورت ہے کہ ادارے کے مقاصد اور اس کی سرگرمیوں سے ہر ایک واقف ہو ۔ یہ ادارہ تقسیم عمل کے لحاظ سے مختلف شعبوں پر منقسم ہے ۔ مثلاً (۱) شعبۂ امتحانات اردو (۲) شعبۂ انسائیکلوپیڈیا (۳) شعبہ ادب اطفال (۴) شعبہ زبان (۵) تاریخ (۶) شعبۂ شعراو مصنفین (۷) شعبۂ سائنس (۸) شعبۂ کتب خانہ (۹) شعبہ طلبہ (۱۰) شعبہ تالیف و ترجمہ (۱۱) شعبہ تنقید ۔ اور توقع ہے کہ ہر صاحب علم و عمل اپنی دلچسپی کے لحاظ سے اس کو فائدہ پہنچائے گا یوں تو ہر ایک شعبہ اپنی انفرادی حیثیت سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے مگر جن شعبوں کا تعلق نشر و اشاعت سے ہے ان کا اجمالی ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا۔ تفصیل کے لئے "ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۴۳ء میں" قابل ملاحظہ ہے۔

ادارے کے کاموں میں سب سے زیادہ اہمیت انسائیکلوپیڈیا کو حاصل ہے جس کا بجائے خود ایک شعبہ ہے ۔ اس کتاب کی نوعیت یہ ہے کہ جس طرح عربوں نے اپنے علم و فضل کے عروج کے زمانے میں ایسی کتابیں تیار کی تھیں جن کو قاموس کہتے تھے اور جو عام معلومات اور تحقیقاتوں کا مخزن سمجھی جاتی تھیں، اب اسی قاموس کی موجودہ ترقی یافتہ شکل انسائیکلوپیڈیا ہے ۔ یہ لغت سے بھی بڑا کام ہے اور

ایسی کتابیں کسی ایک ہی قلم کی شرمندۂ احسان نہیں ہوتیں بلکہ ہر فن اور علم کے ماہر کی اعانت کے بغیر ایسی کتاب مکمل نہیں ہوسکتی ۔ اور ان سب کے ساتھ ایک با ضابطہ تنظیم کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو بحمد اللہ موجود ہے ۔ مجھ کو امید ہے کہ ماہرین علم و فن کی اعانت بھی پورے طور پر حاصل ہوجائے گی اور اردو انسائیکلوپیڈیا جلد شائقین تک پہنچ جائے گی ۔ یہ امر قابل مسرت ہے کہ اصل کتاب کی ایک جلد تیار بھی ہوچکی ہے ۔ جو دار الطبع سرکار عالی میں زیر طبع ہے کتاب کی تکمیل کے بعد ادارے کا ایک ایسا روشن کارنامہ ہوگا جو سارے ہندوستان کو منور کردے گا ۔

ادارۂ ادبیات اردو نے اپنی روئداد ۱۹۴۳ء میں ایک لانبی فہرست ان مفید اور یکار آمد کتب کی دی ہے جو اس سال طبع اور شائع ہوچکی ہیں اور ان کتابوں کی تفصیلات بھی بتائی گئی ہیں جو زیر ترتیب ہیں ۔ ان کتب کی تالیف و تصنیف میں طبقۂ اناث کے اہل قلم نے بھی حصہ لیا ہے ۔ اس موقع پر ادارے کی جملہ کتب پر روشنی ڈالنا باعث طوالت ہوجائے گا مگر مثال کے طور پر صرف ۱۹۴۳ء کی ان چند کتب کا ذکر کروں گی جن کا تعلق اناث سے ہے ۔ ایک شعبہ رقیہ بیگم صاحبہ (مسز زین یار جنگ) پرنسپل کلیۂ اناث کے زیر صدارت کام کررہا ہے ۔ جہاں وہ بچوں اور بچیوں کے لئے مفید کتابیں تیار کررہی ہیں ۔ خواتین کی لکھی ہوئی ۱۹۴۳ء کی کتابیں حسب ذیل ہیں ۔ مرزا غالب ، حیدرآباد ، اشوک اعظم اور چند دیگر کتب ۔ بعض ایسی کتابوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو سائنس سے متعلق ہیں ۔ اگرچہ کہ ان کے مصنف خواتین نہیں ہیں پھر بھی وہ دونوں کے لئے طبعاً دلچسپی یکساں تعلق رکھتی ہیں ۔ مثلاً پودوں کی کہانی خود ان کی زبانی ، طبیعیاتی کائنات ، زہریلے پودے ، جراثیم وغیرہ ۔ غرض کہ کتب مطبوعہ و زیر طبع کی خاصی بڑی فہرست ہے جو ۱۹۴۳ء کی مطبوعہ روئداد ادارہ میں درج ہے اور دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہیں ۔

اس موقع پر میرے آج کے فرائض کے اختتام سے قبل میری خواہش بلکہ میرا فرض ہے کہ میں ادارے کے ان سرگرم اراکین اور مالی امداد سے سرپرستی کرنے والے حضرات کا دلی شکریہ ادا کروں جن کی مستعدی اور سرگرمی اور بلا طلب رقمی اعانت ادارے کے کاموں کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھا رہی ہیں ان میں معتمد صاحب ادارہ اور ۱۹۴۳ء کے معطیان آنریبل غلام محمد صاحب و آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر خاص طور پر قابل ذکر اور لائق مبارک باد ہیں ۔ آخر میں آئیے ہم سب حاضرین جلسہ اس ذات قدسی صفات بندگان اقدس و اعلیٰ کی اردیاد عمر و شوکت و حشمت کی دعاؤں میں مصروف ہوں جن کے افسون رحمت و کرشمۂ کرم کی یادگار عثمانیہ یونیورسٹی اور ادارۂ ادبیات اردو ہیں ۔

بیدارئ اناث

(جو جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات شعبۂ نسواں میں سنائی گئی)

عورت کے دم سے کہتے ہیں نظمِ حیات ہے
مجبور کیوں زمانے میں پھر اس کی ذات ہے؟

اعلائے حق پہ، حق کی حمایت پہ بس نہیں
علم و ہنر پہ، فکر پہ، جدت پہ بس نہیں
قلب و نظر پہ، جوشِ عقیدت پہ بس نہیں
حد ہو گئی کہ عزم پہ، ہمت پہ بس نہیں

ہر لحظہ نکتہ چینوں کو اس کی تلاش ہے!
کیا موردِ بلا یہی اک زندہ لاش ہے؟

درماندہ زندگی کی یہ رفتار تابہ کے؟
حالِ زبوں پہ خندۂ اغیار تابہ کے؟
یہ ناروا طریقۂ ایثار تابہ کے؟
اس صنف پر رہے گا یہ ادبار تابہ کے؟

تقدیر سے فلک سے نہیں، دور سے نہیں!
شکوہ خود آپ سے ہے کسی اور سے نہیں!

عہدِ سلف میں کیا کبھی بیکار ہم رہے؟
تاریخ ہے گواہ کہ بیدار ہم رہے
باطل کے آگے برسرِ پیکار ہم رہے
پابندیوں کے ساتھ بھی خود دار ہم رہے

ہر شعبۂ حیات میں حاصل مقام تھا!
ملت کی آبیاری ہمارا ہی کام تھا!

میں دورِ نو کے ذوقِ ترقی سے خوش نہیں
کڑھتا ہے دیکھ دیکھ کے میرا دلِ حزیں
آماج گاہِ شر ہوئی اللہ کی زمیں
اک شورشِ حیات ہے، نے سوز، نے یقیں

بخشی گئی نگاہ وہ عہدِ جدید کو!
پہچانتی نہیں جو سیاہ و سفید کو!

آسودگی نہاں ہے ضروری قیود میں!
ہے پا بہ گِل حیات جہانِ نمود میں
اپنی جگہ ملے ہمیں بزمِ وجود میں
آزاد ہم رہیں مگر اپنے حدود میں

ناموس و اقتدار کا مفہوم اور ہے
آزادئ اناث کا مفہوم اور ہے

(۲)

بے کیف ہے حیات اگر علمیت نہ ہو | تعلیم ہے فضول اگر تربیت نہ ہو
انساں نہیں وہ جس میں کہ انسانیت نہ ہو | بے سود ذوق و شوق ہے جب کیفیت نہ ہو

آزادیوں کی جنگ میں مصروف ہے جہاں
سیرت گری میں راز زنی کے ہیں نہاں

عالم پہ علم و فن کے حقائق ہیں آشکار | مکتب بھی، مدرسے بھی ہیں کالج بھی شاندار
اہلِ کمال بھی ہیں اتالیقِ باوقار | تادیب و تربیت کی گراں ہے ذمہ دار

نا اہل راہبرس کہ نا اہلیت سند
آنکس کہ خود گم است کرا رہبری کند

روحِ عمل ہو طبقۂ نسواں میں گر رواں | ہر گھر سے دور جہل و فلاکت کا ہو نشاں
تعلیم و تربیت سے مرصع ہر ایک ماں | ملت کے آگے پیش کرے حیدری جواں

بیدارئ اناث کی اب احتیاج ہے!
امراضِ قوم کا یہی واحد علاج ہے!

بچوں کی تربیت کا تہیہ کریں جو ہم! | خوابِ گراں سے جاگ اٹھے قسمتِ اُمم
خدمت ادا جو کرتے ہیں یہ ناتواں قدم | کرتے نہیں وہ کام شہنشاہوں کے قلم

ماں کی سرشت جذب ہے بچوں کے ڈھنگ میں
رنگتی ہے اپنی پود کو ماں اپنے رنگ میں

انسانیت نواز ہے عورت کی زندگی | خاموش و کارساز ہے عورت کی زندگی
جاں بخش ایک ساز ہے عورت کی زندگی | خود زندگی کا راز ہے عورت کی زندگی

اس کا وجود واقعی سیرت نواز ہے!
ہے مجتہد وہی، وہی ملت نواز ہے!

بشیر النساء بیگم بشیر

محترمہ صدر صاحبہ اور معزز حاضرین!

شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیات اُردو کی مجلس انتظامی کی جانب سے میں یقین دلاتی ہوں کہ شعبۂ نسواں آپ سب کا ہے، اور آپ سب شعبۂ نسواں کے! ——— یہ شعبہ نہ صرف خواتینِ دکن کی اعانت کو اپنا حق سمجھتا ہے بلکہ یہ توقع رکھتا ہے کہ عالمِ نسواں کی توجہات کا دائمی مرکز بنے ——— غالباً اس مقصد کو بار بار دہرانے ضرورت نہیں کہ اردو زبان کی خدمت اور ترویج اس کا واحد نصب العین ہے۔

حیران ہوں کہ شکریہ کس طرح اور کس زبان سے ادا کیا جائے، زبان آپ کی شعبہ آپ کا، ہم سب آپ کے، — ہر منزل پر ہمیں آپ کی اعانت اور توجہ کی ضرورت ہے، البتہ یاد دہانی ہمارا کام ہے ——— اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما۔ ہماری استدعا پر آپ نے زحمت گوارا کی اور جلسہ کو کامیاب بنایا - یہ کامیابی آپ کو مبارک ہو! خدا کرے کہ آپ سب کی یہ تشریف آوری شعبہ کے لئے مزید کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

شعبہ نسواں بڑی عقیدت اور مسرت کے ساتھ محترمہ بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ بہادر کی خدمت گرامی میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے کہ آپ نے ازراہِ ادب نوازی اس اجلاس کی صدارت قبول فرمائی جس سے ارکانِ مجلس کی دیرینہ آرزو کا تکملہ اور حوصلہ افزائی ہوئی ———

آپ سب بھی ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود شعبہ کے کاروبار سے آپ نے دلچسپی کا اظہار فرمایا - آپ کی دلچسپیاں اگر شامل نہ ہوتیں تو ——— کیا ہوتا — ؟ منتظر رہتے وہی دو چار ہم!!

بشیر النساء بیگم بشیر
(شریک معتمد شعبہ)

اطلاع - شعبۂ نسواں کی رکنیت کا سالانہ چندہ (ﮯ) ہے۔ جو علم دوست خواتین اس شعبہ کی رکنیت قبول فرمائیں ان کی خدمت میں رسالہ سب رس ایک سال تک مفت روانہ کیا جائے گا اور جو سالانہ (للعہ) عنایت فرمائیں اُن کی خدمت میں بچوں کا سب رس ایک سال تک مفت بھیجا جائے گا۔

اداریہ مملکت

حیدرآباد کے مختلف فرقوں میں اردو کی مقبولیت

ادارۂ ادبیات اُردو کی سرگرمیاں

گزشتہ ہفتہ ادارۂ ادبیات اردو کا جلسۂ تقسیم اسناد والاشان حضرت معظم جاہ بہادر کی صدارت میں بمقام ٹاؤن ہال منعقد ہوا اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ نے اسناد اور انعامات تقسیم فرمائے۔ یہ ادارہ تقریباً ۱۴ سال سے اردو ادب کی اشاعت میں مصروف ہے مگر اس کا اہم کارنامہ تعلیم بالغان کے شعبہ کا قیام ہے جو گزشتہ چار سال سے سرگرم عمل ہے اور خواندگی کی مہم کو آگے بڑھا رہا ہے۔ اس شعبہ کا مقصد یہ ہے کہ بڑی عمر کے ایسے اشخاص کے لئے جنھیں تعلیم سے بہرہ مند ہونے کا موقع نہ مل سکا یا جو دوسرے مضامین میں تعلیم پاچکے ہیں لیکن اردو سے واقف نہیں ہیں، اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اسی طرح ان عورتوں کے لئے بھی اردو کی تعلیم کا انتظام ہو جو سرکاری مدارس سے استفادہ نہیں کر سکتیں۔

ادارہ کی روئداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسب ذیل امتحانات کا انتظام کیا گیا ہے (۱) اردو دانی (۲) اردو زباں دانی (۳) اردو عالم (۴) اردو فاضل (۵) خوش نویسی۔ اس ادارہ کے اردو امتحانات کی مقبولیت نہ صرف بلدہ اور اضلاع تک محدود ہے بلکہ اس کے مراکز حیدرآباد کے باہر بمبئی، مدراس، صوبہ متوسط اور میسور میں بھی قائم ہوگئے ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں ادارہ نے اردو دانی کا دوبار امتحان لیا۔ پہلے امتحان میں (۸۴۷) امیدوار شریک ہوئے اور (۶۳۲) کامیاب ہوئے۔ دوسرے امتحان میں (۹۰۷) امیدواروں نے شرکت کی اور (۶۲۳) امیدوار کامیاب ہوئے۔ اس طرح ۱۹۴۳ء میں (۱۶۰۴) ان پڑھ آدمی پڑھے لکھے بنائے گئے۔ روئداد میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ:۔

"ان اردو امتحانات میں ہر مذہب وملت اور طبقے کے امیدوار شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سال امتحان اردو عالم میں ایک ہندو امیدوار بی، وی، گوپال راؤ بہ حیثیت مجموعی اول آئے۔ اسی طرح متعدد غیر مسلم امیدواروں نے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی ہے۔"

وہ افراد اور ادارے جو وقت بے وقت یہ شور مچاتے رہتے ہیں کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر حکومت سرکار عالی نے ہندو طلبہ کو تعلیم سے محروم رکھا وہ ادارۂ ادبیات اردو کی روئداد کا بغور مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان کا اعتراض کس قدر حقائق سے دور ہے۔ ہم نے بارہا واضح کیا ہے کہ اردو حیدرآباد کے مختلف فرقوں اور طبقوں کی مشترکہ زبان ہے۔ وہ نہ صرف ملک کے ہر گوشہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ غیر مسلم طلبہ نہایت ذوق و شوق سے اردو سیکھتے ہیں جس کا ثبوت ادارۂ ادبیات اردو جیسے خانگی ادارہ کی روئداد سے ملتا ہے۔ اردو کے خلاف بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر جو شور مچایا جارہا ہے اس کے پیچھے چند سیاسی محرکات کارفرما ہیں۔

اردو ادب کی اشاعت میں حیدرآباد اور حیدرآباد سے باہر بہت سی انجمنیں مصروف ہیں۔ اس لئے ہم ادارۂ ادبیات اردو کے کارکنوں کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ اپنی دیگر سرگرمیوں کے مقابلہ میں تعلیم بالغان کی مہم پر زیادہ توجہ کریں اس مہم کی کامیابی ملک کے لئے ایک فال نیک اور دور رس نتائج کی حامل ہوگی۔ ہم ادارہ کے کارکنوں کو اس مستحسن اقدام پر مبارک باد دیتے ہیں۔

یکم اپریل ۱۹۴۴ء

حیدرآباد میں کل ہند اُردو کانگریس مشاہیرِ ہند کا اجتماع صدرِ اعظم بہادر کی سرپرستی

بعض جامعات کے ارباب علم وفضل
کی تحریک پر ادارۂ ادبیات اردو نے حیدرآباد میں ۲۱، ۲۲،
اور ۲۳ جولائی ۱۹۴۳ء کو ایک ایسی کل ہند اردو کانگریس کے
منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو اپنی قسم کا پہلا اجتماع ہوگا جس
میں ہندوستان کی مختلف جامعات کے اردو پروفیسروں کے
علاوہ تمام ایسے ہندو اور مسلمان مشاہیر کو شرکت کرنے کی
دعوت دی گئی ہے جن کی خدمات ملک کی قومی زبان کی ترقی
واشاعت میں مسلمہ ہیں۔

انتظامات بہت اعلیٰ پیمانہ پر شروع کردئے گئے ہیں۔
ہزاکسلنسی صدر اعظم دولت آصفیہ نے اس کانگریس کی
سرپرستی اور ایک اجلاس کی صدارت قبول فرمائی ہے مجلس استقبالیہ
کے صدر ڈاکٹر نواب سر مہدی یار جنگ بہادر اور اس کے نائب صدر
راجہ بہادر بشیشور ناتھ صاحب میر مجلس عدالت عالیہ ہیں۔ ہندوستان
کے بعض مشاہیر سے بھی کانگریس کے مختلف اجلاسوں میں صدارت
کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ کانگریس کے اجلاسوں میں اردو
زبان کی ترقی واشاعت کے متعلق اہم ترین مسائل پر ارباب فن
تبادلۂ خیال کریں گے اور مشہور اساتذہ زبان کے متعلق اپنے
مقالے پڑھیں گے اس اجتماع کے ساتھ ایک شاندار علمی نمایش
بھی ہوگی۔ جس میں ہندوستان اور دکن میں اردو زبان کی ترقی
اور ہمہ گیری کو ظاہر کرنے کے لئے نادر مخطوطات، قدیم کتابیں اور
بہت سے نقشے اور تصاویر پیش کی جائیں گی۔ یہ نمایش اپنی
قسم کی پہلی نمایش ہوگی اس کی کامیابی کے بہترین وسائل فراہم
کئے جارہے ہیں۔

علاوہ دیگر مسائل کے اردو زبان وادب کی ایک مبسوط
تاریخ مرتب کرنے کی تجویز بھی زیر غور رہے گی اور اس تاریخ
کے مختلف ادوار کی ترتیب کا کام ماہرین فن کے سپرد کیا جائے گا۔

مجلس انتظامی نے نہایت سرگرمی کے ساتھ اپنا کام
شروع کردیا ہے اس کے صدر نواب زین یار جنگ بہادر اور معتمد
پروفیسر سید محی الدین قادری زورؔ ہیں۔ مجلس استقبالیہ کا دفتر
ادارۂ ادبیات اردو میں منتقل ہوچکا ہے رکنیت کا چندہ (ھ)
ہے توقع ظاہر کی گئی ہے کہ اہل ملک زیادہ سے زیادہ مالی امداد
کریں گے۔

اُردو کانگریس۔

انتظامات روز بروز اہتمام ضروری تفصیلات پر حاوی ہوتے جاتے ہیں
مختلف کمیٹیاں شب و روز اپنا کام کررہی ہیں۔ انتظامی کمیٹی زیر
صدارت نواب زین یار جنگ بہادر مہمانوں کے قیام وطعام
کے متعلق اپنا دستور العمل مرتب کرچکی ہے۔ اور حیدرآباد کی ثقافتی
اور شہری ترقیوں کے مطالعہ کا موقع دینے کے لئے اس نے باہر سے
آنے والے شرکائے کانگریس کے لئے ایک تفصیلی پروگرام بنالیا ہے جس کے
مطابق حیدرآباد کی عمومی ترقیات کے مختلف شعبے مہمانوں کو
دکھائے جائیں گے علاوہ بریں مہمانداری کے دیگر لوازم کا بھی بہت
اعلیٰ پیمانہ پر انتظام کیا جارہا ہے۔ ہندوستان کے جن اصحاب
کی خدمت میں دعوت نامے بھیجے گئے ہیں ان سے دریافت کیا گیا ہے
کہ ان کے لئے قیام وطعام کی کس قسم کی آسائشوں کا انتظام
کیا جائے۔ مشرقی اور مغربی طرز زندگی رکھنے والے مہمانوں کے لئے
بہترین انتظامات کئے جارہے ہیں۔

مجلس انتظامی بلدہ اور ممالک محروسہ میں تمام حامیان
اردو سے اپیل کرتی ہے کہ وہ مجلس استقبالیہ کی رکنیت میں شریک ہوکر

اردو کانگریس کے اجتماعات کو حیدرآباد کی قدیم روایات کے مطابق زیادہ سے زیادہ شاندار اور کامیاب بنائیں۔ اس اہم ترین کام میں مجلس انتظامی ہر طبقہ اور ہر مکتب خیال سے تعاون حاصل کرنے کی توقع رکھتی ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد سے مجلس استقبالیہ کی شرکت کے فارم حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

نمائش کے معتمد خواجہ محمد احمد صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی (دفتر نمائش گاہ باغ عامہ) ارباب ذوق سے درخواست کرتے ہیں کہ جن اصحاب کے پاس نادر کتابیں، مخطوطات اور دیگر علمی و ادبی نوادر موجود ہوں وہ ازراہ کرم ان اشیاء کو نمائش کے لئے عنایت فرمائیں۔ تمام ایسی اشیاء انتہائی احتیاط اور حفاظت کے ساتھ نمائش کے بعد مالکان کی خدمت میں واپس کر دی جائیں گی۔

اُردو امتحانات اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس بتاریخ ۳ مئی ۱۹۴۴ء مطابق ۹ ، رخورداد ۱۳۵۳ف صبح دس بجے نظام کالج میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی :—

مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) صدر
مولوی محمد سجاد مرزا صاحب ایم اے (") نائب صدر
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے۔ پی ایچ ڈی (لندن)
مولوی محمد عالم صاحب مددگار ناظم تعلیمات
حبیب اللہ صاحب ہاشمی مددگار ناظم رجسٹریشن
" سید محمد صاحب ایم اے۔ شریک معتمد مجلس
خواجہ حمید الدین ایم اے مہتمم ادارہ

ادارہ کے آئندہ اردو امتحانات جولائی ۱۹۴۴ء کے لئے ممتحنین کا انتخاب کیا گیا

بعض مکانوں کی دور دست [illegible] کہ تمام مرکز کے لئے پچاس امیدواروں کی شرط بہت سی دشواریوں کا باعث ہو رہی ہے جس پر کافی غور و خوض کے بعد طے پایا کہ معتمد صاحب ادارہ کو مجاز گردانا جائے کہ حسب صوابدید مرکزوں کی اجازت دیں بشرطیکہ امیدواروں کی تعداد کسی صورت میں تیس سے کم نہ ہو۔ گیارہ بجے جلسہ برخاست ہوا۔

اُردو امتحانات کے مرکز اس سال اردو امتحانات بتاریخ ۱۲، ۱۳، ۱۴ شہریور ۱۳۵۳ف مطابق ۱۸، ۱۹، ۲۰ جولائی ۱۹۴۴ء حسب ذیل مرکزوں میں ایک ساتھ لئے جائیں گے۔

(۱) اندولہ (۲) اورنگ آباد (۳) بلدہ (اناث) (۴) بلدہ (ذکور) (۵) بلدہ (فوج) (۶) بولی (۷) بمبئی (۸) برلی (۹) پربھنی (۱۰) کپڑل (۱۱) کلیانی (۱۲) گلبرگہ (۱۳) تیلے گاؤں ابیڑ، (۱۴) مومن آباد (۱۵) نظام آباد (۱۶) وریجاپور (۱۷) ہمنا باد (۱۸) ہنگولی۔

امتحان کا وقت نامہ اور ہال ٹکٹ یکم جولائی ۱۹۴۴ء کو دفتر سے روانہ کر دئے جائیں گے اگر کسی امیدوار کو ۱۰ جولائی تک ہال ٹکٹ نہ ملے تو فوراً دفتر ادارہ کو مطلع کر دے ورنہ بغیر ہال ٹکٹ کے امتحان گاہ میں داخلہ کی اجازت نہ مل سکے گی۔ بلدہ کے امیدوار اپنے ہال ٹکٹ دفتر ادارہ سے بہ اوقات ۱۰ تا ۵ ساعت شام حاصل کر سکتے ہیں۔

ادارہ کی شاخوں کے معتمدین اور مراکز کے بانیوں کو امتحان گاہ نشستوں اور سیاہی کی دواتوں کا انتظام پہلے ہی سے کر لینا چاہئے۔ صدر نگران کار صاحب امتحان سے ایک روز قبل بھیج جائیں گے۔ امیدواروں کو جوابی بیاضیں ادارہ کی طرف سے دی جائیں گی۔ ان کو اپنے ساتھ قلم لانا چاہئے۔

جلسۂ تقسیم اسناد پربلی حسب ارشاد معتمد ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد شاخ کی جانب سے مولوی [illegible] الدین صاحب صدیقی

سابق معتمد شعبۂ طلبہ نمائندہ منتخب ہوئے چنانچہ صاحب موصوف ۳۰ اردی بہشت ۱۳۵۳ف کو شریک جلسہ ہوئے اور اسنادات و انعامات حاصل ہوتے ہی نہایت احتیاط کے ساتھ پرلی روانہ کئے مولوی سید احمد صاحب منتظم کوتوالی پرلی سرپرست شعبۂ طلبہ اور مولوی محمد قاسم صاحب عثمانی بی اے۔ مہتمم مارکٹ پرلی نے پرلی کے بیوپاریوں سے مبلغ صہ روپے لے کر معتمد کے پاس بھجوادئے تاکہ ضروری انتظامات کئے جاسکیں پرلی کے بیوپاریوں کا شعبہ ہذا ممنون ہے۔ معتمد شاخ نے منظورہ پروگرام اور رقعہ کا مسودہ صدر کی خدمت میں روانہ کرکے عملی کام شروع کرنے کی اجازت حاصل کی اور چونکہ وقت بہت تنگ تھا اور کام زیادہ اس لئے رات کے گیارہ بجے مولوی شیخ حسین صاحب نائب معتمد مولوی نوازالدین صاحب خازن اور مولوی سعیدالدین صاحب صدیقی معتمد شعبۂ طلبہ اور عزیزالدین صاحب قریشی سابق نائب صدر کو طلب کرکے رات ہی میں پروگرام اور رقعہ کی طباعت کے لئے کہہ دیا گیا صاحبان موصوف نے راتوں رات ہر دو کام تکمیل کردئے اور دوسرے دن سعیدالدین صاحب صدیقی نے رقعے تقسیم کرنے شروع کردئے اور تقریباً ۹ بجے تک تقسیم کا کام ختم ہوگیا۔
مجلس انتظامی شعبہ طلبہ نے طے کیا تھا کہ جلسہ تقسیم اسناد مارکٹ میں ہو اس موقع پر سیٹھ حاجی سلیمان احمد صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے اپنی دکان جلسہ منانے کے لئے عطا فرمائی اور ضروری اشیاء فراہم کردیں۔ تقریباً ۱۲ بجے سے مندوبین کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔
ٹھیک شام کے چھ بجے عالی جناب مولوی احمد عبدالجبار صاحب دوم تعلقدار جلسہ میں رونق افروز ہوئے۔ مولوی عبدالرحیم خاں صاحب ایم اے۔ صدر شاخ کی تحریک اور مولوی محمد قاسم صاحب عثمانی بی اے کی تائید پر تالیوں کی گونج میں عالی جناب دوم صاحب نے کرسئ صدارت کو زینت بخشی۔ جلسہ کی کاروائی مولوی فتح علی خاں صاحب کی قراءت اور مسٹر تکارام صاحب گوڑبولے کی پرارتھنا سے شروع ہوئی۔
معتمد شاخ نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ معتمد صاحب نے بتلایا کہ عالی جناب مولوی احمد عبدالجبار صاحب دوم تعلقدار نے باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے جلسہ کی صدارت کو قبول فرمایا جس کا شعبۂ طلبہ نہایت ممنون و مشکور رہے۔ ازاں بعد مولوی محمد قاسم صاحب عثمانی بی اے مہتمم مارکٹ پرلی صدر شعبۂ طلبہ نے چار سالہ رپورٹ پڑھ کر سنائی اور چار سالہ کارگزاری سے حاضرین کو روشناس کرایا۔ ادارہ کے اغراض و مقاصد پر مولوی عبدالرزاق صاحب۔ مسٹر جیون راؤ دیشپانڈے۔ مولوی سید ابراہیم صاحب نے مدلل تقریر کی اور یہ ثابت کر دکھایا کہ اُردو ہندوستان کی مشترکہ اور قومی زبان اور ہندو مسلم اتحاد کا بہترین ذریعہ ہے۔ جلسہ کے اختتام پر پرلی کے بیوپاریوں نے ایٹ ہوم ترتیب دیا۔ مولوی سید احمد صاحب منتظم پولیس نے جن کا تبادلہ ہوا اپنا رخصتی پر شعبۂ طلبہ کو (عہ) روپے عطیہ عنایت فرمایا صاحب موصوف شعبۂ ہذا کے بہت ہمدرد تھے۔ شعبہ آپ کا بے حد ممنون ہے۔ نیز عالی جناب مولوی عبدالجبار صاحب دوم تعلقدار صاحب سرپرست ادارہ کا تبادلہ ترقی کے ساتھ کارپوریشن حیدرآباد عمل میں آیا۔ صاحب موصوف نے وعدہ فرمایا ہے کہ رہبر دکن کا ایک سال کا چندہ عنایت فرمائیں گے۔

رپورٹ دورہ دفتر شعبۂ طلبہ سے ۲ تاریخ ۸ تیر کو بحیثیت نمائندہ مولوی شیخ حسین صاحب، سید شریف الحسن صاحب اور ابوالظفر محی الدین صاحب صدیقی بغرض دورہ قرا ہی

امیدواران اردو امتحانات بذریعہ بیل بنڈی ۲ ساعت شب سمت سیل گاؤں تعلقہ پالم روانہ ہوئے۔ توقع کی گئی تھی کہ یہ اصحاب کو مختلف مقامات کے دوروں کے بعد ۲ رتیر کو واپس ہوں گے مگر سیل گاؤں پہنچنے کے بعد مولوی ہدایت علی خاں صاحب پولیس پٹیل سیل گاؤں نے اپنے یہاں قیام و طعام کا معقول انتظام رکھا اور امیدوار فراہم کرنے میں بڑی امداد دی اور نمائندوں کو ۳ یوم روکا تاکہ لوگ اردو دانی کے کورس سے آشنا ہو جائیں۔ مولوی شیخ حسین صاحب نے لوگوں کو ادارۂ ادبیات اُردو کے اغراض و مقاصد کو اچھی طرح سمجھایا اور مولوی سید شریف الحسن صاحب اشفاق اور مولوی ابوظفر محی الدین صاحب صدیقی نے ان ایام میں اردو دانی کے نصاب کی تکمیل کرائی اور ان کو خط لکھنا اور پڑھنا اور قواعد وغیرہ سمجھائی گئی اور تعلیم کی ذمہ داری مولوی حسن الدین صاحب برادر قاضی کے سپرد کرکے بتاریخ ۶ رتیر بوقت ۳ ساعت سون پیٹھ روانہ ہوئے اور ۸ بجے شب سون پیٹھ پہنچ گئے چونکہ یہ دورے بغیر اطلاع کے تھے اس لئے مسافرخانے میں ٹھیرنے کا قصد کیا۔ جوں ہی اس کی اطلاع مولوی منظفر الدین صاحب اور محمد ہاشم صاحب کو ملی وہ راتوں رات آپہنچے اور نمائندوں کے قیام و طعام کا انتظام اپنے سر لیا۔ وقت کی قلت کی وجہ سے نمائندوں کا ارادہ تھا کہ صرف رات میں تھوڑا آرام لیں اور امیدوار فراہم کرکے صبح پرلی روانہ ہو جائیں۔ اس موقع پر تقریباً رات کے دو بجے تک مولوی منظفر الدین صاحب اور محمد ہاشم صاحب نے کافی امیدوار فراہم کئے۔ اس موقع پر پھر مولوی شیخ حسین صاحب نے ادارہ کے اغراض و مقاصد سمجھائے اور مولوی شریف الحسن صاحب اور ابوظفر محی الدین صاحب امیدوار فراہم کرنے میں منہمک ہو گئے۔ صاحب موصوف کی تفہیم کے بعد امیدوار جوق جوق آنے لگے اور مجبور کیا کہ صبح ۱۰ بجے تک ٹھیر جائیں اس موقع پر اپنے قصد کو ترک کیا اور ٹھیر گئے اس موقع پر مولوی محمد نبی صاحب متاجر سون پیٹھ اور عبدالحفیظ صاحب نے بڑی مدد دی فارم کی کمی کی وجہ سے فیس وصول کرلی گئی اور ایک علحدہ رجسٹر پر ان کے نام ایک فہرست کی شکل میں ترتیب دئے۔

بعد نماز جمعہ راہی پرلی ہوئے اور تقریباً ۱۲ ساعت شب پرلی پہنچے اور بتاریخ ۸ رتیر ۸ بجے صبح اپنی مکمل رپورٹ اور فیس شاخ کے دفتر میں داخل کردی گئی۔

سعیدالدین صدیقی۔ معتمد شعبۂ طلبہ

جلسۂ تقسیم اسناد اڑگاؤں

بتاریخ ۲۹ خورداد ۱۳۵۳ف بوقت ۸ بجے صبح جلسۂ تقسیم اسناد زیر صدارت عالی جناب مولوی فیاض حسین صاحب منتظم کوتوالی اسٹیشن ہوز جینتور بمقام مدرسہ منعقد ہوا۔ اس صدارت کی تحریک جناب نائب امین صاحب جنگلات مستقر ہذا نے کی جس کی تائید صدر مدرس نے کی۔

تقریباً سو ڈیڑھ سو اصحاب مدعو تھے۔ عالی جناب منتظم صاحب پولیس نے اپنی تقریر جو مرہٹی اور اردو دونوں زبانوں میں تھی ارشاد فرمایا کہ اس چھوٹے سے قصبہ میں تعلیمی ترقی دیکھ کر مسرت ہوئی'

"اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے"

تعلیم بالغاں جیسا اہم کام مولوی شیخ محبوب صاحب صدر مدرس جس دلچسپی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں اس کا نتیجہ آپ اصحاب پر ظاہر ہے امید کہ آئندہ بھی اس طرح آپ لوگ تعلیم میں دلچسپی لے کر اپنے قصبہ کو شاہراہ ترقی پر پہنچائیں گے۔

صدر جلسہ نے اسناد تقسیم کرتے ہوئے طلبہ سے خواہش کی کہ وہ اپنے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھیں اور بستی کے لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ ان نئی پھوٹنے والی کونپلوں کی

حوصلہ افزائی کرکے انھیں تناور درخت بنانے کی سعی جاری رکھیں گے۔
مہذب ممالک میں غریب سے غریب مزدور بھی اخبار خرید کر پڑھتا ہے۔
ہندوستان بھی ایک مہذب ملک ہے ہم کو پیچھے نہیں رہنا چاہئے
جب تک آپ کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کریں آپ لوگ دوسرے
ممالک کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتے ۔ اختتام جلسہ پر مولوی
شیخ محبوب صاحب صدر مدرس مدرسہ ہذا نے حضرت بندگان عالی
وشہزادگان بلند اقبال وشہزادیاں فرخ فال کی عمر واقبال
کی ترقی کے لئے دعا کی۔

چائے نوشی کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

شیخ محبوب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ قدیم اڑگاؤں تعلقہ جینتور

شاخ کپل | بتاریخ ۲۰ ر تیر ۱۳۵۳ف بمکان جناب مولوی رحمت اللہ صاحب
ایم اے۔ ایل ایل بی منصف کپل شاخ ہذا کا ایک جلسہ انتظامی
بہ تحریک جناب مولوی محمد حمید اللہ خاں صاحب متعلم بی اے۔ جامعہ عثمانیہ
طلب کیا گیا تھا جس میں مولوی فیض علی صاحب شریک معتمد کو تین
اجلاس میں مسلسل بلا اطلاع غیر حاضر ہونے کی وجہ سے ان کے
عہدہ سے سبکدوش کیا گیا اور جلسہ نے بہ اتفاق آرا، مولوی حکیم
حافظ احمد علی صاحب ہاشمی کو شریک معتمد منتخب کیا۔

نئی مطبوعات | گزشتہ ماہ ادارہ کی طرف سے حسب ذیل نئی
کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

(۱) نظام الملک آصف جاہ اول از سید مراد علی صاحب طالع
اردو فاضل۔ قیمت ۶ر

بانیٔ سلطنت آصفیہ کے مجمل حالات و مستند واقعاتِ
زندگی عوام اور طلبہ کے لئے سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے
ہیں ان کو ادارہ نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔
صفحات (۴۰) مع تصویر نظام الملک آصف جاہ ۔

(۲) حیدرآباد۔ از رفیعہ سلطانہ صاحبہ بی اے۔ قیمت ۱۰ر

اس کتاب میں عوام اور بچوں کے لئے شہر اور ریاست حیدرآباد
کے ضروری حالات سادہ اور سلیس زبان میں درج کئے گئے
ہیں۔ اس کے کئی ابواب ہیں جن میں آب و ہوا، پہاڑ، دریا،
پیداوار، تاریخ، طرز معاشرت، صنعتیں، زبانیں، طرز حکومت،
آثار قدیمہ اور ذرائع حمل ونقل کو خوش اسلوبی کے ساتھ بیان
کیا گیا ہے۔ اس کی مرتبہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ بی اے۔ جامعہ عثمانیہ
ہیں جن کو انشاپردازی کا خاص ذوق ہے۔ کتاب باتصویر ہے۔

(۳) اشوک اعظم۔ از سیدہ مہدی جعفری صاحبہ قیمت ۸ر

یہ کتاب مجلس ادبیات اطفال کی طرف سے طلبہ اور عوام
کے لئے سلیس اور سادہ زبان میں لکھائی گئی ہے۔ محترمہ
سیدہ مہدی جعفری صاحبہ متعلمہ زنانہ کالج نے ہندوستان
کے اس مشہور فرماں روا کے حالاتِ زندگی اور کارنامے دلچسپ
پیرائے میں قلمبند کئے ہیں۔ کتاب باتصویر ہے۔

ادارہ کی مطبوعات دوسروں کی نظر میں

(۱) اردو مخطوطات جلد اول

" ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد اردو زبان کی
جو مختلف النوع مفید خدمات انجام دے رہا ہے
وہ باخبر اصحاب سے مخفی نہیں۔ اب اپنے کتب خانے
کے مخطوطات کی فہرست کی ترتیب کا کام شروع
کیا ہے، چنانچہ اس کے فاضل معتمد ڈاکٹر
سید محی الدین قادری صاحب زور نے اردو مخطوطات
کی پہلی جلد مرتب کی ہے۔ لائق مرتب نے ہر
کتاب کے متعلق حتیٰ الامکان ضروری اور صحیح
معلومات جمع کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی
یہ کوشش اس حیثیت سے زیادہ قابل قدر ہے
کہ اس فہرست کے ذریعہ اردو کے بہت سے

نادر مخطوطات کا علم شائقین کو ہوجائے گا۔
کتاب کے آخر میں اسماء اور اشخاص کے اعلام کا
اشاریہ بھی دے دیا ہے، جس سے تصانیف اور
مصنفین کی تلاش میں سہولت پیدا ہوگئی ہے،
امید ہے کہ دوسری جلد بھی جلد شائع ہوگی"

معارف۔ مئی ۱۹۴۴ء

" ادارۂ ادبیات اردو (دکن) کے ۲۷۵ مخطوطات
کا مفصل اور پُر معلومات تذکرہ اس علمی جائزہ
میں تفسیر و حدیث سے لے کر قصہ، کہانیوں
تک مختلف علوم و فنون آگئے ہیں۔ تذکرہ
ناظرین کے لئے دلچسپ اور شائقین علم و ادب
کے لئے بڑے کام کا ہے۔ اردو میں اس خشک
مضمون کو اس حد تک دلچسپ اور اس
پیمانہ پر وسیع و جامع بنا دینے کی غالباً یہ پہلی
مثال ہے۔"

صدق۔ لکھنو بابت مئی ۱۹۴۴ء

" موجودہ زمانہ میں کتب خانوں کی فہرست
سائنٹیفک طریقوں سے تیار کرنے کے معنی انبوہ
معلومات کا یک جا کرنا ہوا کرتا ہے۔ زور صاحب
قادری باوجود کثرت مشاغل کے قلیل مدت میں
جس کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں وہ
لائق تحسین و آفریں ہونے کے علاوہ مسرت بخش
اور تعجب خیز ہے۔ خدا کرے بقیہ جلدوں کی
تکمیل و اشاعت کے ذرائع جلد جلد نکلتے جائیں
کہ یہ کارنمایاں سرانجام کو پہونچ کر قدر دانوں
کے لئے دستیاب ہوسکے۔ موقع موقع سے
نوادر کے عکسی بلاک دے کر کتاب ہذا کو اور بھی
قیمتی بنا دیا گیا۔ معلومات کے جواہر پارے
یقینی انمول ہیں"

ندیم (گیا) جون ۱۹۴۴ء

(۲) تاریخ سیاسیات۔

" صدیقی صاحب کی تاریخ سیاسیات کی وسعت
کے پیش نظر اگرچہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے
لیکن یہ نچوڑ ہے وسیع مطالعہ اور برسوں کی
کاوش کا۔ زبان اتنی سہل کہ معمولی پڑھا لکھا
بھی ذرا سی محنت کے بعد دنیا کے ایک اہم ترین
علم سے واقف ہوسکتا ہے۔
نشاۃ ثانیہ کے بعد اس وقت تک جو جو
سیاسی نظریے پیش ہوتے رہے ہیں ان کا ذکر
نہایت خوبی اور وضاحت سے کیا گیا ہے۔
کتاب کے آخری دو ابواب میں سیاسیات کے
نظریوں کو مختصر طور سے بیان کردیا گیا ہے۔"

ادب لطیف۔ لاہور مئی ۱۹۴۴ء

" مواد مضمون کی اہمیت، مولف ذی مرتبت
کی محنت اور مطالعہ کی افادیت کے اعتبار سے
یہ کہنا بجا ہے کہ ع نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔
اس طرح کے ٹھوس علمی تالیفات کی تعداد جتنی
بڑھتی جائے اردو کا خزانہ مالا مال ہوجاتا ہے
مگر قدردانوں کو اپنا فرض نہ بھولنا چاہئے۔
اگر اردو میں اچھی علمی تالیفات کی بڑھائی ہوتو
ع چاک گرد، جامہ گرد رطل گرانی من آر
کہتے ہوئے ہاتھوں ہاتھ لیجئے۔"

ندیم (گیا) جون ۱۹۴۴ء

سب رس
ترقی پسند
ادبی رجحانات کا نمبر

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

ترقی پسند ادب نمبر

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۱۲ /

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد ۷ — بابت ماہ جولائی ۱۹۴۴ء — شمارہ ۷

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

ترقی پسند ادب کی چند مطبوعات

"سرخ سویرا"۔ ترقی پسند شاعری کا شاہکار۔ مخدوم محی الدین کی رومانی اور انقلابی نظموں کا مجموعہ ـــــ مخدوم کی شاعری ـــ جدت فکر، صداقت بیان خلوص اور خود اعتمادی کا آئینہ ہے آپ ان نظموں کو پڑھ کر ایسا محسوس کرینگے، جیسے خود آپ ہی کے احساسات اور تجربات کی گرہیں کھل رہی ہیں (قیمت ۱۲/)

"یہ کس کا خون ہے؟"۔ مشہور ترقی پسند ادیب علی سردار جعفری کا ڈرامہ ہے جو جاپانی حملہ سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے ڈرامہ کی کامیابی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندستانی عوامی تھیٹر اسوسی ایشن نے جنوری و فروری ۱۹۴۳ء میں ستائیس بار اسٹیج کیا ہے۔ قیمت ۴/

"یہ امرت ہے"۔ خواجہ احمد عباس کی ڈرامہ نگاری سے کون واقف نہیں۔ "یہ امرت ہے" آپ کا مختصر مگر دلچسپ ڈرامہ ہے۔ امرت کا کون مستحق ہے۔ اکبر یا ایکٹرس۔ ہٹلر یا مسولینی۔ پنڈت یا ملّا۔ اس کا جواب صرف "یہ امرت ہے" میں ملیگا۔ ۶/

"اجرتی محنت اور سرمایہ"۔ کارل مارکس ـــــ اس کتاب میں مارکس نے یہ بتایا ہے کہ دراصل محنت پیداوار کی جڑ ہے لیکن پیداوار کی قیمت کا ایک قلیل حصہ محنت کش کو ملتا ہے باقی سب سرمایہ دار ہضم کر جاتا ہے۔ قیمت ۱/

(دیگر مطبوعات)

"نجات کا راستہ"۔ سی۔ راج گوپال چاری: میرا مقصد حالات پر افسوس ظاہر کرکے خاموش ہو جانا نہیں ہے بلکہ میں چاہتا ہوں کہ جو غلطیاں اس وقت تک کی گئی ہیں ان کے ازالہ کی طرف اپنے ہم وطنوں کو مائل کروں۔ (سی راج گوپال چاری) قیمت ۱/۰

"ہندوستانی ریاستوں کا مستقبل"۔ از خواجہ معین الدین بی اے ۸/ ـــ "جنگ کی کہانی" از افضل عابدی قیمت ۱/۰

(ملنے کا پتہ)

ناشر: "اشاعت گھر" چمن گولی گوڑہ حیدرآباد دکن

"دکن بک ڈپو" عابد روڈ حیدرآباد دکن

حرفِ اولین

(میرے دوست میر عابد علی خاں بی اے حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کو صحت بخش طریقہ پر آگے بڑھانے میں پر خلوص خدمت انجام دے رہے ہیں۔
ان کی خواہش پر جولائی کا شمارہ ترقی پسند ادب کیلئے وقف کیا گیا۔ انھوں نے جو مضامین اور نظمیں مرتب کرکے بھیجیں ان سے مرتب کے اعلیٰ [illegible] اور مذاق کا پتہ چلتا ہے) شاہد

سب رس کی خصوصی اشاعت "ترقی پسند ادب نمبر" آپ کے سامنے پیش ہے۔ اس کی ترتیب و اشاعت کا مقصد یہ تھا کہ کل ہند اردو کانگریس اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سالانہ جلسے کی عظیم تقاریب کے موقع پر جبکہ ہندوستان کے ممتاز اہل قلم جمع ہو رہے ہیں حیدرآباد کے جوان سال ادیبوں کا تعارف اور ان کی تحریرات سے روشناس کرایا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر میں نے محترمی ڈاکٹر زور صاحب سے خصوصی اشاعت کیلئے درخواست کی تھی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب ڈاکٹر صاحب کا ممنون ہوں اور آپ نے اجازت مرحمت فرمائی اور میں اس قابل ہو سکا کہ یہ شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں۔

میں بحیثیت مرتب یہ عرض کرونگا کہ یہ خصوصی اشاعت صرف ایک ہفتہ کی محنت و کوشش کا نتیجہ ہے اس قلیل عرصے میں جو کچھ ممکن ہو سکتا تھا کیا گیا۔ یہ نہیں بتلا سکتا کہ میں اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہو سکا۔

"نئی باتیں" میں قاضی عبدالغفار اور احتشام حسین کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ قاضی صاحب نے اس سال کی عظیم و ضخیم تصنیف پر تنقید فرمائی ہے۔ احتشام حسین نے اس عظیم المرتبت شاعر کی جناب میں اپنا خراج عقیدت پیش کیا ہے جو سرزمین دکن میں محو خواب ابدی ہے۔ نظر نے حیدرآباد کے ترقی پسند شعراء کا تعارف کرایا ہے۔ شہاب اور کلیم نے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیب میکسم گورکی اور ڈانگے کی تحریرات کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

بھارت چند۔ رشید قریشی۔ محبوب حسین۔ افضل عابدی کے افسانے ہماری مجلسی زندگی کے عکاس اور اس پر کہیں کہیں طنز بھی ہیں۔

علی اختر۔ سردار جعفری۔ میکش۔ جواد زیدی۔ نظر۔ صمد رضوی۔ ساز۔ میر حسن۔ اریب۔ تحسین ترقی پسند شعراء میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ مخدوم محی الدین اس محفل میں شریک نہیں ہیں۔ اصرار کے باوجود مخدوم نے اپنی شدید مصروفیت کی وجہ سے کچھ نہیں لکھا۔

میں برادر حمید شاہد ایم اے کا ممنون ہوں کہ آپ کی وجہ سے میں طباعت و اشاعت کی دشواریوں سے محفوظ رہا۔

جناب خلیل اللہ صاحب نے اس خصوصی اشاعت کے لئے ایک دیدہ زیب سرورق تیار کیا جس کے لئے میں خلیل صاحب کا مشکور ہوں۔

میر عابد علیخاں

اعمال نامہ

(قاضی صاحب نے سر سید رضا علی سی' بی' ای' ام' ال' اے کی خود نوشت سوانح عمری "اعمال نامہ" (جسے ہندوستانی پبلشرز دہلی نے شائع کیا ہے) پر جو تنقید فرمائی ہے وہ بلاشبہ تنقیدی ادب میں ایک ممتاز مقام کی حامل ہے' زیر نظر مضمون کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ قاضی صاحب نے صرف اعمال نامہ ہی پر تنقید نہیں فرمائی ہے بلکہ یہ بھی بتلادیا ہے کہ تنقید کا واقعی معیار کیا ہے)

مغربی لٹریچر میں خود نوشت سوانحعمریاں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مورخ ان کے اوراق سے قومی تاریخ کی اندرونی تفصیلات اور اہم واقعات کے پس منظر اور مضمرات کا پتہ پاتا ہے۔ یہ صنف ادب اردو زبان میں تقریباً ناپید ہے۔

ملک کے مشاہیر میں سے سوائے مولنا ابوالکلام آزاد کے ابھی تک کسی نے بھی اپنی زندگی کے حالات اپنے ہی قلم سے لکھنے کی جرات نہیں کی۔ "جرات" میں اس لئے کہتا ہوں کہ اس کام میں واقعی بہت بڑی "جرات" کی ضرورت ہے۔ یہ کام بہت مشکل اور نازک ہے خصوصاً اس لئے کہ وہ لوگ جن کی زندگی کا کوئی پہلو منظر عام پر رہا ہے اس کی معنوی کیفیات کو اگر رنگ آمیزی یا ذہنی تحفظات کے بغیر لکھیں تو انھیں نہ صرف اپنی انسانی کمزوریوں کو پردہ سے باہر لانا پڑتا ہے بلکہ بہت سے دوسرے زندوں اور مردوں کو اپنی اس داستان کے ساتھ لپیٹ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ——— ایسا نہ کریں تو حقائق تشنہ رہ جاتے ہیں۔ مولنا ابوالکلام آزاد نے اپنے "تذکرہ" میں اپنی زندگی کے حالات بہت مختصر بیان کئے ہیں ان کا انداز تحریر بلاشبہ بہت دلنواز ہے۔ لیکن بعض مقامات پر اور بعض حالتوں میں ایک ایسا انداز تحریر بجائے خود حقائق کے چہرہ پر نقاب بن جایا کرتا ہے۔ علاوہ بریں مولنا نے اپنی زندگی کے جن اجزا پر تبصرہ کیا ہے ان کا تعلق دوسرے معاصرین اور مشاہیر کی زندگی سے بہت کم ہے۔ اس لئے مولنا کا کام نسبتاً آسان تھا۔ مگر سر سید رضا علی نے اپنے "اعمال نامہ" میں ایک بہت مشکل کام کو انجام دینے کی کوشش کی ہے' یعنی اپنے "اعمال نامہ" کو اپنے معاصرین اور دوستوں کا بھی اعمال نامہ بنادیا ہے انھوں نے بہ یک وقت اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی کراماً کاتبین کے فرائض انجام دئے ہیں۔ گویا انھوں نے ان فرشتوں کا روزنامچہ چرالیا ہے۔

اس طرح سید صاحب اردو لٹریچر کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک ایسی "بدعت" کے مرتکب ہوئے ہیں اور ایسے خارزار میدان سے گزرے ہیں کہ اگر موصوف زبان اور ادب کا سلیقہ نہ رکھتے ہوتے تو شاید یہ اعمال نامہ ملک کے مختلف مکاتیب خیال کے لئے بہت نزاعی اور بحث طلب مسائل پیدا کردیتا۔ لیکن سید صاحب سب کچھ صاف صاف کہہ دینے کے باوجود ان اوراق میں اپنی زندگی کی دلچسپ داستان کو اس طرح بیان کرتے ہوئے گزر گئے ہیں کہ نہ تو دامنہ کے کسی کانٹے کو اپنے دامن سے الجھنے دیا اور نہ کسی سنگ راہ سے ٹھوکر کھائی۔ حق گوئی میں لہجہ اور انداز بیان کے ایک خوش گوار توازن کی یہ مثال ایسی ہے جس نے اعمال نامہ کو اپنی قسم کی ایک معیاری کتاب بنادیا ہے۔

سوانح نگار نے اپنے جو کچھ خاندانی حالات اور اپنی زندگی کے ابتدائی کوائف بیان کئے ہیں وہ ان کی پبلک زندگی کی تصویر کا ایک دلچسپ پس منظر ہے جس نے ان کی زندگی کے خد و خال کو نہ صرف زیادہ نمایاں بلکہ بہت سبق آموز بنادیا ہے۔ چنانچہ ان ۵۲۷ اوراق کی وسعت میں ہم نہ صرف سر سید رضا علی کے۔ ٹی۔ سی۔ بی۔ ای۔ سابق رکن پبلک سروس کمیشن

وہ ایجنٹ جنرل جنوبی آفریقہ کی پبلک زندگی کو مصور پاتے ہیں۔
بلکہ اس تصویر کے باریک خطوط ایک ایسے SELF MADE -
MAN کے افکار و عزائم کے بصیرت افروز ارتقاء کے مطالعہ کی
دعوت دیتے ہیں جس نے اپنی غیر معمولی ذہنی اور اخلاقی قوت کے
بل پر سیڑھی کے سب سے نیچے قدم سے چڑھنا شروع کیا شہرت
و نصرت کی منزلیں طے کیں اور بالآخر اپنی بھرپور زندگی کے اس
درجہ میں قدم رکھا جس میں جوانی کی جدوجہد کے سرمایہ سے
بڑھاپے کے لئے سکون قلب اور آسائش ضمیر کی دولت حاصل
ہوتی ہے۔ سید صاحب کا بڑھاپا اس قسم کا بےباک بڑھاپا ہے
جو ایک سدابہار جوانی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتا! بہت سی
تھکی ہوئی جوانیاں اس قسم کے بڑھاپے سے شرمایا کرتی ہیں!

اعمال نامہ کے اوراق میں تنوع اس قدر ہے اور
افکار کی لہریں اس قدر ایک دوسرے پر چڑھتی چلی گئی ہیں کہ
کتاب کے مختلف ابواب کی تقسیم قائم نہیں رہ سکی ہے۔ یعنی ایک
باب کا موضوع دوسرے سے الجھا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اس نگارخانے
میں نقش و نگار کا ہجوم اس قدر زیادہ ہو گیا ہے کہ اس کا
تجزیہ کرنا آسان کام نہیں۔ مگر سید صاحب کا طرز اتنا رواں
بے تکان اور دلچسپ ہے کہ مضامین اور موضوعات کی
تقسیم کا الجھاؤ پڑھنے والے پر گراں نہیں گزرتا۔ معلوم ایسا
ہوتا ہے کہ ان اوراق کا لکھنے والا پڑھنے والے کو اپنے ساتھ
دوڑائے لئے جا رہا ہے۔ نہ خود کہیں رک کر سانس لیتا ہے اور
نہ پڑھنے والے کو دم لینے کی اجازت دیتا ہے۔ س دور کے
لپیٹ اور اس تیز گامی کی جھونک میں جو کچھ سامنے آیا وہ اس
سیلاب کے ساتھ بہنے لگا۔ انیس و دبیر، غالب و مومن،
حافظ و سعدی اور ایسے کتنے ہی قدیم و جدید شعرا اور ادیب
اس آندھی کے جھونکوں میں اڑتے چلے جاتے ہیں۔ علیٰ ہذا قومی زندگی
اور سیاست کے بہت سے مشاہیر بھی ان اوراق میں جابجا
اس طرح ٹکے ہوئے ہیں جیسے گدڑی کے لعل! سر سید، محسن الملک
گوکھلے، گاندھی، محمد علی یہ تمام موتی اور ہیرے ایک ہی کشکول
میں پڑے دمک رہے ہیں۔ ان کے گرد و پیش ہندوستان
کی پبلک اور سیاسی زندگی کے مسائل بکھرے ہوئے ہیں اور
اس تمام قوس قزح کو خود مصنف کا قلم اس کی فکر و نظر سے
چمک اور دل آویزی عطا کرتا ہے۔ اس لئے ان اوراق
کی وسعت اور ہمہ گیر تنوع نے انتشار کے بجائے اس مرقع
میں ایک ایسی جاذبیت پیدا کر دی ہے جو شاید کسی سست
انداز بیان کے ساتھ دلکش نہ بن سکتی۔

یہ جاذبیت اور بھی زیادہ ذوق نواز ہو جاتی ہے
جب ہم مصنف کے قلم کی بے محابا حقیقت نگاری کو خود ان کی زندگی کے
"نازک" مسائل سے بھی بے باکانہ کھیلتے دیکھتے ہیں۔ یوں تو
کتاب کے کسی صفحہ پر بھی سوانح نگار نے اپنی زندگی کے ان اجزا
کو جو منظر عام سے دور تھے پردہ کے اندر رکھنا پسند نہیں کیا
اور جس طرح دوسروں پر تنقید کی، اسی طرح اپنے اعمال و
افکار کے لئے بھی اپنے قلم کی نوک کو نشتر بنا دیا۔ مگر
گیارھویں باب میں شملہ کی جو ادبی محفل آراستہ کی گئی ہے
اس کا حسن بیان "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں"
کے نازک مقامات سے کچھ اس طرح گزرا ہے کہ حقیقت کا
چہرہ ایک باریک نقاب کے پیچھے صاف نظر آ رہا ہے!
سید رضا علی صاحب اگر شاعر ہوتے تو اس ایک "ادبی جلسہ" کی
چند داستانوں سے ہزارہا مثنویاں لکھ ڈالتے، اگر
افسانہ نگار ہوتے تو "حسن و محبت کی ان جیتی جاگتی"
تصویروں کو اپنے افسانوں میں حیات جاودانی عطا کرتے!
اس گیارھویں باب کی تمہید میں "کچھ اپنے متعلق" فرماتے ہیں کہ:-

"کسی ایسے شخص کے لئے جس کا کم و بیش
چالیس برس تک ملک کی سیاسی زندگی سے
تعلق رہا ہو اپنی داستان محبت بیان کرنا
اور اس کو کتاب کی صورت میں اپنی زندگی
میں شائع کرانا بڑا دشوار کام ہے۔
ملا عبدالقادر بدایونی کی جرأت کی داد دینا
چاہئے کہ ان کی تقدیس نے اس آفتِ جاں
کے حالات قلمبند کرنے سے باز نہ رکھا جس
سے انھوں نے دل لگایا تھا ــــــ"

اپنی زندگی میں حسن و عشق کی کارفرمائی کا قصہ خود اپنے ہی قلم سے بیان کر دینے کی جرأت اردو ادب میں سید صاحب کا ایک بے مثل اجتہاد ہے، جس نے سید صاحب کی قدامت پسندی کا ڈانڈا ترقی پسند ادب سے ملا دیا ہے۔ تعجب نہیں کہ قدیم "زاہد خشک" اس ادبی ذوق پر انگلی اٹھائے۔ لیکن خود سید صاحب شاعر کی زبان سے اپنے اس "اقدام رندانہ" پر استدلال کرتے ہیں کہ ؎

داغِ دل دکھا رہے ہیں اپنا رنگ میرے سینہ کی صفائی دیکھئے

سینہ کی اس صفائی میں جن داغوں کی نمود سے گیارھویں باب کی آٹھ کہانیاں کسب رنگ و بو کرتی ہیں وہ اردو زبان کے ادیبوں کے لئے ایک دعوت نظر ہے!

اس آپ بیتی کے بنیادی نقوش پر کیسے اچھے افسانو کی عمارت تیار ہو سکتی ہے۔ ان افسانوں کا عنوان کچھ ایسا ہونا چاہئے جیسے۔

"سیاسی قیادت محبت کی ریشمیں جالی میں"
"ایک لیڈر قوم ــــ ہدف ناوک حسن"
"سیاست اور حسن"
"قائدانہ زندگی کی نفسیات لطیف"

اور اگر سوانح نگار کی زندگی کے خشک اور سنجیدہ مشاغل سے قطع نظر کی جائے تو ان افسانوں کا بہترین نام ہوگا۔

"خشک و تر"

بڑے آدمیوں کے سوانح نگاروں نے اکثر بڑا ظلم کیا ہے۔ اپنے ممدوح پر اور خود اپنے اوپر جب انھوں نے دیدہ و دانستہ اس زندگی کی داستان سے اس کی تمام تر بشریت کو خارج کر دیا ہے۔ یعنی سب کچھ لکھا جو زندگی کی بیرونی سطح پر نمایاں تھا اور کچھ بھی نہ لکھا جو ان کے ممدوح کی معنوی زندگی کا سرمایہ تھا ــــ وہ خزانہ جس سے بیرونی زندگی کے چشمے پھوٹتے تھے! ــــ باطن کے اس انعکاس سے قطع نظر کر کے ظاہر کے خد و خال پر سوانح نگاری کی تمام قابلیت کو صرف کر دینا اس فن کی قوت کو مفلوج کر دینا ہے۔ انسان کو ایک انسان کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے انسانیت کی ان نام نہاد "کمزوریوں" اور "لغزشوں" سے قطع نظر کرنا ادب اور فن کی بنیادی حقیقت سے انحراف کرنا ہے۔ اس مقام پر ترقی پسند ادب پیدا ہوتا ہے جو دعویٰ کرتا ہے کہ کوئی ادب ادب نہیں اگر وہ زندگی کے حقائق کا آئینہ دار نہ ہو۔ سید رضا علی صاحب نے پہلی دفعہ اردو ادب اور سوانح نگاری کی اس "کمزوری" کو رد کر کے خود اپنی انسانیت کا چہرہ بے نقاب پیش کیا ہے اور اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ بڑی زندگی کی بڑائی کو سمجھنے کے لئے اس زندگی کے ڈھکے ہوئے پہلوؤں کا بھی منظر عام پر آ جانا ضروری ہے۔ کمزوریوں کے تقابل ہی سے انسانیت کی صلاحیتوں اور طاقتوں کا صحیح اندازہ ممکن ہے ورنہ پھر سوانح نگاری میں حقیقت نگاری کا جز بہت کم رہ جاتا ہے اور ایسی کتابیں یا محض قصیدہ ــــ

بن جاتی ہیں یا کسی پیر، ولی یا پیغمبر کی ملفوظات۔ انسان کو انسان ہی کی حیثیت سے پیش کرنا سوانح نگاری کا بنیادی فرض ہے اور اس فرض کو سید صاحب نے خود اپنی روئداد زندگی میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے دنیائے ادب میں "اعمال نامہ" سوانح نگاری کا ایک نیا اور بہتر معیار پیش کرتا ہے اور یہ ایک صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے!
——— کہ اگر جرأت ہے تو میدان میں آؤ اور اپنی زندگی کی ترازو کے دونوں پلوں کو بھر دو ——— ایک طرف ظاہر اور دوسری طرف باطن ——— پھر منظر عام پر اہل نظر کو موقع دو کہ وہ شخصیت کے ظاہر کی سطح کے نیچے انسانیت کی اجزائے ترکیبی کا پتہ پائیں ——— وہ اجزا جن کو ظاہر پرست دنیا کے عرف عام میں "کمزوریاں" کہا جاتا ہے ——— لیکن جو درحقیقت قوت کردار کا منبع ہیں ——— گہوارہ ہیں جس میں کیرکٹر پرورش پاتا ہے۔ ان انسانی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی "رسم کہن" کو جدید ادب نے ترک کرنا شروع کر دیا ہے اور سوانح نگاری کی اس "بدعت" کو قبول کر کے سید صاحب نے بھی اردو زبان میں اس فن کا ایک نیا راستہ بنایا ہے۔ عمر کی پختگی کے اس درجہ پر پہونچ کر جب وہ دنیا کے تمام سرد و گرم سے گزر چکے ہیں، ادب کا یہ شعور مجتہدانہ قوت حاصل کر کے بہت سی نئی راہیں پیدا کر سکتا ہے ——— "اعمال نامہ" اسی قوت کا ایک مظاہرہ ہے۔ اس کے صفحات میں خشک اور کھردرے سیاسی اور قومی مسائل کے ساتھ ساتھ شعر و سخن اور ادب لطیف کا جو عجیب و غریب امتزاج نظر آتا ہے وہ اس کتاب کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی مثال اس معیار کی کتابوں میں بمشکل مل سکتی ہے۔

"اعمال نامہ" میں سید صاحب نے بہت سے بحث طلب مسائل کو چھیڑا ہے۔ بہت سی چٹکیاں لی ہیں۔ بعض مواقع پر قلم کی نوک کو نشتر کی نوک بنا دیا ہے۔ لیکن یہ رائے کا اختلاف یا تنقید کی شدت کتاب کے مجموعی حسن کو خراب نہیں کرتی بلکہ اس بات کا ثبوت بنتی ہے کہ وہ جو بات لکھ رہے ہیں بالکل اسی طرح لکھ رہے جس طرح وہ ان کے دل میں ہے۔ پڑھنے والے بعض مسائل میں ان سے متفق الرائے نہیں ہو سکتے۔ اس کی انھیں پرواہ نہیں! وقائع نگاری کی یہ آزادی مورد اعتراض نہیں ہو سکتی بلکہ دراصل قابل قدر ہے۔ اس لئے کہ اس صاف گوئی سے کتاب کا معیار بہت بلند ہو جاتا ہے۔

اعمال نامہ اردو ادب میں ایک "اوریجنل" کتاب ہے۔ سید صاحب نے اپنے دیباچہ میں خود ہی اپنی سوانح نگاری کے اسلوب کی ان الفاظ میں وضاحت کر دی ہے کہ۔

> "میں نے یہ تہیہ کر کے قلم اٹھایا تھا کہ واقعات کو اصلی روپ میں پیش کروں۔
> ...... میرے نزدیک اپنی لکھی ہوئی سوانح حیات کی سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہئے کہ ایک مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آکر بہ آواز بلند پڑھ لیں تو لکھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے۔ اسی مناسبت سے میں نے اس کتاب کا نام اعمال نامہ رکھا ہے۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ فرشتوں کا لکھا ہوا اعمال نامہ دفتر کا دفتر ہوگا۔ ان اوراق کو اس کا مختصر اور بہت مختصر چربہ سمجھئے یا مرقع کہئے ———"

زیر نظر اوراق اس امر کے شاہد ہیں کہ سید صاحب نے

اپنے اس اصول کی پابندی کا کتاب کی ہر سطر میں لحاظ رکھا ہے۔

اعمال نامہ پر یہ تبصرہ ایک ایسے شخص کے قلم سے لکھا گیا ہے جس کے سیاسی عقائد اور سیاسی مشاغل سید صاحب کے عقائد اور مشاغل سے بڑی حد تک مختلف رہے ہیں۔ لیکن کبھی بھی یہ اختلاف ان مخلصانہ تعلقات پر اثر انداز نہ ہو سکا جو تقریباً ۴۵ سال سے اس وقت تک تبصرہ نگار اور سید صاحب کے درمیان قائم ہیں۔ اس حقیقت کا ذکر صرف اسی لئے کیا گیا ہے کہ اس کی روشنی بھی اعمال نامہ کے مصنف کے کردار پر پڑتی ہے۔ بدقسمتی سے زمانہ کا رنگ اب بدل گیا ہے۔ موجودہ دور کے جذباتی اور اضطراری ہنگاموں میں سیاسی اختلاف اور دوستی بہ یک وقت یک جا نہیں ہوتے۔ قومی زندگی میں شخصی کردار کا یہ انحطاط ان مغربی افکار و اوضاع کا نتیجہ ہے جو ہماری سیاسی غلامی کی مدد سے مشرقی وضعداریوں پر حاوی ہو چکے ہیں۔ مگر اس بربادی کے مرثیہ خوان بھی اب چند ہی ہیں جو دنیا میں باقی رہ گئے ہیں! اور میری طرح وہ سب بھی پا بہ رکاب!

قاضی عبدالغفار

انسان دوستی اور تہذیب

از میکسم گورکی

پیرس میں ادیبوں کی کانگریس اس غرض سے منعقد کی گئی تھی کہ تہذیب کو فاشزم کے تباہ کن حملوں سے محفوظ رکھا جائے - بہ ظاہر یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ زمانۂ حال کی بورژوائی کی "تہذیب" کے اصلی معنی و مفہوم کانگریس کے جملہ ارکان کے نزدیک یکساں طور پر معین ہیں اور ان کی تعبیر میں اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے - لیکن کیا واقعی ایسا تھا؟

فاشزم زوال یافتہ بورژوا تہذیب کی اولاد اس کا ناسور ہے - فاشزم کے نظریہ ساز اور اس پر عمل کرنے والے وہی مکار ہیں جو بورژوازی کے زمرہ سے آئے ہیں - اٹلی اور جرمنی میں بورژوازی ہی نے سیاسی اور مادی اقتدار فاشسٹوں کے حوالے کیا جن پر یہ بورژوازی تقریباً اسی عیاری کے ساتھ نگرانی رکھتی ہے جس عیاری سے زمانۂ وسطیٰ میں اطالوی شہروں کا دولتمند طبقہ کرایہ کے سپاہیوں کو اپنے قبضہ میں رکھا کرتا تھا - مزدوروں کے انتہائی نفرت انگیز کشت وخون جو فاشسٹوں کے ہاتھوں ہوتا ہے، بورژوازی نہ صرف اظہار اطمینان کرتی ہے بلکہ فاشسٹوں کو اس کی بھی اجازت دیتی ہے کہ وہ ان ادیبوں اور سائنسدانوں پر ظلم و ستم ڈھائیں اور انھیں جلاوطن کریں جو خود اسی کی ذہنی قوت کے نمائندے ہیں اور جن پر وہ حال حال تک اتراتی اور فخر کیا کرتی رہی ہے -

فاشزم اپنے سامراجی آقاؤں کی خواہشات کی تشفی کا ذریعہ بن کر آئی جو چاہتے ہیں کہ ایک نئے قتل عام کے ذریعہ دنیا کی پھر سے تقسیم کی جائے - اس نے یہ نظریہ تراشا کہ جرمن نسل کو ساری دنیا اور نسلوں پر حکمرانی کا حق حاصل ہے - "سفید فام درندہ" کی برتری سے متعلق بیمار فریڈرک نیطشے کے اس بھولے ہوئے تصور کی ابتدا اس وقت ہوئی جب اس نے ہندوستانیوں، ہند چینیوں، ملایا والوں، پولی نیشیائیوں، حبشیوں وغیرہ کو اپنی ماتحتی اور غلامی پر مجبور کیا - یہ تصور اس وقت پروان چڑھا جب جرمن بورژوازی، اپنے آسٹریائی اور فرانسیسی حریفوں کو شکست دے کر نو آبادیات کی لوٹ کھسوٹ میں برطانوی، ولندیزی اور فرانسیسی بورژوازی کی شریک بننا چاہتی تھی - اسی نظریہ کی رو سے بورژوازی کے ہر قومی گروہ کو اس کی اجازت ہے کہ وہ نہ صرف سیاہ فام نسلوں کو بلکہ اپنے سفید فام یوروپی ہمسایوں کو بھی وحشی تصور کرے، انھیں غلام بنائے یا تباہ کرے - یہ نظریہ .... ان واقعات میں سے ایک ہے جو "تہذیب" کے عصری تصور کے ساتھ ذہن میں آتے ہیں -

یورپ کے بورژوا معززین کی آوازیں بلند ہوتی ہیں - وہ برابر شور مچاتے ہیں کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے - وہ چاہتے ہیں کہ علم کو محدود کردیا جائے - تہذیب کے نشوونما یہاں تک کہ ٹیکنیک کی ترقی اور اضافہ کو روک دیا جائے - ان کی خواہش ہے کہ دستی محنت کا دور پھر لوٹ آئے - یورنی منتھ میں ایک اسکول کا افتتاح کرتے ہوئے یارک کے آرچ بشپ صاحب فرماتے ہیں -

" میں چاہتا ہوں کہ تمام ایجادات روک دی جائیں - اگر میرا بس چلے تو میں اندرونی احتراق (INTERNAL CONBUSTION) کے انجن کو ضرور تباہ کردوں"

ان کے ساتھی آرچ بشپ آف کنٹربری ...... بہ ظاہر ٹیکنیک کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ سوویت یونین کے خلاف "جہاد" کی تبلیغ میں وہ اسے کار آمد سمجھتے ہیں ——— اور ماہروں کا خیال ہے کہ نئی جنگ "مشینوں کی جنگ" ہوگی - اگر لندن اور روم کے ان خدائی پیشواؤں

اور ان تمام بورژوا مبلغوں کے بیانات ـــــ جن کے دماغ مزدوروں سے نفرت کرنے کی وجہ سے یا پھر آنے والے ناگزیر سماجی انقلاب کے ڈر سے ماؤف ہوچکے ہیں ـــــ جو تہذیب کے نشو ونما کو روک دینے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر یہ بیانات انیسویں صدی کے اواخر میں دئے جاتے تو خود بورژوازی انھیں بیوقوفی اور جہالت سے تعبیر کرتی..........

یہ ظاہر ہے کہ یوروپی بورژوا تہذیب "لائینفک کل" نہیں ہے جس کی تصویر بورژوا مورخ پیش کیا کرتے ہیں۔ اس کی "قوت متحرکہ" نفع بازوں اور بنکروں میں ـــــ جو بقیہ تمام انسانوں کو ایک ستی اور بہ افراط میسر آنے والی شئے سمجھ کر اپنے اعلیٰ سماجی پوزیشن سے بہر قیمت چمٹے رہنا چاہتے ہیں ـــ اور ان لوگوں میں بٹ چکی ہے جو تہذیب کی ترقی کے لئے کام کرنے کے حق کی مدافعت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قوت ان فاشستوں میں بٹ چکی ہے جن میں ایک زمانے کے نشہ نے سماج دشمن بنادیا ہے..........

لیکن پیرس کے بعض اہم اخبار نویس اس حقیقی خطرہ سے گریز کرتے ہوئے جو بورژوا تہذیب کو فاشزم کی وجہ سے لاحق ہے، اپنے زمانہ کے بنیادی مسئلہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔ اخبار دان میٹر پوچھتا ہے :-

"تہذیب کی مدافعت کرنے والی کانگریس کے فرانسیسی منتظموں میں پانچ انقلابی ادیب ہیں - باربوس۔ ژان رچرڈ بلوش۔ اندرے جیت - اندرے مالرو - رومان رولان -

کیا یہ نام ایک طرح کی بدگمانی نہیں پیدا کرتے ؟

جب ہم ان ناموں کو دیکھتے ہیں تو ہم یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ وہ کونسی تہذیب ہے جس کی مدافعت کی ہمیں دعوت دی جارہی ہے "

یہ سوال بہت ہی برمحل ہے ...... پانچ چھے اخباروں نے اسی سوال کو اور بھی زیادہ صاف طور پر پیش کیا ہے وہ پوچھتے ہیں۔ کیمونزم مغربی یوروپی تہذیب کی وارث ہوگی جس کی بنیاد یونانی اور رومی تہذیبی قدروں پر قائم ہے ؟

یہ سوال ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس خیال سے کہ یہ جھگڑا مفید ثابت ہو اس کا یقین کرنا ضروری ہے کہ ہم کس بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ انکار اور رد کس کا ہے اور تائید و حمایت کس چیز کی - وہ کونسے حقیقی مشملات ہیں جنھیں موجودہ بورژوا تہذیب کے حامی "تہذیب" کے اس تصور سے منسوب کرتے ہیں جس کا مفہوم عرصہ دراز سے غیر واضح ہے ؟

مارلیس بوردے نامی کوئی صاحب ہیں جن کا خیال ہے کہ "تہذیب کی تعریف و تحدید" ضروری بھی ہے اور ممکن بھی اور یہ کہ اس کے بنیادی تخلیقی ذرائع محنت ـــ مادی اور فنی ذریعہ ـــــ اور ذہنی قوت ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ کوئی بھی عقیدہ اور مسلک لازمی طور پر، اپنے وسیع مفہوم میں فنی ہی ہوتا ہے، وہ منطقی طریقوں کا ایسا قابل عمل نظام ہوتا ہے جس کے ذریعہ بنی نوع انسان کائنات سے متعلق اپنے علم میں وسعت پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ بتدریج اس میں تبدیلی کرے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے زمانے کی بورژوازی جو کچھ ہے اسی پر قانع ہے۔ اور بڑی کامیابی سے "تہذیب کی روک تھام" کررہی ہے۔ وہ برابر لاکھوں بے روزگار پیدا کرتی، ٹیکنیک کے استعمال کو روکنے کی کوشش کرتی اور اعلیٰ مدارس عجائب خانوں وغیرہ کے مصارف گھٹاتی جارہی ہے اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ وہ تنہا صنعت جس میں بلا روک ٹوک مسلسل ترقی ہورہی ہے

وہ جنگی صنعت ہے، جس کا مقصد لاکھوں مزدوروں اور کسانوں کو مستقبل کے میدان کے لئے جنگ میں تباہ و برباد کر کے مغربی یورپ کی بورژوازی اپنے اس بین الاقوامی تنازعہ کا تصفیہ کرنا چاہتی ہے کہ اس کا کون قومی گروہ دوسروں پر تسلط جمائے......

اب اس تصور کے حقیقی مفہوم کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ مغربی یورپ کی "جدید بورژوا تہذیب کی بنیاد یونانی اور رومی اقدار پر قائم ہے"......

فرانسیسی اخبار نویس پوچھتے ہیں کہ "کیا ایسی قدیم تہذیب جو یونان اور روم کی تہذیبی قدروں کی وارث ہے، رکاوٹوں کے باوجود اپنا مشن جاری رکھے گی یا اس نئی تہذیب سے مغلوب ہو جائے گی جو روح پر معیشت کو حاوی سمجھتی ہے"؟

جب اخبار نویس حضرات "روح پر معیشت کے حاوی ہونے" کا ذکر کرتے ہیں تو وہ غیر شعوری طور پر اپنی جہالت کا یا پھر ـــــ اس کا زیادہ امکان ہے ـــــ بے شرمی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعضوں نے "روحانی" آزادی کے فریب سے اب تک نجات نہ حاصل کی ہو حالانکہ وہ پوری طرح ان اڈیٹروں کے دست نگر ہوتے ہیں جن کے جسم و روح پر پبلشروں، بینکروں، سرمایہ داروں اور اسلحہ کے مالکوں کا قبضہ ہوتا ہے۔

اگر یہ سادہ لوح اخبار نویس...... سچائی اور احتیاط سے اپنی اطراف نظر ڈالیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ دو پاؤں والی مکڑیوں کی ٹھیک یہی "معیشت" جس کا اظہار رجحانات ہی کردہ طریقوں سے ہوتا ہے، سرمایہ دار ریاستوں ہی میں حاوی ہے۔ برخلاف اس کے "نئی تہذیب" محنت کش انسانیت کو اس بے معنی معیشت سے نجات دلانا چاہتی ہے جسے...... جو بورژوا تہذیب کے رہنماؤں کی "روح" نے جنم دیا ہے۔ اسی سماج میں انفرادی آزادی کا خواب دیکھنا اور اس کا تذکرہ کرنا انتہائی مضحکہ خیز ہے جہاں عوام ـــــ جن میں اخبار نویس بھی شامل ہیں ـــــ بھیڑ اور بکروں کی طرح بہ آسانی خریدے اور بیچے جا سکتے ہوں۔

بورژوا تہذیب کی گندہ "روح" میں جو زہر سرایت کر چکا ہے اس کا صحیح اندازہ خود دغابازی کی گرم بازاری اور دغابازوں کے کھوکھلے پن سے ہوتا ہے.........

آج غداروں کی تعداد میں جو کمیاتی اضافہ اور ان سے نفرت میں جو کیفیاتی شدت پیدا ہو رہی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ بورژوا "روح" کتنی خبیث اور تنزل یافتہ شکل اختیار کر چکی ہے......... اس کا اندازہ بورژوازی کی زندگی کی اس تصویر سے ہوتا ہے جسے یورپ کے اخبار نویس دلفریب انداز میں آئے دن پیش کیا کرتے ہیں۔ خونریزی اور گندگی کے اس مشغلہ نے ان اخبار نویسوں کو اس قدر بے حس بنا دیا ہے کہ اب ان میں اپنے مشاہدات سے نتائج اخذ کرنے کی خواہش ہی باقی نہیں رہی ہے۔ وہ بظاہر غیر جانب داری سے صرف "واقعات کو قلمبند" کرتے ہوئے بھی انھیں خون اور گندگی سے آلودہ کر دیتے ہیں تاکہ اس طرح اپنے بورژوا قارئین کی تفریح کا سامان مہیا ہو۔ اور یہ قارئین جرائم کے تذکرہ اور توصیف سے متاثر ہو کر اور بھی گستاخ اور بے وقوف بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ متوسط اور ادنیٰ متوسط طبقہ کا سب سے زیادہ مقبول ادب جاسوسی کہانیاں ہے۔

کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ اس گندگی اور تنزل میں "یونانی اور لاطینی تہذیبی قدریں" کہاں اور کس شکل میں محفوظ ہیں؟ "مادی" قدروں کی حیثیت سے وہ عجائب خانوں اور امیروں کے دیوان خانوں میں بند ہیں جہاں محنت کش عوام

اور ادنیٰ متوسط طبقہ کا گزر نہیں ہو سکتا۔ "روحانی" قدروں کی حیثیت سے ــــــ مثال کے طور پر ــــــ ایچی لس، سوفوکلیس، یوری پیڈیس کی تصانیف تھیٹروں میں پیش کی جا سکتی تھیں لیکن یورپ میں یہ بھی نہیں ہوتا۔ بورژوا یونیورسیٹیوں میں پروفیسر قانون روما پر، قدیم، یونانی فلسفہ پر اور دوسری قدروں پر لکچر دیتے ہیں جن میں بین الاقوامی قانون یہاں تک کہ زمانۂ وسطیٰ کی انسان دوستی کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ یورپ کے اخبار نویس بتائیں کہ موجودہ زندگی کے انتشار میں یہ قدریں کہاں دستیاب ہو سکتی ہیں؟ اور ان کی عملی تعلیمی اہمیت کیا ہے؟.........

موجودہ یورپ کے حکمران طبقہ کے زوال اور انتشار کا جو عمل جاری ہے اس میں بورژوا اہل علم کا مقام انتہائی عجیب اور حسرت ناک ہے......... سنہ ۱۹۱۴ء میں یورپی بورژوازی نے ایسے ہزاروں اہل علم کو معمولی سپاہیوں کی طرح محاذ جنگ پر بھیج کر انھیں مجبور کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کا خون بہائیں۔ یہ وہی "آقایان تہذیب" ہیں جنھوں نے ہاتھ پاؤں سے معذور ہونے، زہریلی گیس کا شکار بننے اور مرنے سے بیشتر شہروں کی تباہی، زرخیز زمینوں کی تاراجی اور تہذیب کی بربادی میں عملی حصہ لیا تھا......... اب بورژوازی اس سے بھی وسیع پیمانے پر ایک نئے عالمگیر قتل عام کی تیاری کر رہی ہے..... بہت ممکن ہے کہ آئندہ جنگ میں برٹش میوزیم۔ لورے اور قدیم دار السلطنتوں کے بے شمار عجائب گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے اور ذہنی قوت رکھنے والے ہزاروں انسان، ہزاروں "آقایان تہذیب"، اور لاکھوں طاقتور مزدور اور کسان موت کا شکار ہو جائیں۔ اور یہ سب کس مقصد کے لئے؟ صرف اس لئے کہ چند بڑے نفع خور اور بینکر دوسرے گروہوں کو غلام بنا کر اپنی ہوس رانیوں کی تشفی کریں۔ یہ بات کئی بار اور پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ جو قتل عام و قبضہ و قعہ سے بورژوازی کے ہاتھوں ہوتا ہے وہ مسلح لوٹ ہے، وہ ایسا جرم ہے جو تمام ملکوں کے بورژوا قانون کی رو سے بھی مستوجب سزا ہے.......

"معیشت کے عادی ہونے" کا اظہار تو جائداد والوں کی عامیانہ اور حیوانی مادیت سے ہوتا ہے۔ اس موٹے دو پاؤں والے جانور کی حریصانہ مادیت کی زہرآلود "روح" اب تو مذہب اور فلسفہ کے بوسیدہ چیتھڑوں سے بھی بے نیاز ہو چکی ہے۔ فاشزم نسلی نظریہ مسلح غارتگری ہی کا مجنونانہ اور کھلا اعتراف ہے.....

لیکن ایک سرزمین ایسی بھی ہے جہاں تمام مزدوروں اور کسانوں کے ارادہ اور ان کی ذات کو سماجی طور پر ضروری محنت کے ذریعہ جو تمام محنت کشوں کے لئے یکساں مفید ہے، متحرک کیا جا رہا ہے۔ جہاں مزدوروں کی تمام صلاحیتیں نئے حالات زندگی کی تخلیق میں ــــــ ایک نئے اشتراکی تہذیب کی تخلیق میں صرف کی جا رہی ہیں۔

جہاں مزدوروں نے مارکس اور لینن کی تعلیمات کی پیروی اور جوزف استالن کی رہبری میں کسان طبقہ کو زمین کے احمقانہ اقتدار سے، فطرت کی تلون مزاجی سے اور خانگی ملکیت کے مسموم اثرات سے آزاد کیا ہے۔ جہاں مزدور طبقہ نے جائداد کے مالک کو اجتماعی انسان بنا دیا ہے۔

جہاں پرولتاریہ ــــــ جو بورژوا سماج میں صرف محنت و مشقت ہی برداشت کرتا ہے ــــ یہ ثابت کر چکا ہے کہ وہ علم سے آراستہ ہو کر تہذیب کا مالک اور خالق بن سکتا ہے۔ جہاں کسی فرد کے تہذیبی کارنامے کی قدر پوری محنت کش آبادی اس سے کہیں زیادہ کرتی ہے جتنی کبھی کہیں اور ہوتی ہو گی۔ جہاں یہ قدر افزائی فرد کے نشو و نما اور اس کے کام میں مسلسل معاونت کرتی ہے۔

جہاں عورت ـــــــ ملک کی آبادی کا نصف حصہ ـــــــ مردوں کے مساوی سمجھی جاتی ہے اور ان کے شانہ بہ شانہ ہر شعبۂ زندگی میں کام کرتی ہے۔ جہاں عقلی قوت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں عورتوں کی صلاحیتوں میں ان کے کام کرنے کے جوش و خروش میں غیر معمولی رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے۔

جہاں بچوں کی پرورش کلیسا کے مخرب اخلاق ماحول میں نہیں ہوتی۔ جس کا مقصد انسانوں میں علم، مسکینی اور "آنے والی قوتوں" کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔

جہاں مختلف اور عددی اعتبار سے ناقابل لحاظ، نیم وحشی باشندے جن کی پہلے کوئی تحریری زبان نہ تھی اب اپنا ادب رکھتے ہیں اور آزادانہ ترقی کرنے کا حق پا چکے ہیں۔ اب دنیا ان کے خیالات اور جذبات کی ابتدائی شگفتگی سے، ان کے کام کرنے کی صلاحیت اور ان کی شاعری کی حسین سادگی سے روشناس ہو رہی ہے۔

جہاں قدیم قبیلے، جن کی تہذیب کو نفع بازوں اور زار کی سامراج پالیسی نے کچل دیا تھا، اب اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور آزاد شدہ اسپرٹ کے جواہر کو اجاگر کر رہے ہیں۔

اس سرزمین میں آرٹسٹ اور سائنس داں صرف محنت کش عوام کی خدمت بجا لاتا ہے جو انسانیت کی جملہ تہذیبی قدروں کو جذب کرنا اور اپنانا چاہتے ہیں۔

لیکن یہ سرزمین دشمنوں سے گھری ہے جو اس کی دولت پر رشک کرتے اور دنیا کے محنت کشوں پر اس کے مفید اثرات سے ڈرتے ہیں۔ وہ اس سرزمین کو لوٹنے، برباد کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے ماضی کو جاننے کی حقیقی خواہش، جو مستقبل کی تعمیر کے لئے ناگزیر ہے، کسی قدر ملک کی مدافعت کی ضرورت کے تابع ہو گئی ہے اور اس طرح اس کی مادی تہذیب کے نشو و نما اور پھیلاؤ میں ایک حد تک ڈھیل دے دی گئی ہے۔ ماضی سے واقف ہونے کی یہ خواہش ایک حد تک اس وجہ سے بھی محدود ہو گئی ہے کہ بورژوا تہذیب کی میراث میں کھرے اور کھوٹے کی بری طرح آمیزش ہے اور انسانی تاریخ کے متعلق بورژوا تعلیمات کی "اصلیت" ان تمام فریب کاریوں سے مملو ہے جن سے ایک بوڑھی تجربہ کار قحبہ ایک معصوم لڑکی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

پرولتاریہ کو انسان عزیز ہے۔ اگر کوئی شخص سماج دشمن رجحانات ظاہر بھی کرے اور کچھ عرصے کے لئے سماجی طور پر خطرناک بن جائے تب بھی اسے قید خانہ کی مخرب اخلاق بے عملی کا شکار ہونا نہیں پڑتا بلکہ اسے ایک مشاق مزدور اور سماج کے ایک کارآمد رکن بنانے کی غرض سے ازسرنو تعلیم دی جاتی ہے "جرم" کے ساتھ پرولتاریہ کا یہ طرز عمل اس کی انسان دوستی کے عملی پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ انسان دوستی اس سماج میں نہ تو کبھی تھی اور نہ ہو سکتی ہے جہاں انسان انسان کے حق میں بھیڑیا ہوتا ہے...... یہاں ایسے بہت سے نئے کاموں کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے جو بڑی سرعت سے اس ملک کو مالا مال کر رہے ہیں اور قطعی طور پر اس کی طبعی شکل و صورت میں تبدیلی کر رہے ہیں...... اس ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ محنت کی کمی محسوس کی جا رہی ہے اور یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جب یورپ اور امریکہ کے نفع بازوں نے لاکھوں انسانوں کو بے روزگار کر رکھا ہے۔

سوویت یونین میں یہ سب کچھ بیس سال سے بھی کم عرصہ میں ہوا ہے اور اسی سے اس کے باشندوں کی قابلیت اور ان کی جرأت آمیز محنت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے ملک میں محنت آرٹ کی

شکل اختیار کر رہی ہے اور سوویت یونین کا پرولتاریہ لینن اور اس کی پارٹی کی تعلیمات کی رہبری اور جوزف اسٹالن کے نہ ختم ہونے والے بڑھتے ہوئے جوشِ عمل کی وجہ سے انسانیت کی ایک نئی تہذیب ایک نئی تاریخ بنا رہا ہے........ جو کچھ یہاں مختصر اور نامکمل طور پر بیان کیا گیا ہے وہی پرولتاری انسان دوستی کی غیر معمولی تخلیقی قوت کی اساس ہے ــــ وہی مارکس اور لینن کی انسان دوستی ہے۔ یہ وہ انسان دوستی نہیں ہے جس پر حال حال تک بورژوازی اپنی تہذیب و تمدن کی بنیاد کی حیثیت سے ناز کیا کرتی تھی۔

لفظ "انسان دوستی" کے سوا یہ دو انسان دوستیاں کسی چیز میں بھی مشترک نہیں ہیں۔ لفظ وہی ہے لیکن معنی بالکل مختلف ہیں۔ بورژوا انسان دوستی تقریباً پانچسو سال پہلے جاگیرداروں اور ان کے "روحانی پیشوا" کلیسا کے مقابلہ میں .... بورژوازی کی حفاظت خود اختیاری کا ایک ذریعہ بن کر نمودار ہوئی تھی۔ دولتمند بورژوازی، صنعتوں کے مالک یا تاجر جب انسانوں کی "مساوات" کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے مراد خود اپنی شخصی مساوات ہوتی ہے ....

عام طور سے بورژوازی نے مزدوروں کی زندگی کو سدھارنے بجز خیرات کے ــــ جو مزدور سے اس کی خودداری چھین لیتی ہے ــــ کوئی اور ذریعہ استعمال نہیں کیا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ یہ مجہول اور خود پرست بورژوازی "کارِ خیر" میں ہی ہاتھ بٹاتی ہے یعنی ان ہی کو لوٹا جاتا ہے جنھیں خیرات دی جاتی ہے۔ اس کے جواز کے لئے اس نے ایک نہایت ہی احمقانہ اور پُرفریب علم گھڑ لیا ہے کہ "جو کچھ بائیں ہاتھ سے دو اس کا علم سیدھے ہاتھ کو نہ ہونے دو" ــــ اور پھر بے حساب دولت لوٹنے کے بعد یہ "آقایان حیات" بڑی سخاوت سے چند ٹکے مدرسوں، ہسپتالوں اور بیت المعذورین پر بھی خرچ کرتے ہیں۔ ان خود غرض انسانوں کا ادب مظلوموں کے ساتھ "رحم" کی تلقین کرتا ہے لیکن یہ مظلوم وہی ہیں جنھیں خود بورژوازی نے لوٹا اور ذلیل و خوار کیا ہے۔

اگر بورژوا انسان دوستی سچی ہوتی۔ اگر وہ خلوص سے ان لوگوں کو جنھیں اسے غلام بنایا تھا، ابھارتی اور ان میں انسانی عظمت اور اجتماعی قوت کا شعور پیدا کرتی، انھیں اس کا احساس دلاتی کہ دنیا اور قدرت کی قوتوں کو منظم کرتے ہیں انسان کا کیا مقام ہے تو وہ کسی مصائب کے اٹل اور ناگزیر ہونے کا پرچار نہ کرتی اور نہ ہمدردی کا انفعالی احساس پیدا کرتی بلکہ جملہ مصائب اور خاص کر سماجی و معاشی حالات کے پیدا کردہ مصائب سے عملی نفرت دلاتی ...... برخلاف اس کے ان کم مایہ خود پرستوں کی انسان دوستی ہمدردی کی آڑ میں ان خوفناک مصائب کو برداشت کر لینے کی تبلیغ کرتی ہے جو طبقاتی تعلقات کا نتیجہ ہیں اور جنھیں اٹل اور مستقل کے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ مصائب اسی شرمناک تقسیم کا نتیجہ ہیں جس نے انسانوں کو اعلیٰ اور ادنیٰ نسلوں میں سفید فام امراء اور سیاہ فام غلاموں میں بانٹ دیا ہے۔ اسی تقسیم نے محنت کشوں کے مفادات کی یک جہتی کے احساس کو کچلا ہے ...... لیکن انقلابی پرولتاریہ کی انسان دوستی کھری اور بے لاگ ہے۔ وہ پُرشکوہ اور دل خوش کن اصطلاحوں میں انسانی محبت کا پرچار نہیں کرتی۔ اس کا مقصد ساری دنیا کے مزدوروں کو سرمایہ داری کے شرمناک، خونیں اور مجنونانہ تسلط سے آزاد کرانا ہے، انسانوں کو یہ سمجھانا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایسی تجارتی اشیا نہ سمجھیں جو خریدی اور بیچی جا سکتی ہوں۔

انھیں یہ بتلانا ہے کہ وہ ایسی خام اشیا نہیں ہیں جو چند مجہول اور خود پسند اشخاص کی تعیشات کا سامان فراہم کرتی رہیں۔

.... پرولتاریہ کی انسان دوستی محبت کے عاشقانہ گیت نہیں چاہتی بلکہ وہ ہر مزدور سے اس کے تاریخی مشن کے احساس کا اس کے حق اقتدار کے شعور کا ـــــ ایک انقلابی سرگرمی کا مطالبہ کرتی ہے........ وہ اس کا مطالبہ کرتی ہے کہ تہذیب دشمنی، مجہولیت، اور خود پسندی سے، سرمایہ دارانہ اقتدار اور اس کے خدمت گاروں اور طفیلیوں سے، فاشستوں اور قاتلوں سے، مزدور طبقہ سے غداری کرنے والوں سے نفرت اور حقارت کی جائے ـــــ نفرت ان تمام چیزوں سے جو مصائب کا باعث ہیں، نفرت ان تمام لوگوں سے جو لاکھوں انسانوں کے مصائب پر جی رہے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ حقائق اور واقعات کے اس مختصر خاکہ سے بورژوازی اور پرولتاری تہذیب کی قدریں ہر ایماندار آدمی پر واضح ہوجائیں گی۔ (۱۹۳۵)

(مترجمہ) **شہاب الدین**

فانی بدایونی

اردو غزل گوئی نیم وحشی صنفِ سخن ہو یا محض روایت پرستی مگر کبھی کبھی اس تاریکی میں ایسے شعلے بھی لرز اٹھتے ہیں کہ دل کی فضا کچھ دیر کے لئے بے قرار ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے وجدان کی تعمیر میں قدیم روایات کا بہت شاندار حصہ ہے۔ روایتی شاعری میں مقدار اور تعداد کا اضافہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے نئی خصوصیتیں مشکل سے پیدا ہوتی ہیں۔ صرف مضبوط اور جاندار انفرادیت رکھنے والے اس دائرے کو توڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اپنے محدود ہی کے اندر رہکر اپنے سینے کی آگ اور اپنے دل کا گداز اپنی شاعری میں بھر دیتے ہیں پھر چونکہ ان کے پڑھنے والے اپنے معاشی اور معاشرتی روابط کی وجہ سے خود اس ماحول سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں اس لئے اثر ان کی خصوصیت بن جاتا ہے۔ ہم اور آپ غزل کی شاعری سے متنفر ہوں، عاجز ہوں، اسکے مٹا دینے کے درپے ہوں، ایامِ جاہلیت کی یادگار سمجھ کر اس دورِ تہذیب کو اس سے پاک کر دینا چاہتے ہوں، سننا نہ چاہتے ہوں، سن کر اثر لینے سے دور بھاگتے ہوں، مگر ہمارے مضبوط ارادوں کا قلعہ توڑ کر کوئی میرؔ کوئی غالبؔ، کوئی آتشؔ، کوئی حسرتؔ، کوئی جگرؔ، کوئی فانیؔ، کوئی فراقؔ ہمارے وجود کے اندر جھانکتا ہے اور وہ نغمہ چھیڑتا ہے جسے ہماری روح قبول کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ زندگی کی کوئی گہری حقیقت غم، درد اور محبت کا کوئی پریشان کرنے والا خیال۔ ان سے بھاگ کر کوئی کہاں جائے گا! ان کی آواز پیچھا کرتی ہے اور اشعار دہرانے پڑتے ہیں کیونکہ صرف عقل ہمیں ان سے علحدہ رکھنے کی کوشش کرے تو کرے ہمارا دل اب بھی انھیں پناہ دیتا ہے اور غالباً دیتا رہے گا۔ پھر غور کیجئے تو غزل صرف دل کی شاعری ہے بھی نہیں اسے عقل سے گہرا تعلق ہے اور یہی امتزاج اچھا غزل گو پیدا کرتا ہے۔ اس نئے تصور سے چاہے تغزل اور (LYRICISM) کا مفہوم مجروح ہوتا ہو یا بدلتا ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ اچھا غزل گو عقل کے مسائل سے بہت زیادہ دور نہیں رہتا۔ فانیؔ ایسے ہی غزل گویوں میں سے ایک ہیں۔

فانی بدایونی نے ۱۶ اگست ۱۹۴۱ء کو حیدرآباد میں انتقال کیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۲ سال کی تھی اور اگر ان کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی موت بہت پہلے واقع ہو چکی تھی۔ یا واقع ہونا شروع ہو چکی تھی اور یہ ۶۲ سال ایک "مرگِ مسلسل" کی طرح گزرے۔ ہر لمحہ انھیں موت کا انتظار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شکست کھائی ہوئی انفرادیت نے اپنے اندر ایک طرح کی "خواہشِ مرگ" (DEATH-WILL) پیدا کر لی تھی اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے ذہن مختلف صورتیں اختیار کیا کرتا تھا

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہئے تھا

فانیؔ کا نام شوکت علی خاں تھا۔ شوکت تخلص ہو سکتا تھا لیکن انھوں نے فانیؔ تخلص رکھ کر اس خواہش کی تسکین کا سامان کیا۔ یہ بات تنقید کے لئے بہت اہم نہ ہو لیکن نفسیاتی حیثیت سے فانی کے مزاج اور افتادِ طبع کے بہت سے بھید کھول دیتی ہے۔ اس خواہش کے ماتحت وہ کسی وقت موت کے خیال سے غافل نہ رہے زندگی کی وہ تلخیاں جو ایک انفرادیت پسند حساس شاعر کے ہاں بیماری بن جاتی ہیں فانیؔ کے ساتھ ساتھ رہیں۔ وہ ایک وارفتہ مزاج شاعر تھے، عاشقانہ طبیعت رکھتے تھے اور عاشقانہ طبیعت میں خود ایک طرح کی انفرادیت ہوتی تھی۔ محبت اگرچہ ایک اجتماعی اور معاشرتی جذبہ ہے لیکن مختلف قسم کے اخلاقی تصورِ حیات میں مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ فانیؔ کے لئے وہ ایک مخصوص انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس میں ناکامی انھیں زندگی کے اس دھارے پر ڈال دیتی ہے جہاں انفرادیت مجروح ہو کر سانپ کی طرح بل کھاتی ہے اور زہر اگلتی ہے۔ جب وہ زمانے کے آئین و قوانین کو، رسم و رواج کو، ماحول اور سماج کو اپنے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کا نشانہ نہیں بنا سکتا تو اپنی انفرادیت کے خلاف بغاوت بلند کرتا ہے اور اسی کا گلا گھونٹ کر تسکین حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنے ہی گریبان میں زور چلتا ہے اور "خواہشِ مرگ" قوی سے قوی تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

فانیؔ کا پیشہ وکالت تھا لیکن دونوں میں بہت بُعد تھا۔ وکالت ان کے لئے ایسی تھی جیسے کسی "گول خانے میں چوکھٹی چیز" بٹھانے کی کوشش کی جائے مگر ہمارا نظامِ تمدن اس کی کب فکر کرتا ہے کہ افراد کی اصل صلاحیتوں سے کام لیا جائے۔ طاقت کی بربادی کا ایک سلسلہ جاری ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو جہاں ہے وہاں خوش نہیں۔ فانیؔ بھی اسی طرح ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے جو ان کی تمناؤں سے ہم آہنگ نہ تھی ان کی شخصیت کھنچی کھنچی تھی، دماغ احتجاج کرتا تھا، دل بغاوت کرتا تھا، ہڈیاں چٹختی تھیں لیکن زمانے کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوتی تھی۔ کون جانتا ہے کہ فانیؔ کو انھیں تجربات نے جبر کا قائل نہ بنا دیا ہو اس زندگی سے نجات صرف موت دلا سکتی تھی۔ اس لئے ہر وقت موت کا انتظار ــــــــــ ہر وقت ــ

آج روزِ وصال فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

چمن سے رخصتِ فانیؔ قریب ہے شاید
کچھ آج بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

جب دیکھئے جی رہا ہے فانیؔ !
اللہ رے اس کی سخت جانی

لذتِ فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی
دل ٹھہر گیا فانیؔ موت کی دعا کر کے

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانیؔ — زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

آ، اب ائے مرگِ ناگہانی، آ — سخت منتظر ہیں تیرے شیدائی

چارۂ دردِ زندگی تو ہے — کر اگر ہو سکے مسیحائی

فانیؔ تلخ کام کی امید — تو اگر آئی، تو بر آئی

فانیؔ ہی وہ ایک دیوانہ تھا جو موت سے پہلے مرجائے

کیا ہوش کی کافر دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

اور ایسے ہی سیکڑوں شعر! زندگی کو موت میں تبدیل کرلینا، زندگی کو موت سمجھنا، مرنے سے پہلے مرجانا، یہ سب اسی خواہش مرگ کے پہلو ہیں جو نہ خودکشی میں تبدیل ہوتے ہیں اور نہ بغاوت میں غور و فکر کے بہت سے مواقع آتے ہیں، عمل کا کوئی موقعہ نہیں نکلتا۔ اسی وجہ سے فانیؔ کا رنج والم گہرا اور فلسفیانہ ہے۔ غم دو چار دن کا ہوتا تو اس میں رقت پسندی، جذباتیت اور بھڑک بجھ جانے کی کیفیت ہوتی لیکن جب غم زندگی بن جائے، جب جینا گناہ معلوم ہو، جب زندگی جاوید کی خواہش بھی عزیز نہ رہے اس وقت موت سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں، اسی کی تاریکی روشنی پیدا کرتی ہے، اُسی کے ظلمات میں آبِ حیات ملتا ہے اور معشوق کی خواہش بھی بھیس بدل کر موت ہی کے پردے میں چھپ جاتی ہے۔ ـــ

ادائے آڑ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے

مری قضا کو وہ لائے دولہن بنائے ہوئے

یہی وجہ ہے کہ فانیؔ کی موت خوفناک اور ڈراونی نہیں، وہی زندگی کے پیچیدہ معمہ کو حل کرتی ہے۔ وہی سکون لاتی ہے۔ قنوطیت اور یاس جہاں زندگی کا مقصد بن جاتے ہیں فانیؔ وہاں کھڑے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں مرگ کی تکرار فلسفۂ حیات کے سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ زندگی جو ان کے لئے دیوانے کا خواب ہے ان کے پیش نظر ہے وہ اسی کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اس گتھی کا سرا بھی نہیں ملتا کیونکہ ـــ

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یہ صوفیانہ مذاق کی کارفرائی نہیں ہے! یہ لفظوں کے ساتھ کھیل نہیں ہے۔ یہ شکست کھائے ہوئے شدت احساس کی آواز ہے کہ زندگی کی ابتدا اور انتہا کے نہ معلوم ہونے پر وہ حصہ بھی وہم معلوم ہونے لگتا ہے جو نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ جستجو کی منزل ہے جو یاس کی تاریکیوں میں کھوئی گئی ہے۔ یہاں پہونچ کر بہت سے سوچنے والے فانیؔ کے ساتھ ہوجائیں گے اور بہت سے ان کا ساتھ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کریں گے۔ تصوریت اور واقعیت، عینیت اور حقیقت ان دونوں راستوں سے زندگی اور موت کے راز کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فانیؔ نے پہلا راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے بہت سوچا لیکن انھیں اس کا جواب نہ مل سکا کہ زندگی کسے کہتے ہیں۔ ہاں موت کے بارے میں البتہ انھوں نے ایک فلسفہ سا بنالیا تھا۔ زندگی ٹھوس مادی حقائق سے لبریز ہے۔ اس کے تغیرات کا سلسلہ پہلے مادی روابط میں تلاش کرنا چاہیے جسے تصوریت کے حامی نظر انداز کرجاتے ہیں لیکن موت کا راز تو تخیل آفرینی کی مدد سے حل کیا جاسکتا ہے اور اس کے سمجھنے اور اس سے تسکین پانے کے لئے تصوراتی باتیں نکالی جاسکتی ہیں۔ یہی فانیؔ نے بھی کیا ـــ

زندگی خود کیا ہے فانیؔ یہ تو کیا کہیئے مگر

موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

ان کی خواہش مرگ اتنی قوی تھی کہ ان کے یہاں ذوق کا وہ شک بھی پیدا نہ ہوا کہ "مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"!

غزل گوئی فطری شاعری ہے یا نہیں، یہ ہمارے بڑھتے ہوئے خیالات کا ساتھ دے سکتی ہے یا نہیں، اسے مٹ جانا چاہئے یا رہنا چاہیے، ان بحثوں سے قطع نظر فانیؔ مکمل غزل گو ہونے کے باوجود

عام غزل گو شعرا سے بہت مختلف ہیں کیونکہ ان کے یہاں ایک طرح کا فلسفیانہ تسلسل پایا جاتا ہے۔ ان کا ایک الگ انداز بیان بھی ہے۔ یہ چیز انھیں غزل گو شعرا میں بہت بلند مرتبہ بناتی ہے۔ اگر کوئی غزل گو ہمارے سامنے زندگی کے مسائل، محبت کے مسائل، ان کی پیچیدگیاں اور ان کے حل پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی شاعری موجودہ دور کے لوگوں کے لئے بھی اپنے دامن میں کچھ جھلیاں رکھتی ہے۔ فانی کے یہاں ایسی بہت سی جھلیاں ہیں۔ انھیں زندگی اور موت کا بھید معلوم کرنے کی تمنا ہے۔ وہ عشق اور عشق کی کیفیات کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ انسانی طاقت اور اختیار کے حدود دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسائل کسے پریشان نہیں کرتے اجتماعیت پسند اور انفرادیت پسند دونوں ان مسائل پر غور کرتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ اجتماعیت پسند انھیں پھیلا دیتا ہے، جواب کہیں اور ڈھونڈھتا ہے اور کہتا ہے ع

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں پھر حل کر تدبیریں سوچیں (فیض)

لیکن انفرادیت پسند تنہا ہونے کی وجہ سے شکست کھا جاتا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ؎

راس آئے ہیں اشک و آہ کسے
کر نہ آب و ہوائے غم سے ساز (فانی)

"آب و ہوائے غم سے ساز" کر لیتا ہے اور اس مصالحت کو عاشقانہ کیف کا رنگ دیتا ہے ؎

کیا کروں نازک بہت ہے ان کی مرضی کا سوال
ورنہ فانی اس جئے جانے سے کچھ حاصل نہیں،

محبت، زندگی اور موت، جبر اور اختیار، ان کا ایک دائرہ ہے جن میں فانی کا داغ گھرا ہوا ہے اور سب کے اوپر فنا اور بربادی کی ایک تلوار لٹکتی رہتی ہے جو امیدوں کو پنپنے کا موقعہ نہیں دیتی۔ اگرچہ امیدیں بھی مجبوری کا ایک جزو ہیں اور تمنائیں بھی جبر کی آفریدہ۔ فانی نے جبر کے حدود کو دیکھتے ہوئے ایک دنیا تعمیر کر لی تھی جس میں بہار نہیں آتی، جس میں دور عشرت نہیں آتا، جس میں لوگ ہنس نہیں سکتے، جس میں زہر، ویرانی، نشتر، اندھیری راتیں، خون تمناؤں کے گھونٹے ہوئے گلے، موت کے بھیانک پروں کی سرسراہٹ ہے۔ اس دنیا میں سب دبے پاؤں چلتے ہیں، اگر بہار آتی ہے تو اس لئے کہ خزاں آکر اسے تباہ کرے، اگر دور جام ملتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ کسی کو زہر دیا جانے والا ہے۔ اگر شمعیں روشن کی جاتی ہیں تو اس لئے کہ انہیں ہوائیں بجھا دیں۔ ایسی دنیا تعمیر کرنا اور اس میں بسنا کسے پسند ہو سکتا ہے لیکن فانی کہتے ہیں کہ کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ انسان کی فطرت اس مجبوری کو ان لینے کے بعد بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ بھی مجبوری کے ماتحت ہوتا ہے یا اتنا اختیار رہتا ہے۔ فانی نے طنز سے کام لیا ہے ؎

کچھ امید کرم میں گزری عمر کچھ امید کرم میں گزرے گی
اپنے دلوانے پہ اتمام کرم کر یا رب درد دیوا۔ دیئے اب انھیں پرانی دے

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اندر جو اختیار کی طاقت ہے وہ جبر سے نہیں دبتی، اور اگر انسان عمل پسند نہیں ہے تو بھی اسے ذہنی طور پر حرکت کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ فانی کی شاعری کبھی کبھی اتنی متحرک بھی ہو سکتی تھی ؎

ہاں شب ہجراں آج صبح نہ ہو ہاں چلی جائے یاد زلف دراز

کون باعزم اور عمل پسند اپنے نصب العین کے حاصل کرنے میں اس جوش سے کام لینا پسند نہ کرے گا؟ فانی کے تمام نقاد قریب قریب اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی شاعری عام معیار تغزل سے بلند تھی، ان کے خیالات اور محسوسات ان کے ذاتی تخیلی تجربہ کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے اندر ایک طرح کی فلسفیانہ بصیرت تھی جو انھیں

اپنے تجربات کو فلسفیانہ سانچے میں ڈھالنے کی طرف مائل کرتی تھی۔ اس طرح جنون اور حکمت عقل اور دل، علم اور عشق کا امتزاج پیدا ہوتا ہے لیکن دل کا قابو عقل پر ہے اس لئے اگر کبھی اس بات کا احساس ہوتا بھی ہے کہ دل ناکامی کی جانب لے جا رہا ہے تو اس سے نکلنے کے لئے جس توانائی اور قوت ارادی کی ضرورت ہے وہ حاصل نہیں ہوتی۔ فانی کا ایک فارسی شعر ہے ؎

ازجلوتیاں لذتِ عیشِ نگہے پرس
برخلوتیاں فرصت نظارہ حرام است

یہ ان کی خواہش مرگ کا مظہر ہے اور مجبوریوں کے ہوتے ہوئے جبر کی گرفت میں رہنے کے باوجود، فانی نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ انھیں جلوتیوں میں نہیں خلوتیوں میں شامل سمجھا جائے۔

فانی کے بعض اشعار جنھوں نے مجھے تڑپایا ہے آپ بھی سنئے ؎

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے　　تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے　　میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی　　آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

روحِ اربابِ محبت کی لرز جاتی ہے　　تو پشیماں نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا　　مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

لبریز تموج تھا اک خطِ پیمانہ　　محفل سے جو وہ اٹھے لیتے ہوئے انگڑائی

کیوں فلک! انتہا ہوئی کہ نہیں　　ایک دم رہ گیا ہے اب دم سا

مجھے خبر ہے تیرے تیرِ بے پناہ کی خیر　　بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

میں نے فانی ڈوبتی دیکھی ہے نبضِ کائنات　　جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

محو تماشا ہوں میں یا رب کہ مدہوشِ تماشا ہوں　　اس نے کب کا پھیر لیا منہ اب کس کا منہ تکتا ہوں

میں ندامت جان کر خوش ہوں یہ منظر دیکھنا　　وہ مجھے تڑپا کے تیرا پھر نہ مڑ کر دیکھنا

صبح تک فانی ہر آوازِ شکستِ دل کے ساتھ　　کیا قیامت تھا وہ تیرا جانبِ در دیکھنا

نامہربانیوں کا گلہ تم سے کیا کریں　　ہم بھی کچھ اپنے حال پہ اب مہرباں نہیں

پچھتائیں گے آپ دل کو لے کر　　کم بخت غم آشنا بہت ہے

کیا بلا تھی ادائے پرسشِ یار　　مجھ سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر　　کچھ امیدِ جواب میں گزری

مختصر یہ کہ غم عشق اور غم روزگار دونوں نے فانی کو وہ کچھ بنا دیا تھا جسے وہ اپنے کلام میں ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اور زندگی میں ہم آہنگی ہے جسے تجربہ کی شاعرانہ صداقت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فانی کے یہاں میر کے گداز اور غالب کے علو کا امتزاج ہے۔ ممکن ہے ایسا بھی ہو لیکن فانی، میر اور غالب میں سے کسی کے قریب ہوں یا نہ ہوں اپنی ذات سے بہت قریب تھے اور اسی کی ترجمانی نے ان کی شاعری میں اثر پیدا کر دیا ہے

فانی غزل گو تھے اور غزل گوئی میں مکمل آسودگی کا سامان نہیں ہے۔ زندگی کے بہت سے مسائل غزل پر بار ہو جاتے ہیں۔ اور تمام مسائل کو غزل ہی کے ڈھانچہ پر بننا ایک جانب تو ان مسائل پر ظلم ہے دوسری جانب غزل پر۔ اس لئے فانی کا مطالعہ کرتے وقت اس کا خیال رکھنا پڑے گا کہ غزل جس نظام تمدن سے وابستہ رہی ہے اس میں انقلاب آچکا ہے۔ اس لئے غزل میں مکمل تسکین کا پہلو پیدا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ فانی ہی کا شعر یاد آتا ہے ؎

اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز
میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز

فانی کی انفرادیت پسندی اور غزل کی انفرادیت پسندی دونوں کا دور ختم ہو چکا ہے اور صحیح ساز چھیڑنے کا وقت آگیا ہے۔ شاید کوئی نیا نغمہ نکلے، کوئی نیا گیت سنائی دے جو اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ زندگی کے معمہ کو حل کر سکے۔ زندگی کے معمہ ہی کو حل کرنا فانی کا مقصد بھی تھا لیکن وہ الجھ کر رہ گئے۔ انھوں نے وجدان سے کام لینے کی کوشش کی اور زندگی "دیوانے کا خواب" بن گئی جو نہ سمجھی جا سکتی ہے اور نہ سمجھائی جا سکتی ہے۔ لیکن دوسرے راستے

سمجھ میں جن پر فانی کی نگاہ نہ جا سکی اور وہ اپنی انفرادیت پسند شخصیت کا شکار ہو کر رہ گئے۔

فانی کے احساس کی شدت کا اثر ان کی شاعری کے ظاہری محاسن پر بھی پڑا تھا۔ ان کا فلسفۂ زندگی اور عقیدہ جبریانہ تھا۔ صدیوں انسانی دماغ نے اس کی پرورش کی تھی، ان کی قنوطیت نئی نہ تھی۔ ان کے خیالات انوکھی طرح پیش ہونے کے باوجود نئے نہ تھے کیونکہ ان کی صدائے بازگشت فارسی اور اردو شعراء کے یہاں بہت دنوں سے گونج رہی تھی، اور اب بھی گونج رہی ہے۔ ایسی شاعری میں اثر کی کمی پائی جا سکتی ہے لیکن فانی کے یہاں اثر کی کمی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں صرف روایتی طور پر دہرا دی گئی ہوتیں تو ان میں تاثر آفرینی کی صلاحیت نہ ہوتی۔ لیکن خلوص اور ذاتی اثر پذیری نے ان کے طرز اظہار میں واقعیت پیدا کر دی ہے اور لب و لہجہ میں ایک نئی کھنک سنائی دیتی ہے جو خلوص کے بغیر ممکن نہیں۔ جبر او ر اختیار کے رسمی عقیدہ میں ذاتی اعتقاد کی وجہ سے قنوطیت میں بھی زندگی کی الم انگیزی کے سبب نیا پن ہے جو طرز اظہار میں نمایاں ہوتا ہے۔ اور فانی کو دوسرے غزل گویوں سے الگ کر دیتا ہے۔ پرانے اشارے اور قدیم علامات میں نئے گوشے پیدا ہو کر ان کی شاعری کو فرسودگی کا شکار ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ اس طرح فانی کی شاعری کے بعض اجزا بہت دنوں تک کچھ لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرتے رہیں گے۔

احتشام حسین

تاریخ گولکنڈہ ۔ حیدر آباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بڑی سائز سوا تین سو سے زیادہ صفحات قیمت (عہ)

جدید شاعری اور حیدرآباد

ہمیشہ کی طرح آج بھی زندگی تعمیر و تخریب کے دوراہے پر کھڑی ہے، اور ایک نئے آدم اور ایک نئی دنیا کی تمنائیں دور بہت دور چراغِ منزل کی طرح چمک رہی ہیں، اور ہمیشہ کی طرح آج بھی ایک نئے صحت مند تمدن کو جنم دینے کے لئے مادرِ کائنات کو ایک نوئین لباس سے آراستہ کیا جا رہا ہے، اور جہاں سیاست زمانے کے گرداب میں ہچکولے کھا رہی ہے، سائنس کہیں نازاں کہیں پشیمان اور فلسفہ کہیں بیمار کہیں معالج ہے، وہیں ادب کہیں "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی بھول بھلیاں میں پریشان اور کہیں میدان کار زار میں نعرہ زن! ایک طرف تاریکی ہے اور ایک طرف روشنی!! اس دوراہے پر انسانی دکھ درد کا علاج سیاست کو بھی ڈھونڈنا ہے اور فلسفہ، سائنس اور ادب کو بھی! اور یہ کٹھن منزل نہ "آئین نو" سے "ڈرنے" سے سہل کی جا سکتی ہے نہ "طرز کہن" پر "اڑنے" سے! ایسا ہی ایک احساس اور اسی طرح کی ایک فکر ساری دنیا کے ادیبوں اور خصوصاً ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے ادیبوں اور شاعروں کی طرح ہمارے ادیبوں پر بھی طاری رہی، پہلی جنگ عظیم سے اس جنگِ عظمیٰ تک اردو شاعری بہت سے نئے نئے تجربوں سے گزری، اگلے وقتوں کی بہت سی باتیں بھلا دی گئیں اور جہاں بہت سی باتوں کو ایک نئے انداز میں دہرایا گیا وہیں بہت سی نئی باتیں سینے میں گھٹ کر رہ گئیں!! ----- ابھی "غدر" کی یادگاریں غالب کے لئے واہ اور میر کے لئے آہ کہہ ہی رہی تھیں کہ مسدس کے ذریعہ زمانے نے ایک نئی آواز سنی، ایک نئی آواز لیکن کسی قدر دھیمی کسی قدر ہلکی! ----- آفتاب کی آخری شعاعوں کی طرح یہ دور بھی گزر گیا، پھر دنیا نے اکبر کے نشتروں کے ساتھ ایک طوفانی گرج بھی سنی اور یہ طوفانی گرج تھی اقبال کی شاعری!! یہ نیا آفتاب چونکہ "غرب صد ہزار انجم" کے بعد ابھرا تھا اس لئے دنیا نے اسے آنکھیں کھول کر دیکھا! ساری دنیائے اردو شاعری میں اس کی شعاعیں پہنچیں اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دکن کے وطن والوں نے بھی اس سے اکتسابِ نور کیا! یہی وہ زمانہ ہے کہ جب جامعہ عثمانیہ کے قیام کی وجہ سے یہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں ایک نئی زندگی ایک نئی ہلچل شروع ہوگئی تھی، توفیق کی میٹھی میٹھی دردانگیز غزلیں سننے کے باوجود اور داغ و امیر کے "احسانمندوں" کے ہوتے ہوئے یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ ایک ادبی تشنگی سی محسوس کرنے لگا تھا اور یہاں کے نوجوان شعراء نے بھی زمانے کے بدلتے ہوئے رخ کو پہچانا اور اس طرح "تنگنائے غزل" سے نکل کر نظموں کی طرف متوجہ ہونے لگے،

اس مقام پر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان نئے مسافروں کو ایک نئے راستے پر گامزن کرنے میں اقبال کے علاوہ ان صاحبانِ کمال کی شاعری کا بھی بڑا اثر ہے جو جامعہ عثمانیہ اور دار الترجمہ اور دوسری ملازمتوں کے سلسلے میں حیدرآباد میں مقیم تھے اور ان حیدرآبادی علماء اور شعرا کا بھی اثر ہے جو نوراندل تھے اور زمانہ کا رخ پہچانتے تھے! ہمارے بڑے بھائیوں کی یہ خوش نصیبی ہے کہ مولانا شمسی، ضیا یار جنگ توفیق، کیفی، امجد، عزیز یار جنگ تجلی، نائل، شہرت، صفی، اور علی منظور کے ساتھ ساتھ جلیل، ضامن، باغ، لبیب، ظفر علی خاں نظم، رسوا، سلیم، عظمت اللہ خاں، فانی، جوش، علی اختر، آغا داؤد مسعود علی محوی اور خلیفہ عبدالحکیم کی صحبتیں بھی انہیں میسر آئیں!! ---

یہ سب کچھ تو ہوا لیکن محفلوں میں اب بھی "شمع" گھومتی ہی رہی! اور جن شعراء کے سامنے وہ شمع رکھی گئی ان میں قابل ذکر ڈاکٹر زور

حبیب اللہ رشدی، جلال الدین اشک، اکبر، خاقانی، عبدالقیوم خان
باقی، ابوالکلام بدرالدین بدر، بنی الحسن شمیم، امیر احمد، طاہر علی خاں
مسلم، بدر شکیب، تمکین سرمست، وقار مرحوم اور سرمد مرحوم ہیں!
اقبال کا ایک مصرع ہے: "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں"
چنانچہ ہماری ادبی محفلیں ان حضرات سے بھی سیر ہوگئیں، اس
"نقش اول" کے بعد ہم ایک "نقش ثانی" کے منتظر تھے، ہمارا
پہلا تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا لیکن بہرحال وہ پہلی کوشش تھی
طبیعتوں میں جدت ضرور تھی لیکن زبان و بیان کی "لکنت" ایک
اور صحت مند تجربہ کی محتاج تھی! ہمارے بڑے بھائیوں کو بھی
اس کا احساس تھا چنانچہ ان میں سے اکثر شعرا کی شاعری زمانۂ
طالب علمی کے ساتھ ختم ہوگئی اور بعض اب تک ہماری محفلوں
میں کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں مگر ان کو زمانے کے نئے تقاضوں
اور مطالبات کا پورا پورا احساس ہے اور وہ نہایت خلوص
و ہمدردی کے ساتھ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآنے کی سعی
کرتے رہتے ہیں، بہرحال ہم ان کے ممنون ہیں!

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد!

مشرق کے شاعر اعظم کا ایک پیام ہے ؎

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

صوفیانہ قسم کے تصور کو ہٹادینے کے بعد یہ پیام ہندوستان
کے نوجوان کے لئے ایک نئی زندگی کی نوید تھا، اسی شعور بیداری
نے ہندوستانی ادب میں بھی ایک نئی تحریک کی بنا ڈالی، اور
اس تحریک نے "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی شکل میں جنم لیا
اس قسم کی انجمن کا خیال غالباً سب سے پہلے فرانس میں
پیدا ہوا اور بعد میں ایک ادبی رسم بن کر اس کی شاخیں
ساری دنیا میں پھیل گئیں! لیکن ہندوستان میں اس تحریک کا
بھی وہی حشر ہوا جو ہر آزادی پسند تحریک کا ہوا کرتا ہے۔ یعنی
شور و غوغا سے ابتدا اور پھر گاجے باجے کے سے منحوس جھگڑوں پر
اختتام! مخصوص ہندوستانی روایات کے تحت بہت سی "ادبی ذاتیں"
بنیں اور ہر خود غلط ادیب نے اپنے نزدیک ترقی پسندی کا
مفہوم کچھ کا کچھ مقرر کرلیا، پہلے پہلے "ترقی پسند" ادیب
وہی خوش نصیب ہوسکتا تھا جو کمیونسٹ ہو یا کسی نہ کسی طرح
روس کو اپنا کعبۂ فکر و نظر سمجھتا ہو لیکن بعد میں زمانے کے
صحیح اور وسیع مطالبات نے اس تصور کو ختم کردیا اور اب ہر
وہ شاعر یا ادیب "ترقی پسند" ہے جو اپنے وطن کو آزاد دیکھنا
چاہتا ہے، جو اس وسیع ملک میں بسنے والی تمام قوموں کو
یگانگت اور اتحاد کا درس دے، جو سرمایہ داری کی لعنت
کو ساری دنیا کے لئے مضر سمجھتا ہو، جو جمہوریتوں کی طاقتوں
میں دم توڑنے والوں کا ترجمان ہو لیکن خود "قائلین پر دم توڑنا"
جس کا مقصد نہ ہو، اور جس کی تحریریں ہر سامراجی حملہ آور
کے خلاف ہم میں جذبۂ نفرت پیدا کریں! لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ
اس ندی کے دریا بن جانے کے بعد کتنے ایسے ہیں جنھوں نے
اس کی رفتار کا ساتھ دیا، اور کتنے ایسے ہیں جو یا تو راہ میں
بیٹھ گئے یا ذروں کی طرح کناروں سے چمٹ گئے اور منتظر
ہیں کہ کسی موج حوادث کے "دوچار تھپیڑے" ان کی طرف
بھی آئیں اور وہ "طوفان کا نظارہ "صرف" ساحل" سے
نہ کریں! ـــ اب ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ "ہر کس بخیال
خویش خبطے دارد" والا معاملہ کس نوبت پر پہنچا یا کس نوبت
پر ہے، یہاں ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ اظہار کرنا پڑتا ہے کہ
وقت کے جائز مطالبہ کی طرف بہت کم "درد مندوں"
نے توجہ کی، جدید رجحانات کی نفسیاتی تحلیل، اور غزل و نظم
کے غیر شاعرانہ "اصطلاحی" جھگڑوں آزاد نظم و پابند نظم کی

خرافات میں ہم اس قدر الجھ گئے کہ یادش بخیر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سارا ہندوستان انشار و مصحفی کا لکھنؤ ہے!! کیا تاریخ اس طرح بھی اپنے کو دہراتی ہے! ـــــ ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ جیلوں میں ہمارے بڑے بڑے قائدین کا کیا حشر ہوا، اور نہ اس کی خبر ہے کہ جو بڑے بڑے قائدین آزاد ہیں انھیں کس طرح آزادی کی جنگ میں شریک کیا جا سکتا ہے، ہم میں سے کتنے ایسے ادیب و شاعر ہیں جنھوں نے بنگال کی فاقہ کشی کو ایک محب وطن کی طرح محسوس کیا ہوا ور اپنے ہاتھوں کے لبریز جام پھینک دیئے ہوں، نئے ادب کے پردے میں "لحاف" کے اندر کی گدگدی پیدا کرنے والی باتیں بیان کرنے والے "کالی شلوار" میں گوری گوری جوان بل کھائی ہوئی پنڈلیوں کو دیکھ کر مچل جانے والے، کیا کبھی فاقوں سے مرتے ہوئے لاکھوں مزدور، بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچے، اور معصوم بچوں کو بیچتی ہوئی ان گنت مجبور ماؤں کو نہیں دیکھتے، اسی دنیا میں، اسی ان کی اپنی دنیا میں، ان کے اپنے وطن میں! یہ "ابہام و اشاریت" کی آڑ لے کر اور نئی نئی طرزِ سخن ایجاد کرنے والے کیا اب بھی اپنے حاکم ملک کی کسی حسین عورت کے حسین ہونٹوں سے اپنے وطن کی غلامی کا "انتقام" لے کر ایک عظیم فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں اور اس طرح کہ ان کے جیتے جی، ان کی آنکھوں کے سامنے، ان کے وطن کی لاکھوں بہنیں پیٹ کی خاطر اپنی عصمتیں بیچ رہی ہیں! ہو سکتا ہے کہ یہ "ادب برائے زندگی" ہو لیکن یہ سب کچھ ادب برائے انسانیت تو نہیں!!

یہ اور اسی طرح کے ملے جلے خیالات ہمارے ذہنوں پر بھی طاری رہے! ہم نے سچے خلوص کے ساتھ زمانے کے حالات کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے مقاصد بھی شور، مجاز، جذبی، فیض، ندیم قاسمی، یوسف ظفر، علی سردار جعفری، اور کیفی اعظمی کی طرح معین اور اعلیٰ ہیں، ہم نے "ترقی پسندانہ رجحانات" کو غلط "استعمال" کرنے کی کمی نہیں کی ہے! ـــــ اب آئیے آپ کا تعارف یہاں کے جدید شعراء سے کراؤں، آپ کو اس محفل میں ایسے شعراء بھی نظر آئیں گے جو ادب کے ترقی پسندانہ رجحانات سے غیر شعوری طور پر متاثر ہیں لیکن وہ اس زمانے میں بھی اس "تاثر کو" سمجھنا "نہیں چاہتے! اور آپ کو حیرت ہوگی جب آپ سے کچھ ایسے شاعر بھی ملیں گے جو اب تک قدیم دبستان سخن کے پرستار ہیں، لیکن آپ کو اس وقت یقیناً مسرت ہوگی جب انھیں کے پہلو بہ پہلو ترقی پسند شاعر بھی نظر آئیں گے!!

مخدوم محی الدین ـــــ یہ بکھرے الجھے بال اور متفکر چہرے والا شاعر مخدوم ہے، "سرخ سویرا" کا مصنف، مخدوم کو آپ نے کافی پڑھا اور سنا ہے، یہ اپنی نظموں کی تعداد سے زیادہ مشہور ہیں، بنگال میں جس طرح قاضی نذر الاسلام مقبول ہیں بالکل اسی طرح یہ ہیں محبوب ہیں! نقاد ان کی شاعرانہ جسارتوں اور فنی غلطیوں کی گرفت کرنی چاہتے ہیں لیکن ان کا صالح عمل، خلوص، گہرا مطالعہ اور ان کی گفتگو کا من موہن انداز سب کو خاموش کر دیتا ہے، بہر حال ان کی شاعری ترقی پسندانہ عناصر کی بہترین مثال ہے! ان کی مشہور نظم "استالین" ہے اس کا ایک بند ملاحظہ کیجئے، جو میں سمجھتا ہوں آزاد شاعری کا سب سے اچھا نمونہ ہے۔

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں

کیا مجاہد نہ بنوں ؟
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر
مرے پیارے مرے فردوس بدن کی خاطر
ایسے ہنگام قیامت میں مرا نغمۂ شوق
کیا مرے ہم وطنوں کے دل میں
زندگی اور مسرت بن کر
نہ سما جائے گا ؟
قرۃ العین ! میری جان عزیز
او میرے فرزندو !
برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا!
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا!!

صمد رضوی ساز ــــ یہ ہنستے ہوئے چہرے اور کھوئی کھوئی سی آنکھوں والے صاحب ساز ہیں، یہ اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں نظم نگار فانی تھے! انھیں بھی "زندگی ایک ایسی قید" نظر آتی تھی جس کو "زنجیر بھی درکار نہیں"ــ
لیکن ــــ چناں قحط افتاد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق!
کے تجربے سے یہ بھی گزرے اور جب زندگی کی جد و جہد میں انھیں بھی عملی حصہ لینا پڑا تو تصور میں پھولوں کی آبادی بسانے والے اس شاعر نے اپنے لئے کانٹوں کا بستر بھی قبول کر لیا اور اب ان کی شاعری میں زندگی دلہن کی طرح نہیں مجاہد کی طرح جلوہ گر ہے!! یہ جتنا اچھا لکھتے ہیں اتنا ہی اچھا پڑھتے ہیں، اپنی آواز کی طرح نرم و نازک الفاظ کا استعمال ان کی شاعری کی بے مثل خصوصیت ہے، بہر حال یہ ساز ہیں اور ان کے بغیر محفلیں کچھ سونی اور خاموش سی نظر آتی ہیں

ساز کی نئی نظم "شام صحرا" کے کچھ شعر ملاحظہ کیجئے !
بوڑھے املی بن میں مفلس دہقانوں کی اک وادی
یعنی تمدن کی لعنت تہذیب کی محبانہ بربادی
جھونپڑیاں خس پوش دھوئیں میں لپٹی ہوئی دولت انکی
جن کے عرق پسینے سے رنگیں شہروں کی آبادی
دنیا کے ٹھکرائے ہوئے ادراک و تمنا کب جانیں
بھوکے ننگے جی لیتے ہیں ہے یہی ان کی آزادی
ذہن میں صدیوں کی تاریکی خوں میں پشتوں کی نکبت
ان کے تصور میں بھی نہ آئی موج احساس شادی
کچلے ہوئے جذبات ہیں، مردہ روحیں، دل زندہ لاشیں
جن کا شعور زیست مسلسل محنت اور پھر بربادی

بھوک جہالت غربت پستی کب تک ان پر چھائے گی
شام و سحر کی رنگینی کب تک ان کو بہلائے گی
کب تک رکھے گی پوشیدہ فطرت کوہ و صحرا میں
وہ بجلی جو قصر امارت کی بنیادیں ڈھائے گی
سورج ڈوبا خونیں تارے کھیتوں پر تھراتے ہیں
طوفانوں کی آمد کے آثار سے پائے جاتے ہیں

سکندر علی وجد ــــ حیدرآباد کے ممتاز شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے، ابھی چند دن گزرے "لہو ترنگ" کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہوا ہے، اس کو پڑھنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ جدید خیالات اور کہنہ انداز بیان کا ایک بہت اچھا مرقع ہے، ان کی شاعری کا لہجہ جتنا سخت ہے اتنے ہی یہ ہنس مکھ اور مرنجان مرنج انسان ہیں

شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی اور یہ حقیقت ہے کہ بہترین غزل کہتے ہیں، "فرزند جامعہ عثمانیہ" کے علاوہ "اجنتا" اور "تاج محل" ان کی مشہور نظمیں ہیں، "تاج محل" کا ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

بہزادِ عصر ہیں تری گلکاریوں پہ دنگ
منظر کشِ بہارِ چمن ہے جبینِ سنگ
کلیوں کا وہ نکھار وہ کلہائے رنگ رنگ
فانوسِ شمعِ کشتہ سے لپٹے ہوئے پتنگ
رنگینیاں ہیں جوہرِ اہلِ کمال کی
چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی!

صاحبزادہ میکش ـــــ شادی، ملازمت اور فارغ البالی کس طرح بعض صلاحیتوں کے لئے مضر ہوتے ہیں، اس کا اندازہ میکش کی موجودہ زندگی سے ہوتا ہے، حیدرآباد کی بہت سی تاریخی سیاسی کشمکشوں کا رجزخوان، جوانی اور جوانوں کا شاعر اب وہاں نظر آتا ہے جہاں اس کو نہ ہونا چاہیے اور وہ محفلیں اس سے خالی نظر آتی ہیں جس کے لئے وہ خلق کیا گیا تھا! ـــ دیکھئے میکش نے ہندوستان کے لئے کیا کہا تھا!

اک سسکتا سانس اک ٹوٹا ہوا تارِ رباب
جیسے گہری سوچ میں پچھلے پہر کا ماہتاب ـــ
جیسے باسی پھول کی بو جیسے بہت جھڑ کا گلاب
جیسے دن میں چاند تارے جیسے دریا میں حباب
جیسے دیوانے کی جنت جیسے مفلس کا شباب!
کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں اے ہندوستاں!!

رشید احمد ـــــ بہت اچھے شاعر تھے مگر معلوم نہیں کہاں روپوش ہو گئے نہ رسالوں میں نظر آتے ہیں نہ محفلوں میں! ـــ

ع ہائے بے دردیاں زمانے کی!

کاوش ـــــ کبیر خاں نام ہے لیکن قدرت نے مولنا سہا مجددی کی طرح انھیں "مختصر مفید" بناکر پیدا کیا ہے، چاہے غالب کی شرح نہ کر سکیں مگر شعر خوب کہتے ہیں، انھیں جتنا پستہ قد ملا ہے اتنے ہی یہ بلند خیال و بلند حوصلہ، نظم بھی کہتے ہیں غزل بھی، ادھر کچھ دنوں سے آزاد شاعری بھی شروع کی ہے چونکہ فطرتاً شاعر ہیں اس لئے اس نئے تجربے میں بھی کامیاب ہیں، ان کی غزل کا ایک شعر یاد آرہا ہے!

جو آج میرے مقدر سے ہے حدیثِ خموش
ترے نثار وہی شوخیٔ بیاں تھی کبھی!

علی اشرف ـــــ تعجب ہے کہ انھیں اخبار کی مصروفیتوں سے اتنی اچھی نظمیں کہنے کی کیسے فرصت مل جاتی ہے، کبھی کبھی کہتے ہیں مگر بہت اچھا کہتے ہیں، اور بڑی خوشی اس سے ہوتی ہے کہ زمانے کی نبض پر ان کے ہاتھ ہیں، ان کی نظم "انقلاب" بہت پسند کی گئی جو اس طرح شروع ہوتی ہے ع

ہاں سن کہ اب انقلاب آتا ہے!

سلام اللہ سلام ـــــ فطرت نے بابر کی طرح ان سے بھی اس طرح انتقام لیا کہ یہ بھی اب پولیس میں ملازم ہیں، اور بہت دنوں سے خاموش، لیکن ان کی بہت سی نظمیں بہت دنوں تک یاد رہیں گی!

سلیمان اریب ـــــ جتنا ان کا تخلص عجیب ہے اتنے ہی یہ سیدھے سادے اور "لطیف" ہیں! جس طرح یہ اپنی گفتگو میں محتاط اس سے زیادہ شعر میں بے باک، سوچ کر لکھتے اور لکھنے کے بعد ہمیشہ سوچنے کے لئے تیار رہتے ہیں، بہت زمانے سے انکا کلام چھپتا اور پسند کیا جاتا رہا ہے، محفلوں میں شرکت ابھی شروع کی ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنا ایک خاص

مقام پیدا کر لیا ہے، جواں فکر و جواں سال شاعر ہیں، انھوں نے اپنے متعلق خود لکھا ہے۔

میرے اشعار مرا زمزمہ مرا ساز جواں
آتشِ قلب سے دہکی ہوئی آواز جواں
میرے رہوار جواں سال کے انداز جواں
میری تلوار مری مونس و دمساز جواں
میں بہادر ہوں جوانی ہے پرافشاں ہونا

جمیل احمد ـــــ بہت زمانے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ شاعر بھی ہیں اور اتنے اچھے شاعر ان کا یہ شعر میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔

وہ حسن کیا جو محبت میں سر جھکا نہ سکے
وہ عشق کیا جو سرِ دار مسکرا نہ سکے

محمد علی تیر ـــــ غزل و نظم دونوں کہتے ہیں اور دونوں میں بقدر حوصلہ جوہر دکھائے ہیں، ابھی ابھی یونیورسٹی کی تعلیم ختم کی ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اپنی شاعری کے لئے آئندہ کیا لائحہ عمل بنائیں گے۔

تحسین سروری ـــــ تحسین تخلص ہے اس لئے زمانے سے ناشناسی ان کی شاعری کا مقصد نہیں، بلکہ زمانے کی ناشناسیوں نے انہیں ایک حساس شاعر بنا دیا ہے اپنی شاعری میں غریبوں کی حمایت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ خود غربت میں پلے پڑھے ہیں بلکہ اسے وہ اپنا "فرض" سمجھتے ہیں، ان کی نظم "انتقام" طنز کا بہت اچھا نمونہ ہے، چند شعر سنیئے۔

میرے قبضہ میں اگر نظم جہاں ہو جائے
شب کی ظلمت میں گناہوں کے دیئے جلتے رہیں
مکر کے سانچوں میں سرمایہ کے بت ڈھلتے رہیں
خون آدم سے بجھانے کے لئے پیاس اپنی
جرم آغوش تمدن میں یونہی پلتے رہیں
مرے قبضہ میں اگر نظم جہاں ہو جائے

امیر احمد خسرو ـــــ پہلے یہ محفلوں میں شعر سناتے ہوئے جھجکتے اور شرماتے تھے، مگر اب جب کہ اپنا کلام خود سنانے لگے ہیں تو جھجکتے اور شرماتے ہوئے سناتے ہیں، کبھی کبھی نظم کہہ لیتے ہیں ورنہ ان کی محبوب صنفِ کلام غزل ہے خسرو کا ایک شعر ہے ـــ

مر نہ سکنے کا نام جینا ہے
تہمتِ زندگی اٹھائے جا

یوسف ناظم ـــــ بہت کم عمری میں یونیورسٹی کی تعلیم ختم کی ہے، لیکن کلام کہنہ مشقوں کا سا ہے، نظمیں زیادہ کہتے ہیں جن میں جدید رجحانات جھلکتے ہیں۔

لطیف ساجد ـــــ بہت کمسن، لیکن مستقبل کے ایک ممتاز شاعر یقین ہے کہ یہ اپنا مقام پیدا کریں گے، ابھی چند دن ہوئے ایک غزل سننے میں آئی تھی دو شعر اب تک یاد ہیں ـــ

عشرتِ سال کو تکتے رہیں ٭ دریاؤں کے بہو کے دھارے
راہ کسی کی دیکھ رہا ہوں ٭ ڈوب رہے ہیں چاند ستارے

عزیز احمد، علی احمد ـــــ آپ حضرت فصاحت جنگ بہادر جلیل کے صاحبزادے ہیں، لیکن ان دونوں کو سنے کہنے کی طلب نہیں، اس لئے میخانہ امیران کی منزل نہیں دونوں نظم زیادہ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔

اس لطیف حکایت کو دراز تر گفتم نہ کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ بعض اچھی شاعرات نے بھی معیار سخن کو بلند تر بنایا ہے جن میں قابل ذکر بشیر النساء بیگم، مخفی، لطیف النساء بیگم اور نوشابہ خاتون

وغیرہ ہیں۔ بعض جوان عمر شاعر بھی اپنے اجداد کی میراث سے دور نئے میلانات و رجحانات کے ساتھ افق پر چھا رہے ہیں جن میں قابلِ ذکر مظفرؔ، قتیلؔ، اوجؔ، عظیمؔ، متینؔ، صفاؔ، ناصرؔ سروش اور اثرؔ صدیقی ہیں۔ یہ یقین ہے کہ اس عہد کشاکش میں پروان چڑھنے والے شاعر اپنے کلام سے بزم میں اجالا کریں گے۔

آخر میں حیدرآباد کے تین ممتاز شاعروں کا تذکرہ انتہائی ضروری ہے جو دکنی زبان میں شاعری کرتے ہیں، دہقانیؔ، علی صاحب، اور گھنٹا عوام کے محبوب شاعر ہیں ان کی شاعری آہ ہے، سماج پر ایک طنز ہے، عوام کی زبان میں عوام کے لئے پیام بیداری ترقی پسند ادب کا خاص موضوع ہے، دہقانی اپنی اسی قابلیت کے باعث سارے جنوبی ہند میں اپنی انفرادیت پیدا کرچکا ہے۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد میں یہ کہوں گا کہ شعراء کی اس جمعیت نے اپنے مقدس فرض اور مشن کو فراموش نہیں کیا ہے، انھوں نے وقت کی آواز سنی ہے اور سناتے رہے ہیں، اب وقت آگیا ہے کہ صوبہ واری تعصبات کو ختم کرکے صرف کمالِ فن کی پرستش کی جائے۔

نظر حیدرآبادی

شاد اقبال ۔ اقبالؔ اور شادؔ دونوں کی ہستیاں محتاج تعارف نہیں۔ البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی کہ علامہ اقبالؔ مرحوم اور مہاراجہ یمین السلطنہ کے درمیان پچیس تیس سال تک جو مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے۔

یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اقبالؔ کی زندگی اور کردار کے ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن کے متعلق دوسرے ذرائع سے کوئی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ ان گراں مایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر زورؔ صاحب نے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ شادؔ و اقبالؔ کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔

صفحات (۲۰۰) قیمت ما‌ل عہر

مرہٹی ادب میں ترقی پسندی کی روایات

مرہٹی زبان اور ادب کی بنیاد ہی انقلابی دور میں پڑی ہے جبکہ پہلے پہل مظلوم عوام نے اس خطہ ملک میں ظالم اور لوٹنے کھسوٹنے والے طبقہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ آٹھویں صدی عیسوی کا زمانہ عہد جاگیرداری کا شباب اور غریب کسان اور چھوٹے صنعت پیشہ ایک طرف جاگیرداروں اور راجاؤں کے ظلم اور لوٹ کھسوٹ کا شکار تھے دوسری طرف مذہبی گروہ یا برہمن مذہب کی آڑ میں ان کی جہالت اور توہم پرستی سے فائدہ اٹھا کر انھیں جی بھر کے لوٹتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام نے جگہ جگہ بغاوتوں کے علم بلند کرنے شروع کر دئے۔ عوام کی اس انقلابی جدوجہد میں مرہٹی ادب نے جنم لیا۔ اس زمانے میں ایک طرف چترارنگ چنتامنی تصنیف کی گئی جس میں دو ہزار مذہبی روایات کی تفصیل بیان کرنے میں برہمنوں نے اپنی عقل و فراست ختم کر دی جس میں انھوں نے ہر جگہ اپنی برتری کو واضح کیا ہے۔ عوام کے فرائض میں سب سے زیادہ اہمیت برہمنوں کی خدمت اور خیرات کو دی گئی ہے۔ دوسری طرف سنت گیا نیشور نے عوام کے حقوق کے تحفظ میں اپنی آواز بلند کی اور عوام کی زبان میں عوام کو زندگی کا نیا پیام سنایا اور اس جنت کی بشارت دی جس کا وعدہ بھگوان کرشن نے کیا تھا۔ اور جس میں مرد اور عورتیں۔ شودر اور ویش سب آزاد اور برابر تھے۔ گیانیشور کی اس تصنیف نے نہ صرف عوامی ادب بلکہ خود مرہٹی ادب کی نیاد رکھی۔ باوجودیکہ برہمنوں اور مقامی حکومت نے سنت گیانیشور پر ظلم و تعدی کے پہاڑ توڑے لیکن وہ اس کے پیغام کو عوام سے نہ چھین سکے۔ اس لئے کہ گیانیشور کی آواز عوام کے دل کی آواز تھی۔

اسی کے کچھ زمانہ بعد جبکہ سوسائٹی میں طبقہ واری کشمکش شدید ہو چکی تھی۔ فرقہ بندی اپنے عروج پر تھی مسلمانوں نے حملہ کر دیا اور ان کے نئے اور جمہوری نظام زندگی نے معاشرے کو جڑوں سے ہلا دیا۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد مقامی جاگیرداروں اور راجاؤں نے نئے حملہ آوروں سے صلح کر لی اور مسلمان جو ابتداء جمہوریت کا پیام لائے تھے جو سود خواری کے خلاف تھے۔ جن کے یہاں بیواؤں کی یہ درگت نہ ہوتی تھی۔ اتنے زیادہ محاصل نہیں تھے۔ جہاں تعلیم مذہبی فریضہ تھی۔ اپنی انفرادیت قائم نہ کر سکے۔ وہ آہستہ آہستہ جاگیردار، منصبدار اور وطن دار بننے لگے اور اسلامی حکومت نے بھی جاگیرداری نظام کا قالب اختیار کر لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابتداء جو ان کے ترقی پسندانہ نظام حیات کا اثر عوام پر پڑا تھا وہ زائل ہو گیا۔ عوام کے سامنے اب مسلمان اور برہمن میں کوئی فرق نہ رہا۔ اس لئے کہ اب یہ دونوں یکساں طور پر انھیں لوٹتے تھے۔ اس لوٹ کھسوٹ کے خلاف ذات باہر برہمنوں، جلاہوں، کہاروں، مظلوم عورتوں، درزیوں، موچیوں، تباہ حال تاجروں اور کسانوں نے ہر جگہ صدائے احتجاج بلند کی۔ اور ان نئے حالات میں ایک نئی قسم کی شاعری نے جنم لیا جسے سنت یا بھگتی شاعری کہا جاتا ہے۔ یہ احتجاج کرنے والے پورے ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں تھے ان میں سے کبیر، حرتیو انجیا، ایکناتھ، تکارام، جنا بائی اور چنگ دیو کا تذکرہ کافی ہے۔ مسلمان شعراء نے صوفیانہ شاعری کا رنگ اختیار کیا اور ہندوؤں نے بھگتی اور وشنیوا شاعری کا۔ مرہٹی زبان کے بھگتی شاعر صرف اپنے معبود کی حمد نہیں گاتے تھے بلکہ ان گیتوں میں ہمیں ان عوام کی بپتاؤں کا بھی عکس ملتا ہے جو ڈگ گرتے ہوئے معاشی نظام۔ سودخوار امراء کی باہمی جنگ و جدل اور بڑھتے ہوئے محاصل کے تلے کچلے جا رہے تھے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ سیاسی نقطہ نظر سے اس قدر

صاحب نظر ہو گئے تھے کہ کسی معاشی یا معاشرتی انقلاب کی دعوت دیتے ہوں یا طبقہ واری کش کمش کے خاتمہ کا کوئی پروگرام پیش کرتے ہیں بلکہ وہ اس کا مطالبہ کرتے تھے کہ حکومت چترودا کے قوانین پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے اور ایسے اوتار کی دعا مانگتے تھے جو ملک کو اس تباہ حالی افلاس اور کشمکش سے نجات دلائے۔

کچلے ہوئے عوام کے لئے سنت اور بھگتی شاعری اور شاعر خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ جب حکومت نے غلہ ذخیرہ کرلیا اور عوام بھوک سے مرنے لگے تو داجی نے اپنی ذمہ داری پر تمام اناج تقسیم کردیا اور جب داجی سے جرمانہ مانگا گیا تو ایک انتہائی پست طبقہ کا انسان۔ ایک چمار آگے بڑھ کر جرمانہ ادا کردیتا ہے۔ اور یہ چمار کرشن کے اوتار کا درجہ پاتا ہے۔ اور سارے بھگتی شاعر اس کے گیت گانے لگتے ہیں۔ جانی جنار دھن بیجاپور کا ایک غریب ملازم پیشہ تھا اس نے بھی ایک مرتبہ قحط کے زمانے میں سرکاری غلہ عوام میں تقسیم کردیا۔ حکومت نے اسے موت کی سزا دیدی اور سارے عوام اور ان کے شاعروں کا ہیرو بن گیا۔ یہ بھگتی شاعر عوام میں سے نکلتے تھے۔ عوام کے دلوں کی دھڑکن اپنے سینوں میں محسوس کرتے تھے۔ ان ہی کی طرح سوچتے اور ان ہی کی زبان میں شاعری کرتے اور ان ہی کے گیت گاتے تھے۔ ان کے نزدیک اوتار وہی تھا جو سماج کے مظالم کا خاتمہ کردیتا۔ چترودرما کے معنی اس معاشرتی نظام کے تھے جس میں اس گاؤں کی ساری پیداوار اسی گاؤں کے لوگوں کے استعمال کے لئے ہوتی۔ پیداوار کے صرف ۱/۶ حصہ پر حکومت کا حق ہوتا۔ برہمن کے معنی بڑی بڑی توندیں کھانے والے مویشیوں کے بڑے بڑے گلّے پالنے والے اور غریبوں پر ظلم کرنے والے کے نہیں تھے بلکہ اس کے معنی ایک ایسے غریب انسان کے تحت جو دوسروں کے دماغوں کو نور علم سے منور کرتا اور ان کے ستارے دیکھ کر مستقبل کے بارے میں رہبری کرتا۔ کھتری کا مفہوم ایسے آدمی سے نہیں تھا جو ہر وقت شراب کے نشہ میں چور رہتا اور حسین عورتوں کے جھرمٹ میں رنگ رلیاں منایا کرتا۔ بلکہ جو گاؤں اور وطن کی حفاظت کرتا اور سب سے انصاف برتتا۔ ویش کے معنی ایسے شخص کے نہیں تھے جو دوسروں کے محنتوں کا ثمر لوٹ کر اپنا پیٹ بھرتا بلکہ جو تجارت کے ذریعہ گاؤں کی ضروریات پوری کرتا اور مناسب نفع لیتا۔ سنت اور بھگتی شاعروں کا عقیدہ تھا کہ اس طرح معاشرتی نظام کی اگر اصلاح ہوجائے تو قحط، جنگ، بیرونی حملوں اور تباہ حالی سے نجات مل جائے گی۔ اور واقعی اس وقت کے حالات کے لحاظ سے تمام معاشرتی خرابیوں کا یہی ایک حل تھا خواہ وہ کتنا ہی وقتی کیوں نہ ہو۔ تمام بڑے سنت شعراء نے اپنے پورے ادب اور کویتاؤں میں تمام مظلوم عوام کی طرف سے ان ہی قسم کے جذبات پیش کئے ہیں۔ ان کی بپتاؤں اور مصیبتوں کی داستانیں ان ہی کی زبان میں پیش کی ہیں۔ اور اس طرح مرہٹی ادب کو ابتدا ہی سے عوامی اور ترقی پسند ادب کا بہت بڑا سرمایہ ملا ہے۔ سنت شاعری گو کہ عوام کی کوئی سیاسی رہبری نہ کرسکی اور نہ ہی آئندہ کی کشمکش کے لئے تیار کرسکی تاہم اس نے ایک بہت بڑی معاشرتی ضرورت کو پورا کیا اور اپنے زمانے کے ظلم اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف آواز بلند کی۔ البتہ عوام کی تنظیم کرکے اس میں حرکت پیدا نہ کرسکنے کی وجہ سے کچھ ہی روز بعد ان میں شکست خوردگی۔ ڈر اور لاچارگی کا احساس گھر کر گیا۔ اور اس کی وجہ تھوڑے دن بعد ہی بھگتی شاعری کی جاذبیت بھی ختم ہونے لگی۔ لیکن یہ حالت بھی زیادہ دن تک باقی نہ رہے اور آہستہ آہستہ ایک نئی پود ایک نئی آواز اور ایک نئی جھنکار کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ اسا بھوانی کی جس کا تعلق مرہٹہ کسانوں کے دیوتا کھنڈوبا سے تھا پرستش سب سے زیادہ کی جانے لگی۔ غریب طبقہ میں رام داس کی

تعلیم مقبول ہونے لگی۔ اور ہر طرف رام راج کے قیام کی مانگ بڑھنے لگی اس لئے کہ روایات کے مطابق رام راج میں راجہ اور پرجا میں کوئی بُعد نہ تھا۔ اس راج میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔ کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں شُدر بھی برہمن کے خلاف انصاف چاہ سکتا تھا اور اسے انصاف ملتا تھا۔ رام داس نے رام کو اپنا دیوتا بنایا اور عوام کے خواب نے شیواجی کی شکل اختیار کی جس نے آتے ہی فوراً پرانے محاصل (وطن) منسوخ کر دیے۔ کچلے ہوئے عوام کو آزادی کا پیغام سنایا۔ اس نے قانون بنایا کہ ہر کاشتکار کو زمین ملنی چاہیے۔ مالگزاری پیداوار کے لحاظ سے لیجانی چاہیے پیداوار پر وطن کے نام سے کوئی ٹکس نہ لگانا چاہیے۔ اس لئے عوام میں ایک انقلابی لہر دوڑا دی۔ عوام ہی میں سے نئے نئے فوجی لیڈر پیدا ہونے لگے۔ گریلا لڑائی کے ماہر پیدا ہو گئے۔ یہ گریلا جنگجو سیاسی نقطہ سے کافی بیدار ہوتے تھے۔ یہ عوام میں سے ہوتے اور ان کے لئے ہمیشہ کمربستہ رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سلطنت مغلیہ اور دکن کی جیسی سلطنتوں کے دانت کھٹے کر دئیے تھے۔

ان نئے حالات میں ادیبوں کا کیا مقام تھا؟ سنت شاعری کے پیرو نئے حالات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہ کشمکش بالکلیہ نوجوان کاشتکاروں کے ہاتھ میں تھی اور غریبوں کا خون چوسنے والے وطن داروں کے مفاد کے خلاف تھی اور اس لئے یہ ان برہمنوں کے لئے کسی امید کا پیام نہیں رکھتی تھی جو کہ مرہٹوں کی فتح پر اس کی امید رکھتے تھے کہ وہ اچھی تنخواہیں اور منصب پانے والے قاضیوں کی جگہ لے سکیں گے۔ اور نہ ہی یہ ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کے جاگیرداروں اور زمینداروں کے مفاد کے مطابق تھی یہی وجہ ہے کہ ان سب نے ملکر اس جدوجہد کو ختم کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے مکند اور وامن جیسے شاعر اور ادیبوں نے اس جنگ اور اس کے پیچھے کام کرنے والی انقلابی تحریک اور اس کے لیڈر کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ البتہ خود عوام نے تلوار کے ساتھ کویتا اور گیت کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بڑے بڑے ادیب اور شاعر صرف محلوں اور درباروں کی زینت بن کر رہ گئے۔ یہ نئے نئے انقلابی شاعر نئی نئی کویتا اور گیت لکھنے لگے اور ان سے لاکھوں عوام کے دل گرمانے لگے۔ ایک خاص قسم کے گیت نے جسے پواڑا کہا جاتا ہے اسی زمانے میں جنم لیا جو عوام کی زبان میں عوام کے لئے ہوتا تھا اور جسے ہزاروں کی تعداد میں ایک ساتھ ملکر گایا جاتا تھا۔

یہ نئے شاعر دن بھر تلوار لے کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ میدان کارزار میں رہتے اور شام کو دن بھر کے کارناموں کو نیاؤں کی شکل دیکر اپنے ساتھیوں کے دل گرماتے۔ ان میں اپنے ساتھی بہادروں کے غیر معمولی کارناموں۔ جوانمردی اور ایثار کا تذکرہ ہوتا۔ ان کی مدد سے آگے بڑھنے اور دشمنوں کو شکست دینے کے نئے ولولے اور نئی امنگیں پیدا کی جاتیں۔ اور یہ گیت گاؤں گاؤں پھیل جاتے اور بچے بچے کی زبان پر آجاتے۔ اس لئے کہ یہ ان کی دلی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کی امید دلاتے تھے۔ ان میں سے سب سے اچھے شاعر "اجنن داس" (بے پڑھوں یا عوام کے خادم) کہلاتے تھے۔ یہ عوام میں سے ہوتے تھے۔ زندگی کے حقائق سے باخبر رہتے تھے اور عوام کی جدوجہد سے متاثر ہوکر لکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیدھی سادھی نظموں میں جو جان ہے وہ آج کل کے بڑے بڑے سیاسی ناولوں میں نہیں پائی جاتی۔ ان کا ہیرو شیواجی ان کے لئے ایک شہزادہ نہیں تھا

امیسری میں بیٹھا ہوا مجرا سن رہا ہو بلکہ وہ ان ہی میں سے ہے اور ان ہی کے جیسا ہے۔ تمام سپاہی عوام میں سے ہیں اور عوام کے لئے لڑ رہے ہیں اسی لئے ان کی شاعری میں اتنا اثر اتنا خلوص اور جوش ہے۔

پچاس سال کی کشمکش کے بعد آخر کار مرہٹہ سلطنت قائم ہوگئی اور سلطنت کے قیام کے ساتھ کسان عوام اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوگئے۔ ان کی جتھا بندی ختم ہوگئی۔ اور اس نئے اسٹیٹ میں پھر وہی جاگیردارانہ نظام حاوی ہوگیا۔ کچھ نئے اور کچھ پرانے زمیندار پہلے کی طرح پھر ان کے سر پر مسلط ہوگئے۔ پرانے محاصل اور وطن وغیرہ پھر ان پر عائد کر دیے گئے۔ مجاہد سپاہیوں کی جگہ کرایہ کے سپاہیوں نے لے لی جس میں کچھ مرہٹے اور کچھ باہر کے پٹھان اور دوسری قوموں کے۔ کربلا اور سیاسی نقطۂ نظر سے تربیت یافتہ کسان پیچھے رہ گئے۔ اس تبدیلی کے ساتھ عوام کی شاعری بھی ختم ہوگئی۔ پواڑہ اور اس کی اصل روح بھی ختم ہوگئی۔ گو اس کی ایک شکل ضرور رہ گئی لیکن اس میں زندگی کی وہ تابندگی باقی نہیں رہی اب اس پواڑے میں راگ۔ سُر اور تال داخل ہوگئے۔ اس میں جاگیرداروں اور پیشوا کے قصیدے گائے جانے لگے۔ ظاہر ہے کہ حقیقت اور اصلیت سے دور جو چیز ہوتی ہے اس میں زندگی کہاں ہوسکتی ہے۔

اس دور میں اس نئے پواڑے کے علاوہ ایک نئی قسم کی شاعری نے بھی جنم لیا جو لاؤنی کہلاتی ہے۔ پیشوا کا صدر مقام اور دوسرے شہر ہر طرف جاگیرداروں، سپاہیوں اور تاجروں سے بھرے ہوئے تھے۔ دیہاتی عورتوں کو اپنے سپاہی شوہروں سے برسوں ملنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور انھیں شہر جانے کی بڑی خواہش رہتی تھی۔ یہ نوجوان عورتیں اکثر فوجیوں، امراء اور رؤسا کے ہاتھ پڑ جایا کرتیں اور انھیں شہر پہنچا دیا جاتا اور پیشوا اور امراء کے دربار ان سے بھرے رہتے۔ ہر طرف شراب اور عیش وعشرت کا دور رہتا۔ اور اس دور میں جو شاعری کی جاتی وہ جنسی اور شہوانی خواہشات کو ابھارنے اور عیش وعشرت کو دوبالا کرنے کے لئے ہوتی۔ اسی قسم کی شاعری لاؤنی کہلاتی۔

لاؤنی کے ساتھ ایک قسم کی پنڈت شاعری نے بھی جنم لیا یہ اپنے فارم اور مضمون دونوں کے لحاظ سے سب سے بالکل مختلف تھی۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سنسکرت کے ماہر پنڈتوں کی شاعری تھی اور اس لئے بھگتی اور پواڑے سے بالکل جدا تھی اس لئے کہ ان کا تعلق عوام سے تھا۔ ساتھ ہی چونکہ یہ پنڈت جاگیرداروں اور امراء کی لوٹ کھسوٹ میں تو شرکت کرتے تھے لیکن ان کی رنگ رلیوں اور فحشیات سے الگ رہنا چاہتے تھے اس لئے اپنی شاعری کو لاؤنی کے اثر سے بھی بچائے رکھتے اور وہ قدیم سنسکرت کے رنگ میں شعر گوئی کرتے تھے جو حقائق سے دور اور بالکل بےرس ہوتی تھی جیسے آج کل اردو غزلیں بالکل بےرس ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ ان ہی کے طبقہ تک محدود رہتی تھی۔ غریب وتباہ حال طبقہ وہی پرانے پواڑے بھجن دہراتا تھا اور ان حالات میں عوامی شاعری کا گویا جنازہ نکل گیا تھا۔

اٹھارویں صدی میں ہندوستان کو ایک نئی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ پیشوا کی حکومت زوال پذیر ہونے لگی اور ایک نئی بیرونی حکومت کا اثر واقتدار ملک میں بڑھنے لگا جس کی معاشی زندگی زیادہ ترقی یافتہ تھی جو جاگیردارانہ نظام سے نکل کر سرمایہ دارانہ نظام میں داخل ہوچکی تھی۔ اس نئی برطانوی سرمایہ دارانہ حکومت کے مقابلہ میں

فرسودہ جاگیردارانہ نظام نہ ٹھہر سکا اور اس نے اس ملک کی معاشی بنیادوں کو جڑوں سے ہلا دیا۔ ساتھ ہی ریلیں اور صنعتی کارخانے قائم کر کے ایک نیا طبقہ صنعتی مزدوروں کا پیدا کر دیا۔ اور درمیانی طبقہ میں ایک بیداری پیدا کر دی جس نے بیسویں صدی کے ابتدائی دور کی کشمکش کا آغاز کر دیا۔ یہاں بھی سرمایہ دار طبقہ پیدا ہو گیا جس نے پورے ہندوستان کے ایک قوم ہونے کا نعرہ لگایا اور جمہوریت اور آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ اس دور میں بڑے بڑے رہنماؤں اور ادیبوں مثلاً تلک، رانا ڈے، اگرکر اور چلپونکر نے اس نئی بیداری کو پھیلانے کے لئے نثر کو اپنا آلۂ کار بنایا اور پریس کی مدد سے عوام کو اپنے جھنڈے تلے منظم کرنے کی کوشش شروع کی۔ یہ پہلا گروہ ہے جس نے نثر سے اتنا بڑا کام لیا۔ اسی کے بعد ہری نارائن آپٹے نے "کل تر کیٹھن آلد" نامی ناول لکھ کر ناول کو سیاسی و معاشرتی بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا۔ آپٹے کے اس ناول میں کسان جنتا کی تباہ حالی اور اس کی لوٹ کھسوٹ کا نہایت حقیقی رخ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے دوسرے ناولوں میں ہمارے معاشرتی نظام کی گرتی ہوئی دیواروں کے مختلف رخوں اور درمیانی طبقہ کی معاشی اور معاشرتی کشمکش کی بہت ہی لاجواب تصویریں پیش کی گئی ہیں۔

ہندوستان میں جیسے جیسے سیاسی بیداری بڑھتی گئی اور دنیا کے سرمایہ دارانہ نظام کا اندرونی تضاد بڑھنے لگا۔ کساد بازاری تمام دنیا پر چھانے لگی تو ہندوستان میں بھی ہڑتالوں اور عدم تعاون وغیرہ کی تحریکوں میں تندی پیدا ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی حکومت نے بھی ان کو کچلنے کے لئے سخت تدابیر اختیار کرنی شروع کیں اور تحریر و تقریر پر سخت احتساب لگا دیا۔ لیکن ادیب اس کش کش میں کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ وہ تاریخی واقعات اور مذہبی قصوں کی آڑ میں قومی جد و جہد کی داستانیں بیان کرتے تھے۔ کھاڈلکر کا ناول پرتاب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ اس میں اس دور کے قوم پرستوں کی سرگرمیوں کو پیش کیا گیا تھا۔ اس کے ڈرامہ "کیچک وادھ" میں غیر محسوس طریقہ پر لارڈ کرزن کے عہد حکومت کو پیش کیا گیا ہے۔ کوروؤں اور پانڈوؤں کے قصوں کے رنگ میں اس دور کے مظالم اور قوم پرستوں کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان چند مثالوں کے سوا عام طور پر ادیب ناول نگار اور ڈرامہ نگار غیر معمولی احتساب کی وجہ سے سیاسی مسائل سے زیادہ معاشرتی اور گھریلو مسائل پر توجہ کرتے تھے۔ ملک کا سیاسی اور معاشی ہیجان ان میں زیادہ حرکت پیدا نہ کر سکا۔

سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد ملک میں دو بہت اہم کشمکشیں آئیں۔ ایک سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء کی تحریک سول نافرمانی دوسری سنہ ۳۲-۱۹۳۰ء کی جن میں لاکھوں کسانوں، مزدوروں اور درمیانی طبقہ کے لوگوں نے عملی حصہ لیا۔ اور جنہوں نے سارے ملک میں ہیجان پیدا کر دیا۔ لیکن اس زمانے کے ادیب خاطر خواہ پیمانے پر وقت کی ضروریات کا ساتھ نہ دے سکے۔ سوائے اس کے کہ ناولوں کا رنگ کسی قدر ضرور بدل گیا۔ اس زمانے کے لاکھوں انسانوں کے جذبات و احساسات، ایثار، قربانی اور بہادری کا عکس ہمیں کہیں نہیں ملتا۔ گڈکری، کھاڈیلکر اور کولھاٹکر جیسے ناول نگار اور ادیب بھی وقت کا ساتھ نہ دے سکے۔ صرف پھڑکے کے یہاں نئی سوسائٹی کی جھلک ضرور

ملتی ہے اب اس کے ناولوں میں عورتوں کو بھی سماج میں کچھ جگہ ملنے لگی تھی۔ اب میاں بیوی دن کے وقت بھی گھر میں ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے تھے۔ اب نوجوان تعلیم یافتہ لڑکوں اور لڑکیوں میں محبت کی شادی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کا ادب بھی یہیں آکر رک گیا۔ ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی سیاسی میدان کی کشمکش، قربانیوں اور ایثار کی تصویریں پیش کرنے سے وہ بھی قاصر رہا۔ مزدوروں اور کسانوں کی بیداری۔ ان کی تنظیم اور کشمکش کی تصویریں تو دور کی چیز رہیں۔

۱۹۳۰ء اور اس کے بعد کی عالمگیر کساد بازاری اور سول نافرمانی کی تحریک نے نہ صرف ہندوستان کے درمیانی طبقہ کو ملک کی آزادی کی کش مکش میں ڈھکیل دیا بلکہ اب کسانوں اور صنعتی مزدوروں کا بھی بہت بڑا اور منظم گروہ اس میں حصہ لینے لگا تھا۔ عدم ادائی لگان کی تحریک زوروں پر تھی لاکھوں مزدور ہڑتالوں میں حصہ لے رہے تھے۔ ایسے ہیجانی دور میں مذہبی یا تاریخی تحریریں وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر تھیں اب نئے ادب کو راست اس جدوجہد سے تعلق پیدا کرنا تھا چنانچہ اس وقت کے ادب نے نومت وادیا نئے ادب کا نام اختیار کیا لیکن اس نئے ادب کی آڑ میں جس کا دعویٰ مزدوروں اور کسانوں کے جذبات و احساسات کو پیش کرنا تھا اور ان کی آزادی کی جنگ کو آگے چڑھانا تھا بہت ہی گھٹیا قسم کا جنسی ادب پیش کیا جانے لگا جس میں کہیں کہیں کسانوں اور مزدوروں سے ہمدردی بھی ظاہر کر دی جاتی تھی۔ یہ ادب اجتماعی کش مکش اور خارجی مطالعہ کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ ایسے نوجوانوں کی داخلی کشمکش کا نتیجہ تھا جو آگے تو بڑھنا چاہتے تھے لیکن جمہور کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے تھے۔ جمہور کے متعلق لکھنا تو چاہتے تھے لیکن بغیر ان کی دھڑکن محسوس کئے ہوئے یہ ایسے لوگ تھے جو مزدوروں اور کسانوں کے مطالبات اور ان کی کش مکش کے فلسفہ سے بالکل نابلد تھے۔

خود اردو زبان میں گزشتہ ۸/۱۰ سال سے نئے ادب کا لیبل لگا کر اسی قسم کا بازاری ادب بکثرت ہمارے ہاتھوں میں آ رہا ہے۔ مرہٹی زبان میں پھڑکے۔ کھانڈیکر۔ ڈکھول کر۔ واری کر اور بڈپ وغیرہ چند ادیب ایسے ضرور ہیں جن میں اس کش مکش اور ان نئی قوتوں کو جاننے اور سمجھنے کی خواہش پائی جاتی ہے لیکن صرف ایماندارانہ خواہش سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ یہ لوگ درمیانی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ اس طبقہ کی خاص روایات ہیں۔ انھوں نے بجائے اس کے کہ نئے اور بدلے ہوئے حالات کے سانچے میں اپنے آرٹ کو ڈھالا ہوتا محنت کش طبقہ کو اپنے آرٹ کی طرف لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا نتیجہ انتہائی مضحکہ خیز نکلا ہے۔ پہلے ان کے قصوں اور کہانیوں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مالابار ہل کے اعلیٰ باغیچوں میں عشق و محبت کے پینگ بڑھایا کرتے تھے اور اب ان کی جگہ مزدوروں اور کسانوں کے جھونپڑوں نے لے لی۔ ان کے ہیرو اور ہیروئن چوپاٹی یا جوہو پکنک کر کے اظہار محبت کرتے تھے اب اس کے لئے ہڑتال یا ستیاگرہ کا بندوبست کیا جانے لگا۔ ان محنت کشوں کے اتحاد، طاقت، بیداری، باقاعدہ تنظیم، جوشِ عمل، شاندار مستقبل کی امید، کامیابی کے مصمم ارادے اور قربانی اور ایثار نے ان پر کوئی اثر نہیں کیا اس کی کوئی جھلک ان کی کہانیوں میں نہیں ملتی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جنسی محبت کا وجود نہیں ہونا چاہیئے۔ نہیں یہ چیز تو ضروری ہے لیکن صرف یہی کافی نہیں۔ صرف اسی کو چھانے نہ دینا چاہیے۔ اس کی بہترین مثال ہیں سویٹ ناول نگاروں مثلاً شولوخوف

ایلیا اہرن برک، اور ٹالسٹائی وغیرہ کے ناولوں میں ملتی ہے۔

مرہٹی ادب پر تاریک بادل یورپ میں نازیت کے عروج کے ساتھ اور گہرے ہو گئے۔ بعض ادیب نازیت اور فاشزم کی تعریف اس غلط فہمی میں کرنے لگے کہ یہ ایک مخالف برطانیہ تحریک ہے۔ اگست کے بعد قومی تحریک پر برطانوی حکومت کی ضرب نے ہمارے ادیبوں میں اور بھی ہراسانی پیدا کر دی ہے۔ انھیں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ وہ زندگی کے حقایق سے فرار ہو کر انفرادیت کے خول میں پناہ گزیں ہو گئے ہیں۔ اس تاریکی سے باہر نکلنے کے لئے نہ انھیں خود کوئی راستہ نظر آتا ہے اور نہ وہ دوسروں کو راستہ بتانے کے قابل ہیں ہمارے ادیب رجعت پسند قوتوں اور ترقی پسند قوتوں کی اس کش مکش کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہو گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم عوام کی زندگی اور ان کی سیاست کو جب فنون کے ذریعہ پیش کرتے ہیں تو اظہار کے طریقہ میں ہمیں آرٹ ہی کے قوانین کی پیروی کرنی ہوگی لیکن فن کار اتنی آزادی نہیں لے سکتا کہ ان کی سیاست کی شکل وصورت ہی بدل کر اسے مسخ کر دے۔ فرقہ پرست اور رجعت پسند ادیب ہمیشہ یہی کرتے ہیں اور آج بھی یہی کر رہے ہیں۔ موجودہ جنگ شروع ہونے کے بعد سے اکثر ترقی پسند ادیب بھی انتہائی سرعت سے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے سے قاصر ہو گئے ہیں اور قدیم پرستی کے پردے میں اپنی کوتاہیوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ موجودہ جنگ میں ترقی پسند قوتوں کے مقام۔ فاشزم کی رجعت پسندی۔

ملک کے سیاسی جمود۔ قحط اور غذائی مسائل۔ اور جاپانیوں کے حملے وغیرہ اور ان کے اسباب واثرات کو سمجھنے سے قاصر ہو گئے ہیں اور ان پر ایک ایک جمود اور افسردگی چھا گئی ہے۔

اس اندھیرے میں اب نیا ادب ان لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہے جو اس کش مکش میں عقل وحواس کو گم کئے بغیر حصہ لے رہے ہیں اور جو لوگ مزدوروں کو کسان طبقہ سے اور ان کی تحریکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو یہ جانتے ہیں کہ اس جنگ میں فاشزم کی شکست کے معنی عالمگیر سامراجیت کی شکست کے اور تمام دنیا کے عوام کی آزادی کے ہیں۔ اور جس کے لئے ملک میں قومی اتحاد ضروری ہے۔ غذائی مسئلہ کو سلجھانا ضروری ہے اور جاپانی فاشزم کے خلاف ملک کو منظم کرنا ضروری ہے۔ آج صرف اسی طبقہ سے گرمانے والی نظمیں کہانیاں اور چھوٹے ڈرامے ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ پواڑا جو اٹھارویں صدی میں دفن ہو چکا تھا پھر زندہ ہو گیا ہے۔ اور اس کی مثال ہمارے سامنے اناساٹھے کے پواڑے "اسٹالن گراڈ" کی شکل میں موجود ہے۔ جاپانی بم اور ان کی تباہ کاریاں بنگال اور مدراس کے لئے زندہ حقیقتیں ہیں اور آج وہاں کے ادب میں ان ہی کا تذکرہ سب سے زیادہ ہے۔ قحط اور قومی اتحاد اس خطۂ ملک کے بھی حقیقی مسائل ہیں اور اس عوامی ادب میں بھی مسائل سب سے زیادہ چھائے ہوئے ہیں۔ اس اندھیری دنیا میں صرف یہی ادب ایک امید کی کرن پیدا کئے ہوئے ہے۔

محمد کلیم اللہ

(ماخوذ از Literature And the People by S. A. Dange)

انگارے اور اس کے بعد

سجاد ظہیر، احمد علی اور رشید جہاں کی کہانیوں کا مجموعہ "انگارے" اردو ادب میں ایک نئی آواز تھی جو ایک نئے شعور اور احساس کے ساتھ بلند ہوئی تھی، اس کتاب کی اشاعت نے دنیائے ادب میں ایک تہلکہ مچا دیا، ہر سمت سے شور بپا ہوا کہ چند گستاخوں نے تہذیب و اخلاق پر ایک ضرب لگائی ہے۔ کہا جانے لگا کہ ان کہنی باتیں بھی ان گستاخوں نے منظر عام پر کہی ہیں، ان کہانیوں کے مخالفین نے آداب و تہذیب کے واسطوں سے دہائیاں بلند کیں اور اس مجموعے کو ضبط کرا کے چھوڑا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ "انگارے" ادیبوں کے اس سماجی احساس کا پہلا اظہار تھا کہ وہ زندگی کی تگ و دو میں خاموش تماشائی بھی نہیں ہیں، وہ زندگی کی ناکامیابیوں، بربادیوں اور تباہیوں کو دیکھ کر خاموش گزر نہیں سکتے، بلکہ وہ زندگی کے معالج بھی ہیں، یہی وہ بلند احساس تھا کہ "انگارے" کے لکھنے والوں نے بیمار زندگی کی نبض ڈھونڈی اور دیکھا کہ ہر جگہ تباہی اور گندگی ہے، سماجی و سیاسی زندگی کے کئی گوشے کثافتوں اور عفونتوں کا شکار ہیں، زندگی بے بسی، لاچاری اور پشیمانی کا ایک پشتارہ ہے، اگر اس تخریبی دھارے کو ختم نہ کیا جائے تو حشر تک انسانیت اور انسان کو تباہی کا روگ لگا رہے گا۔ سماجی ذمہ داریوں کے احساس نے انگارے کے مصنفین کی نگاہوں کی زد میں سماجی انتشار اور خرابیوں کو پیش کیا، اور انھوں نے اپنے احساس کی بلند قوت کے ساتھ ان سماجی و سیاسی خرابیوں کو شکر میں لپٹی ہوئی کونین کی طرح، کہانیوں کے دلنشین پیرایہ میں بیان کیا، یہ بیان دراصل اردو ادب میں حقیقت نگاری اور جمہور کی برباد زندگی کا پہلا اظہار تھا، گویا "انگارے" نئے رجحانات اور میلانات کی آئینہ دار پہلی تصنیف ہے۔

"انگارے" کی تصنیف و اشاعت دراصل اس عہدِ اضطراب کی پیداوار ہے جو سیاسی و معاشی بحران کی وجہ سے ساری دنیا میں بپا تھا، یورپ میں جرمنی اپنے اقتدار کے لئے فاشزم کا خونین لبادہ پہنے ہر اس تحریک یا نظام کی تخریب چاہتا تھا جو فاشزم کی ارتقاء میں حائل ہو، اہل فکر و ارباب نظر یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ فاشزم جو سرمایہ داری کی منتہائے عروج حاصل کرلے، ان کی اس مخالفت نے ان پر ایک قیامت توڑی، بلند مقام ادیب اور فن کار اگر فاشزم کی مشین کا پرزہ نہیں بن سکتے تو انھیں جلاوطنی، مقید اور دوسری صعوبتوں کا شکار ہونا پڑتا۔ فاشزم کا بڑھتا ہوا یہ بھیانک سیلاب کسی صاحب فکر کے لئے کسی طرح گوارا نہ ہو سکتا تھا اس کے علاوہ ایک اور محرک بھی کارفرما تھا جس نے ادیبوں کو ایک خاص نصب العین کے تحت اکٹھا ہونے پر مجبور کیا، گزشتہ جنگ کے بطن سے نئے نئے فتنے پیدا ہو رہے تھے، جمہور اپنی آزادی اور انفرادیت کو خطرہ میں پا رہا تھا، یہ وہ حالات تھے کہ یورپ کے ممتاز ادیبوں نے جولائی ۱۹۳۵ء فرانس میں متحدہ طور پر اپنی جماعت بنائی، اس جماعت میں میکسم گورکی، رومین رولان، آندرے مالرو، ٹامس مان وغیرہ جیسے عظیم المرتبت ادیبوں نے شرکت کی، ہندوستان کی نمائندگی مس صوفیہ واڈیا نے کی، ادیبوں کے اس گروہ نے ادب کو زندگی کا محدود، ترجمان اور مسیحا قرار دیا کہ انسانیت اپنی بیچارگی کا علاج کرے اور دنیا کو ایک نوید حاصل ہو سکے تاکہ تخریب کے دھارے اب اپنی روانی جاری نہ رکھ سکیں، یورپ میں مقیم نوجوان ہندوستانی طلبہ ان بدلتے ہوئے حالات اور نئی تحریکات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے، چنانچہ نوجوانوں کا یہ گروہ

جس میں ملک راج انند، سجاد ظہیر، جیوتی گھوش، سنگھ وغیرہ تھے، لندن کے ایک چینی رستوران میں نئے ادبی رجحانات کی پذیرائی اور ترویج پر غور و فکر کرتے رہتے۔ انہی کی کوششوں سے ۱۹۳۵ء میں لندن میں ہندوستانی ادیبوں نے اپنی انجمن بنائی جس کا مقصد یہ تھا کہ ادیب اپنے فن یا ادب کے ذریعہ زندگی کی رہنمائی کریں چونکہ ادب ایک روشن مشعل ہے جو عوام کو تاریکیوں اور گمراہیوں سے بچاتا اور سیدھا راستہ بتلاتا ہے۔

اس کی صدائے بازگشت ۱۹۳۶ء میں ہندستان میں بلند ہوئی اور یہاں بھی ادیبوں نے اپنی انجمن بنائی جس کا نصب العین یہ تھا کہ ایسا صالح ادب پیش کیا جائے جو زندگی کا غمخوار اور بیمار زندگی کا مسیحا ہو، نیز ان رجعت پسند اور مرتی ہوئی قوتوں کو ختم کیا جائے جو عوام کی ترقی و آزادی کے آڑے ہوں۔

اس گروہ میں زیادہ تر ملک کے نوجوان ادیب شریک تھے جو یہ محسوس کرتے تھے کہ ادب کا کام محض نشاط آرائی یا انبساط افزائی نہیں، سماج کے بیمار کا علاج اور ہزاروں کوتاہیوں اور مجبوریوں کا انسداد ادیب کا مقدس فرض ہے، چنانچہ ادیبوں نے اسی مقصد کے پیش نظر لکھنا شروع کیا، یہ نئی تحریر رسم و رواج کی پابند دنیا میں بغاوت اور انقلاب تصور کیجانے لگی، ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک مخالفت کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں، ایک شور بلند ہوا کہ یہ ادب جو نوجوان ادیب پیش کر رہے ہیں، تہذیب و آداب کی دھجیاں اڑا رہا ہے، ان باغیوں نے انہیں تک ہی اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ انھوں نے زبان اور اسلوب بیان کی بنیادیں بھی ہلادی ہیں، یہ تبدیلیاں دراصل اس احساس کا نتیجہ تھیں کہ زندگی کے تمام گوشے جو اصلاح طلب ہیں، منظر عام پر تبلائے جائیں

اور ان میں جو خرابیاں ہیں انھیں ختم کیا جائے، ادیبوں نے عوام سے رشتہ جوڑنے کے لئے ادب میں صنعت گری اور الفاظ کے طلسم کے بجائے واقعیت اور حقیقت پیدا کرنے کی کوشش کی، چنانچہ انھوں نے اپنے مسلک کے لئے مخالفتوں کی پرواہ کئے بغیر زبان اور انداز بیان کی پابندیوں کی پرواہ نہ کی اور کہتے چلے گئے چونکہ

نالہ پابند نَے نہیں ہے

واقعات کی اسی رفتار میں ادیبوں نے اپنے مطالعہ کے دوران میں یہ محسوس کیا کہ انقلاب روس نے روسی ادب کی دنیا ہی بدل دی ہے، روسی ادب انسانیت کا گہرا رفیق اور ترقی کا پیامبر ہے، وہاں کے ادیب خیالوں کے طلسم و سحر میں گرفتار داستان امیر حمزہ و فسانہ الف لیلیٰ کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہیں، ان کا موضوع سخن روزمرہ کی زندگی ہے، اس ادب نے ہمارے ادیبوں میں بھی ایک نیا شعور پیدا کیا، اسی شعور کا یہ نتیجہ تھا کہ واقعیت نگاری اور حقیقت پسندی نے ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا، ادب میں اظہار بیان اور انداز فکر میں نئے تجربے ہوئے اور نئی راہیں نکلیں، چنانچہ اس کش کش میں نئے ادب کی تخلیق ہوئی، چند مٹھی بھر ادیبوں کے شعور نے قبول عام حاصل کیا اور ملک میں ان گنت ادیبوں نے اپنے فرض کو محسوس کیا۔

اب " انگارے " کی بجھی ہوئی چنگاریاں دہکتا ہوا شعلہ بن گئیں، جوش نے شعرا و ر ترنم کو آواز دی کہ ملک کی تقدیر بدلنے میں تمہارا پیش پیش رہنا لازمی ہے، شعر شبستانوں میں گونجنے یا گلوئے زہرہ کی آواز سننے کے لئے

ہی نہیں تخلیق کیا گیا ہے بلکہ ملک کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی فلاح کا پیامبر بھی ہے، ناولوں نے پراسرار رموز و نکات کے بجائے ملک کے سیاسی و سماجی مسائل کے لئے جگہ چھوڑی، پریم چند کے ناول، انسان دوستی اور انسانیت پرستی کا اظہار ہیں، ان ناولوں کے کردار واقعی دنیا میں بستے ہیں، ساتویں آسمان میں نہ یہ پرواز کر سکتے ہیں اور نہ انھیں تخت سلیمانی اور نہ مقدس عصا حاصل ہے۔ لاچار زندگی کے مجبور انسان اپنی کمزور طاقت کو سمیٹ کر تباہیوں کی مخالف قوت پر وار کرنا چاہتے ہیں، افسانوں میں سے جن، بھوت اور پریاں ڈر کر بھاگ چکے اور انسانوں کو اپنی جگہ دی، ان کے مسائل کہ افسانوں کا موضوع قرار پائے، اندر سبھا، اور شیریں فرہاد کے ڈراموں نے زندگی کی ناانصافیوں کی دکھ درد بھری داستان کو اپنا جائزہ دیا۔ غرض ادب کے ہر شعبے میں ایک انقلاب آیا، ادب زندگی سے قریب اور زندگی ادب میں حلول کر گئی۔ ادیب نے سماجی ذمہ داریوں کو محسوس کیا کہ زندگی کا یہ قافلہ اب تاریکیوں میں بھٹکتا نہیں پھر سکتا۔ اس دنیا میں ایک نیا نظام قائم ہو کر رہے گا جس میں آسودگی اور چین نصیب ہوگا۔

وہ رسوائے زمانہ "انگارے" جس کی حیات کو اس کی ضبطی نے خطرہ میں ڈال رکھا تھا، آج جاوداں ہو چکی ہے۔ "انگارے" کے بعد ہمارے ادیبوں کی آتشیں تحریروں نے سماج کی معاشرتی و سیاسی خرابیوں کے پردے چاک کئے اور ان خرابیوں کا انسداد کیا، بات یہیں تک رکی نہ رہی بلکہ ان ادیبوں نے قدامت اور اور فرسودگیوں سے جنگ کرتے ہوئے ایک نئی دنیا کی تخلیق بھی کی، یہ نئی دنیا، جمہور کے لئے مسرت اور شادمانی کا پیام لا رہی ہے ادب میں اس نئی تبدیلی نے زندگی کی جو خدمت کی ہے اور درد بھری انسانیت کو جو سکھ پہونچایا ہے، یہ "انگارے" کے مصنفین کا رجحان یا میلان ہی ہے جو آج ملک کے سارے ادیبوں میں پیدا ہو چکا ہے" ان دس بارہ سالوں میں ہمارے ادب میں وہی روح دوڑ رہی ہے جو "انگارے" میں دوڑتی پھری، مخالف قدرتیں اور قوتیں بھی اپنی ترکش کے تمام تیر چلا چلا کر مایوس و پشیمان ہیں اس نئے ادب کی سمت سمٹی چلی آ رہی ہیں، آج جب کہ اس ہیبت ناک جنگ نے زندگی کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے ادیب تاریکیوں کے خلاف عوام کو برسرِ پیکار کر رہے ہیں اور انھیں اس تجلی کا نشان دے رہے ہیں جس سے انسانیت آسودگی حاصل کر سکے، وہ اس معرکہ بیم و رجا میں اپنا تاریخی فرض انجام دے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا فتنوں سے بچی رہے، زندگی کی تباہی و بربادی کی غمگساری ہی ان کا مدعا نہیں رہا بلکہ ان ادیبوں نے مستقبل کی خدمت بھی کی ہے، اس نئے رجحان اور میلان ہی بدولت ادب اپنا مقدس اور تاریخی فرض انجام دے رہا ہے، یہی رسوائے زمانہ اور ہدفِ طنز و اعتراض "نیا ادب" ہے جس نے زندگی کا علاج کیا، دکھ درد میں غمگساری کی اور زندگی کے اس کاروان کو منزل کی راہ دکھلائی اور رہنمائی کر رہا ہے، زمانہ "جدید ادب" کی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکتا، مستقبل کا مورخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گا کہ دو جنگوں کے درمیان تاریکیوں اور بربادیوں کے اس دور میں ادیبوں نے معاشرے کی جو خدمات انجام دی ہیں، ابد الآباد سے لے کر اب تک کبھی ادا نہیں کی گئی ہیں۔ ہدفِ ملامت "انگارے" اور اس کے بعد کی تصانیف ہی ہیں جن سے زندگی نے فیضان حاصل کیا ہے۔

میر عابد علیخاں

جدید ترین تعلیم کا نصاب جدید تر

شیخ سعدی کا قول ہے کہ:۔

بے علم نہ تواں خدا را شناخت

اس مصرع کو سمجھنے کے لئے فارسی داں کی ضرورت ہے۔ مگر اس خدا کو جس کا ذکر شیخ صاحب نے فرمایا ہے اس کو سمجھنے کے لئے اندھی اور ایسی کوشش کی ضرورت ہے جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔ اور یہ کوشش ایسے دل سے نکلے جو حصول نتائج کی ناامیدی کے خیال سے بے نیاز ہو — لہذا ایسے پیچیدہ مسائل ایسی مشکل تعلیم اور ان دونوں سے زیادہ پرپیچ علم عام آدمی کے بس کا ہے اور نہ ہی ان سے اس کو کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ علم جو مروجہ ہیں ان کے حصول میں انسان کی آدھی عمر صرف ہو جاتی ہے اور باقیماندہ کا نصف جزو نصف اول کی کامیابیوں کے حاصل کرنے کی روز و شبینہ کی کوششوں کی وجہ سے کم ہو جاتا ہے۔ بقیہ ایک چوتھائی جو بچ رہتا ہے وہ تلاش ملازمت میں گزر جاتا ہے۔ یعنی مختصراً جب آدمی علم کی روشنی سے منور ہو کر اپنی محنتوں کا پھل حاصل کرنے کے درجہ میں قدم رکھتا ہے تو اس وقت موت کے فرشتے اس کو اس دنیا سے کھینچ کر لے جاتے ہیں اور اس طرح علم سے جو روشنی انسان کے دل و دماغ کو روشن کرتی ہے اس سے انسان کو اس لئے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کہ اس موقع پر روح اور جسم کا تعلق قائم نہیں رہتا۔ قبر کی گہرائیوں میں یا چتا کی آگ کے نیچے عالم اور جاہل ہر دو کی ہڈیاں کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں پھر ایسے علم سے مقصد!

یا تو دنیا کا یہ نظام بدل دیا جائے تاکہ علم حاصل کرتے ہی عالم کی قدر ہو یا پھر علم ہی تبدیل کر دیا جانا چاہیے۔ اور اس کے بجائے ایسے علم کو جگہ ملنی چاہیے۔

۱۔ جو مختصر ہو ۲۔ جو عام فہم ہو ۳۔ جو زندگی میں دل و دماغ کو اپنی روشنی سے منور کرنے کے علاوہ سود مند ثابت ہو سکے۔ ۴۔ جس کا اطلاق عام زندگی میں ہو سکے۔ ۵۔ جس پر انگلی رکھ کر یہ کہا جا سکے کہ "مجھے یہ معلوم ہے"۔

پرانے بزرگ ہمیشہ مڈل پاس یا میٹرک فیل ہوتے تھے۔ اس پر بھی ان کا خیال ہے کہ وہ آج کل کے نوجوان عالموں سے زیادہ سمجھ رکھتے ہیں۔ موجودہ تعلیم کو وہ کھیل سمجھتے ہیں۔ موجودہ طالب علموں کو وہ فیشن پرست اور ان کے مدرسین اور پروفیسروں کو لفنگے۔ موجودہ عالم پرانے لوگوں کو جاہل گردانتے ہیں مگر دونوں تعلیم عام انسان کی نہایت عام زندگی کے لئے موزوں نہیں۔ اسی لئے مندرجہ ذیل نصاب میں علم کو عام فہم اور کارآمد قسم کا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

علم تاریخ:۔ اس سے مراد کسی ماہ کی کوئی تاریخ نہیں بلکہ جہاں تک ایسی گزشتہ تاریخوں کے متعلق مواد معلوم ہوا ہے اور گزرے ہوئے تمام ایام میں جو کچھ واقعات ہو چکے ہیں ان کی تفصیل چاہے یہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ عام طور پر اس میں بادشاہوں اور ملکوں کا حال ہوتا ہے۔

گوتم بدھ:۔ ایک خوبصورت انسان تھے مگر بھر خوراک کم ملنے کی وجہ سے بہت دبلے ہو گئے تھے۔ حیوانوں کے بہت دوست تھے کہتے ہیں کہ جنگلوں میں انھوں نے اپنی قابلیت کی وجہ سے بہت سے جانوروں کی بولیاں سیکھ لی تھیں۔

اگر یہ آج کل زندہ ہوتے تو کسی سرکس کے مالک ہوتے۔

کیوں مشہور ہیں؟ اپنی تعلیم کی وجہ سے۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ سب خواہشات کو مار دینے سے مکتی حاصل ہو سکتی ہے۔

تنقید:- یہ استدلال غلط ہے کیونکہ سب خواہشات کو مار دینے کی خواہش تو دل میں پھر بھی رہ جاتی ہے۔ مکتی کیا ہے؟ ہندی یا سنسکرت کا ایک لفظ۔ اسے بھلا دو کیونکہ یہ تاریخ نہیں ہے۔

رامائن:- رام، اجودھیا کے راجہ دسرتھ کے بیٹے تھے باپ نے بن باس کا حکم دیا۔ یہ اپنی بیوی سیتا اور بھائی لکشمن کے ساتھ چودہ برس تک جنگلوں میں رہے۔ راون کو شکست دی اور پھر واپس آ گئے۔

مہابھارت:- رشتہ دار راجہ کوروا ور پانڈو کی جنگ کا حال۔

۱۔ اشوک اعظم ۲۔ سکندر اعظم ۳۔ ہرش وردھن اعظم ۴۔ اکبر اعظم ۵۔ شہنشاہ اعظم ۶۔ قائد اعظم | ان کا پیشہ حکمرانی تھا اور ہے ان کو سب ضروریات زندگی اور عیش و عشرت کے سامان حاصل تھے

۷۔ شاعر اعظم ۸۔ مرزا احمد اعظم وغیرہ اور ہیں اسی لئے یہ اعظم کہلاتے ہیں۔

گاندھی اور جناح:- کالے آدمی۔ ان میں مناسبت۔

(۱) ان کا تیلاپن جو ہندوستان کے بھوکوں کی سند ہے۔

(۲) ان کے بولنے کی خوبی۔

(۳) ان کے لکھنے کی خوبیاں۔

(۴) ان کی ڈگریاں۔

(۵) ایک ہی ملک میں پیدائش۔

(۶) دونوں اردو اچھی طرح نہیں جانتے۔

ان میں اختلاف:-

۱۔ گاندھی اکثر و بیشتر جیل میں نظر آتے ہیں اور جناح بیرون جیل یا عدالتوں میں۔

۲۔ گاندھی نیچ قوموں کے ابھار کی پیروی کرتے ہیں اور جناح اونچے مقدموں میں فریقین کے ابھرے ہوئے جیبوں کو نیچا کرتے ہوئے اپنے موکلوں کی پیروی کرتے ہیں۔

۳۔ گاندھی عینک پوش مگر لباس پوش نہیں۔ جناح لباس پوش ہیں مگر عینک پوش نہیں۔

علم جغرافیہ:- دنیا گول ہے۔ کیوں گول ہے؟ ایک بڑی بھینس کے سینگ پر جس کی مونچھیں ہمالیہ پربت سے زیادہ اونچی ہیں (جن کو اس نظریہ سے اختلاف ہو وہ اس کو رد کرنے کی کوشش کریں)

دنیا دو حصوں میں تقسیم ہے۔ کالوں اور گوروں میں۔ گورے کالوں پر حکومت کرتے ہیں مگر ماہران فن ورنگت کا خیال ہے کہ بہت جلد کالے کالوں پر حکومت کریں گے اور گورے اگر آپس کی جنگ سے بچ رہے تو اپنے اپنے ملکوں میں چلے جائیں گے۔

ہندوستان:- دنیا کا ایک حصہ ہے جہاں بہت سے کالے بہت بری طرح رہتے ہیں مثلاً گاندھی جیسے پہننے کو کپڑا اور کھانے کو روٹی میسر نہیں۔ یہ باشندے محکوم ہیں گورے کے جوکیک کھاتے ہیں، وسکی اور تمباکو پیتے ہیں اور خاکی کپڑا پہنتے ہیں۔ ان لوگوں کو مچھر نہیں کاٹ سکتا یہ مچھردانوں میں رہتے ہیں۔

پاکستان:- ابھی خیالی جغرافیہ ہے کہتے ہیں اگر یہ صحیح سلامت زمین پر اتر آیا تو اس میں پاک چیزیں بہت ہوں گی۔ آدمی، آب و ہوا، علم، مذہب، دودھ، گوشت، عقل، عورتیں، سپاری وغیرہ وغیرہ۔

ناپاکستان:- پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد جو حصہ ہندوستان کا بچ رہے گا وہ ناپاکستان کہلائے گا۔ چونکہ سب پاک

آب وہوا علم وغیرہ پاکستان کھینچ لے گا اس لئے اس میں صرف کثافت ہی کثافت رہ جائے گی۔

کتابستان:۔ ایک بھٹی ہے جس میں سے گرما گرم اور سخت سخت کتابیں نکلتی ہیں۔

حبش:۔ بہت ہی کالے لوگوں کا ملک۔ اس کے شہنشاہ کو نیگس کہتے ہیں۔ نیگس "ناگ" سے نکلا ہے ناگ سنسکرت میں سانپ کو کہتے ہیں اور سانپ اکثر کالا ہوتا ہے لہذا شہنشاہ حبش کو نیگس کہتے ہیں۔

اس ملک میں حبشی رہتے ہیں۔ گورے اطالوں نے اس پر کچھ عرصہ تک قبضہ جمائے رکھا مگر اب انگریزوں نے پھر نیگس کو حبش میں رہنے کی اجازت دیدی ہے۔ حبش میں جو اطالوی سپاہی گرفتار ہوئے تھے وہ آج کل ہندوستان میں فروکش ہیں کیونکہ یہ گرم ملک میں رہنے کے عادی ہوگئے ہیں۔

جاپان:۔ "چڑھتے سورج" کی روشنی اس ملک کے باشندوں کو راس نہیں آئی ؎

اے روشنی مہر تو برمن بلا شُدی

یونان:۔ یہاں جرمن فوجی رہتے ہیں۔

فرانس:۔ یہاں انگریز اور جرمن باری باری گولا باری کرتے ہیں۔

امریکہ:۔ یہاں کے باشندے بت پرست ہیں۔ ان کے دیوتا کا نام حضرت ڈالر ہے۔ یہ سترہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئے اور اب تک زندہ ہیں۔ یہ اپنے پرستاروں کو الو کھے روپوں میں درشن کرتے ہیں بعض دفعہ بالکل کاغذی پیراہن میں اور بعض دفعہ دہات میں ڈھل کر۔ امریکی ان کو مندروں میں نہیں رکھتے بلکہ یا تو کوٹ کی اندرونی جیبوں میں رکھتے ہیں یا مقفل فولاد کی الماریوں میں۔

انگلستان:۔ یہاں کے باشندوں کو بدہضمی کی آج کل بہت شکایت ہے۔ امریکی اور روسی ڈاکٹر علاج کر رہے ہیں قدرے افاقہ ہے۔

جرمنی:۔ ہوا پیٹ میں بھر جانے کی وجہ سے گوئرنگ پھول کر کپا ہو رہا تھا۔ انگریز، امریکی اور روسی جراح بڑی احتیاط سے اس ہوا کو خارج کر رہے ہیں۔

ایران:۔ رستم و سہراب کی وجہ سے نہیں بلکہ تیل کے چشموں کی وجہ سے مشہور ہے۔

موجودہ زمانے کی چند قابلِ ذکر ایجادیں

موٹر:۔ تیل اور پٹرول نہ ہونے کی صورت میں نہیں چل سکتی۔

ہوائی جہاز:۔ دشمن کے ملکوں پر اڑتے ہیں۔ ان پر گولا بارود وغیرہ لاد کر دشمن کے ملکوں کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ مگر چونکہ موجودہ زمانہ میں وقت کی بہت قدر ہے اس لئے یہ سامان دشمن کے زیادہ سے زیادہ آباد حصوں میں اوپر ہی سے پھینک دیا جاتا ہے تاکہ ہوائی جہازوں کو اترنے اڑنے میں وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔ دشمن کو سامان کے وصول ہوجانے کی رسید دینے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ ملک جس سے سامان روانہ کیا جاتا ہے خود ذریعہ ریڈیو دنیا کو اس امر کی خبر دیتے ہیں تاکہ وقت ضرورت سند رہے۔

ریڈیو:۔ بجلی کا ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ ہر ایک ملک اپنی خوبیوں اور اپنے مخالفین کی برائیوں کو بڑھا چڑھا کر بولتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی گانے بھی سنائے جاتے ہیں۔

جہاز :- دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک جو سطح سمندر پر نظر آتے ہیں دوسرے جو پانی کے اندر مچھلیوں کی طرح پھرتے ہیں مگر ان کی خوبی یہ ہے کہ جلد یا بدیر ہر دو ایسا ڈوبتے ہیں کہ پھر کبھی نظر نہیں آتے اس طرح سمندر کی تہہ میں کروڑوں من لوہا اور فولاد جمع ہو رہا ہے جب سمندر خشکی میں اور خشکی سمندر میں تبدیل ہو جائیں گے تو اس وقت خشکی پر بہت سے جہاز بنے بنائے ملیں گے جن کو مثل وغیرہ دے کر اور پہیے لگا کر سواری کے کام میں لایا جائے گا۔

(نوٹ۔ ملحوظ رہے کہ ان کے لئے سڑکیں چوڑی ہونی لازمی ہوں گی)

تارپیڈو :- دیکھنے میں ایک لمبوتری وضع کی خوبصورت چیز جو ملائم اور شاعری کی طرح خوب صورت ہوتی ہے۔ اس کے شروع کے بول ہیں۔

شرررررررررر ٹھک ——— پھٹ

حشر :- جس چیز کو یہ لگے وہ آن واحد میں سمندر کی تہہ تک پہنچنے کی کارروائی شروع کرے۔

ہوامار توپ :- اسم بامسمی۔ اکثر ہوا کو نشانہ بناتی ہے۔ ہوائی جہاز تو صاف بچ جاتا ہے مگر گولہ جو چھوڑا جاتا ہے وہ واپس زمین پر آکر اپنے آدمیوں کو ہلاک کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

اے۔آر۔پی :- یہ کوئی چیز نہیں بلکہ ایک نئے محکمہ کی ایجاد ہے کہتے ہیں کہ اس محکمہ میں کام کرنے والوں کی خوراک انڈا، روٹی، پلاؤ ہے۔ اسی لئے اس محکمہ کا نام بھی مذکورہ بالا اشیاء کے حرفوں سے مل کر بنا ہے۔

یہ بہت اچھا محکمہ ہے۔ اس میں مختلف کھیلیں کھیلے جاتے ہیں۔ مثلاً بعض اوقات تمام حکام محکمہ دو ٹیموں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ ایک ٹیم کسی گھر میں جا کر تیل وغیرہ چھڑک کر آگ لگا دیتی ہے۔ پھر دوسری ٹیم والے فولادی ٹوپیاں پہن کر بالٹیاں۔ پمپ وغیرہ لے کر آتے ہیں اور جلدی جلدی آگ بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کھیل میں جیت اکثر آگ لگانے والی ٹیم ہی کی رہتی ہے جب آگ اپنا کام کر کے بجھ جاتی ہے۔ تو دیکھنے والے خوب تالیاں بجاتے ہیں۔ مظاہرے کرنے والے اپنے اپنے کمروں میں جا کر انڈا، روٹی، پلاؤ کھانا شروع کر دیتے ہیں تاکہ ان کی ہمت اور طاقت گھٹنے نہ پائے بعض اوقات انہی حکام میں سے بعض مردہ بن کر لیٹ جاتے ہیں۔ بعض آ کر ان کو خاص طریقے سے اٹھا کر مرہم پٹی وغیرہ کرنا شروع کر دیتے ہیں اور مرہم پٹی کے بعد پھر وہی انڈا، روٹی، پلاؤ پیٹ میں منتقل کرنے کی کارروائی!

کہتے ہیں کہ جنگ ختم ہونے پر متعدد حکومتیں اس محکمہ کے لوگوں کو اس مضمون کا حکم دیں گی۔ "اے۔آر۔پی" یعنی "اپنا راستہ پکڑو" اس پر یہ محکمہ منتشر ہو جائے گا۔ مگر اس وقت تک ان لوگوں کے پیٹوں میں اس قدر مقدار انڈا، روٹی، پلاؤ کی پہنچ چکی ہوگی کہ باقیماندہ زندگی میں ان کو کبھی بھوک نہ لگے گی۔

علم ریاضی :- اس میں ہندسوں وغیرہ کو گننا ہوتا ہے۔ ایک سے ہزار تک گنتی کافی ہے۔ کیونکہ عام ہندوستانی کو اس سے بڑی رقم سے واسطہ ہی نہیں پڑتا۔

جمع اُس کو کہتے ہیں مثلاً ایک اور ایک کو اکٹھا کیا جائے تو وہ دو ہو جاتے ہیں۔ مگر بعض ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ ایک اور ایک کو اکٹھا رکھنے کے باوجود حاصل صرف ایک ہی رہ جاتا ہے۔ مثالیں

۱۔ مرغی ذبح کر کے ہانڈی میں پکانے کے لئے ڈالتے وقت

اس کی ٹانگوں کی تعداد ایک جمع ایک یعنی دو عدد ہوتی ہے مگر پکنے کے بعد جب نکالی جائے تو صرف ایک ہی ٹانگ نظر آئے گی. اگر باورچی چالاک ہو تو دوسری ٹانگ کی ہڈی ضرور قاب میں موجود رہے گی۔

۲۔ اگر کسی بڑے عہدہ دار سے ملنے جاتے وقت آپ اپنی جیب میں "ایک جمع ایک" یعنی دو روپیے ڈال کر ساتھ لیتے جائیں تو چپراسی کی نظرِ عنایت حاصل کرنے کے بعد جب آپ اپنی جیب کو محسوس کریں تو صرف ایک روپیہ باقی رہ جائے گا۔ بعض اوقات ایک جمع ایک تین بھی ہو جاتے ہیں مثال

۱۔ شادی کے بعد میاں بیوی کو اگر جمع کیا جائے تو جملہ تعداد دو ہوتی ہے مگر یہ تعداد ہموطن ہندیوں کی حد تک عموماً اور اگر ان کا مشغلہ بیکاری ہو تو خصوصاً نو ماہ کے اندر اندر کم از کم تین تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ تیسرا عدد عالم غیب سے وجود میں آتا ہے۔ کچھ رونے چلانے کی آوازیں آتی ہیں۔ رفقا کا ہجوم ہوتا ہے اور ان واحد میں دو کی تعداد تین میں منتقل ہو جاتی ہے۔ محکمہ اعداد و شمار والوں کو اگر پتہ چل جائے تو وہ اپنے پیدائش کے کتابچہ میں ایک نفر کا اضافہ کر لیتے ہیں۔

تفریق:۔ کسی چیز میں سے کسی چیز کے نکال لینے کو کہتے ہیں۔ اس سے بوجھ ہلکا ہوتا ہے مگر دل بیٹھ جاتا ہے۔ یہ کارروائی اکثر دفتروں میں تنخواہ تقسیم ہونے وقت شروع ہوتی ہے۔ بیوہ فنڈ، جنگی فنڈ، پنشن فنڈ، فیس فنڈ، بیمہ فنڈ غربا فنڈ، فنڈ یتیماں، فنڈ سرخ صلیب، فنڈ چپراسیاں، فنڈ بینائی وکریاں، فنڈ عصرانہ برائے عہدہ داران محکمہ ہذا وغیرہ وغیرہ ان فنڈوں میں رقم جمع ہو جانے کے بعد بوجھ یقیناً ہلکا ہو جاتا ہے۔ مگر باوجود اس ہلکے پن کے دل کسی بوجھ سے بیٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ تفریق اس کو بھی کہتے ہیں جو جذبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں موجود ہے یا پھر اس کو جو فصل پکنے پر کاشتکاروں کے سر پر زمیندار کے کارندے یا دوسرے زمینداروں کے موجود ہو جانے سے عمل میں آئے۔

سود:۔ گُر (۱) [ضرورت زر + ضرورت زر + ضرورت زر]

احتیاجات [کمی وسائل + افزائی کنبہ + گرانی اشیاء] جنگ

= (بنیے کی دوکان / حاجت مند انسان) = ادائیگی فرضہ احتیاجات

= (شلوار پوش پٹھان / حاجت مند انسان) = ضربات ڈنڈہ برسر حاجت مند انسان

= قرقی مکان و تباہی خاندان

چند زبانی سوالات مع جوابات۔

۱۔ ایک مزدور جس کام کے کسی حصہ کو ۲ گھنٹہ میں مکمل کر سکتا ہے اس حصہ کے لئے حکومت نے تین روپے دینا منظور کیا ہے۔ ایک ٹھیکہ دار ٹھیکہ حاصل کرکے چند مزدور کام پر لگاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مزدور دن میں بارہ گھنٹے کام کرتا ہے بتاؤ ہر ایک مزدور کی مزدوری یومیہ کیا ہوگی۔

جواب۔ زیادہ سے زیادہ چھ آنے۔

۲۔ سوال۔ آدمی کے پاجامے کو سوا دو گز لٹھا لگتا ہے۔ بتاؤ دو پاجاموں کے لئے کتنا لٹھا درکار ہوگا؟

جواب۔ چار گز کیونکہ آدھ گز درزی کھائے گا۔ اور پاجامے ذرا چھوٹے اور تنگ سیئے گا مگر اس سے تکلیف پہننے والے کو ہوگی سینے والے کو نہیں۔

جدید ترین نصاب کے یہ چند نمونے اوپر درج کر دیئے گئے ہیں۔ اگر پسند آئے تو دیگر مضامین کو بھی عام فہم بنانے کی کوشش کی جائیگی۔ **بہارت خیدمنہ**

ایک سوال

آپ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جس نے شادی سے پہلے کسی دوسری عورت سے محبت کی ہو؟۔ آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ میں آپ کا شریک راز بننا نہیں چاہتا۔ مجھے یاد آیا کہ مجھ سے کسی موقع پر ایک لڑکی نے یہی سوال کیا تھا اور اس سوال کا جواب میں نے اثبات میں دیا تھا۔ اس لڑکی کا شوہر میرا دوست تھا۔ آپ کے بھی دوست ہونگے جنہوں نے آپ سے مشورے لئے ہونگے جنہوں نے اپنی زندگی کے ہر واقعہ کو آپ سے بیان کیا ہوگا۔ انکی محبتیں ان کی شادیاں، غرض ہر موقعہ پر آپ کی دوست نوازیاں ان کی شریک حال رہی ہوں گی۔

اب کہئے وہی لڑکی اگر آپ کے کسی دوست کی بیوی ہوتی تو آپ کیا جواب دیتے؟ سچ تو یہ ہے کہ اس صدی کا نوجوان طبقہ محبت کے لئے بیحد ذکی الحس ہے۔ ماحول اور معاشرت کی پابندیاں جن مجبوریوں کو سد راہ بناتی ہیں وہ انہیں خاطر میں لانا تو درکنار توڑ کر آگے نکل جانے کی دھن میں رہتا ہے۔ لیکن جب بھی وہ آگے بڑھتا ہے ٹکرایا ہے۔ میں صرف نوجوان ہی کو مورد الزام نہیں ٹھیراتا۔ فریق مخالف کو بھی اعانت جرم کا قصور وار گردانتا ہوں۔ محبت کی شادیوں کی بہت کم مثالیں آپ کے ذہن میں ہوں گی۔ لیکن اکثر شادیوں کے بارے میں آپ سن چکے یا واقف ہوں گے کہ دولھے کو کسی اور سے محبت تھی۔ جب میرے دوست کی شادی ہوئی تو بعض لوگوں نے پوچھا کہ "ہم نے سنا ہے دولھے کو یہ شادی دل سے پسند نہیں۔" میں نے انہیں سمجھایا کہ "صاحب دشمنوں کی اڑائی ہوئی خبر ہے۔ ہمارا دوست تو دل کے جھمیلوں میں پڑنے کو گناہ سمجھتا ہے۔"

میرے جواب سے وہ مطمئن ہوئے نہ میں انہیں کرسکتا تھا۔ میری زبان جو کچھ بھی کہے میرا دل کہتا ہے کہ "سچ مچ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ یہ جواب ایک اجنبی لڑکی کے دولھا بننے والے ہیں پہلے ایک سے دل لگا چکے ہیں۔ لیکن اس کو کیا کرتے کہ محبت کرنا اپنے بس کی بات تھی اور شادی کرنا دوسروں کے" میرے دل کی آواز کو جس طرح آپ سن رہے ہیں۔ دولھا کے بارے میں پوچھنے والے سن پاتے تو رنگ میں بھنگ ہی پڑجاتا۔ آپ چاہیں چار شادیاں کرڈالیں۔ کسی کی انگلی نہ اٹھے گی۔ لیکن کسی ایک کی ناتمام ہی محبت کا راز کھل جائے تو ایسی لے دے ہوگی کہ دوبارہ کبھی محبت کا نام لینے کی ہمت نہ ہوگی۔ ویسے محبت کی مزیداریوں کا میں بھی قائل ہوں لیکن چار لوگوں کے کہنے سننے کا کھٹکا ایسا لگا رہا کہ ہمت نہ بڑھی۔ آج وہی ہمارا دوست ایک وفاشعار اور محبت نواز بیوی کا شوہر ہے۔ لیکن جب میرے پاس ہوتا ہے تو گزری ہوئی محبت کی یاد کو کرید کرید کر چھیڑتا ہے۔ بار بار یہ شعر گنگناتا ہے

عشرت گم شدہ خلد تو مل جائے گی
اے محبت ترا آغاز کہاں سے لاؤں

اور میں کہتا ہوں کہ آغاز کو کیا روتے ہو انجام کی فکر کرو۔ جس لڑکی سے تم نے محبت کی اس کی بھی کسی سے شادی ہوجائے گی۔ اور یہ اندھا دھند محبت خواب و خیال ہوکر رہ جائے گی۔ محبت پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ یہ بہت معرکتہ الآرا بحث ہے غالب نے کہا "خلل ہے دماغ کا" شیفتہ نے کہا "ایک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی" اور میں کہتا ہوں کہ جس طرح انسان کو بھوک پیاس لگتی ہے اسی طرح محبت دل کی بھوک یا پیاس ہے۔ اور یہ آگ کی طرح دفعتاً فوقتاً بھڑکتی رہتی ہے۔ آپ کا نظریۂ محبت کچھ اور ہوگا

آپ شاعرانہ یا فلمی یا رومانی محبت کے قائل تو نہیں ؟۔ ایسی محبت میں تو انسان ایک نظر میں عمر بھر کے لئے دام محبت کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اور چاہے کوئی پوچھ کر بھی نہ دیکھے۔ اپنے جذب اور کشش کا آسرا لئے محبت کے مختلف مدارج طے کرتا رہتا ہے۔ اور آخر میں ؏ "مورث سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز" کا سماں باندھ دیتا ہے۔ آپ نے محبت کو اپنے تاثرات کے تحت محسوس کیا ہے تو آپ کوئی درست نظریہ بھی قائم کر سکیں گے ورنہ اسی میرے دوست کا حال ہوگا کہ ازدواجی محبت کا قائل ہی نہیں ہوتا۔ میں پوچھتا ہوں "کیوں" تو جواب ملتا ہے کہ "دل سے مجبور ہوں" اچھا دل ہے کہ ایک لڑکی سے محبت کرنے پر مائل ہو جاتا ہے اور دوسری سے کتراتا ہے۔ خوش قسمتی سے بیوی محبوبہ سے زیادہ حسین زیادہ سمجھدار اور زیادہ محبت کے قابل ملی ہے۔ اور یہ بات بھی نہیں کہ بیوی اس کی محبت کا دم نہیں بھرتی وہ اس کی ایک مسکراہٹ کے لئے سو سو جتن کرتی ہے۔ اور یہاں ہیں کہ "دل سے مجبور" یہ دل کی مجبوری اس پر کھل جائے تو۔ اور مجھے شبہ ہے کہ وہ کچھ بھانپ گئی ہے تب ہی تو اس نے مجھ سے ایسا سوال کیا۔ وہ سوال آپ بھی سن چکے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خاوندوں کو گزشتہ پر صلوات بھیج دینی چاہیے۔ لیکن آئندہ کے لئے صرف اپنی بیوی کا ہو رہنا چاہیے۔ بیوی کے حق میں احتیاط برتنا اپنی پر مسرت زندگی کو اپنے ہاتھوں بدمزہ بنا لینا ہے۔ بیوی صرف بیوی بننے کے لئے نہیں آپ کی میری مراد ہے اپنے شوہر کی محبوبہ بننے کی آرزومند ہوتی ہے۔ اور یہ اس کا جائز مطالبہ ہوتا ہے۔ آپ کسی لڑکی ہی سے تو محبت کرتے ہیں۔ اور جب بیوی آپ کی پچھلی خطاؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا دل آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اس کے دل کو اپنے دل میں جگہ دیں۔ گزری ہوئی باتوں کو بھلا دینا ہی اچھا۔ اور جس قدر جلد اسی قدر بہتر۔ میں نے اپنے دوست سے بھی کہا اور آپ سے بھی یہی کہتا ہوں کہ ہماری زندگی کا مقصد صرف محبت کرنا نہیں۔ زندگی کی بہت سی اہم ذمہ داریوں کی تکمیل ہمارا مقصد ہونا چاہیے۔ قیس و فرہاد کی جانشینی اگر منظور ہو تو یہ بات اور ہے لیکن زمانہ کے ساتھ آئین محبت بھی بدل گئے ہیں۔ اب محبت ہی سب کچھ نہیں رہی۔ کوئی دن جاتا ہے کہ محبت سرے سے ناپید ہو جائے گی۔ انگلستان کی کسی محبوبہ نے اپنے چاہنے والے کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا کہ یہ وقت بے وقت آدھمکتا ہے۔ اور میرے قیمتی وقت کو ضائع کرتا ہے اور اب تک جو میرا وقت خراب ہوا ہے۔ اس کا مجھے ہرجانہ بھرنے کے لئے بھی تیار رہنا پڑتا ہے ورنہ عدالت قیام و طعام کا بار اپنے سر لے لیتی ہے۔ کوئی شاعر مزاج کہہ اٹھے گا۔

کیا اسیر تجھے لذت اسیری نے ٭ یہ اڑ کے دام میں آنے کا اک بہانہ تھا

تو صاحب مبارک ہو یہ اسیری۔ چکی پیستے رہیے۔ ناک سے چنے چبائیے۔ آپ اسی اسیری کے مزہ لیتے رہیے۔ اور آپ کا محبوب آپ سے بے نیاز۔ زندگی کی کامرانیوں سے لطف اندوز ہوتا رہے گا۔ آپ کے ساتھی اعزازو مراتب کے بلند مقاموں پر ہوں گے اور آپ اس سنگین چار دیواری میں اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر رہ جائیں گے۔ اور آپ لاکھ توبہ کریں معافی چاہیں آپ کو وقت سے پہلے رہا نہ کیا جائے گا۔ میرے خیال میں محبت میں زندگی کو ضائع کرنا انسانیت کی توہین ہے کہ صرف محبت کے لئے انسان کی تخلیق مقصود ہوتی تو انسان تہذیب اور ترقی کے ان مہتم بالشان مدارج اور وسائل کا مالک نہ ہوتا۔ بھلا ایک گم کردہ محبت کو اپنا یا اپنے متعلقین کا

کیوں کوئی خیال رہو۔ وہ کچھ سوچ سکتا ہے۔ تو صرف اپنے محبوب کے لئے۔ اور محبت کرنے والوں کی یہ عجیب کمزوری بھی دیکھنے میں آئی کہ وہ اگر اپنے محبوب کو سب کچھ سمجھتے ہیں تو وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کا محبوب بھی انہیں سب کچھ سمجھے۔ اگر وہ زیورات یا ملبوسات یا کسی دوسری چیز کی فرمائش کر بیٹھے تو یہاں دل بیٹھا جاتا ہے کہ ہم چاہیں ان کو اور یہ چاہیں جنگل کے جھاڑوں کو۔ اس محاورہ کو عام بول چال میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ہاں خوب یاد آیا میرے دوست کی بیوی نے بھی اپنی گفتگو کی روانی میں اسی محاورہ کو استعمال کیا تھا۔ میرے دوست کے طرز عمل کی وہ شاکی تھی میرے دوست کی بے اعتنائی سرد مہری اور بے تعلقی اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ میرا دوست اس کی محبت کی قدر نہیں کرتا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو اجنبیوں کی طرح الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرے دوست کا یہ طرز عمل واقعی سخت تکلیف دہ تھا۔ اس کی چند اور بھی حماقتیں ہیں جنھیں میں بیحد مذموم سمجھتا ہوں۔ اس کی محبوبہ کی شادی کہیں قرار پانے والی ہے۔ تو اس کے ہوش و حواس گم ہیں۔ طرح طرح سے کوشاں ہے کہ یہ شادی نہ ہونے پائے۔ اور ادھر اس کی محبوبہ کا یہ حال ہے کہ اپنے منگیتر کی ہمت افزائیاں کر رہی ہے میرا دوست صرف ایک بار اس لڑکی سے ملنے کی دعائیں کرتا ہے۔ میں نے سمجھا دیا کہ ایسی نادانی نہ کرنا۔ اب تم اکیلے نہیں۔ تم سے دو خاندانوں کا تعلق وابستہ ہے۔ لیکن ٹیڑھی دم سیدھی ہوتی نظر نہیں آتی۔ میں نے تو سوچ لیا تھا کہ اس کی بیوی کے آگے سارا بھانڈا پھوڑ دوں۔ لیکن دوستی کا خیال مزاحم ہوا۔ اور میں نے گفتگو کو دوسرے ہی پہلو سے پھیر دیا میں صاف گو آدمی ہوں کوئی بات کسی سے پوچھتا ہوں یا کہتا ہوں تو کچھ لپیٹ کو کام میں نہیں لاتا۔ میرے دوست کی بیوی اپنی قسمت پر آنسو بہاتی ہوئی بیٹھی تھی۔ کہ میں نے دھیمے لہجہ میں پوچھا: "آپ نے کسی سے محبت کی ہے"۔ ایک دم وہ چونک پڑی۔ آنکھوں میں غصہ کوند گیا۔ لیکن میری سنجیدگی اور شخصیت کے زیر اثر چپ ہو رہی۔ میں نے اصرار کیا تو کہنے لگی "میں نے کسی سے محبت نہیں کی۔ دل تو میرا چاہتا تھا لیکن مجھے موقع نہ ملا۔ میں اپنے شوہر سے محبت کرنے کی آرزو میں جی رہی تھی۔ میں محبت نہیں پرستش کرنا چاہتی تھی۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے دیوتا نے مجھے کس طرح ٹھکرایا"۔ ہاں میں دیکھ رہا تھا۔ اور اس دیوتا کو کیسی پوجا چاہیے یہ بھی میں جانتا تھا میں نے اپنی امید افزا باتوں سے اس کی ڈھارس بندھائی اور وہ چلی گئی۔ اسی اثنا میں وہ مجنون دوست میرے پاس آئے۔ ایک نئی خبر لائے کہ وہ لڑکی مل گئی تھی۔ اس شادی سے سخت ناراض تھی۔ اس کا تو ارادہ ہے کہ عمر بھر ان کی یاد میں آنسو بہاتی رہے وغیرہ" میں نے نفرت سے اپنی گردن پھیر لی اور ناراض لہجہ میں کہا: "تم سے کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ زیادہ نہیں مجھے صرف چند دن کی مہلت دو میں تمھیں دکھلا دیتا ہوں کہ تمھیں کس طرح بہکایا جا رہا ہے۔ اور کہنے والا کس قدر سچا ہے"۔

مجھے زیادہ دن انتظار نہ کرنا پڑا۔ اس لڑکی کی شادی ہو گئی۔ جب میرے دوست نے دولھے کو دیکھا تو اپنے سے زیادہ وجیہہ زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ دولت مند پایا۔ اس کے باوجود اسے لڑکی سے کچھ آس بندھی تھی۔ اور وہ آس یوں ٹوٹی کہ دولھا ان کے دوست نکلے۔ اور شادی کے بعد تو اچھا خاصا "یارانہ" ہو گیا۔ اب وہ دولھا

اپنی بیوی کی روز افزوں محبت کے افسانے سناتا۔ اور میرا دوست ذرا سوچئے تو کیا حال ہوتا ہوگا بچارے کا۔ ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے۔ میں نے سمجھا تھا اس کی آنکھیں اب کھل جائیں گی۔ لیکن اپنے دل کا سارا ابال وہ بیوی کے سر انڈیلتا کہ اس سے شادی کر کے اس نے اپنی محبوبہ کو کھو دیا۔ اس نے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس سے شادی کر کے ایک الھڑ معصوم لڑکی کتنی خوشیوں سے محروم رہ گئی۔ اور کتنی تمنائیں اس کے دل میں گھٹ کر رہ گئیں۔ میں تو سوچتا ہوں کاش اس کی بیوی نے بھی محبت کی ہوتی۔ آج اس کی تلخ کامی اتنی اندوہناک تو نہ ہوتی۔ اتفاق کہیے یا پے در پے ناکامیوں کا اثر میرا دوست بیمار پڑ گیا۔ بیماری نے طول کھینچا۔ اور ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کر دی۔ لیکن بیوی کی تیمارداری اور شبانہ روز خدمت نے اسے موت کے منہ سے چھڑا لیا۔ اب اسے احساس ہوا کہ حقیقت اور افسانہ میں کتنا فرق ہے۔ بیوی اور خیالی محبوبہ میں کون سچی بہی خواہ اور قابل محبت ہے۔ اس بیماری میں وہ اپنی بیوفا محبوبہ کے تصور میں ایڑیاں رگڑتا رہتا۔ تو کب کا راہی عدم ہو چکا ہوتا۔ اب اپنی نئی زندگی میں بیوی اس کی محبت کی مالک ہے۔ اور یہ محبت چھنتی ہوئی یا زبردستی حاصل کی ہوئی نہیں۔ عطا کی ہوئی ہے نذر کی ہوئی ہے۔ اور وہ دونوں خوش ہیں۔

اس واقعے سے آپ کو محبت کی مفروضہ رومانیت اور واقعیت کا بھی اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اب ایک سوال آپ سے بھی ہے!۔ یہ کوئی امتحانی سوال نہ ہوگا۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میرا سوال ہزاروں دلوں کی پکار ہے۔ ان ستم رسیدہ دلوں کی فریاد ہے جو ہماری معاشرت کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہیں۔ جن کی مرضی جن کی زندگی جن کی خوشی کسی کے نزدیک در خور اعتنا نہیں ہوتی۔ اور وہ مظلوم ہستیاں عورتیں ہیں۔ بیویاں!! جن کی قسمتیں شوہروں کے ہاتھوں میں دیدی جاتی ہیں۔ یہ نوجوان محبت کے متوالے شوہران کو اپنی محبت سے محروم رکھتے ہوئے تباہی کے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ اور یہ معصوم زندگیاں گھٹتی ہوئیں ان کے پیچھے پیچھے تباہی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ بیویوں کو بیڑیاں سمجھ کر پاؤں میں پہن لیا جاتا ہے۔ اور گھر کی چار دیواری ان کی ہنستا زندگی کا مدفن بن جاتی ہے اس کا ذمہ دار کون ہے۔ کون اس ناانصافی کے لئے جوابدہ ہوگا۔ کیا اس سوال کا کوئی جواب آپ کے پاس ہے؟ اس گتھی کا کوئی حل آپ سوچ سکتے ہیں؟ آپ جتنا وقت چاہے لیجئے۔ زمانہ آپ کے جواب کا انتظار کرتا رہے گا۔

رشید قریشی

پرچم

وہ دو روز سے بھوکا تھا۔ خود کے پیٹ بھرنے کا سوال نہیں تھا۔ وہ خود تو کافی دنوں تک بھوک سے بھی بہلا سکتا تھا، لیکن اس کے سامنے سوال تھا اپنے دو ننھے ننھے بلکتے ہوئے بچوں کا۔ اپنی بیوی اور ضعیف ماں کا۔ پرسوں سے مل بند ہے۔ ایک وہ ہی نہیں بلکہ سیکڑوں مزدور بے کار اور بھوک کا شکار بن گئے ہیں۔ صبح جب سوکر اٹھا تو منے کی ماں کو عجیب حالت میں دیکھا۔ اس کا دودھ سوکھ گیا تھا۔ اب اس سے اور نہ دیکھا جا سکا۔ وہ گھر سے نکل پڑا ــــــ سماج اور اس کے قانون سے لڑنے کے لئے ــــــ ظلم اور ناانصافیوں کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کے لئے ــــــ یا پھر ــــــ نہ جانے کس لئے۔

" چاند ارے او چاندخاں "

اس کا نام تو اصل میں تھا رمضان خاں لیکن ماں بیچاری کا وہ اکلوتا تھا اس لئے وہ اسے چاند پکارتی تھی ــــــ یہی نام چل نکلا تھا اس کا۔

" کیا ہے رے میکو "

" سانپ سونگھ گیا ہے کیا "

" ہاں بس یہی سمجھ لے "

" یار مجھے بھی کچھ نہیں سجھائی دیتا۔ پرسوں اس بنیے نے ایک روپے کے چانول ادھار دیے تھے۔ آج تو گھر میں ایک دانہ بھی نہیں۔ تیری بھابی رو رہی تھی میں نے سوچا چلو اتنا بڑا شہر ہے کوئی کام دھندا ڈھونڈھ نکالو ــــــ ایک مل بند ہوگئی تو کیا ہوا "

چاندخاں اور میکولال تکارام کی گرنی میں کام کرتے تھے۔ مشین کا معاملہ تو نازک ہوتا ہی ہے بیل بدھو تو ہے نہیں کہ اڑ گئے تو مار پیٹ کر ہانک لیا۔ مشین کا کوئی پرزہ بگڑ گیا تھا جس سے گرنی ہی بند ہوگئی۔ پورے پانسو مزدور بے کار ہوگئے کسی لیڈر یا قائد کو ان پانسو بھوکوں کی فکر نہیں تھی لیکن بھوکوں کو تو موت سے بہر حال لڑنا ہی تھا۔

میکو اور چاند خاں شہر کے چوک میں آگئے دیکھا ایک میلہ لگا ہوا ہے کھانا نہ سہی تماشا ہی سہی۔ تماشے سے بھی تو پیٹ بھر سکتا ہے۔ لیکن وہ تو تماشا نہیں تھا۔ ایک شخص خاکی وردی پہنے چلا چلا کر کہہ رہا تھا ــــــ

وطن کے پاسبانو! ہندوؤ اور مسلمانو۔ آؤ ــــــ

میری بات سنو آج تمھارے امتحان کی گھڑی آ پہونچی ہے۔ دشمن تمھارے ملک کی سرحدوں میں گھس پڑا ہے۔ آئیے اس وقت اپنے ملک سے نکال باہر کرنا تمھارا کام ہے۔ تمھارا وطن تمھاری، قوم اور تمھارا مذہب تم سے کچھ مانگتا ہے۔ قربانی ــــــ ایثار ــــــ حب الوطنی ــــــ "

میکولال نے چاند خاں کے کندھے پر رکھ کر کہا۔

" چاند بھیا یہ کیا کہتا ہے۔"

" کہتا ہے ہندوستان میں دشمن گھس آیا ہے۔ ملک کی حفاظت کرو"

" تو بھیا یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی۔ ملک سے دشمن چاہے نکلے یا نہ نکلے۔ ہمارے تو بیوی بچوں کے پیٹ کا بندوبست ہو جائےگا"

" ہاں ہے تو بات بڑی اچھی۔ مگر ..... "

" مگر کیا چلو چلو ــــــ یوں بھی دیش کی رکشا کرنا اپنا دھرم ہی تو ہے۔"

ایک ایک کرکے سارا مجمع چھٹ گیا لیکن تکارام کی گرنی کے کئی مزدور باری باری سے اپنا نام لکھاتے رہے۔ گنگا۔

موہن، سونی، میکولال اور چاند خاں نے بھی اپنا نام لکھا دیا۔

"روتی کیوں ہو میں مرنے کے لئے تھوڑا ہی بھرتی ہوا ہوں۔ ارے میں تو تیرے اور منے کی ماں کے کھانے پینے کا بندوبست کر رہا ہوں"

"نہیں نہیں بیٹا تو مت جا۔ لڑائی پر جانے والوں کا صحیح حال نہیں معلوم ہوتا اور پھر یہ دن ہمیشہ ایسے ہی تھوڑے رہیں گے۔ نہیں بیٹا تو اپنے شہر ہی میں کوئی کام دھندا کر لے"

"میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں ماں دیکھتی نہیں ہو کتنے سارے لوگ بھرتی ہو گئے ہیں — کیا ان سب کے بیوی بچے نہیں ہیں ارے میکولال بھی تو رہے گا میرے ساتھ"

چاند خاں یوں تو اپنی ماں سے ہمت کی باتیں کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا اس کے ننھے کی ماں مکھیوں سے بھنبھناتی ہوئی کڑاہی چاٹ رہی تھی اس کا منا ابھی رو رو کر سو گیا تھا۔

چاند خاں کے سامنے دو سوال تھے۔ محبت اور فرض اس نے اپنی بے بس محبت پر فرض کو ترجیح دینا ہی مناسب خیال کیا وہ اپنی محبت سے اپنی ماں، بیوی اور بچوں کا پیٹ تو نہیں بھر سکتا تھا۔ وہ محاذ جنگ پر چلا گیا — دشمنوں کو ملک سے نکال باہر کرنے کے لئے اپنے وطن کو آزاد کرنے کے لئے۔ اپنے مذہبی فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے!

سنسناتی ہوئی گولیاں اور توپوں کی گرج۔ سیکڑوں ہزاروں کی آہ کراہ۔

آزادیٔ وطن کے لاکھوں پرستار اسی ہنگامے میں اپنی جنم بھومی پر تڑپ تڑپ کر جان دے رہے تھے۔ دن — ہفتے اور مہینے ہو گئے — چاند خاں اب تنہا رہ گیا تھا۔ میکولال کی بیوی خط کے انتظار میں رہ گئی موت اور حیات کی آغوش میں بے دست و پا بچے کی طرح چاند خاں بوکھلا گیا تھا۔ دشمن آگے بڑھتا ہی گیا — پیچھے ہٹو پیچھے محاذ چاند خاں کے شہر کی حدود تک پیچھے ہٹ گیا۔

"ماں سن رہی ہو یہ آوازیں۔ چلو نا انھیں دیکھ آئیں"

"بہو کلیجہ تو میرا بھی پھٹ رہا ہے۔ لیکن کون جانے وہ کہاں ہوگا۔"

"ہردیال آیا ہے وہ کہتا تھا کہ منی پور سے کچھ ہی دور ہیں"

قریب آدھی رات کے توپوں کا ایندھن کچھ دیر کے لئے ٹھنڈا پڑا۔ چاند خاں کی ماں اور اس کی بیوی کی طرف چل پڑے۔ ہر طرف خموشی تھی لیکن منی پور سے قریب پہنچ کر انھوں نے سنا۔ سیکڑوں انسان کراہ رہے ہیں۔ کئی سپاہیوں کو انھوں نے مرا ہوا دیکھا۔ بوڑھی ماں کا دل دہل گیا بہو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی لیکن وہ آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ انھیں یقین نہیں آتا تھا کہ چاند خاں جیسا ہٹا کٹا انسان مر سکے گا۔ وہ اسے توپوں اور بندوقوں سے بھی بڑی قوت سمجھے ہوئے — بڑھے جا رہے تھے کچھ شور سا ہوا۔ تاریکی کے پردوں کو چاک کرنے کے لئے توپوں کے منہ کھل گئے۔ گولہ باری ہونے لگی۔ اندھیرے میں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہزاروں تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔

"بہو" بوڑھی ماں نے چیخ کر کہا۔

"ماں۔ مجھے ان کے پاس لے چلو۔" گولی بہو کے سینے میں آر پار ہو گئی تھی۔ بہو دھم سے زمین پر گر پڑی۔ وطن کو آزاد کرانے والوں نے زور شور سے گولے برسانے شروع کئے۔

ایک بار بجلی زور سے چمکی —— بوڑھیا نے دیکھا۔ درخت کے پیڑ سے سہارا لئے کوئی کھڑا ہے۔ وہ دوڑی قریب پہنچ گئی۔

"چاند"

بوڑھیا کی رلتی ہوئی آواز توپوں کی گرج میں دب کر رہ گئی۔ اس نے دیکھا اس کا چاند آج روشن نہیں ہے۔ ہاتھ پیر شل ہو گئے ہیں۔ اور سر پر —— ... اونچا بہت اونچا ایک پرچم لہرا رہا ہے —— وطن کی آزادی کا حب الوطنی کا پرچم ——"

افضل عابدی

انقلاب

اے غلام ہندوستانِ محوِ خواب
اٹھ کہ سر پر آگیا ہے آفتاب
ذرہ ذرہ کھا رہا ہے پیچ و تاب
ہے فضا لبریزِ جوش و اضطراب
اب حقائق ہو رہے ہیں بے نقاب
اٹھ رہا ہے روئے فطرت سے حجاب

عہدِ بربادی کا ہے دورِ شباب
انقلاب اے قومِ خفتہ انقلاب

(۲)

اب نہیں وقتِ سوالِ این و آں
بڑھ نہ جائے زندگی کا کارواں
سنسناتی ہیں چمن میں آندھیاں
آشیاں کو تاکتی ہیں بجلیاں
تھرتھراتے ہیں زمین و آسماں
جاگ تو بھی اے مرے جنت نشاں

پھونک دے شعلوں میں مضرابِ رباب
انقلاب اے قومِ خفتہ انقلاب

(۳)

سرنگوں ہے آج فاروقی جلال
چھا رہا ہے قصر و ایواں پر زوال
سسکیاں بھرتے ہیں پارینہ کمال
لوٹتا ہے خاک و خوں میں عہدِ حال
خیرہ کن تھا جس تمدن کا جمال
لب نظر آئے ہیں اس کے قد و خال

اہرمن زادوں کا ہے روزِ حساب
انقلاب اے قومِ خفتہ انقلاب

(۴)

انتظارِ صبحِ خنداں —— تابکے
حسرتِ بزمِ چراغاں —— تابکے
بھیس میں شیطاں کے انساں —— تابکے
کفر کے ہاتھوں میں ایماں —— تابکے
اقتدارِ فتنہ ساماں —— تابکے
ذلتِ خونِ شہیداں —— تابکے

تابکے افسانۂ حسن و شراب
انقلاب اے قومِ خفتہ انقلاب

(۵)

دیکھ اصلِ عزم و ہمت بڑھ چلے
دیکھ آزادی کے پرچم کھل گئے
نظرِ عہدِ کہن کیا چیز ہے
دیکھ آنکھیں کھول نظارے نئے
وقت کیوں ٹھہرے گا تیرے واسطے
موت کے طوفاں میں کشتی ڈال دے

پنجۂ بلبل میں شاہین و عقاب
انقلاب اے قومِ خفتہ انقلاب

صمد رضوی ساز

شاعر

وہ انقلابی نظمیں اور گیتیں لکھا کرتا تھا، اسی جرم کی پاداش میں وہ جیل بھیج دیا گیا، چونکہ وہ سکون کو طوفان سے آشنا کر رہا تھا۔

میں بھی حیران ہوکر سوچتا ہوں کہ وہ ایسے گیت اور اتنی خطرناک نظمیں کیوں لکھا کرتا ہے ! وہ کیوں ان تاروں کو نہیں چھیڑتا ہے جن سے محبت کے نغمے پیدا ہوں۔ شباب بے پناہ ہوجائے، ہر ایک کے شعور اور لاشعور میں رنگینیاں کیف اور سرمستیاں رقص کرتی رہیں۔ ہمارے دیس کے شاعروں نے آج تک یہی راگ الاپے ہیں شاعر کا نغمہ اور مغنی کی لے بغاوت اور انقلاب ہوجائیں تو یہ دنیا جہنم بن کر رہ جائے گی۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ ہندوستان کو محبت کے نغمے اور عشق کی تانیں چاہئیں ورنہ ہمارے دلوں کی آگ، ہماری گرمیٔ حیات اور عقل وخرد سب فنا ہو جائیں گے۔

جمیل نے بھی یہی سوچتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ کسی دربار میں کئی شعراء موجود تھے ایک مرتبہ بادشاہ اپنے دشمن سے مقابلے کے لئے ان شاعروں کو ساتھ لئے میدانِ جنگ گیا تھا، وہاں ان شاعروں نے اپنے خیال کی ندرتوں اور لطافتوں کے وہ اعجاز دکھائے کہ بادشاہ سلامت نے آرٹ کی قدردانی کی۔ شاعر کی دنیا، خیالوں کے وہ جزیرے ہیں جہاں وہ والہانہ اور مستانہ وار گھومتا، ان وارداتوں اور کیفیتوں کو شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہے جس سے آگہی پیدا ہو جائے۔

لیکن یہ انوکھا شاعر، مزدوروں اور دہقانوں کے گیت لکھا کرتا ہے جو نہ شعر کی حقیقت سے واقف ہیں اور نہ ہی شعر کے معنی سمجھتے ہیں۔ وہ اسے ان شعروں کے عوض کیا دے سکتے ہیں ؟ اب شعر و نغمہ کا خدا ہی حافظ ہے۔ شاعر ایوانوں اور شبستانوں سے نکل کر کارخانوں اور کھیتوں کا رخ کر رہا ہے۔ ڈر رہا ہوں کہ کارخانوں کے دھوئیں اور کھیتوں کے گرد و غبار میں وہ کہیں گم ہی نہ ہو جائے۔ ازل سے آج تک شاعر نے ایوانوں میں اپنے دن گزارے ہیں، زر و جواہر میں تولا گیا ہے، اور جب شبستانوں میں رہا ہے جس نے شاعر کا استقبال کیا ہے، اس کے نغموں کو فردوس بنا دیا ہے، اس کے راگوں میں محبت کی دنیائیں آباد کی ہیں۔ لیکن یہ بیچارا شاعر۔ دیوانہ اور گم کردہ راہ ! آج بھی اس نئے دور میں شاعر کی تانوں میں محبت کا طلسم ہے لیکن نہ جانے شہاب یہ دیوانہ شاعر !

شہاب دیوانہ ہی تو ہے، شہاب کے لکھے ہوئے گیتوں اور نغموں سے رضیہ کے گانے سارے ملک میں جادو جگا رہے تھے، اس کے گانے سارے ملک میں جادو جگا رہے تھے، اس کے گانے ہمارے دیس کا ہر فرد گاتا ہے۔ بچے، جوان، نوجوان اور بوڑھے سب ان نغموں پر جان دیتے ہیں۔ ہمالہ سے لیکر راس کماری تک بنگال سے کراچی تک، کانن بالا اور خورشید کی آواز لہرا رہی ہے۔ ان لوگوں سے پوچھو کہ تمھارا گورنر کون ہے وہ سوال پوچھنے والے کو تعجب کی نگاہوں سے یوں دیکھیں گے جیسے وہ آفریقہ کا کوئی جانور ہے ان کے بتیئں اگر آپ کو "پریت کی ریت" یاد نہیں تو کچھ یاد نہیں۔ رضیہ کی آواز میں جیسے موسیقی کا دیوتا چھپا بیٹھا تھا، اس پر شہاب کے لکھے ہوئے نغمے ہندوستان کے رہنے والوں کی ایک دنیا بناتے ایک دنیا مٹا دیتے تھے وہ اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر سر دھنتے ہوئے سرد آہیں بھرتے یا کیف و مستی میں چور مسکرا پڑتے۔

لیکن شہاب دفعتاً بدل گیا۔ اس نے حسن و عشق کے

گیت ہی چھوڑ دے گا۔ رضیہ کی شبستانوں میں رات رات بھر جاگ کر خیالوں کے کئی آتش کدے بنائے تھے، حسن کو سرفراز کیا تھا، عشق کو رفعتیں بخشی تھیں۔ لیکن نہ جانے وہ کن پرچھائیوں کو دیکھ کر ڈرا ـــــ سہما اور پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک شام وہ رضیہ کی محفل میں زندگی کو سرشاریاں عطا کر رہا تھا کہ ایک بڑھیا دو لڑکیوں کو لئے چلی آئی۔ دو لڑکیاں کیا تھیں، دو جوانیاں تھیں، دو شعلے تھے دو بجلیاں تھیں جو گرد و غبار میں آٹی ہوئی افلاس کی ماری تھیں۔ بڑھیا نے رضیہ سے کہا۔ یہ دونوں بہنیں بنگال سے آئی ہیں۔ بنگال میں کال پڑا ہے۔ قحط ـــ تھا ـــــ نجانے ان کے ماں باپ کدھر گم ہو گئے زندگی اور موت کو کسی طاقت نے انھیں اپنے قبضہ میں رکھا ہے کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ مجبور و بے بس ہیں اور زندگی کے لئے سہارا چاہتے ہیں۔ وہ مجبور و بے بس لڑکیاں اپنی بے بسی اور درد کا ایک خاموش افسانہ سنا رہی تھیں، حیا ان کے رخساروں پر سرخی بن کر دوڑ رہی تھی۔ رضیہ نے بڑھیا سے کچھ گفتگو کی اور وہ بنگال کی بھوکی لڑکیاں رضیہ کے ہاں رہنے لگیں۔ شہاب نے کچھ ہی دنوں میں یہ محسوس کیا کہ یہ لڑکیاں کہی جا رہی ہیں آگ سرد ہوتی جا رہی ہے، ان کی پیشانی کے بل؛ ان کے چہرے کی ایک ایک شکن سے غم و اندوہ جھانک رہے ہیں۔ ہر لفظ ایک آہ ہے، ہر سانس ایک نوحۂ غم ہے جو بنگال کی بربادی پر بلند ہو رہی ہے۔ شہاب نے یہاں دیکھا کہ جنت جہنم میں داخل ہو رہی ہے، جہنم کے شعلوں نے فردوس کی راحتوں کو بھی تباہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ شبستان سے بھاگ نکلا اور کارخانوں کھیتوں میں جا پہونچا۔ یہاں چلے آنے سے پیشتر وہ غمِ جاناں اور فکرِ محبوب کی آگ میں جھلستا رہا اور اب مزدور اور کسان کا غم اس کی تقدیر بن گئے ہیں۔ مزدور کا افلاس اور کسان کی بیچارگی کے رنج و الم میں اب یہ گھلتا رہے گا۔

قدرت نے شاعر کو احساس کی امانتیں اس لئے نہیں سونپی ہیں کہ وہ فکروں میں ڈوبا رہے غمِ جاناں کے بعد یہ غمِ دوراں، شاعر کی نسل ہی کو کہیں ختم نہ کر دے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہمارا دیس ایک صحرا ہو کر رہ جائے گا۔ جہاں کوئی نغمہ نہیں کوئی لے نہیں۔ گھونگھٹ میں گوری جلے ارس سے بھرے تورے نین، رات اندھیری کالی کالی اور پیا بن نہیں آوت چین کی مدھ بھری تانوں نے آج ہمارے دیس والوں کو زندہ رکھا ہے حیات کی تلخی اور بدمزگی شاعر کے انہی نغمات سے بجھائی جا رہی ہے کسی سندری کا ڈھول پر گنگنانا، وفاق اور آزادی کے موہوم تذکروں سے زیادہ حیات بخش ہے رات جب میں سوویت جرمن جنگ کی خبریں پڑھ رہا تھا، ایک تانگہ والا تان اڑاتا جا رہا تھا (ترے من میں بسو نگی او ساجنا) مورے من نین بسوائے ساجنا ـــــ اخبار ہاتھ سے چھوٹ پڑا اس روز جرمنی سے بھاگ کر میں رفیعہ کی جناب میں پہونچا جو بجائے میرے کسی لورنڑوا کے مندر میں جا بیٹھی ہے۔ ایک کلرک اور رفیعہ نہ کبھی مل سکتے ہیں اور نہ مل سکیں گے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں مفلس خاندان کو اور افلاس میں جھونک کر بی آے کی چاندی سی سفید سند لینے کے باوجود صرف کلرک ہی رہا اور آگے نہ بڑھ سکا اس تان نے میرے دل کے ان تاروں کو چھیڑا ہے جس سے آہیں تھرا اٹھیں میں نے شاعر کی خدمت میں اپنا خراج پیش کیا وہ میرا ہمنوا ہے، شریکِ غم اور زخموں پر پھاہا رکھنے والا۔

یہ شاعر، سارے انسانوں کے دکھ اور درد کے ساتھی ہیں۔ لیکن آج اس انوکھے شاعر پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا جو دو بھوکی بنگالی لڑکیوں کو دیکھ کر اپنا راستہ بھٹک گیا۔ یہ مزدور اور کسان نجانے کونسی آفت لے آئے کہ دنیا کا رنگ بدل رہا ہے۔ محفل کی رونق، انجمن کی ضیاء، اور بزم نشاط کے انجم کو چھین رہے ہیں۔ شہاب شبستان سے بھاگ نکلا۔ اب وہ ایسی بے نور بھیکی اور اداس دنیا میں جا پہونچا جہاں نہ رضیہ کے گلے کا لوچ ہے نہ شبستانوں کی کافوری شمعیں، نہ عود و عنبر کی لپٹیں اور نہ ہی زرتار فرش مئے و مینا، جام و [illegible] رہٹ چلنے کی آواز اور مشین کا شور وہ شاعر کے بجائے پاگل ہو جاتے ہیں۔ اسی خبط کا تو یہ اثر ہے کہ اس نے انقلاب اور بغاوت کے نعرے لگائے۔ بے مدعا اور بے مقصد نعرے ان نعروں پر اس کو یہ شرط ہے وہ عین انصاف ہے مجسم عدل ہے وہ اس سکون کو درہم برہم کر رہا تھا جو صدیوں سے دائم و قائم ہے وہ ایک ذخیرۂ آب میں کنکریاں پھینک رہا تھا جس سے سارا پانی سکون سے حرکت میں آگیا تھا اور وہ مچھلیاں جو چھوٹی مچھلیوں کے شکار کو آگے بڑھ رہی تھیں سہم گئیں۔ اس کی یہ حرکت ہنگاموں کی ابتدا ہے جن کی انتہا ایک قیامت ہے۔

شہاب جیل میں ایڑیاں رگڑ رہا ہوگا، اگر وہ بنگال کی دو بھوکی لڑکیوں کو نہ دیکھ پاتا تو آج تقدیر اس کے سر پر ایک جگمگاتا تاج پہنا دیتی، اس کے نغمے دیس کے گلی کوچوں میں گونجتے اس کے دکھ بھرے گیت سن کر لڑکیاں ایک آہ بھرتیں، نوجوان اپنی ہمنوائی کے لئے اس کے زیر بار منت ہوتے اس کی محبت کے اشعار دھڑکتے دلوں کی صدا بن جاتے، انہیں جاودانی عطا کرتے اس کا گیت سنگیت کے امتزاج سے بے شمار فردوس بناتا وہ خود گلوئے زہرہ کی آواز بن جاتا۔

اس کی زہریلی نظمیں انہی کو مبارک ہوں جو دیس سے دلوں کی دھڑکن بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ ہماری آخری متاع زرد چہروں، بے نور آنکھوں، لاغر جسم اور نحیف و نزار روح کو ان ترانوں کی ضرورت ہے جو جسم میں ارتعاش پیدا کریں، روح میں ایک لرزش بپا کردیں اور دل میں امنگ اور تمنا رقص و اہتزاز کرنے لگ جاتے۔ یہی ترانے ابتدا سے گاتے جا رہے ہیں اور گاتے جانے چاہئیں۔ شہاب کی شاعری سکون کو درہم و برہم کرتی ہے۔ وہ ایک ذخیرۂ آب میں کنکریاں پھینکتا ہے جس سے سارا پانی سکون سے حرکت میں آجاتا ہے اور وہ مچھلیاں جو چھوٹی مچھلیوں کے شکار کو آگے بڑھتی ہیں سہم جاتی ہیں۔

ہنگامہ و اضطراب کا خالق یہ دیوانہ شاعر، سکون، سکوت اور محبت کے رموز پر ایک کاری ضرب لگانا چاہتا ہے۔ اُف بنگال کی بھوکی لڑکیاں نصیبوں جلی اپنے جلو میں بدنصیبوں کا ایک لشکر لئے آئی ہیں۔ بنگال سے بھاگ کر یہ لڑکیاں شاعر کو گلشن سے صحرا میں بھگا رہی ہیں۔

یہ بھوکی لڑکیاں اور ان کا وارفتہ یہ شاعر!

ستارہ، آسمان کی گود سے ٹوٹ کر زمین کی نجاست میں راکھ ہو رہا ہے ـــــ بے چارہ شہاب ـــــ دیوانہ شاعر!

محمد محبوب حسین

(نوٹ) اس شمارہ کے متعلق آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

مدیر

کفر اور شاعر

سلام اُس نظم کو خونریزیاں بھی جس میں شامل ہوں
سلام اس عقل کو جو چھین لے چہروں سے رنگینی
سلام اس علم کو جو نخوتوں سے آشنا کردے
سلام اس بزم کو تخلیقِ عبرت کام ہو جس کا
سلام اُن مذہبوں کو خون سے ہوں جن کی تعمیریں
سلام اس زندگی کو جو قضا کی زد میں رہتی ہو
سلام ان دولتوں کو جو خداوندی سکھاتی ہیں
سلام اُس گلستاں کو جس میں ویرانی نکھرتی ہے
سلام اس کارواں کو گمرہی پر ناز ہو جس کا
سلام اس نظمِ دوراں کو سلام اس کبریائی کو

سلام اُس دہر کو افسوس و حسرت جس کا حاصل ہوں
سلام اس زہد کو جو دے رہا ہو درسِ خود بینی
سلام اس ہوش کو جو زندگی صبر آزما کردے
سلام اس عیش کو سوزِ نہاں انجام ہو جس کا
سلام اُن نیکیوں کو پاسباں ہوں جن کی شمشیریں
سلام اس سرخوشی کو جو ہوا کے رُخ پہ بہتی ہو
سلام ان عشرتوں کو جو غرض مندی سکھاتی ہیں
سلام اس آشیاں کو جس پہ بجلی رقص کرتی ہے
سلام اس امتحاں کو ناشناسی راز ہو جس کا
سلام ایسی عبادت کو سلام ایسی خدائی کو

عارف

یہ انکارِ حقیقت بھی حقیقت سے نہیں خالی
سمجھ سکتے نہیں اہلِ جہاں سوز و گداز اس کا
یہ مزدوری کا دکھ غارت گری اربابِ دولت کی
یہ بیماروں کی چیخیں، یہ غریبوں کی دکھی نظریں
یہ بیوائیں اور ان کی چشم و ابرو کی یہ ویرانی
یہ اہلِ علم اور باطل کے آگے سرنگوں ہونا
یہ جنگیں، قتل و غارت کی یہ ہمت آزما رسمیں
ہوا کی رو میں اڑ جانا مہکتے گلستانوں کا
برستی عبرتیں اربابِ عقل و دل کی چوکھٹ پر
حجابِ لطف میں بے رحمیاں آسودہ حالوں کی

کہ اک درسِ حیاتِ نو ہے شاعر کی زبوں حالی
کہ دنیا سطحی بیں ہے اور بہت گہرا ہے راز اس کا
یہ آسایش کے پردے میں گھٹائیں دردِ عبرت کی
یتیموں کی یہ دردِ یاس میں ڈوبی ہوئی نظریں
یہ مائیں اور بھری گودوں پہ ان کی خستہ سامانی
یہ اربابِ ہنر اور اس قدر زار و زبوں ہونا
حریفِ آدمیت کیا حقائق اور کیا رسمیں
قضا کی زد میں یہ دم توڑنا کڑیل جوانوں کا
ضمیر و روح کی قربانیاں باطل کی چوکھٹ پر
یہ دیں کی آڑ میں خود بینیاں اللہ والوں کی

یہ مانا کر رہی ہے عقلِ اول اہتمام اس کا
نہ ہستی تام ہے خود اور نہ آئین ناتمام اس کا

مگر شاعر کے دل کا بھید کوئی پا نہیں سکتا
یہ وہ عقدہ ہے جس کو نطق ابھی سلجھا نہیں سکتا

یہ عالم ہے کہ ہر اک سانس ہے گویا حریف اس کا
بہت نازک بہت نازک ہے احساسِ لطیف اس کا

اسے فرصت کہاں ان خشک راہوں سے گزرنے کی
نظامِ زندگی کی الجھنوں پر غور کرنے کی

اچٹتی سی نظر اک ڈال دیتا ہے ببولوں پر
مگر اس کی نگاہیں جھومتی ہیں آ کے پھولوں پر

اسے اس سے غرض کیا پھول کی رگ رگ کو پہچانے
یہ کانٹے کیا ہیں کیا ہے پنکھڑی یہ راز بھی جانے

نظر شاعر کی جب پڑتی ہے اس عہد تباہی پر
نظامِ علم و عقل و ہوش کی گم کردہ راہی پر

اسے ملتا ہے اندیشوں سے گھبراتا ہوا انساں
ہجومِ تیرگی میں ٹھوکریں کھاتا ہوا انساں

ہوائیں ہونکتی ہیں ہر قدم آغوشِ طوفاں میں
فضائیں چیختی ہیں دم بدم اس دشت ویراں میں

بھٹکتا ہے اسی تاریک وادی میں خیال اس کا
نہیں پاتا نہیں پاتا جواب اکثر سوال اس کا

اسے اس کی گرفتہ خاطری پھر لے کے اڑتی ہے
حقیقت پر جمی تھی جو نظر اک بار مڑتی ہے

وہ کہتا ہے مآلِ زندگی برباد ہونا ہے
جسے کہتے ہیں ساحل اصل میں کشتی ڈبونا ہے

یہ سوز و درد ہوتا اور نہ یہ سود و ضرر ہوتا
زمانہ کا کوئی والی کوئی وارث اگر ہوتا

یہاں ہیں جس قدر آلام آب و گل کی بستی میں
سمٹ کر جمع ہو جاتے ہیں سب شاعر کی ہستی میں

انہیں رہ رہ کر دہراتا ہے وہ ان کی زباں ہو کر
سناتا ہے یہ قصے زندگی کا ترجماں ہو کر

دل اس کا اصل میں سرگرمِ سوز و ساز ہوتا ہے
کہ اس کا کفر اس کی روح کی آواز ہوتا ہے

علی اختر

اشتراکی

برہمن تجھ کو سمجھتا ہے نجس
مولوی کے لئے کافر تو ہے
توڑ دے جھوٹے خداؤں کا طلسم
صبحِ صادق کا پیمبر تو ہے

علی سردار جعفری

بے گناہ

(ایک دوست کے جیل جانے پر)

فریبِ لفظ پرستی ہے پردہ دارِ جنون
بنا دیا ہے جسے اقتدار نے قانون

ہیں خواہشوں کے جنازوں پہ زرق برق غلاف
اٹھا رہا ہے جنھیں اپنی دوش پر انصاف

یہ پستیوں کی بلندی سے ضابطوں کا نزول
حقیقتوں سے یہ بچنے کے گول مول اصول

یہ جنبشِ خمِ ابرو، یہ عدل کے فرمان
ہے فتح مندِ زباں کی شکست کے اعلان

فریب خوردہ غلامی کا یہ بلند مقام
یہ چند لفظوں پہ تعمیرِ زندگی کا نظام

یہ اختیار کی بے چارگی ہے یا ہے غرور
ہے زعمِ ذوقِ نظر سے حقیقتیں مستور

جبینِ جبر کی ہر اک شکن میں ہے مرقوم
کہ میری روح پشیمانیوں سے ہے محروم

زباں پہ مہر لگا دی قلم کو روک دیا
سمجھ رہے ہیں کہ سینے میں دم کو روک دیا

غلام ہاتھ نے پاؤں میں ڈال دی زنجیر
مگر صداقتِ احساس ہو سکی نہ اسیر

ترے خیال کی پرواز اب بھی ہے آزاد
تری نظر، تری آواز اب بھی ہے آزاد

سکوں نواز شب و روز قید خانے میں
کٹیں گے جرأت اظہار کے بڑھانے میں

میکش

ترقی پسند مصنفین

آگ محفل میں غلاموں کی لگا دیں اے دوست
دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کر دیں

گائیں ٹوٹے ہوئے بربط پہ ترانے دل کے
بزم کو اپنی نواؤں سے غزلخواں کر دیں

ڈال دیں وقت کی افسردہ نگاہوں میں نگاہ
عہدِ پارینہ کو اک خوابِ پریشاں کر دیں

رنگِ خون بھر کے بنائیں وہ نئی تصویریں
کاوشِ مانی و بہزاد کو حیراں کر دیں

چھین لیں ہاتھ بڑھا کر مہ و پرویں سے چمک
ہند کی خاک کے ذروں کو درخشاں کر دیں

کب تلک راہ کے کانٹوں سے بچائیں گے قدم
ان کو تھوڑا سا لہو دے کے گلستاں کر دیں

دے کے احساس نیا ہند کے شہ پاروں کو
حسنِ یوسف کو چراغِ تہِ داماں کر دیں

عام ہو غالب و اقبال کی رعنائیٔ فکر
بے زبانوں کو زباں دے کے زباں داں کر دیں

کھول دیں سب کے لئے قفلِ درِ میخانہ
حضرتِ جوش کو سر حلقۂ رنداں کر دیں

علی سردار جعفری

فتح استالین گراڈ کے بعد!

توہمات کے تاریک و تنگ ڈیرے میں
مغالطوں کے فسوں کار سخت گھیرے میں
خیال و خواب کے عبرت نشاں اندھیرے میں!
ابھی تو شمعِ حقیقت جلائی ہے ہم نے!

ہزار فتنے ہیں پوشیدہ ذوقِ راحت میں
ہزار کانٹے ہیں پنہاں گلوں کی چاہت میں
ہزار حشر ہیں خوابیدہ بطنِ فطرت میں!
ابھی تو ایک قیامت اٹھائی ہے ہم نے!!

وہ جانِ دید وہ ارمان دیدۂ حیراں
وہ نور و طور کی اک داستانِ نغمہ کناں
جہاں نے دیکھی کہاں مجلسِ مہِ تاباں!
ابھی تو محفلِ زہرہ سجائی ہے ہم نے!!

ابھی تو سازِ شبستاں کا وقت باقی ہے
ابھی تو لطفِ نگاراں کا وقت باقی ہے
ابھی تو رقصِ بہاراں کا وقت باقی ہے!
ابھی تو روحِ گلستاں جگائی ہے ہم نے!!

ابھی تو گردشِ دوراں پہ مسکرانا ہے
ابھی تو دشمنِ بیجان پہ مسکرانا ہے

ابھی تو حسرتِ طوفاں پہ مسکرانا ہے!

ابھی تو حیرتِ طوفاں بڑھائی ہم نے!!

دلاورانِ حسیں وہ بہادرانِ حسیں
قرارِ خاطرِ صحرا، نگارِ نجد نشیں
بتانِ چیں ہیں کہیں آہوانِ ہند کہیں!

"نئے جہاں" کو نئی مے پلائی ہے ہم نے!!

مہک رہا ہے کہاں "گلستانِ سرخ" نہ پوچھ
لہک رہے ہیں کہاں "شاہدانِ سرخ" نہ پوچھ
کہاں کہاں ہے ابھی "کاروانِ سرخ" نہ پوچھ!!

ابھی تو ایک ہی منزل دکھائی ہے ہم نے!!

نظر حیدرآبادی

غزل

بہ اندازِ نو اک جہاں بن رہا ہے	زمیں پر نیا آسماں بن رہا ہے
فلک کے ستایوں کے دن پھر رہے ہیں	قفس کی جگہ آشیاں بن رہا ہے
ہر اک نوع کی بندشیں اٹھ رہی ہیں	ہر اک بے زباں با زباں بن رہا ہے

نئی راہ پائی ہے انسانیت نے
نئی طرز کا کارواں بن رہا ہے

میر حسن

منزلیں

ہزاروں منزلیں ایسی ملیں گی — جہاں ہر گام پر کلیاں کھلیں گی
جہاں ہوں گی محبت کی بہاریں — جہاں ہوں گی مسرت کی پھواریں
جہاں دکھلا کے دلآویز راہیں — تجھے بہکائیں گی تری نگاہیں
جہاں الفت کے کچھ رنگین نظارے — کریں گے تجھ کو پردوں سے اشارے
مگر تو ان کے دھوکے میں نہ آنا
مسافر راستے میں رک نہ جانا

ملیں گے تجھ کو کچھ ایسے محل بھی — جہاں جلتے ہیں عشرت کے کنول بھی
جہاں شیشوں میں بہتی آگ بھی ہو — جہاں للچانے والا راگ بھی ہے
جہاں منہ مانگی دولت بھی ملے گی — جہاں شاید حکومت بھی ملے گی
تیرے سر پر خدائی ہاتھ ہوگا — ہر اک قانون تیرے ساتھ ہوگا
نہ بن جانا کہیں ان کا نشانا
مسافر راستے میں رک نہ جانا

کچھ ایسی وادیاں تجھ کو ملیں گی — جہاں بربادیاں تجھ کو ملیں گی
دھواں اٹھے گا رنگیں مسکنوں سے — لپٹ جائیں گے شعلے دامنوں سے
جہاں چھوڑیں گے تجھ کو ساتھ والے — جہاں ٹوٹیں گے تیرے دل کے چھالے
جہاں دار و رسن کے حال ہوں گے — جہاں دل قید میں پامال ہوں گے
مگر گھبرا کے یاں ٹھوکر نہ کھانا
مسافر راستے میں رک نہ جانا

تری منزل ہے آزادی کی منزل — تمناؤں کی آبادی کی منزل
تجھے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنا ہیں — غلامی کی سلاخیں توڑنا ہیں
لگے بڑھنے وہ تاریکی کے سائے — بڑھے جانا قدم رکنے نہ پائے
فضا تاریک ہے مشعل جلا دے — اندھیرے راستوں کو جگمگا دے
وطن تیرا مصیبت میں ہے ہمدم — نجات اب تیری ہمت میں ہے ہمدم
وطن میں کیا زمانہ ہے اندھیرا — مگر ہونے ہی والا ہے سویرا
نئی تعمیر ترے ہاتھ میں ہے — تری تقدیر ترے ہاتھ میں ہے
بڑھے جانا نہ ہرگز ہچکچانا
مسافر راستے میں رک نہ جانا

علی جواد زیدی

انتقام

میرے قبضہ میں اگر نظمِ جہاں ہو جائے
لاغرانساں کی گردن پہ چلادوں شمشیر
روند دوں سامنے آئے جو مرے بے تقصیر
محفلِ عیش میں پہنچے نہ کبھی نالۂ غم
اور مضبوط کروں درد و الم کی زنجیر
مرے قبضہ میں اگر نظمِ جہاں ہو جائے

ظلم و بیداد کے طوفاں کو روانی دے دوں
پھر سے چنگیز و ہلاکو کو جوانی دے دوں
عظمتِ کفر کو کچھ اور بڑھانے کے لئے
جہل کے ماروں کو نمرود کا ثانی دے دوں
مرے قبضہ میں اگر نظمِ جہاں ہو جائے

دیوتاؤں کی دیا، اور مسیحا کی شفا
اہلِ ایماں کی عنایات، رسولوں کی عطا
سایۂ شہپرِ جبریل کا دامِ تقدیس
کچھ بھی باقی نہ رہے فتنۂ شیطاں کے سوا
مرے قبضہ میں اگر نظمِ جہاں ہو جائے

شب کی ظلمت میں گناہوں کے دئیے جلتے رہیں
مکر کے سانچوں میں سرمایہ کے بت ڈھلتے رہیں
خونِ آدم سے بجھانے کے لئے پیاس اپنی
جرم آغوشِ تمدن میں یوں ہی پلتے رہیں
مرے قبضہ میں اگر نظمِ جہاں ہو جائے

تحسین سروری

فرمان

جو ہمیں لیجائیں عہدِ بربریت کی طرف
ذہن و قلب و پا کی ایسی رجعتوں کو چھین لو

بندۂ بے بس کے نالے بھی پہنچ سکتے نہیں
آسمانِ خواجگی کی رفعتوں کو چھین لو

جھونپڑوں تک جب پہنچ سکتی نہیں موجِ طرب
قصر و ایواں کی فراواں عشرتوں کو چھین لو

بے گناہ و بے خطا دوزخ کا ایندھن کیوں بنیں
قبضۂ شداد سے سب جنتوں کو چھین لو

جلوتِ جمہور کی بے کیفیوں کا واسطہ
ہر محلِ شہ کی رنگیں خلوتوں کو چھین لو

مستی و رندی فقط زردار کا حصہ نہیں
جام و مینائے حسیں کی عصمتوں کو چھین لو

بے خضر ہی سب کو ملنا چاہیے آبِ بقا
راستہ گم کرنے والی ظلمتوں کو چھین لو

عام ہو کر بھی جو محدود و مقید ہو گئیں
فطرتِ فیاض کی اُن رحمتوں کو چھین لو

عرش و کرسی سے مقامِ تختِ سلطاں ہے بلند
ابنِ آدم کی خدائی عظمتوں کو چھین لو

سلیمان اریب

مسائل حاضرہ اور ہماری مطبوعات

عصر حاضر آپ کو مجبور کر رہا ہے کہ نت نئے مسائل کے ہر پہلو سے آگاہ ہوں۔ علمی نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں نئی تحریکوں اور نئے مسائل سے آپ ناواقف نہیں رہ سکتے، وقت کی اسی اہم ضرورت اور تقاضے کے پیش نظر انڈیا بک ہاؤس نے مسائل حاضرہ پر تحقیقی اور عام فہم انداز میں متعدد کتابیں شایع کی ہیں۔ جن کا مطالعہ آپ کے لئے انتہائی مفید اور معلومات آفریں ہوگا۔

ہماری کتابیں

- جنگ اور روپیہ .... ۱۲؍
- جنگ اور اغذیہ .... ۱۵؍
- جنگ اور مالیہ .... ۱۲؍
- اشتراکی روس .... ۶؍
- تنظیم مابعد جنگ .... ۶؍
- ہندستان کے زر پر جنگ کے اثرات .... عمہ
- جنگ اور غذا کا مسئلہ .... ۱۲؍
- حیدرآباد کی صنعتوں پر جنگ کے اثرات .... عہ
- جنگ اور راتب بندی .... عمہ
- امریکہ میں بین الاقوامی زر کے منصوبے .... ۶؍
- کینیڈا " " " .... ۸؍
- انگلستان " " " .... ۸؍
- ہندستان " " " .... ۸؍
- محصول زائد نفع اندوزی .... ۸؍
- ہندستان کا قومی قرضہ .... ۱۲؍
- ہندستان کے لئے ایک معاشی لائحہ عمل .... ۱۲؍
- حیدرآباد اور قیمتوں کی نگرانی .... عہ

تازہ ترین اشاعت

اقبال وے آوٹ بزبان انگریزی قیمت ۸؍

شاعر مشرق نے ہندستان کی سیاسی گتھیوں کا حل پیش کرتے ہوئے ہندستان کی سیاسی و سماجی ترقی کا لائحہ عمل دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی دلچسپ اور اہم ترین کتاب ہے۔

ہماری مطبوعات کے علاوہ آپ ہمارے مرکز سے ہندستان کے ممتاز ناشرین و مطابع کی تمام کتابیں حاصل کر سکتے ہیں۔

ہر قسم کے کتابوں کا مرکز

انڈیا بک ہاؤس

عابد روڈ — حیدرآباد دکن

مرکز مصنوعات ملکی
ملکی مزدُورنے
آپکے لئے کیا کچھ تیار نہیں کیا۔
مرکزِ مصنوعات ملکی (عابد روڈ)
(پر ملاحظہ فرمائیے۔)
مالکان :۔ مسرز سالمین اینڈ کمپنی

سوئٹ روس

یہ اردو زبان میں پہلی کتاب ہے۔ جس میں سوئٹ روس کی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت تفصیل سے بالکل غیر جانبدارانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ چند عنوانات ذیل میں دیئے جاتے ہیں۔

معاشی زندگی:۔ صنعتی نظام۔ صنعتی سائنس۔ زرعی نظام۔ زرعی سائنس۔ تقسیم پیداوار کا نظام۔ معاشی تحفظ۔

سیاسی زندگی:۔ سوئٹ حکومت کا دستور۔ دستور کی خصوصیات۔ کمیونسٹ پارٹی۔ مزدور سبھائیں۔ ڈکٹیٹرشپ یا جمہوریت۔ خارجی پالیسی۔ قومیت کا مسئلہ۔ غیر روسی قومیتوں کی معاشی اور معاشرتی ترقی۔ سرخ فوج کا حصہ موجودہ جنگ میں۔ سرخ فوج کی تنظیم۔

معاشرتی زندگی:۔ تعلیم کا نظام۔ فنون لطیفہ کی حیثیت۔ فن تعمیر مصوری و سنگ تراشی۔ تھیٹر۔ میلے۔ سینما۔ ادب۔ پریس۔ عورتوں کی حیثیت۔ صحت جسمانی۔ کھیل:۔ مذہب اور اخلاق۔

ہماری مطبوعات

(۱) غذا کیونکر ملے؟ قیمت ۶ر (۲) سوئٹ روس قیمت تین روپے (۳) مسئلہ غذا اور قیمتوں پر نگرانی ایکروسیا ازیم نرسنگ راؤ ایڈیٹر رعیت

ہمارے پاس ملنے والی کتابیں

لینن ۷ر	نئی تصویریں ۹ر۴ہر
استالین ۷ر۷ہر	اتحاد عمل کا پیام ۷ر
غذا کیسے ملے؟ ۱۴ر	نیا ادب نمبر(۱) عہ۲ر۸ہر
نفرت ۷ر	نیا ادب نمبر(۲) ...... ؍؍
بچوں کے قاتل ۷ر	جاپان کا اصلی روپ عہ۷ر۴ہر
رویا ۳ر۶ہر	فاشزم کیا ہے؟ ۱۴ر
نئے نغمے ۷ر	پیکار ۷ر
ہل اور ہنسیا ۷ر	دیہات کے غریبوں سے خطاب عہ۲ر۸ہر
لینن ازم کی اساس عہ۱۲ر	جھنکار عہ۱۲ر
کارل مارکس ۱۴ر	سوشلزم عہ۱۲ر

ماڈرن بک ڈپو

پبلشرز و بک سیلرز

سلطان بازار — حیدرآباد دکن

مطبوعۂ
اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز
(مغلپورہ حیدرآباد دکن)

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۸/

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

سب رس

جلد ۷ بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۴ء شمارہ ۹

اُردو کا قدیم ترین سائنسی ادب

باوجود تحقیق اور تلاش کے ڈیڑھ سو سال سے پہلے کی
کوئی سائنسی کتاب دستیاب نہ ہوسکی اور نہ کسی سرکاری یا
غیر سرکاری کتب خانہ کی فہرست میں ایسی کتاب کا پتہ چلا۔ ہماری
تحقیق میں اردو زبان میں سائنس کی سب سے قدیم کتاب "بحر حکمت"
ہے جو ۱۷۹۵ء میں لکھنو سے لیتھو میں شائع ہوئی۔

انڈیا آفس کے کتب خانہ کی فہرست میں سائنس کی
صرف دو کتابوں کا ذکر ہے جن میں سے ایک ۱۸۲۳ء اور دوسری
انیسویں صدی کی ہے۔ بلوم ہارٹ نے ان کتابوں کے متعلق
نمبر (۲۳۰) اور (۲۳۱) کے تحت حسب ذیل معلومات قلمبند کی ہیں:۔

آغاز:۔

"اس کتاب پڑھنے والوں پر پوشیدہ نہ رہے کہ
مولف تمام اس کی تالیف میں دو مطلب رکھے
ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس ملک کے باشندوں کو
حقیقت ان نباتات کی اور کیفیت ان چیزوں
کی جو ولایت مغرب کے طبیب اپنی دواؤں میں
ملاتی ہیں دریافت ہووے۔"

"یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں
ان نباتات سے دوائیں تیار کرنے اور ان کے
استعمال کرنے کے طریقے درج ہیں جن کو یورپین
ڈاکٹر ہندوستان میں بیماریوں کے علاج میں
استعمال کرتے ہیں۔ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے
کہ فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی انسٹرکٹر کیپٹن
جان ولیم ٹیلر نے اس کتاب کی نظر ثانی کی ہے۔
تمام قلمی نسخہ میں جگہ جگہ اصلاحیں دی گئی ہیں۔"

تمت تمام شد ہژدہم صفر ۱۲۴۵ھ

خواص الادویہ

آغاز:۔

"سب چیزیں جو کہ دنیا میں موجود ہیں یا سالدم
(Soldium) یعنی یابس یا لیکیویڈم
(Liquidum) یعنی رطب یا ویپرم
(Vaporuin) یعنی بخار یا بھاپ ہیں
اور یہی تینوں یعنی رطوبت اور یبوست اور بخاریت
چیزوں کی تین حالتیں کہلاتے ہیں۔"

مرتب فہرست نے کتاب کے متن سے متعلق انگریزی میں جو
اپنی رائے ظاہر کی ہے اس کا اُردو ترجمہ یہ ہے۔

"غالباً کسی یوروپین مترجم نے کسی انگریزی طبی
مقالے سے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ شروع
سے آخر تک انگریزی اور لاطینی اصطلاحیں
استعمال کی گئی ہیں جنھیں اردو رسم الخط میں پیش
کیا گیا ہے۔ چند طبی نسخوں کو کتاب کے آخر میں
شامل کیا گیا ہے۔"

اس دور کی جن کتابوں کا حال معلوم ہوسکا وہ حسب
ذیل ہیں:۔

(۱) بحر حکمت (مطبوعہ) ۱۷۹۵ء
(۲) فری سیز آن میرل پائزنس (مطبوعہ) ۱۸۲۶ء
(۳) کتاب ادویات (قلمی) ۱۸۳۰ء
(۴) مجموعہ مسائل سائنس (قلمی) ۱۸۳۰ء
(۵) تپ اور اسہال کا رسالہ (مطبوعہ) ۱۸۳۱ء
(۶) بیان سانپ کے بچھو کا (مطبوعہ) ۱۸۳۱ء

یہ کتابیں اردو زبان میں سائنس کے قدیم ترین کارنامے ہیں

اس لئے نہایت اہم ہیں۔ اب یہاں اس دور کی ہر کتاب کے موضوع زبان اور اسلوب پر ضروری معلومات پیش کی جاتی ہیں۔

بحرِ حکمت تقطیع ۱۰" ۶½" صفحات (۵۸) سنہ طباعت ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۸ء۔

اس مقالے کی تیاری کے سلسلے میں ہمیں جتنی مطبوعہ اور قلمی کتابیں دستیاب ہوئیں ان میں یہ کتاب سب سے زیادہ قدیم ہے اور یہ لیتھو میں چھپی ہے۔ پادری پرکنس صاحب کی کوشش سے کسی انگریزی کتاب سے ترجمہ کی گئی۔ کتاب کے سرورق اور آخری صفحہ پر کہیں بھی مترجم کا نام درج نہیں۔ فہرست اور دیباچہ بھی نہیں ہے۔ صفحہ (۲) سے "مقدمہ" کی سرخی کے تحت اصل کتاب شروع ہوگئی ہے۔ سرورق کی عبارت درج ذیل کی جاتی ہے:-

"ایں رسالہ عجیب وغریب دربیان تحقیق ساختن
سبب روانگی و دریافتن قواعد حرکت دخانی
کل مسمیٰ بہ "بحر حکمت" کہ بسعی و توجہ صاحب والا
مناقب پادری پرکنس صاحب ترجمہ اش بزبان
اردو عام فہم شدہ بتاریخ پنجم شعبان ۱۲۱۴ھ
بہ بیت السلطنت لکھنو در مطبع مسیحائی باہتمام
اضعف العباد مسیح الزماں ولد مولوی نور محمد مرحوم
طبع گردید"

آخری صفحہ پر یہ عبارت ہے:-

"حق سبحانہ تعالیٰ جل جلالہ کی برکت سے
یہ کتاب مسمی بہ بحر حکمت بیچ دریافت کرنے احوال
حکمت روانگی اور ترکیب طیار کرنی دخانی کل
کے جو تالیف کی ہوئی پادری پرکنس صاحب کی
حسب فرمائش بعض صاحبان عالی شان کے
مطبع مشہورہ مسیحائے میں اہتمام اضعف العباد
واحقر الافراد مسیح الزماں ولد مولوی نور محمد
مرحوم کی بیچ دار السلطنت لکھنو کی کشمیری محلہ
میں چھپائی گئی ۱۲"

اس کتاب میں دخان (Steam) کا بیان ہے اس کی ایک سرخی "بیان میں تحقیق دخان اور اطوار پیمائش کے" تحت دخان اور دھویں کا فرق بتلایا گیا ہے اور "پیمائش سطری" یعنی طول ناپنے کے پیمانے۔ "پیمائش سطحی" یعنی طول و عرض ناپنے کے پیمانے اور "طول و عمق" ناپنے کے پیمانوں کو درج کیا گیا ہے۔ دوسری سرخی "دخانی کل کا بیان" کے تحت اس کی اہمیت اور افادیت کو واضح کیا گیا ہے اور یہ بیت لکھی ہے ؎

ہے اس کل میں حکمت بھری تو بتو ہ بلاشک اسے چھوٹی دنیا گنو

حرارت کا ذکر کرتے ہوئے تھرما میٹر کے متعلق اس طرح لکھا گیا ہے:-

"...... تصور نے اس امر واقعی کے
عالمان فن کو ایک نہایت مفید آلہ کی ایجاد کی
طرف جو انگریزی میں تھرمو میٹر اور اس
رسالہ میں نا بدرجہ نما کہلاتا ہے متوجہ کیا
جس کے بنانے کی یہ طریق ہے بالشت بھر
لانبی ایک شیشی کی نئے جس کا سوراخ بہت
ہی باریک ہو لیتے ہیں اور اس کی ایک طرف
کو آگ میں گلا کر گرہ جو فدار کی شکل بناتے ہیں
پھر اس میں سیماب اتنا داخل کرتی ہیں کہ
گرہ مذکور بھر جاوے اور سیماب نئے کی
تہائی تک پہنچی پھر جتنی ہوا کہ اس نئے میں
باقی رہی بہ ہوشیاری تمام نکال کرنے کی

دہانہ کو مضبوطی سے بند کرتے ہیں بعد اس کی
گرہ مذکور کو گلتی ہوئی برف میں داخل کرتے ہیں
تب سیماب اپنی حرارت کچھ کھو کر سمٹ جاتا ہے
اور نزول کرنے لگتا ہے۔ پھر جس جگہ سیماب نزول
کرتے کرتے ٹھہر گیا ایک نشان کرتے ہیں اور اس کا
نام نقطۂ انجماد آب رکھتے ہیں اس لئے کہ برودت
کے اس درجہ پر پانی جم کر برف ہو جاتا ہے پھر
اس گرہ پر سیماب کو کھولتے پانی میں داخل کرتے ہیں
تب سیماب حرارت حاصل کر کے ...... درجہ بدرجہ
نئے مذکور میں چڑھتا جاتا ہے جب دیکھتے ہیں کہ
چڑھتے چڑھتے ٹھیر گیا تب عین نقطۂ وقف پر
ایک نشان کرتے ہیں اور اسے نقطۂ جوش آب
کہتے ہیں ...... مناسب ہے کہ اس رسالے
کے پڑھنے والے ان دو حساب کو یعنی نقطۂ انجماد
بتیس اور نقطۂ جوش دو سو بارہ یاد رکھیے کیونکہ
آنے والے ورقوں میں استعمال ان کا اکثر ہے ......"

صفحہ (۱۳) کے حاشیہ پر "ایر پینپ" کی اس طرح تعریف
کی گئی ہے:-

"...... اور ایر پینپ ایک آلہ نہایت مکلّف
بنا ہے کہ ہوا اس کے وسیلے سے ظرف سے نکالی
جاوے تا کہ اس کی غیر حاضری کی تاثیر معلوم ہو۔"

صفحہ (۱۶) کے بعد ایک بڑا نقشہ دیا گیا ہے جس کا نام
"نقشہ کلاں دخانی کل مع بیلر وغیرہ" ہے۔ اسی طرح صفحہ
(۱۷) پر "نقشہ دخانی کل خیالی" کی سرخی کے تحت ایک دوسرا
نقشہ ہے۔ ان نقشوں کی مدد سے دخانی کل کے اعمال کو
سمجھایا گیا ہے۔ صفحہ (۱۸) کے حاشیہ پر "آلہ مسمی پنپ"
کا نقشہ دے کر اس کے اعمال کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ پمپ
کنویں سے پانی کھینچنے کے کام آتا ہے۔ صفحہ (۲۳) پر "بینوکومن صاحب
کے دخانی کل کا" نقشہ دے کر اس کی ساخت کے متعلق تفصیلی
معلومات قلمبند کر دی گئی ہیں۔ اس آلے کی مدد سے کنویں
یا کان سے پانی باہر نکالا جاتا ہے۔ صفحہ (۲۷) پر بیلر اور اس
کے متعلقہ آلوں کو ایک نقشہ سے واضح کر کے دخان کے دباؤ کی
مختلف شکلوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

"بیان اجزائے دخانی کل" کی سرخی کے تحت بیلر کی
تعریف کی گئی ہے اور بتایا ہے کہ وہ تانبے یا لوہے سے بنایا
جاتا ہے۔ بیلر ایک قسم کا برتن ہے جس میں پانی گرم ہو کر بھاپ
بن جاتا ہے۔ بیلر کے ایک دوسرے جزو "حافظ" کی تعریف،
ساخت اور اس کے اعمال کی تشریح کی گئی ہے پھر "آلہ مانع"
کا ذکر ہے جس کا کام یہ ہے کہ حسب ضرورت آگ زیادہ یا
کم روشن کرے۔ اس کا نقشہ بھی وضاحت کے لئے دیا گیا ہے۔
بھاپ کے بننے سے پانی کی مقدار میں کمی ہوتی ہے اور آگ کے
التہاب سے بھاپ کی طاقت رفتہ رفتہ زیادہ ہوتی جائے گی
اور اندیشہ لگا رہتا ہے کہ پانی کی کمی کے سبب کہیں بیلر پھوٹ نہ
جائے۔ اس اندیشے کو دور کرنے کے لئے ایک آلہ استعمال
کیا جاتا ہے جس کا نام "ارزق" ہے۔ اس کے ذریعہ سے بیلر
میں اسی قدر پانی داخل کیا جاتا ہے جتنا کہ بھاپ کے بننے میں
صرف ہوتا ہے اس آلے کو نقشے کے ذریعے سے واضح کیا گیا ہے۔
یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پانی بیلر میں حسب ضرورت پہونچ
رہا ہے یا نہیں دو نل لگائے گئے ہیں تا کہ پانی کی کمی و زیادتی
معلوم ہوتی رہے۔ کثرت استعمال سے بیلر میں ریت اور میل وغیرہ
بہت جمع ہو جاتا ہے اس لئے بیلر کے اوپر کی طرف ایک بڑا
سوراخ بنایا گیا ہے۔ جب صفائی کرنی ہوتی ہے تو اس سوراخ

کو ایک "ڈھکنے" سے بند کردیا جاتا ہے تاکہ بھاپ کا راستہ
بند ہوجائے اور آدمی آسانی سے بیلر کو صاف کرسکے ۔ غرض
بیلر کے تمام متعلقات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور وضاحت
کے لئے کئی نقشے کتاب میں درج ہیں جو لیتھو میں نہایت خوبصورت
چھپے ہیں ۔

اس کتاب کی زبان میں قدامت پائی جاتی ہے جملوں
کی ساخت اور ترکیبیں قدیم اردو کا نمونہ ہیں مثلاً

"اب آغاز دخانی کل کا کرتا ہوں مطابق نقشے کے"
"مصنف سعی کرتا ہے کہ اس بات کو روشن کرے"
"ہم آغاز مطلب کا اب یوں کیا چاہتے ہیں" وغیرہ

بعض ایسے قدیم الفاظ جگہ جگہ نظر آتے ہیں جو اب
متروک ہوچکے ہیں جیسے ۔

"پانیمیں، ہواین، ادجانی (اد بجانی) بھیتر (اندر)
وے (وہ) یہے (یہ) ۔ دیسا (ویسا ہی) اور پروار وغیرہ ۔

بعض الفاظ کا املا بھی مختلف ہے مثلاً

جاناچاہئے (جاننا چاہئے) کوئی (کنویں) کھان (کان)
جسّی (جس سے) ۔ اسّی (اس سے) جیسے
حرف "ٹ" کو "تّ" لکھا گیا ہے ۔
تھر، تھنڈا ۔ فت ۔ تو ٹنی وغیرہ

بعض انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ کیا گیا اور بعض کو ویسا ہی اردو
میں منتقل کرلیا گیا : ۔

دخانی کل (Steam Engine) سلنڈر
اسکو یرانچ ——— اسکرو ۔ پیچ
کیوبک فٹ ——— ایر پینپ
تھرمومیتر یا تھرمامیٹر ۔ تاب درجہ نما اسکیل
پیستن وغیرہ

علم طبیعیات کی جو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں
ان میں سے چند یہ ہیں : ۔

عمل تکثیف ۔ عمود علی الافق ۔ نقطۂ جوش ۔ نقطۂ انجماد ۔

"باب خانق" کی سرخی کے تحت جو عبارت ہے اس کا نمونہ
پیش کیا جاتا ہے ۔

"خانق کا قاعدہ علیہ اس پیچ کی جو آگے مذکور ہے
مانند ہے کہ اس کی ایک جانب پھیرنے سے آمد دخان کی
بیلر سے مطلق رک جائے گی لیکن جانب ضد پھیرنے سے
دخان باسانی تمام رواں ہوگا پس روشن ہے کہ جس قدر
بند یا کھلا ہو تس قدر دخان کل میں داخل ہوگا امر اختیاری ہے"

سائنس کی مطبوعہ اردو کتابوں میں یہ سب سے
قدیم ہے باوجود اس کے کہیں بھی اردو کو ہندی زبان نہیں
لکھا گیا ہر جگہ اردو ہی لکھا ہے اس کے بعد جو کتابیں چھپی ہیں
ان میں سے بعض کتابوں میں اردو کو ہندی لکھا گیا ہے ۔

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں (۵۳۶ ب ۸ ۱ ب) نمبر پر یہ
کتاب مل سکتی ہے

ٹری ٹیز آن مینرل پائزنس

تقطیع ۶" ۵½"
صفحات (۱۳۲) سنہ طباعت ۱۵ جولائی ۱۸۲۶ء مصنف
پی ۔ بریٹن ۔ مترجم کا نام درج نہیں ۔

یہ رسالہ ان زہروں کے متعلق ہے جو دھاتوں سے
تعلق رکھتے ہیں مثلاً آکیمیو رنٹ آو مرکیوری ۔ آرسنک
(سنکھیا) انٹیمونی (سنگ سرمہ) کاپر (تانبا) ۔ لیڈ (سیسا)
زنک (جست) وغیرہ ۔

کتاب کا سرورق انگریزی زبان میں ہے جس کی
عبارت یہ ہے : ۔

TREATISE
ON
MINERAL POISONS
BY
P. Breton Surgeon
In the Service of
The Hon'ble East India Company
AND
Superintendent
OF THE
Native Medical Institute
Govt: Lithographic Press
July 15th 1826

کتاب میں کہیں بھی یہ درج نہیں کہ وہ کہاں چھپی -
البتہ کتاب کے صفحہ (۳۷) کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ
کتاب کلکتہ میں چھپی ہوگی اور اس کا رسم الخط بھی کلکتہ کی
دوسری کتابوں کا سا ہے جو لیتھو میں چھپی ہیں - عبارت یہ ہے:-

"۱۸۲۵ء میں کلکتے کے ایک مرد نے دن
کو ہڑتال کھائی تھی آدھی رات کے قریب
اس کی حالت بہت تباہ ہوئی اس وقت
لوگ اس کو چاندنی چوک کے (ہاسپٹال)
یعنی دار الشفا میں علاج کے واسطے لائے
چونکہ وہ (ہاسپٹال) ہمارے سپرد تھا اس
واسطے ہم اس کے پاس گئے ...."

کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:-

"بسم اللہ الرحمن الرحیم
(ٹکسیکالجی) یعنی بیان زہروں کا"

اس سرخی کے تحت (آکسیمیوریٹ .....آو... مرکیوری)
کے زہر کا بیان ہے - یہ زہر بنایا جاتا ہے اور اس کے بنانے کی
ترکیب بتائی گئی ہے - یہ زہر دواؤں میں کام آتا ہے اگر کوئی
زیادہ مقدار میں کھائے تو چند گھنٹوں میں موت واقع ہوتی ہے۔

اس زہر کے کھانے کے بعد جو علامتیں ظاہر ہوتی ہیں ان کو
گنایا گیا ہے - اس زہر کا امتحان مختلف حیوانوں مثلاً
خرگوش اور بلی پر کرنے کے بعد جو نتائج برآمد ہوئے ان کو
درج کر دیا گیا ہے - اس زہر کے توڑ کے لئے لعاب دار چیزیں
مثلاً گھولا ہوا گوند یا بہدانہ مفید ہیں - سب سے اچھا
توڑ انڈے کی سفیدی ہے - زہر کھائے ہوئے انسان کی
جان بچانے کے لئے طبیبوں کو جن امور کا بطور خاص
خیال رکھنا چاہئے انھیں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے
اور ہدایت کی گئی ہے کہ مریض کو صحت یاب ہونے
تک زود ہضم غذا کم مقدار میں دینی چاہئے - اگر زہر
کھانے سے کسی کی موت واقع ہو جائے تو اس کا
پوسٹ مارٹم کر کے دیکھنا چاہئے کہ زہر کا اثر معدہ اور
آنتوں پر کس طرح ہوا ہے - اگر زہر کے ٹکڑے اور آنتوں
کے اندر سرخی نظر آئے تو یقین ہوگا کہ یہ آدمی زہر کے کھانے
سے مرا ہے -

صفحہ (۱۷) سے سنکھیا کا بیان شروع ہوتا ہے -
اس کے ناموں کی اس طرح تشریح کی گئی ہے: -
"(آرسنک) انگریزی لفظ ہے ...... اور معنی
اس کے زہر چوہے کا ہے - اس چیز کو عربی زبان میں
سم الفار بولتے ہیں اور اس کے معنی بھی زہر چوہے
کا ہے لیکن سم الفار صرف اس چیز کی صفت ہے کیونکہ
عربی میں اصل نام اس کا شک ہے اور سنسکرت میں
سنکھیا اور شل بولتے ہیں ...... فارسی زبان میں
زرنیخ سفید بولتے ہیں اور شاید کہ زرنیخ لفظ (آرسنک
سے نکالی گئی ہے مگر تلفظ میں فرق ہوا ہے -
ہندوستان کے لوگ کہتے ہیں کہ سم الفار کہ

عوام اس کو سنبل کھار کہتے ہیں یا نچ قسم ہے "۔

پھر اس کی اقسام بیان کرکے اس کے متعلق ضروری معلومات درج کردی گئی ہیں۔ اس کے بعد آرسنک کھانے کے بعد جو علامتیں ظاہر ہوتی ہیں ان کا ذکر ہے۔ کتے اور خرگوش پر اس زہر کا تجربہ کرنے سے جو نتیجے برآمد ہوئے تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ ایسے (۶) اشخاص کی وارداتوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جنھوں نے یہ زہر کھا لیا تھا " فائدہ" کی سرخی کے تحت اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ اب تک کوئی دوا ایسی ایجاد نہیں ہوئی جو اس زہر کی تریاق ہو۔ "علاج" کی کئی تدابیر بتلائی گئی ہیں اور طبیبوں کو ہدایات دی گئی ہیں۔

صفحہ (۴۸) پر انٹیمونی کی پیدائش اور ساخت کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس سے جو دوائیں بنائی جاتی ہیں ان کی ترکیب بھی بتا دی گئی ہے اور پہلے زہر کی ترتیب کے مطابق تمام ضروری چیزوں کا حال درج ہے۔ اسی طرح تانبے سیسے اور جست کے زہروں کے خواص، تاثیر اور علاج وغیرہ کو وضاحت سے لکھا گیا ہے۔

کتاب کے ختم پر اس کی غرض و غایت کے متعلق یہ لکھا ہے:۔

" جن زہروں کا بیان اس رسالے میں ہوا ہے ان زہروں کے سوائے اور بھی بہت معدنی زہر ہیں کہ انگریزی طبیبوں کی دواؤں کے کام میں آتے ہیں لیکن چونکہ ان کے کھانے میں اتنی جوکھم نہیں ہے جو اس رسالے کے زہروں میں ہے اس لئے اس رسالے میں کہ
تو سیکھ لوگ بشکہ علم طب کے مدرسے کے طالب علموں کے سیکھنے کے واسطے تصنیف کیا گیا ہے۔ ان زہروں کا احوال نہیں لکھا گیا تا کہ رسالہ بڑھ نہ جاوے "

اس کتاب میں انگریزی طب کی جو اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں ان میں سے اکثر کا اردو ترجمہ کرلیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر چند یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

مرکیوری (پارا)۔ سلفیورک اسڈ (گندھک) نروز (اعصاب) لفٹ ونٹریکل (بطن الیسر)۔ رائٹ ونٹریکل (بطن ایمن) گلسٹر (حقنہ)۔ رکٹم (مستقیم)۔ وین (ورید)۔ انجکشن (پچکاری) بٹینگ (ضربت) وغیرہ۔

بعض الفاظ کا املا اس طرح لکھا گیا ہے مثلاً۔

تامی (تانبے)۔ مہہ (منہ)۔ چھٹھا (چھٹا)۔ دھوکھا (دھوکا) وغیرہ

ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو اب متروک ہوچکے ہیں وہ یہ ہیں جیسے کتنے (کئی)۔ بھیتر (اندر)۔ ان نے (اس نے)۔ ناقوتی (کمزوری) اکڑنا اور جھکنا سے اکڑاہٹ اور جھکاہٹ صفت بنائی گئی ہے۔

حسب ذیل جملوں میں "گئی" کی جگہ "گئیں" استعمال کیا گیا ہے۔

" بھانت بھانت کی دوائیں اس زہر کی قوت کم کرنے کے لئے حیوانوں کو دی گئیں ہیں۔

" جا بجا اس میں بائی کی پوٹلیاں بندھ گئیں تھیں"

دینا چاہئے کی بجائے دیا چاہئے لکھا گیا ہے۔ ٹ اور ڈ کو ت، دَ لکھا ہے۔ پانی کی جمع پانیوں اور شریان کی جمع شرائین بنائی گئی ہے۔

حسب ذیل ہندی الفاظ جگہ جگہ جملوں میں لائے گئے ہیں:۔

گن (خاصیت)۔ ادھک (زیادہ) ترنت (فوراً) موا (مرا) جنتر (آلہ) وغیرہ وغیرہ

یہ کتاب کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں (۹۵ ۱۵ ۶ ب-ز) نمبر پر موجود ہے۔

کتاب ادویات (قلمی) تقطیع "۶ "۹۔ اوراق (۱۴۴) خط نستعلیق شکستہ سنہ کتابت ۱۲۴۹ھ ۱۸۳۰ء

اُردو نثر میں یہ رسالہ مغربی طب کی کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اور اُردو میں مغربی طب کی ایک نہایت قدیم کتاب ہونے کی حیثیت سے خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ پہلے ورق کی پیشانی پر "کتاب ادویات است" لکھا ہے۔ غالباً یہی اس کتاب کا نام ہے۔ اس کے بعد ہی پہلا باب شروع کر دیا گیا ہے۔ مصنف اور مترجم کے نام کا کہیں بھی حوالہ نہیں۔ اس کے ختم پر کوئی ترقیمہ نہیں ہے بلکہ اسی کاتب نے دوسری کتابیں "بیان الکٹر سٹی" اور "بیان رحم" شروع کر دی ہیں۔ سب کے آخر میں یہ ترقیمہ ہے :۔

"کتاب نسخہ جات متفرقات ترکیب انگریزی .. برائے خاطر مشفق شفیق برادر ہم کیشی ہونسی مخلصی محرم راز خفی و جلی واقف اسرار لم یزلی برادرم شیخ محمد علی ڈاکٹر ... قلعہ کالنجر روحی فداک بخط خام .... افہام فقیر حقیر پُر تقصیر بندہ الف خاں .... رحمت تحریر یافت۔ تحریر بتاریخ بست پنجم ماہ ذیقعد ۱۲۴۹ھ مطابق ماہ مئی ۱۸۳۰ء لغایت پنجمی بیساکھ"

اس کتاب میں جملہ (۵۷) باب ہیں۔ ہر باب میں کسی خاص مرض اور اس کے علاج کے طریقوں کو بیان کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند ابواب کی سرخیاں یہاں درج کی جاتی ہیں :۔

(۱) تپ کے علاج میں جو کہ سردی سے ہوتی ہے (۲) ہیضہ کے علاج میں۔ (۳) اپی لپسی۔ صرع یعنی مرگی کے علاج میں۔ (۴) ڈیاریا یعنی شکم جاری کے علاج میں۔ (۵) خلل دماغ۔

ہر مرض کے اردو نام کے ساتھ انگریزی نام بھی اردو رسم الخط میں لکھے گئے ہیں اور بعض کے عربی اور فارسی نام بھی دئے ہیں۔ ایک ایک مرض کی دو دو تین تین دوائیں تجویز کی گئی ہیں۔ بعض امراض میں مریض پر جو مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں ان کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مرکب ادویات کے بنانے کی ترکیبیں سمجھائی گئی ہیں۔

اس کتاب کے تیسرے باب اور اختتام کی عبارتیں یہاں درج کی جاتی ہیں :۔

تیسرا باب :۔

" التہاب سینہ سوزش سینہ چھاتی کے جلن ... سوء الہضم، بدہضمی آجیرن۔ جاننا چاہئے کہ جب آدمی کے آنتیں کمزور ہو جائیں اور اس کے سبب کھٹی ڈھکارین آیا کریں اور بدہضمی ہو جائے تب یہ دوائی پلا دے علاج سلفیورک ایسڈ ایک حصہ اور واٹر آٹھ حصہ ملا کر پندرہ بوند سے تیس تک مصری کے شربت کے ساتھ پلا دے"

اختتام :۔

"پوڈر مار کے درخت کا کر اڑھائی ہاتھ سے زیادہ ہو وے جڑ پیڑ سے سوکھا کے مکینی اس کی پانچ گرین سے پندرہ تک کھلانے سے بہت فائدہ کیا۔ تمام شد"

کتاب کے ختم پر "دوائی متفرقات" کے عنوان سے مختلف نسخے درج کئے گئے ہیں جو (۲۰) صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کی اختتامی عبارت یہ ہے :۔

"تس پیچھے وہی چھانے ہوئے پانی کو لے کے پکاوے کہ اسپرٹ کم کے مانند گاڑھا جاوے بعد اس کے پوڈر اور مکینی کو ٹلے کی ایک ساتھ ..... چینے کے برابر ہو وے ملا کے چلاوے فقط تمام شد"

مغربی طب کی جن دواؤں اور بیماریوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا تھا ان میں سے چند یہ ہیں :۔

سمن پوڈر۔ دارچینی کا سفوف۔ انفیوزن آف کلوفر۔ کچلے ہوئے لونگ سلفٹ آف ایرن۔ کسیس۔ اسٹون ان بلاڈر۔ سنگ مثانہ۔ افتھلمیا ان۔ جوشش چشم یعنی آنکھ کا درد۔ اینٹمنٹ۔ مرہم "نیٹرک ایسڈ اور سلفیورک ایسڈ" کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ "گلانا" حل کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کھٹی کو (کٹھی) اور ڈکار کو (ڈھکار) لکھا ہے۔

(باقی)

خواجہ حمید الدین

علامہ سید علی حیدر طباطبائی اور انکی شاعری

(سلسلے کیلئے مئی کا رسالہ دیکھئے)

گزشتہ مضمون میں علامہ کے قصائد کو پیش کیا گیا تھا۔

اب ہم ان کی نظموں کا تذکرہ کرتے ہیں، علامہ علی حیدر کی
نظمیں مختلف عنوانوں پر ہیں، جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔
عبرت و حسرت، خطاب بہ اہل اسلام، بے ثباتی دنیا،
گلاب کا پھول، آہ سرد، برسات کی فصل، مرگ انبوہ وغیرہ

عمدہ نظم کے لئے تین امور ضروری تصور کئے جاتے
ہیں اولاً وہ سادہ ہو، صاف ہو، دوسرے نازک خیالی یعنی
کوئی جدت و ندرت ہو، عمدہ تشبیہ ہو، لطیف استعارہ،
اعلیٰ تخیل ہو، تیسرے موثر ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ
ہر نظم میں یہ تینوں امور پائے جائیں بلکہ ان میں کوئی
بھی ہو تو وہ نظم یا کلام عمدہ تصور ہوگا۔

حضرت نظم کی نظموں میں یہ امور بدرجۂ اتم پائے
جاتے ہیں، ان میں سادگی ہے، نازک خیالی ہے اور اثر
بھی موجود ہے، ہم مختصر طور پر بعض نظموں کے نمونے پیش کرتے
ہیں "عبرت و حسرت" یہ ایک طویل نظم ہے اس میں
اہل ہند کی تباہی اور بے سروسامانی کا تذکرہ کر کے
سر آغا خاں کی مسلم یونیورسٹی کی کوشش کو بیان کیا
گیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کالجوں کی سند ہے جن کے پاس — حال ان کا ہے قابل عبرت
کچھ نہیں آتا نوکری کے سوا — کچھ نہیں جانتے بجز خدمت
نہ تو رد و قدح کی تاب ان میں — نہ تو ان میں ہے جنبش کی طاقت
درس گاہوں میں سیکھتے ہیں علوم — کارخانوں میں صنعت و حرفت
کھلتے جاتے ہیں ان پہ سب اسرار — اٹھتے جاتے ہیں پردۂ حیرت
ہوئے جاتے ہیں آشکار ان پر — سب رموز و دقائق فطرت
ان کے قابو میں برق کی ہے عناں — لیتے ہیں آفتاب سے خدمت
جو کہ ہم سے ہیں بے سروساماں — نہیں ان کو نصیب یہ دولت

"برسات کی فصل" خاص طور سے قابل تذکرہ ہے،
یہ نظم انگریزی نظموں کے طرز پر لکھی گئی ہے، جو نازک خیالی
اور اعلیٰ تخیل کا بڑا اچھا نمونہ ہے اور نہایت دلکش پیرایہ میں
یہ لکھی گئی ہے۔

رت ہے برکھا کی ساون کی راتیں — چل رہی ہے ہوا سائیں سائیں
ابر کرتا ہے گردوں سے باتیں — آ رہی ہے صدا سائیں سائیں

نکل وادی سے یوں جیسے اژدر — پہنچا دود سیہ بن کے ہر جا
پھیل دم بھر میں ادھر سے ادھر کر — سر پہ دیو سیہ بن کے گرجا

دل سراسیمہ آپے سے باہر — مست ہاتھی کی سی چال اس کی
برق اس کی ہے تیغ دو پیکر — تیغ کہسار ہے ڈھال اس کی

مشک اندام و تاریک و تیرہ — جیسے گیسوئے مشکیں کسی کا
شوخ پرفن سیہ مست و خیرہ — جیسے جادو ہو چشم پری کا

ڈالیاں وجد میں جھومتی ہیں — ناز کرتی ہیں اترا رہی ہیں
جھک کے ساحل کے لب چومتی ہیں — موج دریا کو ترسا رہی ہیں

اس نظم میں نازک خیالی کا جو اچھوتا نمونہ ہے اس سے
بہتر شائد ممکن نہیں ہے۔ مولانا حالی مرحوم کی قومی

نظموں کے بعد اکثر شاعروں نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے اور عمدہ عمدہ نظمیں لکھی گئی ہیں، علامہ علی حیدر کا "ساقی نامہ" بھی اسی طرح کی نظم ہے اگرچہ یہ ساقی نامہ دراصل شراب کی مذمت پر لکھا گیا ہے، لیکن اس میں مغربی علوم فنون کی ترقی وغیرہ کا بھی تذکرہ ہے، اور پھر مسلمانوں کی قدیم تہذیب اور شائستگی اور ان کے علوم کی ترقی جدید تہذیب کی خام کاریوں کا مقابلہ اور موازنہ بھی کیا گیا ہے، مختصر نمونہ ملاحظہ ہو۔

بادہ خواری کا حکم ہر جا ہے — خط ساغر بجائے طغرا ہے
ابر و باراں پہ کچھ نہیں موقوف — مے زمستاں پہ کچھ نہیں موقوف
مے کشی ہر جگہ ہے دن رات اب — ہند سارا ہے اک خرابات اب
اب کہاں وہ طہارت و تقویٰ — بادہ کش خود ہیں حاکم اعلیٰ
ہوشمندی نے کیا خطا کی تھی — کہ پسند آئی تم کو بے ہوشی
سمجھے ہو تم کہ رندی و الحاد — ہے ترقیٔ قوم کی بنیاد
سمجھے ہو تم کہ یہ رکوع و سجود — محض بے کار ہیں نرے بے سود
سمجھے ہو تم کہ سجدۂ طاعت — عقلا کو ہے باعث ذلت

غرض یہ ایک طویل نظم ہے، جس میں مغربی تہذیب اور مشرقی تہذیب کا مقابلہ نہایت تفصیل سے کیا گیا ہے اور اسلام کے علوم و فنون کی ترقی کی داستان نہایت وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔

"گلاب کا پھول" کے عنوان پر ایک مختصر نظم ہے جس میں نہایت عمدگی سے اظہار خیال مکالمہ کے طور پر ہوا ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

گلگشت باغ میں نظر آیا یہ صبح دم — اک گل فراز شاخ چمن آشکار ہے
پوچھا یہ میں نے دیکھ کے اس کا فروغ رنگ — کس نازنیں کا تو بھی چراغ مزار ہے
معلوم ہو رہا ہے گریباں کے چاک سے — شاید کسی کی خاک پہ تو سوگوار ہے
کہنے لگا کرے کوئی ماتم کسی کا کیا — اپنی ہی زیست کا نہیں کچھ اعتبار ہے
میں نے کہا ہمیشہ رہے یہ ترا شباب — کہنے لگا کہ چشم زدن کی بہار ہے
میں نے کہا کہ روح فزا ہے تری شمیم — کہنے لگا کہ اک نفس مستعار ہے
پوچھا یہ میں نے کان میں آتی ہے کیا صدا — بولا اجل اجل کی جہاں میں پکار ہے
پوچھا یہ رنگ شعلہ تو لرزاں ہے کس لئے — بولا جگر میں زخم ہے پہلو میں خار ہے
میں نے کہا کہ حیف تو کہنے لگا کہ حیف
جائے قرار ہے نہ تو پائے قرار ہے

حضرت نظم کے جن نظموں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے ان سے ان کی نظم نگاری کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور علامہ کی نازک خیالی، سادگی اور اثر کا پتہ چل سکتا ہے۔ یہ امر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ علامہ کی نظمیں کسی قابل نظم نگار شاعر سے کم نہیں ہیں۔

انگریزی نظموں کے ترجمے

علامہ سید علی حیدر کا ایک نمایاں کارنامہ انگریزی نظموں کا ترجمہ کرنا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی غیر زبان کا ترجمہ ہی نہایت مشکل ہے اور پھر نظم ہی میں کسی نظم کا ترجمہ کرنا اور پھر پڑھنے والوں کو وہی لطف دلانا جو اصل نظم میں ہے۔ نہایت دشوار ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ نے اس خوبی اور خوش اسلوبی سے اس کام کو تکمیل پر پہونچایا ہے کہ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

یوں تو علامہ نے کئی انگریزی نظموں کا ترجمہ اردو نظم میں کیا ہے لیکن ٹامس گرے کی مشہور (Elegy) کے ترجمہ "گور غریباں" کو لازوال شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ علامہ کے "گور غریباں" کہنے کا سبب یہ ہوا تھا کہ مولوی

عزیز مرزا مرحوم اپنے بعض دوستوں سے جن میں مولوی ظفر علی خاں
خواجہ غلام الثقلین اور علامہ شرر وغیرہ شامل تھے۔ خواہش
کی تھی کہ گرے کی (Elegy) کا ترجمہ کیا جائے۔ ان اصحاب نے
جو کوششیں کیں وہ کامیاب نہ ثابت ہوئیں۔ مرحوم عزیز مرزا
نے اس خواہش کا اظہار علامہ سے کیا آپ نے نہایت قلیل
عرصہ میں اس کی تکمیل کر دی "گور غریباں" کے متعلق شرر مرحوم کی
رائے قابل ملاحظہ ہے۔

"یہ ایسی مقبول روزگار اور ایسی سرمایۂ ناز انگلستان نظم ہے
جس کا ترجمہ ہمارے واجب التعظیم علامہ اور مستند زمانہ شاعر جناب
مولوی سید علی حیدر صاحب نے کیا ہے مگر کس خوبی سے؟ جس کا
اظہار کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے ایسی جانگداز اور موثر
نظمیں اور بالکل طور پر اردو میں کم کہی گئی ہیں نہ کہ ترجمہ"

پروفیسر سروری نے اپنی کتاب جدید اردو شاعری میں
اس نظم کے متعلق جو خیال ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے۔

"جدید اردو شاعری میں یہ نظم بڑی اہمیت رکھتی ہے۔
اور بلاشبہ ایک قابل قدر اضافہ ہے، طباطبائی کی کامیابی کا بڑا
راز یہ ہے کہ انھوں نے مفہوم کا ترجمہ کیا ہے۔ اردو زبان کے
اسالیب اور ماحول کا خیال کبھی ہاتھ سے نہیں گیا"

علامہ نظم نے صرف اس ایک انگریزی نظم کا ترجمہ نہیں
کیا بلکہ کئی ایک انگریزی نظموں کو اردو نظم کی صورت میں منتقل کیا
ہے، علامہ طباطبائی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے غیر مقفیٰ نظموں
کو اردو میں رائج کرنے کی بھی کوشش کی تھی، اور قدیم وضع کے نقاد
اس قسم کی معرا نظم کو نظم ہی تسلیم نہیں کرتے تھے، مگر آج موجودہ نسل
طباطبائی کی پیروی میں مصروف ہے۔

غزلیں اب ہم علامہ علی حیدر کی غزلوں کی طرف متوجہ
ہوتے ہیں آپ کی غزلوں کا ایک دیوان "صوت تغزل" کے نام
سے شائع ہو چکا ہے، اس سے ۱۹۳۳ء تاریخ بھی نکلتی ہے۔ اس دیوان
میں (۲۲۱) غزلیں اور چند رباعیات شریک ہیں، اگرچہ علامہ کے
قصائد اور نظمیں اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے مشہور ہیں
مگر حقیقت میں آپ ایک غزل گو شاعر تھے، ابتدا سے آخر عمر تک
غزل گوئی کرتے رہے۔

اردو شاعری میں دہلی اور لکھنؤ کے اسکول اپنی اپنی نوعیت
کے لحاظ سے خصوصیات رکھتے ہیں، شعرائے دہلی کے ہاں فارسی زبان
کی دلاویز ترکیبیں کثرت سے پائی جاتی ہیں، لکھنؤ اسکول کی شاعری
میں اس کے بجائے زنانہ معاشرت کی بہت سی چیزیں شامل ہیں،
شعرائے دہلی کی غزلیں مختصر ہوتی ہیں وہ طویل غزلوں سے اجتناب
کرتے تھے، لیکن شعرائے لکھنؤ اکثر نہایت سیر حاصل غزلیں لکھتے ہیں۔
شعرائے دہلی کے یہاں روحانی جذبات پائے جاتے ہیں، اور لکھنؤ
کی شاعری میں معشوق کے خارجی اوصاف اور لوازم کا بیان ہوتا
ہے، رعایت لفظی شعرائے لکھنؤ میں زیادہ پائی جاتی ہے اور
شعرائے دہلی میں یہ خصوصیت نہیں ہوتی، شعرائے لکھنؤ کا عام
رنگ معاملہ بندی ہے، اور شعرائے دہلی میں تشبیہات کی نزاکت
اور استعارات کی لطافت پائی جاتی ہے، شعرائے لکھنؤ مبالغہ
اور تصنع میں الجھ گئے تھے۔

دہلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد یہاں کے شعراء ہندوستان
کے مختلف شہروں میں پھیل گئے، ان میں خصوصیت سے رام پور
حیدرآباد اور کلکتہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، ان مقامات میں
دہلی اور لکھنؤ دونوں اسکول کی خوبیوں سے ملکر شاعری کا ایک
نیا اسکول قائم ہونا ناگزیر تھا، چنانچہ رام پور اسکول کو بطور نمونہ
پیش کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کلکتہ کا حال ہے یہاں واجد علی شاہ
اختر کے طفیل مٹیا برج سواد کلکتہ نہیں بلکہ لکھنؤ کا ایک محلہ بن
گیا تھا، دن رات شعراء کی پر لطف صحبتیں اور مشاعروں کی

گرم بازاری رہا کرتی۔ اختر نے اپنے ساتھ کے اساتذہ سخن کو سبعہ سیارہ کا خطاب دیا تھا، جن میں برق، صولت، درخشاں، بہار بہتر، عیش مشہور ہیں۔ اختر کی دو بیگمات عالم اور محبوب عالم بھی شاعری کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ لکھنؤ کے ان شعرا کے سوا دہلی کے شعرا، داغ، سید غفور نساخ بھی کلکتہ میں موجود تھے علیٰ ہذا حیدرآباد میں امیر، داغ، ظہیر، سرشار دہلی اور لکھنؤ کے شعرا جمع ہو گئے تھے۔

یہ ماحول تھا جس میں نظم نے اپنی شاعری کو پروان چڑھایا۔ وہ اول لکھنؤ میں رہے۔ پھر مٹیا برج کلکتہ کی بزم میں شریک رہے اس کے بعد حیدرآباد کو اپنا ملجا و ماوی بنالیا۔ نظم کے زمانہ میں جدید شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ حالی اپنا مقدمۂ شعر و شاعری لکھ کر ہماری قدیم شاعری کی برائیوں کو تفصیل سے ظاہر کر چکے تھے۔ اور خود نظم نے جدید شاعری میں حصہ لے کر اپنی نظمیں اور بے قافیہ نظمیں لکھ دی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام امور کے لحاظ سے نظم کی غزلوں کے رنگ کو بدلنا ناگزیر تھا۔ ان کی غزل میں چست بندش کے ساتھ ساتھ مضامین کی تازگی اور اسلوب بیان کی ندرت موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں تغزل کا رنگ بہت کم ہے۔ اس کے بجائے فلسفہ اور اخلاق سے وہ مملو ہیں۔ وہ عربی اور فارسی کے بڑے ماہر تھے اس لئے ان کے کلام میں عربی اور فارسی کی آمیزش زیادہ ہے۔ پھر کلام میں مبالغہ نہیں ہے۔ معنویت موجود ہے۔ ابتذال سے ان کی شاعری پاک ہے۔ محاورات اور روزمرہ کا استعمال نہایت خوبی سے کیا ہے۔ ان کے کلام میں فلسفہ اور اخلاق کے ساتھ دلچسپی پائی جاتی ہے۔ ان میں بے مزگی اور کیف کی کمی نہیں ہے۔ اگر وہ دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کرتے ہیں تو بھی نہایت پر لطف اور موثر پیرائے میں کرتے ہیں۔

غزلوں کا کچھ انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ ناظرین خود ان کے متعلق غور فرما سکتے ہیں کہ ان میں کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا اسرار پنہاں ہیں۔

ترے جلوہ کے آگے اپنی ہستی کو فنا پایا
یہ پیغام اجل ہم نے دم قالو بلیٰ پایا
نہ اب پست و بلند دہر کو مڑ کر بھی دیکھونگا
بہت گر پڑ کے میں نے جادۂ صبر و رضا پایا
بھروسا زیست پر کچھ ہے نہ ایام جوانی پر
شرار سنگ اسے دیکھا اسے رنگ حنا پایا

روز محشر میری از خود رفتگی دیکھو ذرا
خود اسی کے سامنے شکووں کا دفتر لے چلا
آ کے میخانہ میں ہم مستوں کو پہلے لوٹ لے
کس طرف او ابر دریا بار لشکر لے چلا
عفو کا خلعت گناہوں کی ندامت پر ملا
نذر دینے اشک جو لایا تھا گوہر لے چلا

مرتبہ رکھتی ہے اے ناصح سیہ کاری مری
ابر رحمت سے مرا دامان تر پیدا ہوا
چاہیے اپنی بات کا پیدا تو کرلے اعتبار
پھر اگر جھوٹوں بھی کہدے گا یقیں ہو جائے گا
اس بت کی دید کو نظر پاک میں ہے شرط
اور آنکھ آئینہ کی لگائی ہوئی سی ہے
ساقی کی چشم مست کا رندوں سے حال پوچھ
ملتے ہی آنکھ واقف اسرار ہو گئے
مرنے کی آرزو ہی شب غم میں رہ گئی
حیلے جو موت کے تھے وہ بیکار ہو گئے

حضرت نظم کے ہر قسم کے کلام کا نمونہ پیش کر دیا گیا ہے جس سے ان کے کلام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، نظم نے اس زمانہ میں اپنی شاعری آغاز کی تھی جبکہ عام طور سے قدیم شاعری کا بازار گرم تھا، اگرچہ جدید شاعری کی بنا حالی نے ڈال دی تھی لیکن اس کی طرف متوجہ ہونے کے لئے قدیم طرز کے شعرا مائل نہیں تھے نظم ان شعرا میں شامل ہیں جنھوں نے باوجود قدیم طرز کے شاعر ہونے کے جدید شاعری کو لبیک کہا اور اپنی طبیعت کی جولانی سے جدید شاعری کی پوری خدمت نہایت مستعدی سے انجام دی۔ عمدہ عمدہ نظمیں موزوں کیں اور پھر بے قافیہ نظموں اور انگریزی ترجموں سے اردو زبان کی شاعری کو مالا مال کر دیا، آج ان کے نقش قدم پر بیسیوں شعرا گامزن نظر آتے ہیں۔

حضرت نظم اپنے زمانہ کے استاد سخن تھے، انھوں نے ایک ماہر فن استاد کی حیثیت سے اپنے کلام کو موزوں کیا ہے ان کے کلام میں دہلی اور لکھنؤ اسکول کی خوبیاں جمع ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مغربی شاعری کے بیش بہا خزانہ سے اپنی شاعری کے ذخیرہ میں اضافہ کیا ہے۔ ان کا کلام مشرق اور مغرب کے گراں بہا جواہر سے مملو ہے؛

حضرت نظم کا کلام اس امر کا متمنی ہے کہ تفصیل کے ساتھ اس پر ریسرچ کیا جائے۔ ہم اپنی عدیم الفرصتی کے باعث کما حقہٗ اس کی خوبیوں کو اجاگر کرنے سے قاصر ہیں۔ کاش کوئی جماعت اس کی جانب متوجہ ہو جائے۔

نصیر الدین ہاشمی

محسوسات ماہر

موت کا بھی تو آسرا نہ رہا — زندگی میں کوئی مزا نہ رہا

اب وہ طوفانِ مدعا نہ رہا — دل مرا تیرے کام کا نہ رہا

مجھ کو ساحل کی آرزو کب تھی — مجھ پہ احسان ناخدا نہ رہا

میں ہوں اور قربِ منزلِ غم دوست — اب ذرا سا بھی فاصلہ نہ رہا

میں جفا ہی پہ صبر کر لیتا — یہ بھی عالم رہا رہا نہ رہا

دل تو ان کے ہی گیت گاتا ہے — کیا ہوا سر اگر جھکا نہ رہا

آہ! وہ جوشِ آرزو ماہر
ہائے پہلا سا حوصلہ نہ رہا

ماہر القادری

محرومِ بہار

مفلس کی چشمِ یاس میں آنسو ہیں یا نہیں — ان موتیوں کو آہ کوئی جانچتا نہیں

دو چار آدمی بھی گہر سنج کیا نہیں

دنیا ہے جس کا نام وہ کیا شر کدہ نہیں

بے درد زر پرست ہی ملتے ہیں جا بجا — دولت کدہ، درست، سیاست کدہ بجا

سب کچھ سہی مگر یہ محبت کدہ نہیں

احساس یاں کسی کو کسی بات کا نہیں

ہے کون آج تختۂ مشقِ جفا و جور — دیکھا ہے منعموں نے اسے کیا بچشمِ غور

مفلس بُرا تو ہے مگر اتنا بُرا نہیں

ان منعموں کو دید بھی بس کی روا نہیں

تشبیہ اس کو دوں میں گلِ خشک سے، غلط — مفلس تو منعموں کے لئے خار ہے فقط

مانا کہ گلستانِ جہاں بدنما نہیں

ان خوش نمائیوں سے مگر فائدہ نہیں

نسرین بھی نسترن بھی گلِ ارغواں بھی ہے — پروین بھی ہے سہیل بھی ہے کہکشاں بھی ہے

اوپر بھی گل کدہ ہے یہیں گل کدہ نہیں

مفلس کو لیکن اس سے کوئی واسطہ نہیں

یہ لالہ زار ہیچ یہ نقش و نگار ہیچ — یہ برگ و بار ہیچ یہ باغ و بہار ہیچ

مفلس نظر اٹھا کے ادھر دیکھتا نہیں

دیکھیں وہ اس کو جن کو غمِ افلاس کا نہیں

خوش اس سے منعمانِ طرب زندہ دار ہیں — کیوں خوش نہ ہوں کہ یہ بھی تو باغ و بہار ہیں

مفلس ریاضِ دہر میں پھولا پھلا نہیں

یعنی خزاں نصیب بہار آشنا نہیں

علی منظور

گل بوٹے

انجمن انسداد بیرحمی برنسواں کی مجلس عاملہ نے بیویوں کے لئے "احکام عشرہ" کا جو مسودہ مرتب کیا تھا اس کو گزشتہ مہینہ حسب ہدایت مجلس مذکور ہم نے ہندوستان کے مشہور اخباروں اور رسالوں میں شایع کرایا تھا، ملک کے طول وعرض میں اس مسودہ کی کافی نشرو اشاعت ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہزاروں عورتوں اور مردوں کے مختلف النوع خطوط انجمن کے دفتر میں آج تک برابر چلے آرہے ہیں، اس نشرو اشاعت کے صلہ میں مجلس عاملہ نے ہمیں انجمن کا "پبلسٹی آفیسر" بنایا ہے، یہ عہدہ بڑی ذمہ داری کا ہے، نشرو اشاعت میں غلطی کرنے کی بڑی سخت سزا مجلس نے تجویز کی ہے وہ یہ کہ ایک سال تک بیوی کے ہر حکم کی تعمیل کرنا خواہ وہ جائز ہو کہ ناجائز!! اس لئے ہمیں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتا ہے اور ایک ایک لفظ بڑی سوچ بچار کے بعد لکھنا ہوتا ہے۔

احکام عشرہ کے مسودہ کی تعریف وتائید میں ملک کے طول وعرض سے مردوں اور عورتوں کے ہزاروں خطوط انجمن کے دفتر میں وصول ہوئے ہیں جن میں وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جو اقدام کیا گیا ہے اس کی بیحد حوصلہ افزائی کی گئی ہے، ان ہی احکام کی مخالفت میں چند دلچسپ خطوط بھی وصول ہوئے ہیں جن کے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ ایک پرانے خیال کی خاتون لکھتی ہیں "احکام عشرہ کا پہلا حکم نہایت بدشگون ہے "آپ یہ سمجھ لے کہ تیرے والدین (خدانخواستہ) مرچکے ہیں تیرے گھر سے اب تجھ کو کوئی واسطہ نہیں رہا"........ الخ میں ایسے منحوس حکم کی ہرگز پابندی نہیں کرسکتی۔ بھلا میں یہ کیسے سمجھ لوں کہ نصیب دشمنان میں دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہوں اور سوائے شوہر کے میرا کوئی نہیں رہا، ایسے حکم پر ہزار بار لعنت بھیجتی ہوں"۔

۲۔ ایک ناقص العقل لکھتی ہیں "احکام عشرہ کا دوسرا حکم عجیب وغریب ہے، کیا انجمن کی مجلس عاملہ نے بیویوں کو "بیوا" سمجھ لیا ہے؟ کیا خوب! میں اپنے شوہر کے ساتھ ان کے دوستوں کو بھی خوش رکھوں!! یعنی ان سے پردہ نہ کروں، ان کی خاطر تواضع کروں اگر وہ گھر میں صبح سے شام تک برج کھیلتے رہیں تو ان کے کھانے پینے کا انتظام کروں، پان بنا بنا کر بھیجتی جاؤں اگر مجھ کو گانا آتا ہے تو ان کے سامنے گاؤں اور ناچوں ورنہ وہ ناخوش ہوجائیں گے تو میرے آرام اور چین کو برباد کردیں گے، ایسے حکم کو میرا دور ہی سے سلام ہے"۔

۳۔ ایک خواہشوں کی کنیز خاتون لکھتی ہیں "انجمن کا تیسرا حکم بالکل لغو ہے "اگر تو دنیا میں سکھ چین سے رہنا چاہتی ہے تو اپنی تمناؤں کے معیار کو گھٹا دے" اگر میں اپنی خواہشوں کو کم کردوں تو پھر زندگی میں لطف ہی کیا رہا! زندگی کا مقصد خواہشوں کا پورا ہونا ہے ورنہ انسان اور حیوان میں فرق ہی کیا ہے!!! اور جبکہ میرے میاں میری ہر خواہش کو پورا کرتے ہیں تو خدانخواستہ میں اپنی خواہشوں کو خواہ مخواہ کیوں گھٹا دوں۔ میرے شوہر اس قدر نیک اور فرمانبردار ہیں کہ میں ان کی تعریف نہیں کرسکتی۔ میرے ہر حکم کی تعمیل کرنا وہ اپنی عین سعادت مندی سمجھتے ہیں، اس سلسلے میں کئی دفعہ نوکری کے لالے پڑگئے تھے۔ ایک مرتبہ تو انہوں نے صاف کہہ دیا تھا "نوکری جائے جہنم میں! مگر تمہاری فرمائشیں سرآنکھوں پر"!! اس حکم میں زندگی کے معیار کی مثال ربر سے دی گئی ہے کہ جس کو اپنی مرضی کے موافق گھٹایا اور بڑھایا جاسکتا ہے مگر میں نے اپنے شوہر کو ربر کا بنا لیا ہے جس کو میں اپنی مرضی کے موافق گھٹایا اور بڑھایا کرتی ہوں۔ شوہر ربر کا بن جانے کے بعد "معیار زندگی" کو ربر کا بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے........ لہٰذا اس حکم

میں اس طرح ترمیم کردی جائے کہ "ہر بیوی کو چاہیے کہ اپنے
شوہر کو ربر کا بنادے تاکہ اپنی خواہش کے موافق جب چاہے
اس کو گھٹا اور بڑھا سکے"!

۴۔ ایک احمق خاتون لکھتی ہیں' احکام عشرہ کے چوتھے
حکم کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس حکم میں لکھا ہے درمیانی
زندگی میں اگر تیرا شوہر تجھ سے کچھ کھنچا رہتا ہے تو پروا نہ کر
انجان بن جا......"! یہ بات بڑی عاقبت نا اندیشی کی
ہے۔ اگر شوہر بیوی سے کھنچا رہے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ کسی
اور کی محبت میں پھنس گیا ہے۔ چنانچہ میں اپنے میاں کے ساتھ
یہی طریقہ اختیار کرتی ہوں' جب کبھی وہ خاموش بیٹھے رہتے
ہیں' فوراً تاڑ جاتی ہوں اور پوچھتی ہوں "کیوں! آج کس کے
خیال میں ہو"؟ وہ ہنس کر کچھ جھینپتے ہوئے کہتے ہیں "تم
بھی عجیب آدمی ہو! خاموش بیٹھنا بھی آفت ہے"!! اگر میں
اپنی کہے جاتی ہوں آخر وہ تنگ آکر کسی نہ کسی کام میں لگ
جاتے ہیں۔ اسی طرح میں ان کے خیالات کی اصلاح کرتی رہتی
ہوں ورنہ وہ ایک دن ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔ اس حکم میں
یہ لکھا جائے "درمیانی زندگی میں اگر تیرا شوہر تجھ سے کچھ کھنچا رہتا
ہے تو اس کی اچھی طرح تنبیہ کر کہ وہ دوسری عورتوں کے خیال
میں نہ رہے"۔

۵۔ ایک لالچی بیوی لکھتی ہے "احکام عشرہ کا پانچواں
حکم مجھ کو پسند نہیں ہے' اگر بیوی اپنے شوہر کی آمدنی کا حساب
نہ دیکھے تو شوہر کی جرأت کس قدر بڑھ جائے گی! ساری آمدنی
شوہر اپنے آپ پر صرف کرے گا اور بیوی کو فاقہ کرنے کی نوبت
آجائے گی۔ یہ حکم کس قدر مہمل ہے۔ میں تو اپنے شوہر کی سالم
تنخواہ وصول کرلیتی ہوں' ان کے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی
نہیں دیتی' البتہ ان کی جائز ضرورتوں کو پورا کرتی ہوں
اور اس طریقہ سے میں اپنے شوہر کو ہزاروں گناہوں سے
محفوظ رکھتی ہوں' وہ خود کہتے ہیں کہ بیاہ سے پہلے انھیں
جوا کھیلنے کی عادت تھی اور کبھی کبھی صرف گانا سننے کے لئے
"شریف عورتوں" کے کوٹھوں پر بھی جایا کرتے تھے اور ان کو
تحفے بھی دیا کرتے تھے۔ مگر اب نہ جوا کھیل سکتے ہیں نہ گانا سن
سکتے ہیں' میں نے ان کی دین دنیا سنوار دی ہے' وہ اکثر
کہتے ہیں "بیگم! میری جنت تمھارے قدموں تلے ہے' گنہ نہ ہوتا
تو تمھیں سجدہ کرتا۔ کبھی کچھ روپے سینما وغیرہ کے لئے لینے کی
ضرورت ہو تو وہ میرے قدموں پر سر رکھ دیتے ہیں تب کہیں
ایک دو روپے پھینک دیتی ہوں' اس حکم میں اس طرح
ترمیم کی جائے "شوہر کی ہر چیز تیری ہے' اس کے سارے
جسم پر بھی تیرا قبضہ ہوچکا ہے' تجھ کو حق حاصل ہے کہ اس کی
سالم آمدنی تو اپنے قبضہ میں رکھے اور کبھی کبھی اس کی جائز
ضرورتوں کو کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد بیحد کفایت شعاری
کے ساتھ پورا کرے"۔

۶۔ ایک ناسمجھ بیوی لکھتی ہے "چھٹے حکم کی نسبت مجھکو
سخت اعتراض ہے' اس حکم میں درج ہے "اگر تیرا شوہر
بچوں سے زیادہ محبت نہیں کرتا ہے تو کچھ فکر نہ کر اور اس کے
اس فعل پر کبھی نکتہ چینی نہ کر......"! چند سال سے میں
یہ محسوس کررہی تھی کہ ان کو مجھ سے اور میرے بچوں سے
محبت نہیں رہی ہے' چنانچہ میں نے ان کے شوفر کو کچھ روپے
دے کر اپنا ہمراز بنالیا اس سے معلوم ہوا کہ انھیں اپنی
بہن کی ایک کنیز سے محبت ہوگئی تھی اس کے نتیجہ میں ایک
لڑکی پیدا ہوئی ہے........ ایک دن میں ان سے
خوب جھگڑی اور مجھ سے اور بچوں سے انجان رہنے کی
وجہ صاف بتادی' جب انھیں علم ہوگیا کہ ان کا راز فاش ہوگیا

ہے تو ایک دن کیا دیکھتی ہوں کہ ایک لڑکی کو گود میں لئے چلے آرہے ہیں، میری تیوری پر بل دیکھ کر کہا " میری اس حماقت کا تمہیں علم تو ہو ہی گیا ہے. خواہ یہ لڑکی جائز ہو کہ ناجائز مگر میری اولاد تو ہے، اب میں اس کو تمہاری کنیزی میں دیتا ہوں "! میں اس " سینہ زوری " کا کیا جواب دیتی مگر میں نے ان کا راز تو پالیا اگرچہ یہ سودا کچھ مہنگا پڑا۔"

۷۔ ایک بدگمان بیوی لکھتی ہے: " احکام عشرہ کا ساتواں حکم بالکل لغو ہے، یہ حکم شوہر سے بدگمان نہ ہونے کی نسبت ہے. مگر میرا خیال ہے کہ ہر بیوی کو اپنے شوہر سے ہر وقت بدگمان رہنا چاہیے، اگر شوہر کو معلوم ہو جائے کہ اس کی بیوی اس کی نسبت اچھا خیال رکھتی ہے تو وہ نڈر ہو کر عیش مناتا اور خوب گلچھرے اڑاتا ہے، جو بیوی اپنے شوہر سے بدگمان نہیں رہتی وہ ایک دن اس کو اپنے ہاتھوں سے گنوا دیتی ہے' اس لئے ہر بیوی کو چاہیے کہ شوہر پر سخت سے سخت نگرانی رکھے' اس کے نوکروں کو اپنا ہم راز بنالے اور اس کی نقل وحرکت پر حشر بٹھا دے۔"

۸۔ ایک دولت کی پجارن لکھتی ہے " احکام عشرہ کے آٹھویں حکم سے مجھ کو اتفاق نہیں ہے، شوہر کی محبت کو دولت کی ترازو میں اگر نہ تولا جائے تو بیوی ہمیشہ افلاس میں مبتلا رہے گی، اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کی خواہشیں اور فرمائشیں پوری نہ کرے تو میں اس کو ہرگز چاہنے والا شوہر نہ سمجھوں گی، فرہاد نے اپنی شیریں کے لئے پہاڑوں کو کاٹ کر دودھ کی نہر نکالی تھی اگر آج کل کے شوہر " شیریں " سے زیادہ فیشن ایبل بیویوں کے لئے روپے لاکر ان کے قدموں پر نہ ڈال سکیں تو وہ شوہر بننے کے مستحق نہیں ہیں ایسے شوہروں کو گھر سے نکال دینا چاہیے ...... میرے صاحب کی تنخواہ کہنے کو تو آٹھ سو روپے ہے مگر ان کی آمدنی ڈھائی ہزار سے کم نہیں ہے' بیاہ سے پہلے ان میں آمدنی بڑھانے کی مطلق قابلیت نہیں تھی میں نے آہستہ آہستہ ان کے دل سے ہر قسم کا خوف نکالا اور ان کی دنیا بنا دی اب ہم بڑے مزے میں ہیں اور خوب عیش منا رہے ہیں۔"

۹۔ ایک کم فہم خاتون نویں حکم کی نسبت لکھتی ہیں " مذہبی معاملہ میں مجھ میں اور میرے شوہر میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ہم دونوں مذہب سے بالکل کورے ہیں البتہ دنیوی معاملہ میں ہمیشہ اختلاف ہوتا رہتا ہے اور خوب بحث ہوا کرتی ہے بحث میں ہمیشہ میں ان پر غالب ہو جاتی ہوں اور وہ تھک کر خاموش ہو جاتے ہیں' وہ بی اے پاس ہیں اور میں کچھ بھی نہیں! باوجود اس لیاقت کے میں انھیں بولنے نہیں دیتی میری زبان اس قدر تیز چلتی ہے کہ بیان نہیں کر سکتی! اکثر وہ کہا کرتے ہیں " بیگم تمھاری زبان میں بجلی کی قوت ہے "! ایسی زبان رکھ کر میرے لئے ناممکن ہے کہ ان سے بحث نہ کروں لہذا یہ بالکل نادانی کی بات ہے کہ بیوی شوہر کے اختلاف پر خاموش رہے اور بحث نہ کرے۔"

۱۰۔ ایک بے وقوف بیوی لکھتی ہے " دسواں حکم عجیب و غریب ہے' یہ کیسے ممکن ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے دل کی بات سمجھ جائے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس کے چہرے سے پڑھ لے' یہ تو کوئی نجومی ہی کر سکتا ہے! یہ بات بھی میری سمجھ میں نہ آئی کہ زبان کے زخم تیر و نشتر کے زخموں سے زیادہ کس طرح گھائل کر سکتے ہیں؟ چمڑے کی زبان تیر و خنجر سے کیسے تیز ہو سکتی ہے؟ تین چار انچ کی گوشت کی زبان کس طرح دل کو زخمی کر سکتی ہے؟ دل تو بہت بڑی چیز ہے وہ تو کسی کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی! انجمن کی مجلس عاملہ میں ساری جاہل اور احمق عورتیں نظر آ رہی ہیں اور یہ عقل کی اندھی عورتیں شاعری بھی کرتی ہیں ان کی شاعری کا نمونہ کس قدر مہمل یہ مصرعہ ہے!

" زباں کے زخم دل میں اک ذرا بھرتے ہیں مشکل سے "!

پروانے

آج چراغ کے گرد پھر پروانے آنے لگے تھے۔ سنہرے سنہرے، نرم ریشمیں پروں والے پروانے جو ایک والہانہ جذبہ کے تحت چراغ کے گرد گھوما کرتے ہیں۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ یہی، گھومتے گھومتے آخر کار وہ جان دے دیتے ہیں۔ ان کے ریشمیں پر جھڑ جاتے ہیں۔ لیکن چراغ خالی نہیں رہتا۔ ان کی جگہ تازہ دم پروانے لے لیتے ہیں۔ ان کی شیفتگی یونہی باقی رہتی ہے۔ یہ تڑپ یہ محبت باقی رہتی ہے۔ ان کی آرزو شاید چراغ ہے اور بس!

آج بجلی کے قمقمہ کے اطراف میں ان پروانوں کے بنائے ہوئے روشن دائروں کو دیکھ رہی تھی۔ برسات کے موسم میں نہ جانے یہ کہاں سے آ نکلتے ہیں۔ میں اکیلی تھی۔ صاحب ابھی گھر نہ لوٹے تھے۔ میں وقت گزارنے کے لئے ایک رسالہ لئے بیٹھی تھی۔ وقت چپ چاپ سا تھا۔ کسی طرح گزرتا نہ معلوم ہوتا۔ کوشش کرنے کے باوجود میں نیند کو نہ بلا سکی۔ بڑی بی کبھی کی سو چکی تھیں۔ ان کے خراٹے گونج رہے تھے۔ بندو بیچارا دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا بیٹھا ہی سو گیا تھا، اپنے سر کو گود میں چھپائے ہوئے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کتنی بے فکر ہے اس کی نیند کتنی میٹھی کتنی مست۔ مجھے اس پر رشک آنے لگا۔ میں خود بھی تو کبھی اسی طرح سویا کرتی تھی۔ زمانہ بھر میں تو میری نیند مشہور تھی۔ لیکن اب...... اب تو وہ باتیں مجھے داستانِ پارینہ معلوم ہوتی ہیں۔ محض خواب و خیال۔ اب وہی میں ہوں لیکن وہ نیند کہاں۔ جانو جیسے کسی نے میری تازگی چھین لی ہو۔ وہ زندہ دلی غائب ہو گئی۔ اب تو ایک بہارِ پائمال ہوں جو جلد خزاں سے ہم آغوش ہو گی۔ ہاں کسی وقت بہار شباب پر بھی تھی۔ تھی گی۔ کون جانے۔

میں نے بستر کی طرف دیکھا۔ سفید چادر بجلی کی روشنی میں نہائی ہوئی مجھے بلا رہی تھی۔ لیکن خدا جانے کیوں مجھے اس بستر پر نیند نہیں آتی۔ کتنی ہی راتیں، میری اداس اور بے خواب گزری تھیں اس پر۔ کتنی بے چین کروٹیں کیسی مایوس دھڑکنیں جذب تھیں اس میں۔ اس تکیہ نے میرے آنسو ہمیشہ امانت مانگے ہیں۔ یہی ایک تو واحد غم خوار ہے میرا، جو میرے خوابوں کو سنبھالتا ہے۔ اور میں گزشتہ زمانہ میں کھو جاتی ہوں۔

باہر بارش زور سے ہونے لگی۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر جل پریاں ناچنے لگیں۔ فضا، ترنم ریز ہو گئی۔ اس جل ترنگ کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی تڑپنے لگا۔ ڈوبنے ابھرنے لگا۔ میں نے پھر قمقمہ کی جانب نظر کی۔ وہاں اب بہت کم روشن دائرے باقی رہ گئے تھے۔ کہاں گئے وہ سب دیوانے جو ابھی ابھی گھوم رہے تھے۔ کیا تھک ہار کے رہ گئے۔ معاً میری نگاہیں فرش پر دوڑ گئیں۔ میرے دل کو دھکا سا لگا۔ میرے قدموں کے نیچے ایک حسین سنہرے پروں والا ڈھیر پڑا تھا۔ یہ انجام تھا اس جل اٹھنے والی محبت کا۔ میرا دل تڑپ گیا۔ اور مجھے ایک بات یاد آگئی۔

بالکل یہی موسم تھا۔ بھیگا بھیگا سہانا سا۔ اسی طرح بارش کی بے ہنگام بوندیں کھڑکی کے شیشوں پر شور مچایا کرتیں۔ جانفزا سا شور۔ جس کے ساتھ روح بھی رقص کرنے لگے۔ اس وقت میرا ایک دل تھا جس میں لطیف احساسات جاگتے تھے۔ ایک پر کیف تشنگی انگڑائیاں لیتی۔ میں اکثر ایسے میں کوئی دلکش فسانہ پڑھا کرتی اور پڑھتے پڑھتے خود کو مستیوں میں کھو دیتی۔ اس سے زیادہ افسانوی فضا اور کیا ہو سکتی ہے۔ سرد سرد ہوائیں جسم میں لہریں دوڑاتیں۔ دل کی رگ رگ تن جاتی۔ اور آرزوئیں اس ساز کو زخمہ لگاتیں۔ جو نغمہ بلند

ہوتا وہ مجھے لے اڑتا اور میں ایسی بلندیوں کی سیر کرآتی جہاں امنگیں اور خوشیاں سرسراتی ہوتیں۔ غم دور بھی نہ ہوتا۔ ایسے ہی میں میں پڑے ہی جاتی۔ ایک دن میں یونہی بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ کہ یکایک میری نگاہ بجلی کے قمقمہ پر جا پڑی۔ اس پر عجیب پرچھائیاں رقص کررہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ چند روشن دائرے گھوم رہے ہیں۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ پروانے ہیں۔ سنہرے سنہرے چمکیلے پروں والے۔ مجھے اس گردش میں ایک عجیب احساس مچلتا ہوا معلوم ہوا۔ بھابی میرے قریب ہی بیٹھی سوئٹر بن رہی تھیں۔ بھائی جان فاروق صاحب کے ساتھ تاش کھیل کر ابھی باہر گئے ہوئے تھے۔ مجھے اپنے اردگرد کی خبر نہ رہی تھی۔ نجانے کب تک میں یونہی دیکھتی رہتی کہ ایک بھاری اور گہری آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ فاروق صاحب کھڑے تھے۔ اپنی خواب آلود آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے سے۔ انھوں نے پھر پوچھا "کیا دیکھ رہی ہیں آپ!" بھلا میں انھیں کیا جواب دیتی کیا میں ان سے کہہ دیتی کہ میں ان گھومنے والے پروانوں کو دیکھ رہی ہوں۔ ان چمکیلے دائروں کو دیکھ رہی ہوں۔ میں خاموش ہو رہی۔

فاروق بھابی جان کے بھائی تھے۔ میرے بھی شائد بھائی ہی ہوتے .... جب میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو وہ قریب ہی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ انھوں نے میرے کندھے پکڑ کر ہلا دیئے۔ "نہیں بتائیں گی آپ! کہ اس شوق سے آخر کیا دیکھا جا رہا تھا" آہستہ سے میرے لب گنگنا اٹھے۔ پروانے۔ انھوں نے حیرت سے دہرایا "پروانے!" اور خود بھی ان گھومتی ہوئی روشنیوں کو دیکھنے لگے۔ وہاں اب بھی بہت سارے شوریدہ سر گھوم رہے تھے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے پروانے چلے گئے۔ جانے ہم کب تک بیٹھے یونہی دیکھا کرتے کہ بھابی نے بتایا رات زیادہ آگئی ہے۔ اب سوجانا چاہیے۔

صبح صبح میں نے دیکھا فرش پر چمکیلے سنہرے پروں والا ایک ننھا سا حسین ڈھیر لگ رہا ہے۔ نہ جانے کیا سوجھا کہ میں نے بڑے چاؤ سے اسے سمیٹ لیا اور چاندی کی ایک ڈبیا میں بند کرکے رکھ لیا۔

فاروق صاحب بھابی سے کوئی ایک سال بڑے تھے۔ امریکہ میں کسی ہندوستانی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ جہاں پہلے ان کے ابا کام کرتے تھے۔ چھ ماہ کی رخصت پر یہاں آئے ہوئے تھے۔ جاتے جاتے بہن سے بھی ملنے چلے آئے۔ جب سے وہ ہمارے ہاں آئے ہوئے تھے ایک چہل پہل سی رہتی۔ رات کو تاش کی محفل جمتی۔ کھیلنے والے بھابی اور بھیا۔ میں اور فاروق صاحب۔ امی کے خوف کے مارے ہی ہم سوتے تھے، ورنہ شائد رات بھر بھی کھیل ہوتا۔ ایک سنجیدہ قسم کی شرارت ان میں کروٹیں لیتی۔ اب جب سے کہ وہ جان گئے کہ میں پروانوں کو شوق سے دیکھا کرتی ہوں وہ چھیڑنے لگے تھے۔ کہتے "ارے ہاں! آپ کو پروانوں سے محبت ہے نا بڑی۔ بھئی ہم انسانوں سے تو یہ پتنگے بھلے۔" اور نہ جانے کیا کیا کہتے۔ بھابی کو بھی ایک مذاق ہاتھ آیا۔

جب وہ جانے لگے .... تو جانے کیوں میرا دل سسکنے لگا۔ میں ان کی کچھ بھی تو نہ تھی کہ روک لیتی۔ راہی چلتے چلتے کسی درخت کی چھاؤں کا سہارا پکڑے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ ٹھکانا تھوڑے ہی بن سکتا ہے۔ بس ذرا کی ذرا دم لیا اور چل پڑے۔ یہ تو میری اپنی مورکھتا تھی کہ ان کو کچھ سمجھ بیٹھی۔ چلتے چلتے جب وہ مجھے 'خدا حافظ' کہنے آئے تو میں انھیں چاہتے ہوئے بھی کچھ کہہ نہ سکی۔ کتنا کچھ جی چاہتا تھا میرا کچھ کہنے کے لئے۔ معاً میرے ذہن میں بجلی کوندگئی۔ میں نے ڈبیا پروانوں کے

پروں والی ڈبیا نکالی اور انھیں دے دیا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ایک کانپتی رو رگوں میں سرسرا گئی۔ وہ بس یونہی مسکرا دیئے۔ ان کی آنکھیں اور زیادہ خواب آسا ہو گئیں ..... میرا دل ڈوب گیا۔

جب کبھی وہ بھابی کو خط بھیجتے چند الفاظ میرے نام بھی بھیج دیتے۔ میں نے باوجود ان کے پیہم اصرار کے جواب کبھی نہ دیا۔ ایک دفعہ انھوں نے پوچھا تھا "مشرق میں رہتے رہتے تھک گئی ہو گی تم مغرب کو کیوں نہیں اپناتیں؟"

ہمارے گھر میں یکایک انقلاب آیا۔ گھر کی فضا میں کچھ ویسے سُر گونجنے لگے۔ بھابی اور اماں نہ جانے سر جوڑے کیا کھسر پھسر باتیں کیا کرتیں۔ لیکن جب میں جاتی تو ایک دم چپ سی ہو جاتیں۔ پھر اماں بات ٹالنے کو کہتیں "دلہن! ذرا اچار کی تو خبر لینا۔ کہیں پھپھوندی نہ لگ جائے۔" فرمانبردار بہو سر جھکا کر کہتیں "امی۔ میں نے دیکھ کر کل ہی تیل ڈالا ہے" میں کوئی ایسی بچہ بھی تو نہ تھی جو ان باتوں کو نہ سمجھتی۔ خوب جانتی تھی کہ ان کی یہ باتیں ہمارے متعلق تو کبھی بھی نہ تھیں۔ تو کیا میرے متعلق تھیں...... ہاں میں نے جلد محسوس کر لیا۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا۔ گھر کا کونا کونا جیسے پکار اٹھا کہ میں اب اپنی سے پرائی بنائی جانے والی ہوں۔

ایک دن میں بھابی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ بھابیوں کو ستانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ کہنے لگیں "اچھا بنو ستا لو جتنا جی چاہے۔ میں بھی ایک نہ ایک دن سمجھ لوں گی۔" میں نے پوچھا مطلب؟ کہنے لگیں "منی آخر تم بھی تو ایک دن بھابی بن کر رہو گی" اور میں سمجھ گئی کہ آخر یہ بھابی کا لاڈ یوں ایسا منڈلا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں کسی کی خواب آلود آنکھیں تھرک گئیں۔ اچھا تو یہ مطلب تھا۔ فاروق صاحب کے لئے میں ...... کا۔ بھابی جان اب بےحد خوش رہا کرتیں۔ اپنے گھر سے اور بھائی کے پاس سے جو ڈاک آتی اس میں سے نہ جانے ہنس ہنس کر کیا کیا سنانے لگتیں۔ اور تو اور بھائی جان نے بھی بنانا شروع کیا۔ سب گھر والوں نے جیسے مل کر میرے خلاف بغاوت کر رکھی ہو۔ بابا بھی میری طرف دیکھ کر ہنس دیتے۔ امی پر تو مجھے بےحد غصہ آنے لگا۔ وہی اس فتنہ کی جڑ تھیں۔ خیر غصہ تو مجھے ایسے ہی آجاتا تھا۔ لیکن تنہائیوں میں کچھ عجیب عجیب احساسات دل میں ابھرنے لگتے۔ دل ڈوبتا رہتا۔ میں نے نئے نئے زاویوں سے فاروق کو سوچا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ان کے متعلق اتنا اور ایسے نہ سوچا تھا۔ میرا دل آنے والی مسرتوں کے خیال سے دھڑک اٹھتا۔ "جب خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائیں تو کیا ہو گا؟" میں اکثر سوچا کرتی۔

آہ! ایک دن یہ سب خواب پریشاں ہو گئے۔ جنگ چھڑ گئی۔ قدرت نے جیسے میرے ارادوں کا مضحکہ اڑایا ہو۔ سمندری راستے بند ہو گئے۔ اور ایک دن سمندر پار کے لکھنے والے نے لکھا کہ خطوط کا سلسلہ بھی اب مجبوراً بند کرنا ہو گا۔ کتنا حسرت بھرا خط تھا وہ ایک غریب الوطن کا جو اپنوں سے دور بہت دور ایک دوسری دنیا میں بس رہا تھا۔ انھوں نے سب کو خدا حافظ کہا تھا۔ بھابی اس دن بہت روئی تھیں میرا دل بےچین ہو گیا۔ ایک ناقابل بیان خلش ایک رہ رہ کے تڑپانے والا درد میرے دل کو نشانہ سمجھے ہوئے تھا۔ جنگ کا وہ دور تھا جس میں امریکہ غیر جانبدار نہ رہ سکا تھا۔

ایک سال گزر گیا۔ بہت سے دلگداز آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ وہاں کی کوئی کیفیت نہ معلوم ہو سکی۔ نہ جانے کیوں میں اب انھیں بالکل اپنا سمجھنے لگی تھی۔ اپنی عزیز ترین چیز آنکھوں سے دور ہے اپنا مرکز تمنا آلام میں گھرا ہو تو بھلا

کیسے چین آئے۔ میرے بنائے بسائے خیالی گھروندے سب ڈھے گئے۔ میں ایک ایک دن گنے جارہی تھی۔ ایک زخم ابھی بھرنے نہ پایا تھا کہ قدرت کی کٹار نے اور ایک وار کیا۔

بھابی اداس سی ہوگئیں۔ امّی پھر مسرتوں سے کھیلنے لگیں۔ ایک دن بھابی نے آنسو روتی ہوئی آنکھوں سے بتایا کہ امّی نے میری قسمت کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اب زیادہ دنوں تک کسی پردیسی کا انتظار نہ کرسکتی تھیں۔ دوسروں کی بیٹیاں ان کی بلا جانے۔ وہ اپنی اکیلی لڑکی کو بھلا کیسے انتظار میں بٹھائے رکھتیں۔ موئی جنگ جانے کب دفان ہو۔ زمانہ بھاگا جارہا تھا۔ اس طرح ایک پردیسی کی امیدوں کی دنیا، اس کے ارمانوں کی امانت، اس کی غیر موجودگی میں لوگوں نے لوٹ لی۔ بھابی رو بھی تو نہ سکیں۔ اور میں...... میرے نہ جانے کتنے آنسو دل سے امنڈے لیکن آنکھوں سے بہہ نہ سکے۔ وہیں سمٹ کر رہ گئے۔ ہائے میری مجبوریاں میں ان کے لئے رو بھی تو نہ سکی۔

بہت جلد ساری تیاریاں مکمل کرلی گئیں۔ میرے ارمانوں کے خون سے سبھوں نے کیسے جی جان سے ہولی کھیلی۔ بھابی بظاہر بڑی خوشی سے مجھے دلہن بنا رہی تھیں۔ لیکن یہ تو انہی کا دل جانتا ہے کہ وہ کیسے مجھے سنوار رہی تھیں۔ ہم نے کیا سوچا تھا کیا نکلا۔ تمناؤں کی بساط یک دم الٹ گئی۔ ہمارے جدا ہوہی جانے چاہئیں میں جتنا روسکتی تھی روئی۔ دل کھول کر اپنی امیدوں کے جنازے کا ماتم کیا۔ سبھوں نے سمجھا لڑکی ہوں۔ دنیا کے قانون کے مطابق اور ہی ہوں۔ میرے دل کے ٹکڑے کٹ کٹ کے آنکھوں کی راہ بہہ گئے۔ مگر ان کو سمیٹنے والا تو کہیں اور تھا۔

میں بیاہ کر اپنے شوہر کے گھر آگئی۔ اب میں ہمیشہ انہی کی تھی۔ اچانک انھوں نے میرے دورِ زندگی میں قدم رکھا اور مجھے اپنا لیا۔ قسمت شائد یہی ہے۔

قدرت کو شائد اس پر بھی چین نہ آیا۔ ستم ظریفی تو دیکھئے۔ شادی کے ٹھیک آٹھ روز بعد کہ ابھی شادیانوں کے سُر خاموش بھی نہ ہوئے تھے۔ میرا گھونگٹ پٹ الٹا بھی نہ تھا کہ فاروق یکایک آگئے۔ اس سے بالکل انجان اور بے خبر کہ کسی اور نے ان کی دنیا اجاڑ لی ہے۔ خوش خوش مسرتوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے مجھے لینے جو آئے تھے...... ان پہ جیسے بجلی گری۔ جب انھوں نے سنا کہ میں اب کسی اور کی ہوگئی ہوں۔ دوسرے ہی دن وہ چلے گئے۔ جیسے سانپ نے انھیں ڈس لیا ہو۔ اور زہر ان کو لوری دے رہا ہے۔ وہ یہ دو دن بالکل خاموشی سے رہے۔ میں چاہتے ہوئے بھی انھیں نہ دیکھ سکی۔ اپنی مجبوریاں ان سے کہہ نہ سکی۔ گھونگٹ کی آڑ سے بس ایک جھلک سی دیکھی تھی۔ ہائے اللہ میری مجبوریاں۔

بھابی نے ایک تحفہ دیا۔ "فاروق بھائی کا خیال تھا کہ یہ شمع تمھیں شادی کے موقعہ پر دیتے۔ اب جب کہ تمھاری شادی ہورہی ہے۔ خواہ کسی سے ہو۔ وہ تمھیں یہ دے گئے ہیں۔"

میں نے کھول کر دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہاتھوں سے کھولا۔ چاندی کی ایک خوبصورت سی شمع تھی۔ جس کی لو پر ایک پروانہ نثار ہونے کو تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ لبوں پر ایک آہ تھرتھرا گئی۔ ایک پرزے پر انھوں نے شعر لکھ دیا تھا۔

"ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری"

آج ان پروانوں کو دیکھ کر۔ ان گھومتی ہوئی چمکیلی محبتوں کو دیکھ کر مجھے وہ ساری بسری باتیں یاد آگئیں۔ جنھیں میں نے بڑی مشکل سے بھلایا تھا۔ یا کم از کم اپنے کو دھوکا ہی دے رکھا تھا کہ بھول گئی۔ آج میرے زخم پھر ہرے ہوگئے۔ ان سے خون رسنے لگا۔ بری طرح قدرت نے میرا دل ٹٹولا۔ اللہ۔

ابتدا تو مسرت تھی۔ انجام حسرت کیسا!

یکایک میں چونک گئی۔ بھاری بھاری قدموں کی آہٹ ہوئی۔ اور آواز آئی "ارے! تم ابھی تک نہیں سوئیں۔ رات زیادہ آگئی۔ بس مجھے ویسے ہی ذرا دیر ہو گئی تھی"۔ اس سے قبل کہ میں جواب دوں وہ اندر آگئے۔ ٹوپی بیزاری کے انداز میں ایک طرف کو پھینکی۔ شیروانی کے بٹن کھولتے ہوئے وہ قریب آگئے۔ "کیا کر رہی تھیں تم!" میں نے اپنے قدموں میں سوئے ہوئے ڈھیر کو دیکھا۔ انھوں نے ایک ٹھٹھا مارا۔ "خوب! اور اپنے پاؤں سے انھوں نے اس حسین ریشمی ڈھیر کو روند دیا۔ میری بانہہ پکڑ کر اٹھایا۔ کہنے لگے۔ "واقعی تم کبھی کبھی بالکل بچوں کی سی حرکت کرتی ہو۔ یہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے۔ چلو سو رہو۔" مسہری کی طرف جاتے ہوئے ایک دفعہ میں نے ان بکھرے ہوئے کشتگانِ محبت کو دیکھا......... بیچارے پروانے! باہر بارش زور سے ہونے لگی۔ کھڑکیوں پر جل ترنگ بج اٹھا۔

زینت ساجدہ

محبت کی چھاؤں:۔ مرزا اظفر الحسن صاحب بی اے کے چند افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کیلئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ چھوٹی تقطیع ۱۳۲ صفحات قیمت مجلد ۱۲؎

ادب میں افادیت کا فروغ

دنیا کی تاریخ میں فنون لطیفہ اور ادبیات کا نظریہ اپنی غرض اور غایت کے اعتبار سے ایک مختلف فیہ مسئلہ رہا ہے، بعض مفکرین اور ادبا کا خیال ہے کہ فنونِ لطیفہ کے پیش نظر کسی متعین مقصد کا پایا جانا ضروری نہیں، لیکن ادبا کا ایک مکتب خیال آرٹ اور لٹریچر کے غیر افادی تصور سے متعلق نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ فن و ادب کی قدر کو محض تفریحی نہیں بلکہ افادی ہونا لازمی ہے۔ ان دونوں نظریات کے تجزیے سے پیشتر مناسب ہوگا اگر فن و ادب کے متعلق چند کلاسیکل تصورات پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

افلاطون کے نزدیک آرٹ مقصود بالذات شئے نہیں بلکہ توسط ہے تہذیب فکر اور تربیت ذہنی کا، وہ ایسے ادب اور حسن کاری کا قائل نہیں جو افادیت سے معرا ہو، اساطیر یونان میں رب النوع شاعری کا تصور ایک ایسی قوت سے وابستہ نظر آتا ہے جو روحوں کی تسکین اور دلوں کے سکون کی ضامن ہے۔

فنونِ لطیفہ میں افادیت کے پیش نظر افلاطون، ہومر سے یہ سوال کرنا چاہتا تھا کہ تم نے نوع انسان اور سماج کو کتنا بلند کیا۔ لیکن اسی نظریہ کے خلاف ارسطو کے نزدیک فنونِ لطیفہ کی قدریں افادی نہیں بلکہ تفریحی نظر آتی ہیں۔

اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ فن و ادب کا پس منظر اپنے اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے تین عناصر کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایک نظام سیاسی، دوسرے نظام اقتصادی، تیسرے نظام معاشری۔

حسن کار اور ادیب خواہ کسی سر زمین کا رہنے والا ہو ایک جماعت کا فرد ہوتا ہے، اس کا ایک ماحول ہوتا ہے، وہ ایک مخصوص اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام میں جکڑا ہوتا ہے آپ کسی ایسے ادیب اور حسن کار کے وجود کو تصور میں نہیں لا سکتے جو خلا میں معلق ہو اور جس کا وجود زندگی کے مادی علائق سے آزاد ہو۔

جذبات، ادراک اور انفعال کا مادہ اگرچہ داخلی اور خلقی چیز ہے لیکن انسان کے احساس کی بیداری، شعور کی تحریک اور انفعال کا کیف و کم تمام تر موثرات بیرونی اور محرکات خارجی پر منحصر ہوتے ہیں۔

جس طور پر زندگی کے تمام شعبے مجموعی حیثیت سے ان اسباب اور حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں جن کو نظام تمدن کہا جاتا ہے، اسی طور پر انسان کے سارے جذبات اور خیالات اپنے ہی زمانے اور ماحول کے منظر ہوتے ہیں، ہر دور کی معاشر کا اثر اس دور کے خیالات اور جذبات کے اوپر پڑنا لازمی ہے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس میں ادبیات کی تعمیر یا تخریب کا راز پوشیدہ ہے۔ رابرٹ لارڈلٹن کا مقولہ ہے ؎

A nation's literature is the biography of its humanity

جن لوگوں کے نزدیک فن و ادب کا کوئی نصب العین متعین نہیں ہوتا ایسے حضرات فنونِ لطیفہ میں مستقل اقدار کے قائل ہوتے ہیں، فن و ادب کو سماجی زندگی کا منظر نہیں سمجھتے بلکہ الہامی قسم کی چیز تصور کرتے ہیں۔

درحقیقت حسن کار اور ادیب کے لئے اسباب و علل کی دنیا سے جذباتی فراریت کے باوجود چھٹکارا ممکن نہیں، زمانہ، ماحول اور مادی حقیقتوں سے گریز ادب نہیں بلکہ زندگی کی جذباتی تکذیب ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں اسی حقیقت کو مولانا حالی نے یہ کہہ کر بے نقاب کیا ہے کہ "خیال کی تخلیق مادے

کے بغیر ممکن نہیں۔"

کارل مارکس کا قول ہے کہ اگرچہ انسان ہی مادی قوتوں کو تحریک میں لاتا ہے۔ لیکن ان کی قدروں کے تغیر کے ساتھ ساتھ انسان ذہنی اعتبار سے غیر شعوری طور پر خود بھی بدلتا جاتا ہے۔

مشرق اور مغرب کے بڑے بڑے حسن کار اور ادیب جب اس مقام پر آکر رکتے ہیں تو ہر شخص کی سانس اس کے سینے میں گھٹنے لگتی ہے، مختلف سمتوں سے مختلف آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن ہر آواز کے ساتھ ایک مجروح احساس کی کسک محسوس ہونے لگتی ہے ؎

اے زر تو خدا نیستی ولیکن بخدا
ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

ادبی فضا میں ایک ایسی ہولناک آواز ہے جس کو انسانی دماغ پر مادے کا ردعمل کہنا چاہیے، عمر خیام جہاں اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے وہاں کہتا ہے ؎

گویند کہ مرد را ہنر می باید　　یا نسبتِ عالی بہ پدر می باید
امروز جہاں شد است در نوبت ما　　کیں ہا ہمہ ہیچ است زری باید

شکسپیر اپنی فکر و نگاہ میں کائناتی وسعتوں کو لئے ہوئے ہے، لیکن مادے کی جذباتی تکذیب اس سے بھی ممکن نہیں۔ جو نے کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے ؎

یہ زرد اور چمکیلی دھات سیاہ کو سفید، کریہہ کو حسین، غلط کو صحیح، رذیل کو شریف بنا سکتی ہے۔ یہ زرد فام غلام مذہبوں کو بناتا اور بگاڑتا ہے۔"

دراصل مادی اسباب و علل سے آنکھیں چرا کر تخیل کے بازوؤں پر اڑتے اڑتے کسی موہوم فردوس خیال میں کھو جانا ادب نہیں بلکہ ادب عبارت ہے۔ روحِ عصر کی ترجمانی، زندگی کی تشخیص اور زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھنے سے، بقول علامہ اقبال ؎

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

جرمنی کا مشہور مفکر اور شاعر گوئٹے کہتا ہے "میں اس شاعری کو محض کھوکھلی اور بے روح چیز سمجھتا ہوں جس کی بنیاد حقیقتوں کے بجائے ہوا میں رکھی جائے۔"

مغربی ادب کے مشہور نقاد میتھیو آرنلڈ نے اس فلسفہ کو پیش نظر رکھ کر کہا ہے کہ ادب کو اپنی صداقت کے لحاظ سے "تنقید حیات" ہونا چاہیے۔ ادب کے اندر فرار و شکست، خود پرستی، ذہنی عیاشی حالات سے گریز اور حقیقتوں کی جذباتی تکذیب ایسے بے پناہ طوفان ہیں جن کی رو میں ہیئت اجتماعی کا تعمیری شعور بہہ جاتا ہے، ہزلٹ کہتا ہے۔

Art must anchor in nature or it is the sport of every breath of folly.

ہر ادب کے تعمیری اور تخریبی اثرات اس کی ہیئت اجتماعی پر مرتب ہوتے ہیں، ادب ایک ہی وقت ایک قوم کی زندگی کا عکس بھی ہوتا ہے اور اس پر عکس انداز بھی۔ زندگی اور ادب میں ایک مستقل عمل اور ردِ عمل کا سلسلہ جاری اور ساری ہوتا ہے، زندگی ایک نامیاتی، جدلیاتی اور عبوری حقیقت ہے، اگر وقت کا تغیر اور قوموں کا عروج و زوال تاریخی جبریت ہے تو روایت پرست اور رجعت پسند حضرات آرٹ اور ادب کو کیونکر جامد اور ساکت تصور کرتے ہیں۔ زمانے کا تغیر اور تبدل قدرت کا اٹل قانون ہے ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
قرار ایک تغیر کو ہے زمانے میں

زندگی اور آرٹ کے ارتقائی تصور کو پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے ؎

چو نظر قرار گیرد بنگار خوب روئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگار

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

یہ ہے آرٹ اور زندگی کا عبوری تصور ـــــ درحقیقت فن و ادب میں جمود خصوصاً اس وقت پیدا ہوجاتا ہے جب فن و ادب کی موت و حیات کا سررشتہ دولت، طبقاتی برتری اور سرمایہ دارانہ اقتدار کے ہاتھ میں ہو، اگر ۱۹۱۷ء سے پہلے کے روسی ادب کا جائزہ لیا جائے تو ادب پر جاگیردارانہ اقتدار اور طبقاتی برتری کی مہر بہ لگی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس دور کا ادب بورژوازی طبقے کے لئے محض سامان تفریح کی حیثیت رکھتا تھا۔ دوسری طرف پرولیتاری طبقہ یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ مادی مملوکات کی طرح ادب بھی اہلِ دول کی ملکیت ہوا کرتا ہے اور اس "شجرِ ممنوع" کی برکات سے فیض یاب ہونا بھوک اور افلاس کی دسترس سے باہر ہے۔

لیکن انقلاب کے بعد جب ہیئتِ اجتماعی نے چولا بدلا اور فکریں آزاد ہوئیں تو تعمیری تصورات کے رکے ہوئے دھارے روسی زندگی میں اس شدت سے پھوٹ نکلے کہ طبقاتی برتری ذہنی تعیش، فراریت اور رجعت پرستی، بہت سی چیزیں ان کی رو میں بہہ گئیں۔

۱۹۳۲ء کی کانفرنس میں خارکوف کے مقام پر اشتراکی ادیبوں کا یہ فیصلہ کہ ادب کا نصب العین خدمتِ جمہور اور شعورِ اجتماعی کی تحریک ہونا چاہئے درحقیقت ملک و ملت کی ترقی میں سب سے اہم تعمیری اقدام تھا، اسی بنا، پرشو نہار کہتا ہے ؎

The mother of fine arts is luxury, but the mother of useful asets is necessity.

ادبیات کے اندر **Ideology** (فکریات) کا تبدیل ہونا کسی خاص دور یا کسی مخصوص قوم تک محدود نہیں۔ اس گزرگاہ پر منزل بہ منزل ایسے مقامات ملتے ہیں جہاں انقلابات برابر گزرتے رہے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے بطن سے والٹیر اور روسو جیسے باغی پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جب ہم فرانس کے سیاسی پس منظر میں مذہب، انسانیت اور سماج کو زخم آلودہ پاتے ہیں تو فرانس کے ادب میں باغیانہ میلانات کو دیکھ کر ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا، ہر ملک کا ادب اس کے تمدن کی آوازِ بازگشت ہوا کرتا ہے، قہقہوں کے پیچھے قہقہے اور کراہوں کی آڑ میں کراہیں چھپی ہوتی ہیں۔

انیسویں صدی کے دوران میں خیام، سعدی اور حافظ کی سرودگاہوں سے ـــــ "درد ایران بے دواست" اور "ایں قافلہ تا بحشر لنگ است" کے ہولناک نعروں کا بلند ہونا، جمال الدین افغانی اور مالکم خاں کا طوفانوں کو اپنے ساتھ لے کر اٹھنا اس لئے تعجب خیز نہیں کہ ایران کے سیاسی پس منظر میں ناصر الدین شاہ قاچار کی جابر حکومت کار فرما ہے۔

ہمارے ادب میں افادی رجحانات کا آغاز غدر کے بعد سے شروع ہوتا ہے، جہاں سرسید اور ان کے رفقائے کار نے ادب کو ہر قومی اور سماجی زندگی کا ترجمان بنایا وہاں حالی آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی نے ادب کے اندر انفرادیت کو

اجتماعیت کے ساتھ اور داخلیت کو خارجیت کے ساتھ ہم آہنگ کرکے تخیل میں واقعیت کا عنصر پیدا کیا، اس قسم کے ادب کا مقصد براہ راست معاشری اور قومی اصلاح تھا۔

اس کے بعد جمہور کے اندر سیاسی بیداری اور قومی شعور کی تحریک کو اکبر، چکبست اور ظفر علی خاں نے خاص طور پر اپنا نصب العین بنایا۔ اگر فن و ادب کی عمارت خلا میں معلق ہونے کے بجائے زندگی کی سرزمین پر کھڑی ہو تو ہیئت اجتماعی کے تزلزل سے ادب کے اندر ارتعاش کا پایا جانا لازمی ہے، شاعرانہ حیثیت اور حسن کارانہ انفرادیت کے یہ معنی نہیں کہ روم جل رہا ہو اور نیرو واٹلن بجا رہا ہو، اگر فن و ادب میں انفرادیت اور اجتماعیت، داخلیت اور خارجیت کی ہم آہنگی نہ ہو تو فن و ادب زندگی کی ترجمانی نہیں بلکہ زندگی کی فراری تکذیب ہے، اسی خیال کے پیش نظر البرٹ ہبرڈ کہتا ہے ؎

An artist should have more than two eyes.

آپ دیکھ چکے ہیں کسی قوم کی ادبیات میں افادی رجحانات کیونکر داخل ہو جاتے ہیں، اگر ادب قدیم اور ادب جدید دونوں کو بغور دیکھا جائے تو دونوں کے رنگ ڈھنگ چال ڈھال، مزاج اور تیور میں بڑا فرق محسوس ہوتا ہے، جس طرح زنگی اور فرنگی بچے اپنی صورت شکل اور فطرت کے اعتبار سے ایک مخصوص رنگ و نسل، آب و ہوا اور جغرافی ماحول کا پتہ دیتے ہیں اسی طرح ادب قدیم اور ادب جدید دونوں ایک خاص معاشری ماحول اور ذہنی آب و ہوا کی پیداوار ہیں، دونوں کے تاریخی اور تمدنی پس منظر الگ الگ ہیں۔ غدر کے انقلاب سے پہلے ادب کا نصب العین زندگی کی ترجمانی اور تنقید نہ تھا بلکہ مقصد محض ذہنی تعیش تھا۔

اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے اگر قصوں اور افسانوں کا تجزیہ کیا جائے تو قصے اور افسانے غیر نفسیاتی خرافات، ماورائیت اور فراریت کا مجموعہ نظر آتے ہیں، منظومات کی نفسیاتی تحلیل اس حقیقت کا پتہ دیتی ہے کہ ہمارے قصیدے صداقتوں سے خالی لیکن جھوٹی لفاظی اور ضمیر فروش قسم کی خوشامدوں سے لبریز تھے، مثنویات کے اندر سچائی اور نفسیاتی کردار نگاری کے بجائے خوارق عادات اور خیالی طلسمات کو بطور خاص مقبولیت حاصل تھی یہی عالم غزل گوئی کا تھا، غزل اپنی رسمی عاشقی اور روایاتی جکڑبند کے اعتبار سے ایک ایسی "تنگنائے" ہو چکی تھی جس کے حبس اور فشار سے گھبرا کر مرزا غالب کو کہنا پڑا۔ ع

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

گوئٹے نے صحیح کہا ہے ؎

Decline of literature indicates the decline of a nation.

اس میں شبہ نہیں کہ غدر سے پہلے جہاں حسن کار اور ادیب واقعات سے ہٹ کر بالعموم خیالی تصنع کی بھول بھلیاں میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں وہاں ہم کو چند لوگ نظیر، میر اور درد جیسے مخلص بھی دکھائی دیتے ہیں جن کے جذبات میں خلوص اور احساس میں سچائی پائی جاتی ہے لیکن انفرادیت اور اجتماعیت کا یہ توازن حالات کی مجموعی حیثیت کے پیش نظر ادب قدیم کی ایک استثنائی صورت ہے۔ اس وقت ہم جس ذہنی فضا، معاشری ماحول اور سیاسی آب و ہوا میں سانس لے رہے ہیں وہ یقیناً اس فضا اور ماحول سے بہت مختلف ہے جس میں جنات کا نزول، پریوں کی اڑان، جادوگروں کے کارنامے، عشق کی ہونکیاں رقیب کا ابرام، رسمی عاشقی اور نزع کی ہچکی عام تھی۔ اگرچہ ہماری

نظم و نثر دونوں کے افادی رجحانات غدر کے بعد سے بتدریج بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن ہمارے ادب کی خاص وہ رومانی تحریک جس کے علم بردار "ادب برائے حیات" کے بجائے "ادب برائے ادب" کے حامل تھے تقریباً جنگِ عظیم کے خاتمہ تک خصوصاً اس نوجوان طبقہ میں اپنا کام کرتی رہی جو آسکر وائلڈ، شیلے، ورڈزورتھ، کالرج اور سوائن برن وغیرہ سے اثر لیتا رہا۔

جنگ عظیم کے بعد جمہور کی بے چینی، بھوک، افلاس اور اقتصادی مصیبتوں نے ادیبوں کو دفعتاً سوتے سے جگا دیا، زمانے کی بدلتی ہوئی صورت اور وقت کے تقاضے نے "رومانیت" کو مجبور کیا کہ وہ Realism (واقعیت) کے لئے ادب میں جگہ خالی کر دے۔ ادب حاضرہ کے اندر موضوعی اور اسلوبی تغیرات اصل میں ان ہی افادی رجحانات کا نتیجہ ہیں جن کا مقصد ایک طرف سماج کی اصلاح، دوسری طرف زندگی کی تنقید و ترجمانی ہے، اس وقت افادی مکتب خیال کے نثر نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، رشید صدیقی کی تصنیفات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اکبر، چکبست اور ظفر علی خاں کے بعد افادی مکتب خیال کے نظم نگاروں میں سب سے بڑے مفکر اور مجاہد اعظم ڈاکٹر اقبال ہیں۔ اسی مکتب خیال کے علم برداروں میں جوش، احسان، حفیظ، فراق، علی اختر اور یگانہ امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں۔

اس وقت انسانیت کو ادب کے وسیلے سے جس چیز کی ضرورت ہے وہ فراری قسم کی خود اظہاریت نہیں بلکہ واقعیت اور آرٹ کا صحیح امتزاج اور توازن ہے، بیسویں صدی کے ماہر نفسیات اور نقاد ادب ہربرٹ ریڈ کا خیال ہے کہ آرٹسٹ کی شخصیت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے آرٹ میں Self-expressin یا (خود اظہاریت) کا رنگ گہرا نہ ہو، لیکن چونکہ فردی شخصیت رابطۂ ملت کے بغیر از خود نامکمل ہوتی ہے اس بنا پر آرٹسٹ کے لئے داخلیت کا خارجیت کے ساتھ ہم آہنگ ہونا تکمیلِ شخصیت کی ایک نفسیاتی ضرورت ہے بقول اقبال ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اگر آرٹ کے اندر سماج کے لئے کوئی ابلاغ نہ ہو جس سے سماج متاثر ہو سکے تو وہ آرٹ، آرٹ نہیں بلکہ ہم اس کو ایک ایسا نشہ کہہ سکتے ہیں جس کو پی لینے اور پلا دینے کے بعد زمانہ، زندگی، اور سوسائٹی کی ہر حقیقت کو چند لمحوں کے لئے تو بھلایا جا سکتا ہے، لیکن یہ خواب خرگوش نہ زمانے کی حقیقتوں کو بدل سکتا ہے نہ سوئی ہوئی سماج کو جھنجھوڑ سکتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے ؎

زمانہ اپنے حوادث چھپا نہیں سکتا
ترا حجاب ہے قلب و نظر کی ناپاکی !

اس وقت اکثر حضرات موجودہ ادب کو شکوک اور بدگمانی کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں خصوصاً وہ ادب جو "نیا ادب" کہلاتا ہے آج جا بجا مورد الزام ہے، درحقیقت ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں، عقل اور بصیرت کا تقاضا ہے کہ تصویر کے تاریک پہلو کے ساتھ اس کے روشن پہلو کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے اس میں شبہ نہیں کہ کارل مارکس کے مادی تصورات اور فرائڈ کے جنسی مزعومات پر انسانیت، کلچر اور تہذیب کا انحصار نہیں، حیا سوز قسم کی عریاں نگاری، خام نہی اور بے راہ روی کو آرٹ اور ارتقاء سے تعبیر کرنا بنیادی غلطی ہے، لیکن ہر قوم کی زندگی اور پائندگی کے لئے جتنا کہ مریض کے لئے اپنے

مرض کی نوعیت سے باخبر ہو کر اس کے ازالے کی کوشش
کرنا ہے، بقول علامہ اقبالؒ ؎

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

اس وقت استعماری تباہیاں، طبقاتی غارت گری اور سرمایہ دارانہ
استحصال انسانیت اور کلچر کو کچل رہے ہیں، زندگی اپنے
زخموں سے کراہ رہی ہے، لیکن سماج کا ایک طبقہ ایسا بھی
ہے جس کے لب پر آج بھی یہی دعا ہے کہ ع

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے!

حقیقتاً جن لوگوں کے اندر زندگی کا جدلیاتی اور عبوری شعور
ہی موجود نہیں ہوتا یا جن کے مفاد کو کسی نہ کسی طور پر چوٹ
لگتی ہے وہی لوگ بالعموم اس قسم کی تنگ نظری، کوتاہ اندیشی
اور رجعت پسندی کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔
ہمارے نزدیک موجودہ ادب کو "نیا ادب" کہنے کے بجائے
ترقی پسند ادب کہنا زیادہ مناسب ہے، اس لئے کہ ادب کو
سب سے پہلے سماجی زندگی کا مظہر اور روحِ عصر کا ترجمان
بنانے کے بانی دراصل حالی، آزاد، سرسید اور ان کے
رفقائے کار تھے، وہی افادی تحریک ہے جو آج ایک دوسرے
روپ میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہے۔ درحقیقت، شہرت
کے شکار، زمانہ سازی، نقالی اور بغاوت کے لفظوں سے
کھیلنے کا نام ترقی پسند ادب نہیں بلکہ ادب اور انسانیت
کی ترقی کے لئے ضرورت ہے زندگی کے جامد تصور سے ہٹ کر
اس کے ان زخموں کو عریاں کر دینے کی جن کے خون سے
مستقبل کی تصویر بنائی جا رہی ہے، اب ضرورت ہے زندگی
کے چہرے سے تہذیب، معاشرت اور سیاست کے ان
رنگین پردوں کو اٹھا دینے کی جو انسانیت کے کوڑھ اور
جذام کو چھپائے ہوئے ہیں۔
اب شعر و ادب کو خیرہ نفسیاتی چناں چنیں، لفظی
طمطراق اور فنی استادیت سے بلند کرنا چاہیئے جو ذوقِ جمالیات
کی آسودگی کے ساتھ ساتھ ہیئتِ اجتماعی کے اندر زیادہ سے
زیادہ قوائے فکر و عمل کو تحریک میں لانے کا ذمہ دار ہو۔

منظور حسین شور

محبت

کیا تو نے محبت کے میٹھے راگ سنے ہیں؟
کیا ان پُراسرار راگوں کو سمجھنے کیلئے تو نے راتیں آنکھوں میں گزاری ہیں؟
کیا تیرا دل ایسے سرور سے بھر گیا تھا جس میں سوز پنہاں ہوتا ہے؟
اور کیا اس میٹھی جلن سے تیری حسین پلکوں پر آنسوؤں کے موتی ڈھلک
آئے تھے؟

کیا تو ان سب سے آشنا ہے؟
اگر نہیں تو دیکھنا سنبھل کر قدم رکھنا۔
یہ سرسبز اور پھولدار راستہ بہت خاردار ہے۔
کہیں تیرے نازک پاؤں زخمی نہ ہو جائیں۔
اس سنسار میں کوئی کسی کا ہو کر نہیں رہتا۔
اور پھر یہ زخم مندمل ہونے والے نہیں۔
کیونکہ گرم آنسوؤں اور دبی ہوئی آہوں سے کہیں تیرا نازک
دل جھلس نہ جائے۔

فضل کریم حلمی

انجام

ایک دور دیس کا رہنے والا میرا دوست تھا۔ ہر مہینہ وہ شہر آتا اور میں اپنے گھر کے سوا اسے کسی دوسری جگہ ٹھہرنے نہ دیتا۔ اس کی خوش اخلاقی اور زندہ دلی ہمارے گھر والوں کے لئے خوشی اور انبساط کا موجب ہوتی۔ گاہ گاہ وہ آتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے خوشی اور لطفِ زندگی کی برات چلی آئی۔ خود ہنسنا دوسروں کو ہنسانا اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ لیکن میں ہی جانتا تھا کہ اس کی ہنسی کی اوٹ میں دل کے کتنے زخم مسکراتے تھے۔ اس کے قہقہوں کی گونج میں کیسی دردبھری آہیں پوشیدہ تھیں۔ سارا دن وہ ہنسی ٹھٹول میں گزارتا۔ لیکن جب رات ہوتی، جب صرف میں اور وہ جاگتے رہتے، غم واندوہ کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھتیں۔ دل کے زخم ہرے ہوجاتے اور وہ افسردہ لہجے میں اپنی زندگی کے وہ راز بیان کرنے لگتا جنھوں نے اس کے سکون اور راحتِ زندگی کو درہم برہم کردیا۔ وہ مجھ سے مشورے اور دل جوئی کی توقع رکھتا۔ میں اس کا دوست جو ٹھہرا۔

پہلے پہل تو میں نے اس کی باتوں کو مذاق میں اڑایا۔ میں کہتا۔ ”توفیق دیوانے ہوئے ہو۔ یہ دل کا آزار بڑا موذی ہوتا ہے۔ کسی کے خیال ہی خیال میں اپنی مطمئن اور شاد کام زندگی کو گھن لگا لینا کوئی عقل مندی نہیں۔“ اور میں اپنے دل میں سوچتا کہ ”توفیق نے لطف اور تفنن کی خاطر محبت کا ڈھونگ تو خوب رچایا ہے۔“ اسی لئے جب میں اس کی پردرد گفتگو سنتا اسے آہیں بھرتا ہوا دیکھتا۔ تو میں دل ہی دل میں مسکراتا۔ وہ زہرہ کے حسن اور اس کی دلنوازیوں کی تفصیل سناتا۔ تو میں انجام کے متعلق پوچھتا۔ وہ چپ ہو رہتا ہم دونوں خاموش لیٹے ہوئے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھ دیتے۔ کاش توفیق کا انجام آسمان پر چمکنے والے تارے کی طرح نظر آجاتا۔ توفیق کچھ گنگنانے لگتا اور میں سوجاتا۔ صبح ہوتی تو توفیق پھر ہنسی خوشی کی باتوں میں لگ جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس سے خاص دلچسپی پیدا ہوچکی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے اس پر رشک بھی آتا تھا کہ ایک حسین لڑکی اس کی محبت کا دم بھرتی ہے۔

اس محبت کی میرے دل میں قدر ہے جو آپ ہی آپ اور بغیر کسی توسط کے پیدا ہو۔ ایک رات ہم دیر گئے باتیں کررہے تھے توفیق اپنا دکھڑا روتا رہا۔ ان بیتابیوں کا اظہار کرتا رہا جو زہرہ کی یاد کا نتیجہ تھیں۔ اور میں پھر اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ ”محبت بھروسے کے قابل نہیں۔ ایک اضطراری اور غیر یقینی جذبہ کا نام ہے“ لیکن توفیق! بیچارہ توفیق!! زہرہ کی محبت کو لافانی اور پائیدار سمجھتا تھا۔ وہ ان واقعات کو پیش کرتا جن میں زہرہ نے اپنے قلبی لگاؤ کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ان آنسوؤں کا بھی ذکر کرتا جو اس کی جدائی پر اس کی آنکھوں میں چمکنے لگے تھے۔ میں پوچھتا ”تمہاری ہر بات درست لیکن اب مجھ سے کہو کہ تمہارا کیا ارادہ ہے۔“ توفیق سوچنے لگتا اور میں اس کے جواب کا انتظار کرتے کرتے سوجاتا۔ ایک دن صبح کو میری بیوی نے ناشتہ پر توفیق کی شادی کا ذکر چھیڑا۔

ایک نہایت ہی خوب صورت، خوب سیرت اور خاندانی لڑکی ان کی نظر میں تھی اور ان کا اصرار تھا کہ توفیق جیسے شریف اور خوش طبع انسان کے لئے وہ لڑکی ایک موزوں شریکِ حیات ثابت ہوگی۔ میں نے توفیق کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر پوچھا ”کہو کیا ارادہ ہے“ توفیق نے اپنی بعض مجبوریوں کا اظہار کرتے ہوئے اپنی نارضامندی ظاہر کی

میری بیوی کو بڑا اچنبھا ہوا اور وہ حیران نظروں سے توفیق
کو گھورنے لگی۔ میں نے گفتگو کو مذاق کا رنگ دیتے ہوئے
کہا " ہاں صاحب مارے ٹھوکے کی شادی کے تو ہم بھی قائل نہیں
کوئی ہمارے دل ہی سے پوچھے کہ شادی سے ہمیں کیا سکھ
ملا " توفیق نے کہا " بھئی یہ تو تمہاری سراسر ناشکری ہے
تمہاری زندگی میرے لئے انتہائی طمانیت بخش ہے۔ ایک
بیوی اور ایک خاوند ایسی ہم آہنگی اور خلوص کے ساتھ
زندگی بسر کرتے بہت کم نظر آتے ہیں۔ توفیق کی ان باتوں
سے میری بیوی شاد بہت خوش ہوگئی کیونکہ اسی وقت سے
انھوں نے تہیہ کر لیا کہ توفیق کی شادی کر کے ہی چین لیں گی۔
توفیق کا کچھ روپیہ ہمارے پاس جمع تھا۔ اور وہ زہرہ کے
لئے کوئی تحفہ خریدنے کے لئے طلب کر رہا تھا۔ میری بیوی
نے اسے فضول خرچی سے منع کرتے ہوئے ہر مہینہ کچھ نہ کچھ
رقم بھیجتے رہنے کی تاکید کی تاکہ شادی کے سامان کی خریدی
پایۂ تکمیل کو پہنچے اس وقت توفیق کو مایوس ہی ہونا پڑا۔
میرے روکتے رہنے کے باوجود توفیق کی جمع کردہ رقم سے
میری بیوی شادی کے بعد ضروری لوازمات بازار سے خرید
لائی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر توفیق نے بظاہر تو خوشی کا اظہار
کیا لیکن اس کے دل پر اس کا جانے کیا اثر ہوا ؟۔ وہ اس
دفعہ بغیر کسی تحفے کے شہر سے اپنے گاؤں کو لوٹا۔

مہینہ گزر گیا لیکن توفیق نہ آیا۔ اس نے ایک خط
لکھ بھیجا جس میں اپنی بیماری کی خبر لکھی تھی۔ اس دوران
میں میری بیوی نے تھوڑا تھوڑا کر کے بہت کچھ سامان
جمع کر لیا تھا اب وہ چاہتی تھیں کہ دوسرے معاملات بھی
طے پا جائیں۔ توفیق کو بلایا جائے اور جملہ امور کا تصفیہ کر لیا
جائے۔ توفیق کو خط لکھا گیا کہ شہر میں باقاعدہ علاج ممکن ہے
فوراً چلے آؤ۔ توفیق آیا۔ لیکن یہ پہلے کا سا توفیق نہ تھا وہ بہ مشکل
بات کر سکتا تھا اور لاغری نے اس کی ہیئت ہی بگاڑ دی تھی۔
وہ بستر پر چپ چاپ پڑا رہتا اور ہر وقت کسی فکر میں کھویا
کھویا سا رہتا۔ ہم سب اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتے
کھلے بندوں مذاق کی ہماری بیوی متحمل نہیں ہو سکتیں لیکن
توفیق کی بیماری میں انھوں نے اس پابندی کو اٹھا لیا اور
ہم اپنی نوک جھونک سے توفیق کے حزن و ملال کو دور کرنے
کی کوشش کرتے۔ میری بیوی توفیق کی دلہن کے لئے خریدے
ہوئے سامان کو کشتیوں میں جما جما کر سامنے لے آتی۔ توفیق
ایک غمزدہ مسکراہٹ کے ساتھ ان چیزوں کو دیکھتا اور اپنی
گردن پھیر لیتا۔ میں نے توفیق کے دل کا بھید اپنی بیوی پر
ظاہر نہیں کیا تھا اس لئے وہ حیران رہ جاتیں لیکن میں انھیں
اس طرح سمجھا دیتا کہ بھئی شادی کرنے والا توفیق ہے ہم
دلہن پسند کرنے والے کون۔ وہ جسے پسند کرے۔ اسی سے اس
کی شادی ہوگی۔

رات میں توفیق نے اپنا سر میری گود میں رکھ دیا اور
بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ میں نے ہر طرح اس کی
ڈھارس بندھائی اور اس کی زبوں حالی کا سبب دریافت
کیا۔ رکتے رکتے اس نے کہنا شروع کیا " زہرہ نے مجھ سے بیوفائی
کی۔ زہرہ نے میرا دل توڑ دیا۔ زہرہ نے مجھے ٹھکرا دیا۔" میرے
دل پر جیسے کسی نے متواتر گھونسے لگائے۔ میں نے اپنا سر تھام
لیا۔ اوہ میں یہ کیا سن رہا تھا۔ زہرہ نے توفیق کے ساتھ
بیوفائی کی۔ زہرہ نے توفیق کا دل توڑ دیا۔ زہرہ نے توفیق کو
ٹھکرا دیا۔ اس وقت محبت ایک ہیبت ناک چڑیل کی طرح اپنے
خوفناک دانت نکالے میری آنکھوں میں پھر گئی۔ میں نے
توفیق کی دلدہی کرتے ہوئے کہا " توفیق مرد کے دل پر

ایسے تو کئی صدمے گزرتے ہیں۔ ایسا اثر لوگے تو جینے کے لالے
پڑ جائیں گے۔ جس نے تمہارا دل توڑا ہے اس کے خیال
سے باز آؤ۔ جس نے تمھیں ٹھکرا دیا اسے بھول جاؤ۔ دنیا
میں تم صرف محبت ہی کے لئے پیدا نہیں ہوئے تمھیں بہت کچھ
کرنا بھی ہے لیکن مجھے تشویش تھی کہ اس انقلاب کی وجہ آخر
کیا تھی۔ توفیق دھیمے لہجہ میں کہنے لگا۔" میں غریب ہوں
اور زہرہ حسین اور دولت مند اور اسکے ماں باپ جن کے ہاتھوں میں
اسکی قسمت ہے انھوں نے اسکی شادی ایک دولت مند شخص سے طے کر دی ہے
میں نے کہا توفیق تمھیں اسقدر رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہم تمہاری
شادی زہرہ سے زیادہ حسین اور زہرہ سے زیادہ دولتمند لڑکی سے کروا دیں گے۔
لیکن توفیق کی بے چینی میں کمی ہوتی نظر نہ آئی وہ اسطرح تڑپ رہا تھا جیسے کسی زخم کا گھائل ہو۔

چند دن کے بعد توفیق کی طبیعت کچھ سنبھلی اور وہ
اپنے گاؤں کو چلا گیا۔ ڈاکٹروں کی رائے میں اس کا دل کمزور
ہو گیا تھا اور اسے ایسی جگہ رہنا چاہیے تھا جہاں اسے
اطمینان اور دلی خوشی حاصل ہو سکے۔ اس کے جانے کے
آٹھ دس روز بعد ایک رات میں بستر پر لیٹے سو جانے کی کوشش
کر رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں میرے دل میں رہ رہ کر وحشت
سی اٹھتی۔ میں سو جانا چاہتا لیکن نیند نہ آتی تھی۔ کہ اتنے
میں مجھے پھاٹک کی طرف سے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی
دی میں نے بستر چھوڑ کر پھاٹک کا رخ کیا پھاٹک کھول کر
باہر دیکھا تو دیوار کا سہارا لئے کوئی شخص کھڑا تھا۔ قریب
جا کر دیکھا تو میرے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ دیوار سے
لگا ہوا توفیق کھڑا تھا۔ میں اسے سہارا دیتے ہوئے اندر لایا
اور پلنگ پر لٹا دیا ہم دونوں چپ تھے میں دیکھ رہا تھا کہ
توفیق کی حالت پہلے سے بہت زیادہ خراب تھی۔ میں توفیق
کے منہ سے کچھ سننے کے لئے بیتاب تھا لیکن توفیق آسمان کی
طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔" انجام " میں نے اپنے
دل میں سوچا توفیق نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی جیب
سے کاغذوں کا ایک پلندا نکالا اور میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

" یہ میری اور میری محبت کی نشانی ہے" توفیق نے نحیف
آواز میں کہا اور مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا اس نے
اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کے ہونٹ ہلنے لگے وہ دونوں۔
توفیق اور زہرہ کھیلے کودے۔ کس طرح وہ دونوں ایک
دوسرے کا خیال کرتے۔ بڑے ہونے کے بعد کس طرح
ان کی ملاقاتوں پر پابندیاں عائد ہو گئیں۔ کس طرح وہ
چھپ چھپ کر ملتے کیسی کیسی باتیں ہوتیں۔ کیسے کیسے
وعدے ہوتے۔ اور اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا
جیسے ان کی محبت کے ہر منظر کا میں بھی ایک تماشائی تھا میں
نے انھیں کھیلتے کودتے دیکھا۔ میں نے انھیں ایک دوسرے
سے ملتے ہوئے میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے دیکھا محبت اور
نباہ کے وعدے کرتے ہوئے دیکھا اور انجام!! اب آسمان
کی طرح صاف نظر آ رہا تھا۔ اور کچھ ایسا دور بھی نہ تھا۔ توفیق
نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں صبح ہوتے ہی وہ سارا سامان
جو میری بیوی نے اس کی شادی کے لئے جمع کیا تھا اس کے
گاؤں کو بھیج دوں گا اور زہرہ کی شادی کی خوشی میں اس کی
طرف سے یہ تحفہ پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد توفیق کی
ٹکٹکی آسمان کی طرف بندھ گئی اور وہ کچھ گنگنانے لگا اس کی
آواز مدھم پڑ گئی تو میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک بہت
بڑا تارا ٹوٹا اور دیر تک روشنی دیتا ہوا زمین کی طرف گرنے
لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فضا میں غائب ہو گیا میری آنکھ
لگ گئی اور میں صبح تک سوتا رہا۔ صبح اٹھنے کے بعد جب میں نے
توفیق کو جگانا چاہا تو اس نے کوئی حرکت نہ کی

رشید قریشی

داغ دہلوی کا اصلی نام؟

جناب من۔

ماہنامہ سب رس بابتہ جنوری ۱۹۴۳ء میں مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اپنے مضمون "داغ دہلوی" میں فرماتے ہیں کہ داغ مرحوم کے "خاندان کے ناموں کا آخری جزو "الدین احمد خاں" رہا ہے اور عرف کا آخری ٹکڑا "مرزا" مثلاً امیرالدین احمد خاں عرف فرخ مرزا اعزالدین احمد خاں عرف اعظم مرزا وغیرہ۔ اب سوال یہ ہے کہ داغ مرحوم کا اصلی نام کیا ہے۔ کیونکہ اس لحاظ سے "نواب مرزا" ان کا عرف ہونا چاہیے نہ کہ نام۔ کیا اس معمہ کو کوئی حل کر سکتا ہے؟

میرے ذخیرہ میں چند لفافے ہیں جو مختلف حضرات نے مختلف مقامات سے داغ مرحوم کے نام روانہ کئے تھے۔ ٹپہ خانوں کی مہروں سے ظاہر ہے کہ یہ خطوط ماہ اکتوبر ۱۸۹۳ء سے ماہ جنوری ۱۸۹۵ء تک کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان لفافوں پر داغ مرحوم کا نام۔ القاب خطابات وغیرہ موجود ہیں۔ میرے خیال میں ان لفافوں پر کی عبارت سے داغ مرحوم کے نام وغیرہ پر تھوڑی بہت روشنی ضرور پڑ سکتی ہے۔ ان لفافوں میں سے چند ایسے لفافوں کا میں نے انتخاب کیا ہے جن کی عبارت سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ داغ مرحوم کس نام سے مشہور تھے اور ان کے دوست احباب عزیز و اقارب شاگرد وغیرہ تحریر میں ان سے کس نام سے مخاطب ہوتے تھے۔

لفافہ نمبر (۱) حیدرآباد دکن۔ محبوب گنج

بخدمت فیض درجت بلبل ہندوستان جہاں استاد ناظم یار جنگ۔ دبیرالدولہ فصیح الملک جناب قبلہ و کعبہ حاجی نواب مرزا خاں صاحب بہادر داغ دہلوی۔ دام اقبالہ۔ مشرف باد۔ از دادری ضلع بلند شہر

لفافہ نمبر ۲۔ حیدرآباد دکن۔ سدی عنبر بازار۔

بعالی خدمت معلی القاب مقرب الخاقان استاد السلطان بلبل ہند جہاں استاد ناظم یار جنگ، دبیرالدولہ فصیح الملک حضرت نواب مرزا خاں صاحب بہادر داغ دہلوی مدظلہ العالی مشرف باد۔

لفافہ نمبر ۳۔ بفضلہ تعالیٰ۔ خط ہذا بمقام حیدرآباد دکن محلہ محبوب گنج رسیدہ۔ بخدمت فیضدرجت دبیرالدولہ فصیح الملک جہاں استاد ناظم یار جنگ بلبل ہندوستان جناب نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی۔ مشرف باد۔ راقم محمد اعتماد علیخاں از قصبہ سعدآباد ضلع متھرا۔

لفافہ نمبر ۴۔ بفضلہ تعالیٰ۔ بحضور عالیجناب معلی القاب حضرت فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب بہادر داغ دہلوی۔ محبوب گنج حیدرآباد دکن۔ خاکسار سینہ فگار نوح عظیم آبادی

لفافہ نمبر ۵۔ لفافہ ہذا بمقام حیدرآباد دکن۔

بملاحظہ اقدس جناب فیض مآب جناب نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی استاد شاہ دکن۔ مشرف باد۔ راقمہ نیاز

لفافہ ہذا رائے ادوے پور میواڑ۔

لفافہ نمبر ۶۔ بعونہ۔ حیدرآباد دکن محلہ محبوب گنج۔

بملاحظہ جناب معظم و مکرم حضرت فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب بہادر متخلص داغ مشرف باد۔ عریضہ لاڈلے صاحب از فرخ آباد

لفافہ نمبر ۷۔ بفضلہ تعالیٰ۔ بعالی ملاحظہ جناب قبلہ فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی مشرف باد۔ دکن حیدرآباد محبوب گنج از رامپور افغانان۔

ان لفافوں میں نمبر ۳ نمبر ۴ اور نمبر ۶ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ لفافہ نمبر ۳ سعدآباد ضلع متھرا کے رئیس کنور محمد اعتماد علیخاں صاحب کا روانہ کیا ہوا ہے۔ لفافہ نمبر ۴ حضرت داغ مرحوم کے شاگرد نوح عظیم آبادی کا ہے۔ اور لفافہ نمبر ۶ کے لکھنے والے سید محمد اصغر حسین صاحب واقف عرف لاڈلے صاحب فرزند نواب

جعفر علیخاں صاحب رئیس شمس آباد ضلع فرخ آباد ہیں۔ ان تینوں حضرات نے جو داغ مرحوم اور ان کے خاندان سے ضرور اچھی طرح واقف ہوں گے، داغ مرحوم کو "نواب مرزا خاں" کے نام سے مخاطب کیا ہے

لفافہ نمبر ۲ اور نمبر ۵ کے دوسرے رخ پر "جواب گیا ۱۱ر جمادی الاول کو" اور "جواب گیا ۱۱ر جمادی الاول ۱۳۱۲ھ کو" لکھا ہے جو ضرور داغ مرحوم کا ہی لکھا ہوا ہے۔

داغ مرحوم کا انتقال ۱۳۲۲ھ میں ہوا اور ان کے انتقال کے پانچ سال بعد یعنی ۱۳۲۷ھ میں مانک راؤ وٹھل راؤ کی "بستان آصفیہ" شایع ہوئی۔ اس کتاب میں خطابات کی ایک فہرست دی گئی ہے جس میں خطاب یافتوں کے اصلی نام بھی درج ہیں۔ داغ مرحوم سے متعلق مولف یوں لکھتا ہے:۔

"نواب مرزا داغ ، ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۱۱ھ کو بتقریب دربار سالگرہ مبارک خانی. بہادری: ناظم یار جنگ۔ دبیر الدولہ. فصیح الملک. بلبل ہندوستان جہان استاد کا خطاب عطا ہوا۔ وغیرہ" (حصہ اول صفحہ ۴۷۰)

اب سوال یہ ہے کہ "نواب مرزا خاں" میں 'خان' نام کا جزو ہے یا خطاب کا۔ داغ مرحوم کو ۱۳۱۱ھ میں "خانی" "بہادری" وغیرہ سے سرفراز کیا گیا تھا۔ لیکن ان کے وہ خطوط جو اس زمانہ سے ایک عرصہ قبل لکھے گئے تھے ان میں داغ مرحوم نے خود کو "نواب مرزا خاں" لکھا ہے۔ پنڈت مانک راؤ صاحب مولف "بستان آصفیہ" داغ مرحوم کے ہمعصر تھے اور اگر داغ مرحوم کا نام "نواب مرزا خاں" کے علاوہ اور کچھ ہوتا تو مولف موصوف اس سے ضرور واقف ہوتے اور وہی نام اپنی کتاب میں بھی لکھتے۔ لہذا داغ مرحوم کے خطوط پڑھنے سے اور ان لفافوں پر کی عبارت دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ داغ مرحوم کا پورا اور اصلی نام "نواب مرزا خاں" ہی تھا جو بہت ممکن ہے کہ داغ مرحوم نے خود ہی اس کو اس وجہ سے اختیار کر لیا کہ اس میں ان کی عرفیت "نواب مرزا" میں ان کے خاندانی ناموں کا آخری جزو "خان" بھی موجود ہے۔ ورنہ کوئی معنی نہیں کہ داغ مرحوم جیسی مشہور ہستی کا نام "گمنامی" میں رہے

ہرمز

شاد اقبال:۔ اقبال اور شاد دونوں کی ہستیاں محتاج تعارف نہیں۔ البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ علامہ اقبال مرحوم اور مہاراجہ سر یمین السلطنۃ کے درمیان پچیس تیس سال تک جو مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے۔

یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شایع ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اقبال کی زندگی اور کردار کے ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن کے متعلق دوسرے ذرایع سے کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان گراں مایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے شایع کیا ہے۔ شاد و اقبال کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔

صفحات (۲۰۰) قیمت عالہ

گناہِ مسرت

اداس شام کے بکھرے ہوئے دھندلکوں میں
حسین شہر کی راہوں سے جب گزرتا ہوں
نظر فروز، تمدن کی جلوہ گاہوں پر
سکونِ زیست کو پیہم تلاش کرتا ہوں
خموش نہر کی خوابیدہ سطح پر گاہے
کوئی حسین سا نغمہ مچلنے لگتا ہے
کہ جیسے ایک جواں، غم نصیب شاعر کا
خیال، گیت کے سانچے میں ڈھلنے لگتا ہے
کنارِ آب حسینوں کے ان گنت جھرمٹ
مری نگاہوں کی آغوش پھیل جاتی ہے
سمٹ سمٹ کے بکھرتے ہیں حسن کے جلوے
دلِ ملول کی تقدیر مسکراتی ہے
سماج کی یہ کمیں گاہ ـــ حسن کے بازار
یہاں جوانی و عصمت کا مول ہوتا ہے
یہی ہے تیرا خلیفہ، یہی ترا شہکار؟
اسی زمیں پہ مشیت بھی رقص فرما ہے
حیات بخش محبت کا آسرا لے کر
جواں رتوں کو حسیں تر بنا ہی لیتا ہوں
طرب نوازِ شبستاں میں مسکراتے ہوئے
سرور و کیف کے نغمات گا ہی لیتا ہوں

سردار الہلم

تأثرات

پائے استقلالِ وحشت لرزہ براندام ہے
شاید اب نزدیک حدِ منزلِ بے نام ہے
کاش وہ دیوانہ کہہ کر مسکرا دیں ایک بار
پھر تو ہر منزل بقدرِ وسعتِ یک گام ہے
عزلتِ دیوانگی میں جھک گیا تھا سر جہاں
سرزمیں اب تک وہاں کی لرزہ براندام ہے
گردشِ ہستی کا ہوں میں وہ نمایاں دائرہ
میرا انجام ابتدا ہے ابتدا انجام ہے
دوڑتا ہے ہر رگِ دیوانہ میں بن کر لہو
تیرا وہ جلوہ جو اب تک جلوۂ بے نام ہے
جا رہا ہوں مٹ کے کاندھوں پر بحسنِ احترام
پیچھے پیچھے خلق ہے آگے خدا کا نام ہے
کروٹیں لیتی ہے دنیا جنبشِ پیہم کے ساتھ
کھیل ان نظروں کا دورِ گردشِ ایام ہے
موجزن ہے یوں ان آنکھوں میں محبت کی شراب
جیسے اک سمٹا ہوا سا میکدہ درجام ہے
اپنے عالم میں محبت بھی نہیں رہتی جہاں
نام دنیا کا مری وہ عالمِ بے نام ہے
بن گئی ہے کام کی مٹ کر مری ہستی اثرؔ
جذبِ آہِ صبح، تاثیرِ دعائے شام ہے

مرزا اثر فیروز آبادی

اقبالؔ کا شباب

۱۹۱۵ء سے پہلے کی بات ہے۔ ابھی وہ سر ہوئے تھے نہ ڈاکٹر۔ ہاں جامعہ سے دستارِ فضیلت حاصل کر لی تھی۔ نگاہ میں وسعت اور دماغ میں ذوقِ تجسس پیدا ہو چلا تھا۔ شعر کہنے لگے تھے۔ اور خوب کہنے لگے تھے۔ مشاعروں میں بھی دکھائی پڑتے تھے۔ دیس میں وہ کون تھا جو اقبال کا نام لیتے ہوئے جھوم نہ جاتا تھا۔ "خودی" ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اسی نیم خوابی کے عالم میں زبان "شکوہ" مکمل کر چکی تھی۔ وہ اور بات ہے کہ "نگاہ کی نامسلمانی" کفر کا فتویٰ لئے خانقاہ کی چار دیواری میں لرز کر نیم جان ہو گئی ہو لیکن انسانیت غلامی کے تار پود کو ریزہ ریزہ کئے ع

عزمِ آزادی سلامت زندگی پاینده باد" کا نعرہ لگا رہی تھی اور کسی "غزل خواں" کی زبان بھی تغزل کی رنگینیوں کے پردے چاک کرتے ہوئے بول اٹھی "آج وہ ننگ جوانی ہے جو زنداں میں نہیں"

"اصلاحات" کی اصلاح (۱۹۱۹ء کے اصلاحات اور ۱۹۲۹ء کے اصلاحات مراد ہیں) ہوتے ہوئے دیکھ کر بھی ہر ہندوستانی آزادی کی منزل کی طرف بڑھنے کے لئے یہی کہتا ہوا "ہمسفروں" کی ہمت باندھتا ہے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

انھیں ناشاعر مجاہدانِ آزادی میں ایک پیمبرِ سخن بھی تھا جو سرِ رہگذار عبدیت کو عبدیت کی راہ دکھلا رہا تھا یا پھر کاروانِ زندگی کی حدی خوانی کر رہا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ علی برادران اور گاندھی جی کے سوراج یا ہوم رول کی ہنگامہ خیزیوں کے نتیجے کے طور پر بیجاپور یا بنتول کے جیل خانہ میں "چکی کی دھن" میں گنگنا رہا ہو ـــ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

بلکہ پنجاب کی کھلی فضا میں یہ شاہین مزاج جواں سال درویش ایک نئے شوالے کی تعمیر میں مصروف تھا تاکہ من کی سونی بستی پھر ایک بار آباد ہو جائے۔ غیریت کے پردے اٹھا کر بچھڑے ہوؤں سے ملنے کے لئے وہ سیماب وار بیتاب تھا۔ دیر و حرم کی بندشوں سے عاجز آکر اس کا ذوق روا داری کلیسا، حرم اور دیر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتا تھا وہ ان درویشوں گراں مذہب کے ہر پیچ و خم کو خوب سمجھتا تھا غالب کی طرح اس کی نگاہِ حقیقت آشنا ریاضت کے کھوکھلے پن کو دور ہی سے بھانپ لیتی تھی ـــ

تن پروری خلق فزوں شد زریاضت
جز گرمیٔ افکار ندارد افغاں، تیغ

اس لئے وہ کھلے بندوں کہتا ہے ـــ

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اور اس بندۂ آزاد کی نورانی جبین آستانۂ وطن پر جھک جاتی ہے اور کسی سے مخاطب ہو کر بول اٹھتا ہے ـــ

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

رہ رہ کر یہ آرزو اس کے دل میں مچلتی ہے کہ اس نئے شوالے میں شکتی اور شانتی کا پجاری دھرم اور گیان کی حدوں سے نکل کر میٹھے میٹھے منتر الاپے اور پریت کے ساغر لنڈھائے اس لئے کہ ـــ

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اقبالؔ کا دیس عہدِ عتیق ہی سے سرفراز رہا ہے اور جس کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو۔ زمانے نے کروٹیں لیں، ستم پر ستم

توڑے، یونان اور روم کی بساط الٹ گئی لیکن ؎

یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اور اب بھی ؎

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اس کو مبالغہ . نہ سمجھئے آپ کے پہلو میں بھی دل ہے اور دل میں وطن، قوم، انسانیت اور آزادی کا درد ہے تو یہ شعر چپکے چپکے دل کی گہرائیوں میں اتر جائیں گے اور دیس کی بیوگی " پر چند آنسو گل ہی پڑیں گے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔

حبِ وطن از ملکِ سلیماں خوش تر
خارِ وطن از سنبل وریحاں خوش تر
یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد
می گفت گدا بودن کنعاں خوش تر

شباب نام ہے جذبات اور حیات کی ہنگامہ خیزیوں کا ــــ یہ وہ سہانی رت ہے کہ نچلا بیٹھا نہیں جاتا کسی پہلو قرار نہیں ملتا جوش اور ولولوں کا ہجوم شوق سر رہگذار کسی کا انتظار سوتے جاگتے" اٹھتے بیٹھتے" آٹھوں پہر کیا کرتا ہے۔ آخر وہ ہے کون ؟ یہ خود شباب نہیں بتلا سکے گا شاید اس سے زیادہ کچھ نہ کہے ؎

" نام کیا لوں کوئی اللہ کا بندہ ہوگا "

ہوسکتا ہے کہ کوئی سچ مچ " اللہ کا بندہ ہو " اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ " اللہ کا بندہ " محض کنایہ ہو ــــ خیر کچھ بھی سہی، آپ یہی سمجھ لیجئے کہ شباب کا مزاج سیمابی ہے۔ شعوری طور سے نہ سہی

تجسس، تلاش، طلب اس کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ یہی اس کی جبلتیں (Instinct) ہیں۔ نفسیاتی تجزیہ (Psycoanalysis) کرنے پر بھی علمائے نفسیات اس سے آگے شاید کچھ اور پائیں ــــ

فن کار انسان ہوتے ہوئے بھی ایک ذرا اور ہی انسان ہوتا ہے اس لئے اس کا شباب بھی نرالا ہوتا ہے۔ اس ہنگامہ خیزی میں ایک متانت اور اس شورش میں ایک صلاحیت ہوتی ہے۔ تجسس، تلاش اور اضطراب اس کے دل دماغ میں بھی کروٹیں لیتے ہیں لیکن پیمبرانہ انفرادیت لئے ہوئے اور اس شاعرانہ پیمبری کے آگے صرف تین چیزیں ہوتی ہیں حسن، خیر اور صداقت۔ ان کے سوا کسی اور کی تلاش اسے مقصود نہیں ــــ انھیں پالیا تو سب کچھ مل گیا اور یہ نہیں تو فن لا یعنی اور فن کار، فن کار نہیں بلکہ کچھ اور ــــ

کسی مکتبِ خیال کا شاعر ہو وہ حسن، خیر اور صداقت ہی کے پس منظر میں اپنا پیام سنائے گا۔ نہ زمانے کی قید ہے اور نہ مقام کی یمغرب کا شاعر ہو کہ مغرب کا یہی تین حقیقتیں اس کی شاعری کی روح ہوں گی۔ چاہے وہ حقیقت (Reality) کی طرف سے تخیل (Idea) کی طرف پرواز کررہا ہو یا تخیل سے حقیقت کی طرف آرہا ہو انھیں تین عناصر کی ہم آہنگی اس کو شاعر اور اس کی شاعری کو الہام بناتی ہیں۔ یہاں تک کہ " آہنگ " مکمل ہوجائے تو شاعر زندۂ جاوید ہوجاتا ہے اور وہ دعویٰ کرسکتا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ورنہ زمانہ کی گردش اس کو اور اس کی شاعری دونوں کو حرفِ مکرر کی طرح صفحۂ ہستی سے محو کردے گی۔

آئیے جوانسان اقبال کی جوان شاعری میں اس آہنگ کی تلاش کریں۔ ہاں اس کا خیال رہے یہ اقبال کے شباب کا زمانہ ہے۔ ابھی اس کی شاعری کی اٹھان کے دن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی سے پر تول رہی ہے اور نک سک سے ایسی درست ہے کہ گمان ہونے لگتا ہے کہ بھری جوانی ہے لیکن یہ نگاہ کی نامسلمانی ہے کہ کسی کافر پر بھی جا پڑی۔

ذرا دیکھئے تو اقبال کسی "گل رنگین" کو دیکھ کر کیسا بے تاب ہوا جا رہا ہے اور اس کا ذوق تجسس نوا سنج فغاں ہو چلا ؎

تو شناسائے خراش عقدۂ مشکل نہیں
اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں

اس چمن میں تو سراپا سوز و ساز آرزو
اور تیری زندگی ہے بے گداز آرزو

مطمئن ہے تو پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں
زخمی شمشیر ذوق جستجو رہتا ہوں میں

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس

اور چاند سے استفسار کرتا ہے ؎

پھر بھی اے ماہ مبیں میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہے وہ پہلو اور ہے

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو
سیکڑوں منزل ہے ذوق آگہی سے دور تو

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

نظارۂ شفق کی خوبی زوال پر تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں، ہنگاموں کا محل ہے
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشی ازل ہے

یہ ناصبوری، یہ تڑپ یہ ذوق آگہی، یہ نور کی طلب اور یہ وسعت کی خواہش، سب کیا ہے؟ وہی ایک اعلیٰ نصب العین کی تلاش جس کی صلاحیت شاعر خود میں ابھی نہیں پاتا۔ ابھی آہنگ مکمل نہیں ہوا ذوق تجسس حقیقت سے ہمکنار نہیں ہوا لیکن دیکھیے تو حسن، خیر اور صداقت کے نقوش صاف دکھائی پڑتے ہیں اور ان کا رنگ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔

لیکن اقبال سے نچلا کیسے بیٹھا جاتا وہ آئینہ خانۂ فرنگ کی طرف چل پڑے "شاید وہاں کی گنوان بستی میں انھیں اپنے ذوق استفہام کا جواب اور دل کی اس بے تابی کی دوا ملے" چنانچہ کہتے ہیں ؎

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

نظر ہے ابر کرم پر درخت صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاج باغباں مجھ کو

فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو

پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنوں نے محبت کا رازداں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

دیارِ مغرب سے ہو آنیکے بعد وطن پرست اقبالؒ ملت پرست ہو چلے۔ "قومی ترانے" کے ردِ عمل میں "ملی ترانہ" لکھا۔ گویا وہ ہندیوں کے شاعر نہیں رہے۔ مسلمانوں کے شاعر ہو گئے۔ وطن پرستی اور قومیت کو ایک فریب کے سوا کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہی اقبال جس نے کہا تھا ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اب یوں نوا سنج ہے ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یعنی وہ اب اس اسلامی نظریہ کے قائل نظر آتے ہیں ؎

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

جس دیس کو مینو سواد اور جنت بداماں سمجھتے تھے اور جس کا ہر ذرہ ان کا "دیوتا" تھا اس کی مدح سرائی تو اور بات ہے سرے سے وطن پرستی اور قومیت کے خلاف کہتے ہیں ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبالؒ کو جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی جس کے لئے مثلِ بو پریشان رہا کرتے تھے وہ حاصل ہو گئی۔ چنانچہ اب ان کے کلام میں تجسس تلاش اور طلب کے ارتسامات نہیں ملتے اب وہ ایک پیام سنانے لگے۔ "نصب العین" تک پہنچ گئے گویا انھوں نے منزل کا سراغ لگا لیا —— یہ ان کی شاعری کا دوسرا دور ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب کہ مولانا محمد علی کو اقبال کی قومی شاعری یاد آجاتی "تو قلب پر وہی اثر ہوتا۔ جو کسی ایسے خاندان والوں کے قلب پر ہوتا ہے جن کی ایک چہیتی لڑکی کسی شرمناک فعل کے ارتکاب کے باعث گھر سے نکل گئی ہو اور انھوں نے خاندانی عزت و آبرو کی تباہی کا باعث دل سے بھلانے کی کوشش کی ہو اور اتفاقیہ اس کے اوڑھنے یا پہننے کی کوئی چیز نکل آئے اور یکایک ان کی نظر اس پر پڑ جائے۔ محبت اور شرم دونوں کی کشمکش سے زیادہ دل پر چوٹ لگانے والی کونسی جنگ ہو سکتی ہے۔

حسینی شاہد

نذرِ غالب

میری سب بیتابیاں مانوسِ درماں ہوگئیں
مشکلیں کمزور تھیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

دفعتاً جب عشق کی شانیں نمایاں ہوگئیں
حسن کی تابانیاں حیرت بداماں ہوگئیں

میری آہیں زینتِ فطرت کا ساماں ہوگئیں
دل سے نکلیں اور تاروں کا گریباں ہوگئیں

فطرتِ گلریز تھی تجدید فرمائے بہار
چار کلیاں زینتِ صبحِ گلستاں ہوگئیں

ان کو رہنا چاہیے خاموش تا صبحِ بہار
میں انھیں کلیاں نہیں کہتا جو خنداں ہوگئیں

عشق سے کہہ دو کرے شکوہ خدائے حسن سے
پھر وہ نظریں بے نیازِ دردِ پنہاں ہوگئیں

رنگ لائیں اس طرح میری تصور کوشیاں
ہوتے ہوتے ایک دن تصویرِ جاناں ہوگئیں

زندگی کا میری ہر لمحہ ہے صرفِ اضطراب
کس قدر بے چینیاں جذبِ رگِ جاں ہوگئیں

میں تو جب جانوں مرا ویرانہ بن جائے چمن
وہ بہاریں کیا جو پابندِ گلستاں ہوگئیں

تھا ارادہ حشر میں بیداد کی فریاد کا
خیریت گزری کہ وہ نظریں پشیماں ہوگئیں

ہستی و مستی کے ہنگاموں کا یہ انجام تھا
بستیاں کی بستیاں خوابِ پریشاں ہوگئیں

چند لمحے زندگی کے مل سکے پرواز کو
آہ وہ آزادیاں جو صرفِ زنداں ہوگئیں

پارسائی کا بھروسہ لے ہی ڈوبا حشر میں
نیکیاں کمزور تھیں اتنی کہ عصیاں ہوگئیں

یہ تری کافر نگاہوں کا تغیر الاماں!
شعر ساماں ہوتے ہوتے قہر ساماں ہوگئیں

میں جو لایا تھا تری محفل سے کچھ کیفیتیں
دفعتاً میرے لئے وحشت کا ساماں ہوگئیں

شامِ غم میرے تخیل کی پریشانی نہ پوچھ
میں نے جتنی کیں دعائیں سب پریشاں ہوگئیں

ہم سے منظرؔ جو نگاہیں مل نہ سکتی تھیں کبھی
اے زہے قسمت وہ اب تسکیں کا ساماں ہوگئیں

منظر صدیقی اکبرآبادی

برٹش میوزیم کے خزانہ میں ایک نادر شئے کا اضافہ

برٹش میوزیم کے شعبۂ مخطوطات نے ڈیوک آف رٹ لینڈ سے ایک مطلا مخطوطہ "سالٹرانیڈ بک آف اورس" حاصل کیا جو ۱۵ بڑی تصویروں، ۲۳۲ چھوٹے تاریخی اور آرائشی کناروں سے مزین ہے۔ اس کی قیمت ۵۰۰۰ پونڈ ہے جس میں نیشنل آرٹ کلکشن فنڈ نے ۲۰۰۰ پونڈ اور بقیہ ۱۵۰ پونڈ برٹش میوزیم نے دیئے یہ تصویر اسی نادر مخطوطہ کا ایک صفحہ ہے۔

پرسی بسی شیلی

اوائل ۱۹ ویں صدی کا مشہور رومانوی شاعر۔ اس کی شاعری جذبات سے مالا مال تھی اور اس میں فطری حسن پرستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہمعصر شاعر کیٹس کا زبردست مداح اور پرستار تھا اور اس کی موت پر اس نے جو نظم لکھی ہے وہ شیلی کا شاہکار ہے۔

زہراب

اگر اس زندگی میں زندگی میری نہیں ہوتی !
فضائے نکہت و تابندگی میری نہیں ہوتی

اگر آنکھیں سرشک غم سے خالی ہو نہیں سکتیں
جوانی کی ترنگیں لا ابالی ہو نہیں سکتیں

اگر احساس کی آواز مدھم ہو نہیں سکتی
طبیعت بے نیازِ شادی و غم ہو نہیں سکتی

اگر غربت مری راحت کی منزل پا نہیں سکتی
کوئی نغمہ کسی محفل میں کھل کر گا نہیں سکتی

اگر میری طلب آسودۂ منزل نہیں ہوتی
نہیں ہوتی کبھی آساں کوئی مشکل نہیں ہوتی

اگر میرے ہی نالے باعثِ ذوقِ تبسم ہیں
مری آہیں نشاطِ لرزشِ موجِ ترنم ہیں

اگر اٹھتا نہیں نظروں سے پردہ ذوقِ راحت کا
نہیں مٹتا اگر یہ وسوسہ جبر و مشیّت کا !

اگر امواجِ طوفاں بھی سہارا دے نہیں سکتیں
کسی کو اپنے آغوشِ بلا میں لے نہیں سکتیں

اگر اک قہقہہ ہی ہے صلہ آشفتہ حالی کا
"سکوتِ" دل شکن انعام ہے شیریں مقالی کا

اگر "گونگی تمنا" ہی ہے منزل گل فشانی کی
رہیں گی دوشِ محرومی پہ لاشیں نغمہ خوانی کی

اگر "اندھی محبت" ہی ہے منزل فکرِ منزل کی
بھنور کی آبرو رکھتی ہے خواہش امنِ ساحل کی

اگر احباب مجھ پر ظلم بھی فرما نہیں سکتے
ریاکاری کے اونچے اونچے ایوان ڈھا نہیں سکتے

اگر دنیا میں چشم ہمدم کا بی نم نہیں ہوتی
"شریکِ زندگانی" بھی شریکِ غم نہیں ہوتی

اگر میرے لئے باقی نہیں کچھ عیش زاروں میں
گلستانوں میں صحراؤں میں رنگیں آبشاروں میں

اگر خونیں بدن تارے مجھی پر مسکرائیں گے
روپہلی، سرد کرنوں سے سدا جھلسائے جائیں گے

اگر نورِ سحر داغِ مصیبت دھو نہیں سکتا
ستارہ صبح کا حالت پہ میری رو نہیں سکتا

اگر اک مضطرب دل کی بھی کشتی کھے نہیں سکتی
شفق کی رنگ سامانی تسلّی دے نہیں سکتی

تو پھر اے ہم نشیں میں خاک ہو جاؤں تو اچھا ہے
بھیانک قبر کی خوراک ہو جاؤں تو اچھا ہے

منظر

نئی کتابیں

۱- نیرنگ مغرب (ناول) از یزدانی جالندھری حجم ۹۷ صفحے قیمت ۱۲؍ پتہ انڈیا بک ہاؤس عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

۲- آنسو (ناول) مترجمہ احسان بی اے ۱۶۸ صفحے قیمت ۸؍ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۳- نیرنگیٔ حیات (افسانے) مرتبہ گلاب چند کپور ۹۷ صفحے قیمت 〃 〃 〃 〃 〃

۴- اپنا چار (ٹیگور کے افسانے) مترجمہ یزدانی جالندھری ۱۲۰ صفحے قیمت ۸؍ 〃 〃 〃

۵- پہلی پوجا (ٹیگور کے افسانے) مترجمہ جگن ناتھ وششٹھ ۱۲۸ 〃 〃 ۸؍ 〃 〃 〃

۶- اشتراکی روس- از عبدالقادر لکچرار جامعہ عثمانیہ ۳۰ 〃 〃 ۶؍ 〃 〃 〃

۷- بیکس (ناول) مترجمہ مائل ملیح آبادی ۱۲۲ صفحے 〃 ۸؍ 〃 〃 〃

۸- شکست (ناول) مترجمہ رشید گیلانی ۹۶ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۹- سوانح حیات مولانا آزاد از محمد سمیع اللہ۔ قیمت ۶؍۷ پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ- عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

۱۰- کامیابی کے راز از سوامی رام تیرتھ 〃 ۱۲؍۶ 〃 〃 〃 〃

۱۱- نقد دھرم 〃 ۱۲؍۶ 〃 〃 〃 〃 〃

۱۲- دیہاتی رومان (ڈراما) از چودھری افضل حق 〃 ۱۰؍ 〃 〃 〃 〃

۱۳- بیتی باتیں (ناول) از ایم۔ اسلم حجم ۲۵۲ صفحے قیمت ۲؍ پتہ کتب خانہ دارالبلاغ- میو روڈ- لاہور۔

۱۴- رین نظارے (افسانے) از ایم- اسلم- حجم ۴۰۰ صفحے قیمت للعہ 〃 〃 〃 〃 〃

۱۵- اس کی کہانی (افسانہ) از پرویز قیمت عال پتہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز- لاہور

۱۶- زاہدہ (ناول) از محمد رحیم دہلوی 〃 عال 〃 نیا کتاب گھر- اردو بازار- دہلی

۱۷- ڈاک گھر (ٹیگور کا ڈراما) مترجمہ جمیل احمد- قیمت ۸؍ پتہ نرائن دت سہگل- لاہور۔

۱۸- تلخیاں (مجموعہ کلام) از ساحر لدھیانوی 〃 ۸؍ - پریت نگر بک شاپ- بسنت روڈ- لاہور

۱۹- کھنڈر (افسانے) از طاہر تمیر قیمت ۱۲؍ پتہ دارالتشہیر- بھاٹی دروازہ- لاہور

۲۰- آخرکار (افسانہ) از طاہر تمیر 〃 ۸؍ 〃 نرالا بک ڈپو- ہسپتال روڈ- 〃

۲۱- ہماری گلی (کہانیاں) از احمد علی قیمت ۱۲؍ پتہ الثنا پریس- دہلی-

۲۲- بلقیس (افسانے) از صادق الخیری دہلوی قیمت عال پتہ خاتون کتاب گھر- اردو بازار- دہلی

۲۳- آئینۂ حیرت (افسانے) از سید رفیق حسین مرحوم قیمت عال پتہ ساقی بک ڈپو- دہلی

۲۴- ثروت آرا بیگم (ناول) از حمیدہ سلطانہ قیمت ۸؍ پتہ نیا کتاب گھر- اردو بازار- 〃

۲۵- دفینے (تاریخی افسانے) از امداد انصاری 〃 عال 〃 〃 〃 〃

۲۶- جانباز ملت (نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی وفات پر نظم) از بشیر النساء بیگم بشیر دارالحرمت دبیر پورہ

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

اشتراکیت اور اسلام | ناشر اقبال اکیڈمی لاہور ۔

اس کتاب میں کہیں مرتب یا مولف کا نام درج نہیں ہے ۔ تعجب ہے کہ اقبال اکیڈمی جیسے اس طرح غیر ذمہ داری کے ساتھ اس کو شایع کر دیا ۔ اس میں پہلے اشتراکیت کا مفہوم واضح کیا گیا ہے اور کارل مارکس کے فلسفہ کو سمجھا کر اشتراکی تحریک اور روسی انقلاب کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے ۔ آخر میں اسلامی نظریات پر چند صفحات میں بحث ہے لیکن یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر زیادہ شرح و بسط کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے ۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے | از علی عباس حسینی ۔ ناشر مکتبۂ جامعہ لکھنو ۔

اس مجموعے میں نو چھوٹے چھوٹے ڈرامے ہیں جو سماجی اور تاریخی موضوعوں پر قلمبند کئے گئے ہیں ۔ مصنف کی زبان اور انداز بیان بہت دلچسپ ہے اور تاریخی واقعات کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ڈرامے کی شکل دینے کی کوشش کی ہے ۔

اردو ادب میں یوں تو صنف ڈراما ہی کی طرف کافی توجہ نہیں کی گئی ہے ۔ اور ایک ایکٹ کے ڈرامے تو شاذ و نادر ہی لکھے گئے ہیں اس لئے علی عباس حسینی صاحب کی یہ کاوش قابل قدر ہے اور اس کی وجہ سے اردو کی یہ ضرورت ایک حد تک تکمیل کو پہنچتی ہے ۔

لندن سے آداب عرض | از آغا محمد اشرف ناشر عالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۔

آغا محمد اشرف صاحب اردو دنیا میں اس لئے مشہور ہو چکے ہیں کہ لندن ریڈیو سے وہ اردو میں بات چیت کیا کرتے تھے ۔ اب وہ ہندوستان واپس ہو چکے ہیں اور اپنے مضامین کا یہ مجموعہ شایع کیا ہے ۔

ان مضمونوں کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ ان کی زبان نہایت سادہ اور شگفتہ ہے اور دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کو اس ترتیب سے لکھا اور چھاپا گیا ہے کہ یہ کتاب ایک اچھا خاصہ سفرنامہ بن گئی ہے اور چونکہ جنگ کے زمانہ میں مصنف انگلستان میں مقیم تھے اس لئے دوران جنگ کے چشم دید حالات کا موقع ہونے کی وجہ سے یہ کتاب ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے ۔ جو لوگ اپنی فرصت کے اوقات میں دلچسپ اور معلومات آفریں کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب سے ضرور محظوظ ہوں گے ۔

بکواس | از شوکت تھانوی ۔ ناشر اردو بک اسٹال لاہور

یہ ایک نفسیاتی ناول ہے جس کو مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی نے سنجیدہ پیرائے میں لکھنے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن اس کی سنجیدگی میں بھی جگہ جگہ شوخی اور طنز جھلکتی ہے ۔ قصہ میں ایک بو الہوس کا اپنی محبوبہ کو رام کرنے کی غرض سے مرشد کا روپ اختیار کرنا بڑے پر لطف انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ اصل قصہ کی گتھی کو سلجھانے کے لئے ہیرو کی ایک یوروپین محبوبہ سے مدد لی گئی ہے ، جو ہیروئن کے زیر اثر اسلام قبول کر کے ہیرو کو بھی اسلام اور اپنی مذہبی محبوبہ کی طرف راغب کر دیتی ہے ۔

یہ دلی ہے | از سید یوسف بخاری ۔ ناشر ۔ مکتبۂ جہاں نما ۔ دہلی ۔

اس کتاب میں سیر گولکنڈہ کی طرح مختلف مضامین کے ذریعہ سے دلی کے تمدن اور تہذیب و معاشرت کی نقاشی کی گئی ہے ۔ ابتداء میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب معتمد

انجمن ترقی اردو کی ایک تقریظ ہے جس میں کتاب کی خصوصیات
کو اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع یہ ہے
کہ دلی شہر کی زندگی کے ہر پہلو کو وضاحت کے ساتھ نمایاں
کیا جائے۔ جو اصحاب دلی کی شاعری اور ادب سے دلچسپی
رکھتے ہیں ان کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

جنگ اور مالیہ | از امتیاز حسین خاں۔ ناشر ادارۂ
جنگ اور روپیہ | ادب جدید۔ حیدرآباد

ادارۂ ادب جدید حیدرآباد نے مسائل حاضرہ سے
متعلق مختلف ماہرین معاشیات سے چھوٹے رسالے لکھوا کر
چھپوانے شروع کئے ہیں۔ جن میں سے ایک کتاب پر اس سے
پہلے تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ یہ دونوں کتابیں اسی سلسلے کی
کڑیاں ہیں۔ اور ان دونوں کے مصنف جامعہ عثمانیہ کے
ایک نوجوان لکچرار امتیاز حسین خاں صاحب ہیں جنھوں نے
ان موضوعوں پر دلچسپ اور ضروری معلومات اردو میں قلمبند
کردی ہیں۔ معاشیات کے طلبہ ان سے خاص طور پر استفادہ
کر سکیں گے۔

تلخ و شیریں | از صلاح الدین قریشی ناشر مکتبۂ جہاں نما دہلی

یہ کتاب سترہ افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جو زیادہ تر
عربی، انگریزی اور فارسی زبان کے مشہور افسانوں کے تراجم
ہیں۔ اور ان میں سے اکثر افسانے اردو کے بعض معروف
رسائل ساقی، ادبی دنیا، ادب لطیف اور عالمگیر میں شائع
ہو چکے ہیں۔ اردو زبان میں آج کل افسانوں کا دور دورہ
ہے اور ہر نوجوان اپنی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری ہی سے
کرتا ہے جس طرح پہلے زمانہ میں ہر شاعر غزل گوئی سے اپنی
شاعری کی ابتدا کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ افسانوں کے بعض
مجموعے ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے بہت پست ہوا کرتے ہیں۔

ان حالات میں یہ بہتر ہے کہ دوسری زبانوں کے بلند پایہ
افسانوں کو اردو میں منتقل کیا جائے اور اس لحاظ سے
یہ کتاب قابل قدر ہے۔ مترجم نے ترجمے کی کامیاب
کوشش کی ہے البتہ بعض مقامات پر غیر زبانوں کے
لفظوں کا تلفظ اردو میں صحیح نہیں لکھا گیا ہے۔

موضع دویلی کی معاشی تحقیق | از محمد ناصر علی۔
ناشر مجلس علیہ طیلسانین عثمانیہ۔

یہ ایک ضخیم معاشی کتاب ہے جس میں جامعۂ عثمانیہ
کے ایک لائق تعلیم یافتہ نے ایک چھوٹے سے موضع کی معاشی
تحقیق پیش کی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
محنت اور تحقیق و تجسس کے ذریعے سے چھوٹے سے چھوٹے
موضوع پر کتنی مفید اور ضروری معلومات حاصل کی جا سکتی
ہیں۔ اور اس امر کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے
اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان معاشیات کے موضوع پر کتنا
اچھا عبور رکھتے ہیں۔ حیدرآباد کے ایک ضلع نظام آباد میں
بودھن ایک تعلقہ ہے جس میں دویلی ایک قدیم موضع ہے
جہاں صرف ۱۱۵۴ نفوس آباد ہیں۔ اس کتاب میں یہ
بتایا گیا ہے کہ اس موضع کے باشندے اپنی زندگی کس
معیار پر بسر کرتے ہیں اور اس کے کیا اسباب ہیں۔ اور وہ
کیا تدابیر ہیں جن کی بنا پر ان کے معیار زندگی کو بلند
کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں مسئلہ آبادی کے مختلف
پہلوؤں پر مختلف نقاط نظر سے بھی بحث کی گئی ہے یہ کتاب
دوسروں کے لئے ایک نمونہ ہے اور ثابت کرتی ہے کہ ہمارے
دیہاتوں کی طرف توجہ کرنے کی کتنی سخت ضرورت ہے
اور ان سے متعلق محنت اور تلاش کے بعد کیسی مفید کتابیں
قلمبند کی جا سکتی ہیں۔

تیر بہدف ۔ مرتبہ حکیم محمد ظفرالدین صاحب ناصر دفتر حکیم دکن حیدر آباد۔

یہ کتاب مختلف نسخوں کا ایک مجموعہ ہے جو سینہ بہ سینہ چلے آرہے تھے اور جن کو ماہنامہ حکیم دکن کے لائق مرتب حکیم محمد ظفرالدین صاحب ناصر نے مرتب کرکے حکیم دکن کے ایک خاص نمبر میں شایع کیا ہے۔ اور نسخوں کے درج کرنے سے پہلے ان کے آزمانے والے اور ایجاد کرنے والے اطباء کے سوانح حیات بھی درج کردئے ہیں۔ یہ کتاب پہلے ۱۹۴۱ء میں چھپی تھی اور اتنی مقبول ہوئی کہ اس سال اس کا ایک دوسرا ایڈیشن چھپوانا پڑا ۔ طب یونانی سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے یہ ایک مفید مجموعہ ہے ۔

صحیح قاعدہ حصہ اول و دوم ۔ از جعفر حسین تاشر بیاکتی گھر حیدر آباد ۔

اردو میں بچوں کی تعلیم کے لئے عہد حاضر میں مختلف قاعدے لکھے جارہے ہیں ۔ یہ بھی اس سلسلہ میں مفید کوشش ہے ۔ کتاب میں بچوں کی ذہنیت کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے اور جابجا تصویروں کے ذریعے اسباق کو دلچسپ بنایا گیا ہے۔

لہو ترنگ از سکندر علی وجد ۔ ناشر عبدالحق اکیڈمی ۔

میر سکندر علی وجد جامعہ عثمانیہ کے ایک لائق اور قابل فخر سپوت ہیں ۔ ان کے مجموعۂ کلام کا عرصہ سے انتظار تھا جو اب بہت دیدہ زیب شکل میں شایع ہوا ہے۔ وجد کی شاعری میں ندرت بیان اور جذبات کی پاکیزگی کے علاوہ ایک خاص زندگی اور اوپج ہے جو جدید اردو شاعری میں ایک صحتمند اضافہ سمجھی جاسکتی ہے۔ ان کی بعض نظمیں مثلاً تاج محل، اجنتا اور عبدالرزاق لاری اردو کی نظم گوئی کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گی ۔

اس مجموعے میں غزل اور نظم کے جو پاکیزہ نمونے نظر سے گزرتے ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی قدیم شکلوں میں زندگی اور بقا کی بڑی صلاحیت ہے۔ "ق"

سادہ و رنگین افسانے ظفر قریشی دہلوی کے بارہ سادہ و سلیس، رنگین و دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ زندگی کی تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں ۔ اس مجموعہ میں یہ دونوں رخ نمایاں ہیں ۔ الفاظ کے ترنم میں بے ساختگی و بے باکی چھپی ڈھکی مل جاتی ہے ۔ فن افسانہ نگاری پر صاحب موصوف کو کافی قدرت حاصل ہے جو سادہ و سلیس افسانے ہیں ان میں محض سادہ پرکاری، جن کو رنگینی ملی ہے ان میں رومان روح بن کر جلوہ فرما ہے ۔

حجم ۲۲۰ صفحے قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ عبدالحق اکیڈمی ۔ اشاعت منزل اردو گلی (حیدر آباد دکن)

کنول ڈاکٹر اعظم کریوی ایک قدیم کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں ۔ کنول ڈاکٹر صاحب کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ ۔ بقول پنڈت برج موہن کیفی صاحب : ۔

" تاثر و دلچسپی کا جہاں تک تعلق ہے افسانہ سے افسانچہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے " زیر نظر تصنیف کے اکثر و بیشتر افسانے ہندی طرز معاشرت کی ہو بہو تصویر پیش کرتے ہیں ۔ گویا مصنف نے جذبات و احساسات کی عکاسی کی ہے ۔ ان کی زندگی کے گہرے سے گہرے نقوش کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے ۔ ان کے افسانچوں میں ہم کو منشی پریم چند اور سدرشن دونوں کی افسانہ نویسی کی جھلکیاں مل جاتی ہیں ۔ انداز بیان نہایت سادہ و سلیس ۔ تصنع سے عاری ۔ تکلف سے دور حجم ۱۵۲ قیمت عہ ۔ عبدالحق اکیڈمی ۔ اشاعت منزل اردو گلی ۔ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے ۔ "ج"

خیابان دکن (ماہ نامہ) مرتبہ حمید النسا بیگم (عثمانیہ) حجم ۶۰ صفحے چندہ سالانہ پانچ روپے پتہ حسینی پریس۔ بازار نور الامرا۔ حیدرآباد دکن

خواتین کا یہ ادبی ماہ نامہ ماہ جنوری ۱۹۴۴ء سے بیگم نواب کمال یار جنگ بہادر کی سرپرستی میں شایع ہو رہا ہے، اب تک اس کے چھے شمارے نکل چکے ہیں۔ ہر شمارہ "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" کے مصداق ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں بیگم نواب کمال یار جنگ، جلیل القدر جلیل، ماہر القادری، مجنوں گورکھپوری، علامہ ضامن کنتوری، حضرت امجد، سید تمکین کاظمی مخدوم محی الدین، صاحبزادہ میکش، سید بادشاہ حسین، نصیر الدین ہاشمی، محمد اظہر الٰہ آبادی، جہاں بانو بیگم، سعیدہ مظہر بانو بیگم بشیر النسا بیگم بشیر، جمیلہ بیگم (کلکتہ)، زینت ساجدہ، انیس فاطمہ کبرا بیگم قابل ذکر ہیں، ان کے علمی، ادبی، اخلاقی، تعلیمی، تاریخی، سماجی مضامین، نظمیں، افسانے، ڈرامے اس ماہ نامے کے معیار کی بلندی کے ضامن ہیں، مضامین کے انتخاب میں مدیرہ کے ذوق صحیح اور مذاق سلیم کی داد نہ دینا باعث ناانصافی ہوگا۔

ماہ جون کا شمارہ "نشریات نمبر" کے نام سے شایع ہوا ہے، یہ شمارہ ۱۴۸ صفحوں پر مشتمل ہے، اس کو صاحبزادہ میکش نے بڑی خوش اسلوبی سے مرتب کیا ہے، اس میں جہاں بانو بیگم مسز نظام الدین، مسز محمد خان، لطیف النسا بیگم، مسز عباس علی بیگ مسز محسن، زہرہ بیگم، رابعہ لطیف، رفعت لئیق، رشید قریشی، محبوب حسین جگر، افضل عابدی وغیرہ کی نشری تقریریں، افسانے اور فیچر درج ہوئے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خواتین کا یہ معیاری رسالہ شاہراہ ترقی پر اسی طرح گامزن رہے اور اپنی گوناگوں دلچسپیوں کی وجہ سے خوب پھولے پھلے۔

ہماری سماج میں "علم و ادب" ایسے لفظ ہیں جو کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوئے، ہمیں اپنے لہو و لعب سے فرصت کہاں کہ علم و ادب کی قدر کریں، اگر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہے تو صرف اپنے لٹریچر کی توصلہ افزائی سے، لٹریچر کی قدر دانی ہی سے قوم کی ترقی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کتابیں خریدنا ہم فعل عبث سمجھتے ہیں۔ اپنے اسباب تعیش پر ہزاروں روپے صرف کر دیں گے مگر اس کا عشر عشیر بھی کتابوں کی خریداری اور علم و ادب کی آبیاری پر صرف کرنا گناہ عظیم سمجھیں گے۔

ملاء اعلیٰ، بند لفافہ، مٹھائی کی ٹوکری یہ تینوں مختصر ڈرامے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے لکھے ہیں، ان میں دنیوی ضرورتوں کی کشمکش کے ساتھ اعلیٰ جذبات کا مظاہرہ کیا گیا ہے ہر ڈرامہ کا حجم ۳۲ صفحے اور قیمت ۴ر ہے۔

کٹھ پتلیاں از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی حجم ۱۴ صفحے قیمت ۸ر یہ ڈراما بھی نصیحت خیز ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ انسان قسمت کے ہاتھوں کیسے کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ یہ چاروں ڈرامے مکتبہ جامعہ دہلی سے مل سکتے ہیں۔

چور لڑکا حجم ۲۸ صفحے قیمت ۴ر **چھوٹا لڑکا**۔ حجم ۲۴ صفحے قیمت ۳ر۔ یہ دونوں ڈرامے عبد الغفار مدہولی نے لکھے ہیں بچوں کے لئے نصیحت خیز اور سبق آموز ہیں مکتبۂ جامعہ سے خریدے جا سکتے ہیں۔

باغبانی مرتبہ مکتبہ جامعہ دہلی حجم ۴۸ صفحے قیمت ۶ر اس رسالہ میں پھول اور ترکاریاں اگانے کے آسان طریقے سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں۔

کاغذ سازی مرتبہ مکتبہ جامعہ دہلی حجم ۴۸ صفحے قیمت ۶ر کاغذ بنانا اور کاٹنا، کاغذ کے پھول، کھلونے اور غبارے وغیرہ بنانے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

لکڑی کا کام مرتبہ مکتبۂ جامعہ حجم ۴۸ صفحے قیمت ۶ر۔

مختلف درختوں کی لکڑی سے مختلف چیزیں اور فرنیچر بنانے کی ترکیب بتائی گئی ہے۔ غرض کہ یہ تینوں رسالے نہایت مفید اور کارآمد ہیں۔

ہوائی جہاز | مرتبہ مکتبہ جامعہ حجم ۴۰ صفحے قیمت ۶ر بچوں کی معلومات کے لئے یہ سلسلہ نہایت مفید ہے۔

لڑائی کے ہتھیار | از عبداللطیف اعظمی حجم ۴۸ صفحے قیمت ۶ر پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔ اس رسالہ میں جنگ کے جدید ہتھیار مثلاً ہوائی جہاز۔ ٹینک، جنگی موٹر، جنگی جہاز، ڈبکنی کشتی اور سرنگوں وغیرہ کی نسبت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

پڑدادا کی کہانی | از محمد عبدالغفور حجم ۴۸ صفحے قیمت ۶ر پتہ۔ مکتبۂ جامعہ دہلی اس رسالے میں "پڑدادا" کی کہانی کے علاوہ کھنڈروں کی پکار، بگ ڈنڈی کی کہانی اور دولت آباد کے قلعہ کے حالات بھی لکھے گئے ہیں۔

جنگ اور اغذیہ | از ڈاکٹر انور اقبال قریشی حجم ۸۰ صفحے قیمت ۱۵ر ملنے کا پتہ ادارۂ ادب جدید شاہراہ عثمانی حیدرآباد دکن۔ مسائل حاضرہ پر یہ رسالہ لکھا گیا ہے، ہندوستان میں خوردنی اجناس کی پیدائش، گیہوں اور چاول کی مقدار، پیداوار، اجناس کی برآمد، موجودہ قحط کے اسباب، قیمتوں پر نگرانی کے نتائج، ذخیرہ اندوزی، بنگال کی صورت حال اور اس کے اثرات، راشن بندی اور حیدرآباد کی غذائی صورت حال پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے

"س"

جانباز ملت | از بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر۔ معین دکن پریس حیدرآباد

یہ ایک نظم ہے جو قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی اچانک موت پر سپرد قلم کی گئی ہے۔ اس کی مصنفہ حیدرآباد کی ایک مشہور اور صاحب دل خاتون ہیں جو اردو دنیا میں اپنے شعر و سخن کے اعلیٰ ذوق کی وجہ سے کافی متعارف ہو چکی ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی اچانک رحلت نے ہندوستان کی سیاسی اور ادبی دنیا میں ایک ایسا صدمہ پہنچایا ہے جس کی نظیر ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے ان میں جو خوبیاں جمع ہو گئی تھیں وہ کسی ایک ہی شخص کی ذات میں مشکل سے جمع ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ہندوستان میں ان کا ماتم کیا جا رہا ہے اور شاعر اور ادیب لیڈر اور مقرر سب ہی اپنے اپنے انداز میں اس قومی نقصان کا اظہار کر رہے ہیں۔ نواب مرحوم سے متعلق اس اثناء میں کئی نظمیں لکھی گئیں اور شائع ہوئی ہیں لیکن بشیر النساء بیگم صاحبہ نے اپنی اس نظم میں مرحوم کی زندگی کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والوں پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ بشیر النساء بیگم کا اسلوب نہایت شائستہ اور تخیل بہت بلند ہے یہی وجہ ہے ان کی یہ نظم اس موضوع سے متعلقہ دوسری نظموں میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔

کرنیں | از پریم ناتھ پردیسی۔ مطبوعہ راج کمل پبلشرز جموں کشمیر

اس چھوٹی سی کتاب میں بچوں کے روزمرہ کے واقعات ڈائری کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے مصنف ایک خوش ذوق اور فراخ دل ہندو ہیں جن کو انشاپردازی کا بھی اچھا سلیقہ حاصل ہے۔ انھوں نے اس ڈائری میں بچوں کے جو حالات اور واقعات بیان کئے ہیں ان میں خاص طور پر اس امر کی کوشش نمایاں ہے کہ ہندو اور مسلمان بچے ساتھ ساتھ کھیلیں، کودیں اور نشو و نما حاصل کریں۔ واقعات ایسے پیش کئے گئے ہیں جو ہر ملک کے بچوں کی زندگی میں روزانہ پیش آتے ہیں۔

ان تمام امور کے لحاظ سے یہ قابل قدر کوشش ہے اور یقین ہے کہ بچے اس کو شوق سے پڑھیں گے۔ "ق"

صبر شکن

زندگی ـــ دانشِ اندوہ کی سیرت ہی سہی !
فکر میں ڈوبی ہوئی سوز میں لہرائی ہوئی
خون میں لتھڑی ہوئی اور نڈھال
آہ ـــ فاقوں کی شکار !
مسکراتی ہوئی بجلی کا تصور بنتی
آگ کی شکل ہی میں آگ سے لڑتی بھڑتی
آگ برساتی ہوئی
آگ بنتی ہی چلی جاتی ہے ۔
ـــ خون سے کھیل رہا ہے انساں !
غرق ہے ساغرِ گلنار میں کس کا پندار ؟ !
ایک رودادِ مصیبت ہے ـــ مگر
زندگی سے ہے عبادت یہی تقدیر گداز
طائرِ صبر شکن ! ـــ اس کا تجھے علم نہیں ؟
ٹوٹ جائیں نہ کہیں تیرے پہاڑوں کی جڑیں
زلزلے دیر سے منہ کھولے ہوئے بیٹھے ہیں
کس قدر برق فگن ہے آواز
تھرتھراتا ہے فلک ٹوٹ رہے ہیں تارے
کپکپاتی ہے زمیں کانپ رہے ہیں ایواں
درد میں جھوم رہا ہے انساں
کوئی طوفان ہوا ہے بیدار
کیسی چیخیں یہ چلی آتی ہیں
گائے کا فکر نہ اشتر کا خیال
دیر کی راہ سے جاتی ہیں حرم کو راہیں

وقت کو وقت کا احساس ہوا ہی کب تھا
فکر کو وقت کے احساس کا دعویٰ بھی ہے
صرف دعویٰ ہے ـــ نہیں کوئی دلیل ! ؟
تیرے احساس میں تو وقت بھی ہے فکر بھی ہے
زندگی ! ـــ تیرے لئے کون نہیں ہے بے تاب ؟
آبشاروں کے ابلتے ہوئے نغموں کا جمال
چاند تاروں سے نکلتے ہوئے سازوں کا خیال
ملک الموت کے چہرے کا جلال
اور جبریل کا حال !
فکر تاریک ہوا جاتا ہے
عیش باریک ہوا جاتا ہے
شب کے دامن میں نہاں ہے خورشید
خون کے طشت سے اٹھتا ہے دھوئیں کا بادل
کس کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے لہو ۔
کتنی بے رنگ ہے دنیائے نشاط
کوئی پرویز ہے کوئی فرہاد
یہ رعونت کی تجلی یہ امارت کا جلال !
یہ غریبی کی دہکتی ہوئی آنکھوں کا سوال
ٹوٹ جائے گا طلسمِ اضداد
خاص احمر کی چٹانیں ہوں کہ اسود کے پہاڑ
اک دھماکے میں الٹ جائیں گے
خود ہی ٹکرائیں گے پس جائیں گے اڑ جائیں گے
زندگی کھیل سہی کھیل کی تفصیل ہے خاص

کاوش

ادارہ کی خبریں

اندولہ | ۱۲ / شہریور سنہ ۵۳ ف کو صبح میں ندی پار کرکے جانب اندولہ روانہ ہوا۔ سواری کا انتظام تھا۔ معتمد صاحب مرکز نے دیگر علم دوست احباب کے ساتھ پرجوش طریقہ سے استقبال کیا۔ جس کا میں شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

امتحان ہال کی آرائش | امتحان ہال کا خصوصاً زنانی نشست کا معائنہ کیا۔ ذکور کی حد تک نشست کا انتظام مدرسہ میں ہی کیا گیا تھا۔ اناث کے نشست کا انتظام میرے جانے تک ملتوی رکھا گیا تھا۔

مولوی عطاء اللہ صاحب کے مکان میں ہی اس کا انتظام کرایا گیا۔ کیونکہ صاحب موصوف کی بیوی صاحبہ ہی زنانہ مرکز کی نگرانکار مقرر ہوئی تھیں۔ اس انتظام سے ہر دو فریق بھی خوش ہوئے۔ موصوف کے ذریعہ ضروری ہدایات ان تک پہونچائے گئے۔

نگرانکاران امتحان | معتمد صاحب مرکز نے جناب حکیم صاحب دواخانہ یونانی اندولہ۔ مسٹر سنگن گوڑا صاحب وکیل مولوی عطاء اللہ صاحب اور مسٹر نرسنگ راؤ پٹواری وغیرہ کو نگرانکار مقرر کیا تھا۔ ان اصحاب کی کافی توجہ اور پرخلوص تعاون عمل کی وجہ سے امتحان بغیر کسی دقت کے اختتام کو پہونچا۔

تقریریں اور اشاعت مقصد | عصرانوں کے سلسلہ میں جوابی تقریریں کرنی پڑیں۔ دوران تقریر میں ادارہ کے مقاصد پر زور دیا گیا۔ دیگر اصحاب کی تقریریں بھی ہوئیں۔ امید ہے کہ جناب حکیم صاحب، وکیل صاحب اور پٹواری صاحب جیسے علم دوست احباب کی اعانت و ترغیب سے عوام میں کافی جوش پیدا ہوگا۔ مرکز بھی ترقی سے محروم نہ ہوگا

دارالمطالعہ | یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ دارالمطالعہ نہیں ہے۔

(اردو امتحانات کے مرکزوں کی روئدادیں)

حالانکہ مرکز کے قیام کے ساتھ ہی اس کا بھی قیام ضروری ہے۔ معمولی طور پر اخبار بینی ہوا کرتی ہے۔ باضابطگی کی نسبت معتمد صاحب سے کہا گیا۔

بتاریخ ۱۵ / شہریور سنہ ۵۳ ف دو بجے کے قریب شاندار طریقہ پر مجھے رخصت کیا گیا جس میں سرپرست مرکز جناب گرلنگپا صاحب مقدم مالی کا خاص حصہ پایا گیا۔ اس طرح میرا سفر کم و بیش پر طے رہا۔ گرناتھ راؤ

بلولی | ۱۱ / شہریور سنہ ۵۳ ف کو ۹ بجے بلولی پہنچا۔ اول وقت پہنچنے کی وجہ سے معتمد صاحب بس اسٹیج پر نہ آسکے۔ امیدواران امتحان اسٹیج پر موجود تھے۔ جناب صدر مدرس صاحب کے مکان لے گئے۔ مدرسہ میں ٹھیرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ امتحان ذکور مدرسہ تحتانیہ ذکور میں اور امتحان اناث مدرسہ نسواں میں ہوا۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی نشستوں پر ناموں کی چٹھیاں چسپاں کی گئی تھیں۔ ۹ بجے کے قریب طلبہ امتحان گاہ میں آئے ان کے ہال ٹکٹ دیکھے گئے۔ امتحان میں نگرانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ طلبہ کی تیاری امتحان اچھی تھی۔ جوابات لکھنے میں آخر وقت تک مشغول تھے۔ مولوی عبدالبصیر صاحب صدر مدرس و معتمد ادارہ بہت ہی دلچسپی سے کام کرتے ہیں۔ مدرسہ کے اوقات کے علاوہ بالغ طلبہ کو تعلیم دیتے ہیں۔ ہر ایک طالب علم مولوی صاحب سے بہت ہی مانوس نظر آیا۔ اور ان کے احکام کی تعمیل فوراً کرتا گیا۔ فارسی اور اردو کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ دارالمطالعہ بھی قائم کیا جا رہا ہے۔ امتحان مقررہ اوقات پر لیا گیا۔ رعایا کو تعلیم کا شوق دلانے کی صدر مدرس صاحب اور مولوی مرزا یوسف بیگ صاحب مددگار مدرس۔ مولوی بشیر احمد صاحب اور دیگر معززین حضرات مقامی کوشش کرتے ہیں۔ انتظام طعام اچھا رہا۔ مولوی عبدالبصیر صاحب اور مولوی مرزا یوسف بیگ

کے ہاں دو مرتبہ دعوت میں شریک رہا۔ واپسی میں بھی دعوت
کی گئی۔ اور آتے وقت معتمد صاحب طلبہ اور دیگر معزز حضرات
بس اسٹینڈ تک پہنچانے آئے تھے۔ شیخ جابر

مرکز پرلی | معتمد صاحب، ارکان صاحبان اور امیدواران
امتحانات نے اسٹیشن پر استقبال کیا۔ ان کے ہمراہ دفتر شعبہ طلبہ کو روانہ
ہوا۔ انتظام خورد و نوش اکثر معتمد صاحب شعبہ طلبہ نے کیا۔ ارکان
صاحبان ادارۂ ادبیات اردو و شعبہ طلبہ نے بھی باری باری سے
ضیافت کی۔ امتحانات تواریخ مقررہ میں ہوئے۔ مرکز مذکور میں مولوی
شیخ حسین صاحب نائب معتمد، مولوی سید الدین صاحب صدیقی معتمد،
مولوی عزیز الدین صاحب قریشی، مولوی نواز الدین صاحب، ذکی الدین
صاحب نے نگرانی کی اور امتحانات زبانی میں امداد فرمائی۔

مرکز اناث میں صدر معلمہ صاحبہ نیاز النساء بیگم صاحبہ معلمہ
مدرسہ نسواں اردو و صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ نسواں مرہٹی نے نگرانی
کی اور امتحانات زبانی کی تکمیل فرمائی۔

سیل گاؤں اور سون پیٹھ کے امیدوار بوقت امتحان
شریک امتحان رہے اور تقریباً بیس امیدوار بوجہ بارش و
خرابی راستہ شرکت امتحان سے قاصر رہے۔

بتاریخ ۱۲ شہریور ۱۳۵۱ف مسٹر جیون راؤ صاحب معتمد
کمیٹی وجہاتہ پرلی کی یاد فرمائی پر مع امیدواران عالم و فاضل و
معتمد ادارہ مندر پہنچا۔ مسٹر موصوف شعبہ کے رکن بھی ہیں۔ پرتپاک
استقبال کیا۔ مندر تفصیلی طور پر دکھایا اور ہر چیز کے متعلق
افہام و تفہیم کرتے رہے۔ مندر مذکور کے ہال میں حاضرین
کی چائے وغیرہ سے خاطر کی گئی۔ میری مختصر سی تقریر اور شکریہ کے
بعد یہ پارٹی واپس ہوئی۔ واپسی میں اقبال جیون پارک کی سیر کی۔
یہاں بھی راؤ صاحب نے نباتات سے متعلق معلومات بہم پہنچائے
جس کے لئے میں راؤ صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ واقعی معتمد صاحب
نہایت خلیق، روشن خیال اور سلیقہ شعار ہیں۔ جنھوں نے
معتمدی کمیٹی مندر کا جائزہ لے کر نہ صرف مندر کی ضروری ترمیم
کی بلکہ آرائش و زیبائش میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا۔

ہر دو شعبہ کے اراکین تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور
ادارۂ ادبیات اردو کی ترقی کے متمنی ہیں۔ عموماً تمام لوگ
اور خصوصاً نوجوان ادارۂ ادبیات اردو اور شعبہ طلبہ سے
بہت زیادہ وابستگی کے اظہار کے ساتھ ساتھ کام بھی کرتے ہیں۔
تمام اراکین ادارۂ ادبیات اردو اور شعبہ طلبہ کا میں شکریہ
ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے امتحانات میں میری امداد فرمائی۔
مولوی سعید الدین صاحب اور مولوی شیخ حسین صاحب مدرس
مدرسہ وسطانیہ پرلی خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں۔ محمد حسین

مرکز پرینڈہ | بتاریخ ۱۱ شہریور ۱۳۵۱ف بارسی پہونچا جہاں
کمیٹی ادارہ پرینڈہ کی جانب سے مسٹر سرنجواس راؤ مدرس
مدرسہ پرینڈہ نے میرا استقبال فرمایا۔ ۴ بجے شام میں بذریعہ
موٹر روانہ ہوکر ۶½ بجے شام پرینڈہ وارد ہوا۔ اراکین نے
سرکاری عمارت میں میری رہائش کا انتظام فرمایا۔ خورد و نوش
کا بہترین انتظام کر دیا گیا تھا۔ خصوصاً مولوی قدرت اللہ
صاحب معتمد مدرس، پیرو کار صاحب پولس، ڈاکٹر صاحب
حیوانات و معتمد صاحب ادارہ قابل ذکر ہیں اس لئے کہ انھوں
نے ہر طرح کی سہولت بہم پہونچائی اور آخر وقت تک ہر طرح
کی امداد فرماتے رہے۔

انتظامات و معائنہ امتحان گاہ | ۱۱ شہریور کو ۷ ساعت شام
مولوی قدرت اللہ صاحب کے ہمراہ بغرض معائنہ انتظامات
امتحان گاہ روانہ ہوا۔ طالبات کی نشست کا انتظام صاحب موصوف
کی والدہ صاحبہ جو ذی علم ہونے کے علاوہ پنشن یافتہ صدر معلمہ کی
بھی ہیں ان کے ذمہ کر دیا گیا اور ان کی امداد کے لئے مولوی صاحب

اہلیہ صاحبہ کو مقرر کر دیا گیا۔ انھیں بھی مولوی صاحب کے توسط سے ضروری ہدایات دیکر تقریباً ۹ بجے شب مقام رہائش پہونچا۔ ۱۲ ار شہریور کو قبل از وقت ۹ بجے صبح امتحان گاہ پر پہونچ کر نشستوں کے انتظام کا اطمینان کر لیا گیا اور ٹھیک ۱۰ بجے ہر فریق کے دو دو طلبہ کی دستخط نگرانکار صاحبان کے روبرو لے کر اسی روز اور اسی وقت کے لفافہ جات کو کھول کر طلبہ میں تقسیم کر دیئے گئے۔ طبقۂ اناث کا انتظام نشست اسی مقام سے ۱۰۰ قدم کے فاصلہ پر علحدہ کمروں میں رہنے کی وجہ سے اور مولوی صاحب کی والدہ صاحبہ صدر نگران کار طبقۂ اناث ہونے کے باعث مولوی قدرت اللہ صاحب صدر مدرس کے توسط سے نگرانکار صاحبان کی موجودگی میں لفافہ جات حوالہ کر دیئے جاتے تھے اور تختہ جات حاضری کی ضروری خانہ پری بعد اخذ دستخط دو دو طالبات کمل ہوتے پر اسی وقت منگوائے جاتے تھے اس طرح ہر روز پرچہ جات کی تقسیم عمل میں آیا کرتی تھی اور بفضل تعالیٰ آخر وقت تک کسی قسم کی بے ضابطگی نہ ہوئی

تعداد شرکار | کثرت بارش اور آمد و رفت کے ذرائع مفقود ہونے کے باعث ۵۴ طلبہ میں ۲۶ حاضر اور ۲۸ شرکا غیر حاضر رہے اس امتحان کا انعقاد ماہ بہمن یا اسفندار میں ہوا کرے تو غیر حاضری کی تعداد کم ہو سکتی ہے اور شرکا بھی خاطرخواہ حاضر ہو سکتے ہیں تعداد شرکار کی صراحت حسب مندرجہ ذیل ہے

طبقۂ ذکور۔ امتحان اردو دانی $\frac{11}{14}$ و امتحان زباندانی $\frac{5}{11}$ جملہ $\frac{16}{14}$ حاضر

طبقۂ اناث۔ امتحان اردو دانی $\frac{3}{5}$ و امتحان زباندانی $\frac{6}{6}$ و امتحان اردو عالم $\frac{1}{1}$ جملہ $\frac{10}{12}$

تدابیر اصلاح | چونکہ دیہات میں مدرسین ان ٹرینڈ ہوا کرتے ہیں اور کوئی مناسب و موزوں کتب بغرض مطالعہ دستیاب نہیں ہوا کرتے اس لئے مناسب ہوگا کہ ہر امتحان کیلئے منتخبہ قصہ جات و مضامین ٹرینڈ مدرسین کے ذریعہ ادارۂ امتحانات اردو ادبیات کی جانب سے لکھوائے جائیں اور انہیں شریک نصاب کیا جائے تو بہت کچھ اصلاح زبان ہو سکتی ہے اور طلبہ میں قابلیت بھی پیدا ہو جائے گی ورنہ اس طرح کے قصہ جات پڑھا لے سے کوئی فائدہ نہیں۔ زبانی امتحانات اردو دانی و زباندانی کے دوران میں اس ناچیز کو ان کے قصہ جات کے سننے اور دوران گفتگو میں ان کا طرز بیان سننے سے جو تجربہ ہوا وہ قابل ذکر ہے۔ زبان قابل اصلاح ہے اور مواد تعلیم ناکافی تھا جس کی اصلاح مندرجہ بالا تدابیر کے اختیار کرنے سے بھی ہو سکتی ہے۔ لہذا ادارہ سے توقع ہے کہ ان نقائص کو آئندہ دور کرنے کی سعی فرمائی جائے گی تو احسن ہو گا

جلسۂ تقسیم اسناد | اراکین کمیٹی ادارہ نے بعد ختم امتحان عہدہ داران مقامی، علم دوست حضرات و دیگر معززین کو مدعو فرمایا۔ معتمد صاحب نے تفصیلی رپورٹ پڑھ کر سنائی اور دیگر حضرات نے بھی علم کے فوائد و مقاصد ادارہ پر کافی روشنی ڈالی من بعد تحصیلدار صاحب پرگنہ نے کامیاب طلبہ کو اسناد تقسیم فرما کر مقاصد ادارہ اور اردو کے پرچار پر مدلل تقریر فرمائی۔ آخر میں اس ناچیز نے بھی مقاصد ادارہ کی صراحت کر کے اس کو کامیاب بنانے کے عملی تدابیر کا ذکر کر دیا اور اراکین کمیٹی کا شکریہ ادا کر کے اپنی تقریر ختم کر دی اور بعد ازاں پر تکلف ایٹ ہوم (عصرانہ) میں سب حضرات نے شرکت فرما کر چائے نوشی فرمائی اور جلسہ بخیر و خوبی برخاست ہوا۔

محمد عظیم الدین

مرکز ہمنا باد | ۱۱ ار شہریور کو ½ ۱ بجے دوپہر ہمنا آباد وارد ہوا۔ بس ڈپو پر چند اصحاب لینے کے لئے منتظر کھڑے تھے۔ بڑے خلوص سے استقبال کیا اور مجھے وہاں سے امتحان گاہ کی عمارت کو لے گئے۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل صدر ادارہ

شاخ ہمنا باد سے تقریباً نصف گھنٹہ بعد ملاقات ہوئی۔ اور امتحان سے متعلق ضروری تبادلۂ خیال ہوا۔

مغرب سے قبل امتحان گاہ کی بیرونی دیوار پر وقت نامہ امتحان چسپاں کرایا گیا۔ بنچ اور کرسیاں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے نشست کے لئے فرش کا انتظام کرایا گیا۔ اناث کے امتحان کے لئے صدر معلمہ صاحبہ کو مقرر کیا گیا تھا۔ ان کے پاس تمام قواعد و ضوابط اور وقت نامہ امتحان جناب صدر صاحب شاخ ادارہ ہمنا باد کے ذریعہ پہنچا یا گیا اور جملہ امور سمجھا دیئے گئے۔

۱۱ ارشہر یور کو وقت سے قبل امتحان گاہ پہنچا۔ نگرانی امتحان کے لئے مقامی وکلاء اور صدر مدرس صاحب مدرسہ وسطانیہ ہمنا باد مقرر کئے گئے تھے۔ ان کے آنے کے بعد جوابی بیاضیں امیدواروں میں تقسیم کی گئیں سربمہر لفافے دو دو امیدواروں کے دستخط لے کر کھولے گئے اور تقسیم کئے گئے۔ اناث کے امتحان کے لئے سربمہر لفافہ جوابی بیاضیں اور جاذب وغیرہ بذریعہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب صدر شاخ ادارہ صدر معلمہ صاحبہ کے پاس روانہ کئے گئے۔ اور ختم امتحان پر روزانہ کے روز جوابی پرچہ جات سلواکر سیل بند کیا گیا۔

ذکور میں امیدوار اردو دانی میں ۱۵، اردو زباندانی میں ۱۴ اور اردو عالم میں ۵ شریک امتحان رہے ایک امیدوار بوجہ بیماری غیر حاضر رہا۔ جملہ امیدواروں سے ہال ٹکٹ منگوا کر شناخت کی جانچ کر لی گئی۔

امیدواروں سے وقت پر پرچہ جات حاصل کر کے جناب صدر صاحب شاخ ادارہ کے دستخط سے سیل بند کیا گیا۔ جناب معتمد صاحب ادارہ، صدر مدرس صاحب اور دیگر وکلاء صاحبین نے نگرانی امتحان اور انتظامی معاملات میں اپنے عزیز وقت کی پروا نہ کرتے ہوئے بہت کچھ امداد کی امتحان کا کام کامیابی کے ساتھ انجام پایا۔

امتحان میں خاص دلچسپی اور جانفشانی کے ساتھ میرے کام میں حسب ذیل خواتین و اصحاب نے ہاتھ بٹایا۔

صغرا بیگم صاحبہ صدر معلمہ جو مرکز نسوان کی صدر نگران کار تھیں۔
مولوی سید شیر الزماں صاحب سوداگر کابلی معتمد ادارہ۔
مولوی محمد عبدالوحید صاحب وکیل۔ پنڈت مڑوڑپا صاحب وکیل۔
پنڈت بھیم راؤ صاحب وکیل اور مولوی نبی الحسن صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ ہمنا باد۔ یہ حضرات ادارے کی جانب سے شکریہ اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جناب محمد اسمٰعیل صاحب صدر شاخ ادارۂ ادبیات اردو خاص دلچسپی کے ساتھ کام کر رہے ہیں وہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں

مانک راؤ

مرکز کیل

۱۱ ارشہر یور رات کے ڈھائی بجے کی گاڑی سے کیل پہنچا جناب ضیاء الدین احمد صاحب وکیل اسٹیشن پر موجود تھے۔ میرے رہائش کا انتظام اسٹیشن کے قریب جناب راگھویندر راؤ صاحب وکیل کے مکان میں کیا گیا۔

دوسرے دن صبح دس بجے امتحان شروع ہوا۔ جس کا انتظام عمارت مدرسہ فوقانیہ میں کیا گیا تھا۔ اناث کے لئے بھی اسی عمارت میں انتظام تھا۔ نشست کا انتظام اچھا تھا۔ ہر نشست پر امیدوار کا نام، رول نمبر اور امتحان کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔

ذکور کے لئے حسب ذیل صاحبان نگرانکار مقرر کئے گئے تھے۔
۱۔ مولوی محمد حسین صاحب مدرس وظیفہ یاب۔ ۲۔ مولوی سید احمد علی صاحب حافظ ٹونکی۔ ۳۔ محمد شرف الدین صاحب۔ ۴۔ مولوی حمید الدین صاحب بی اے، بی ٹی۔ ۵۔ مولوی ضیاء الدین احمد صاحب وکیل۔

اناث کے لئے صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ نسواں کیل نگرانکار

نہیں۔ امتحان نہایت اطمینان کے ساتھ بلاکسی رکاوٹ کے ختم ہوا۔ اصول وضوابط کی پابندی اچھی طرح کیجاتی تھی۔

جوابی بیاضات | جوابی بیاضات کو باندھ کر مہر لگانے کے لئے کسی قسم کی مہر نہیں مل سکی۔ اس لئے نگراں کار صاحبان کے دستخطی چٹھیاں ثبت کی گئیں۔ پہلے تین جوابی بیاضات پر مولوی محمد حسین صاحب مدرس وظیفہ یاب کی دستخطی چٹھیاں ثبت ہیں اور باقی پر مولوی ضیاء الدین احمد صاحب کی دستخطی چٹھیاں ثبت ہیں۔

میری رہایش کا انتظام نہایت اطمینان بخش تھا۔ اور مجھے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ مولوی ضیاء الدین صاحب نہایت ہوشیار اور پرجوش ہیں۔ انھیں کی کوششوں سے اس سال کیل میں مرکز قائم ہوا ہے۔ ہیودن اچاری

مرکز گلبرگہ | ۱۱ ستمبر کو تقریباً ۲ بجے رات گلبرگہ اسٹیشن پہونچا۔ مولوی نصیر الدین صاحب صدر شعبہ اردو عثمانیہ کالج گلبرگہ و معتمد ادارہ ادبیات اردو شاخ گلبرگہ نے ایک طالب علم کو میرے لینے کے لئے اسٹیشن بھجوایا تھا۔ میں ان کے ہمراہ مسلم اقامت خانہ عثمانیہ کالج پہونچا جہاں میری رہایش وخورد ونوش کا انتظام کیا گیا تھا۔ صبح ۹½ بجے مولوی نصیر الدین صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔ جناب صدر صاحب کلیہ سے انعقاد امتحان کے لئے کالج کے دو کمرے اور زنانی امتحان گاہ کے لئے ایک علحدہ مکان (جو کلیہ سے ہی متعلق تھا) کا انتظام فرمایا تھا۔ مولوی صاحب معز نے علاوہ اس انتظام کے دو مزید نگران کار صاحبین کا بھی انتظام فرمایا تھا۔ مولوی محمد عمر خاں صاحب و مولوی فخر الدین صاحب ارمان نے کافی مدد بہم پہونچائی۔

ٹھیک ۹۔۵۰ کو پہلی گھنٹی اور ٹھیک دس کو تیسری گھنٹی بجوائی گئی اور دس بجے سے قبل ہی جوابی بیاضات اور دوائتیں نشست پر رکھ دیئے گئے اور دس بجتے ہی پرچہ جات تقسیم کئے گئے۔

زنانی امتحان گاہ کے لئے معتمد صاحب ادارہ نے اپنی کوشش سے زنانہ ہائی اسکول گلبرگہ سے ایک استانی صاحبہ کو بطور نگران کار دو یوم تک تشریف لانے کا انتظام فرمایا تھا۔ صاحبہ موصوفہ نے اپنے فرائض بحسن خوبی انجام دیئے۔ ٹھیک ایک بجے جوابی بیاضات لے لئے گئے اور سب کے سامنے ان پر مہر لگادی گئی۔

معتمد صاحب ادارہ مولوی نصیر الدین صاحب روزانہ دوران امتحان میں امتحان ہال تشریف لاکر اپنے دیرینہ تجربہ کی روشنی میں رشد و ہدایات فرمائے۔ زنانہ امتحان گاہ میں آپ کے حسن انتظام سے کافی آرام رہا۔ مولوی صاحب کا علمی انہاک وشغف باوجود ساری مصروفیت کے انھیں خاموش رہنے نہیں دیتا وہ اپنا قیمتی وقت خدمت اردو میں صرف فرماتے ہیں۔ ہر طالب علم کے لئے ان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے کہ جو شخص جب چاہے آئے۔ چنانچہ تشنگان علم و شائقین درس کا ہر وقت مکان پر مجمع رہتا ہے۔

میں اپنے ساتھی مولوی محمد عمر خاں صاحب و عبدالغفور صاحب کا بھی ازحد ممنون ہوں کہ ان ہر دو اصحاب بھی دوران امتحان میں نگرانی فرماکر کافی مدد بہم پہونچائی۔ ہر دو صاحب ذوق صاحب علم ہیں جن کے دل میں اردو کی خدمت کا درد و شوق ہے۔ صاحبان موصوف نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ آئندہ سال اس امتحان میں زیادہ طلبہ کو شریک کرائیں گے اور ساتھ ہی ان کے درس و تدریس کے لئے بھی اپنا وقت دیں گے۔ اس سال وہ اس فرض کو کافی طور سے انجام نہ دینے پر

اظہار ندامت کرتے ہیں۔ احمد محی الدین

منجلے گاؤں

اعزازی معتمد صاحب مرکز حتی الامکان کوشش کر رہے ہیں کہ منجلے گاؤں میں ادارہ کی شاخ قائم ہو۔

یہاں کئی معززا اور معتبر لوگوں سے ملا۔ مولوی قیام الدین احمد صاحب بھی ساتھ تھے۔ کئی لوگوں نے امید دلائی کہ آئندہ سال یہ حالت نہیں رہے گی۔ بلکہ شاخ ادارہ قائم ہو جائے گی۔

اس سال مرکز منجلے گاؤں پر کیج شریف سے پست اقوام کے طلبہ شرکت امتحان کی غرض سے آئے تھے۔ حالانکہ بارش بہت کثرت سے ہو رہی تھی۔

چنانچہ ضلع بیڑ میں بارش بہت کثرت سے ہو رہی تھی اور مرکز ہذا میں دیگر مقامات دیہات و مواضعات کے امیدوار شریک ہیں۔ اس لئے ۳۳ میں ۲۷ حاضر رہ سکے۔ محمد نہال

مرکز جولہ نظام الدین

۱۱ ر شہریور ۱۳۵۳ ف براہ کرڈواڑی ڈیڑھ بجے دن بارسی ٹاؤن پہونچا۔ اسٹیشن پر معتمد صاحب اور ایک رکن مولوی سید رفیع الدین صاحب سواری لئے ہوئے موجود تھے۔ بوجہ بارش و خرابی راستہ رات کو بارسی میں قیام رہا۔ ۸ بجے صبح بارسی سے جولہ نظام الدین روانہ ہوئے۔ جو تقریباً ۹ میل ہے۔ راستہ اس قدر خراب تھا کہ گاڑی کے پہیئے ڈیڑھ دو فٹ کیچڑ میں دھنس رہے تھے۔ باوجود چار بیل لگانے کے مقام مرکز پر ½۳ بجے پہونچا۔ آبادی کے باہر سے پرجوش و پرتکلف استقبال کے ساتھ مدرسہ کے احاطہ میں لیجایا گیا۔ جہاں معززان آبادی و مقدمان دیہی کا ایک خاصا مجمع تھا۔ اسی وقت معتمد صاحب کے ایماء سے ایک ذیلی کمیٹی امتحانات ادارہ ادبیات اردو کے نام سے تشکیل دی گئی جس میں آبادی کے چند معززین اور مقدمان دیہی بھی بحیثیت رکن شریک ہوئے۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ امیدواروں کو اردو کے امتحانوں کے لئے فراہم کرنے کا انتظام ہو اور نادار طلبہ کی دستگیری حتی الوسع کی جائے۔ اس کمیٹی سے قوی امید ہے کہ آئندہ امیدواروں کی زیادہ تعداد شریک ہو

مدرسہ کے ۳ کمروں میں نشستوں کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ دو کمرے ذکور کے لئے ایک کمرہ اناث کے لئے دیا گیا۔ مسٹر گنپت راؤ صاحب مددگار مدرس نے ایک کمرہ کی نگرانی قبول فرمائی جو قابل تشکر ہے۔ موصوف سے آئندہ بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ درمیانی ہال کی نگرانی میں کر رہا تھا۔ اس طرح امتحانات پایہ تکمیل کو پہونچے۔

معتمد صاحب موصوف بے حد مصروف آدمی ہیں۔ یہ صدارت مدرسہ، کارٹپہ کے علاوہ انجمن ہائے تنظیم دیہی، غلہ گودام، دیہی بنک اور ادارہ ادبیات اردو کے نمبرکاری فرائض بر وقت انجام دیتے ہیں۔ نیز وہ اردو دانی، زباندانی اور اردو عالم ذکور و اناث کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ باغ مدرسہ کبوترخانہ دیگر پرند اور جانور قابل ذکر ہیں۔

مقامی حضرات میں سے مولوی سید کریم الدین صاحب صدر شاخ ادارہ اور منوی راؤ کاہکر رکن ادارہ کے کام نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مولوی سید رفیع الدین صاحب رکن ادارہ قابل ستایش ہیں۔

میں معتمد صاحب اور دیگر ارکان کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میرے لئے سواری اور خورد و نوش کا عمدہ انتظام کیا۔ محمد معین الدین

مرکز مومن آباد

میں مومن آباد تقریباً رات کے ½۱۱ بجے پہونچا کیونکہ ریل ۲ گھنٹے

تاخیر سے پہونچی۔

مولوی بدیع الدین صاحب جو ادارہ ہذا کے اردو عالم ہیں بس اسٹانڈ مومن آباد پر تشریف لائے تھے۔ ان کے ہمراہ چھاؤنی مومن آباد جو تقریباً ۶ میل پر واقع ہے پہونچا۔ قیام کا انتظام ملٹری انڈین مس میں کیا گیا تھا۔ ایک صاحب جن کا نام مسٹر سینرز ہے، وہ میرے آنے کی اطلاع پاکر تشریف لائے۔ جن کا نہ اس امتحان سے کوئی تعلق ہے اور نہ اس انتظام میں انھوں نے کوئی خدمت پیش کی ہے۔ محض ایک خلاقی فرض کو کام میں لاکر اسی وقت صاحب موصوف نے میرے لئے چاء وغیرہ کا انتظام کیا۔ جن کا میں بیحد مشکور ہوں۔

صبح کو غلام حسین صاحب ایجوکیشنل جمعدار آئے مولوی بدیع الدین صاحب نے میرا تعارف کروایا۔ اس کے بعد میں نے امتحان کے انتظامات کی نسبت دریافت کیا صاحب موصوف نے کہا کہ ہمارے یہاں رومن فیگر اسکول ہے اس میں دو کمرے ہیں وہاں انتظام کر دیا گیا ہے۔ میں نے ان کا معائنہ کیا جو بالکل نامناسب اور دیگر انتظامات میں تکلیف کا باعث تھا اس لئے انفرمیشن ہال میں انتظام کروایا گیا جو امتحانات وغیرہ کے لئے بیحد موزوں تھا۔ فرنیچر اور میز کے انتظام کے بعد جملہ امیدواروں کی حاضری لی گئی جن میں اردو دانی کے (۱۶) اور زباندانی کے (۷) امیدوار حاضر رہے۔

معلوم ہوا کہ تعلقہ مومن آباد میں ادارہ کی شاخ قائم ہے لیکن وہاں سے کوئی امیدوار شریک ہوا اور نہ امتحان کا مرکز قایم کیا گیا۔

مولوی واحد علی صاحب معتمد مس نے میرے زمانہ قیام رہائش وغیرہ کا معقول انتظام فرمایا۔ نیز جناب غلام حسین صاحب و مولوی بدیع الدین صاحب و مولوی سردار بیگ صاحب و جناب محمد اعظم صاحب نے بھی انتظامی امور میں خاطر خواہ سہولتیں بہم پہنچائیں۔ میں ان حضرات کا بیحد مشکور ہوں۔

باقر علی خاں

کل ہند اردو کانگریس

ادارے کی جانب سے جس کل ہند اردو کانگریس کا افتتاح عمل میں آیا ہے اس کا آئندہ اجلاس ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوگا۔ حیدر آباد میں افتتاحی تقریب شاندار پیمانے پر منائی گئی اور تمام ہندستان کے مشاہیر نے ادارۂ ادبیات اردو کا ہاتھ بٹایا۔ اس کے کل نو اجلاس تھے جو حسب ذیل اصحاب کی صدارت میں منعقد ہوئے۔

۱۔ افتتاحی اجلاس۔ ہز اکسلنسی کرنل ڈاکٹر حافظ سر محمد احمد سعید خان بہادر کے سی ایس آئی ای۔ ایم بی ای۔ ایل ایل ڈی۔
نواب صاحب چھتاری و صدر اعظم دولت آصفیہ

۲۔ زبان کی ترقی و اشاعت کے وسائل۔ رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو پی سی، ایل ایل ڈی۔

۳۔ اصلاح زبان و اردو مصطلحات۔ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے علیگ صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

۴۔ تاریخ ادب اردو۔ عالیجناب میجر شمس الدین محمد صاحب وزیر تعلیمات ریاست بہاولپور۔

۵۔ اردو کے ناشرین و مصنفین۔ ڈاکٹر مولنا عبد الحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو۔ دہلی۔

۶۔ رسم الخط اور ٹائپ۔ خان بہادر شیخ عبد القادر چیف جسٹس بہاولپور

۷۔ ترقی پسند ادب۔ جناب سجاد ظہیر صاحب صدر انجمن ترقی پسند مصنفین۔

۸۔ اردو صحافت۔ جناب سید عبد اللہ بریلوی صاحب اڈیٹر بمبئی کرانیکل۔

۹۔ کاروباری اجلاس۔ آنریبل مسٹر غلام محمد ایم اے (علیگ) سی آئی ای
صدرالمہام فینانس سرکار عالی
آخری اجلاس میں آئندہ کے لئے حسب ذیل مجلس
انتظامی منتخب ہوئی۔

صدر۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو۔

نائب صدر۔ ۱۔ سر شیخ عبدالقادر۔ ۲۔ آنریبل نواب
زین یار جنگ بہادر۔ ۳۔ مولنا عبدالحق صاحب
۴۔ جناب عبداللہ بریلوی صاحب۔

معتمد عمومی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔

شریک معتمدین۔ ۱۔ ڈاکٹر تاراچند (شمال) ۲۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
خازن پروفسر رشید احمد صدیقی علیگڈہ (جنوب)

ارکان مجلس عاملہ

۱۔ قاضی عبدالغفار صاحب حیدرآباد۔
۲۔ خان بہادر حافظ ولایت اللہ ناگپور۔
۳۔ ڈاکٹر عبدالحق پرنسپل محمڈن کالج مدراس۔
۴۔ میاں بشیر احمد صاحب لاہور۔
۵۔ پروفیسر عبدالقادر سروری میسور۔
۶۔ عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کلکتہ۔
۷۔ حضرت خواجہ حسن نظامی دہلی
۸۔ نمائندہ لکھنؤ۔
۹۔ پیر الٰہی بخش صاحب وزیر تعلیم کراچی۔
۱۰۔ شاہ عالم خاں صاحب پشاور۔
۱۱۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلی۔
۱۲۔ سید محمد اعظم صاحب معین امیر جامعہ عثمانیہ۔
۱۳۔ سید سلیمان ندوی صاحب اعظم گڑھ۔
۱۴۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب الہ آباد۔
۱۵۔ ڈاکٹر سجاد ظہیر صاحب لکھنؤ۔
۱۶۔ دیوان رادھے ناتھ گلشن الہ آباد
۱۷۔ پنڈت رام بابو سکسینہ بلند شہر۔
۱۸۔ کرشن سہائے وحشی کانپور۔
۱۹۔ سر کیلاش نرائن ہکسر۔
۲۰۔ خواجہ غلام السیدین صاحب کشمیر۔
۲۱۔ میجر شمس الدین صاحب وزیر تعلیمات بہاولپور۔
۲۲۔ آنریبل بشیر حسن صاحب زیدی وزیر اعظم رامپور۔
۲۳۔ آنریبل شعیب قریشی صاحب وزیر تعلیمات بھوپال۔
۲۴۔ رائے بہادر پنڈت امرناتھ اٹل صاحب وزیر مال جے پور۔
۲۵۔ مسز سروجنی نائیڈو حیدرآباد
۲۶۔ بیگم شاہنواز لاہور۔

ادارۂ ادبیات اُردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
ن کی بیٹا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ...	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سرسید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۹۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	۰
" " دوسری کتاب	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن ...	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی ...	۸۰	۰	۱۰	۰
مہ لقا ...	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
سچ کا جادو ..	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات ...	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۸۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۲	۲	۰	۰
نذر دکن ...	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان ...	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات ...	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نائی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا ...	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ ...	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت ...	۵۶	۰	۸	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۲ء میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۴	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

اکتوبر

(ماہ نامہ)

سب رس

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
عبد الحفیظ صدیقی بی ایس سی

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلی فون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
قیمت فی پرچہ ۸/

جلد ۷ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۴ء شمارہ ۱۰

خواجہ حمید الدین ایم اے (عثمانیہ) کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں طبع ہو کر خیرت آباد سے شائع ہوا

آئینۂ خیال

احساں مرا شعر، مرا خون، مری روح — خوابیدہ کو کابوس ہے بیدار کو پیغام
کرتی ہے اشارے مری پستی کو بلندی — افلاک کے اسرار ہیں بے پردۂ واحرام
آتے ہیں گزر جاتے ہیں مہتاب و کواکب — رکتا نہیں دم بھر کو مرا توسنِ شہ گام
اسباق میں ہیں میرے شدائد کے صحیفے — فہرستِ مضامیں میں ہیں آلام ہی آلام
معذوری و ناکامی و خامی و غلامی — اول سے نہیں میرے عقائد میں یہ اوہام
اشعار میں غلطاں ہیں مری روح کے شعلے — ہر چند نہیں نطق میں گنجائشِ پیغام
سانسوں میں ہوائیں ہیں فرشتوں کے پروں کی — منڈلا کے اترتے ہیں مرے ذہن پہ الہام
اب ہے مری دنیا میں محبت ہی محبت — شعلے ہیں مری شبنمِ شاداب کا انجام
ٹکتے ہیں قدم گوہر و الماس کی تہ پر — جس گھاٹ ڈبوتی ہے مجھے گردشِ ایام
یہ نشۂ بیدار ہے تحلیل ہی تحلیل — تلخیص ہی تلخیص ہے یہ بادۂ بے جام
اقوام کے دل ہیں مری آہوں کی کسوٹی — مایوس غریبوں کے لئے ہے مرا پیغام
ہیں جن کی شبیں غرق چراغوں کی دعا میں — معصوم صباحوں پہ جرائم کے ہیں الزام
اے کاش ملے ان کو مرا نورِ بصیرت — اے کاش وہ دہرائیں پھر افسانۂ اسلام
انساں کی قلمرو میں ہیں میدانِ مہ و مہر — مردانِ وغا کی ہے کہیں صبح کہیں شام

اب مصلحتِ وقت نہیں ماتمِ ماضی
رہ جائے نہ آئندہ تصادم بھی کہیں خام

احسان دانش

اردو کا قدیم ترین سائنسی ادب (بسلسلہ گزشتہ)

مجموعہ مسائل سائنس (قلمی) تقطیع ۶" × ۹" -

اوراق (۴۴) - خط نستعلیق شکستہ سنہ کتابت ۱۲۴۹ھ - ۱۸۳۳ء

اس میں مختلف سائنس اور طبی مسائل سے متعلق الگ الگ مضامین درج ہیں - یہ رسالہ بھی الف خاں کا لکھا ہوا ہے - غالباً یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے یا پھر کسی ترجمہ کی ہوئی اردو کتاب سے نقل کیا گیا ہوگا۔ اس کتاب کے نام اور مصنف کا پتہ نہ چل سکا - اوپر کا نام ہم نے قرار دے لیا ہے - اس رسالہ میں حسب ذیل بیانات ہیں:-

(۱) الکٹریسٹی (۲) بیان تپ پیدا ہونے کا (۳) ماتا (۴) ابر (۵) تشریح شجر (۶) بیان غذا ہضم ہونے کا (۷) بیان لہو کے جریان کا (۸) گالنیزم (۹) بیان گیس کا (۱۰) بیان یوٹرس یعنی رحم کا۔

مذکورۂ بالا عنوانات میں سے ہر ایک کو علحدہ علحدہ تفصیل سے سمجھایا گیا ہے - رحم کے متعلق جو معلومات بیان کی گئی ہیں وہ (۱۵) صفحات پر مشتمل ہیں - مولف نے اردو میں انگریزی اصطلاحیں کثرت سے استعمال کی ہیں، بعض اصطلاحوں کا اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے - کتاب موضوع اور زبان کے اعتبار سے قدیم ترین کتب میں شمار کی جاسکتی ہے - "تشریح شجر" کے بیان سے یہاں عبارتیں نقل کی جاتی ہیں :-

آغاز :-

"جاننا چاہیئے کہ درخت کی رطوبت کا جریان آدمی کے خون کے جریان کے مانند ہے اور دونوں کے پشتے بھی ایک ہی طور سے ہوتے ہیں۔ درخت کی جڑ کی بے شمار شاخیں کہ جو مانند شرائین ہیں سو وہ زمین کے اندر جا بجا پھیلے رہتے ہیں .... "

اختتام :-

"گل تب بو اور دوسری قسم کے پھول موسمی جو بے پھل درخت کا ہے پھاڑ کر دیکھا گیا جو چیزیں کہ بیان کئے گئے ان میں سے ایک بھی نظر نہ آوے اور جو کہ نہ پھول نے پھل درخت کا تھا اس سے یقین کلیہ ہوا کہ جس پھول سے زردمادہ ہوگا اس میں پھل بھی ہوگا وگرنہ کوئی صورت پھل ہونے کی نہیں ہے"

جن انگریزی الفاظ کا استعمال ہوا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں :-

الکٹریکل مشین، ہارٹ، لفٹ ونٹریکل، انڈیجسشن (Indigestion) گیس کے بیان کے تحت برف بنانے کی ترکیب بتادی گئی ہے اور اس کے ختم پر یہ عبارت درج ہے :-

"جو ہوا کہ گورستان سے بہ طور شعلہ کے اٹھتے ہیں سو فاس فیوریٹیڈ ہیڈروجنگس ہے اور ہندوستان کے لوگ کہتے ہیں ناسمجھ کر کہتے ہیں کہ بھوت شیطان ہیں سو یہ بات برخلاف ہے"

رحم کے بیان میں اس کی نشو ونما، حمل، زچگی وغیرہ سے متعلق تفصیلی معلومات طبی نقطۂ نظر سے قلمبند کی گئی ہیں - آخر میں ہاتھ اور پاؤں کاٹنے یعنی آپریشن کا طریقہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کے آغاز کی عبارت یہ ہے :-

" جاننا چاہئے کہ یوڑس ایک لاٹن لفظ ہے
کہ جس کو انگریزی زبان میں اویٹ اور عربی
میں رحم اور فارسی میں زہدان اور ہندی میں
دھرن اور کوکھی اور سنسکرت میں گربھ استھان
کہتے ہیں "

اس کتاب کی زبان اور انداز بیان وہی ہے جو پہلی کتاب کا ہے۔ گیارہ کو " اگارہ " اور مثلاً کو مسلاً لکھا ہے۔ جن انگریزی طبی اصطلاحات کا ترجمہ ہوا تھا ان میں سے بعض یہ ہیں :-

لفٹ ونٹریکل (البطن الیسر)، رائٹ ونٹریکل (البطن الیمن) السر (راج پھوڑا) وغیرہ۔

تپ اور اسہال کے علاج کا رسالہ تقطیع ۹" ۶" صفحات (۳۲) آخر میں ایک صفحہ کا تتمہ ہے۔ سنہ طباعت ۵ اگسٹ ۱۸۳۱ء۔ نستعلیق، لیتھو مطبوعہ کلکتہ مصنفہ جیمس ہچنسن۔

یہ رسالہ دراصل جیمس ہچنسن کے ذاتی تجربات کا خلاصہ ہے جو اسے سرکاری پلٹنوں اور قید خانوں کے دواخانے میں تپ اور اسہال کے مریضوں کے امتحان کے بعد ہوئے تھے۔ اس نے یہ تمام تجربے اپنی تجاویز کے ساتھ مقام گیا سے ایک خط کی صورت میں کلکتہ کی میڈیکل اینڈ فزیکل سوسائٹی کے سکریٹری جان ادہم کے نام انگریزی میں لکھ بھیجے تھے تاکہ نوسکھ ڈاکٹر جو پہلے پہل ہندوستان میں آئے ہیں ان کو پڑھ کر استفادہ کریں اور تجربہ کار ڈاکٹر اس کے مطالعہ کے بعد اس مرض مہلک کے استیصال کی طرف زیادہ متوجہ ہوں۔ زیر نظر رسالہ اسی کا اردو ترجمہ ہے جو حکیم مولوی عبدالمجید صاحب کی نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ پہلا سرورق انگریزی زبان میں اور دوسرا اردو میں ہے۔

ابتدائی (۵) صفحات بطور دیباچہ کے ہیں جن میں اس رسالے کی تصنیف کے سبب کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے:-

" صاحبو بہت مدت سے ہمارا ارادہ تھا کہ ہم پیٹ چلنے کی بیماری کے چند حالات .... لکھیں۔ اس بیماری کے احوال کو جو کچھ کہ ہم جانتے ہیں مروج خط کے طور پر ترت لکھیں .... ہم ان امتحانی بیانات کو جو ہماری آزمایش میں آئے ہیں منحصر کرتے ہیں۔

ہماری سمجھ میں اس سے کوئی بڑا مہلک مرض اس ملک میں نہیں ہے .... اندازی تین چوتھائی اسی بیماری کے چند اقسام سے ضائع ہوتے ہیں۔

.... اس بیماری کی ضروریات اور دوا کی سب اقسام کہ اس میں دی جاتی ہیں خوب تحقیق نہ ہوئی کہ کونسی دوا زیادہ فائدہ مند ہے .... پر جو صاحبان سوسائٹی اس پر غور کرنے لگے تو ہم کو امید ہے کہ وے جب تک اس کی متفرق اقسام کی خوب تحقیق کر نہ لیں اور ہر قسم کی دوا کی تاثیر خوب ثابت نہ ہولے اس کا دھیان نہ چھوڑیں گے ....

اس واسطے ضرور ہے کہ ہم اس بیماری کے چند بیان ہندوستانی طبیعت اور موسم کی نسبت اور جو جو بیماریاں کہ پیٹ چلنے کی بیماری سے علاقہ رکھتی ہیں لکھیں "

مذکورۂ بالا عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ جیمس ہچنسن خود ایک ڈاکٹر ہوگا اور آئندہ صفحات میں اس نے اس مرض کے متعلق جو معلومات بیان کی ہیں وہ ڈاکٹر کے سوا کوئی دوسرا شخص بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن تعجب ہے کہ کتاب میں

کسی جگہ بھی اس کے ڈاکٹر ہونے کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ البتہ حسب ذیل عبارت سے اس کے ڈاکٹر ہونے کا کچھ پتہ چلتا ہے ۔

" جب سے ہم نے ہندوستانیوں کی تپ کے علاج کا ڈول ڈالا کہ جس کے موافق ہم اب تک تدبیر کرتے ہیں ہمارے ٹھہرنے کا کہیں اتفاق نہ ہوا کہ جس کی آب و ہوا بڑی بری ہو لیکن جہاں ہم رہے وہاں ہمیشہ دیکھتے رہے کہ معالجہ کچھ مشکل نہیں ہے۔"

ابتدا ہی میں اس نے (کلومل) کے استعمال میں کمی کرنے پر زور دیا ہے اور اس کی بجائے کسی دوسری مفید دوا کے استعمال کی ہدایت کی ہے۔ جون تا جولائی اس بیماری کے مریضوں کی تعداد کم رہتی ہے اور جولائی تا ڈسمبر یہ مرض پھیلتا جاتا ہے۔ ابتدائی تین مہینوں میں (ریمٹنٹ فیور) ہوتا ہے اور کبھی کبھی اسہال ہوتا ہے اور آخری تین مہینوں میں (انٹرمٹنٹ فیور) یعنی باری کا تپ اور اسہال کی چند اقسام بہت زیادہ ہوتی ہیں ۔ اس تپ کی ابتدائی حالت میں علاج کرنے کے طریقے اور مختلف دوائیں تجویز کی ہیں ۔

انگریز ڈاکٹروں کو اس زمانے میں مرض کی تشخیص کرنے میں جو رکاوٹیں پیش آتی تھیں ان کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

" ہم کو خوب معلوم ہے کہ پیٹ چلنے کی چند اقسام ہیں پر افسوس ہے کہ ہم لوگ اس ملک میں علامتوں سے خوب تشخیص کر نہیں سکتے ہیں کیونکہ اگر ہم لوگ ہندوستانی زبان سے بڑے واقف کار ہوں تو بھی یہ زبان غیر مانوس ہے اور ہر ایک صوبے میں یہ زبان بدلا کرتی ہے اور جس ڈول سے ہندوستانی مریض بیماری کو ظاہر کرتے ہیں وہ بھی بعضے وجوہ سے ٹھیک ٹھیک نہیں ہے۔ جب ان لوگوں نے دیکھا جو ڈاکٹر لوگ ہمیشہ فصد لیتے ہیں اور بہت جونک لگانے کا حکم دیا کرتے ہیں یا پلستر باندھا کرتے ہیں تب ڈاکٹر کے اس سوال کو کہ تم کو کہیں درد ہے تدبیر کے ڈر سے مریض درد ضرور کا انکار کرتا ہے۔ اس صورت میں کونسی وجہ باقی رہی کہ جیسے ڈاکٹر لوگ مرض کی تشخیص اچھی وجہ سے کریں۔"

اس نے اپنے تجربے کی بناء پر مرض اسہال کی پانچ اقسام بتلائی ہیں ۔ اور ہر ایک کی علامتیں، مرض کی رفتار اور اس کے نتائج کو تفصیل سے بیان کیا ہے ۔ انگریزی، عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت میں دو اقسام کے نام بھی دئے گئے ہیں مثلاً

انگریزی	عربی	فارسی	ہندی	سنسکرت
ڈیاریا	اسہال	شکم جاری	پیٹ چلنا	اتیسار
دسنتری	اسہال الدم	اسہال خون	آنین لہو	رکت اتیسار

اس کے بعد صرف پہلی تین قسموں سے متعلق اپنے تجربات اور علاج کے طریقے پیش کئے ہیں اور اس کی وضاحت کردی ہے کہ ۔

" اس مرض کے ہمارے بیانات صرف ان احوال پر ہیں جو ہندوستانیوں ہی سے علاقہ رکھتے ہیں اور گوروں سے نہیں منحصر ہیں اس کا یاد رکھنا کہ کس ملک میں یہ بیان لکھا گیا بہر ضرور ہے کیونکہ ہم کو صوبجات کی آب و ہوا اور کھانے پینے اور عادت اور طبیعت کے بدلنے میں کچھ شبہ نہیں ہے ۔

پس اس اختلاف کے موافق معالجہ بھی بدلے گا اس کے سوائے ہمارے قیاس میں رت کے بدلنے کے سبب ایک ہی ملک میں بھی فرق ضرور ہوگا چنانچہ ہماری دانست میں کلومل اس مرض میں بلکہ ہر مرض کے لئے کمتر دیکھا ہے۔"

رسالہ کے ختم پر بطور اعتذار کے یہ عبارت درج ہے:۔
" آخر ہم توقع رکھتے ہیں کہ آپ صاحبان سوسیٹی
کی خدمت میں ہماری طرف سے عذر کریں گے ہم نے کمال جلدی
اور کمی فرصت میں لکھا ہے۔"
"تتمہ رسالہ" کی سرخی کے تحت یہ لکھا ہے کہ دوسری
اور تیسری قسم کی ابتدا میں اگر مریض طاقتور ہے تو فصد لینے سے
فائدہ ہوگا اور (ڈیاریا) میں اگر مریض کی عمر زیادہ ہے تو
شاید ان لوگوں کو اپیکا کیو نہا کے ساتھ توتیا اور افیون
کم و بیش ملا کر دینے سے فائدہ ہوگا۔ ان بیماریوں میں
گرم پانی نہلانے سے کیا فائدہ ہوتا ہے معلوم نہ ہوسکا۔ اب تک
اس پر کسی نے تحقیق نہیں کی اس لئے اس پر تحقیقات کرنی
چاہئے۔

یہ رسالہ کلکتہ کی اولین مطبوعہ کتابوں میں سے ہے۔
اس کی زبان اور اسلوب بیان عام کتابوں سے ذرا
مشکل ہے کیونکہ علمی مضامین اور تصانیف کی زبان دشوار
ہوتی ہے۔ ہندی، سنسکرت اور عربی کے عام فہم الفاظ کا
جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں چند لکھے
جاتے ہیں:۔

ڈول، جھٹ پٹ، نرت، سمجھتا (زمانہ)۔
استھاپک
مثلاً۔ کثیر الوقوع، سریع وغیرہ۔

اکثر ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اس زمانے میں عام
طور پر رائج تھے اور اب متروک ہوگئے ہیں
لیے، نہان، جد، تد، تس، پیچھے، کدھی کدھی،
ایدھر، اودھر وغیرہ۔

بعض الفاظ کا املا اس طرح لکھا ہے:۔
چونٹی (چیونٹی)۔ مدعی (مدعا) پانوں (پاؤں)
اسے (اس سے)۔

اس زمانے میں بھی مغربی طب کی بعض اصطلاحوں
کے اردو اور ہندی میں ترجمے کرلئے گئے تھے مثلاً۔

آرٹریز	شرائین
انجکشن	پچکاری
رکٹم	مستقیم
اسپلین پوڈر	ہندوستانی گولی
اسپازیبرٹی	استھاپک
انٹرمٹنٹ فیور	بارکی تپ یا تپ نوبت
ڈکاکشن	جوشاندہ

بعض انگریزی الفاظ کو ان کے تلفظ کے مطابق
اردو میں منتقل کرلیا گیا تھا جیسے:۔

سوسیٹی Society
مجسٹریٹ Magistrate

جملوں کی ساخت اور ترکیب کی قدامت ملاحظہ ہو:۔
" تحقیقات چاہئے کرنا۔ کیا کیا چیزیں دکھلائی دیں گی۔
ضرور ہے کہ اس مدعا کی طرف اشارہ کریں۔ ہمارے
قیاس میں یوں آتا ہے" وغیرہ
'سوچ بچار' کو واؤ عطف سے ملایا گیا ہے اور
'روز بروز' کی ترکیب پر 'دن بدن' بنایا گیا ہے جو
غلط ہے۔

یہ رسالہ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو میں نمبر (۲۸۰۹)
پر رکھا ہوا ہے۔

بیان سانپ کے بکھ کا | تقطیع ۹" × ۷" صفحات (۷۳)
کتاب کے ختم پر (۵) صفحات میں سانپ کے سروں کی اشکال

کی تفصیل درج ہے ۔(۳۰صفحات میں سانپ کے سروں کی (۱۱) تصویریں لیتھو میں چھپی ہوئی ہیں ۔ تصویر کے ہر صفحے کے نیچے انگریزی میں لکھا ہوا ہے:۔

Pearson Govt. Lith Press

کتاب کا سرورق انگریزی زبان میں ہے جس کی عبارت یہ ہے:۔

Essay

on the
venom
of

Serpents

مصنف اور مترجم کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ گورنمنٹ لیتھو پریس میں چھپی ہے لیکن سنہ طباعت کہیں درج نہیں۔ چونکہ یہ کتاب رسالہ تپ واسہال کے ساتھ ایک جلد میں ہے اور سائز اور رسم خط دونوں کا بالکل ایک ہی ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی ۱۸۳۱ء کی مطبوعہ ہے ۔ ان دونوں کتابوں میں رسم الخط اور اعراب کے جو اشارے استعمال کئے گئے ہیں وہ اردو کے محققین اور ماہرین لسانیات کے لئے خاص کر قابلِ توجہ ہیں ۔ نمونہ کے طور پر یہاں چند درج کئے جاتے ہیں:۔

سانْپ، جیتْ، مِیں، اُٹْھتے (اٹھتے)۔ پکڑنے (پکڑنے) دَوری (ڈوری) اغلبکہ ۔ فی الحقیقت ۔

اس رسالے میں دیباچہ اور فہرست نہیں ۔ اصل کتاب صفحہ (۱) سے شروع ہوتی ہے ۔ ابتدا میں یورپ کے ان مصنفین کا ذکر ہے جنھوں نے سانپ کے زہر سے متعلق نہایت تفصیل اور تشریح کے ساتھ کتابیں قلمبند کیں ۔ چند مصنفین کے نام یہ ہیں :۔

نکلس، میلن، رسل، ہوگ آرفلا، شا وغیرہ۔

یورپ سے جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں ہندوستان کے سانپوں کا تفصیلی ذکر نہیں ہے ۔ اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ اہل ہند نے سانپوں پر تجربے اور امتحان نہیں کئے اور نہ اپنی تحقیقات کو کتابی صورت میں پیش کیا اس لئے یورپ والوں کو ہندوستان کے سانپوں کا علم نہ ہو سکا ۔

انگلستان اور امریکہ کے سانپوں کی اقسام بیان کرکے ہندوستان کے ان سانپوں کی تفصیل درج کی گئی ہے جو حکومت مدراس کے زیر نگرانی رسل نے امتحان کرکے متعین کئے تھے ۔

(۱) گیڈی پارا گودو جس کو صوبہ بنگالہ اور بہار میں "کریت" بولتے ہیں ۔

(۲) بنگارم پاما جو بنگالے میں "سانکھنی" کے نام سے مشہور ہے ۔

(۳) ہورانا پام ۔

(۴) چنتاناگو جسے صوبہ بہار میں "گومن" اور صوبہ بنگالے میں "گومن اور گوکھرو" بولتے ہیں ۔

(۵) کیٹو کارکیولا پوڈا ۔ بنگالے میں "بوڑا" اور بہار میں "امیٹر" اور "سیہ چیندر" کہتے ہیں ۔

(۶) بودرو پام

(۷) کالیو برمیلا نیورس ۔

(۸) کالیو برلا جیسس جو بمبئی میں "بٹن" کے نام سے مشہور ہے۔

بنگالہ اور بہار میں جن سانپوں کے نام مشہور ہیں اور مصنف نے جنھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ حسب ذیل ہے :۔

(۱) گومن جنس کی کئی اقسام ہیں مثلاً

"کھریس، کھیا گومن، دو اصلا، مٹیل وغیرہ۔

کبوتروں پر امتحان کرنے کے بعد یہ ثابت ہوا کہ "گومن" سانپ کی اقسام کا زہر بہت خطرناک ہوتا ہے۔ ماہرین حیوانیات نے سانپوں کی (۲۲۹) اقسام قرار دی ہیں جن میں سے ۱/۲ زہر والے اور بقیہ زہر نہیں رکھتے۔ پانی کے سانپ زہریلے نہیں ہوتے اگر کسی میں زہر ہوتا بھی ہے تو وہ کم درجہ کا ہے زہریلے سانپوں کے پہچاننے کے دو طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ غرض ہندوستان کے سانپوں کے متعلق پوری تفصیلات درج کردی گئی ہیں۔

اس کے بعد یورپ میں سانپوں کے زہر کے متعلق جو تجربے کئے گئے ان کو (۱۳) سرخیوں کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ اس واقعہ سے ہمارے عالموں کو سبق حاصل کرنا چاہئے کہ یورپ کے ایک ماہر حیوانیات فانٹینا نے سانپوں کے زہر پر کم و بیش ۶ ہزار تجربے کئے۔ ہندوستان میں رسل اور یوگ نے کئی تجربے کئے "گومن" سانپ پر رسل کے (۷) تجربوں سے جو نتائج نکلے ان کا خلاصہ درج کیا گیا ہے۔ غرض سانپوں کے ڈسنے سے جو وارداتیں پیش آئیں ان سب کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ سانپ کے کاٹے ہوئے کے مختلف علاج اور دوائیں تجویز کی گئی ہیں جن میں سے بعض ایسی ہیں جن کے استعمال سے بہت سے ڈسے ہوئے آدمیوں کی جانیں بچ گئیں۔

مصنف کتاب نے صفحہ (۵۲) پر اپنا ایک چشم دید واقعہ لکھا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ چھوٹے ناگپور میں ۱۸۱۸ء میں بہ حیثیت ڈاکٹر ملازم تھا اور یہ کتاب اس واقعہ کے چند سال بعد لکھی گئی۔ اس طرح یہ ثابت ہو گیا کہ کتاب کی طباعت ۱۸۳۱ء یا اس کے قریبی زمانے میں ہوئی ہے۔ اس واقعہ کا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

"ایک مارگزیدہ کی واردات کہ روبرو ہمارے چھوٹے ناگپور میں ظاہر ہوئی تھی سو یہ ہے"

"۱۸۱۸ء کے مارچ مہینے کی ستائیسویں تاریخ دوپہر چار بجے دن کو "آمیٹر" سانپ کہ...... بنگالے میں "بوڑا" مشہور ہے۔ (کپتان راجرز صاحب کے سئیس کی پنڈلی میں ٹخنے کے اوپر ڈسا تھا ڈسنے کے بعد ہی پانوں رسی سے باندھا گیا تاکہ بکھ اوپر سرایت نہ کرے۔ کم و بیش آدھے گھنٹے کے بعد ہمارے پاس آیا اور اس وقت بکھ کی تاثیر کچھ معلوم نہ ہوئی مگر نشانیاں دانتوں کی ایک دوسرے سے ایک انگلی کے فرق پر ظاہر تھیں اور زخم کی جگہ سے ذرا لہو نکلتا تھا...... اسی وقت وہ دوا کہ جس کو (کاسٹک والٹل الکلی) کہتے ہیں لگایا...... بعد اس کے مریض کو کچھ طور افاقہ کا معلوم ہوا تب دوا موقوف کی گئی اور پانوں پانوں اپنے جھونپڑے تب کہ کہیں ڈال وال سے بنایا تھا چلا گیا .. ... آخر ساڑھے نو بجے تھوڑی اکڑاہٹ ہو کر وہ مرگیا"

یہ کتاب اردو میں علم حیوانیات کی قدیم بلکہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ غالباً یہ کسی انگریز ڈاکٹر کے رسالے کا ترجمہ ہے۔ زبان کی خصوصیات تقریباً وہی ہیں جو اس سے پہلے کی کتاب سے متعلق بیان کی گئیں۔ ترجمہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ترجمہ پن نہیں پایا جاتا۔ رسم خط اور چھاپے کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کلکتہ میں گورنمنٹ لیتھو پریس میں چھپی ہوگی۔ بعض الفاظ کا املا بالکل وہی ہے جو کلکتہ کی دوسری کتابوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً

"چھٹھا، کھنچھتے، دھوکا، ہانی، گانو" وغیرہ۔

کتاب کے ختم پر شیخ بوعلی سینا کی کتاب "قانون اور طب اکبر" کے حوالے دئے گئے ہیں۔

خواجہ حمید الدین

ایک دن

رات گئے سویا تھا۔ ارادہ تھا کہ صبح کو دیر تک سوؤں گا۔ اس وقت تک جب کہ گرمیوں کے دیکھتے ہوئے سورج کی کرنیں ناقابل برداشت نہ ہوجائیں۔ کل دن بھر لو اور آندھی کے جھکڑ چلتے رہے۔ رات میں بھی بڑی گرمی تھی۔ آخر شب میں جا کر کہیں موسم کے بپھرے ہوئے تیور درست ہوئے تھے۔ صبح کاذب کے وقت موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ میں بھی کوئی حسین اور سہانا سا خواب دیکھ رہا تھا۔ یکایک ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کہیں بڑے زور سے بجلی کڑک رہی ہے یا بڑے زور کی دھواں دھار بمباری ہو رہی ہے۔ چشم زدن میں خواب کے حسین نظارے سب غائب ہوگئے۔ گھبرا کر جاگ اٹھا۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ دادا جان حقہ اور کھانسی کا شغل کر رہے ہیں۔ لاحول پڑھ کر پھر سو گیا۔

تھوڑی دیر اور سویا تھا کہ زلزلہ سا آتا معلوم ہوا ——— دراصل چچی اماں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نماز کے لئے اٹھا رہی تھیں۔ ہم نے کوشش کی کہ ہوں ہاں کر کے پھر سو جائیں مگر توبہ کیجئے، چچی اماں کہاں ماننے تھیں ——— "نہ معلوم آج کل کے لڑکوں پر کیا خدا کی رحمت ہے کہ نماز سے ہی جی چراتے ہیں۔ خدا کا خوف ہی دل میں نہیں ہے۔ جب ہی تو دنیا سے خیر اور برکت اڑ گئی ہے۔ موئی جو چیز کوڑیوں کے مول بکتی تھی اب روپوں کے بدلے بھی نہیں آتی۔ بھلا جب دنیا میں بے دینی کا سکہ چلے گا سب چیزوں پر آگ کیوں نہ پڑے گی۔ اٹھو، میاں حسان۔ صبح ہو گئی ہے۔ چار رکعت نماز پڑھ لو۔ پھر وقت نکل جائے گا (جواب کے انتظار میں کچھ وقفہ۔ مگر ہماری طرف سے جواب نہ ملنے پر) اے بیٹا! میں کب سے تمھیں جگا رہی ہوں۔ ایسے بھی کیا گدھے بیچ کر سوئے ہو کہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ آخر میں کب تک تمھیں جگاتی رہوں ——" ہم نے اپنے دل میں کہا کہ آپ سے جگانے کو ہی کس نے کہا تھا۔ جب کسی کی نیند بھر جائے گی خود ہی اٹھ بیٹھے گا۔ اگر کوئی نماز نہیں پڑھتا ہے تو آپ کی بلا سے۔ جانے دیجئے جہنم میں۔ زبردستی کی کیا ضرورت ہے ——— مگر قہر درویش برجان درویش، دل ہی دل میں کوفت کھا کر رہ گئے۔ چچی اماں تو خیر ہم کو جگاتے جگاتے اکتا کر چلی گئیں مگر اس کے بعد ہماری نیند بھی اچاٹ ہو گئی۔ بہت کوشش کی کہ دوبارہ نیند آجائے مگر صبح ہی صبح ان بے وقت کے حملوں سے اعصاب اتنے بھڑک گئے تھے کہ نیند آئی ہی نہیں۔

آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ دادا جان سامنے ہی بیٹھے حسب سابق حقہ اور کھانسی سے شغل فرما رہے تھے۔ رسماً و معمولاً آداب بجا لایا۔ خلاف معمول آج زیادہ مہربان معلوم ہو رہے تھے۔ ارشاد فرمایا: "جیتے رہو بیٹا (کھانسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے) کیا بات ہے آج کل تمھاری صحت کچھ اچھی نہیں معلوم ہو رہی ہے؟"

میں صبح ہی صبح اس قسم کے کسی سوال کے لئے قطعاً تیار نہ تھا۔ تاہم ادب سے جواب دیا: "شاید کچھ گرمی کا اثر ہو۔ میں تو کوئی خاص بات محسوس نہیں کرتا۔"

"خدا کرے کوئی خاص بات نہ ہو ——— اور ہونی بھی نہیں چاہیے۔ اس عمر میں آدمی کو صحت مند اور طاقتور ہونا چاہیے ——— ہمیں بھی اپنا لڑکپن کا زمانہ یاد ہے۔ واللہ کیا دن تھے! رگ رگ سے طاقت اور مسرت ابلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور ایک ہم پر ہی کیا موقوف ہے! اس زمانے میں سب کی یہی کیفیت تھی ——— [illegible]

چہرے، چوڑے چکلے سینے، سرو قد اور وجیہہ، آنکھوں
میں بے پناہ امنگوں کا چھلکتا ہوا نور، اور دلوں میں دنیا
کو تسخیر کرنے کے حوصلے! ـــــ ہمارے زمانے کے نوجوان
ایسے ہوتے تھے۔"

"جی ہاں، درست فرماتے ہیں۔" ہم نے یہ کہہ کر
پیچھا چھڑانا چاہا، مگر دادا جان کے دل کی بھڑاس ابھی پوری
طرح نہ نکلی تھی۔

"اور کیا غلط تو نہیں کہتا؟ ایک تم لوگ ہو ـــــ
دبلے پتلے پچکے سے بدن، کبوتر کے مانند چھوٹے چھوٹے سینے،
آنکھوں پر موٹی سی عینک، آئے دن بیماریوں کا شکار رہتے
ہو۔ کبھی نزلہ ہے تو کبھی بخار آگیا ہے۔ سچ کہتا ہوں جوانی
میں تو کبھی ہمارا سر تک نہیں دکھا۔ میاں، زندگی کا لطف
اٹھانا ہے تو صحت بناؤ۔ ورزش کیا کرو۔ تم بابو آدمی
اگر اکھاڑے میں جانا پسند نہیں کرتے تو دو چار ڈنڈ گھر میں
ہی پیل لیا کرو یا پھر ...."

اب دادا جان کو کون بتائے کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ آج کل
ویسی عمدہ صحت قائم ہی نہیں رہ سکتی جیسی کہ آپ کے زمانے
میں ہوتی تھی۔ زندگی کی جدوجہد زیادہ مصنوعی اور نہایت
جان لیوا بن گئی ہے۔ آپ کے زمانے میں کلرکی کی یہ وبا
نہیں پھیلی تھی۔ سیدھا سادا زمانہ تھا اور زندگی گزارنے
کے طریقے بھی سہل اور آرام دہ تھے۔ نام کو تو ہم لوگ صبح
سے شام تک بس کرسی پر بیٹھے قلم گھستے رہتے ہیں مگر سچ
یہ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا عذاب ہے جس کا اندازہ وہی
لوگ کرسکتے ہیں جو اس میں مبتلا ہیں۔ شاید اسٹیشن پر بوجھ
اٹھانے والا ایک قلی ہم سے زیادہ بہتر حالت میں ہے۔ اگر
آپ اس سے کہیں کہ تو بھی ذرا ان بابو لوگوں کی طرح چھ سات
گھنٹے کرسی پر بیٹھا رہ تو دوسرے دن پناہ مانگنے لگے گا۔
اور پھر آج کل تو لڑائی کے زمانے میں وہ بھی ہم سے کچھ کم
نہیں کماتا۔ تین چار روپے روز کی مزدوری کر ہی لیتا ہوگا
ہمیں بھی تو مہینہ بھر آنکھوں کا تیل نکالنے کے بعد ساٹھ ستر روپے
سے زیادہ نصیب نہیں ہوتے۔ پھر ان ساٹھ ستر روپے کے
بل بوتے پر ہمیں کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ مزدور کی طرح ہم رہ
نہیں سکتے۔ اندر سے چاہے خزانہ خالی ہو مگر ظاہری نمود
ونمایش تو برقرار رکھنی ہی پڑتی ہے۔ آخر خاندانی وقار اور
سفید پوش طبقے کے فرد ہونے کی وجہ سے بھی تو ہم پر بہت سی
ناخوشگوار مگر ناقابل گریز ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ان مصیبتوں
میں تو ہماری زندگی کٹتی ہے اور پھر آپ ہیں کہ زخموں پر نمک
چھڑکنے کے لئے کہتے ہیں کہ صحت بناؤ۔ مگر دادا جان کو
کیا سمجھاتے ان کے سمجھنے اور سیکھنے کا زمانہ تو گزر چکا ہے۔

دادا جان بڑی دیر تک لکچر دیتے رہے مگر ہمارے
دل و دماغ میں باغیانہ خیالات اس قدر بھڑک رہے تھے کہ
شروع کے چند جملوں کے علاوہ ہم نے ان کی تقریر دل پذیر
کے باقی حصوں کو غور سے سننے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور
شائد غور سے سنتے بھی تو خاک اثر نہ ہوتا ـــــ جب سے
ہم نے ہوش سنبھالا ہے دادا جان کے ان غدر سے پرانے
خیالات کو سیکڑوں مرتبہ سن چکے ہیں۔ بات وہی ہوتی
ہے۔ صرف الفاظ کا جامہ ہر دفعہ مختلف پہنا دیا جاتا ہے۔
ان کی تمام گفتگو ایک مرکز پر گھومتی رہتی ہے۔ فرق صرف
اتنا پیدا ہوتا ہے کہ پیرایۂ بیان کبھی اگر ناصحانہ ہوتا ہے تو
کبھی طنزیہ، کبھی ہمدردی اور دوستی میں ڈوبا ہوا تو کبھی
خفگی اور غصے میں بھرا ہوا۔ پہلے پہلے تو ہم نے جب ان کی
نصیحت پر غور و فکر کیا تو یہ معلوم ہوا کہ ان کا کہنا سچائی سے

خالی نہیں ۔۔۔ آخر ہماری یہ زندگی بھی کیا زندگی ہے جس میں صحت اور تندرستی، امنگ اور طاقت کی نعمتوں کا فقدان ہو ۔۔۔ لیکن سدھارنے کی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ کبھی اپنی ذاتی کاہلی مانع ہوئی تو کبھی دنیا کے ناسازگار حالات نے ہماری تھوڑی بہت ہمت کو توڑ دیا۔ غرض یہ کہ نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے۔ ہم جیسے ہمیشہ تھے ویسے ہی رہے۔

خدا خدا کرکے داداجان نے نصیحت کا دفتر تہہ کیا۔

یہاں سے چھٹی پاکر جلدی جلدی نہا دھو کر کپڑے بدلے اور دفتر جانے کو تیار ہو گئے۔ دفتر کا وقت تنگ ہو رہا تھا، جلدی جلدی ناشتہ کرکے دفتر پہنچے مگر باوجود اتنی جلد بازی کے بھی دیر ہو ہی گئی تھی۔ دفتر کے گھنٹے پر نظر ڈالی تو دل دھک سے ہو گیا۔ پورے آدھے گھنٹے کی دیر ہو گئی تھی۔ ابھی گھنٹے کی سوئیوں پر سے نظر ہٹنے نہ پائی تھی کہ "آپ کو صاحب بلا رہے ہیں" "کچھ معلوم ہے؟"

"معلوم نہیں صاحب" چپراسی نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیا کچھ خفا معلوم ہوتے ہیں؟"

"معلوم نہیں" چپراسی نے حسب سابق اختصار سے جواب دیا۔

اب سوال یہ تھا کہ آخر آج صبح ہی صبح کیوں طلب کیا جا رہا ہے؟ شاید دیر سے آنے پر سرزنش ہوگی یا کچھ اور کام ہوگا؟ زیادہ گمان یہی تھا کہ سوال ہوگا کہ دیر سے کیوں آئے؟ ہمارے موجودہ صاحب کو وقت کی پابندی کا بڑا خیال ہے جہاں ذرا منٹ دو منٹ کی بھی دیر ہوئی ضرور باز پرس کرتا ہے۔ بندۂ خدا یہ نہیں سوچتا کہ آدمی کے ساتھ دس ہزار علائق لگے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی دیر ہو جانا بالکل فطری چیز ہے۔

خیر صاحب، ڈرتے ڈرتے صاحب کے پاس پہنچے۔ چہرے سے شگفتگی ظاہر ہو رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ دیر سے آنے پر بھی کچھ نہیں کہا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی مہربانی سے ہوا موافق ہے۔ مگر مقطع کا بند جب کھلا جب کہ صاحب نے کاغذات اور فائلوں کا ایک بڑا سا پلندہ ہمارے سپرد کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ نادر شاہی حکم بھی سنا دیا کہ جس طرح بھی ہو متعلقہ کام شام تک پورا ہو جائے۔

غضب خدا کا یہ لوگ آدمی کو آدمی نہیں سمجھتے۔ کولھو کا بیل سمجھتے ہیں۔ اپنے آپ تو صبح سے شام تک کرسی پر نیم دراز ہو کر سگار پیتے رہیں گے مگر ماتحتیں کو پل بھر کی فرصت نہیں لینے دیں گے۔ معلوم نہیں بڑے عہدوں پر پہنچ کر لوگوں میں انسانیت کیوں نہیں رہتی؟ غرور کے ان بندوں اور ان کی متمدن دنیا کی عظمت کا سارا بوجھ ہم نے اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ حکومت اور اقتدار۔ اور متمدن دنیا کی جھوٹی تہذیب کی سربفلک عمارت کی بنیادوں میں معصوم انسانیت کی آزاد روح کچل کچل کر بھری گئی ہیں مگر عہد حاضر کی زندگی بہری ہے۔ وہ انسانیت کی مظلوم روح کی آہ وبکا کو نہیں سن سکتی۔ شاید اس سے بہتر تو وہ زمانہ تھا جب کہ "دست مشاطہ نہ تھا محرم زلف دوراں" ۔۔۔ اور جب کہ مزدور خود ہی اپنا آجر بھی ہوتا تھا۔ مانا کہ اس وقت دنیا تہذیب حاضر کے کھلونوں سے محروم تھی مگر اس کے ساتھ ہی وہ انسانیت کے ان ناخداؤں کے ظلم سے بھی آزاد تھی جو آدمی کے ساتھ جانوروں سے برا سلوک کرتے ہیں۔ کاش کہ آج کل کے زمانے میں انسداد بے رحمی حیوانات کے قانون کی طرح کوئی قانون ایسا بھی نافذ ہوتا جو دفتروں میں کام

کرنے والے حیوان نما انسانوں کو اپنے بالا دستوں کے ظلم سے نجات دلا سکتا۔

شام کو پانچ بجے کے بعد دفتر سے نکلنا نصیب ہوا ــــ مگر اس ہیبت کذائی میں کہ پسینے سے شرابور، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ دور سے کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ قبر میں سے کوئی مردہ نکل کر آ رہا ہے۔ اور پھر ہمارے یہ دفاتر بھی تو قبرستان ہی ہیں جہاں انسان کی اعلیٰ صلاحیتیں اور حوصلے فنا ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتے ہیں ــــ

تھکا ماندہ گھر پہنچا۔ بیگم دالان میں بیٹھی ہوئی بچوں کے کپڑوں کی مرمت کر رہی تھیں۔ کچھ خفا خفا سی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر مجھ پر خود تھکاوٹ کا اس قدر غلبہ تھا کہ سیدھا اپنے کمرے میں جا کر دراز ہو گیا۔ کافی دیر تک لیٹا ہوا سستا رہا مگر نہ معلوم کیوں، بیگم نے آج خلافِ معمول چائے بنا کر نہیں بھیجی۔ آخر جب چائے کی طلب نے زیادہ ستایا تو جا کر بیگم سے پوچھ ہی بیٹھا کہ "کیوں کیا آج چائے وائے نہیں پلاؤ گی؟"

"چائے کہاں سے دوں؟ چائے کا سامان بھی لاکر دیا ہے کبھی؟" بیگم نے رکھائی سے جواب دیا۔

"کیوں کیا چائے کا ڈبہ ختم ہو گیا ہے؟ ننھو (نوکر کا نام ہے) سے کیوں نہ منگا لیا"

"جی میں چائے کی پتی کو نہیں کہہ رہی ہوں۔ وہ تو بہت کافی موجود ہے مگر شکر کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ننھو دنیا بھر میں ہو آیا۔ مگر کہیں شکر کا پتہ نہیں۔ اسی واسطے تو میں کہتی تھی کہ وقت بے وقت کے لئے تھوڑی بہت لاکر جمع کرو۔ مگر آپ ٹھیرے فرض شناس آدمی! جمع کیسے کرتے؟"

لیجئے صاحب چائے سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ شکر ہی نہیں ہے چائے کیا خاک پئیں۔ ہم ٹھیرے ہندستانی آدمی۔ ایک آدھ چمچے سے کام نہیں بنتا جب تک پورے تین چار چمچے شکر کے نہ ڈال لیں چائے میں مزا ہی نہیں آتا۔ اس کمبخت لڑائی نے زندگی کی بہت سی نعمتیں چھین لی۔ روز کچھ نہ کچھ ٹنٹا لگا ہی رہتا ہے۔ آج شکر نہیں ہے تو کل آٹا نہیں ملتا، آٹا ملتا ہے تو ایندھن ندارد ہے۔ غرض کہ ایک ناک میں دم ہے۔ دن بھر دفتر میں خون پسینہ ایک کرو۔ گھر آؤ تو ان مصیبتوں کا سامنا۔ زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔

تھکا ہوا اتنا تھا کہ شام کو کلب بھی نہیں گیا۔ رات میں کھانا کھانے کے بعد یکے بعد دیگرے کچھ لوگ ملنے کے لئے آئے ــــ مکان دار صاحب کرایہ مانگنے اور کچھ قومی کارکن چندہ وصول کرنے کے لئے تشریف لائے۔ مگر میں نے ننھو سے کہلوا دیا کہ گھر میں نہیں ہوں۔ اور دن بھر کا تھکا ہارا جلدی پڑ کر سو گیا ــــ یہ تو صرف ایک دن کی روئداد ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ اور شائد اس ملعون زندگی کی پوری کہانی سنانے کا نہ مجھ میں حوصلہ اور نہ سننے والوں کو فرصت۔ کیا پتہ جو وہ خود بھی گرفتار بلا ہوں۔

آیت اللہ بیگ عارف

ہم

کیوں جبینِ محبت جھکائیں گے ہم
بندگی کو خدائی بنائیں گے ہم

جس قدر آرزوئیں بڑھائیں گے ہم
اُن کو اتنا ہی مجبور پائیں گے ہم

ہجر کو زندگانی بنائیں گے ہم
جائیے جائیے، مر نہ جائیں گے ہم

ناز سے جب وہ دیکھیں گے اپنی طرف
ان کو اس دم بہت یاد آئیں گے ہم

ناخدا ہم کو طوفان میں چھوڑ دے
ورنہ ساحل پہ بھی ڈوب جائیں گے ہم

جستجو کے تقاضوں کے مجبور ہیں
جانتے ہیں کہ تجھ کو نہ پائیں گے ہم

غنچہ و گل سے اُلجھی ہوئی ہے نظر
اس طرح کیا انھیں بھول جائیں گے ہم

تیری محفل سے جانے کی ہمت نہیں
اور گئے تو پلٹ کر نہ آئیں گے ہم

لذتِ غم سلامت رہے عشق میں
شدّتِ غم میں بھی مسکرائیں گے ہم

حاصلِ جستجو ہم کو معلوم ہے
ل گئے وہ، تو خود کو نہ پائیں گے ہم

آپ کی بے نیازی کہاں جائے گی؟
جب محبت سے پردہ اٹھائیں گے ہم

ہر مسرت گزرتے ہی غم بن گئی
اب فریبِ مسرّت نہ کھائیں گے ہم

موت کے شور کو بند کر دے کوئی
زندگی کا نیا گیت گائیں گے ہم

جو ہمیں روکتا ہے وہ یہ سوچ لے
دور سے آئے ہیں، دور جائیں گے ہم

کیا جہنم میں رہنا کوئی فرض ہے؟
اپنی دنیا کو جنت بنائیں گے ہم

ضبط کی زندگی بے نتیجہ رہی
زندگی کو تڑپنا سکھائیں گے ہم

تا کجے یہ ضیاء، تا کجا یہ سکوں!
ظلمتِ غم کی دولت لٹائیں گے ہم

جو چمکتے ہیں لیکن تڑپتے نہیں
ان ستاروں کو انساں بنائیں گے ہم
ق

آج شاہدؔ، خودی منزلِ شوق ہے
آج ان کی سمجھ میں نہ آئیں گے ہم

شاہد صدیقی

جائے پناہ

جب بارش موسلا دھار ہو تو مضبوط سے مضبوط چھاتا ہونے کے باوجود بھی کپڑوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور بھیگ جاتا ہے اور میرا چھاتا تو ہماری پرانے وقتوں کی یادگار۔ ایسی حالت میں پانی سے بالکل محفوظ رہنے کی توقع رکھنا اپنے آپ کو فریب دینا نہیں تو اور کیا ہے۔ کچھ دیر تک تو میں اپنے آپ کو فریب دیتا رہا مگر جب بارش کے موٹے موٹے قطرے گردن پر سے ہوتے ہوئے پشت پر یلغار کرنے لگے تو مجبوراً جائے پناہ ڈھونڈنے کے لئے ادھر ادھر دیکھنا پڑا۔ خوش قسمتی سے لوہاری دروازہ قریب تھا، اس سے بہتر اور کونسی جائے پناہ ہو سکتی تھی۔

جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا دروازے کے نیچے جا کھڑا ہوا اور جیب سے رومال نکال کر چہرہ پونچھنے لگا۔ میری طرح کئی اور لوگ بھی وہاں کھڑے بارش کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ وقت گزارنے کے لئے کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور چاہیے چنانچہ ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق کسی نہ کسی شغل میں محو تھا۔ مثلاً دیوار کے ساتھ سیڑھی پر ایک مزدور بیچارہ جھولی میں مونگ ڈالے مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ اس کے پاس ہی مونگ پھلی بیچنے والا بھی بیٹھا تھا۔ ان دونوں سے کچھ دور ایک لمبی داڑھی والے مولوی صاحب کھڑے تھے بظاہر ان کی کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی تاہم وہ بار بار اپنے دانتوں کو بند کرکے ہونٹ سکڑ کر ایک عجیب انداز سے تھوکتے جاتے تھے۔ دروازے کی دوسری دیوار کے قریب ایک نوجوان کھدر پوش کھڑا تھا، اس کے ہاتھ میں بیڑیوں کا بنڈل تھا اور وہ بیڑی کے لمبے لمبے کش لے کر اردگرد کھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی دائیں طرف ایک کلرک نظر آ رہا تھا، کلرک میں نے اس لئے کہا کہ ایک تو اس نے کافی ضخیم فائل بغل میں دبا رکھی تھی اور دوسرے اس کے چہرے پر بے کیف زندگی کی پرچھائیاں سی رینگ رہی تھیں۔ میرے قریب ایک موٹی سی توند والے میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس مہاجن کھڑے تھے۔ ان کی نگاہیں چھوٹی سی کاپی کے صفحے پر جمی تھیں۔ شائد کسی حساب میں مشغول تھے۔ ایسے موقعوں پر گفتگو کرنے کے لئے کوئی موضوع خود بخود نکل آتا ہے۔ مگر ہر شخص پہل کرنے میں کچھ تکلف محسوس کرتا ہے چند منٹ کے بعد ایک اور صاحب آئے۔ وضع قطع اور لباس سے شاعر معلوم ہوتے تھے۔ آتے ہی وہ ایک کونے میں کھڑے ہوگئے اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے انھیں ان لوگوں میں، ان لوگوں کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے لوگوں کی بیتابی بڑھتی جارہی ہے ہر شخص گفتگو کرنے کے لئے بیتاب ہے مگر ہر شخص گفتگو کرنے سے کتراتا کیوں ہے؟ یہ سوال مجھے پریشان کر رہا تھا! آخر خدا خدا کرکے مونگ پھلی بیچنے والے نے سامنے کھڑے ہوئے ایک نائی سے کہا۔ ساری رات بارش ہوگی ـــ دیکھئے بادل سنا ہے کہیں اولے پڑے ہیں ـــ؟"

"ہاں امرتسر میں ـــ بڑا نقصان ہوا ـــ ایک شخص کی دو گائیں سردی سے مرگئیں" نائی نے جواب دیا۔

"ایسے زمانے میں نقصان ہونا ـــ رام رام۔ بیچارے کا کیا حال ہوگا ـــ" مونگ پھلی بیچنے والے نے متاثر ہو کر کہا۔

"قسمت کے آگے کیا پیش چل سکتی ہے انسان کی۔ خدا جانے یہ منحوس جنگ کب ختم ہوگی ـــ چیزیں اتنی مہنگی ہوگئی ہیں کہ جی چاہتا ہے مر جائیں۔ یہ استرا پہلے ڈھائی روپے میں

ملجاتا تھا اب سات روپے میں بھی نہیں ملتا۔ اب ہم جائیں کدھر؟
مولوی صاحب نے اپنے کمبل کو شانے پر ٹھیک ٹھاک کیا اور ذرا آگے بڑھ کر بولے۔ یہ سب ہماری بد اعمالی کی سزا ہے۔ ہم نے اپنے خدا کو بھلا دیا ہے۔ دنیا کی محبت میں بالکل دیوانے ہو گئے ہیں۔ قحط اور بدحالی میں یہ قدرت کا عذاب ہے"
سب لوگ بڑی توجہ سے یہ بات سن رہے تھے۔
لالہ جی کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ وہ کسی ذہنی کشمکش میں گرفتار غیر شعوری طور پر ٹانگوں سے اپنی دھوتی اوپر اٹھاتے جا رہے تھے۔
مولوی صاحب کی بات سن کر وہ بیزار ہو گئے اور ایسی جگہ چلے گئے جہاں کلرک سر جھکائے نہ معلوم کیا سوچ رہا تھا!
مولوی صاحب سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولے — "یہ جنگ — یہ بھی قدرتِ الٰہی کا عذاب ہے خدا نے خود کہا ہے جب لوگ مجھے بھول جاتے ہیں تو میں ان پر عذاب نازل کرتا ہوں"
"مزدور نے آہ بھر کر کہا: "آپ ٹھیک کہتے ہیں مولبی جی — ہم پرمیشور کو بھول گئے ہیں۔"
"بھگوان کرے اب یہ لڑائی جلد ختم ہو جائے" ہو نگ پھلی بیچنے والے نے دردناک لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں حسرت و یاس کی ایک دنیا آباد تھی۔ مسلسل بیماریوں نے جسم کا خون نچوڑ کر ادھ موا کر چھوڑا تھا۔ نائی اور مزدور کی حالت بھی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی۔ اسی اثنا میں کھدر پوش نوجوان آگے بڑھ کر بولا۔
"معاف کیجئے مولوی صاحب! مجھے آپ کے خیالات سے اختلاف ہے۔ یہ جنگ عذاب نہیں بلکہ آنے والے شاندار دور کی ابتدا ہے۔"
"شاندار دور —؟" مولوی صاحب نفرت سے ہنس پڑے۔

"جی ہاں بالکل نہایت شاندار دور — یہ جنگ فاشیت اور اشتراکیت کی جنگ ہے۔ فاشیت سرمایہ داری کی پیداوار ہے اور اشتراکیت کے علمبردار دنیا کے مزدور ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے، یہ جنگ سرمایہ داری اور مزدوروں کی جنگ ہے۔ حالات صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ سرمایہ داری تباہ ہو جائے گی اور مزدوروں کو فتح ہو گی — سرمایہ داری ختم ہونے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا سے ظلم و تشدد ختم ہو جائے گا، ملکیت کا قابلِ نفرت تصور ختم ہو جائے گا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بھوک ختم ہو جائے گی۔ آپ نے دیکھا بنگال میں لوگ بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے تھے مگر سرمایہ داروں نے جمع کئے ہوئے انبار در انبار غلے میں سے مٹھی بھر اناج بھی باہر نکالنا پسند نہ کیا۔ سرمایہ داری نے انسانیت اور شرافت کو ختم کر کے رکھ دیا ہے مگر جنگ کے بعد یہ نہیں ہو گا۔ مزدوروں کی حکومت میں یہ نہیں ہو گا۔ مزدور، غریب فاقہ کش لوگوں نے بے انتہا دکھ اٹھائے ہیں اب ایسا وقت آ رہا ہے کہ وہ بھی دوسروں کی طرح خوشی سے زندگی بسر کر سکیں گے۔" لالہ جی نے گھور کر کھدر پوش کو دیکھا اور اپنی جگہ چھوڑ کر اور پیچھے ہٹ گئے۔ مولوی صاحب اس انداز سے مسکرا رہے تھے گویا ان باتوں کو لغو سمجھتے ہیں — نائی، مزدور اور مونگ پھلی بیچنے والا — یہ تینوں حیرت اور مسرت کے عالم میں ٹکٹکی باندھے کھدر پوش کی طرف دیکھ رہے تھے۔
"میاں ابھی تو نے دنیا کا کچھ بھی نہیں دیکھا۔ پچھلی لڑائی میں بھی جوشیلے لونڈے کہتے تھے۔ لڑائی کے بعد یہ ہو گا وہ ہو گا۔ مگر ہوا کچھ بھی نہیں۔ مصیبت تو یہ ہے ہمارے نوجوان دو حرف انگریزی کے پڑھ کر بے دین ہو جاتے ہیں، نہ خدا کا خوف

نہ رسول کا ڈر، جو دل میں آیا کہہ دیا ——— استغفر اللہ۔"

"کھدر پوش نے اسی سنجیدگی کے پیرائے میں کہا۔ "مولوی صاحب! ہم بے دین نہیں ہیں مگر تقدیر پرستی کو بھی بزدلی سمجھتے ہیں۔ سرمایہ داری نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے اور ہر وقت غریبوں کا خون چوسنے کے لئے طرح طرح کے اصول وضع کئے ہیں، تقدیر پرستی ان اصولوں میں سب سے زیادہ خطرناک اصول ہے۔ غور کیجئے کیا ہمارے خدا کو یہ بات پسند ہے کہ ایک سرمایہ دار لاکھوں من غلہ جمع کر کے اس بات کا انتظار کرتا رہے کہ جب غلہ انتہا سے زیادہ مہنگا ہو جائے اس وقت تھوڑی تھوڑی مقدار میں اسے بیچ دے۔ اور اس بات کی ذرہ بھر پروا نہ کرے کہ اس کے گھر کے سامنے ہزاروں غریب انسان بھوک سے لاچار نیم جان پڑے ہوئے ہیں۔ غریب لوگ دنیا میں اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ ساری عمر محنت کریں اور فاقہ کشی کی حالت میں مر جائیں۔ خدا کو یہ بات ہرگز منظور نہیں ہے۔ اور یہ جنگ اس بات کا فیصلہ کر رہی ہے۔ دنیا کے مزدور جاگ پڑے ہیں اور اب اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور فتح انہیں کو حاصل ہو گی ——"

مونگ پھلی بیچنے والا کچھ کہنا چاہتا تھا مگر مسرت و جوش کے عالم میں اپنے خیال کے اظہار کے لئے اسے موزوں لفظ نہیں ملتے تھے۔ نائی اور مزدور ——— چپ چاپ کھڑے تھے جیسے کوئی خوش گوار خواب دیکھ رہے ہیں۔ شاعر نے ایک لمحے کے لئے ادھر دیکھا اور پھر جیب سے پنسل نکال کر کاپی پر کچھ لکھنے لگا۔ کلرک کی حالت بدستور وہی تھی۔ لالہ جی کھسکتے کھسکتے دروازے کی دیوار کے آخری حصے تک جا پہنچے تھے اور اب نوٹوں کا بنڈل نکال کر نوٹ گن رہے تھے۔ یکایک فضا میں قہقہے کی آواز گونجی۔ ہم نے اپنے سامنے دیکھا، ایک عورت ہنسی کے مارے دوہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے پاس کھڑے ہوئے لمبی لمبی مونچھوں والے آدمی کا بھی یہی حال تھا۔ جب ہنسی کا دورہ ختم ہوا تو عورت نے ہونٹوں پر سرخ زبان پھیری، ایک پھسلتی ہوئی نظر ادھر ادھر ڈالی اور پھر مسکرا کر انگڑائیوں پر انگڑائیاں لینے لگی ——— اس کا رنگ اگرچہ سیاہی مائل تھا تاہم آنکھوں کی شوخی نے اس کے چہرے میں ایک خاص قسم کی جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ اس کے ساتھی نے بڑی سی گٹھڑی کو کندھے سے ہٹا کر زمین پر رکھ دیا۔ اچکن کی جیب سے ایک چمکتا ہوا ڈبہ نکالا اور اسے کھول کر پان بنانے لگا۔ سب کی نظریں عورت کی طرف اٹھ گئیں۔ مولوی صاحب منہ پر کچھ بڑبڑائے اور منہ دوسری طرف پھیر کر آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ شائد کوئی وظیفہ پڑھنے لگے۔ اچانک کلرک کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی۔ اس نے فائیل کو دائیں بغل سے نکال کر بائیں بغل میں رکھ دیا اور آگے کھسک آیا۔!

"تو لڑائی کب تک ہوتی رہے گی ——— ؟" مونگ پھلی بیچنے والے نے کھدر پوش کو مخاطب کر کے کہا۔

"یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ——— بہرحال جنگ ایک سال کے بعد ختم ہو یا دو سال میں، دنیا سے امیروں کی حکومت کا آخری وقت آ پہنچا ہے!"

"بھگوان ——— !" مونگ پھلی بیچنے والے نے کہا اور دروازے کی چھت کو دیکھنے لگا۔

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ خاموش چہرے، کسی نہ کسی چیز کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی ہوئی آنکھیں، بے حس و حرکت جسم مگر سینوں میں امنگوں اور ولولوں کا اضطراب، ہر شخص ایک خواب دیکھ رہا تھا! کلرک اب عورت کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کی بھوکی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں ——— عورت مسکرا مسکرا کر آنکھیں مٹکا مٹکا کر اپنے ساتھی سے باتیں کر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ

کلرک کو کنکھیوں سے دیکھتی بھی جاتی تھی "اللہ تو کریم ہے" مولوی جی نے نعرہ مارا اور سرخ رومال سے ناک پونچھنے لگا سرخ رومال دیکھتے ہی مجھے اپنی بیوی کا خیال آ گیا — جو سرخ چادر میں لپٹی پلنگ پر لیٹی میرا انتظار کر رہی تھی۔ آج میں اس کے لئے لونڈر بھی لے آیا تھا" اپنی پیاری چیز کو دیکھ کر وہ کس قدر خوش ہو گی۔ میرے جسم میں ایک ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ میں بیوی کے خیالات میں محو ہو گیا۔ اس محویت کے عالم میں صرف ایک لفظ میرے کانوں میں پڑا۔ "ہیرا منڈی" عورت کے ساتھی نے ایک ٹانگے والے کو آواز دی تھی! دو تین منٹ میں کیا کچھ ہو گیا مجھے معلوم نہیں۔ اپنے خیالات سے چونک کر جب میں نے اودھر اودھر دیکھا تو عورت اور اس کے ساتھی کے علاوہ سب لوگ موجود تھے۔ اپنے خوابوں میں ڈوبے ہوئے — ہاں کلرک بھی جا چکا تھا! بارش زور و شور سے ہو رہی تھی — مگر میں نے گھر جانا ہی مناسب سمجھا!

مظفر حسین اظہر (دہلی)

رات کا بھولا اور دیگر افسانے - پروفیسر عبد القادر صاحب سروری ایم اے - ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی - مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابل مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائیٹل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبد القیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۸ - قیمت عہ

ارباب ذوق کے لئے نادر تحفہ

(تصانیف محترمہ آنسہ محمودہ رضویہ مدیرۂ رسالہ "شعاع اردو" کراچی)

سندھ کی مایۂ ناز و فاضل ادیبہ محترمہ آنسہ محمودہ رضویہ ادبی دنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ موصوفہ ایک خاص اسلوب انشاپردازی کی موجد ہیں اور ان کی ہر تصنیف میں ان کے اس پاکیزہ اسلوب کا رنگ پورے کمال کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے "ادب میں آپ کا ذوق سلیم تعریف کے قابل ہے۔ افسانوں کے پلاٹ سے مصنفہ کے دلی سوز، حس ہمدردی اور اعلیٰ اخلاقی معیار کا پتہ چلتا ہے۔ محترمہ محمودہ زبردست امکانات کی مالک ہیں۔ ان کی انشا کا انداز بہت اثر انداز اور دل کش ہے" (ہماری زبان)۔ (۱) سوز و ساز - ۱۲ اصلاحی، معاشی اور معاشرتی افسانوں کا مجموعہ قیمت ۱۲ر (۲) مشک و عود - ۱۵ نفسیاتی، اخلاقی اور سماجی افسانوں کا مجموعہ قیمت عہر (۳) ہست و بود - ۱۶ المیہ، طربیہ اور روحانی افسانوں کا مجموعہ قیمت عاں (۴) نامۂ تہدید ۱۲ اصلاحی افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ - (۵) دردانہ - قیمت عہ (۶) لالہ زار قیمت ۱۲ر (۷) ارمغان قیمت ۱۲ر (۸) کہکشاں - قیمت عاں (۹) آبشار - قیمت عاں (ادبی مجموعے)

رعایت - پورا سٹ خریدنے والوں سے پورے سٹ کے صرف دس روپے لئے جائیں گے۔

ملنے کا پتہ - شعاع دو دارالاشاعت　انجمن ترقی اردو کراچی

سوکھا باغ

میری قسمت بھی عجیب ہے۔ مجھے کہیں چند روز چین سے قیام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ دشت پیمائی، بادیہ گردی اور صحرانوردی یہ ہے میری قسمت جس کو کوئی طاقت بدل نہیں سکتی۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ جہاں میں نے صبح کے وقت آفتاب کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا ہو، وہیں پھر اس کو غروب ہوتے ہوئے دیکھوں۔ شام کے وقت جب کسی شفاف ندی کو یا نالے کو مست خرام دیکھتا ہوں تو اس خیال سے آہیں بھرا کرتا ہوں کہ دوسری صبح کو اسے پھر نہ دیکھ سکوں گا اور شائد ہمیشہ کیلئے نہ دیکھ سکوں گا۔ چاہے گرما ہو چاہے سرما، چاہے برسات ہو چاہے بہار، مجھے ہر موسم میں سفر کرنا پڑتا ہے اور ہمیشہ سفر کرنا پڑتا ہے گرما کے وسط میں جب ہر طرف آگ برستی رہتی ہے اور سرما کی راتوں میں جب سردی سے اعضاء ٹھٹھر جاتے ہیں اور بارش کے طوفان باد و باراں میں میں سفر کرتا رہتا ہوں۔ کیوں؟ —— کس لئے؟ سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ پیٹ کے جہنم کو بھرنے کے لئے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ مئی کا مہینہ تھا جب کہ چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہتا رہتا ہے۔ میں علی الصبح ایک بیل گاڑی میں بیٹھ کر چلا تھا۔ منزلِ مقصود کچھ زیادہ دور نہیں تھی۔ توقع تھی کہ بارہ بجنے کے قبل ہی سفر ختم ہو جائے گا مگر اس کو اتفاق کہئے یا قسمت، بنڈی بان راستہ بھول گیا۔ ساتھ دو جوان تھے۔ ان کو بھی معلوم نہیں تھا کہ سیدھا راستہ کونسا ہے۔ گاؤں والوں کی یہ خصوصیت حیرت انگیز ہے کہ اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں کا راستہ تو ان کو معلوم رہتا ہے لیکن تیسرے گاؤں کے راستہ سے وہ اتنے ہی ناواقف ہوتے ہیں جتنے قطب شمالی یا قطب جنوبی کے بسنے والے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بنڈی بان راستہ بھول گیا۔ دیر تک میں اور میرے ساتھی ٹامک ٹوئیے مارتے رہے نہ کوئی گاؤں نظر آیا نہ کسی راہرو کا پتہ چلا۔ مئی کا مہینہ شدت کی حدت بھلا کس کی شامت آئی تھی جو بادیہ گردی کے مزے اٹھاتا۔ لیکن میں کیا کرتا۔ میری تو قسمت ہی میں سفر لکھا ہے۔ دوپہر کے قریب آندھی آئی۔ کس قیامت کی میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ سارا جنگل تیرہ و تار ہو گیا۔ بنڈی ایک سیاہ چٹان کی آڑ میں کھڑی کر دی گئی اور میں اس میں اس طرح بیٹھا رہا جس طرح کوئی گرفتار قفس اپنی سخت تھکا دینے والی کشمکش سے اکتا کر اور مجسم یاس ہو کر قفس میں بیٹھا رہتا ہے کوئی ایک گھنٹے تک ہوا کے تیز و تند جھونکے چلتے رہے۔ نہیں معلوم اس عرصہ میں کتنے ٹہنے ٹوٹ گئے اور کتنے درخت جڑ سے اکھڑ گئے۔ کامل ایک گھنٹہ کے بعد ہوا ذرا کم ہوئی اور بنڈی پھر چلنے لگی۔

جب شام کے چار بجے تو ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں درختوں کا بڑا خوبصورت جھنڈ تھا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے اب تک کھایا پیا نہیں تھا۔ اب رائے یہ ہوئی کہ یہاں ذرا ستا لیں اور جو کچھ آذوقہ ساتھ ہے نوش جان کریں۔ چنانچہ بیل کھول دیئے گئے اور توشے دان لائے گئے۔ میں نے کچھ تھوڑا سا زہر مار کیا باقی ساتھ والے چٹ کر گئے۔ سوکھی لکڑیاں جمع کرکے چائے تیار کی گئی۔ میں نے ایک پیالی ختم کی دوسری ہونٹوں سے لگا رہا تھا کہ مغرب کی جانب نظر پڑی۔ مجھے وہاں کا منظر بڑا دلفریب اور دلکش نظر آیا۔ جی میں آیا کہ ذرا قریب جا کر اس دلفریب منظر کا جائزہ لوں اور یہ معلوم کروں کہ اس میں آخر یہ دلکشی کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ میں نے چائے کی دوسری پیالی جلد ختم کر ڈالی اور چھڑی ہاتھ میں لے کر جانے لگا۔ ابھی دس پانچ قدم بھی

نہیں گیا تھا کہ ہنڈی بان دوڑ کر آیا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی بولی میں جسے میں بہ دقت سمجھ سکتا تھا کہا "ادھر نہ جانا۔"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں مگر ادھر نہ جانا"

مجھے غصہ آگیا۔ اس عرصہ میں دونوں جوان بھی وہاں پہنچے۔ میں نے ان سے کہا اس شخص سے دریافت کرو کہ مجھے ادھر جانے سے کیوں منع کرتا ہے۔ ان دونوں جوانوں نے دیر تک ہنڈی والے سے چھپاؤں بپاؤں کی اس کے بعد ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہنڈی والا کہتا ہے کہ یہ جنگل آسیب زدہ ہے یہاں ایک سوکھا باغ ہے۔" "سوکھا باغ!" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں" "اس کا مطلب کیا ہے؟ صاف صاف بیان کرکے کہو۔"

"جی وہ کہتا ہے کہ مشہور ہے کہ اس طرف ایک سوکھا باغ ہے اس کو دیکھنا بہت بُرا ہے اگر وہ نظر آجائے تو یا تو انسان بادشاہ ہوجائے یا سخت مصیبتوں میں مبتلا ہوکر دیوانہ بن جائے۔"

"اس سے دریافت کرو کہ اس باغ کو آج تک کسی نے دیکھا بھی ہے"

"جی ہاں وہ کہتا ہے کہ اس کے دادا کے بھائی نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ کچھ پاگل سا ہوگیا اور چند روز کے بعد مرگیا۔ مرنے سے پیشتر اس نے اپنے خاندان والوں سے کہا تھا کہ اس طرف ایک سوکھا باغ ہے اس کو دیکھنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا۔ اگر اسے دیکھو گے تو یا تو بادشاہ ہوجاؤ گے یا میری طرح پاگل ہوکر مرجاؤ گے۔ اس زمانے سے لوگ ادھر آیا جایا نہیں کرتے۔"

یہ سن کر مجھے بیساختہ ہنسی آگئی۔ ہنڈی والے کے دادا کا بھائی ــ سوکھا باغ ــ بادشاہ یا پاگل خوب خوب۔

میں نے جوانوں سے کہا تم لوگ یہیں ٹھیرو۔ اس سے پھر ہنڈی میں رکھ لو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ بس تھوڑی ہی دور جاؤں گا۔ تم لوگوں کی نظروں کے سامنے ہی رہوں گا۔ ذرا میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس سامنے کے جنگل میں اتنی دلفریبی کہاں سے آگئی ہے۔ آخر بات کیا ہے؟

جوانوں نے سر تسلیم خم کیا جو کہ ان کی عادت ہوتی ہے۔ ہنڈی بان بھی خاموش ہوگیا کیوں کہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے کس طرح روکے۔ میں چھڑی ہلاتا ہوا خراماں خراماں چل پڑا۔

پانچ بج چکے تھے دھوپ کی حدت کم ہوگئی تھی۔ سامنے دلفریب وادیاں تھیں۔ سرسبز مرغزار تھے۔ سایہ دار درخت تھے۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ دل نے کہا کاش سوکھا باغ نظر آجائے۔ شائد بادشاہ ہوجاؤں۔ اگر پاگل بھی ہوجاؤں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اب کونسا عقلمند ہوں پاگل بننے سے اس کو ڈرنا چاہیے جسے اپنی عقلمندی کا دعویٰ ہو۔ خدا کے فضل و کرم سے ایسا دعویٰ تو مجھ کو کبھی نہیں ہوا اور نہ امید ہے کہ آئندہ کبھی ایسا دعویٰ کرنے کی خود مجھے توفیق دے گا۔ پاگل تو میں اب بھی ہوں۔ یہ پاگل پن نہیں تو کیا ہے کہ چند ٹکوں کی خاطر صبح سے شام تک اور پھر شام سے صبح تک دشت نوردی اور بادیہ پیمائی کرتا رہتا ہوں ــ دیکھوں تو میں کیسا دلفریب منظر ہے۔ کتنا سہانا مقام ہے۔ آفتاب کی زرد زرد کرنیں ان درختوں پر کیا بہار دکھا رہی ہیں۔ ہوا بھی خوب چل رہی ہے۔ نہ زیادہ تیز ہے نہ زیادہ گرم مگر مجھے آگے نہ بڑھنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سوکھا باغ نظر آجائے اور میں پاگل بن جاؤں۔ اونہہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ اب دنیا میں اسرار کہاں رہے ہیں۔ یہ دنیا تو اب اسرار سے خالی ہوچکی ہے۔ ہنڈی بان کے دادا کے بھائی کے زمانے میں

شائد یہاں کچھ اسرار ہوں مگر اس زمانے میں جبکہ ہوائی جہاز ریڈیو ایجاد ہو چکے ہیں اس دنیا میں اسرار کہاں سما سکتے ہیں۔ اگر یہاں سوکھا باغ ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ یورپ کے سیاحوں کی نظر سے محفوظ رہتا۔ سب خرافات ہے۔ بالکل خرافات از سر تا پا خرافات۔

میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ بے دھڑک آگے بڑھتا چلا گیا۔ شائد اس لئے کہ سوکھے باغ کو دیکھنے کی خواہش نامعلوم طور پر میرے دل میں جاگزیں ہو چکی تھی۔ میں اس کو دیکھ کر بادشاہ یا پاگل دونوں میں سے کوئی ایک بننا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس روز کی صحرا نوردی کے مقابلے میں بادشاہ یا پاگل بن جانا مجھے ہر طرح غنیمت معلوم ہو رہا تھا۔ بہرحال میں آگے بڑھتا گیا اور اپنے خیالات میں کچھ ایسا کھویا گیا کہ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ کتنی دور نکل آیا ہوں ایک اونچی پہاڑی کے دامن میں سے چکر کاٹ کر جب میں ذرا آگے بڑھا تو اپنے کو ایک بہت بڑی لکڑی کے دروازے یا پھاٹک کے سامنے کھڑا دیکھا۔ اس پھاٹک کے دونوں پٹ بالکل کھلے تھے اور وہ اتنی اونچی اور فراخ تھی کہ بڑے سے بڑا ہاتھی بھی مع عماری کے اس کے اندر بآسانی داخل ہو سکتا تھا۔ لمحے بھر کے لئے میرے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ اچانک خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہی ہے سوکھا باغ۔

دیر تک اس سوچ میں کھڑا رہا کہ اندر داخل ہوں یا واپس پلٹ جاؤں۔ مصیبتیں انسان کو دلیر بنا دیتی ہیں۔ مجھے اپنی اس بے کیف زندگی کا خیال آیا جس کو میں بسر کرنے پر مجبور ہوں وہی صبح سے شام تک سفر اور پھر شام سے صبح تک سفر وہی ایک قسم کا پھیکا اور سیٹھا کام جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا وہی

ہر قسم کی لعنتیں اور لامتیں جن سے کسی وقت بھی پناہ نہیں مل سکتی۔ دل نے کہا دیکھو بھی اس سوکھے باغ کو، بادشاہ بن جاؤ گے بادشاہ! اگر نہ بنو گے بھی تو ایسا کونسا نقصان ہو جائے گا۔ پاگل بننا تو کوئی ایسی بری بات نہیں ہے دیکھو نا پاگلوں کے لئے کیسے کیسے محلات بنائے جاتے ہیں اور کیسے کیسے باغ لگائے جاتے ہیں۔ ان کو کھانا بھی وقت پر ملتا ہے اور کپڑے بھی خوب دیئے جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کل پاگلوں سے بڑھ کر اور کون خوش نصیب ہو سکتا ہے۔ ہر چیز مفت اور پھر کچھ کام نہیں۔ میں نے کہا ٹھیک تو ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس سوکھے باغ کی وجہ سے میری قسمت بدل جائے اور زندگی کا تھوڑا لطف مجھے بھی نصیب ہو۔

یہ سوچ کر میں پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ وہاں میں نے عجیب تماشا دیکھا ——— ہاں اتنا عجیب کہ انسان کو پاگل بنانے کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔

——— ۲ ———

میں نے دیکھا کہ پھاٹک کے سامنے ایک بہت عریض لامتناہی گرد سڑک ہے جس کا رنگ بے حد سیاہ اور چمکتا ہوا ہے اس کے دونوں جانب بہت اونچی مہندی کی باڑ ہے مگر بالکل خشک ہے عجیب بات یہ ہے کہ تمام سوکھے پتے سوکھی شاخوں سے برابر لگے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ پھول اور دانہ ہائے اسپند اگرچہ بالکل خشک ہیں مگر ٹہنیوں پر موجود ہیں۔

آفتاب کے غروب ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس کی زرد زرد شعاعیں اس سوکھی مہندی کی باڑ پر عجیب یاس انگیز کیفیت اٹھا رہی تھیں۔ میں نے سامنے جو نظر ڈالی تو دور ایک بارہ دری نظر آئی۔ میں یہ خط مستقیم اس لامتناہی گرد

سڑک پر تیز تیز چلنے لگا۔ بہت بڑی اونچی لیکن خشک باڑ سڑک کے دونوں طرف لگی ہوئی تھی جب بارہ دری کے قریب پہنچا تو ایک بلند اور وسیع چبوترہ نظر آیا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا حوض سامنے موجود ہے جس کے بیچوں بیچ فوارے کا بڑا نفیس ستون بنا ہوا ہے مگر نہ حوض میں پانی کا ایک قطرہ باقی تھا نہ آتی ہے نہ فوارہ چلتا، دونوں خشک۔ اس حوض کے سامنے ہی ایک بڑی شاندار بارہ دری ہے میں بائیں جانب سے اس بارہ دری میں داخل ہوا اور چاروں طرف گھومنے لگا ہر دروازے سے عجیب نظر نظر آیا تفصیلی ذکر تو محال ہے۔ اجمالاً کچھ بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ایک دروازے کے وسط میں کھڑے ہو کر جب میں نے سامنے کے منظر پر نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ مانگ گرد سڑک دور تک چلی گئی ہے اور اس کے دونوں جانب نیم کے درخت لگے ہوئے ہیں مگر سب کے سب جڑ سے لے کر چوٹی تک خشک ہیں۔ البتہ پتے اور پھول اور نبولیاں سوکھی ٹہنیوں پر برابر قائم ہیں۔ اگرچہ یہ سب بالکل سوکھے ہیں سڑک کے آخری سرے پر ایک اور بارہ دری ہے دوسرے دروازے سے مجھے مولسری کے درخت بالکل اسی طرح نیچے سے اوپر تک سوکھے کھڑے ہوئے نظر آئے۔ سوکھے ہوئے پھولوں پر عجیب حسرت برس رہی تھی۔ آخری سرے پر بارہ دری بھی دکھائی دی تیسرے دروازے سے کارگ کے اور بارہ دری، چوتھے سے پیپل کے اور بارہ دری، پانچویں سے آم کے درخت اور بارہ دری، چھٹے سے کھرنیوں کے درخت اور بارہ دری۔ غرض کہ ہر دروازے سے مختلف قسم کے سایہ دار اور ثمردار درخت نظر آئے جو سب کے سب بالکل سوکھے ہوئے اور خشک تھے

لیکن باوجود اس کے سوکھے پتے، سوکھے پھول اور سوکھے پھل برابر موجود تھے۔

جب میں نے دروازوں سے اس سوکھے باغ کا منظر دیکھ لیا تو جی میں آیا کہ ذرا ہمت کرکے سب بارہ دریوں کا بھی معائنہ کرلوں۔ ممکن ہے کہ کہیں نہ کہیں مجھے بہت بڑا خزانہ مل جائے اور میں بادشاہ ہوجاؤں۔ آفتاب غروب ہوچکا تھا خون شفق سے مغرب گلنار تھی مگر چودھویں رات کا چاند آہستہ آہستہ طلوع ہورہا تھا۔ میں نے آم کے درختوں کی جانب والے دروازے سے قدم باہر نکالے اور بارہ دری کا رخ کیا جو دور نظر آرہی تھی وہاں بھی مجھے سوکھا حوض ملا۔ جب اندر داخل ہوا تو بارہ دروازے نظر آئے ہر دروازے سے نیا منظر دکھائی دیا۔

مثلاً پہلے دروازے سے میں نے گلاب کے صدہا تختے دیکھے جن میں کے سارے پودے بالکل سوکھے تھے گلاب کے پھول گلاب کی کلیاں، گلاب کے پتے سب کے سب بالکل خشک تھے۔ دوسرے دروازے سے چنبیلی کی ہزار ہا بیلیں دکھائی دیں۔ ان کی بھی یہی حالت تھی۔ تیسرے سے جوہی، چوتھے سے موتیا، پانچویں سے موگرا، چھٹے سے چمپا کے لاتعداد تختے نظر آئے۔ مگر سب کی ایک ہی حالت تھی پتے اور پھول اور کلیاں اگرچہ بالکل خشک تھیں مگر اس کے باوجود ان کو اچھی طرح پہچانا جاسکتا تھا۔

جب سارے دروازے ختم ہوگئے تو میں چنبیلی کی بیلوں والے دروازے سے باہر نکلا۔ میں نے قریب جاکر چند پھولوں کو توڑنے کی کوشش کی مگر وہ ہاتھ لگتے ہی گر پڑے جو چند ہاتھ میں آئے وہ ہاتھ کی ذرا سی حرکت سے بکنی بن گئے۔ میں آگے بڑھا۔ مانگ گرد سڑک پر تیز تیز بخط مستقیم چلنے لگا۔ کوئی پاؤ گھنٹے کے بعد دوسری بارہ دری ملی۔ وہی حوض اور فوارہ

اور وہی بارہ دروازے۔ پہلے دروازے سے لیموں کے، دوسرے سے نارنگی کے، تیسرے سے سپوٹے کے، چوتھے سے فالسے کے، اور چھٹے سے شہتوت وغیرہ کے بہ کثرت درخت نظر آئے جو حسب معمول نیچے سے اوپر تک بالکل ہی خشک تھے۔ میوے درختوں پر موجود تھے لیکن بالکل سوکھے ہوئے تھے۔

غرض کہ اس طرح میں نے گیارہ بارہ دری کا معائنہ کیا اور ہزارہا قسم کے درخت جن کو میں نے زندگی میں کبھی دیکھا تھا یا جن کی تصاویر جغرافیہ کی کتابوں میں کہیں نظر سے گزری تھیں۔ میں نے دیکھ ڈالے، مثلاً شاہ بلوط، صنوبر، شیشم ساگوان، برگد، تاڑ، ناریل، ساگو کے درختوں کے علاوہ بہت اقسام کے کروٹن، بہت اقسام کے پام، بہت اقسام کے سرو کے درخت اور پودے ہزارہا کی تعداد میں نظر سے گزرے، حتیٰ کہ چیل تک مجھے نظر آئی۔ مگر سب کی ایک ہی کیفیت تھی یعنی سب جڑ سے لے کر چوٹی تک سوکھے تھے۔ بالکل سوکھے۔ کسی میں بھی ذرا سی تراوٹ نہیں پائی جاتی تھی۔ چودھویں کے چاند کی روشنی اس سوکھے باغ میں عجب یاس انگیز اثر پیدا کر رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس سوکھے باغ کا ہر پتہ کل من علیہا فان کا زبان حال سے ورد کر رہا ہے۔

دیر تک گھومنے کے بعد آخر میں بارہویں بارہ دری میں داخل ہوا۔ یہ بارہ دری سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھی اور بہت حسین تھی۔ چودھویں رات کی چاندنی میں وہ ایک دلہن کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں بلا تامل اس میں داخل ہو گیا اور ہر دروازے سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ یہاں مجھے اور ہی قسم کے مناظر نظر آئے۔

ہر دروازے کے سامنے ایک وسیع حوض موجود تھا۔ جس میں سونے کے سکے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے کئی قسم کے سکوں کو اچھی طرح پہچان لیا۔ کیوں کہ چودھویں رات کا چاند ضیا باری کر رہا تھا۔ جب اس کی روشنی ان سکوں پر پڑتی تھی تو بس آنکھ جھپک جاتی تھی۔ بعض ایسے سکے بھی نظر آئے جن کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شائد تصاویر میں دیکھا ہو مگر اس وقت خیال نہ آیا کہ وہ کس ملک کے ہیں۔ غرض کہ اس حسین وجمیل بارہ دری کے گرد بارہ حوض تھے اور ہر حوض میں کسی نہ کسی ملک کے سونے کے سکے بھرے ہوئے تھے۔ میں دل میں بہت خوش ہوا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں ضرور بادشاہ بن جاؤں گا۔ اس سے بڑا خزانہ تو شائد قارون کے پاس بھی نہ ہوگا۔ بارہ وسیع حوض سونے کے سکوں سے بھرے ہوئے!

دفعتاً خیال آیا کہ بارہ دری کو اندر کی جانب سے بھی دیکھ لینا چاہیے کیونکہ میں اب تک ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک اور دوسرے سے تیسرے تک بس اسی طرح گھومتے رہا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے اندر کی جانب نظریں دوڑائیں۔ چاند کی دھیمی روشنی میں مجھے اس بارہ دری کے وسط میں ایک اونچا گول چبوترہ نظر آیا جو چمکتے ہوئے سنگ سیاہ کا بنا ہوا تھا۔ میں اس کی جانب بڑھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اس چبوترے پر بڑے سلیقے سے بارہ تاج رکھے ہوئے نظر آئے جن میں سے ہر تاج میں ان گنت ہیرے اور جواہرات جڑے تھے۔ میں آگے بڑھا اپنے سر سے ٹوپی اتاری اور ایک ایک تاج کو اٹھا کر اپنے سر پر رکھنے لگا۔ مگر کوئی بھی تاج میرے سر پر ٹھیک نہ بیٹھا۔ کوئی تو بہت ڈھیلا تھا کوئی بہت تنگ۔ کوئی اس قدر وزنی تھا کہ اس کے وزن سے گردن ٹوٹنے لگی۔ کوئی اتنا پھلکا تھا کہ سر پر آتا ہی نہیں تھا۔ میں نے بارہ تاج اپنے سر پر

رکھے اور پھر اتار ڈالے اور اس کے بعد اپنی رومی ٹوپی سر پر رکھ لی۔ دل میں کہا ان تاجوں کے مقابلہ میں یہ کتنی سبک اور نرم ہے اور میرے سر پر ٹھیک بھی آتی ہے۔ اچانک چودھویں رات کا چاند بارہویں دروازے کے مقابل آگیا اور اس کی روشنی ایک سیلاب کی طرح اندر داخل ہوئی۔ میں نے اس روشنی میں دیکھا کہ ان تاجوں کے گرد ایک زبردست اژدہا حلقہ ڈالے پڑا ہے اور اپنی منحوس اور بدرنگ بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے گھور رہا ہے۔

وہ اتنا عظیم الہیئت اور خوفناک تھا کہ اس کو دیکھتے ہی میرے حواس گم ہو گئے اور میں بدحواسی کے عالم میں ایک دروازے کی طرف بھاگا جب میں اس دروازے سے باہر نکلنا چاہا تو دیکھا کہ حوض کے وسط میں سونے کے سکوں کے ڈھیر پر ایک بڑا ناگ سوپ کی طرح پھن پھیلائے تقریبًا ایک گز بلند ہو کر پھنکارے مار رہا ہے۔ میں تیزی سے واپس پلٹا اور دوسرے دروازے سے باہر نکلنا چاہا۔ وہاں بھی یہی منظر نظر آیا۔ میں تیسرے پھر چوتھے پھر پانچویں پھر چھٹے دروازے کی طرف بھاگا اور باہر نکلنا چاہا لیکن ہر جگہ وہی تماشا دکھائی دیا۔ غرض کہ جب بارہویں دروازے پر بھی یہی معاملہ پیش ہوا تو میں انتہائی خوف کے عالم میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور بڑے خشوع و خضوع سے دونوں ہاتھ بلند کرکے کہا "میں ان بارہ تاجوں کو اور ان بارہ حوضوں کے خزانے کو نہیں چاہتا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ مل جائے۔"

جیسے ہی میری زبان سے یہ الفاظ نکلے میں نے دیکھا کہ دور ——— بہت دور ایک ریت کا ٹیلہ ہے جس پر ایک سرسبز و شاداب کھجور کا درخت تنہا کھڑا ہے۔ چودھویں رات کا چاند اس کے پتوں کی آڑ سے ضیاباری کر رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی میں بے تحاشا بھاگا۔ مجھے اس سوپ کی طرح پھن پھیلائے ہوئے ناگ کا خیال بھی نہیں آیا۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں معلوم نہیں کب تک بھاگتا رہا۔ صرف اتنا خیال ہے کہ کھجور کے درخت سے میں نے اپنی نظریں ہٹنے نہیں دیں۔ جب ہوش آیا تو دیکھتا ہوں کہ میرے دونوں ہاتھ کھجور کے پیڑ کے گرد حلقہ کئے ہوئے ہیں اور میں ریت کے ٹیلے پر بیٹھا ہوا ہوں۔ مشرق سے آفتاب نمودار ہو رہا ہے۔ اس کی دوشیزہ کرنیں کھجور کے پتوں پر چمک رہی ہیں۔

معلوم نہیں کیوں میں نے گردن پھرا کر سوکھے باغ کی طرف نگاہ دوڑائی وہاں عجیب منظر نظر آیا۔ سارا سوکھا باغ جل رہا تھا۔ بڑے بڑے عظیم الشان سوکھے درخت دھڑا دھڑ گر رہے تھے۔ شعلے ہزار ہا فٹ بلند ہو رہے تھے۔ اور دھوئیں سے پورا نصف مغربی کرہ تیرہ و تار تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں پھر جو کھولیں تو مشرق کی جانب آفتاب بلند ہو چکا اور ریت کا ذرہ ذرہ الماس کی طرح چمک رہا تھا۔

محمد جلال الدین اشک

اطلاع۔— جن خریدار اصحاب کا چندہ ختم ہو چکا وہ براہ کرم تقسیم کنندہ سے مطبوعہ رسید حاصل فرما کر رقم عنایت فرمائیں۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ تک دی جائے ورنہ تعمیل ارشاد میں دقت ہوتی ہے۔

غزل

اگر قائم محبت کی کوئی معیار ہو جائے
محبت کرنے والو! زندگی دشوار ہو جائے
ستانا اور ایسی بے لحاظی کا ستانا کیا
کہ ہر مجبور تم سے ٹوٹ کر مختار ہو جائے
جو کرتے بھی ہیں وہ اقرار تو اس ڈھب سے کرتے ہیں
کہ جب چاہیں وہی اقرار صاف انکار ہو جائے
اگر سمجھے کہ عقبیٰ اور دنیا ایک ہی کی ہیں
تو ہر عقبیٰ کا طالب آج دنیا دار ہو جائے
نظر کیا وہ نظر، حد جس نظر کی آسماں ٹھیرے
نظر تو وہ نظر! جو آسماں کے پار ہو جائے
بہارِ باغ دنیا دیکھنے والو! روش بدلو
نہ ہو ایسا کہ ہر کانٹا گلے کا ہار ہو جائے
ہوا ترکا، الٰہی! ذرّہ ذرّہ دہر کا جاگا
مری سوئی ہوئی تقدیر بھی بیدار ہو جائے
تمنا ہے، انھیں دیکھوں تو ایسے روپ میں دیکھوں
کہ بس میری نظر ناقابلِ دیدار ہو جائے
صفیؔ وہ شعر ہی کلھے کو رکھوں اپنے دیواں میں
سراسر جس کے مطلب سے انھیں انکار ہو جائے

صفیؔ (اورنگ آبادی)

ساقی

جام ہاں ایک چھلکتا ہوا جام اے ساقی
زندگی ہے ابھی مرغِ تہِ دام اے ساقی
چند روز اور یونہی گلکدۂ مستی میں ——
چھوڑ دے عقل کو بے قید و زمام اے ساقی
مجھ کو آوارۂ افلاک بنا دے نہ کہیں
یہ ترا نغمۂ آسودہ خرام اے ساقی
تری آنکھوں کی چھلکتی ہوئی مے کے آگے
کون لے ساغرِ گلفام کا نام اے ساقی
اُف یہ دنیا کی ہوس کوش نگاہوں کا ہجوم
گم نہ ہو جائے کہیں عصمتِ جام اے ساقی
اب بھی تابندگیٔ فکر و خرد کے باوصف
دستِ ظلمت میں ہے جلووں کی زمام اے ساقی
کشمکش زیست کی ہے اصلِ تمنائے شباب
مجھ کو درکار نہیں عیشِ قیام اے ساقی
قلبِ کونین میں آثارِ سحر سے پہلے!
پر فشاں کب نہ تھی تاریکیٔ شام اے ساقی

لطیف ساجد (عثمانیہ)

ریڈیم کے والدین

ایک نوجوان پیرس کے شاہی کتب خانہ سے ابھی ابھی نکلا ہے۔ جو اپنے رنگ روپ اور خط و خال سے فرانسیسی معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک حسین دوشیزہ سے مخاطب ہے۔ جو شہر وارسا (پولینڈ) سے سائنس کی تعلیم کے واسطے یہاں آئی ہے۔
اس کا نام سیرا ہے اور نوجوان طالب علم کا نام ایم۔ پیری۔ کیوری ہے۔

پیری۔ تو آپ پیرس میں سائنس کی تعلیم مکمل کرنے آئی ہیں۔

سیرا۔ جی! اگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی سائنس کے بہت دلدادہ ہیں۔ میں نے آپ کو ہمیشہ سائنس ہی کی کتابیں پڑھتے پایا ہے۔

پ۔ میں فرانس کے صدر مقام میں محض سائنس کی تعلیم کے واسطے وارد ہوں اور تجربات بھی کر رہا ہوں۔

س خوب! سائنس، بے انتہا مفید چیز ہے اور اس سے دنیا کو غیر معمولی فائدہ پہنچا ہے۔ اور آئندہ اور بھی زیادہ مفاد یقیناً پہنچے گا۔

پ۔ اور نقصان بھی تو غیر معمولی پہنچ رہا ہے۔

س۔ آہ! یہ انسان کی شامتِ اعمال ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ یا اس کا سدباب ہو جائے۔

اب سیرا اور پیری کیوری کی باہم شادی ہو چکی ہے۔ شناسائی اور بار بار کی ملاقات نے محبت و عشق کی شکل اختیار کر لی جس کا نتیجہ ازدواج نکلا وہ دونوں سائنس کے متعلم اور شیدا تھے۔ پس ان کی یہ ہم رنگی اور ہم مذاقی بھی ان کے دائمی اتحاد کا ایک زبردست ذریعہ بن گئی۔

—— ۳ ——

پروفیسر ایم پیری کیوری اور ان کی بیگم مادام کیوری ریڈیو ایکٹو عناصر کی تلاش۔ مطالعے اور تجربات میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

—— ریڈیو ایکٹو سے ایسی دھات مراد ہے جس سے ایسی شعاعیں نکلتی ہوں جن کے ذریعہ گیسوں میں، برقی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

پروفیسر۔ مجھے یقین ہے کہ پچ بلینڈ دھات میں یورنیم سے بھی زیادہ کی قوی دھات کے ذرے شامل ہیں۔

مادام کیوری۔ میرا خیال بھی یہی ہے، مسٹر بیکرل نے پچ بلینڈ دھات، دوسری دھاتوں سے نکال کر گویا جدید باب تحقیق کھول دیا ہے۔ وہ اپنی کارگاہ میں ایسی اشیا کے تجربات کرتا رہا جو بظاہر گرم ہوئے بغیر ہی چمکتی ہیں۔ یعنی فاس فورسینٹ!

مگر اس نے اسی اثنا میں ایک جدید دھات یورنیم اوکسائڈ بھی ڈھونڈ نکالی۔ اوہ! اس دھات کا رنگ کس قدر میلا ہے۔

پ۔ بیکرل نے ایورنیم اوکسائڈ کے اندر، اشعۂ آفتاب داخل کر کے اسے فاسفورسینٹ (یعنی گرم ہوئے بغیر چمکنے والی دھات) بنا دیا ——

م۔ اور بیکرل نے اس کے بعد۔ یہ تحریر کرنا چاہا کہ یورنیم اوکسائڈ کا اثر۔ فوٹو پلیٹ پر کیا پڑتا ہے —— اس نے پلیٹ بارش کے اثر سے بچانے کے واسطے میز کی دراز میں رکھ دی۔ مگر چند روز بعد جب وہ پلیٹ باہر نکالی تو بیکرل، یہ دیکھ کر تصویر حیرت بن گیا کہ پلیٹ پر خوب اور نہایت تیز عکس نمایاں ہو گیا ہے۔

یعنی دھوپ میں رکھے جانے کی بہ نسبت زیادہ عیاں و نمایاں ۔

پ ۔ یہ کامیابی اور دریافت گویا اتفاقیہ ہوئی ۔

م ۔ سائنس کی بیشتر دریافتیں، اتفاقاً ہی ہوتی رہی ہیں ۔

پ ۔ بہرحال بیکرل، اسی طرح ''پچ بلینڈ'' میں سے یورنیم نکال لیتے ہیں کامیاب ہوئے اور انھوں نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ ــــ ''یورنیم ریڈیو ایکٹیو ہے''، یعنی اس میں سے برقی گیس گرم کئے بغیر ہی نکلتی ہے ــــ مگر اب ہم اپنے تازہ تجربوں سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ــــ پچ بلینڈ کے بعض اجزا، یورنیم، سے بھی زیادہ قوی ہیں ۔

م ۔ اور اس سے ثابت ہوا کہ ــــ پچ بلینڈ میں یورنیم سے بھی زیادہ قوی کسی نامعلوم دھات کے ذرے شامل ہیں ۔

پ ۔ مگر یہ بات ابھی تھیوری ہی تھیوری ہے

م ۔ مگر ہم دنیائے سائنس کو یہ تماشا جلد ہی عملی شکل میں دکھا سکیں گے ۔ ہماری کامیابی یقینی ہے ۔

پ ۔ اب ضرورت ہے کہ ہم یورنیم کی کانوں سے فضول اور بیکار مادہ منگوا کر اسے پگھلانے اور ڈھالنے میں مصروف ہوجائیں ہمیں یہ تجربہ مدتوں کرنا پڑے گا ۔

م ۔ تاہم کامیابی یقینی ہے ۔

۴

پروفیسر کیوری، مدت کی محنت اور تجربے کے بعد کامیاب ہوگیا ہے مگر اس میں مادم کیوری بھی نصف کی حصہ دار ہے ۔ چنانچہ ان دونوں نے یورنیم دھات کو کانوں کے بیکار مادے میں ایک نئی دھات ۔ اپنے قیاس اور اپنی تھیوری کے مطابق نکال لی ہے ۔ اور اس کا نام مادم کے وطن پولینڈ کے تعلق اور نسبت سے ''پولونیم'' رکھا ہے ۔ یہ دھات یورنیم سے مشابہ ہے ۔

مگر پروفیسر اور ان کی بیگم، اب بھی فلزات کے پگھلانے اور دیگر اعمال و تجارب کیمیاوی میں مصروف و محو ہیں بقول افسانہ از افسانہ می خیزد، ان کو امید ہے کہ وہ ایک دیگر جدید دھات دریافت کرسکیں گے جو نہایت کارآمد اور قیمتی ثابت ہوگی ۔

۵

پیرس کے سائنس کلب کی عظیم الشان عمارت میں ایک جلسہ ہونے والا ہے ۔ ہال، سامعین سے پُر ہوچکا ہے مقرر کا انتظار ہے ــــ لو وہ بھی آگئے ۔ ہیں، یہ تو پروفیسر کیوری ہیں ۔ اور ان کے ہمراہ مادم کیوری بھی ہیں ۔ ان کی محترم رفیق حیات !

پروفیسر صاحب ۔ ایک نہایت اہم اور قیمتی دھات، ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوچکے ہیں جس کا نام انھوں نے ''ریڈیم'' رکھا ہے اور وہ اس وقت اسی کے متعلق تقریر کرنے والے ہیں ۔ لو وہ کھڑے ہوگئے ۔ آپ بھی ان کا لکچر بغور سنئے گا ۔

تقریر ۔

معزز صدر اور علم دوست حاضرین و سامعین !

آپ لوگوں کو یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ کچھ مدت پیشتر ہمارے ایک محترم ہم وطن ''مانیشور بیکرل'' نے اول ایک ''پچ بلینڈ'' نامی دھات دریافت کی ۔ اور پھر یورنیم اوکسائڈ نام کی دھات ! جس میں سے برقی گیس نکلتی تھی ۔

ہم نے یعنی میں نے اور میری رفیق حیات نے پچ بلینڈ پر مزید تجربے کئے تو معلوم ہوا کہ ــــ پچ بلینڈ کے بعض اجزا یورنیم سے بھی زیادہ قوی اور اہم ہیں اور اس کے معنی یہ تھے کہ ــــ پچ بلینڈ میں یورنیم سے زیادہ قوی دھات کے ذرات بھی

شامل ہیں۔ پس ہم نے اسی تجربوری کی روشنی میں پولونیم دھات دریافت کی۔

لیکن ہم قانع اس پر بھی نہیں ہوئے چنانچہ متواتر تحقیقات و تجربات میں محو رہے۔ حتیٰ کہ ہماری محنت ٹھکانے لگی اور ہم کو اس کار اہم کا علم۔ ایک نہایت اہم اور قیمتی دھات کی شکل میں مل گیا۔ جس کا نام ہم نے ریڈیم رکھا ہے بعض حاضرین خوشی کی تالیاں بجاتے ہیں۔

پروفیسر۔ حضرات! یہ عجیب الخواص دھات، کم یاب، مگر نہایت قیمتی اور اہم ہے۔ اگرچہ دیکھنے میں نمک کی مانند سپید سفوف ہے، مگر اس کی کم یابی کی کیفیت یہ ہے کہ یہ دنیا بھر میں صرف اس قدر ہے جس قدر سمندر میں سونا! اس کی مقدار ابھی بہت کم ملی ہے یعنی صرف اتنی جو چند چمچوں میں آسکے۔ اسی واسطے وہ سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ یعنی ایک تولہ ریڈیم کی قیمت ہزاروں روپے ہے۔

حضرات! ریڈیم دیگر دھاتوں میں ملی جلی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی تلاش کا سادہ طریق یہ ہے کہ جس دھات یا مادے کے متعلق یہ خیال ہو کہ شاید اس میں ریڈیم شامل ہو تو فوٹو گرافر کی ایک پلیٹ لے کر اسے سیاہ کاغذ کی دو تہوں میں لپیٹ دو اور پھر اس کے اوپر بٹن یا کوئی اور چھوٹی چیز رکھ دو۔ اور پھر اس کے ٹھیک اوپر وہ دھات رکھ دو۔ جس کی آزمائش منظور ہے۔ اور ان چیزوں کو صندوق میں بند کر کے باہر کی روشنی سے بچاؤ اور پھر تیسرے روز حسب قاعدہ پلیٹ ڈیولپ (مکمل) کرو۔ پس اگر پلیٹ پر بٹن وغیرہ کی تصویر نظر آئے تو وہ اس امر کا ثبوت ہوگا کہ دھات میں ریڈیم کے ذرات شامل ہیں۔ خواہ بہت ہی کم ہوں اور وہ عموماً بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لئے ریڈیم کے ذرات کسی مادے یا دھات سے نکالنا، کوہ کندن و کاہ برآوردن سے کم نہیں!

دو پونڈ ریڈیم حاصل کرنے کے لئے پانچ ہزار ٹن (ایک ٹن - ۲۸ من) مادہ کھنگالنا پڑتا ہے۔ تھوڑی سی ریڈیم کے لئے بھی مشینوں کو مال گاڑی بھر دھات پگھلا کر ہزاروں مرحلوں سے گزرنا ۔ نیز شہنشاہی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ تاہم، ریڈیم اسی طریق سے حاصل کی گئی اور کی جائے گی۔ کیونکہ وہ بیش بہا شئے ہے۔

ایک رتی ریڈیم بھی اس کے مالک کو لکھ پتی بنا سکتی ہے اور تلاش۔ محنت پسندی اور مسلسل و مستقل کوشش ہی سے ایسی نایاب چیزیں مل سکتی ہیں۔

حضرات! ریڈیم، سونے سے زیادہ قیمتی ہے، یعنی بیش بہا دولت ہے یہ دھات تاریک حجرے میں مثل اخگر چمکتی اور ماحول روشن کر دیتی ہے۔ گویا گوہر شب چراغ ہے اس میں سے حرارت اور روشنی متواتر نکلتی ہے مگر اس کا وزن بہت ہی کم گھٹتا ہے۔ ریڈیم کی ایک چنگاری۔ دن رات۔ مدتوں تک حرارت اور روشنی خارج کرتے رہنے کے باوجود بدستور شعلہ ریز رہتی ہے۔

ایک پونڈ، نصف سیر سے کچھ کم، ریڈیم، ایک گھنٹے میں ایک پونڈ برف آسانی سے پگھلا سکتی ہے اور یہی مقدار طویل مدت تک یہی عمل کر سکتی ہے۔ وہ ہمیشہ گویا متحرک رہتی ہے۔ اگر یہ عجیب دھات کسی انگیٹھی یا بھٹی کے اندر کافی مقدار میں رکھ دی جائے تو پھر اس میں ایندھن ڈالنے یا صاف کرنے کی ضرورت صدیوں تک نہیں ہوتی ہے (چیرز)

معزز سامعین! جو چیز ریڈیم سے چھو جائے وہ بھی قریب قریب ریڈ ایکٹیو بن جاتی ہے! وہ بھی اس سے اثر حاصل کرلیتی ہے۔ چنانچہ اس میں بھی ریڈیم کے خواص و اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔۔ ایک شخص نے کاغذی پٹھے (مقوے) کے بکس میں سے ریڈیم سے پُر نلکیاں نکال لیں اور بکس پھینک دیا۔ مگر بکس کئی روز تک چمکتا رہا۔

ہر چیز ریڈیم مس کرکے نئی طاقت حاصل کرلیتی ہے خاص کر تاریکی میں چمکنے کی قوت۔ بجلی گھروں کے ان کمروں میں جہاں بہت سے بٹن (سوئچ) ہوں (اگر کمرے تاریک ہوں) اگر ان سوئچوں پر ریڈیم سے متاثر کردہ لوشن لگا دیا جائے تو وہ اندھیرے میں چمکتے ہیں! اور آدمی وہاں پہنچ کر اور سوئچ دبا کر قمقمہ (بلب) روشن کرلیتا ہے اور تاریکی میں ٹٹولنے اور بجلی کی لپیٹ میں آجانے سے محفوظ رہتا ہے۔

ریڈیم لوشن، آئندہ زمانے میں گھڑیوں اور کلاکوں وغیرہ میں بھی لگایا جائے گا، تاکہ وہ شب تاریک میں بھی وقت دکھا سکیں!

یہ عرق مستقبل زمانے میں شفاخانے میں رکھی ہوئی۔ پائزن (زہر) کی شیشوں کے لیبلوں پر بھی لگایا جائے گا۔ تاکہ زہر، نادانستہ طور پر غلطی سے تاریکی کی وجہ سے نہ استعمال ہو جائے۔ یعنی زہر کی بوتلیں نمایاں اور ممیز رہیں۔

ریڈیم آئندہ زمانے میں قفل اور چابی کے منہ اور گڑیوں میں بھی لگائی جائے گی۔

حضرات! اب میں ایک اہم نکتے کی طرف آتا ہوں۔

آوازیں ارشاد! ارشاد!

پروفیسر۔ اس دھات کی دریافت نے۔ ثابت کر دیا ہے کہ ایٹم (جزو لایتجزیٰ) بجائے خود گویا نظام شمسی ہے۔ جو ایک مرکز (قطب) کے گرد گردش کرتا ہے!۔۔ اور ذرّے کے اندر لازوال اور لافانی طاقت ہے۔

اجتماع، معینہ مراسم کے بعد حسن اختتام کو پہنچتا ہے۔

(۶)

۱۹۲۳ء میں ایک تقریر۔

حضرات! پروفیسر کیوری کی توقعات حرف بحرف پوری ہوئیں بلکہ ریڈیم سے دنیا کو موجد کے قیاس سے بھی زیادہ مفاد پہنچے اور اس انوکھی دھات کے دیگر خواص معلوم کئے گئے جو سب کے سب مفید ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہیں

ریڈیم دھات، دنیا میں سب سے زیادہ (ریڈیو ایکٹو) ہے۔ یعنی اس کے اندر سے زیادہ سے زیادہ ایسی شعاعیں نکلتی ہیں جن سے گیسوں میں برقی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ ریڈیم اب تک صرف چمچہ بھر ملی ہے۔ بعض گھڑیاں اور کلاک تاریکی میں بھی وقت دکھاتے ہیں یعنی ان کے ڈائل یا ہندسے روشن ہوتے ہیں۔ تاہم ان کی قیمتیں دس پندرہ روپے سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ مگر اس کے باوجود کہا جاتا اور سمجھا جاتا ہے کہ ان میں ریڈیم لگی ہوئی ہے چنانچہ لاہور۔ دہلی وغیرہ شہروں کے ساعت ساز (واچ میکر) جنگ سے پیشتر دو ڈھائی روپے لے کر معمولی گھڑیوں کو بھی تاریکی میں وقت نما بنا دیا کرتے۔ اور دعویٰ کرتے تھے کہ ان میں ریڈیم لگا دی گئی ہے حالانکہ ریڈیم سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گھڑیوں پر چمکنے والی چیز ریڈیم نہیں۔ بلکہ سلفیڈ آف زنک (صاف شدہ جست دھات) ہوتی ہے۔ اور اسی کے اوپر ریڈیم کا نہایت ہلکا سا نشان لگا دیا جاتا ہے۔ جس سے جست چمک اٹھتا ہے۔ سوئی

کی نوک کی برابر ریڈیم، لاکھوں کے ڈائیل چمکا دیتی ہے ۔
اگر اس قسم کی گھڑیوں کا ڈائیل خوردبین سے دیکھا جائے
تو اس پر ریڈیم کے بے شمار باریک ذرات نہایت تیزی سے
تھرکتے نظر آئیں گے! وہ ذرے ایک سکنڈ میں قریب قریب
دو لاکھ بار تھرکتے ہیں۔ اور اس طرح ریڈیم گویا جست کی
سطح پر لگاتار حملے کرکے اسے روشن کر دیتی ہے۔ گو ریڈیم
کی عمر بڑی ہے۔ مگر جست ریڈیم کے حملوں سے گھس کر
اڑ جاتا ہے۔ بہرحال گھڑیوں میں ریڈیم لگنے کی پروفیسر
کیوری کی پیشین گوئی پوری ہو چکی ہے،

ریڈیم، زہروں کی شیشیوں کے لیبلوں، قفل کنجیوں
کے منہ اور بجلی کے سوئچوں وغیرہ پر بھی حسب پیشین گوئی
لگائی گئی ہے اور لگائی جا رہی ہے۔

ریڈیم، کل دنیا میں شاید ڈھائی تولے سے زیادہ
نہیں۔ مگر اس میں اضافہ گویا خالص منافع ہے یعنی
موجودہ مقدار ہی غیر فانی ہے چنانچہ وہ سولہ سو سال میں
اپنی طاقت صرف نصف اور (۳۲۰۰ سال میں) تین چوتھائی
(۳/۴) کھوتی ہے یعنی اس طویل مدت کے بعد بھی چوتھائی حصہ
باقی رہ جائے گا۔ اور وہ اس طرح بیس ہزار برس تک کارآمد
قایم اور زندہ رہ سکتی ہے اور رہے گی البتہ اس طویل
مدت کے بعد ریڈیم کے بجائے محض سیسہ دھات رہ جائے گی

ریڈیم کے وجود نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ — فنا
(موت) درحقیقت کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ مادے میں تبدیل
ہو جانے کی قوت بے حد ہے۔

ریڈیم طب اور ڈاکٹری میں بھی بڑی کارآمد ثابت
ہو چکی ہے۔ چنانچہ ورم، دنبل، پھوڑے، پھنسی اور سرطان
وغیرہ کا علاج بے خطا ہے! اور اگر یہ بیماری بالکل دفع نہ
کر دے تو درد، تکلیف میں تو ضرور تخفیف کر دیتی ہے۔ یورپ،
امریکہ، اور روس کے شہروں میں ایک ایک ریڈیم ہسپتال
ضرور موجود ہے — مگر ان اوصاف و حالات کے باوجود ریڈیم
نقصان بھی کچھ کم نہیں پہنچاتی خصوصاً جانداروں کو چنانچہ وہ
نہ صرف خطرناک بلکہ قاتل ہے۔ ریڈیم جس زمین کے
اندر ایک سیر دھنستی ہو اس کے قریب کے آدمیوں کی
موت یقینی ہے۔ مگر حملۂ موت دفعتاً نہیں ہوتا۔ بلکہ آغاز
میں تو خفیف سی تکلیف یا درد تک محسوس نہیں ہوتا تاہم
جسم سے چھو جانے کے دو ہفتے کے اندر اندر ہی آدمی کی جلد
پھٹنے اور آنکھیں جواب دینے لگتی ہیں اور پھر موت آموجود
ہوتی ہے۔

ریڈیم دھات، جس قدر دنیا میں موجود ہے، وہ
انسانوں کو بہت نقصان پہنچا چکی ہے ایک مقرر کی جیب میں
نلکی کے اندر ریڈیم موجود تھا۔ وہ ریڈیم تشریح و تفصیلی تقریر
کے واسطے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مگر اس کے بدن کی جلد ریڈیم
کے اثر سے چوتھے ہفتے سرخ ہو کر رفتہ رفتہ سانپ کی کیچلی کی
مانند اترنے لگی جسم میں گہرا اور تکلیف دہ زخم پڑ گیا، جو کئی
ماہ کے معالجے سے مندمل ہوا۔

ڈاکٹروں نے ریڈیم کے جو تجربات چوہوں، گنی پگ
اور دیگر چھوٹے حیوانوں پر کئے تو ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ان کو
ریڈیم کی روشنی میں کافی دیر تک رکھا جائے تو ان کے
بال اور جسم کی کھال نیز بینائی جاتی رہے گی اور پھر
موت ہو جائے گی سائنس دانوں کو ریڈیم سے بڑی توقعات
ہیں مستقبل کے متعلق بہت سے قیاسات اور نظریات ہیں۔
چنانچہ ان کو یقین ہے کہ اس سے دیگر غیر معمولی مفاد ہوں گے۔
اس کے ذریعہ مادے کے بہت سے نامعلوم خواص اور

اصول معلوم ہوجائیں گے۔ اس کی مدد سے عناصر تبدیل ہوسکیں گے۔ ادنیٰ دھاتوں سے سونا بنایا جائے گا۔ گو ریڈیم سے سونا اب بھی بنایا جاسکتا ہے مگر اس کی لاگت موجودہ سونے سے زیادہ اور اس واسطے قیمت بھی بہت زیادہ ہوگی۔ ریڈیم نے ثابت کردیا ہے کہ سونا بسیط (مفرد) نہیں بلکہ مرکب ہے۔ چنانچہ ریڈیم اس کا ایک عنصر ہے۔

ریڈیم ہی کے ذریعہ (اہم جزو لاینتجزیٰ) کے اہم راز کا انکشاف ہوگا اور کچھ شک نہیں کہ اس کے وسیلے سے نظام عالم کے بہت سے سربستہ راز معلوم ہوں گے اور کون جانتا ہے کہ کیا کچھ ہوکر رہے گا۔

ریڈیم، زخم پیدا کرتی ہے، مگر زخم کا علاج بھی ہے.... یعنی نشتر بھی ہے اور مرہم بھی یہ موت لاتی ہے۔ پس کیا عجب ہے کہ کبھی علاج المثل (ہومیوپیتھک) کے اصول کے مطابق یہ زہر (ریڈیم) تریاق موت بھی ثابت ہوجائے۔

پروفیسر ای۔ او۔ لارنس آف کیلی فورنیا (امریکا) یونیورسٹی نے نمک سے مصنوعی (نقلی) ریڈیم تیار کی۔ جو ادویہ میں اصل ریڈیم کے کام اور فائدہ دیتی ہے۔ تاہم اصل اصل ہے اور نقل نقل۔

یقین کیا جاتا ہے کہ ریڈیم کے متعلق مزید تحقیقات۔ زیادہ اہم اور مفید انکشافات کرے گی۔ سائنس داں اس سلسلے میں مصروف کار ہیں تحقیقات کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوگا۔

اگرچہ جنگ عالمگیر نے رخنہ اندازی کی ہے۔ تاہم انسان کی تلاش و جستجو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اور نہ ہونی چاہئے کہ شرف انسانیت اور تقاضائے بشریت یہی ہے۔

یہ افسانہ ختم اگر آپ اسے افسانہ کہنے کو تیار ہوں، کیا رائے ہے آپ کی؟

منظفر حسین اظہر (دہلوی)

غزل

کشمکشِ حیات میں نغمۂ آبشار کیا
موجِ شفق کا رنگ کیا؟ صبحِ فلک نگار کیا

گل میں ہے تازگی کہاں غنچہ ہے جلوہ دار کیا
میرا چمن ہی جب نہیں، کیف فزا بہار کیا

رسمِ جنوں کی پیروی، دستِ جنوں شعار کیا
فصلِ بہار کے لئے دامنِ تار تار کیا

اب نہ وہ عہدِ فصلِ گل اب نہ وہ کیف زائیاں
کھل کے کرے گا دل میں پھر غنچۂ یادیار کیا

کیسا نظارہ کس کو شوق، اپنی نظر ہی جب نہیں
حسن کی دید کے لئے۔ دیدۂ مستعار کیا

کاوشِ ضبطِ درد نے، مہلتِ بےخودی نہ دی
عشق کے سوز و ساز میں چین کہاں قرار کیا

تلخیٔ غم بجا مگر یہ بھی تو ہے عطائے دوست
پھر یہ ملال و سوزِ غم مجھ کو ہو ناگوار کیا

تیرے بغیر تنگ ہیں کون و مکاں کی وسعتیں
میرا جہاں ہیں بن تیرے حیطۂ اقتدار کیا

پھیل رہی ہیں دہر میں حسن کی خوش ادائیاں
وجدیؔ عشوہ باز پھر کاہشِ انتظار کیا

وجدی الحسینی

زمانۂ جنگ کی شادی

اس سے قبل کہ میں اپنے موضوع کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں اپنا تعارف کرانا ضروری سمجھتی ہوں اس لئے کہ کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو مجھ اجنبی کا ادبی دنیا میں تعارف کرائے اور میں نے ڈرتے ڈرتے پہلی بار اس میں قدم رکھا ہے۔

میں آدم و حوّا کی بیٹی ہوں دنیا میرا وطن اور دنیا کے تمام مذاہب کی اعلیٰ تعلیم میرا مذہب ہے۔ اپنا نام بتلانا ضروری نہیں سمجھتی گمنامی ہی میں رہنا پسند کرتی ہوں۔ اگر کسی کو میرا نام جاننے کی خواہش ہو تو وہ خود تلاش کر لے۔ یہ مشکل کام نہیں ڈھونڈنے سے خدا بھی ملتا ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں ایک جاہل عورت ہوں کیونکہ کسی ادارے کی ڈگری نہیں رکھتی ہوں لیکن خدا نے مجھے سوچنے اور سمجھنے کی استطاعت بخشی ہے اور ایک دردمند دل عطا فرمایا ہے اس لئے چند خیالات جو میرے ذہن میں موجزن ہوئے ہیں انہیں پیش کرکے اپنے ضمیر کو یہ تسکین دینا چاہتی ہوں کہ میں نے انسانیت کا ایک ادنیٰ فرض ادا کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ میری یہ چھوٹی سی خدمت ملک کے لئے کسی دن کارآمد ثابت ہو۔

خدا بھلا کرے اس جنگ کا کہ اس نے دنیا کے امن و چین کو آلام و پریشانیوں سے بدل دیا ہے۔ مسرت و شادمانی کی جگہ فکر و تجسس نے لی ہے۔ تمام عالم میں سنسنی سی پھیلی ہوئی ہے تقریباً تین چوتھائی کرۂ ارض میں خون کے دریا بہہ رہے ہیں۔ جو ممالک جنگ سے بری ہیں وہاں بھی کھانے کو کھانا اور پہننے کو کپڑا بمشکل دستیاب ہو رہا ہے۔ امیر و غریب سب آفت میں مبتلا ہیں جن کے دسترخوان پر روزانہ پلاؤ، متنجن، نقمی، کباب نظر آتے تھے آج ان کے دسترخوان پر معمولی لوازمات دکھائی دیتے ہیں دعوتیں شاذ اور نپی تلی ہونے لگی ہیں۔ اکثر ایسے بھی لوگ ہیں جنھیں پیٹ بھر کھانے میں بھی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ موٹر نشین حضرات نے سیکل اور ٹانگے میں بیٹھنے کو گوارا کیا ہے۔ کریپ اور جارجٹ کی ساڑیاں پہننے والی خواتین نے سوت کی بنی ہوئی ساڑیوں کو زیب تن کرنے میں عیب نہیں جانا ہے۔ جواہرات، سونے اور چاندی کے زیورات کا خریدنا متوسط طبقے والوں کے لئے تقریباً محال ہو گیا ہے۔ شادیوں میں جہاں ہزار دعوتی بلائے جاتے تھے اور عمدہ کھانے کھلائے جاتے تھے وہاں اب بمشکل پچاس کو دعوت دی جاتی ہے اور جو لوازمات دسترخوان پر چنے جاتے ہیں ان میں بھی بڑی حد تک کمی کر دی گئی ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مہمانوں کی تواضع لیمنڈ سے کی جا کر قناعت کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ جنگ کا زمانہ ہے اور روپے کی قیمت گھٹ گئی ہے۔ لیکن متمدن اقوام نے شادی کے رسومات کی جہلات کو صدیوں پہلے خیرباد کہہ دیا تھا اور اسلام کے رہنماؤں نے اپنے عمل سے یہ بتلا دیا تھا کہ شادی میں کس قدر سادگی برتی جائے اور اسراف سے کس طرح پرہیز کیا جائے۔

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستانیوں نے نہ تو غیر اقوام سے اور نہ خود ان کے مذہبی رہنماؤں کے عمل سے کوئی سبق حاصل کیا۔ آئے دن شادی کی رسومات پر ایک کثیر رقم صرف کی جایا کرتی ہے اور اس کے نتائج قوم کی تباہی کا باعث بن رہے ہیں۔ ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جب جنگ سے قبل ایک لڑکی کی شادی کرنے کے لئے غریب

باپ کو شادی کا قرضہ ادا کرتے برسوں ساہوکار کی دھمکیاں سننی پڑتی تھیں تو اس زمانے میں کیا کچھ مصائب نہ برداشت کرنے ہوتے ہوں گے۔ خوش قسمتی سے اگر کسی کے ایک یا دو اولاد ہو تو اس کو شاید کچھ مدت کے بعد اس ٹیکس کی ادائی سے نجات مل جاتی ہوگی لیکن جس کے یہاں چار پانچ لڑکے اور لڑکیاں ہوں تو ان کی شادی کے قرضے کا بوجھ تو تمام عمر اس کی زندگی کو تلخ کر دیا کرتا ہے اور یقیناً اولاد ان کے حق میں وبال جان ہو جاتی ہے۔ زمانہ بدل گیا۔ گھڑی کے کانٹے آگے بڑھا دئے گئے اور ایک گھنٹہ قبل دن ہونے لگا لیکن ہم نے رسومات میں فرق نہ آنے دیا خواہ ہماری یہ ہٹ دھرمی، تباہی کا باعث کیوں نہ بنی ہو۔ باپ یا بھائی جنگ کے میدان میں جان جوکھوں میں ڈال رکھا ہو اور یہاں بیٹی یا بہن کی شادی رچائی جا رہی ہو تب بھی شادی کی دھوم اور رسومات میں رتی برابر فرق نہ آنے پائے گا۔ جہیز میں وہ سب کچھ دینا لازمی قرار پائے گا جو دادی اور اماں کی شادی کے وقت دیا گیا تھا مثلاً چاندی کا پلنگ اور پائے زیب وغیرہ خواہ سونے اور چاندی کے دام سو گنے کیوں نہ بڑھ گئے ہوں۔ ساچق، مہندی، شب گشت، بازگشت اور چوتھی ان رسومات میں کمی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ خاندان اور دولہا والوں میں ناک رکھنی ضروری ہے۔ دولہا والوں کی طرف سے بھی اتنے ہی جوڑے آنے چاہئیں جتنے کہ بڑی بہن کے دولہا نے لائے تھے۔ اس سے کیا غرض کہ بڑی بہن کے دولہا میں استطاعت تھی اور چھوٹی بہن کے دولہا کی آمدنی کم ہے۔ ساہوکار کے یہاں روپے کی کمی نہیں۔ سود دینے آمادہ ہو جائیے تو رقم میں دشواری ہی نہیں۔ بدقسمتی سے اگر لڑکی والوں نے جہیز میں کمی کی یا رسومات میں فرق آ گیا تو بے چاری دولہن کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے جب کبھی ساس یا نند کو اس بے چاری کے دل پر نشتر لگانے ہوتے ہیں تو کہہ اٹھتی ہیں کہ "بیگم صاحبہ کا دماغ تو دیکھو ایسا کر رہی ہیں جیسے کہ جہیز میں سونے کے پائے زیب ہی تو لائی تھیں" وغیرہ وغیرہ۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جہیز کی کمی کا خمیازہ بے چاری لڑکی کو تمام عمر بھگتنا پڑا ہے اور میاں بیوی کے تعلقات پر بھی ان کا برا اثر ہوا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان بے جا رسومات نے ہماری زندگیوں کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے اور ہم نے خوش گوار زندگیوں کو ان بے جا اور مہمل رسومات کے قدموں پر نثار کرنا گوارا کیا ہے۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہم اس مسئلہ پر غور کریں اور اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کریں ان رسومات کو جاری رکھنے کی ذمہ داری زیادہ تر عورتوں پر ہے۔ اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے ان مصائب کا احساس کیا کریں جو ایک پالنے والے کو اپنی روزی کمانے میں برداشت کرنے ہوتے ہیں تو یقیناً وہ رسومات پر بے جا اسراف سے باز آ سکتی ہیں تاکہ مردوں پر قرض کا ضرورت سے زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنوں اور غیروں میں یہ کہہ کر اترائیں کہ ہم نے اپنی بیٹی کی شادی دھوم سے مچائی اور اتنے ہزار روپے صرف ہوئے، اس بات پر فخر کیا کریں کہ ہم نے فلاں رسم کو توڑ کر اور جہیز میں فلاں فلاں فضول چیزیں نہ دے کر اس قدر کفایت کی اور اپنے شوہروں کو قرض سے بچایا تو یقیناً ان کی اس قسم کی شیخی قابل ستائش ہو سکتی ہے اور ان کے شوہروں کی نظروں میں ان کی وقعت دوبالا ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ابتدا میں ایسی بہنوں کی ہنسائی ہوگی اور انھیں دل شکن باتیں سننی پڑیں گی۔ مگر انھیں یہ تصفیہ کرنا ہوگا کہ کیا ان کے شوہروں کے

انکارات سے نجات اور خوش گوار گھریلو زندگی ان کے نزدیک زیادہ وقعت رکھتی ہے یا ان لوگوں کے طعن جن سے برے وقت میں کسی قسم کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ ان کو جان لینا چاہئے کہ ہر نیا کام ابتدا میں دنیا کی نظروں میں کھٹکتا ہے اور اس کے بانی کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ جو کمزور دل کے ہوتے ہیں وہ یہ جانتے ہوئے کہ انھوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ اچھا اور مفید ہے دنیا کی لعن طعن کی برداشت نہ لا کر اس کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ لیکن چند ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی ذات پر ہر مصیبت برداشت کرتے ہوئے دنیا کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں اور اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔ ان کا خلوص اور ان کی ہمت لوگوں کو ان کے کام کی طرف متوجہ کرتی ہے اور چونکہ اس کام میں بھلائی مضمر ہوتی ہے اس لئے چند ایسے اشخاص پیدا ہو جاتے ہیں جو اس کام کو شروع کر دیتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ مقبولیت حاصل کرنے لگتا ہے۔ ایک دور ایسا بھی آتا ہے کہ اس نئے کام کا بانی جو انقلابی سمجھا جاتا تھا رجعتی خیال کئے جانے لگتا ہے۔ پس جو بہنیں میری ہم خیال ہیں انھیں ابتدا میں دل شکن باتیں سہنی ہوں گی۔ لیکن اگر وہ ترک رسومات سے اپنی مالی حالت بہتر بنانا چاہتی ہیں اور اپنے شوہروں کو انکارات سے بچانا چاہتی ہیں تو انھیں بلا خوف و خطر اپنے کام کو جاری رکھنا چاہئے۔

میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ رسومات جاری رکھنے کی تمام تر ذمہ داری عورتوں ہی کے سر ڈالنا انصاف سے بعید ہوگا کیونکہ مرد بھی ایک حد تک اس کے ذمہ دار ہیں۔ ان میں بعض ایسے ہیں جو ان رسومات کو جائز تصور کرتے ہیں اور بعض لوگوں کے لعن طعن سے خوف کھا کر ان کا جاری رکھنا گوارا کرتے ہیں اور اکثر ایسے ہیں جو اپنی بیویوں کو ان رسومات کے نقائص اور جہالت کو نہیں بتلاتے اور انھیں ان پر پیسہ ضائع کرنے سے منع نہیں کرتے ہیں۔ وہ بےچاریاں یہ دیکھ لیتی ہیں کہ میاں صاحب شادی پر پیسہ خرچ کرنے آمادہ ہیں اور وہ اس کو خرچ کر ڈالتی ہیں۔ اگر شوہر اپنی بیوی پر اپنے مصائب کو ظاہر کرے اور اس کو سمجھائے کہ اگر رسومات نہ کئے جائیں تو اس قدر روپیہ بچ سکتا ہے اور اس کی مشکلات میں اتنی کمی ہو سکتی ہے تو شاید وہ مان جائے، اگر نہ مانے تو شوہر مطلوبہ رقم دینے سے انکار کر سکتا ہے۔

تعجب ان تعلیم یافتہ مردوں پر ہوتا ہے جو اپنی شادی میں اس قسم کے رسومات کو روا رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو اور دلہن والوں کو بے جا مصارف میں مبتلا کرنے سے عار نہیں کرتے۔ اگر چند لوگ ترک رسومات پر تیار ہو جائیں تو بہت جلد ہمیں اس خود لائی ہوئی وبا سے نجات مل جائے گی اور والدین کے لئے اولاد اتنی وبال جان نہیں معلوم ہونے لگے گی۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ آج کل کے تعلیم یافتہ لڑکے شادی کے وقت دلہن والوں سے یہ دریافت کیا کرتے ہیں کہ جہیز کس قسم کا دیا جائے گا۔ کتنے مہمانوں کو کھانا کھلایا جائے گا وغیرہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں کی تعلیم میں بھی کچھ نقائص ہیں اور وہ لوگوں کے دماغوں کو اتنا روشن اور بلند نہیں کر رہی ہے جیسا کہ صحیح تعلیم کو کرنا چاہئے۔ ان بے جا مصارف نے اکثر گھروں کو تباہ و برباد کیا ہے

اور یہ تباہی روز بروز بڑھتی نظر آرہی ہے اس لئے۔ اگر حکومت کی توجہ بھی اس جانب مبذول کی جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اگر ممکن ہو تو حکومت کو چاہئے کہ شادی کے مصارف پر بھی قید لگادے اور ہر شخص کی آمدنی کے مطابق شادی کے اخراجات کی شرح مقرر کردے۔ ایسی صورت میں نہ تو دلہا والے دلہن والوں سے ناجائز مطالبہ کرسکیں گے اور نہ دلہن والے غیر ضروری رسومات پر پیسہ صرف کرکے اپنے کو مقروض بنائیں گے۔ دولت کا صرف بجا طریقوں سے ہوگا۔ ملک میں خوش حالی بڑھے گی اور قوم ترقی کرے گی۔

"دختر دکن"

حشر جذبات

رہینِ کاوشِ غمہائے روزگار نہ کر
دلِ ستم زدہ کو وقفِ انتظار نہ کر

ابھی جنونِ محبت کو اور دے وسعت
ابھی سے جیب و گریباں کو تار تار نہ کر

سکونِ ضبطِ تمنا عزیز ہے مجھ کو!
تسلیاں مجھے دیدے کے بے قرار نہ کر

میں زندگی کی حقیقت سے خود پریشاں ہوں
مجھے تو وقفِ غمِ جبر و اختیار نہ کر

متاعِ زیست سمجھ اس ودیعتِ غم کو
تو رازِ عشق زمانے پہ آشکار نہ کر

چمن کی نزہتِ رنگیں کو مستقل نہ سمجھ
فریبِ حسن ہے یہ، اس پہ اعتبار نہ کر

ترا جنون ابھی ناتمام ہے ثاقبؔ
تو دل فگار نہ کر، آنکھ اشکبار نہ کر

ثاقب (کانپوری)

خواجہ حافظ اور ملا جامی کے دکن سے مراسم

دکن کی اسلامی سلطنتوں کو ہمیشہ ایران سے تعلق رہا، نہ صرف سیاسی حیثیت سے ایران اور دکن کے تعلقات استوار تھے، بلکہ علمی حیثیت سے بھی دکن میں ایرانی علما، فضلا، شعرا اور ادیب آتے رہے، اور دکن بھی ان کی سرپرستی کرتا رہا۔ بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی اور خود آصفیہ دور میں ایران کے شعرا و ادیب، علماء و فضلاء دکن آتے اور شاہی عنایتوں اور قدر دانیوں سے مالامال ہوتے رہے۔

اس کے قطع نظر کہ جن ارباب کمال اور صاحبان ہنر نے ایران سے دکن آکر بود و باش کرلی تھی، بعض ایسے اصحاب بھی تھے جنہوں نے اگرچہ دکن آنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی تھی، لیکن اہل دکن کے ساتھ ان کے تعلقات قائم ہوگئے تھے اور خط و کتابت کے ذریعہ مراسم جاری تھے، اسی قسم کے دو شعرا کا تذکرہ ہمارے اس مضمون کا مقصد ہے، ان میں سے ایک خواجہ حافظ شیرازی اور دوسرے مولانا جامی علیہ رحمۃ ہیں۔

بہمنی سلطنت جو تقریباً دو سو سال تک دکن کے وسیع حصہ پر حکومت اور جہاں بانی کا پرچم لہراتی رہی، قوت اور شوکت کے ساتھ فرماں روائی کرتی رہی، اس کے کئی ایک بادشاہ نہ صرف خود زیور علم سے آراستہ تھے، بلکہ ان کی داد و دہش اور سرپرستئ علم و ہنر کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک سلطان محمود شاہ بہمنی ہے جو اس خاندان کا پانچواں تاج دار تھا۔ اس کے زمانہ میں علم و فن کو بڑی ترقی ہوئی اس کی علمی قدردانی شہرۂ آفاق تھی جس کی وجہ سے عرب و عجم سے شعرا اور ادیب دکن آکر بادشاہ کی قدردانی اور عنایتوں سے سرفراز ہوتے تھے، اسی کے زمانۂ حکمرانی میں خواجہ حافظ نے بھی دکن کا ارادہ فرمایا تھا، مگر افسوس ہے کہ وہ دکن نہیں آئے، البتہ دکن کی قدردانی سے بہرہ اندوز ہوئے، ان کے متعلق مصنف تاریخ فرشتہ نے جو صراحت کی ہے، اس کا اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے،

"اس مبارک دور میں عرب و عجم کے شعرا دکن آکر شاہی عنایتوں اور سرفرازیوں سے مستفید ہوتے تھے، چنانچہ عجم کا ایک شاعر دکن آکر میر فیض اللہ انجو کے ذریعہ جو مسند صدارت پر متمکن تھا، بادشاہ کے دربار میں قصیدۂ غرا پیش کیا اور پہلے ہی بار ایک ہزار تنکہ طلائی سے جو ایک ہزار تولے کے مساوی تھے سرفراز ہوا، اس طرح شاد کام اور نہال ہو کر اپنے وطن کو واپس ہوگیا، بادشاہ کی قدردانی علم کا شہرہ سن کر خواجہ حافظ بھی دکن آنے کے لئے راغب ہوئے، لیکن بعض موانع کی وجہ سے ان کا ارادہ، ارادہ ہی ہو کر رہ گیا، جب یہ اطلاع میر فیض اللہ انجو کو پہونچی تو اس نے سفر خرچ کے لئے کچھ روانہ کرکے خواہش ظاہر کی کہ اگر خواجہ صاحب دکن آکر یہاں زینت بخش ہوں اور اپنے فیض سے اہل دکن کو مستفید ہونے کا موقع دیں تو امید ہے کہ وہ بھی اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر وطن کو مراجعت فرمائیں گے۔

میر فیض اللہ کی اس توجہ کے باعث خواجہ صاحب پہلے سے زیادہ ہندوستان کے سفر کے متمنی ہوگئے، اور فیض اللہ نے

جو کچھ روانہ کیا تھا اس میں سے کچھ تو اپنے بھانجوں کو دیا اور کچھ بیوہ عورتوں کی امداد فرمائی، اور کچھ اپنا قرضہ ادا کیا، اور سامان سفر مرتب کیا، لیکن جب بلار پہونچے تو جو کچھ پاس تھا وہ ایک تباہ حال دوست کو عطا کر کے تہی دست ہو گئے، خواجہ زین العابدین ہمدانی اور خواجہ محمدؐ گازرونی جو معتبر تجار تھے خواجہ صاحب کے خرچ کے کفیل ہوئے، اگرچہ انھوں نے بعض امور میں کوتاہی کر کے خواجہ صاحب کو رنجیدہ بھی کر دیا، تاہم خواجہ صاحب ان کے ساتھ موافقت کر کے محمود شاہی جہاز[1] میں جو دکن سے آیا تھا سوار ہو گئے ہنوز جہاز روانہ نہیں ہوا تھا کہ اتفاقاً سمندر میں طوفان آگیا اور خواجہ صاحب سفر سے متنفر ہو گئے، اور ظاہر کیا کہ چند دوستوں سے وداعی ملاقات باقی رہ گئی ہے، ان سے مل کر تھوڑے عرصہ میں واپس آجائیں گے، اس بہانہ سے جب جہاز سے اتر گئے تو ایک غزل کہہ کر ایک دوست کے ذریعہ میر فیض اللہ انجو کو روانہ کر دی اور خود شیراز روانہ ہو گئے، غزل یہ ہے:-

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد	بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
بکوئی میفروشانش بجامی برنمی گیرند	زہے سجادہ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد
رقیبم سرزنشہا کرد کز این خاک در بگذر	چہ افتاد ایں سرما را کہ خاک در نمی ارزد
بسے آساں نمود اول غم دریا ببوئی زر	غلط کردم کہ یک موجش بصد من زر نمی ارزد
شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درجست	کلاہ دلکشت اما بترک سر نمی ارزد
بشو ایں نقش دل تنگی کہ در بازار یکرنگی	ہمہ ہائے گوناگوں مے احمر نمی ارزد

چو حافظ در قناعت کوش واز دنیائے دوں بگذر
کہ یکجو منت دوناں جہاں یکسر نمی ارزد

جب یہ غزل میر فیض اللہ انجو کو پہونچی تو اس نے ایک دن تقریب کی اور اس جلسہ میں سلطان محمود شاہ بہمنی سے خواجہ صاحب کا پورا قصہ بیان کیا اور غزل سنائی، سلطان نے ارشاد فرمایا چونکہ خواجہ صاحب ہمارے یہاں آنے کے ارادہ سے نکل چکے تھے، اس لئے ہم پر بھی لازم ہے کہ اپنی عنایت سے محروم نہ رکھیں، چنانچہ ملا محمدؐ قاسم مشہدی کو جو دربار بہمنی کا ایک فاضل ادیب تھا ایک ہزار تنکہ (جو ہزار تولے سونے کے مساوی ہوتے تھے) دے کر حکم دیا کہ ہندوستان کے مختلف النوع تحفے خرید کر خواجہ صاحب کے لئے شیراز لے جائیں[2]۔

اب ہم مولانا عبدالرحمن جامی کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کو بیان کرتے ہیں۔
بہمنی سلطنت کے آخر دور میں محمود گاواں کی وزارت کے باعث ملک میں امن و امان تھا اور قلمرو بہمنی کے

---

[1] بہمنی حکومت میں کئی بندرگاہ شامل تھے، جو اس زمانے میں تجارتی اغراض کے تحت نہایت اہم تصور ہوتے تھے، ان بندرگاہوں سے، چین، آفریقہ، حجاز اور ایران کو مال جاتا اور آتا تھا۔ حکومت کے کئی سو جہاز تھے، جو خلیج بنگال، بحیرۂ عرب، بحر ہند وغیرہ میں سفر کرتے تھے

[2] ترجمہ از تاریخ فرشتہ مطبوعہ نول کشور پریس ص ۳۰۲ جلد اول

حدود وسیع ہوگئے تھے، نظم و نسق سلطنت نہایت عمدہ تھا، بہر حال محمود گاوان کی وزارت نہ صرف انتظام سلطنت بلکہ علم و ہنر کی ترویج کے لحاظ سے بھی قابل تذکرہ ہے، اس کے قائم کردہ مدرسہ کے کھنڈر آج تک بیدر میں اپنے بانی کی یاد دلاتے ہیں

محمود گاواں کو مولنا جامی سے مراسم دیرینہ تھے، چنانچہ اس خصوص میں جو صراحت مصنف تاریخ فرشتہ نے کی ہے، اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

" خراسان اور عراق کے بادشاہ غائبانہ اس پر (محمود گاواں) عنایت کی نظر رکھتے تھے، مولنا عبدالرحمن جامی قدس سرہٗ خطوط ارسال کرکے اظہار نیاز کرتے تھے۔ محمود گاواں بھی ان سے عقیدت اور اخلاص رکھتا تھا، چنانچہ اس کے " مکتوبات " میں کئی خطوط موجود ہیں، مولنا جامی نے اپنے ایک قصیدہ میں اس کی مدح کی ہے، اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے :-

مرحبا اے قاصد ملک معانی مرحبا   الصلا کز جان و دل نزل تو کردم الصلا

اس کے علاوہ اور بھی ارشاد فرمایا ہے، بیت

ہم جہاں را خواجہ او ہم فقر را دیباچہ اوست   آیت الفقر لا کن تحت استار الغنا

ایک دوسرے قطعہ میں فرمایا ہے،

جامی اشعار دلاویز تو جنسی ست لطیف   پرورش از حسن بود لطف معانی تارش

ہمرہ قافلہ ہند رواں کن کہ رسد   شرف عز و قبول از ملک التجارش [1]

خواجہ محمود گاواں کے مکتوبات "ریاض الانشاد" کے نام سے ترتیب پا چکے ہیں، چنانچہ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے، (ملاحظہ ہو فن انشاء فارسی نمبر ۱۴۸)

اس کتاب میں جامی صاحب کے موسومہ چند خطوط بھی شامل ہیں۔ ایک خط صفحہ (۱۹) پر دوسرا خط صفحہ (۶۷) پر اور تیسرا خط صفحہ ۲۴۳ پر درج ہوا ہے، کتاب بڑی سائز کی ہے۔ یہ خطوط کافی طویل ہیں چنانچہ پہلا اور تیسرا خط چار صفحات پر مشتمل ہے، اور دوسرا خط چھے صفحات میں آیا ہے۔

مولنا جامی کے خطوط انشاء جامی کے نام سے مرتب ہوئے ہیں، اس کا بھی ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ (ملاحظہ ہو فن انشاء فارسی نمبر ۲۱) انشاء جامی میں جو خطوط ہیں ان میں محمود گاواں کے موسومہ خطوط صفحہ (۹۱) سے (۹۵) تک ہیں، اگرچہ خطوط میں محمود کا نام نہیں ہے بلکہ " مولنا گیلانی " کے نام سے لکھے گئے ہیں، خواجہ محمود اپنے آپ کو ہمیشہ محمود ابن شیخ محمد گیلانی تحریر کرتا تھا، چنانچہ خود ریاض الانشاء میں یہی صراحت ہے،

محمود گاواں اور مولنا جامی کے خطوط کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک دوسرے کے مراتب اور اعلیٰ قابلیت کا معترف اور مداح تھا [2]

---

[1] تاریخ فرشتہ مطبوعہ نول کشور پریس جلد اول نمبر (۳۵۸)

[2] اگرچہ اس موقع پر خطوط کے اقتباس وغیرہ پیش کئے جا سکتے تھے، مگر طوالت کے خوف سے اس کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

دوسری ہستی جن سے حاجی صاحب کے مراسم کا پتہ چلتا ہے وہ شہر گوا کے قاضی محمود ہیں، اولاً قاضی صاحب کے متعلق مختصر صراحت ضروری ہے،

قاضی صاحب کے اجداد حجاز سے ساحل ہند پر تجارت اور تبلیغ اسلام کی غرض سے آئے تھے، اور سلطنت بہمنیہ کے ابتدائی زمانہ سے شاہی ملازمت میں شامل تھے، قاضی صاحب کے والد قاضی احمد بھی گوا کے قاضی تھے ان کے انتقال کے بعد قاضی محمود کو ان کی جگہ ملی[1]، ۸۹۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا "تعلیقات محمود" آپ کی تصنیف ہے، مصنف "تاریخ احمدی" نے آپ کے اور حاجی صاحب کے مراسم کے متعلق حسب ذیل صراحت کی ہے،

"قاضی محمود کبیر بن قاضی احمد بن فقیہ ابو محمد بن فقیہ اسمٰعیل[2] بن فقیہ، مخدوم اسحاق، از گلستان نسب وانچہ ابن عاصی را از بزرگان رسید تحریر نمودم وایں اینست کہ قاضی القضات ممالک دکن و داماد سید اکبر حسینی بن حضرت خواجہ بندہ نواز قدس سرہ بود قلم در وصف او معترف بہ عجز و قصور است فردے بود معاصر جناب مولنٰنا نور الدین عبد الرحمن جامی کہ جناب مولنٰنا باین تعدس وعلو شان بلفظ حضرت تحریر می فرمود"

مصنف "گلستان نسب" (قادر عظیم خاں) نے بھی یہی صراحت کی ہے "قاضی القضات" سے "تحریر می فرمود" تک عبارت بالکل ایک ہے اس سے واضح ہے کہ مصنف تاریخ احمدی نے گلستان نسب ہی سے اس بیان کو اخذ کیا ہے۔

افسوس ہے کہ انشاء جامی میں قاضی محمود کے موسومہ خطوط نہیں ہیں،

اس موقع پر مولنٰنا جامی کی قلمی ایک کتاب کا تذکرہ بھی نامناسب نہیں ہے۔ کتب خانہ سعیدیہ[3] (ترپ بازار حیدرآباد) میں "جوامع البیان"، جو تفسیر کی کتاب اور شیخ معین بن صفی کی تصنیف ہے، اس کے متعلق یہ صراحت کی گئی ہے کہ یہ مولنٰنا جامی کی قلمی ہے چنانچہ صفحۂ اول پر حسب ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے

"ہذا التفسیر خط عبد الرحمن الجامی شارح الکافیہ ابن الحاجب"،

اس کے علاوہ تفسیر جس خط میں لکھی گئی ہے اسی طرز کی تحریر میں حسب ذیل تحریر بھی ہے،

"الفقیر عبد الرحمن جامی ۸۵۵ھ"

جامی صاحب کی پیدائش ۸۱۷ھ میں ہوئی اور انتقال ۸۹۸ھ میں ہوا۔ اس لحاظ سے یہ کتاب انھوں نے

---

[1] اس خدمت کا "پروانہ" دیکھا گیا ہے۔

[2] فقیہ اسمٰعیل کا تذکرہ عرب کے مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے (ملاحظہ ہو عجائب الاسفار صفحہ ۲۷۹)

[3] کتب خانہ سعیدیہ مولنٰنا مفتی محمد سعید خاں مرحوم کا ملکی ہے، جو ان کے ورثاء کی جانب سے اب عام کردیا گیا ہے، مفتی صاحب "قاضی محمود" کی اولاد میں شامل ہیں۔

(۴۸) سال کی عمر میں لکھی ہے۔ پوری کتاب جس خط میں لکھی ہوئی ہے اس خط میں " الفقیر عبدالرحمٰن جامی ۵۵ ۸ھ " کی تحریر اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ یہ کتاب مولانا ہی کی قلمی ہے۔

یہ چند امور حافظ اور جامی صاحب کے متعلق قابل تحریر ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ایران اور دکن کے جو تعلقات سیاسی اور علمی سال ہا سال قائم رہے ہیں ان کی پوری تحقیق اور وضاحت موجب دلچسپی ہوسکتی ہے، اگر جامعہ عثمانیہ کے ایم اے کے طلبہ اس کی جانب متوجہ ہوں تو کافی ذخیرۂ معلومات حاصل ہوسکتے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ

ان کا خط اور میں کہوں !! املا غلط انشا غلط
ہیں صحیح الفاظ و عدہ کے مگر وعدہ غلط

نقشبندانِ سیاست کا نوشتہ دیکھ کر
میں تو کہہ سکتا نہیں اتنا صحیح اتنا غلط

دل میں ہے کچھ اور کہتے ہیں زباں سے وہ کچھ اور
سچ نہیں ہے یہ تو پھر دنیا کو میں سمجھا غلط

بندہ پرور! کیا خبر کس سحر فن کا ہے یہ کام
میں تڑپ اٹھا صحیح آپ ہی نے تڑپایا غلط

علم مستقبل نہیں اب تک تو ہوں زندہ ضمیر
اپنے دل کی ترجمانی میں نہیں کرتا غلط

رازِ طاعت خدمتِ خلقِ خدا لاریب فیہ
قبل ازیں مفہومِ طاعت میں جو سمجھا تھا غلط

امرأ القیسی عروض از براہیں ہو بھی تو کیا
میرؔ کے اشعار تک پڑھتے ہیں مولٰنا غلط

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
یہ ڈھب اردو شعر کی تقطیع کرنے کا غلط

مٹ گئے ہم مٹ گئے ہم مٹ گئے
وزن یوں جانچیں جو ہم ہندی تو کیا ہوگا غلط

اپنی بھٹی اپنا ساقی اپنا ساغر اپنی مے
مے اُدھر کی ہو تو ان اپنوں پہ اترانا غلط

شاعرانہ ذوق نے موقع پہ رکھ لی میری لاج
میرے بھائی نے تو قومی گیت بھی گایا غلط

ہیں علی منظور بھی شاعر یہ کہتا کچھ صحیح
ہیں علی منظور بھی استاد یہ دعویٰ غلط

علی منظور

نئی کتابیں

۱۔ اعمال نامہ (خود نوشت سوانح) از سر سید رضا علی ۔ قیمت سے ۔ ملنے کا پتہ ہندوستانی پبلشرز ۔ دہلی ۔

۲۔ خارستان (مجموعہ مضامین) از آغا شاعر قزلباش حجم ۲۳۲ صفحے قیمت عالہ پتہ انڈیا بک ہاؤس ۔ عابد روڈ حیدرآباد دکن

۳۔ حیدرآباد کی صنعتوں پر جنگ کے اثرات از محمد نظام الدین احمد ۹ صفحے قیمت عہ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

۴۔ حیدرآباد اور قیمتوں کی نگرانی از احمد عبدالماجد ۔ حجم ۱۷ صفحے قیمت عہ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

۵۔ جنگ اور روپیہ ۔ از امتیاز حسین خاں ؍؍ ۶۶ ؍؍ ؍؍ ۱۲؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

۶۔ جنگ اور مالیہ ۔ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۶۴ ؍؍ ؍؍ ۱۲؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

۷۔ اندھیرا اور روشنی (ناول) از احمد حسین خاں ؍؍ ۱۶۰ ؍؍ ؍؍ عمر ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

۸۔ لاجونتی (افسانے) مرتبہ گلاب چند ؍؍ ۱۰۰ ؍؍ ؍؍ عہ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

۹۔ بند لفافہ (مزاحیہ ڈراما) از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ۔ حجم ۳۲ صفحے قیمت ۴؍ پتہ مکتبہ جامعہ دہلی ۔

۱۰۔ ملاء اعلیٰ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۳۲ ؍؍ ۴؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

۱۱۔ مٹھائی کی ٹوکری ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۳۲ ؍؍ ۴؍ ؍؍ ؍؍

۱۲۔ کٹھ پتلیاں (ڈراما) ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۶۴ ؍؍ ۸؍ ؍؍ ؍؍

۱۳۔ کاغذ سازی مرتبہ مکتبہ جامعہ حجم ۴۸ صفحے قیمت ۶؍ ؍؍ ؍؍

۱۴۔ لکڑی کا کام ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۶؍ ؍؍ ؍؍

۱۵۔ ہوائی جہاز ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۶؍ ؍؍ ؍؍

۱۶۔ باغبانی ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۶؍ ؍؍ ؍؍

۱۷۔ لڑائی کے ہتھیار ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۶؍ ؍؍ ؍؍

۱۸۔ کنول (افسانے) از اعظم کریوی ؍؍ ۲۵۰ ؍؍ عالہ پتہ عبدالحق اکیڈیمی ۔ اردو گلی ۔ حیدرآباد دکن

۱۹۔ سادہ و رنگین افسانے از ظفر قریشی ۲۲۰ ؍؍ عالہ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

۲۰۔ فن داستان گوئی از کلیم الدین احمد قیمت عالہ ؍؍ دائرہ ادب ۔ بانکی پور ۔ پٹنہ

۲۱۔ سویت روس کی عورتیں (روسی عورتوں کے حالات) از رضیہ ظہیر قیمت عہ پتہ قومی دارالاشاعت ۔ بمبئی ۴

۲۲۔ سوشلزم مترجمہ سبط حسن قیمت عمر ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

۲۳۔ سویٹ روس از محمد کلیم اللہ ؍؍ سے ۔ ماڈرن بک ڈپو ۔ سلطان بازار ۔ حیدرآباد دکن ۔

۲۴۔ اردو تنقید پر ایک نظر (دوسرا ایڈیشن) از کلیم الدین احمد قیمت عالہ پتہ مرکز ادب ۔ سندرو ۔ پٹنہ

۲۵۔ ادب اور زندگی (دوسرا ایڈیشن) از مجنوں گورکھپوری قیمت عال ۔ پتہ کتاب خانہ دانش محل ۔ لکھنؤ

مرزا سیف علی خاں

ادارہ کی خبریں

مرکز نظام آباد | ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اسٹیشن نظام آباد پہونچا۔ ادارہ کے اصحاب موجود اور قیام گاہ تک ساتھ رہے۔ امتحان گاہ کے انتظامات کی نسبت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سب کچھ کر لئے گئے۔ چنانچہ میں نے صبح ٹھیک نو بجے پہونچ کر اچھی طرح سے دیکھ لیا۔ زمانۂ امتحان سے متعلق جو بھی کارروائی عمل میں آئی اس کی تفصیل تواریخ وار درج ذیل ہے۔

تفصیل حاضری وغیر حاضری امیدواران امتحان

ذکور	حاضر	غیر حاضر	جملہ
اردو دانی	۱۳	۱	۱۴
اردو زباندانی	۱۴	۳	۱۷
اردو عالم	۱۸	۱	۱۹
اناث	**حاضر**	**غیر حاضر**	**جملہ**
اردو دانی	۲۵	۶	۳۱
اردو زباندانی	۷	۲	۹
اردو عالم	۱	-	۱

مسٹر کاشی ناتھ راؤ وکیل ہائیکورٹ اور مولوی غلام احمد صاحب وکیل ہائیکورٹ ادارے کی کاروبار میں تن دہی اور دلچسپی کو کام میں لاتے ہیں۔

جناب مولوی واسع المدنی صاحب مہتمم آبکاری و نائب میر مجلس شاخ نظام آباد نے بوقت امتحان تشریف لا کر ضروری انتظامات و کاروبار امتحان میں بڑی محنت و دلچسپی سے کام لیکر زبانی امتحانات میں بھی ہر دو میقاتوں میں حصہ لیا۔

جناب مولوی ابو طاہر محمد عبدالقادر صاحب سیول سرجن رکن ادارہ آغاز امتحان سے پہلے تشریف لا کر بعد تقسیم پرچہ جات کچھ دیر کی نگرانی کے بعد واپس ہوئے۔

مولوی سید اقبال علی صاحب صدر مہتمم تعمیرات بھی ادارہ کی قدر و منزلت بڑھانے میں اپنے عزیز وقت کو صرف فرماتے ہوئے امتحان گاہ تک تشریف لا کر بعد تقسیم پرچہ جات واپس ہو گئے۔

مولوی عبدالجلیل صاحب مہتمم کتب خانہ رکن ادارہ امتحان گاہ تک تشریف لا کر بدیر نگرانی کی۔

سید محمود عالم صاحب سالک نائب معتمد ادارہ اور جمیل احمد صاحب منتظم دارالاقامہ جامع مسجد بھی نگرانی میں بطور خاص انہماک و دلچسپی کو کام میں لایا۔

جناب مولوی بشیر احمد صاحب مہتمم خزانہ آغاز امتحان کے بعد کچھ دیر کے لئے امتحان ہال کا معائنہ فرما کر اظہار خوشنودی کے بعد واپس ہو گئے۔

خواتین:۔ محل جناب سول سرجن۔ صدر نگران کار امتحان گاہ اناث و نائب معتمد ادارہ موصوفہ نے امتحان گاہ اناث کی صدارت اور نگرانی اور بے لوث خدمات کو جس عمدگی سے انجام دیا قابل ستائش ہے اور ادبی دلچسپی کے شوق کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

محل جناب مہتمم صاحب خزانہ موصوفہ نے طبقہ اناث میں کاروبار امتحان میں ہر دو میقات میں تکلیف گوارا فرما کر اپنی ادبی دلچسپی کا اچھا خاصہ ثبوت دیا۔

محل جناب صدر مہتمم صاحب تعمیرات عامہ۔ موصوفہ نے بھی تعاون عمل فرماتے ہوئے امتحانی کاروبار کو نہایت عمدگی سے پورا کیا۔

بیبا بائی صاحبہ صدر معلمہ مرہٹی نسوان مستقر نظام آباد قابل تشکر و ستائش ہیں کہ موصوفہ نے معہ اپنی خادمہ مدرسہ صبح سے شام تک کاروبار میں انتھک کوشش سے ادارہ کی خدمت انجام دی۔

دوسرے روز بھی اول وقت مولوی واسع المدنی صاحب نے

تشریف فرما ہو کر امتحان زباندانی میں تعاون عمل سے میرا ساتھ
دیا۔ موصوف کے ہمراہ مولوی جلال الدین صاحب مددگار ناظم
جنگلات ڈویژن نظام آباد بھی تھے۔ موجودہ تعلیمی منظر پر ایک
گہری نظر ڈال کر اس کے آئندہ ارتقا کے متعلق مناسب گفتگو
ہوئی۔ کچھ دیر بعد ہی بڑی مسرت کی بات ہے کہ مولوی محمد باقر حسین
صاحب قریشی بی اے ایچ سی ایس اول تعلقدار ضلع نے ہمراہی
مولوی جعفر علی صاحب صادق منصف تعلقہ نظام آباد و مولوی
حامد علی صاحب مددگار مال امتحان گاہ میں تشریف فرما ہو کر امیدواران
امتحان اردو عالم کا فرداً فرداً معائنہ فرمایا اور امتحان کے متعلق
اظہار خوشنودی فرمایا اور ساتھ ہی جو عہدہ داران سررشتہ
حاضر ہال تھے ان کے متعلقہ سررشتہ جات کے ناخواندہ جوانان کو
تعلیم کی ترغیب و تحریص دلا کر شریک امتحان کرنے کے لئے ہدایت
فرمائی۔ اور جو امیدوار شریک امتحان تھے ان کے پیشے کے متعلق بھی
خاص طور پر استفسار فرمایا اور جب انھوں نے یہ معلوم کیا کہ کاروبار
دنیا کے مختلف افراد جن کو اب تک تعلیم سے بہت کم تعلق تھا،
مدرسہ بالغان سے تعلیم حاصل کر کے اپنے میں امتحان کی صلاحیت
پیدا کی اور اس طرح خواندگی کی مہم میں جو کامیابی ہوئی اس کے
متعلق اطمینان کا اظہار فرمایا اور جناب معتمد صاحب ادارہ کے
توجہ دلانے پر اس کا بھی وعدہ فرمایا کہ عنقریب ہی وہ اس
خصوص میں کمیٹی منعقد کر کے ادارہ کی مشکلات کو رفع کرنے کی
کوشش فرمائیں گے۔ اسی اثنا میں جناب صاحبزادہ میر احمد علی خاں
صاحب مہتمم تعلیمات (صدر مجلس شاخ ادارہ) و جناب ڈاکٹر واسن راؤ
صاحب صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ نظام آباد تشریف فرما ہوئے۔
ہر دو اصحاب نے امتحان کے معاملہ میں بہت امداد فرمائی اور
دوران امتحان میں بھی شریک ہو کر اپنے ادبی ذوق کا ثبوت دیا،
نہ دیا بلکہ چار پانچ عہدہ داروں کی صحبت سے ادارہ کی ترقی سے
متعلق مختلف امور دریافت فرمائے۔ اور معتمد صاحب سے کہا گیا کہ
کمیٹی کے بعد ہم لوگ بھی امیدواران امتحان کی درس و تدریس میں
ایک آدھ گھنٹہ وقت دیں گے۔ خصوصاً منصف صاحب کے تعلیمی
جذبات و طریقہ ہائے تعلیم قابل قدر ہیں۔ اگرچہ پہلے روز مسٹر
کاشی ناتھ راؤ وکیل ہائیکورٹ بلدہ چلے گئے تھے مگر اتفاقی بات
ہے کہ آج واپسی پر فوری امتحان گاہ مع اپنے ایک ساتھی مسمی
مسٹر نارائن راؤ وکیل ہائیکورٹ ساکن بلوٹی تشریف لائے
اور نگرانی میں بطور خاص حصہ لیکر مقامی عہدہ داران موجود
سے ادارہ کی فلاح و بہبود کی نسبت اچھی معلومات کا اظہار
فرمایا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ نارائن راؤ صاحب وکیل ہائیکورٹ
نے موجودہ منظر کی نسبت خوش گوار تاثرات کو اپنے دل میں
جگہ دی۔ علاوہ ازیں شیخ حسین صاحب مدرس فوقانیہ کلاں نے
بھی نگرانی وغیرہ میں پھرتی سے حصہ لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

طبقۂ اناث:۔ بموجب پروگرام دیرروزہ جناب محترمہ
محل سیول سرجن صاحب اپنے فرائض نگرانی بہ تعاون عمل محل جناب
مہتمم صاحب خزانہ اور محل جناب ذکریا صاحب مددگار کا پولیس
نہایت خوشگوار طریقہ پر انجام دیئے۔

آخری روز صرف ایک وقت کا پرچہ تھا۔ اور صرف ایک
ہی ہال میں مختصر طلبہ جمع تھے۔ بوجہ گرہن ایک خاص تاریکی چھائی
ہوئی تھی، سابقہ دو روز کی چہل پہل باقی نہ رہی۔ امیدواروں نے
نہایت سکون و اطمینان سے اپنے کام مفوضہ انجام دیئے۔ مسٹر
کاشی ناتھ راؤ وکیل ہائیکورٹ جو کہ اس ادارہ کی روح رواں
ہیں بہ امداد شیخ حسین صاحب مدرس مدرسہ فوقانیہ و مولوی
[illegible] اسمٰعیل صاحب مدرس گڈی کی نگرانی میں سرگرم تھے۔

مولوی محمد حسین خاں صاحب معتمد ادارہ نے جس محنت وجانفشانی اور جفاکشی سے امیدواران امتحان کو تیار کیا وہ امیدواروں کے جوش وخروش سے ظاہر ہو رہا تھا۔ خاں صاحب موصوف کو ان تعلیمی مسائل میں جو دلچسپی رہی ہے وہ دوران امتحان میں ان کی کارکردگی سے ظاہر ہو رہا تھا۔ بلاشبہ خاں صاحب موصوف کا وجود خاص کر معتمدی ادارہ پر ایک نعمت غیر معمولی ہے۔ اور مجھے جہاں تک معلومات بہم ہوئے۔ ادارہ نے جو بھی ترقی اس خصوص میں کی ہے وہ صرف خاں صاحب موصوف کی محنت اور دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ وہ فطرتاً بھی بہت رحم دل واقع ہوئے ہیں۔ اور امیدوار خاں صاحب موصوف سے بہت ہی خوش رہے ہیں۔ مجھے دوران امتحان میں نگرانی وغیرہ میں بہت مدد دی۔ میں ان کا خاص طور پر بہت ممنون ہوں۔

سے ایشیا

مرکز وبیجاپور | ریلوے گاڑی اسٹیشن پر رات کے بارہ بجے پہونچا۔ معزز سرپرست ادارہ مولوی سید شاہ نصیر الدین صاحب نہری منصف وبیجاپور اور مولوی میر حسن علی صاحب معزز صدر ادارہ اور ڈرائنگ ماسٹر صاحب مدرسہ وسطانیہ مجھے لینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ ان حضرات کے ہمراہ وبیجاپور پہونچا۔ میرے قیام وطعام کا معقول انتظام تھا۔ سرپرست صاحب ادارہ اردو کی ترویج میں سعی بلیغ فرما رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض امیدواروں کی فیس امتحان۔ کتابیں اور تعلیمی اخراجات بھی خود برداشت کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اسی کام کے تحت میں نے خود دیکھا ہے کہ اپنی پوزیشن کا خیال کئے بغیر معمولی معمولی لوگوں سے انھیں خوشامد کرنی پڑی ہے جو ایک بہت زبردست ایثار ہے۔

مولوی میر حسن علی صاحب وظیفہ یاب امین کروڑگیری کے جوش عمل کی وجہ سے ادارہ خوب ترقی کر رہا ہے۔ ایسے مخلص اور بااثر حضرات کی وجہ سے یقین ہے کہ آئندہ یہ ادارہ دوسرے اضلاع سے بڑھ جائے گا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بھی بڑی خوشی ہوئی کہ مدرسہ وسطانیہ وبیجاپور کے صدر مدرس مولوی مسعود حسین خاں صاحب اور ان کے مددگاروں نے ادارہ کی ہر طرح سے امداد کی اور آئندہ پوری امداد کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

سرپرست صاحب اور صدر صاحب کی انتہائی دلچسپی کی وجہ سے امتحان گاہ کا انتظام بہترین تھا۔ اردو دانی۔ زباندانی اور اردو عالم ذکور و اناث کے امیدواروں کی نشستیں بہت ہی اصولی طریقہ پر بچھائی گئیں تھیں۔ اناث کی نشستوں کا انتظام بہت ہی سلیقہ سے علحدہ کیا گیا تھا۔ جس کی نگرانی بیگم صاحبہ سرپرست صاحب نے فرمائی اور صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ نسواں نے بھی نگرانی میں ہاتھ بٹایا۔ بہرحال جس حسن وخوبی سے انتظام کیا گیا تھا وہ قابل تعریف ضرور تھا۔

جن مقامی اصحاب نے شاخ کی سرگرمیوں میں دلچسپی لی اور کارکنان شاخ کی اعانت فرمائی اور پورا وقت نگرانی میں صرف فرمایا ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جناب تحصیلدار صاحب
۲۔ مولوی محمد سعد اللہ خاں صاحب وکیل۔
۳۔ " بشیر الدین احمد صاحب وکیل۔
۴۔ " شیخ احمد صاحب وکیل۔
۵۔ ڈرائنگ ماسٹر صاحب مدرسہ وسطانیہ وبیجاپور۔
۶۔ مولوی مسعود حسین خاں صاحب صدر مدرس نے زبانی امتحان اردو دانی لیا۔
۷۔ مولوی منظور حسین خاں صاحب مددگار مدرسہ وسطانیہ نے اردو زباندانی کے شرکاء امتحان زبانی میری نگرانی میں لیکر نمبر دیئے۔

ظہیر الدین

مرکز ہنگولی ۔ ۲۰؍شہریور ۱۳۵۲ف شنبہ دس بجے صبح ہنگولی پہونچا۔ اسٹیشن پر مولوی عبداللہ صاحب معتمد ادارہ مولوی مرزا احمد بیگ صاحب شریک معتمد و مولوی محمد عثمان خاں صاحب کمالی سابق معتمد تشریف لائے تھے۔ ان کے ہمراہ امتحان گاہ پہونچا جہاں امیدوار حاضر اور میرے منتظر تھے۔ جاتے ہی پرچے تقسیم کر دیئے گئے۔ ادارہ کے تمام امتحانات میں طلبہ اور طالبات قابل ذکر تعداد میں شریک تھے جس کے لئے ادارہ شاخ ہنگولی قابل مبارکباد ہے۔ امتحان کے ہر سہ ایام میں مولوی عبداللہ صاحب و مولوی احمد بیگ صاحب، مولوی عثمان خاں صاحب کمالی کے علاوہ مولوی ملک ذاکر صاحب اردو فاضل قبالہ نویس دفتر رجسٹری مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مدرس مدرسہ فوقانیہ ہنگولی، مولوی محمد امین صاحب مدرس مدرسہ مرکزی اور مولوی شیخ محبوب صاحب مدرس مدرسہ نرسی نے نگرانی کے فرائض نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیئے۔ طبقہ اناث کے امتحان کیلئے علحدہ جگہ مقرر کی گئی تھی۔ طالبات کی صدر نگراں کارہ قمرالنساء بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ ہنگولی تھیں۔ جنھوں نے آمنہ بی صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نرسی و شاہ جہاں بیگم صاحبہ مددگار معلمہ ہنگولی و سعیدالنساء بیگم و نورالنساء بیگم صاحبہ و حمیدہ بیگم صاحبہ خورشید معتمد شعبہ نسوان ادارہ و عزیزالنساء بیگم صاحبہ مددگاران بسمت نگر کی معیت میں نگرانی امتحانات کے فرائض نہایت اچھی طرح انجام دیئے۔ خصوصاً مولوی شیخ محبوب صاحب مدرس مدرسہ نرسی و آمنہ بی صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نرسی کا شکریہ ضروری ہے کہ دونوں نے اپنے مستقر سے لڑکوں اور لڑکیوں کو امتحانات کا شوق دلاکر ان کو تیار کیا اور اپنے ہمراہ ہنگولی لائے اور واپس لے گئے۔

ان دونوں کی سعی و کوشش اور علم دوستی ہر طرح قابل ستائش و مبارکباد ہے۔ ختم امتحان پر طبقہ ذکور و طبقہ اناث کو علحدہ علحدہ مخاطب کیا گیا۔ ادارہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی اور اردو زبان کی اشاعت و ترویج کے لئے ان کی موجودہ کوششوں پر مبارکباد دی جاکر آئندہ اس سے زیادہ کام کرنے کی تحریص و ترغیب دلائی گئی۔ اکثر طلبہ و طالبات کی طرف سے بعد ختم امتحان، امتحان گاہ و اسٹیشن پر صدر نگران کار کو پھول پہنائے گئے جس کا شکریہ ادا کیا گیا۔

مولوی عبداللہ صاحب و عثمان خاں صاحب کمالی و محمد اسمٰعیل صاحب و محمد امین صاحب و مرزا احمد بیگ صاحب و شیخ محبوب صاحب نہایت سرگرمی اور خلوص سے ادارہ کے مقاصد کو آگے بڑھانے اور عوام کو لکھا پڑھا کر امتحان کے لئے تیار کرانے میں شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ان تمام کا خلوص اور سرگرمی ہر طرح قابل ستائش و قابل مبارکباد ہے۔ مولوی عثمان خاں صاحب کمالی نہایت محنتی فرض شناس ہمدرد اور مخلص کارکن ہیں جن کے قلب میں ہمیشہ کام کرنے کا جذبہ موجزن رہتا ہے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ رفاہ عام کے کام کرتے رہنا ان کی عادت ہو گئی ہے۔ ان کا وجود باشندگان ہنگولی کے لئے میں سمجھتا ہوں ایک نعمت ہے۔ ان کے علاوہ جناب سیٹھ عبداللہ صاحب اور مولوی شیخ حیدر صاحب ادارہ ہنگولی کی حسب ضرورت مالی امداد فرمایا کرتے ہیں۔

عبدالفتاح

نتیجہ اردو امتحانات بابت ۱۹۴۴ء

امتحان اردو دانی

حسب ذیل امیدواروں نے علی الترتیب سب سے زیادہ نشانات حاصل کئے۔

۱۹۲۔ شوکت علی اول (بلدہ فوج)
۱۶۱۔ مرزا ثناء اللہ بیگ دوم (فوج)
۲۳۰۔ نواب محمد محی الدین خاں سوم (فوج)

مرکز اندولہ

(کامیاب)

۱۔ محمد علی
۲۔ آئیتا
۱۳۔ گریا
۱۴۔ سوشکریا
۱۵۔ سید اسمٰعیل

مرکز اورنگ آباد (ذکور)

(کامیاب)

۱۹۔ اسرار احمد
۲۰۔ سلطان احمد

مرکز بلدہ (اناث)

(کامیاب)

۲۴۔ سراج النساء بیگم
۲۵۔ ذاکرہ بیگم
۲۶۔ لطیف النساء بیگم
۲۷۔ رحیم النساء بیگم
۳۰۔ جعفر جہاں
۳۵۔ حافظ النساء بیگم
۳۶۔ سلمہ بیگم
۳۷۔ اشرف النساء بیگم
۳۸۔ محبوب بیگم
۴۳۔ پاشا بیگم
۶۵۱۔ صفیہ نصرت

مرکز بلدہ (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

۵۵۔ حیدر علی
۶۲۔ محمد سعد اللہ

(کامیاب)

۴۹۔ سید زین العابدین
۵۰۔ سید عبد الوہاب
۵۸۔ عبد الرحمٰن
۶۰۔ محمد محی الدین خاں

مرکز بلدہ (فوج)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

۸۳۔ محمد عظیم الدین
۸۷۔ عبد الرحمٰن
۹۲۔ مبارک علی
۹۳۔ یعقوب علی
۹۴۔ حسن
۹۵۔ عبد الرحمٰن
۹۶۔ عبد الصمد
۱۲۸۔ سید صابر حسین
۱۳۰۔ شیخ احمد
۱۳۱۔ شیخ بڈھن
۱۳۲۔ محمد کریم الدین
۱۳۳۔ سومبر سنگھ
۱۴۰۔ سید محمد محسن
۱۴۱۔ شیخ احمد
۱۴۶۔ بلدیو راؤ
۱۴۸۔ جہانگیر بیگ
۱۵۹۔ شیخ عبد القادر
۱۶۱۔ مرزا ثناء اللہ بیگ
۱۶۲۔ شوکت علی
۱۶۳۔ محمد حبیب
۱۶۴۔ سید عطاء اللہ
۱۶۹۔ بشیر الدین
۱۹۹۔ فخر الدین
۱۷۴۔ احمد علی
۱۷۶۔ غلام رسول
۱۷۸۔ اختر عمر
۱۸۱۔ احمد منظور الدین
۱۸۷۔ عبد الغفور دوم
۱۸۸۔ محمود علی
۱۹۱۔ محمد مونس
۱۹۵۔ شیخ حسین
۲۰۰۔ سید عبد النبی
۲۰۳۔ محمد حیات خاں
۲۰۵۔ بشیر الدین
۲۰۶۔ محمد ضیاء اللہ
۲۰۸۔ عبد اللہ خاں
۲۱۰۔ محمد عبد العظیم
۲۱۲۔ محمد عمر
۲۱۵۔ احمد خاں
۲۱۷۔ محمد رزاق علی
۲۲۲۔ حیدر علی
۲۲۳۔ محمد حسین
۲۲۸۔ محمد عبد العزیز
۲۳۰۔ نواب محمد محی الدین خاں
۲۳۱۔ محمد محی الدین
۲۳۳۔ محمد صاحب
۲۳۵۔ سید احمد العیدروس
۲۳۹۔ شیخ احمد عمودی
۲۴۵۔ عبود بن بکیر
۲۶۲۔ محمد بن محفوظ
۲۶۷۔ حسین قریشی
۲۶۹۔ رتجو سنگھ
۲۷۷۔ رسول خاں
۲۸۶۔ محمد سلطان
۲۸۸۔ محمد عبد الحفیظ

۲۸۹۔ بشیرالدین قادری
۲۹۱۔ شیخ محی الدین
۲۹۲۔ محمد یونس
۲۹۳۔ محمد عبدالکریم
۳۱۵۔ این۔ آر۔ لچوئرز
۳۱۶۔ شوکت علی خاں
۳۱۷۔ حسن محمد خاں
۳۳۷۔ ولی الدین خاں
۳۴۱۔ ولی داد خاں
۳۴۵۔ عابد شریف

(کامیاب)

۷۳۔ عبدالقادر
۷۴۔ محمد سالم
۷۵۔ مہابیر پرشاد
۷۷۔ محمد یوسف
۷۸۔ گروبا
۷۹۔ جانکی سنگھ
۸۱۔ مرزا محبوب بیگ
۸۲۔ سید عثمان شاہ
۸۴۔ شیخ احمد اول
۸۵۔ اول داد خاں
۸۶۔ سرور
۸۸۔ حسن
۸۹۔ حبیب بیگ
۹۱۔ شیخ امام
۹۷ میجر اے شامرٹ
۹۸۔ شہاب الدین خاں
۹۹۔ ریاض محمد
۱۰۰۔ محمد انور
۱۰۱۔ غلام محی الدین خاں
۱۰۲۔ محمد جعفر
۱۰۳۔ شرف الدین
۱۰۵۔ سید گیسو دراز حسینی
۱۰۶۔ حمید خاں
۱۰۷۔ عبدالحمید خاں
۱۰۸۔ سالار محمد
۱۰۹۔ محمد جعفر
۱۱۰۔ شیخ عبداللطیف
۱۱۱۔ حیات علی بیگ
۱۱۲۔ سید کریم الدین
۱۱۳۔ محمد شفیع
۱۱۴۔ غلام مصطفیٰ
۱۱۵۔ احمد شریف
۱۱۶۔ اے ٹامس
۱۱۸۔ رسول بخش
۱۲۰۔ سید رفیق حسین
۱۲۱۔ محمد عمر
۱۲۲۔ محمد عنایت اللہ
۱۲۳۔ سید یٰسین
۱۲۴۔ خواجہ احمد
۱۲۵۔ محمد اسمٰعیل
۱۲۷۔ عبدالکریم
۱۲۹۔ انتونی
۱۳۴۔ اسمٰعیل خاں
۱۳۵۔ محمد علی
۱۳۶۔ محمد غوث
۱۳۷۔ محمد حمید الدین
۱۳۸۔ احمد شریف
۱۴۲۔ شاہد خاں
۱۴۳۔ عبدالرحمٰن
۱۴۴۔ زنگاریڈی
۱۴۵۔ سید خواجہ معین الدین
۱۴۷۔ میر لیاقت علی
۱۴۹۔ محمد حمید الدین
۱۵۰۔ شیخ چاند
۱۵۱۔ بشیر احمد خاں
۱۵۲۔ شیخ حسین
۱۵۴۔ محمد نعمت اللہ
۱۵۶۔ عبدالعزیز خاں
۱۵۷۔ محمد صدیق
۱۵۸۔ محمد امیر الدین
۱۶۰۔ کے۔ وی۔ راجلو
۱۶۵۔ علیم الدین
۱۷۱۔ محمد عثمان
۱۷۲۔ شیخ عثمان علی
۱۷۷۔ محمد حسن خاں
۱۷۹۔ شیخ فرید
۱۸۲۔ محبوب علی
۱۸۳۔ محمد پاشاہ
۱۸۴۔ کریم خاں
۱۸۶۔ بشیر احمد
۱۸۹۔ شیخ مہتاب
۱۹۰۔ عبدالکریم
۱۹۲۔ غلام محی الدین
۱۹۴۔ پریم سنگھ
۱۹۶۔ پاپالال
۱۹۷۔ عبدالمجید
۱۹۸۔ اسمٰعیل شریف
۱۹۹۔ سید احمد
۲۰۱۔ یوسف علی
۲۰۹۔ جعفر حسین خاں
۲۱۳۔ سید شمس الدین
۲۲۰۔ غلام مرتضیٰ خاں
۲۲۱۔ محمد حسین
۲۲۴۔ محمد بشیر الدین
۲۲۵۔ بشیر احمد بیگ
۲۲۷۔ عبدالرحیم
۲۳۲۔ عوض بن کرنل ناصر
۲۳۶۔ سید علی
۲۳۸۔ محمد عسکری
۲۴۰۔ عبدالجبار انصاری
۲۴۱۔ احمد باعمران
۲۴۳۔ احمد بن عمری
۲۴۴۔ حبیب بوبکر بن جمل اللیل

۲۴۶۔ عبداللہ باکوین
۲۴۷۔ محمد بانقیب
۲۴۸۔ احمد بجدم
۲۴۹۔ محمد ایمانی
۲۵۰۔ عبدالجلیل بغدادی
۲۵۱۔ احمد نہدی
۲۵۲۔ شیخ عبدالرحیم عمودی
۲۵۳۔ عمر حضرمی
۲۵۵۔ عبدالقادر برمضان
۲۵۶۔ حسن باصلیب
۲۵۸۔ عمر باسوید
۲۵۹۔ سالم بن محفوظ
۲۶۳۔ ناجی جابری
۲۶۴۔ سید عیدروس العیدروسی
۲۶۵۔ علی بن سعید بفلح
۲۶۶۔ حبیب عبدالرحمن العیدروس
۲۶۸۔ شیخ عبدالرحیم عمودی
۲۶۹۔ آر، پی، کاگنا
۲۷۲۔ شنکر راؤ
۲۷۴۔ قادر شریف
۲۷۵۔ شیخ کریم اللہ
۲۷۹۔ محمد جعفر
۲۸۰۔ محمد ابراہیم
۲۸۱۔ شیخ محی الدین
۲۸۲۔ محمد جعفر مدم
۲۸۳۔ محمد اسمٰعیل
۲۸۴۔ محمد اسمٰعیل
۲۸۵۔ محمد شفیع
۲۸۶۔ سید حفیظ
۲۹۵۔ عبدالحق
۲۹۸۔ غلام رسول
۲۹۹۔ فصیح الدین
۳۰۱۔ غلام دستگیر
۳۰۲۔ عبدالمجید
۳۰۷۔ محمد صدیق خاں
۳۱۰۔ محمد حسین
۳۱۱۔ محمد مولانا
۳۱۸۔ سید جعفر حسین
۳۱۹۔ یٰسین خاں
۳۲۰۔ شیخ محبوب
۳۲۲۔ بلرام راؤ
۳۲۳۔ محمد امین خاں
۳۲۵۔ میر محمود علی
۳۲۶۔ عبیدالرحمن خاں
۳۲۷۔ احمد الدین
۳۲۸۔ خواجہ معین الدین
۳۲۹۔ غلام مرتضیٰ
۳۳۰۔ احمد بن محبوب
۳۳۱۔ واحد علی خاں
۳۳۲۔ محمد عبدالشکور
۳۳۳۔ بندا سنگھ
۳۳۴۔ اسمٰعیل خاں
۳۳۵۔ محمد مظفر
۳۳۶۔ قادر الزماں خاں
۳۳۸۔ بی، ایم، جوشی
۳۳۹۔ مرزا جعفر علی خاں
۳۴۲۔ گوپال سنگھ
۳۴۳۔ محمد اکبر
۳۴۸۔ سی، جی، آئزک

مرکز بلولی (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

۳۵۲۔ خواجہ عبدالولی

(کامیاب)

۳۵۱۔ رام کشن
۳۵۵۔ محمد احمد الدین
۳۵۹۔ جٹی با
۳۶۰۔ سالم
۳۶۲۔ محمد بشیر الدین
۳۶۳۔ باشاہ
۳۶۴۔ مرزا بشیر بیگ
۳۶۹۔ محمد کلیم الدین

مرکز بمبئی (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

۳۷۶۔ ابراہیم
۳۸۱۔ انور بیگ
۴۰۸۔ معین الدین

(کامیاب)

۳۷۸۔ اکبر علی
۳۸۰۔ امیر علی
۳۸۹۔ حمد خاں
۳۹۲۔ دین محمد
۳۹۷۔ سید نواب علی
۴۰۰۔ شیخ ایوب
۴۰۲۔ شیخ عبداللطیف
۴۱۱۔ عبداللہ
۴۱۲۔ عبداللہ
۴۱۸۔ عبدالرحمن
۴۲۰۔ عبدالستار
۴۲۱۔ عبدالرشید
۴۲۷۔ عبدالغفار
۴۲۸۔ عبدالغنی
۴۳۰۔ عزیز اللہ
۴۳۶۔ گنونت
۴۳۸۔ محبوب صاحب
۴۴۱۔ محمد اسمٰعیل
۴۴۲۔ محمد ایوب
۴۴۴۔ محمد حامد
۴۵۱۔ محمد عبدالغفور
۴۵۴۔ محمد قاسم
۴۶۱۔ واجد علی
۴۶۸۔ محمد صدیق

مرکز پرلی (ذکور)

(کامیاب)

۴۷۶۔ اسمٰعیل خاں

۴۷۸۔ محمد اسد اللہ پاتوڑی
۴۸۱۔ محمد خلیل الدین
۴۸۲۔ سید عیسیٰ علی
۴۸۴۔ بیجناتھ راؤ
۴۸۶۔ خواجہ منظور احمد
۴۸۷۔ محمد یونس حسین
۴۹۱۔ پنڈت جیتمبر راؤ ویسپانڈے
۴۹۵۔ شیخ اسمٰعیل
۴۹۷۔ محمد عثمان
۵۰۰۔ محمد علی
۵۰۳۔ محمد ظہور الدین
۵۰۸۔ میر صادق علی
۵۱۳۔ الیاس محی الدین
۵۲۸۔ سید جمال

مرکز پرلی (اناث)

(کامیاب)

۵۲۲۔ نسیم النساء بیگم
۵۲۳۔ رحمت بی
۵۲۴۔ صاحبہ بی
۵۲۷۔ آمنہ بیگم
۵۳۱۔ ذاکرہ بی

مرکز پرینڈہ (ذکور)

(کامیاب)

۵۳۶۔ عبد الرحمٰن
۵۳۸۔ مادھو راؤ

مرکز کپّل (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

۵۷۸۔ سید احمد

(کامیاب)

۵۷۶۔ خواجہ پیراں
۵۷۹۔ محمد خلیق الزماں
۵۸۲۔ شیخ محبوب

مرکز کپّل (اناث)

(کامیاب)

۵۸۶۔ خدیجہ بی
۵۸۹۔ خواجہ بیگم
۵۹۰۔ معین النساء بیگم
۵۹۲۔ بلقیس بیگم
۵۹۴۔ مکرم النساء

مرکز کلیانی (ذکور)

(کامیاب)

۵۹۶۔ ضمیر الدین
۶۰۱۔ سید محمد علی
۶۰۴۔ محمد شہاب الدین
۶۰۵۔ محمد ظہور الدین
۶۰۶۔ محمد ممتاز الدین
۶۰۷۔ محمد راجہ
۶۰۸۔ معین الدین
۶۰۹۔ منمتیا
۶۱۱۔ لبتپا
۶۱۲۔ فیض الدین
۶۱۳۔ ایرپا
۶۱۴۔ مانکپا
۶۱۵۔ محمد علاء الدین
۶۱۶۔ محمد عزیز الدین
۶۱۷۔ محمد حاجی میاں
۶۱۸۔ محمد عبد الغنی
۶۲۲۔ سید طاہر
۶۲۳۔ عبد الغنی
۶۲۵۔ سید محبوب پٹیل

مرکز کلیانی (اناث)

۶۲۶۔ نسیمہ بیگم
۶۲۷۔ زاہدہ بیگم
۶۲۸۔ رحیمہ بی
۶۲۹۔ طاہر النساء بیگم
۶۳۰۔ مختار النساء بیگم
۶۳۱۔ عفیرہ بانو بیگم
۶۳۲۔ ریاست خانم
۶۳۳۔ رحیمہ بیگم
۶۳۴۔ عارفہ بیگم
۶۳۵۔ زہرہ بیگم
۶۳۶۔ زاہدہ بیگم
۶۳۷۔ اصفیہ بیگم
۶۳۸۔ طاہرہ بی
۶۳۹۔ اصغری بیگم
۶۴۰۔ مختار بیگم
۶۴۱۔ نجم النساء بیگم
۶۴۲۔ عنایت بی

مرکز گلبرگہ (ذکور)

(کامیاب)

۶۴۳۔ محمد مظہر الدین
۶۴۶۔ سید عبد الغنی
۶۴۷۔ محمد عبد العزیز
۶۴۸۔ شیخ احمد

مرکز گلبرگہ (اناث)

(کامیاب)

۶۵۰۔ حبیب النساء بیگم

مرکز مومن آباد (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۶۶۱۔ محمد معین الدین
۶۶۲۔ محمد علی خاں
۶۶۳۔ منولال
۶۶۸۔ سید جمشید احمد

(کامیاب)

۶۶۶۔ حسین خاں
۶۶۷۔ سید غوث
۶۷۰۔ نظیر احمد
۶۷۲۔ خورشید علی
۶۷۳۔ محمد حسن الدین
۶۷۴۔ احمد بیگ
۶۷۵۔ محمد صاحب

۶۷۶۔ محمد رحمن خاں
۶۷۷۔ عبدالعزیز خاں
۶۷۸۔ سید شجاع الدین
۶۷۹۔ شیخ محمد
۶۸۰۔ محمد محبوب علی

مرکز نظام آباد (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

۶۸۳۔ عبدالحمید
۶۹۰۔ مرزا محمود بیگ

(کامیاب)

۶۸۱۔ عبدالغفار خاں
۶۸۲۔ کریم الدین خاں
۶۸۴۔ عبدالقادر
۶۸۵۔ انیس احمد نعمانی
۶۸۶۔ سیف اللہ خاں
۶۸۷۔ احمد
۶۸۸۔ رفیع الدین
۶۸۹۔ صاحب حسین
۶۹۲۔ ظہیر احمد
۶۹۴۔ نرسلو

مرکز نظام آباد (اناث)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

۶۹۸۔ نور جہاں بیگم
۷۰۰۔ اختر جہاں
۷۱۸۔ گوداوری

(کامیاب)

۶۹۵۔ سیدہ راحت فاطمہ
۶۹۶۔ سیدہ زہرہ خاتون
۷۰۱۔ عزیزہ بیگم
۷۰۲۔ اصغری بیگم
۷۰۳۔ قمر النساء بیگم
۷۰۷۔ سرسوتی بائی
۷۰۹۔ چندر بھاگا
۷۱۰۔ سلوچنا بائی
۷۱۱۔ انسویا بائی
۷۱۲۔ شکنتلا بائی
۷۱۳۔ تائی بائی
۷۱۴۔ رادھا بائی
۷۲۰۔ وینکٹ راگوا
۷۲۱۔ کلاوتی کانڈلیکر
۷۲۲۔ ہلتا بائی
۷۲۴۔ امت اللہ خاتون
۷۲۵۔ خدیجہ بیگم

مرکز ویجاپور (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

۷۳۶۔ نصر اللہ خاں
۷۳۹۔ غلام جیلانی
۷۴۳۔ قاضی خواجہ سید پاشا (فریدالدین احمد)

(کامیاب)

۷۲۷۔ شیخ چھمو
۷۲۸۔ محمد عبدالغفار
۷۳۰۔ فیاض الدین
۷۳۱۔ شیخ نیر
۷۳۲۔ قطب الدین
۷۳۳۔ امان اللہ خاں
۷۳۴۔ گلزار شاہ
۷۳۵۔ غلام قادر
۷۳۷۔ شیخ کریم
۷۴۰۔ سید یعقوب
۷۴۲۔ شیخ محمد

مرکز ویجاپور (اناث)

(کامیاب)

۷۴۷۔ بی بی زیب النساء عرف صاحب بیگم

مرکز ہمنا باد (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

۷۴۹۔ امین الدین

(کامیاب)

۷۵۴۔ عبدالستار خاں
۷۵۵۔ سید عبدالواحد
۷۵۶۔ اشفاق احمد
۷۵۷۔ محمد قیام الدین
۷۵۸۔ محمد عبدالسلیم
۷۵۹۔ محمد شفیع الدین
۷۶۰۔ عبدالرحیم
۷۶۲۔ غلام دستگیر

مرکز ہمنا باد (اناث)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

۷۶۳۔ افضل النساء بیگم طاہرہ
۷۶۵۔ قمر النساء بیگم
۷۶۶۔ عابدہ بیگم
۷۷۱۔ محمودہ بیگم

(کامیاب)

۷۶۴۔ حلیم النساء بیگم
۷۶۷۔ خورشید بیگم
۷۶۸۔ در شہوار بیگم
۷۶۹۔ عمر النساء بیگم
۷۷۰۔ محمودہ بیگم
۷۷۲۔ بیگم جانی

مرکز منگولی (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

۷۷۳۔ محمد ابراہیم
۷۷۵۔ پیر محمد
۷۸۴۔ محمد عبداللہ
۷۸۵۔ محمد نیر

(کامیاب)

۷۷۴۔ محمد اسمٰعیل
۷۷۶۔ عبدالرشید
۷۷۷۔ عبدالعزیز
۷۷۸۔ محمد سعید
۷۷۹۔ فیض محمد خاں کمالی
۷۸۰۔ خلیل اللہ خاں
۷۸۳۔ امیر علی خاں
۷۸۶۔ عبدالحمید

۷۸۸۔ مرزا رشید بیگ
۷۹۰۔ اشفاق احمد
۷۹۳۔ رحمت اللہ خاں

مرکز ہنگولی (اناث)

(کامیاب)

۷۹۴۔ صابرہ بیگم
۷۹۵۔ حمید النساء بیگم

۷۹۶۔ شہر بانو بیگم
۷۹۷۔ ساجدہ بیگم
۷۹۸۔ غوثیہ بیگم
۷۹۹۔ خدیجہ بیگم
۸۰۰۔ نجم النساء بیگم
۸۰۱۔ اصغری بیگم
۸۰۲۔ نور جہاں بیگم

۸۰۴۔ شاہ زمانی بیگم
۸۰۵۔ جمیلہ بیگم
۸۰۶۔ حمیدہ بیگم
۸۰۷۔ بی بی
۸۰۸۔ سیدہ زاہدہ بیگم

مرکز جوالہ نظام الدین (ذکور)

(کامیاب بدرجہ امتیاز)

۸۱۷۔ محمد یعقوب
۸۱۲۔ بابو
۸۱۸۔ شیخ محی الدین
۸۱۹۔ سید کریم الدین
۸۲۱۔ ادہو

نتیجہ امتحان زباندانی بابتہ سنہ ۱۹۴۴ء

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے۔

۳۰۱۔ میجر تاج احمد خاں اول
(بلدہ فوج)

۲۹۷۔ محبوب جہاں اول
(نظام آباد)

۶۶۔ چاندنی بیگم (بلدہ اناث) اول

ناموں کی ترتیب بلحاظ رول نمبر

مرکز اندولہ (ذکور)

۱۔ محمد عبداللہ سوم
۲۔ گرلنگیا سوم
۴۔ محمد عبدالنبی سوم
۷۔ خواجہ حسین سوم
۱۰۔ احمد حسین سوم
۱۳۔ ویرنا (مرکز میں اول) دوم
۱۴۔ محمد عبدالرحیم شاہ سوم
۲۵۔ شیخ امام علی سوم
۲۶۔ گنگمیا سوم

مرکز اندولہ (اناث)

۳۱۔ محبوب بی سوم
(مرکز میں اول)
۳۲۔ زینب بی سوم

مرکز اورنگ آباد (ذکور و اناث)

۴۵۔ محمد عثمان اللہ سوم
۴۷۔ ودودہ جمیل دوم
(مرکز میں اول)
۴۹۔ امیر النساء بیگم دوم

مرکز بلدہ (اناث)

۵۱۔ فاطمہ النساء بیگم عرف ذکیہ بیگم دوم
۵۲۔ کریم النساء بیگم سوم
۵۷۔ افضل بیگم سوم
۵۸۔ حشمت بیگم دوم
۶۱۔ نور جہاں بیگم دوم
۶۶۔ چاندنی بیگم اول
(مرکز میں اول)
۶۷۔ سردار سلطانہ اول
۷۰۔ انور النساء بیگم دوم
۷۱۔ بدر النساء بیگم دوم
۷۲۔ سلیم النساء بیگم سوم

مرکز بلدہ (ذکور)

۷۷۔ محمد یٰسین شریف دوم
۷۸۔ حسین علی خاں دوم
(مرکز میں اول)
۸۱۔ یوسف کمال سوم
۹۱۔ بہادر علی مرزا سوم
۹۵۔ محمد اصغر سوم
۹۷۔ سید عبدالمجید سوم
۹۸۔ سید عبدالغفار سوم
۷۶۴۔ محمد رحمن حسین سوم

مرکز بلدہ (فوج)

ففتھ بٹالین

۱۰۰۔ جمعدار سالم
۱۰۱۔ جمعدار ناصر سوم
۱۰۴۔ حوالدار سید حسین سوم
۱۰۵۔ " حسن لعبراوی سوم
۱۰۸۔ " محمد عثمان دوم
۱۱۰۔ " شیخ احمد دوم
۱۱۱۔ " ابراہیم خاں دوم
۱۱۳۔ نایک شام راؤ دوم
۱۱۴۔ " عطاء الرحمن خاں دوم
۱۱۵۔ " عبدالرحمن سوم
۱۱۶۔ " راج لنگیا سوم
۱۱۷۔ " عبدالوہاب دوم
۱۱۸۔ " غلام غوث الدین دوم
۱۱۹۔ سوبجر کلرک غلام صمدانی دوم
۱۲۰۔ " محمد اعظم خاں دوم
۲۲۳۔ " بی شام سنگھ دوم

سکنڈ بٹالین نظم انضباطی

۱۲۱۔ جمعدار ابوالحسن سوم

۱۲۲۔ حوالدار عبدالرشید سوم

۷ بٹالین حیدرآباد انفنٹری

۱۲۵۔ حوالدار میجر محمد یوسف سوم
۱۲۶۔ ر کلرک محمد خواجہ دوم
۱۳۲۔ ر شیخ کمال سوم
۱۳۳۔ سولجر کلرک غلام رسول دوم

حیدرآباد کیولری ٹریننگ سنٹر

۱۲۷۔ دفعدار میجر عبدالحمید خاں دوم
۱۳۸۔ لانس دفعدار صاحب حسین دوم
۱۳۹۔ رکروٹ کلرک محمد خواجہ خاں دوم

حیدرآباد انفنٹری
ٹریننگ کمپنی

۱۴۰۔ میجر تاج احمد خاں اول
(مرکز میں اول)
۱۴۱۔ صوبہ دار مومن علی سوم
۱۴۳۔ ر معین الدین سوم
۱۴۴۔ جمعدار سید عبدالرحمن دوم
۱۴۵۔ حوالدار میر محی الدین علی سوم
۱۴۶۔ ر مصطفےٰ خاں سوم
۱۴۷۔ ر شرف الدین (دوم) دوم
۱۴۹۔ ر سید بن محمد دوم
۱۵۰۔ لانس حوالدار نرسا سوامی سوم
۱۵۲۔ نائیک نعیم اللہ خاں دوم
۱۵۳۔ ر محمد عزیز حسن خاں سوم
۱۵۴۔ ر مصطفےٰ احمد سوم
۱۵۵۔ ر محمد اسمٰعیل سوم
۱۵۶۔ نائیک خواجہ محمد عثمان دوم
۱۶۰۔ سید نورالدین دوم

فورتھ بٹالین گولکنڈہ
انفنٹری

۱۶۲۔ جمعدار محمد مولانا دوم
۱۶۳۔ کوارٹر ماسٹر جمعدار
محمد خاں دوم
۱۶۴۔ نائیک محمد جعفر حسین سوم
۱۶۵۔ محمد معین الدین سوم
۱۶۶۔ صوبہ دار عبدالستار سوم
۱۶۷۔ ر حسین خاں دوم
۱۶۸۔ نائیک شیخ محی الدین سوم
۱۷۰۔ صوبہ دار عبدالکریم سوم
۱۷۳۔ نائیک عمر خاں سوم
۱۷۴۔ شیخ مرتضیٰ سوم
۱۷۵۔ شیخ محمد سوم
۱۷۸۔ حوالدار عبدالحسین سوم
۱۷۹۔ جمعدار محمد حسن دوم
۱۸۰۔ بشیر احمد سوم
۱۸۱۔ حوالدار لچھمی نارائن سوم
۱۸۲۔ عبدالوہاب دوم
۴۵۶۔ جمعدار لچھمن سنگھ سوم
۴۵۷۔ ر سید محمود سوم
۴۶۰۔ حوالدار سید رحیم سوم
۴۶۱ ر محمد شہاب الدین سوم
۴۶۲۔ نائیک شیخ حسین دوم
۴۶۴۔ لانس نائیک سراج الدین سوم
۴۶۶۔ میجر سید قادر سوم

جمعیت نظام محبوب

۱۸۳۔ کمپنی کوارٹر ماسٹر سید حسین سوم
۱۸۴۔ ر حوالدار میجر محمد بن زیاد سوم
۱۸۵۔ ر ر عبداللہ بن شریب سوم
۱۸۷۔ کمپنی کوارٹر ماسٹر جمعدار
سید احمد باعقیل دوم
۱۸۸۔ حوالدار احمد قریشی دوم
۱۸۹۔ ر بوبکر بایمین سوم
۱۹۰۔ ر عامر باصلیب دوم
۱۹۲۔ نائیک سید محسن نظامی سوم
۱۹۳۔ ر شیخ حسن عمودی دوم
۱۹۴۔ ر فقیر محمد خاں دوم
۱۹۵۔ سید علی جیلانی سوم
۱۹۸۔ لانس نائیک علی قریشی سوم
۲۰۰۔ سعید محدیل دوم
۲۰۱۔ لانس نائیک سعید کثیری سوم
۲۰۲۔ ر شیخ احمد باعقیل دوم
۲۰۴۔ طاہر بایمین سوم
۲۰۶۔ محمد انصاری سوم
۲۰۷۔ عوض باعلم سوم
۲۰۹۔ عبید بن خلیفہ سوم
۲۱۰۔ سلطان احمد الکثیری سوم
۲۱۲۔ نائیک حسن صومالی دوم
۲۱۳۔ عبداللہ قریشی دوم

حیدرآباد آرمی
ٹرانسپورٹ کمپنی

۲۱۴۔ ایکوئیشل دفعدار جنگم لچھمیا دوم
۲۱۷۔ اکٹنگ لانس دفعدار
محبوب علی خاں دوم
۲۱۸ ڈرائیور کلرک محمد جعفر دوم
۲۲۱۔ ڈرائیور محبوب علی دوم

مرکز بلولی (ذکور)

۲۲۲۔ احمد عبداللہ سوم
۲۲۳۔ غلام محی الدین سوم
۲۲۴۔ غلام نصیر الدین سوم
۲۲۶۔ راچیا سوم
۲۲۷۔ محمد اسمٰعیل سوم
۲۲۹۔ محمد عبدالکریم سوم
۲۳۳۔ محمد عبدالوحید دوم
(مرکز میں اول)
۲۳۶۔ ہنما گوڑ سوم
۲۳۷۔ ماہوراؤ دوم
۲۳۸۔ محمد عبدالقیوم سوم
۲۳۹۔ محمد ابراہیم سوم
۲۴۰۔ مرزا امیر بیگ دوم
۲۴۱۔ محمد عمادالدین سوم

مرکز بلولی (اناث)

۲۴۳ پاشا بیگم سوم

مرکز بمبئی (ذکور)

۲۴۵۔ احمد سوم

۲۴۸۔ اسمٰعیل سوم
۲۵۰۔ سراج الدین سوم
۲۵۱۔ فخرالدین دوم
۲۵۲۔ محمد حسین سوم
۲۵۴۔ محمود الحسن سوم

مرکز بمبئی (اناث)

۲۵۵۔ منیرہ خانم دوم
(مرکز میں اول)

مرکز پرلی (ذکور)

۲۶۲۔ ولی خاں سوم
۲۶۴۔ قادر خاں سوم
۲۶۵۔ محمد خواجہ دوم
(مرکز میں اول)
۲۶۶۔ محمد عبدالحفیظ سوم
۲۶۷۔ ظہورالدین سوم
۲۶۸۔ سید ابراہیم سوم
۲۶۹۔ حبیب الدین سوم

مرکز پرلی (اناث)

۲۷۵۔ محمودہ بیگم سوم
۲۷۶ رحیم النساء بیگم دوم
(مرکز میں اول)

مرکز پربنڈہ (ذکور)

۲۸۳۔ محمد حسین سوم
۲۸۴۔ شاہو (مرکز میں اول) دوم

مرکز پربنڈہ (اناث)

۲۸۹۔ شہزادی بیگم دوم
۲۹۲۔ حذاقت بیگم دوم
(مرکز میں اول)
۲۹۳۔ اختر بیگم سوم
۲۹۴۔ قیصر بیگم سوم

مرکز کبیل (ذکور)

۳۰۴۔ سید محمد عرف قیصر سوم
(مرکز میں اول)
۳۰۵۔ شمس الدین سوم

مرکز کبیل (اناث)

۳۱۱۔ ممتاز جہاں بیگم دوم
(مرکز میں اول)
۳۱۶۔ نجم النساء بیگم سوم

مرکز کلیانی (ذکور)

۳۲۰۔ محمد ریاض الدین سوم
۳۲۲۔ محمد امیر اللہ سوم
۳۲۳۔ نور محمد معین الدین سوم
۳۲۵۔ محمد نذیرالدین دوم
۳۲۶۔ محمد نظیرالدین سوم
۳۳۰۔ محمد حمیدالدین سوم
۳۳۱۔ دید پرکاش سوم
۳۳۶۔ میر حیدر علی دوم
(مرکز میں اول)
۳۳۸۔ محمد عبدالرحیم سوم
۳۳۹۔ بابولال سوم
۳۴۰۔ نارائن راؤ سوم
۳۴۹۔ کبعمینا دوم

مرکز کلیانی (اناث)

۳۴۱۔ طیب النساء بیگم دوم
۳۴۲۔ عابدہ بیگم سوم
۳۴۳۔ ارشد بیگم سوم
۳۴۴۔ اصغر بانو بیگم دوم
۳۴۷۔ نعیم النساء بیگم دوم
(مرکز میں اول)
۳۴۸۔ رحیم النساء بیگم دوم

مرکز گلبرگہ (اناث)

۳۵۰۔ رحیم النساء بیگم دوم
(مرکز میں اول)
۳۵۹۔ عابدہ خاتون سوم
۳۶۰۔ خیر النساء دوم

مرکز منگلے گاؤں

(ذکور)

۴۴۶۔ محمد الدین سوم
۴۵۲۔ محمد مشتاق احمد سوم

مرکز منگلے گاؤں

(اناث)

۴۵۳۔ محمودہ بیگم صدیقی سوم
۳۶۲۔ نورالنساء بیگم صدیقی دوم
(مرکز میں اول)
۳۶۴۔ دستگیر بیگم سوم
۳۶۶۔ اختر النساء بیگم سوم
۳۶۷۔ صغرا بیگم سوم

مرکز مومن آباد (فوج)

۳۶۸۔ جمعدار میر واحد علی دوم
۳۶۹۔ لانس کلرک ڈی پتھمبر راؤ سوم
۳۷۰۔ جمعدار غلام حسین دوم
۳۷۱۔ دفعدار عبدالمجید سوم
۳۷۲۔ لانس دفعدار فقیر محمد دوم
۳۷۳۔ دفعدار شیخ عمر دوم
۳۷۴۔ سوار سید عبدالجبار سوم

مرکز نظام آباد (ذکور)

۳۷۵۔ سید نذیر احمد سوم
۳۸۳۔ کمتد راؤ سوم
۳۸۷۔ ایس سری نواس راؤ سوم
۳۹۰۔ ایس وینکٹ نرسیا سوم

مرکز نظام آباد (اناث)

۳۹۱۔ سیدہ خورشید النوری بیگم دوم
۳۹۲۔ سیدہ تہذیب النساء بیگم دوم
۳۹۳۔ سیدہ حامد النساء بیگم اول
۳۹۷۔ محبوب جہاں اول
(مرکز میں اول)
۳۹۸۔ فیاض بیگم دوم

مرکز وقار آباد / بیجاپور (ذکور)

۴۰۹۔ جوگی لال (مرکز میں اول) دوم
۴۱۰۔ قاضی خواجہ سید شاہ منیرالدین احمد قادری سوم
۴۱۳۔ محمد مشتاق احمد خاں سوم
۴۱۴۔ حبیب محسن احمد زبیری سوم

مرکز بیجاپور (اناث)

۴۱۷۔ رابعہ خاتون سوم

مرکز ہمنا باد (ذکور)

۴۲۲۔ محمد رحمت اللہ خاں سوم
۴۲۳۔ سید عبدالماجد سوم
(مرکز میں اول)

مرکز ہنگولی (ذکور)

۴۲۴۔ محمد قاسم سوم
۴۲۵۔ باپو سوم
۴۲۹۔ کونڈیا سوم

۴۳۰۔ ایم بالیا دوم
(مرکز میں اول)

مرکز ہنگولی (اناث)

۴۳۱۔ خدیجہ بی سوم

۴۳۲۔ الفت بی دوم
(مرکز میں اول)

مرکز جولہ نظام الدین

۴۳۳۔ گنپت سوم
۴۳۷۔ سری دھر (مرکز میں اول) دوم

نتیجہ امتحان اردو عالم بابتہ ۱۹۴۴ء

ناموں کی ترتیب لحاظ نشانات حاصلہ کی گئی ہے۔

۱۸۔ اختر جہاں اول (بلدہ اناث)
۴۲۔ سید شریف سلیم خوندمیری اول (بلدہ ذکور)
۶۔ سید شاہ افضل الدین نہری دوم (اورنگ آباد)

ناموں کی ترتیب لحاظ رول نمبر

مرکز اندولہ

۱۔ سید علی رضوی سوم
۴۔ محمد اسمٰعیل سوم

مرکز اورنگ آباد (ذکور)

۶۔ سید شاہ افضل الدین نہری دوم
(مرکز میں اول)
۷۔ محمد بشیر الدین پٹنی سوم

مرکز اورنگ آباد (اناث)

۸۔ مہرالنساء بیگم رفعت سوم
۹۔ طاہرہ خاتون اطہر (مرکز میں اول) دوم
۱۰۔ مہرالنساء بیگم مہر سوم
۱۱۔ بشیرالنساء بیگم بشیر سوم
۱۲۔ عباسی بیگم عرف شہناز سوم
۱۳۔ عائشہ بیگم صدیقہ سوم

مرکز بلدہ (اناث)

۱۸۔ اختر جہاں (مرکز میں اول) اول
۲۳۔ ہاشمی بیگم دوم
۲۴۔ اخترالنساء بیگم دوم
۲۷۔ آمنہ صدیقی دوم
۳۱۔ جیلانی بیگم ناہید سوم

مرکز بلدہ (ذکور)

۴۲۔ سید شریف سلیم خوندمیری اول
(مرکز میں اول)
۴۸۔ محمد عبداللہ سوم
۴۹۔ محمد عبدالعزیز عزیز دوم
۵۰۔ محمد عبدالحفیظ اقبال سوم
۵۲۔ سید مصطفےٰ مہر سوم
۵۳۔ شیخ عبدالرحمن ضیاء سوم
۵۴۔ میر افضل علی شاہد دوم

مرکز بلدہ فوج

۵۷۔ محمد بو عیل سوم

مرکز بلولی (ذکور)

۵۸۔ محمد عبدالجلیل سوم
۵۹۔ محمد عبدالرب سوم
۶۰۔ محمد رکن الدین (مرکز میں اول) سوم
۶۱۔ محمد رفیع اللہ خاں سوم
۶۲۔ محمد احمد الدین سوم
۶۴۔ خواجہ عبدالوکیل سوم
۶۶۔ محمد نذیر احمد سوم
۶۹۔ منشی شیخ احمد صدیقی سوم
۷۰۔ محمد احمد الدین سوم

مرکز بمبئی

۷۳۔ سید انیس احمد خاں سوم
۷۴۔ محمد علی (مرکز میں اول) دوم
۷۵۔ محی الدین سوم

مرکز پرلی (ذکور)

۷۶۔ محمد عبدالرشید سوم

مرکز پرلی (اناث)

۷۸۔ اقبال بیگم دوم

مرکز پربنڈہ (اناث)

۸۰۔ بسم اللہ بیگم سوم

مرکز کیپل (ذکور)

۸۲۔ میر حسن علی سوم
۸۴۔ سید محی الدین احمد دوم

مرکز گلبرگہ (ذکور)

۹۰۔ محمد مخدوم علی سوم
۹۱۔ محمد عبد القادر زردی سوم
۹۴۔ محمد عبد الحی سوم
۹۵۔ محمد علی دوم
۹۸۔ محمد حسین سوم

مرکز منجلے گاؤں (ذکور)

۱۰۰۔ محمد سراج الدین دوم
۱۰۱۔ محمد حنیف الدین سوم

مرکز منجلے گاؤں (اناث)

۱۰۶۔ اقبال النساء بیگم صدیقی سوم

مرکز نظام آباد (ذکور)

۱۰۸۔ ڈی وینکٹ نرسیا سوم
۱۰۹۔ سید احمد سوم
۱۱۳۔ خواجہ معین الدین سوم
۱۱۵۔ شیخ عبد اللہ سوم
۱۲۰۔ احمد حسین سوم
۱۲۲۔ بی جیجتریا سوم
۱۲۳۔ ٹی پرمانڈلو سوم

مرکز نظام آباد (اناث)

۱۲۷۔ مہارانی بائی سوم

مرکز ویجاپور (اناث)

۱۴۴۔ فضل النساء بیگم سوم

مرکز ہمنا باد (ذکور)

۱۴۵۔ محمد عبد الستار سوم
۱۴۷۔ محمد نجم الدین سوم
۱۴۹۔ محمد عبد القدیر سوم
۱۵۰۔ مدن لال سوم

مرکز ہنگولی (ذکور)

۱۵۱۔ محمد آدم علی خاں کمالی سوم
۱۵۲۔ عبد الرشید بیگ سوم
۱۵۴۔ واحد علی خاں کمالی سوم
۱۵۶۔ سید لیاقت علی سوم
۱۶۱۔ محمد حسن اکبر سوم
۱۶۳۔ ثناء اللہ خاں سوم
۱۶۴۔ محمد یٰسین سوم

مرکز ہنگولی (اناث)

۱۶۵۔ سعیدۃ النساء بیگم سوم
۱۶۶۔ زینت النساء بیگم سوم
۱۶۷۔ خیر النساء بیگم سوم
۱۶۸۔ شہزادی بیگم سعیدہ سوم
۱۶۹۔ آمنہ سوم
۱۷۱۔ امینہ بیگم شاہدہ سوم
۱۷۲۔ فہمیدہ بیگم فہمید سوم
۱۷۳۔ رابعہ بیگم سوم
۱۷۶۔ فاطمہ النساء بیگم سوم
۱۷۷۔ رقیہ سوم
۱۷۸۔ نور النساء بیگم سوم
۱۷۹۔ حفیظ النساء بیگم سوم
۱۸۰۔ سلطانہ اصفہ بانو سوم
۱۸۱۔ احمدی بیگم سوم
۱۸۲۔ معصوم بیگم سوم

مرکز جولہ نظام الدین (ذکور)

۱۸۳۔ لکشمن سوم
۱۸۵۔ گرو داس سوم

مرکز جولہ نظام الدین (اناث)

۱۸۶۔ سیدہ زہرہ بیگم سوم
۱۸۷۔ سیدہ لطیفہ بیگم سوم

نتیجہ امتحان اردو فاضل بابتہ ۱۹۴۴ء

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے

۷۔ احمد سلطان دوم (بلدہ)
۱۹۔ سید احمد علی علی دوم (پرلی)
۱۷۔ محمد ریاض الدین دوم (بلدہ)

ناموں کی ترتیب بلحاظ رول نمبر

مرکز بلدہ (اناث)

۱۔ رحمت النساء بیگم سوم

مرکز بلدہ (ذکور)

۷۔ احمد سلطان (مرکز میں اول) دوم

۸۔ محمد اعظم علی خاں — دوم
۱۰۔ سید نور الحسن عابدی — سوم
۱۴۔ محمد محبوب شریف — سوم
۱۵۔ محمد عبدالرزاق قمر — سوم
۱۶۔ محمد اسمٰعیل — سوم
۱۷۔ محمد ریاض الدین — دوم
۲۰۔ اختر عباس — دوم

۲۶۔ وجیہ الدین — دوم

مرکز بلدہ فوج

۱۸۔ حسن بن بریک — سوم

مرکز پرلی (ذکور)

۱۹۔ سید احمد علی — دوم

مرکز کپسل (ذکور)

۲۱۔ محمد اولیاء محی الدین تمنا — سوم

۲۳۔ سید اسمٰعیل علوی — دوم

مرکز ہنگولی (ذکور)

۲۷۔ محمد عبدالرحمٰن — دوم
۲۸۔ غلام محمد مدنی — سوم

مرکز جولہ نظام الدین

۳۰۔ محمد عثمان خاں — سوم

امتحان خوشنویسی

مرکز ہنگولی (ذکور)

۶۔ مرزا احمد بیگ — سوم

مرکز ہنگولی (اناث)

۸۔ سعید النساء بیگم
۹۔ عزیز النساء بیگم — سوم

ادارۂ ادبیات اردو میسور

صدر۔ محمد آبا سیٹھ صاحب ایم ال، سی۔ نائب صدر۔ محمد خلیل اللہ صاحب ایم اے، ایل ایل، بی ایڈوکیٹ۔ معتمد۔ عبدالقادر سروری۔ خازن۔ سید عبدالکریم صاحب سوداگر۔

اراکین۔ خان صاحب محمود شریف صاحب ایم اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ بنگلور۔ سید عبدالرحمن صاحب بی، ایس، سی ممبر ریپرزنٹیٹو اسمبلی، میسور۔ محمد احمد صاحب بی اے سٹی مجسٹریٹ میسور۔ نذیر احمد صاحب ملکی بی اے، بی ٹی اسسٹنٹ سروے سپرنٹنڈنٹ میسور۔ کیپٹن محمد جمال الدین صاحب۔ صمد شاہین صاحب ایم اے ایل ایل بی۔ ایڈیٹر "میسورین" بنگلور۔ عبدالقیوم صاحب بی اے ایل ایل بی۔ سید نذیر احمد صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی۔ لکچرار جغرافیہ مہاراجہ کالج میسور۔ سید محی الدین صاحب ایم اے۔ صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ میسور۔

تقسیم کار اور سہولت کے مدنظر، حسب ذیل شعبوں پر کام تقسیم کر دیا گیا ہے۔

۱۔ شعبۂ تاریخ میسور۔ جس کے عہدہ دار حسب ذیل ہیں۔

صدر۔ مولوی محمود خاں صاحب محمود بنگلوری، مصنف "تاریخ سلطنت خداداد"

معتمد۔ مولوی محمد حسین صاحب ایم اے، ایل، لکچرار اردو و فارسی، سینٹ جوزفس کالج۔

اراکین۔ ۱۔ جناب محمد صالح صاحب بی اے، ایل، ایل، بی ایڈوکیٹ (۲) مولوی محمد اسمٰعیل شریف صاحب بی اے، ایم سی، ایس ڈپٹی کمشنر بنگلور (۳) سید غوث محی الدین صاحب ڈائرکٹر روزنامہ "الکلام" بنگلور (۴) عبدالعزیز خاں صاحب بی اے، وظیفہ یاب ناظم پولس بنگلور۔ (۵) مولوی آر، عبدالقادر صاحب، میسور (۶) عبدالقادر صاحب سروری

۲۔ شعبۂ شعراء و مصنفین میسور۔

صدر۔ جناب غازی صاحب، مدیر "فاکس" بنگلور۔ معتمد جناب حکیم عبدالمنتقم خاں صاحب بنگلور۔

اراکین ۔ ۱۔ جناب نفیس صاحب بنگلوری۔ ۲۔ جناب حسن مشتیٰ صاحب بنگلور۔
۳۔ جناب مولوی شاہ ابوالحسن صاحب ادیب میسور۔ ۴۔ مولوی عبدالواسع
صاحب عصری صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ نالی۔ ۵۔ عبدالقادر صاحب سروری۔

۳۔ شعبۂ تصنیف و تالیف

صدر۔ جناب عبدالقادر صاحب سروری۔ معتمد جناب عبدالقادر صاحب ایم اے۔
اراکین ۔ ۱۔ جناب محمد اباسیٹھ صاحب ایم ایل سی میسور (۲) جناب مولوی
شاہ ابوالحسن صاحب ادیب (۳) جناب میر نور حسین صاحب نور ایم اے، ایل ایل بی
اڈوکیٹ میسور (۴) جناب ایچ آر، عبدالمجید صاحب ایم اے، لکچرار اردو و فارسی
مہاراجہ کالج میسور۔ (۵) جناب ین ناگیا صاحب ایم اے۔

۴۔ شعبۂ تعلیم بالغاں و اردو امتحانات۔

صدر۔ جناب ایچ عبدالغفور صاحب بی اے بی ٹی، وائس پرنسپل گورنمنٹ ٹریننگ کالج میسور۔
معتمد۔ افضل العلماء مولوی سید عبدالحکیم صاحب معلم اردو و فارسی مہاراجہ ہائی اسکول
اراکین۔ ۱۔ جناب وی، جمبھوناتھن صاحب ایم اے لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج میسور
۲۔ بی، عبدالقدوس صاحب بی اے بی ٹی مددگار گورنمنٹ ٹریننگ کالج میسور۔ ۳ مولوی
رکن الدین صاحب سالک معلم اردو و فارسی مہاراجہ ہائی اسکول میسور ۴۔ جناب میر
مرتضیٰ حسین صاحب بی اے بی ٹی صدر مدرس اردو پریکٹسنگ مڈل اسکول میسور۔ ۵۔
جناب غلام محمد صاحب بی اے بی ٹی اسسٹنٹ انسپکٹر اردو مدارس میسور۔ ۶۔ عبدالقادر صاحب سروری۔

۵۔ شعبۂ نسوان۔

صدر۔ محترمہ رحمت النساء بیگم صاحبہ بی اے بی ٹی صدر معلمہ زنانہ نارمل اسکول میسور۔
نائب صدر محترمہ بیگم عنایت حسین صاحب، ٹرافک منیجر میسور معتمد محترمہ سیدہ افضل النساء بیگم صاحبہ
اراکین ۔ ۱۔ محترمہ حبیب النساء بیگم صاحبہ بی اے ایس سی معلم سائنس زنانہ اردو نارمل اسکول میسور
۲۔ محترمہ حکیم ہمایون بیگم صاحبہ لیڈی طبیب زنانہ دواخانہ میسور۔ ۳۔ محترمہ آمنہ خاتون
صاحبہ ایم اے۔ ۴۔ محترمہ سائرہ محمد اباسیٹھ صاحبہ ایم ایل سی۔ ۵۔ سراج النساء بیگم صاحبہ
۶۔ محترمہ اشرف النساء بیگم صاحبہ۔ ۷۔ محترمہ ادیب خالدہ بانو صاحبہ۔

اجلاس شعبۂ تصنیف و تالیف

منعقدہ ۲۰ اگست ۱۹۴۴ء روز یکشنبہ وقت ۶ بجے شام بمکان پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری۔

حاضرین :-

جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری صدر مجلس شعبۂ تصنیف و تالیف۔ جناب
ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب بی اے۔ مددگار مدرس طیبہ ہائی اسکول، میسور۔ جناب مولوی
شاہ ابوالحسن صاحب ادیب لکچرار گورنمنٹ ٹریننگ کالج، میسور۔ جناب
عبدالقادر صاحب ایم اے (علیگ) معتمد۔

لائحہ عمل مرتب اور منظور۔ مجلس انتظامی ادارہ پڑھا گیا اور منظور ہوا جس کی رو سے
۱۔ ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں تصنیف و تالیف کا صحیح ذوق پیدا کرنا اور اس کے لئے
ممکنہ وسائل اختیار کرنا۔
۲۔ نوجوان مصنفین کی رہبری و امداد کرنا اور انکی تصانیف کی اشاعت کا انتظام کرنا۔
۳۔ اردو میں ایسے علوم و فنون پر کتابیں مرتب کرانا اور انہیں شائع کرانا جنکی اردو کو ضرورت ہے۔
۴۔ نئے عالمی ادبی رجحانات اور نمونوں سے عوام کو روشناس کرانا۔
۵۔ صاحب ذوق نوجوانوں کو تصنیف و تالیف اور تحقیق کی طرف راغب کرنا۔

حسب ذیل امور طے پائے۔

۱۔ ایک دارالمطالعہ کھولا جائے جسمیں اردو کے معیاری رسالے منگوائے جائیں۔
۲۔ ادارہ کا کتبخانہ جلد سے جلد قائم کیا جائے۔
۳۔ شعبے کے زیر اہتمام "حلقہ مطالعہ" قائم کیا جائے جسمیں مشاہیر ادیبوں
کی تصانیف کے بہترین حصے پڑھے جائیں اور ان پر بحث و مباحثہ ہو سکے۔
۴۔ ادارے کے رسالے کی اشاعت کا انتظام جلد سے جلد کیا جائے۔
۵۔ مولوی شاہ ابوالحسن صاحب ادیب نے "میسور کے شعراء" پر آئندہ
اجلاس میں جو "حلقہ مطالعہ" ہوگا اپنا مقالہ پڑھنے کا وعدہ فرمایا۔
اور اس کے بعد کے جلسے میں معتمد صاحب نے نئے ادب پر مقالہ
سنانے کا وعدہ کیا۔

جلسہ ساڑھے سات بجے برخاست ہوا۔

(ماہ نامہ)

سب رس

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۸ر

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
مہندر راج سکسینہ ایم ایس سی

جلد ۷ بابت ماہ نومبر ۱۹۴۴ء شمارہ ۱۱

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر سب رس خیریت آباد سے شایع ہوا۔

فریسہ[1] کے نام

اے نازشِ خانداں فریسہ — اے نور و سرور و شادمانی
اے غنچۂ نورس و دل آویز — ہو تیری بہار جاودانی
جھلکے ترے رُخ و جبیں پر — ایمان و یقیں کی ضو فشانی
ہو تیرے لئے مدام دوراں — فردوسِ نشاط و کامرانی

دے تجھ کو نظر امینِ اسرار
صورت گرِ جلوۂ معانی

جو تجھ کو سنا رہی ہے دنیا — میں نے بھی سنا ہے یہ فسانہ
طفلی کے وہ پُر سکون دن رات — وہ نور و نشاط کا زمانہ
آتا تھا مجھے بھی شکلِ انجم — دنیا کے دھوئیں میں جگمگانا
فطرت نے مجھے عطا کیا تھا — پھولوں کی طرح سے مسکرانا
ہر سانس لٹا رہا تھا میں بھی — اک نور و سرور کا خزانہ
ہنستی ہوئی عطر بیز راتیں — وہ چاند کا لوریاں سنانا
گاتی ہوئی دل نواز صبحیں — خورشید کا آ کے وہ جگانا

اب میں ہوں اور اک بجھا ہوا دل
اللہ رے گردشِ زمانہ

بیٹی یہ تجلیاں رہیں دو ہو کا — کچھ اور ہے رسم و راہِ دوراں
عشرت کے یہ دلپذیر اجزا — ہو جائیں گے خود بخود پریشاں
ہستی کا نہیں مقام کوئی — اک موج ہے مضطرب و گریزاں
اک اور زمانہ آ رہا ہے — ہیں جس میں کشاکشیں نمایاں

تجھ کو بھی اسی سے ہے گزرنا — طفلی ہے تری اسی کا عنوان
گہرا ہے فریبِ عصرِ حاضر — ہے اس کی روش حریفِ انساں
مدت سے ہے زندگی کا پہلو — بیگانۂ سوز و سازِ پنہاں
مردوں کا ضمیر تنگ و تاریک — بے نور و ضیا حیاتِ نسواں
اک خوابِ طویل علم و دانش — اک جہل بسیط عقل و عرفاں
وہ گھر ہے مگر حقیقت آگاہ — تو ہے جس گھر کی شمعِ رخشاں

فطرت میں ہو گر یقینِ محکم
ہوتی ہے رہِ حیات آساں

تو راہ سے آشنا نہیں گر — کام آ نہ سکے گی تیز گامی
طوفان کا راز اور کیا ہے — موجوں کی یہی سبک خرامی
انکار ہے موت زندگی کی — ایماں کا صلہ بلند نامی
ہے مادرِ کائنات عورت — اک ہستئ سرمد و گرامی
یہ راز کہیں نہ بھول جانا — رہ جائے گی زندگی میں خامی
آزادئ سیر اس چمن میں — ہے قلب و نگاہ کی غلامی
عرفانِ حیات اور کچھ ہے — کہتی ہے خرد کی ناتمامی
دل چاہیے بیش و کم سے آزاد — ہے رازِ سرور تشنہ کامی
اس بزم میں ہیں خوشی کے اجزا — اندیشۂ خوب و خوش کلامی

ہو جنس کو تیری رشک جس پر
تو پائے وہ ہستئ گرامی

علی اختر

---

[1] ببر حسن صاحب کی چہار سالہ دختر کا نام

ضروری اطلاع :- جو مضامین نظم و نثر سب رس میں اشاعت کے لئے وصول ہوتے ہیں۔ انھیں مجلس ادارت میں پیش کر دیا جاتا ہے اور قابل اشاعت مضامین کو سلسلہ وار شایع کیا جاتا ہے۔ ناقابل اشاعت مضامین واپس نہیں کئے جاتے۔ مضمون نگار اصحاب ان کی اپنے پاس نقلیں رکھیں۔
جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ارم کا ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے۔

شمس الامراء کے سائنسی کارنامے

شمس الامراء کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ خاندان پائیگاہ آصفجاہی امراء میں ہر لحاظ سے ممتاز رہا ہے۔ جاگیرات و مناصب کے علاوہ شاہی خاندان کی لڑکیاں اس خاندان کے امراء سے بیاہی گئیں۔ اکثر افراد سپہ سالاری کے علاوہ وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے اور خطابات و دیگر مراحم شاہی سے سرفراز ہوئے۔ چنانچہ اس خاندان کے کئی امراء کو شمس الامراء کا خطاب ملا۔ امیر کبیر نواب محمد فخرالدین خاں شمس الامرائے ثانی سنہ ۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۷۶ھ میں انتقال کیا۔ یہ سب سے پہلے امیر پائیگاہ ہیں جن کی علم دوستی، علم پروری اور دو نوازی آج تک مشہور ہے۔ وہ اپنے ذوقِ علم و فضل میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے اطراف علماء کا ایک گروہ جمع کر لیا تھا جو تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ اس عہد کے ایک مشہور مصنف خواجہ غلام حسین خاں المخاطب بہ خاں زماں نے اپنی تاریخ "گلزار آصفیہ" میں ان کے علم و فضل اور علمی دلچسپیوں کے متعلق لکھا ہے۔

"آن سرخیل امرائے نامدار امیریست صاحب شان و شوکت و شکوہ ... صاحب تصانیف علوم حکمت علی الخصوص در علم ریاضی کہ عبارت از ہندسہ و ہیئت باشد و نیز در علم جر ثقیل رسالہ ہائے عمدہ تصنیف فرمودہ ستۂ شمسیہ کہ مشہور آفاق اند۔ در نفس الامر علم ریاضی را آن قدر سہل و آسان تر نمود کہ خلقے در ادراک توجہ و شوق بحصول مقاصد و مطالب بلند و آب و دل پسند ارجمندی می رسد اگر بوعلی سینا زندہ می بود و این تحریر دل فزائی داد و نیز در علم حساب رسالہ خلاصہ بہ تحریر تصنیف آوردہ کہ آن علم لطیف خلاصہ تر شدہ بہ فہم و ادراک ہر ذی فہم می آید۔ اگر شیخ بہاؤالدین عاملی می دید بصد دل و بجان بہ ثنائے بے پایاں لب انصاف می کشادہ"[1]

یہی وہ شمس الامراء ہیں جنھوں نے حکمت، ہندسہ، ریاضی وغیرہ میں سب سے پہلی دفعہ اردو میں کتابیں لکھوائیں اور خود تصنیف کیں۔ چونکہ نواب موصوف کو علوم ریاضی و ہیئت سے خاص شغف تھا اس لئے زیادہ تر ان ہی علوم سے متعلق کتابیں فرانسیسی اور انگریزی زبانوں سے ترجمے کرا کے اپنے سنگی چھاپے خانہ میں چھپوائیں۔

یہی نہیں بلکہ ذاتی تحقیق اور تلاش کے لئے انھوں نے ایک رصدگاہ جہاں نما تعمیر کرائی تھی۔

اس مقالہ کی تیاری کے سلسلے میں ہمیں حسب ذیل کتابوں کا پتہ چلا جو ان کی زیر سرپرستی لکھائی گئیں۔

(۱) ترجمہ شرح چغمنی قلمی کتابت قریب سنہ ۱۲۵۰ھ۔
(۲) اصول علم حساب مطبوعہ سنہ ۱۲۵۲ھ۔
(۳) رسالہ مختصر جر ثقیل۔
(۴) رسالہ کسورات اعشاریہ مطبوعہ سنہ ۱۲۵۲ھ
(۵) علم جر ثقیل (ستۂ شمسیہ جلد اول) مطبوعہ سنہ ۱۲۵۶ھ
(۶) علم ہیئت (" دوم) " "
(۷) علم آب (" سوم) " "
(۸) علم ہوا (" چہارم) " "
(۹) علم مناظر (" پنجم) " "
(۱۰) علم برق (" ششم) " "

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ (۲۸۸)

(۱۱) رسالہ علم واعمال کرے کے بیان میں مطبوعہ ۱۲۵۶ھ
(۱۲) منتخب البصر (دورنما) 〃 ۱۲۵۷ھ
(۱۳) کمسٹری کا مختصر رسالہ 〃 ۱۲۵۹ھ
(۱۴) رسالہ مفتاح الافلاک 〃 ۱۲۶۰ھ
(۱۵) رسالہ کیمسٹری 〃 ۱۲۶۱ھ
(۱۶) خلاصتہ الادویہ 〃 ۱۳۶۲ھ
(۱۷) نافع الامراض 〃 ۱۳۶۳ھ
(۱۸) ترکیب ادویہ 〃 ۱۳۶۲ھ
(۱۹) رسالہ حیوانات مطلق 〃 ۱۳۶۴ھ
(۲۰) مرقع تصویرات حیوانات 〃 ۱۳۶۶ھ

نواب فخر الدین خاں نے خود بھی کئی کتابیں لکھیں مگر ان کی اردو کتابوں کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ان ہی کی ہیں۔ اس لئے کہ دیباچہ میں بجائے اپنے نام کے صرف یہ لکھدیا ہے کہ "مصنف اس کتاب کا یہ کہتا ہے۔" البتہ فارسی کتابوں میں اپنے نام کی صراحت کردی ہے۔ مثلاً کتاب "شمس الہندسہ" مطبوعہ ۱۲۴۱ھ کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"می گوید مولف ایں رسالہ محمد فخر الدین خان المخاطب
شمس الامراء........ "کہ کتاب اقلیدس" اگرچہ
حاوی جمیع اصول ہندسیہ است از دقت براہین
وتطویل دلایلش مبتدی را بہرہ وافی.........
نمی داد......... نسخہ خوب از تالیفات موسی کلارک
کہ در زبان فرانسیسی...... بود... دیدم کہ
در آں کتاب اعمال اصول اشکال...... قریب الفہم
کہ از آں کارہائے اعمال بہ آسانی می برآیند مرقوم
اند۔ لہذا......... آں کتاب را از زبان فرانسیسی
بہ زبان فارسی مرقوم نمودہ شد تا در روزگار موجب
یادگار باشد۔"

مذکورۂ بالا عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب صاحب خود بھی مصنف تھے اور فرانسیسی زبان پر کافی عبور تھا۔ فارسی میں ایک سے زیادہ کتابیں لکھیں اور ضرور ہے کہ یہ اردو کتابیں بھی ان ہی کی تصنیفات ہوں۔

ان کے فرزند محمد رفیع الدین خاں عمدۃ الملک شمس الامراء ثالث ۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۳ھ میں انتقال کیا۔ ذوقِ علم وفضل اور شوقِ تصنیف وتالیف اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ چنانچہ مطبع شمس الامراء میں جو کتابیں چھپیں وہ زیادہ تر ان ہی کی فرمائش اور دلچسپی کی وجہ سے لکھی گئی تھیں۔ بعض کتابوں میں صراحت کردی گئی ہے کہ صاحبزادہ نواب محمد رفیع الدین خاں عمدۃ الملک بہادر کی فرمائش پر لکھی گئیں۔

شمس الامراء ثانی نے اپنی فارسی کتاب "شمس الہندسہ" میں اپنے فرزند کی نکالی ہوئی شکلوں کو بھی جگہ دی اور اس کے دیباچہ میں اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"چند اشکال مستخرجہ برخوردار محمد رفیع الدین خاں
در آخر مقالہائے متعلقہ آنہا بہ تفصیل مرقوم ساختہ۔"

انھوں نے زیادہ تر علم ہندسہ اور علم حساب پر اردو میں کتابیں لکھیں جن کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گئے۔ اردو زبان میں اول اول سائنسی موضوعوں پر تصنیف وتالیف کرنے اور دوسروں سے لکھوانے کی وجہ سے عہد حاضر میں نواب رفیع الدین خاں کی شخصیت کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے انھوں نے علوم وفنون کو اردو میں منتقل کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان کی چند کتابوں کے نام جو ہمیں معلوم ہو سکے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) رسالہ علم ہندسہ مطبوعہ ۱۲۵۱ھ (۲) رفیع الحساب مطبوعہ ۱۲۵۲ھ
(۳) تکملہ رفیع الحساب مطبوعہ ۱۲۵۴ھ (۴) رفیع البصر 〃 ۱۲۵۷ھ

(۵) رفیع الصنعت مطبوعہ ۱۲۶۹ھ (۶) رفیع الترکیب مطبوعہ ۱۲۸۱ھ
(۷) تحفۂ گردوان مطبوعہ ۱۲۹۲ھ۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ان کی کئی قلمی کتابیں بھی ان کے خاندانی کتبخانہ میں موجود ہیں جو اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں۔

شمس الامراء کے تیسرے فرزند نواب محمد بدرالدین خاں بہادر معظم الملک تمیز نے جو عنفوان شباب ہی میں انتقال کر گئے۔ ان کے متعلق گلزار آصفیہ کا مصنف لکھتا ہے۔

"اگر فضائل علمی از حکمت و ریاضی وغیرہ بہ ارقام آرد
دفتر بے پایاں باید"[1]

انھیں شعر و شاعری کا بھی بہت اچھا ذوق تھا۔ اپنی یادگار میں ایک دیوان چھوڑا ہے۔ باوجود تلاش کے آپ کی کسی حکمیاتی کتاب کا پتہ نہ چل سکا۔ البتہ ایک قلمی اردو نسخہ انوار بدریہ[2] دستیاب ہوا جو نواب بدرالدین خاں کی خواہش پر کسی کتاب سے ترجمہ کیا گیا تھا۔ شائد ان کی جواں مرگی کی وجہ سے یہ رسالہ چھپ نہ سکا۔ اس میں اقلیدس کی نسبتوں کے متعلق کافی معلومات درج ہیں۔

یہ رسالہ شاہ علی ساکن قلعہ ادھونی کا تصنیف کردہ ہے جو ۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے ختم پر سنہ کتابت درج ہے۔

"اختتام تحریر فی التاریخ بست و چہارم رمضان المبارک
۱۲۵۱ھ"

کتاب کا آغاز مصنف کے حسب ذیل دیباچے سے ہوتا ہے۔

"حسب فرمائش بدرالدین خاں بہادر
جاننا چاہیئے کہ وے نسبتیں جو اقلیدس میں مذکور ہیں اگرچہ کثرت فوائد میں بہتر از شکل عروس ہیں لیکن معانی میں باوجود نزاکت ایسے قلیل الالفاظ کہ جن کا سمجھنا مبتدیوں کو بغایت دشوار بلکہ منتہیوں کو بھی اس لئے ان کو اس ذرۂ بے مقدار شاہ علی ساکن قلعہ ادھونی نے زبان ہندی میں بہ عبارت سلیس مع امثلہ عددی ترجمہ کیا تا فوائد سے ان کے خاص و عام متمتع ہوں اور موسوم بانوار بدریہ کر کے بطریق تحفہ خدمت بابرکت میں نواب معلی القاب ثریا رفعت و گردوں قباب معظم الملک معظم الدولہ محمد بدرالدین خاں بہادر ابن مستطاب امیر کبیر شمس الامراء محمد فخرالدین خاں بہادر کی گزرانا۔
باللہ التوفیق و بہ نستعین۔"

چالیس سرخیوں کے تحت نسبتوں کی تعریفات مع امثلہ درج ہیں چند سرخیاں یہ ہیں۔

"تعریف مقادیر متجانسہ، تعریف نسبت عظمیٰ، تعریف اعداد متناسبہ" وغیرہ وغیرہ بعنوان "تعریف مقادیر متناسبہ" جو بحث صفحہ (۴ تا ۶) کی گئی ہے اس کا اختتام حسب ذیل عبارت پر ہوتا ہے۔

"اگر اول و ثالث کو چار مرتبہ مضاعف کریں اور ثانی و رابع کو دو تو حاصل آٹھ اور بارہ اور آٹھ اور بارہ ہوں گے۔ پس جیسا اول ثانی سے ایک ربع کم ہوگا ویسا ہی ثالث رابع سے۔ وقس علی جمیع المراتب"

$$\frac{9}{12}\quad \frac{3}{15}\quad \frac{4}{8}\quad \frac{2}{1}$$

$$\frac{9}{12}\quad \frac{3}{12}\quad \frac{4}{8}\quad \frac{2}{8}$$

$$\frac{9}{12}\quad \frac{3}{9}\quad \frac{4}{8}\quad \frac{2}{9}$$

اس کتاب میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ قدیم اردو ہے۔ عربی الفاظ اور ترکیبیں جگہ جگہ ملتی ہیں۔

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ (۲۹۱) [2] یہ نسخہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر کے کتبخانہ میں موجود ہے۔

غرض شمس الامراء کے دور میں علم و فن کی جو بلند پایہ غذا انجام پائیں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ میں یہ دور بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے پہلے سائنس، ریاضی، ہئیت اور دیگر جدید علوم و فنون سے متعلق ایسی منظم کوششیں نہیں کی گئی۔ باوجود تحقیق اور تلاش کہ اس سے قبل کی کسی تصنیف یا ترجمہ کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ شمس الامراء کے تراجم اردو میں سائنسی ادب کے اولین کارنامے ہیں۔ ان کی اہمیت اس وجہ سے بھی بہت زیادہ ہے کہ سب کے سب مستند اور اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ تعجب ہے کہ یہ ترجمے حال حال تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی شہرت حیدرآباد سے باہر بہت کم ہوئی۔ اور خود حیدرآباد میں موجودہ زمانہ کے علماء اور بالخصوص ریاضی دانوں اور سائنس دانوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جو ان کتابوں سے پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں۔

نواب فخرالدین خاں شمس الامراء کا علمی شغف اس درجہ تھا کہ وہ حیدرآباد سے باہر کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے بھی واقف تھے اور اس زمانہ میں جتنے اردو۔ فارسی یا انگریزی اخبار چھپتے تھے وہ ان سب کو منگواتے اور ان کے سالانہ فائل مجلد کرا کر رکھتے تھے۔ چنانچہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر کے کتبخانہ میں ان کی اکثر جلدیں محفوظ ہیں۔

ان کے مذاق کی اگر کوئی کتاب ہندوستان کے کسی گوشے میں بھی چھپتی تو وہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرتے اور اپنی کتابوں کی ترتیب کے وقت ایسی جملہ کتابیں ان کے پیش نظر تھیں۔ ان کو جدید ترین علوم و فنون سے گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے "ستہ شمسیہ" کے رسالوں کو انگریزی رسالوں سے جو لندن میں چھپتے تھے منگوا کر اردو میں ترجمہ کرایا۔ اس زمانے میں شمالی ہند میں بھی اس قسم کی کوششیں کی گئیں لیکن تعجب ہے کہ وہاں کے علماء دکن کے ترجموں سے لاعلم رہے۔

شمس الامراء نے انگریزی اصطلاحات کے ترجمے کرائے تھے لیکن شمالی ہند کے ترجموں میں زیادہ تر انگریزی اصطلاحات ہی مستعمل تھیں مثلاً ایسڈ کا ترجمہ یہاں "کھٹا" کیا گیا اور وہاں انگریزی اصطلاح ہی مستعمل رہی۔ اسی طرح کئی اصطلاحیں ہیں جن کا یہاں ترجمہ ہوا اور وہاں اصل اصطلاح ہی استعمال کیجاتی تھی۔

نواب شمس الامراء نے جو کتابیں شائع کیں ان کی زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔ برخلاف اس کے شمالی ہند کے ترجموں کی زبان اور انداز بیان اس قدر آسان اور عام فہم نہیں۔ شمال کی زبان پر عربی کا اثر زیادہ تھا اس لئے وہاں کے مترجمین نے ہیڈروسٹاٹکس اور اوپٹکس کا ترجمہ علی الترتیب علم الماء اور علم الانظار کیا اور دکن میں علم آب اور علم انظار کیا گیا تھا۔

اب ہم اس دور کی ان کتابوں پر جو ہمیں مختلف کتب خانوں سے دستیاب ہوئیں تفصیلی روشنی ڈالیں گے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اردو زبان میں علمی اور حکمیاتی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے شروع ہو چکا تھا۔

ترجمہ شرح چغمینی | اوراق ۱۸۹، سطر ۱۰۔ تقطیع ۶ ۱/۴ × ۸۔ خط نستعلیق ــــ عنوانات سرخی میں۔ متعدد رنگین نقشے بھی شامل ہیں۔ مولف شاہ علی متوطن ادھونی سنہ تصنیف قریب سنہ ۱۲۲۵ھ۔

علم ہئیت کی مشہور فارسی کتاب شرح چغمینی کا یہ ایک آزاد اردو ترجمہ ہے جس کو شاہ علی متوطن ادھونی نے نواب شمس الامراء کی سرپرستی میں سنہ ۱۲۲۵ھ کے قریبی زمانہ میں مرتب کیا۔ مترجم نے اپنا اور کتاب کا نام دیباچہ میں اس طرح لکھا ہے۔

" اس ذرہ بے مقدار شاہ علی متوطن ادھونی نے

مشہور شرح چغمنی کو کہ جس کی عبارت کی دقت
اور معانی کی نزاکت باریک بینان نازک خیال
پر ظاہر و باہر ہے۔ زبان ہندی میں بہ عبارت
سلیس و صاف ترجمہ کر کے اس مہر منیر (شمس الامرا)
کی رائے روشن سے مسائل اصل میں تقدیم و تاخیر
کی اور مسئلہ ضعیفہ کی قوی سے تبدیل"

اس سے قبل مصنف نے مادری زبان میں تعلیم و تدریس
کے فوائد بیان کئے ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں لکھتا ہے:۔

"دانایان روزگار اور عاقلان تجربہ کار پر پوشیدہ
نہیں کہ جس قوم میں زبان مروج سے جو فن ترجمہ
و ترقیم پاتا ہے۔ صاحب زبان نہایت آسانی کے
ساتھ اس فن کا فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ بہ نسبت دوسری
زبان کے مدت قلیل میں حاصل اور کامل ہوتا ہے۔
کیونکہ جو مدت وہاں معرفت الفاظ میں جاتی ہے۔
یہاں وہ تحصیل معانی میں کام آتی ہے۔"

اس کے بعد نواب شمس الامراء کے مساعی کا تذکرہ کیا ہے کہ
انھوں نے کس طرح ذاتی توجہ سے فنون ریاضی اور علوم طبیعی کو یورپین
زبانوں سے اردو و فارسی میں منتقل کیا۔ اور اس سلسلہ میں رغبت
دلائی ہے کہ ہمیں بھی ان کے اس فیض کو عام کرنے کی کوشش کرنی
چاہیے۔

یہ نسخہ غالباً خود مصنف کا مکتوبہ ہے کیونکہ اس میں جگہ جگہ حاشیہ
پر اصلاحیں، تشریحیں اور اضافے درج ہیں۔ تعجب ہے کہ آخر میں
کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ یہ قلمی نسخہ زیور طبع سے
آراستہ ہوا تھا یا نہیں۔

یہ کتاب بالکل اسی تدریسی طرز پر لکھی گئی ہے جو شمس الامراء
کی دوسری مطبوعات کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی شاگرد کے سوالات
اور استاد کے جوابات کے درمیان میں نہایت اچھے رنگین نقشے بھی مضامین
کی وضاحت کے لئے اتارے گئے ہیں۔ عبارت کے نمونے ذیل میں
درج کئے جاتے ہیں:۔

آغاز:۔

"سبحان اللہ کہ جس کی قدرت کا ادنیٰ سا نمونہ یہ ہے کہ
اجرام علویہ اور اجسام سفلیہ کو عدم سے وجود میں لایا
اور ان کے فعل و انفعال سے انواع و اقسام کے
مصنوع ایک سے ایک بہتر سطح زمین پر بنایا۔"

اختتام:۔

"ان کے نزدیک سال قمریہ اصطلاحیہ اور شمسیہ حقیقیہ
میں تفاوت دس یوم گیارہ ساعت بارہ دقیقے ہے
اور موافق ثباتی دس یوم گیارہ ساعت کسر، کم یعنی
ایک دقیقہ تین خمس دقایق ساعت سے اور موافق
بطلیموس دس یوم گیارہ ساعت تین خمس خمس ساعت ہے۔"

اس کے بعد حسب ذیل سرخیاں قائم کر کے فارسی عبارتیں لکھی
گئی ہیں۔

(۱) ترکیب برآوردن روزماہ نو۔ (۲) حساب دانستن قمر کہ در کدام
برج است (۳) حساب قمر در حقرب۔

یہ نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اصول علم حساب — علم حساب کا ایک ابتدائی رسالہ ہے جو
۸/۶ ½ کی تقطیع پر (۸۰) صفحات
میں شائع کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کے آخر میں اعداد لوگارتم کا ایک
جدول ہے جو (۱۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ کے سرورق پر حسب
ذیل عبارت مندرج ہے۔

"اصول علم حساب ہندی زبان میں"
اہل فرنگ کے دستور پر نوسکھوں کے لئے بیچ عہد نواب ملک

جناب بندگان عالی حضرت آصفجاہ نظام الملک نظام الدولہ فتح جنگ میر فرخندہ علی خاں بہادر مدظلہ العالی کے نیچے سنگی چھاپہ خانی سرکار نواب امیر کبیر شمس الامرا بہادر کے شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں بیچ سنہ ۱۲۵۲ھ کے چھپا۔

ابتدا میں ایک فہرست درج کی گئی ہے جس کا عنوان "حساب کے اعمال کی فہرست ہندی زبان میں" رکھا گیا ہے۔ اس کے تحت (۳۷) سرخیاں درج ہیں جن سے اس رسالہ میں بحث کی گئی ہے۔

اس رسالہ کا ایک دوسرا ایڈیشن کتب خانہ جامعہ عثمانیہ سے دستیاب ہوا۔ جس کا نمبر (۵۱۱/الف) ہے۔ یہ رسالہ ۳/۴ کی تقطیع پر (۲۱) سال بعد یعنی سنہ ۱۸۵۱ء میں "کلکتہ اسکول بک سوسائٹی پریس" میں چھپا۔ صفحات کی تعداد (۸۷) ہے۔ اس کے سرورق پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"اصول علم حساب اردو زبان میں اہل فرنگ کے
دستور پر نوسکھوں کے لئے"

اس کے نیچے عبارت بالا کا انگریزی ترجمہ ہے۔ پہلے ایڈیشن کے سرورق پر "ہندی زبان میں" اور اس ایڈیشن کے سرورق پر "اردو زبان میں" درج ہے۔ نیز پہلے ایڈیشن میں فہرست سے پہلے "تنبیہ" کی سرخی کے تحت حسب ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے:-

تنبیہ

"اس کتاب میں اختصار کے لئے کئی علامتیں مقرر کی گئیں تاکہ سیکھنے والوں کو مفید ہو۔

+ جمع کی علامت − تفریق کی علامت × ضرب کی علامت
÷ تقسیم کی علامت : تناسب کی علامت = مساوات کی علامت"

اس دوسرے ایڈیشن میں یہی عبارت فہرست سے پہلے کے صفحہ پر درج کی گئی ہے اور "حساب کے اعمال کی فہرست" کے نیچے بھی "ہندی زبان میں" کی بجائے "اردو زبان میں" لکھا ہوا ہے۔

ہر صفحہ کی پیشانی پر کتاب کی سرخیوں کے نام اردو اور انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً جمع مرکب (Compound Addition) قانون ثلاثی (Rule of Three) وغیرہ۔

یہ رسالہ فورٹ ولیم کالج کے اردو ٹائپ میں چھپا ہے۔

کتاب کے آغاز میں علم حساب کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی ہے۔

"حساب وہ علم ہے کہ جس سے مجہول عددوں کے
نکالنے اور حاصل کرنے کا حال عدد معلوم خاص سے
بآسانی جانا جائے۔"

ابتدائی دو صفحات میں اعداد کی اشکال ان کے لکھنے کا طریقہ اور مراتب کے تعین کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ۱،۱،۱ ہندسے لکھ کر یہ بتایا ہے کہ ان کو ارقام کہتے ہیں۔ فہرست کے مطابق ایک ایک موضوع کو لیکر اس کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک عنوان ہے "جمع کا عمل" جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے جمع کی تعریف اور جمع کرنے کا طریقہ تبلایا گیا ہے۔ بعض عمل کے دو دو تین تین طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ پھر یہ معلوم کرنے کے لئے کہ جمع کا عمل صحیح ہے یا غلط جمع کے امتحان کا طریقہ سمجھایا گیا ہے۔ اور بطریق سوال جواب ہر عمل کی تین تین چار چار مثالیں دی گئی ہیں۔ یہی طریقہ تمام عنوانات مثلاً تفریق، ضرب اور قسمت (تقسیم کے معنی میں استعمال ہوا ہے) وغیرہ میں اختیار کیا گیا ہے۔

(باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

پیشے کا انتخاب اور جدید نفسیات

روزی کمانا انسان کا اولین فریضہ ہے۔ کسب معاش کی غرض سے ہر فرد کو اپنے لئے پیشے کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ دور حاضر میں زندگی کی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے اور ہر فرد زیادہ محنت کرنے پر مجبور ہو رہا ہے، ان معاشی تبدیلیوں نے پیشے کی اقتصادی اہمیت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ پیشے کی اہمیت صرف اقتصادی ہی نہیں بلکہ تمدنی اور اخلاقی بھی ہے۔ ہم اپنے پیشے کے فرائض ادا کرنے میں جو وقت صرف کرتے ہیں اس کا اثر ہماری ذہنی اور عملی دلچسپیوں پر پڑتا ہے۔ ہماری سیرت کا عام رنگ اور ہمارا نظریۂ حیات بڑی حد تک اسی کام کی بدولت معین ہو جاتا ہے۔ ہم پیشہ افراد کی گفتگو، خیالات اور عادتیں ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ پیشے کے ان دوررس اثرات اور اس کی اہمیت کو پروفیسر اشپرانگر نے یوں ظاہر کیا ہے "پیشہ انسان کے لئے نوشتۂ تقدیر بن جاتا ہے۔ چند سال کے عرصے میں وہ انسان کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کی سیرت کی تشکیل کرتا ہے۔ پیشہ ہی ہمارا نہیں ہوتا بلکہ ہم بھی پیشے کے ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ گوشہ ہے جہاں سے انسان دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے۔"

پیشے کے انتخاب کی ضرورت تمدن کے ابتدائی مدارج میں سماج کی ساخت بالکل سادہ تھی بچے اپنے والدین اور بزرگوں کے ساتھ روزمرہ کے کام اور سماجی مشاغل میں حصہ لے کر ضروری معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔ سادہ قوانین، ضابطۂ معاشرت، مذہبی معلومات اور رسم و رواج سے متعلق تمام امور اسی طرح "تعلیم بالعمل" کے ذریعے سیکھ لیتے تھے۔ تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرہ زیادہ پیچیدہ ہوتا گیا اور سماجی زندگی میں اگلی سی سادگی باقی نہ رہی، غیر رسمی تعلیم و تربیت، جو والدین اور بزرگوں کے ساتھ کاروبار میں شرکت کی وجہ سے حاصل ہوتی تھی وہ نئی ضروریات زندگی کے لئے اکتفا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے باضابطہ اور رسمی تعلیم و تربیت کی ضرورت داعی ہوئی۔ طبعی علوم اور تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ ایجادات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا، جس نے زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کیا۔ کارکردگی کی اہمیت بڑھ گئی اور تقسیم کار کو مفید اور ضروری تسلیم کیا گیا۔ ان حالات میں پیشے کے انتخاب کا مسئلہ نہایت اہم اور ناگزیر ہو گیا۔

غلط طریقۂ انتخاب یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہم اپنی زندگی کے بعض نہایت اہم مسائل پر بہت کم غور و فکر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ پیشے کے انتخاب کا ہے۔ ہم اس اہم مرحلے کو بالکل سرسری توجہ سے طے کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ وہ عام بے اطمینانی ہے جو اکثر افراد اپنی پیشہ ورانہ زندگی سے ظاہر کرتے ہیں۔ عمر رسیدہ افراد سے پوچھئے تو انہیں بھی یقین نہیں کہ جو پیشہ انھوں نے اختیار کیا تھا وہ ان کے لئے موزوں تھا۔ وکیل صاحب اپنی ناکامی کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں "کاش میں ڈاکٹر ہوتا" ڈاکٹر صاحب اپنے پیشے کی پریشانیوں سے اکتا کر کہتے ہیں "ملازمت کے زمرے میں داخل ہوتا تو مقررہ اوقات میں مقررہ کام انجام دے کر اپنی زندگی آرام و اطمینان سے گزارتا" ملازمین سے پوچھئے تو وہ پابندیوں اور ترقی کے حدود کا ذکر کر کے آزاد

پیشوں کی خوبیوں کو حسرت سے بیان کریں گے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہر شخص چاہتا ہے کہ کاش وہ کچھ اور ہوتا مگر وہ نہ ہوتا جو ہوا۔ اس پریشانی پر ہمیں متعجب نہ ہونا چاہئے کیونکہ پیشے میں داخل ہونے سے پہلے یہ غور ہی نہیں کیا جاتا کہ فرد کو پیشے سے کوئی مناسبت ہے بھی یا نہیں

عام غلط فہمیاں بعض غلط فہمیاں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ ان کی وجہ سے پیشے کے انتخاب کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہونے پاتا۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ تمام افراد مساوی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ مساوات کا یہ دل خوش کن تخیل صحیح نہیں۔ نفسیات کے جدید ترین شعبے "انفرادی اختلافات" نے ثابت کردیا ہے کہ افراد کی صلاحیتوں میں بہت سے کیفی اور کمی اختلافات ہوتے ہیں یہ خیال ہرگز درست نہیں کہ ہر انسان میں اتنی عام استعداد ہوتی ہے کہ خواہ کوئی پیشہ اختیار کرے وہ کامیاب ہوسکتا ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ محض لگاتار کوشش اور محنت ہر پیشے میں کامیابی کے لئے کافی ہے بعض بڑی ہستیوں کے سوانح بھی بظاہر اس خیال کی تائید کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر غور اور عام مشاہدے سے واضح ہوتا ہے کہ اگر صرف محنت ہی کامیابی کا راز ہوتی تو ہم اکثر سخت محنت کرنے والوں کو معمولی حالت میں نہ پاتے۔

اس سلسلے کی ایک اور غلط فہمی یہ ہے کہ پُرجوش ارادہ ہی بڑے درجے تک پہنچا دینے کے لئے کافی ہے۔ مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ کسی پیشے میں کامیابی حاصل کرنے کی قابلیت کو محض دلی خواہش سے کوئی تعلق نہیں۔ محض نوجوانوں کی خواہش کو بھی پیشے کے انتخاب میں بہت زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ بعض صورتوں میں ایسی خواہش کی نفسی بنیاد طفلانہ پائی گئی ہے۔

نوجوانوں کی غلطیاں پیشے کا انتخاب کرنے میں نوجوان بالعموم جن غلطیوں کا شکار ہوتے ہیں ان کا سرسری ذکر بیجا نہ ہوگا۔ بعض پیشوں کے متعلق یہ حسن ظن ہوتا ہے کہ وہ منفعت بخش، آرام اور سکون و اطمینان کی زندگی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر پیشے میں مقررہ معینہ کام کے خشک مراحل اور تکلیف دہ پہلو ہوتے ہیں، جو ایک بیرونی ناظر کو پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتے پھر کسی کام کو دلچسپ پانا کام کی نوعیت پر ہی منحصر نہیں ہوتا بلکہ شخصی دلچسپی اور رجحانات کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے۔ ایک ہی کام زید کو دلچسپ معلوم ہوسکتا ہے جو ممکن ہے بکر کو خشک اور عمر کو بیزار کن محسوس ہو۔

کبھی نوجوانوں کی نگاہیں غیر معمولی واقعات پر پڑتی ہیں تو آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں۔ کسی بڑے ڈاکٹر کے کامیاب عمل جراحی کی شہرت سن کر یہ خیال کرلینا صحیح نہیں کہ ہر فرد کے لئے ڈاکٹری کا پیشہ اتنی ہی دولت اور شہرت کا باعث ہوگا۔ ہر شخص انجینیر بن کر نظام ساگر جیسا عظیم الشان کارنامہ پیش نہیں کرسکتا۔ صدہا انجینیر اپنی زندگی سڑکوں کی مرمت اور معمولی مکانات کی تعمیر میں صرف کرتے ہیں۔

مروجہ معیار وقعت اور سماجی روایات کے تحت مہذب اور غیر مہذب پیشوں کی تفریق کے باعث بھی اکثر نوجوان ایسے پیشے اختیار کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں کہ ان کا شمار "سفید پوشوں" میں رہے اس طرح اپنے میدان عمل کو تنگ کرلینا نقصان دہ ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص غلہ فروشی میں ایک ڈاکٹر سے زیادہ کمائے اور زیادہ خوش گوار زندگی بسر کرسکے۔

نوجوانوں کی پریشانیاں نوجوانوں پر نظر ڈالئے تو وہ پریشان

حال دکھائی دیں گے۔ ان کی پریشانی کا سبب چند سوالات ہیں جو ان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) "کونسا پیشہ میری ذاتی خوبیوں اور کمزوریوں کے مدنظر مناسب حال ہوگا؟"

(۲) "کونسا پیشہ میرے ذاتی، خاندانی اور سماجی حالات کے لحاظ سے موزوں ہوگا"؟

(۳) "ہر پیشے میں مشکلات، پریشانیاں اور مقررہ کام کے خشک مراحل ہوتے ہیں۔ اپنی طبیعت کی افتاد کے لحاظ سے ان چیزوں کو کس پیشے میں برداشت کرسکوں گا؟"

ان پریشان کن سوالات کا جواب نہ وہ خود دے سکتا ہے، نہ والدین اور نہ اساتذہ۔ بعض بزرگ ذمہ داری کو محسوس کرکے مگر بے بسی کو چھپاتے ہوئے یوں ٹال دیتے ہیں کہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے تمہیں خود اپنے لئے اپنا پیشہ منتخب کرلینا چاہئے۔ خود اعتمادی کی تلقین تو اچھی چیز ہے، مگر آپ سے ایک ڈوبتا ہوا شخص مدد مانگے اور آپ اس سے کہیں کہ "اپنی جان کی حفاظت آپ ہی کرنی چاہئے، ہمت کرکے دس بیس ہاتھ مارو اور کنارے کے کسی موزوں حصے تک پہنچ جاؤ" تو یہ رہبری یا ہمدردی نہ ہوگی۔ پھر اپنی نفسی کیفیات کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ بعض عمر رسیدہ افراد بھی تو اپنے آپ کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ پھر ایک خام کار نوجوان سے معرفت نفس کی ایسی توقع کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے۔

بہرحال بے چارہ پریشان حال نوجوان کسی رہبر کے نہ ملنے سے صحیح مشورے سے مایوس ہوکر اپنے مستقبل کو اتفاقات کے حوالے کردیتا ہے یا مروجہ روایتی طریقوں کو آنکھ بند کرکے قبول کرلیتا ہے۔

مروجہ طریقے ہمارے ملک کا ایک مروجہ طریقہ تو یہ ہے کہ آبائی پیشہ اختیار کرلیا جائے، اس طرح بعضوں کا پیشہ تو گہوارے ہی میں متعین ہوجاتا ہے۔ درزی کا بیٹا درزی، سنار کا بیٹا سنار اور بڑھئی کا بیٹا بڑھئی۔ حالانکہ مغربی ممالک پر نظر ڈالئے تو بعض درزیوں، بڑھئیوں اور لوہاروں کے بیٹوں نے بڑے بڑے درجوں تک رسائی حاصل کی اور ملک کی بڑی سے بڑی خدمت انجام دی۔ ہمارے ملک میں آبائی حکیم ہونا بھی ذاتی صلاحیت کے فقدان کے باوجود صداقت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نوجوانوں کے لئے ان کے والدین اور بزرگ پیشے کا انتخاب کردیتے ہیں۔ بہت سے نوجوان جو پولیس اور فوج میں داخل ہوکر کامیاب ہوسکتے تھے، اس لئے ایسا نہ کرسکے کہ ان کے والدین کو یہ گوارہ نہ تھا کہ ان کے لڑکے وردی پہنیں۔ اس طرح والدین کا مشورہ بعض وقت ان کی رغبت یا نفرت پر منحصر ہوتا ہے۔ یا پھر متذکرہ بالا غلط خیالات پر۔

نوجوانوں کی زندگی کے اس اہم مرحلے کی گتھی کو سلجھانا ایک بڑی انسانی خدمت ہے۔ اس خصوص میں اہل مغرب نے جو طریقے اختیار کئے ہیں وہ ہمارے لئے مشعل ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔

مغربی ممالک میں پیشہ نمائی مغربی ممالک میں پیشے کے انتخاب میں نفسیات پیشہ نمائی سے مدد لی جاتی ہے۔ نفسیات کا یہ جدید شعبہ صنعتی نفسیات اور تعلیمی نفسیات کے امتزاج سے ایک مشترک شعبے کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ پیشہ نما ماہرین نوجوانوں کی ذہنی آزمائش، مخصوص صلاحیتوں کی آزمائش، سماجی اخلاقی اور جذباتی آزمائشوں

کے بعد ان کے تعلیمی اور معاشی حالات پر غور کرکے ماہرانہ مشورہ دیتے ہیں۔

ذہنی آزمایش اس مشورے میں ذہانت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ذہنی آزمایش کے ذریعہ نوجوان کا ذہنی خارج قسمت معلوم کیا جاتا ہے۔ یہ آزمائش کئی سوالات پر مشتمل ہوتی ہے جو مختلف عمروں کے لحاظ سے مرتب کئے گئے ہیں۔ صحیح جوابات کی نشان دہی سے ذہنی عمر معلوم کی جاتی ہے۔ کسی فرد کی ذہنی عمر کو اس کی تاریخی عمر پر تقسیم کرنے سے ذہنی عمر کو اس کی تاریخی عمر پر تقسیم کرنے سے ذہنی خارج قسمت حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ایک دس سالہ لڑکا سوالات کے ایسے صحیح جواب دے کہ اس کی ذہنی عمر بارہ سال حاصل ہو تو اس کا ذہنی خارج قسمت $\frac{12}{10}$ یا ۱۲۰ (جب کہ ۱۰۰ اوسط قرار دیا جائے) ہوگا۔

مختلف پیشوں کی تحلیل کی گئی ہے اور یہ معلوم کیا گیا ہے کہ ہر پیشے میں کامیاب ہونے کے لئے کم از کم کس قدر ذہنی خارج قسمت (ذ۔خ۔ق) ضروری ہے۔ مثلاً میکانیکل انجینیرنگ کے لئے ذ۔خ۔ق ۱۱۰ ہونا چاہئے اور اہلکاری کے لئے ۹۰ کافی ہے۔ ان اعداد سے یوں رہبری کی جاتی ہے کہ جس نوجوان کا ذ۔خ۔ق ۱۱۰ سے کم ہو اُس کو میکانیکل انجینیرنگ کا پیشہ اختیار کرنے سے منع کیا جاتا ہے کیونکہ اس پیشے کے فرائض ادا کرنے میں زیادہ ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جس کا ذ۔خ۔ق ۹۰ سے زیادہ ہو اس کو اہلکار بننے کا مشورہ نہیں دیا جاتا کیونکہ اس کی ذہانت کے لحاظ سے وہ اعلیٰ تر سطح کا کام کرسکتا ہے۔ .... جس طرح کمتر ذہانت کا آدمی اعلیٰ تر پیشے کے فرائض اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا۔ اسی طرح بہتر ذہانت کا آدمی کمتر سطح کے پیشے کے فرائض سے اکتا جاتا ہے اور بڑی بے دلی سے کام کو انجام دیتا ہے۔

اس کے علاوہ ذہنی خارج قسمت معلوم کرنے سے وہ سطح معلوم ہو جاتی ہے جس پر کوئی فرد پہنچ سکتا ہے۔ ذیل کے جدول سے اس کا اندازہ ہوگا۔

ذہنی خارج قسمت	پیشہ ورانہ سطح
۵۰ تا ۶۰	ادنیٰ مزدوری یا سادہ کام
۶۰ تا ۷۰	بازگشتی کام جس میں مہارت درکار نہو۔
۷۰ ″ ۸۰	ادنیٰ مہارتی بازگشتی کام
۸۰ ″ ۹۰	نیم مہارتی۔ اہلکارانہ (معمولی)
۹۰ ″ ۱۱۰	مہارتی۔ اہلکارانہ (خصوصی) ٹکنیکل
۱۱۰ ″ ۱۲۵	اعلیٰ ٹکنیکل۔ اعلیٰ اہلکارانہ۔ انتظامی
۱۲۵ ″ ۱۴۰	پروفشنل اور اعلیٰ انتظامی
۱۴۰ سے زیادہ	اعلیٰ پروفشنل اور نظم ونسق

اس جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوائے ان افراد کے جن کا ذ۔خ۔ق ۵۰ سے بھی کم ہو یعنی جن کی عقل ایک ۷ سالہ لڑکے سے بھی کم ہو کسی کو بھی روزگار کے مواقع سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔

مخصوص صلاحیتیں ذہنی خارج قسمت سے تو وہ بلند سطح معلوم ہوتی ہے۔ جہاں تک فرد پہنچ سکتا ہے۔ مگر یہ معلوم کرنے کے لئے کہ فرد کس میدان عمل کے لئے موزوں ہے مخصوص صلاحیتوں کی آزمایش کی جاتی ہے۔ ایسی متعدد معیاری آزمایشیں مرتب ہوچکی ہیں مثلاً میکانی صلاحیت کی آزمایش۔ اشکال کے تعلقات سمجھنے کی آزمایش۔ موسیقی کی صلاحیت کی آزمایش۔ اہلکارانہ

صلاحیت کی آزمائش وغیرہ وغیرہ۔

ان آزمائشوں کے بعد فرد کی اخلاقی، سماجی اور جذباتی خصوصیات معلوم کی جاتی ہیں۔ ان کے لئے جو آزمائشیں مرتب ہوئی ہیں وہ اتنی عام نہیں کہ ہر ملک میں استعمال کی جاسکیں۔ ان میں بہت سی مقامی خصوصیات شامل ہیں۔ علاوہ ازیں وہ زیادہ قابلِ اعتماد بھی نہیں اس لئے پیشہ نما ماہر سوال بند کے ذریعہ والدین اساتذہ اور ساتھیوں سے کچھ معلومات حاصل کرتا ہے۔ بالآخر بالمشافہ گفتگو سے بھی اپنی رائے قائم کرتا ہے۔

اس سارے مواد کو یک جا جمع کیا جاتا ہے۔ تعلیمی کیفیت اور طبی معائنے کی رپورٹ بھی پیش نظر رہتی ہے۔ اس طرح نوجوانوں کا ایک مکمل نفسی مرقع حاصل کرنے کے بعد پیشہ نما ماہر ایک ماہرانہ مشورہ دیتا ہے۔

حبیب احمد

تعلیم کا مسئلہ :- از ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ - قیمت عہ -

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کی ایک جدید کتاب "تعلیم کا مسئلہ" شائع ہوئی ہے جس میں حسب ذیل عنوانات پر مفید اور ضروری معلومات درج ہیں:-

(۱) تعلیم و تربیت کا مقصد (۲) تعلیم کی مدت (۳) موجودہ نظام تعلیم کے مدت (۳) موجودہ نظام تعلیم کے نتائج و نقائص (۴) اعلیٰ تعلیم کا صحیح نصب العین (۵) علم کی وحدت (۶) انسانی وحدت کی تعلیم (۷) ایمان اور علم (۸) ابتدائی اور ثانوی تعلیم (۹) اعلیٰ تعلیم (۱۰) تعلیمی منزلیں اور نصاب (۱۱) جامعہ کے شعبہ جات (۱۲) طالب علم اور عملی سیاسیات -

ملنے کا پتہ - سب رس کتاب گھر خیریت آباد -

نغمہ

نغمہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ماضی کی دلچسپ اور رنگین ساعتیں فنا کی وادی میں گم ہوجائیں ـــــــ وقت خواہ کتنی ہی تیزی سے کیوں نہ گزر جائے گراں رنگین ساعتوں کی یاد ہمیشہ قلب پر مترنم گیت برساتی رہتی ہے۔

نغمہ کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب محبت کے طوفانی سمندر میں سکون کی سی کیفیت پیدا ہوجائے ـــــــ خواہ وہ سکون نتیجہ ہو کامیابی کا یا انتہائی افسردگی اور مایوسی کا ـــــــ اس وقت جب روح کے لطیف جام میں سکون کی شراب ختم ہوجائے۔ نغمے کے دھیمے دھیمے شیریں راگ سنائی دیتے ہیں۔

نغمہ ان نازک ساعتوں میں پیدا ہوتا ہے جب دوشیزۂ بہار مضامینِ محبت سے گنگنانے لگے ـــــــ وہ نوجوان قلب میں اس وقت پرورش پاتا ہے جب ماہِ حسنِ وفا شعار اپنے آپ کو محبت کے سپرد کردے.... ....

نغمہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ وہ محبت کرنے والے کی مایوس آنکھوں سے اشکوں میں تحلیل ہوکر بہنے لگے۔!

انسانی زندگی گو بالآخر غموں کی پُرپیچ اور کٹھن راہوں کو طے کرتی ہوئی اپنی منزل کو پہنچ جاتی ہے مگر کبھی بھی وہ نغمہ اور ترنم سے محروم نہیں رہتی۔

نغمہ.. ترنم.... روح.... انسانی زندگی.... مصائب و آلام

نغمہ... ترنم.......

افضل صدیقی

صاحبانِ انقلاب

صبحدم جب نور و تاریکی تھے گرمِ اختلاط
اٹھ رہی تھی آسماں سے ماہ و انجم کی بساط

رات کے دو نیزہ لمحے صبح کا منہ چوم کر!
اک نئی دنیا کو جاتے تھے خوشی میں جھوم کر!

ایک عالم پر تھا طاری نیم بیداری کا خواب
تھا ابھی اوڑھے ہوئے کہرے کی چادر آفتاب

زندگی احساسِ نو کے موڑ پر گاتی ہوئی!
آسمانوں سے نسیم خوش گوار آتی ہوئی!

جیسے جیسے چلتے جاتے تھے سہانے پن کے تیر
کھنچتی جاتی تھی گل و غنچہ پہ سونے کی لکیر!

جا رہا تھا میں بھی اس عالم میں بستی سے ادھر
رات کی مانند، صبحِ نو سے نظریں پھیر کر!!

یادِ ماضی، فکرِ مستقبل میں، چہرہ زرد سا
نیند سے آنکھیں تھیں بوجھل، سر میں ہلکا درد سا

زندگی جب موت ہو، یہ جام لے کر کیا کروں
فطرتِ فیاض کا انعام لے کر کیا کروں
اب مئے منظر سے کیا، جب مٹ چکا نظروں کا جوش
اب نہ سرشاری کی طاقت ہے نہ بیداری کا ہوش

ہاں تو میں بھی جا رہا تھا دور بستی سے ادھر
اس طرف! یعنی جہاں ہیں کچھ "خداوندوں" کے گھر

وہ خداوندانِ گیتی، وہ معزز سود خوار!
صاحبانِ دولت و زر، حاکمانِ ذی وقار!

عشرت و راحت کے خوگر، لعنتوں کے رازداں
رحمتِ یزداں کے مرکز، شیطنت کے پاسباں

دیدۂ احساس خوابیدہ، وہ دن ہو یا کہ رات
پتھروں کی مورتیں، اک چلتا پھرتا سومنات!

ہاں تو اے ہمدم، انھیں کے پاس جانا تھا مجھے
چند معصوموں کی تقدیریں بنانا تھا مجھے!

اپنی خودداری کے ہاتھوں آج خود بسمل تھا میں
اپنا خنجر، اپنی گردن، آپ ہی قاتل تھا میں!

جم گئی تھیں پپڑیاں ہونٹوں پہ، چہرہ تھا اداس
رفتہ رفتہ آ گیا اک قصر کی پھاٹک کے پاس

دیکھتا کیا ہوں کہ کچھ خدام ہیں سرگرمِ کار
اپنے آقا کے نمونے، بدکلام و بدشعار!

پھر گھبرایا ہوا چہرہ نظر کیوں دیکھتے!
موڑوں کو پوجنے والے، ادھر کیوں دیکھتے

پیٹیاں باندھے کمر پر، ناز فرماتے رہے
مسکراتے جھومتے، آتے رہے جاتے رہے!

سچ بتانا! کیا یہی ہیں "صاحبانِ انقلاب"؟
اس طرف آئیں! کدھر ہیں طالبانِ انقلاب!!

نظر (حیدرآبادی)

غزل

محبت دل میں رہ سکتی نہیں ہرگز نہاں ہوکر
یہ بول اٹھتی ہے خاموشی کے منہ میں بھی زباں ہوکر

غنیمت جانتا تھا میں تمہاری مہربانی کو
مگر تم اور دلکش ہوگئے نامہرباں ہوکر

یہ ذرّے، یہ مہ و خورشید، یہ گل اور یہ شمعیں
نشاں یہ دے رہا ہے کون بے نام و نشاں ہوکر

محبت میں ہزاروں بار یہ موقعہ بھی آیا ہے
کہ میں نے ان سے باتیں کی ہیں سرتاپا زباں ہوکر

خضر کے آسرے سے گمرہی بہتر ہے الفت میں
یہاں رہرو بھٹکتا ہے شریکِ کارواں ہوکر

میں اک معیار رکھتا ہوں مرا سجدہ وہ سجدہ ہے
جبینِ شوق رہ جائے گی جزوِ آستاں ہوکر

منیرؔ ان سے بہت ممکن تھا پھر سے صلح ہوجاتی
مجھے کھویا ہے میرے رازداں نے رازداں ہوکر

منیرؔ چغتائی (لاہور)

غزل

دل کو نگہہ لطف و کرم راس کہاں ہے
ہر شخص مگر صاحبِ احساس کہاں ہے

گتھی یہ سلجھ جائے۔ کوئی آس کہاں ہے
وہ پاس ہے میرے۔ تو مرے پاس کہاں ہے؟

مفروضۂ اربابِ خرد۔ حدِّ خرد تک!
دیوانۂ منزل کے لئے یاس کہاں ہے

ہنستے ہوئے ہونٹوں کو تحمّل تو سکھاؤ
ہاں میری وفاؤں کا تمہیں پاس کہاں ہے

بیتابیٔ پیہم کی دعا مانگ رہا ہوں!!
کہہ دیجئے یہ "چیز" مرے پاس کہاں ہے

جاتا ہوں کہاں وحدتِ معنیٰ سے گزر کر
ہر پھول میں ہر طرح کی بُو باس کہاں ہے

سطحیتِ حسنِ بتِ رنگیں پہ نہ جانا
آئینہ حریفِ رخِ الماس کہاں ہے

ہر سانس تری یاد کو دیتا ہے ہوائیں
آہوں کے لئے مہلتِ انفاس کہاں ہے

اے شادؔ جو ہو قوّتِ بازو کا نتیجہ!
وہ نانِ جویں داخلِ افلاس کہاں ہے

شاد عارفی

بھول جا

"احمد عظمیٰ کا شمار ہر کی زبان کے اچھے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ خود اس مختصر سے افسانے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کی نظریں کتنی وسیع ہیں"

میں چاہتا تھا کہ تمہارے والد کی موت کا دکھ بھلانے کے لئے تمہارا دل بہلاؤں۔ بہت سوچا، پر سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں تمہیں کیونکر بہلاؤں کیسے شانتی دوں؟

کیا تمہیں کچھ یاد ہے کہ میں نے دیر تک چپ رہنے اور کچھ سوچتے رہنے کے بعد تمہیں کیا کہا تھا؟ نہ بھلائی جانے والی مجھے اچھی طرح یاد ہوگا۔ لیکن تم نہیں جانتیں کہ اس کا انجام کیا ہوا؟

لو میں بتائے دیتا ہوں، پر خدا کے لئے اس پوتر بندھن پر نہ پچھتاؤ جو ہمیں باندھے ہوئے تھا اور جس کا نام میں اپنی زبان پر نہیں لا سکتا۔

میری غربت نے دنیا میں میرے لئے کوئی ٹھکانہ نہ چھوڑا۔ میں جانتا تھا کہ اپنے اور تمہارے تعلقات پر کبھی بھی پردہ نہ رہ سکے گا لیکن میں نے اپنی دانست میں اسے نبھا لیا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ تم میرے لئے اپنا جیون، اپنا سکھ، اپنی امنگیں، اپنی تمنائیں یہاں تک کہ اپنا کہلا سکنے والا سبھی کچھ مجھ پر نچھاور کرنے کو تیار ہو۔ لیکن میرے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ میں اپنی خوشی کے لئے تمہارا جیون ناش کر دوں، تمہاری امنگوں پر پانی پھیر دوں اور تمہیں گرہستی کے قابل بھی نہ رکھوں۔

آہ میں نے اس دن کتنا جھوٹ بولا تھا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور میں تم سے کہہ رہا تھا۔

"میں ایک خوش حال اور امیر زمیندار کا لڑکا ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔ وہی میٹھی باتیں آج میری زندگی کا اندر ہی اندر خاتمہ کئے دے رہی ہیں۔ یہ کچھ آج ہی کی بات نہیں اس وقت بھی جب میں تم سے جھوٹ اور سفید جھوٹ کہہ رہا تھا اس کے خیال ہی سے میری سانس باہر نکل رہی تھی۔

مجھے تمہاری وہ نظریں بھی یاد ہیں جن سے تم نے مجھے اس وقت دیکھا تھا۔ اس کی چوٹ کے گھاؤ میں آج بھی کسک اٹھتی ہے۔ من میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ حالانکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس وقت انجان بن کر اپنی آنکھیں نیچی کر لی تھیں۔

چلتے ہوئے میں نے یہ بھی کہا تھا —

"کل انگورہ جا رہا ہوں فصل پکنے تک لوٹ نہیں سکوں گا"

"تمہیں کچھ پتا بھی ہے مجھ پر کیا بیتی؟"
شاید تم نے کبھی سوچا ہی نہ ہو!
میں بھی بتانا نہیں چاہتا!

آنسو اور آہیں..... تمہاری یاد! لیکن — یہ سن کر تو مجھے بہت ہی مسرت ہوئی کہ تم اب ایک سکھی اور مالدار زمیندار کی جیون ساتھی ہو اور سکھی بھی ہو۔

میری آنکھیں جو آج ڈبڈبائی ہوئی ہیں تمہیں ہنستا دیکھ کر ہنس سکتی ہیں تم مجھے بھول گئی ہوں گی! "ضرور ہی!" پیاری زہرہ! تمہیں اپنے شوہر کو اپنانا ہوگا کیونکہ تمہارا دیوتا، تمہارا سب کچھ وہی ہے۔ اس کی خوشی میں تمہاری خوشی ہے۔"

(ہندی سے ترجمہ) **وحید یوسف زئی**

(مغلیہ دربار کی ایک جھلک)

رات اپنے پورے سنگھار میں کھڑی تھی۔ اُس نے اپنے کندھوں پر ایک تاروں بھرا دوشالہ بھی ڈال لیا تھا۔ اس کے خوبصورت ماتھے پر چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ دنیا والے دن بھر کے تھکے ماندے پیر پھیلائے سو رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ مگر کبھی کبھی رات کی خاموشی میں کسی کی ایک دردناک آہ سنائی دیتی۔ زمانے کی نیرنگیوں پر تاسف کرنے والا دہلی کا لال قلعہ تھا جو :-

دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار

کچھ اُداس سا کھڑا تھا۔ چاند کی کرنیں جھک جھک کر اسے چھیڑتیں۔ ننھے ننھے تارے اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتے۔ رات کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں لوریاں دے دیکر اُسے سلانا چاہتیں۔ مگر وہ عہدِ رفتہ کی یاد میں غمگین کھڑا رہا۔ اس کی بھی قسمت کا ستارا کسی وقت اوجِ امارت پر درخشاں، تیرہ بختوں پر چشمک زنی کیا کرتا تھا۔ وہ بڑے بڑے شہنشاہوں کی خواب گاہ رہ چکا تھا۔ وہ رنگیلے شہزادوں کی عشرت گاہ رہ چکا تھا۔ مگر اب؟ اب وہ ایک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ تھا۔ اب وہ اکبرِ اعظم کہاں تھے؟ ان کے وہ نورتن کیا ہوئے جو ہر وقت ان کے شاندار دربار میں جھلملاتے رہتے؟ اکبر کے وہ عشرت پسند فرزند سلیم کیا ہوئے، جنھوں نے اپنے عدل و انصاف سے ہندوستان بھر میں ایک ہل چل مچا دی تھی؟ جس نے جہانگیرِ عادل کا خطاب پایا تھا؟ ان کی وہ ملکہ کیا ہوئیں جو حقیقت میں نورِ جہاں معلوم ہوتی تھیں؟ قلعہ کے لبوں تک ایک سرد آہ آ کر رک گئی۔ اب تو سوائے چند انگریز سپاہیوں کے اور کوئی پرسانِ حال نہ تھا!

ایک سپاہی نیند میں سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور بندوق سنبھالتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ اُسے دور سے کسی کے تھکے ہوئے قدموں کی آہٹ آ رہی تھی۔

کون ہے؟ اس نے کڑکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ایک تھکا ماندہ مسافر، منزلِ مقصود سے بہت دور کندھے پر ایک گٹھڑی اٹھائے ہوئے آ رہا تھا۔ اس کے تھکے ہوئے پاؤں ہر ہر گام پر رک جاتے تھے۔ مسافر سپاہی کے قریب آ کر رک گیا۔ اس نے سپاہی کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا اور رات بھر کی پناہ مانگی۔ سپاہی نے ایک نظر اس کے مایوس اور افسردہ چہرہ پر ڈالی اور ایک طرف کو اشارہ کر دیا۔ بیچارہ مسافر دعائیں دیتا ہوا اس جگہ پہنچا جس طرف کہ سپاہی نے اشارہ کیا تھا۔ اُسنے اپنے دُکھتے ہوئے کندھے پر سے گٹھڑی اتاری اور قلعہ کی آغوش میں سو گیا۔

کچھ ہی دیر بعد مسافر کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا کہ قلعہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے جس پر ایک شاندار شاہی پرچم لہرا رہا ہے۔ مسافر جلدی سے اس میں داخل ہو گیا۔ اسے ہر طرف مرمریں حوض نظر پڑے جن میں گلاب کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ جن میں سفید کنول کے پھول کوئی باوقار راج ہنس کی طرح تیر رہے تھے۔

ہر طرف خوش رنگ گل و برگ لہلہا رہے تھے اور ان پر خوش الحان چڑیاں میٹھے سُر الاپ رہی تھیں۔ مسافر جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا قلعہ کے اندر داخل ہوا۔ قلعہ اس قدر روشن تھا کہ مسافر کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ وہ جلدی سے ایک طرف کو بڑھ گیا۔ وہاں چل کر اس نے اپنے آپ کو ایک بڑے سے دالان میں پایا جس میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ جن کے بیچ میں شہنشاہ جہانگیر جلوہ افروز تھے۔ وہ بار بار مڑتے اور ہر گھڑی ان کی پُرجلال نگاہ ایک میزان پر پڑتی جو تخت کے پیچھے ایک مرمریں دیوار پر آویزاں تھی۔ شہنشاہ کے جاہ و جلال کو دیکھ کر مسافر کانپ گیا اور آہستہ سے دربارِ عام کا منظر پیچھے چھوڑتا ہوا باہر نکلا۔ سامنے اُسے ایک دوسرا محل نظر پڑا۔ مسافر ایک اور چمن میں سے گزرتا ہوا اس محل میں داخل ہوا۔ محل کے درمیان میں سے ایک نہر بہہ رہی تھی۔ جس میں ایک طرف بہت سی لڑکیاں نہا رہی تھیں۔ نہانے کے بعد کوئی گلاب کے فوارے کے نیچے کھڑی ہو جاتی تو کوئی عطر کے۔ غرض کہ ان کے میٹھے قہقہوں سے سارا محل گونج رہا تھا۔ مسافر اور آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ سامنے ایک زرق برق پردہ پڑا ہے۔ جس میں لعل و زمرد جھلملا رہے ہیں۔ مسافر نے آہستہ سے اُسے اٹھالیا اس کے آگے ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ جس کی مرمریں دیواروں پر چھوٹے چھوٹے آئینے جڑے تھے اور اس کے بیچ میں ایک بڑا سا شیشہ کا چراغ آویزاں تھا جس کا عکس دیوار پر پڑنے سے معلوم ہوتا کہ ہر طرف ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹما رہا ہے۔

کمرے کے درمیان ایک تخت پر نورجہاں بیٹھی تھی۔ یہ اس کا سنگھار خانہ تھا۔ بہت سی سہیلیاں اس کے سنگھار میں مصروف تھیں۔ کوئی اس کے لانبے لانبے سیاہ بالوں میں موتی پرو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے تاروں بھرا دوشالہ نورجہاں کو اوڑھا دیا ہے۔ اس کی لاجواب پوشاک پر ہیرے اور یاقوت ٹکے تھے۔ کوئی سہیلی اس کی پوشاک پر عطر اور گلاب پاشی کر رہی تھی، جس کی بھینی بھینی خوش بو سے سارا محل معطر ہو رہا تھا۔ کوئی سہیلی چنور ہلا رہی تھی تو کوئی سونے کا پنکھا جھل رہی تھی۔ بعض سہیلیاں ملکہ کے آگے بیٹھی اس کی دلجوئی کا سامان کر رہی تھیں۔ کوئی ستار اور طنبورہ پر سُریلے نغمے گا رہی تھی تو کوئی پچیسی اور چوسر میں شہزادی کا دل بہلا رہی تھی۔ ہر لمحہ شہزادی کا شیریں قہقہہ سنائی دیتا اور وہ اپنے گلے سے کوئی خوبصورت ہار یا پاس سے کوئی بیش بہا خلعت ان کی طرف پھینک دیتی۔

"با ادب باملاحظہ ہوشیار" کی شاندار صدا نے سب کو چونکا دیا۔ سہیلیاں ادب سے ہاتھ باندھے کھڑی ہو گئیں۔ ملکہ نورجہاں بھی مسکراتی ہوئی آہستہ سے شہنشاہ کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے میٹھے چہرے کی مسکراہٹ کو دیکھ کر شہنشاہ جہانگیر کچھ دیر کے لئے سلطنت کے پریشان کن مسئلہ کو بھول گیا۔

شہنشاہ اور ملکہ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے ایک مرمریں تخت پر بیٹھ گئے۔ ان کے آگے زمین پر سفید اور سیاہ مرمر کی شطرنج بنی تھی۔ بہت ساری لڑکیاں مہروں کے بجائے اس بساط پر کھڑی تھیں۔ شہنشاہ اور ملکہ دونوں کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے۔ کبھی شہنشاہ اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کوئی چال سوچنے لگتا اور کبھی ملکہ کی بھی جبینِ ناز پر شکنیں پڑ جاتیں۔ لڑکیوں کو ادھر ادھر ہٹایا جاتا۔ کچھ دیر بعد ملکہ کے شیریں قہقہہ سے جہاں پناہ کی شکست کا پتہ چلا۔ شہنشاہ مسکراتا ہوا مگر بادل ناخواستہ اٹھ کر اپنے تختِ طاؤس پر دربارِ خاص کے لئے روانہ ہوا شہزادی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور ہاتھ میں تیر اور کمان لئے ہوئے اپنی سہیلیوں کے ساتھ باغ میں چلی گئی۔

دفعتاً سارے محل میں ایک تلاطم برپا ہو گیا تھا۔ ملکۂ جہاں پناہ کے تیر نے کسی رہ گیر کو ہلاک کر دیا تھا! جب شاہ جہانگیر کو یہ خبر پہنچی تو غصہ سے اس کی ابروئے عدل پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے ایک عام دربار کا حکم دیا۔

ملکۂ نورجہاں ایک چلمن سے پردہ کے پیچھے دربارِ عام میں کھڑی تھی اور شہنشاہ جہانگیر اپنے اسی تخت پر جلوہ افروز تھا جس کے پیچھے ایک میزان آویزاں تھی!

جہانگیر کے لئے عجیب وقت آن پڑا تھا۔ اس کا پُر جلال چہرا انصاف اور محبت کی زبردست کشمکش کا آئینہ دار تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ انصاف نے فتح پائی کیونکہ معاً جہانگیر کا چہرہ رنج و الم کی ایک تصویر بن گیا۔ جہانگیر ایک شوہر کی حیثیت سے نہیں بلکہ جہانگیر عادل کی حیثیت سے تخت پر بیٹھا تھا اور اس کے آگے اس کی عزیز از جاں ملکہ نورجہاں ایک مجرم کی حیثیت سے کھڑی تھی۔ سارے دربار میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی جس میں شہنشاہ کی زبردست آواز گونج گئی۔ "خون کے بدلے خون یہی جہانگیری عدل ہے"! لوگ دربار میں اس حکم سے تھرّا اٹھے۔ مگر جہانگیر کی ابرو پر بل تھا نہ شکن حالانکہ یہ وہی نورجہاں تھی جس کی پیشانیٔ نازک پر ذراسی گرہ پڑ جاتی تو جہانگیر بےچین ہو جاتا۔ واہ! کیا انصاف کیا تھا جہانگیر عادل نے! ملکہ نورجہاں کے قتل کا حکم دے دیا تھا! مگر سب درباریوں نے ہاتھ جوڑ کر شہنشاہ سے عرض کی کہ:-

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

ملکہ نورجہاں رہا کر دی گئی۔ شہنشاہ نے دربار کو برخواست کیا اور آہستہ آہستہ سر جھکائے حرم کی طرف گیا جہاں نورجہاں اپنے تخت پر کسی سوچ میں غرق بیٹھی تھی۔

شہنشاہ جہانگیر نے آہستہ سے جھک کر ملکہ کے خوبصورت نازک پیروں کو چوم لیا اور کہا:-

'تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من!'

ملکہ مسکرائی۔ اس نے شہنشاہ کو اپنے پیروں پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ میرے سرتاج ایک مغل بادشاہ کا باوقار سر کسی کے آگے بھی خم نہیں ہوتا۔ میری ملکہ جہانگیر نے مسکرا کر جواب دیا "محبت اور حسن کے دربار میں شہنشاہوں کے سر بھی جھک جاتے ہیں!"

مسافر دیر ہی کھڑا دونوں کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا۔ اتنے میں شہنشاہ کی نگاہِ پُر جلال اس پر پڑی۔ مسافر بھاگنے کے لئے راہ ڈھونڈنے لگا۔ اس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر جہاں پناہ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ کھیل گئی۔ انھوں نے جیب سے کچھ جواہرات نکالے اور مسافر کی طرف پھینک دئے۔ مسافر اپنی گھبراہٹ اور پریشانی سب کچھ بھول گیا۔ وہ جلدی سے دوزانو ہو کر جواہرات بٹورنے لگا۔ اسے کسی نے زور سے ایک لات ماری۔ مسافر بلبلا اٹھا: اس نے دیکھا کہ اس کے آگے ایک سپاہی کھڑا ہے۔ مسافر نے اس کی کوئی پروا نہ کی جواہرات بٹورنے لگا۔ سپاہی کی ایک اور لات نے بیچارے مسافر کو حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے دکھتے ہوئے کندھے پر گٹھڑی اٹھائی اور چپکے سے چل کھڑا ہوا۔

کچھ آگے چل کر مسافر رک گیا۔ اس نے غم نصیب قلعہ کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے قلعہ نے بھی اس کے ساتھ ایک آہ بھری ہے۔ مسافر یہ شعر پڑھتا ہوا منزلِ مقصود کی طرف چل دیا ؎

ہے تو گورستاں مگر تو خاکِ گردوں پایہ ہے　　آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے!

خدیجہ بلگرامی

گُزارش

یہ عنایت چاہتا ہوں ایک لمحے کے لئے
پاس تیرے بیٹھ جاؤں ——!
ختم ہو ہی جائیں گے جو کام ہیں دیگر مرے
تیرے جلووں سے جو ہو جاتا ہے دلِ اوجھل مِرا
راحتوں سے ہوتا ہے نا آشنا ——!!
ایک بحرِ بیکراں ہیں میری محنت، میرے کام
بن کے رہ جاتے ہیں اک بارِ گراں ——

آ گیا ہے موسمِ گریا دریچے کے قریب
اپنی آہوں اور سرگوشی کے ساتھ ——
گلستاں کے اک شگفتہ کنج میں
شہد کی ننھی، فراواں مکھیاں
گا رہی ہیں بے خودی کے ساز پر
وقت ہے اب بیٹھ جاؤں تیرے چہرے کے قریب
یہ عنایت چاہتا ہوں ایک لمحے کے لئے ——!!

تحسین سروری

حیدرآباد کی نئی آبادی

(ڈاکٹر امیر علی صاحب ہاشم نے آج سے چار سال قبل یہ تقریر حیدرآباد ریڈیو سے نشر فرمائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے حیدرآباد کی عمرانی زندگی کے ایک اہم پہلو پر عالمانہ نظر ڈالی ہے اور اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ چونکہ یہ تقریر اپنے موضوع کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے اس لئے ہم اسے سب رس میں شائع کر رہے ہیں)

بیسویں صدی کے ان پہلے چالیس سال میں شہر حیدرآباد کیا سے کیا ہو گیا۔ سرکاری اور خانگی عمارتیں کتنی تیار ہوئیں اور شہر کی ہر سمت نئی نئی کتنی آبادیاں بسائی گئیں۔ یہ سب ایسے امور ہیں جن سے عام طور پر حیدرآباد کا ہر باشندہ واقف ہے۔ اس مختصر تقریر میں مجھے ان نئی آبادیوں کا محض ذکر کرنا مقصود نہیں۔ میں کوشش یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اقتصادی نقطۂ نظر سے ان کی طرف توجہ دلاؤں اور اگر ممکن ہو تو اس کا اندازہ کرنے کی کوشش کروں کہ یہ آبادیاں کن اثرات کے تحت وجود میں آئیں اور ان کے وجود سے ہماری سماج پر کیا اثرات پڑ رہے ہیں اور آئندہ پڑیں گے۔

حیدرآباد کی نئی آبادیوں کے وجود میں آنے کے خاص اسباب کا ذکر کرنے سے قبل تین چار ایسی عام سماجی قوتوں کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا جن کی ہر سماج تابع رہتی ہے۔

سب سے پہلے یہ امر قابل لحاظ ہے کہ بنی نوع انسان کی سماجی دنیا کے آغاز ہی سے بستیاں ہر وقت آباد اور برباد ہوتی رہیں۔ ہر نئی آبادی کے ساتھ کوئی نہ کوئی پرانی آبادی اجڑتی رہی۔ دنیا کے چند خطے ایسے بھی ہیں جہاں تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایک بار نہیں سات سات مرتبہ یہاں نئی آبادیاں قائم ہوئیں۔ اپنے عروج کو پہنچیں اور برباد ہو گئیں۔ بقول شاعر کے ؏
سیکڑوں شہر بسائے کئی ویران کئے۔

حیدرآباد کی آبادی کا یکایک پھیلنا اس پرانی دنیا کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دنیا کے تقریباً ہر ملک کی تاریخ میں ایسے بہت سے دور پائے جائیں گے جن میں شوق تعمیر و وسعت آبادی نے چند ہی سال میں نئے نئے شہر آباد کر دئے۔ چنانچہ دکن میں بھی ابتداً ہندو راجاؤں نے اور بعد کو مسلمان بادشاہوں اور امرا نے کئی خوبصورت عمارتیں بنائیں جو اب تک ان کے عہد کی یاد تازہ کرتی ہیں اس حقیقت کو بھی جانتے ہیں کہ اسلامی سماج میں شوق تعمیر خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ اسپین سے چین تک اور بخارا سے جاوا تک جہاں کہیں مسلمان رہے بسے وہاں انھوں نے نہ صرف مساجد اور خانقاہیں بنائیں بلکہ سرائیں اور محلات بھی کھڑا کئے۔ دوسرے ممالک کی طرح مغل بہمنی اور قطب شاہی اور آصفی عہد میں حیدرآباد کے مسلمانوں نے سیکڑوں عمارتیں تعمیر کیں جن میں سے کئی ایسی ہیں جو اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔

دوسرا قابل لحاظ امر یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی نئی نئی ایجادات نے دنیا کے ہر طبقہ کی زندگی میں اس قدر سرعت کے ساتھ انقلابات پیدا کر دئے ہیں کہ گزشتہ تیس چالیس سال کی طرز زندگی پر بھی پوری طرح عمل پیرا رہنا ہمارے لئے غیر ضروری بلکہ ایک حد تک ناممکن ہو گیا ہے۔ مثلاً گنجان بستیوں میں رہنا اس لئے لازمی تھا کہ حمل و نقل میں آسانی ہو، وقت پر ایک دوسرے

کی مدد کرسکیں اور آپس میں روابط قائم رہیں۔ اب ٹیلیگراف، موٹر، ٹیلی فون کی بدولت دور دور بھی رہ کر یہ ضروریات پوری ہوسکتی ہیں۔ ریڈیو کی بدولت جنگل میں بھی رہ کر دنیا بھر کی روزانہ خبریں اور موسیقی پروگرام اور تقریر سننے کا موقعہ مل سکتا ہے۔ سمنٹ کی سڑکوں نے موٹروں کی سواری کو اور بھی آسان کردیا۔ یہ سب اور ایسی متعدد ایجادات بنی نوع انسان کی طرز معاشرت پر اس قدر موثر ہیں کہ دنیا بھر میں لوگ گنجان بستیوں کو چھوڑ کر دور دور کشادہ مقامات پر سکونت اختیار کررہے ہیں۔

شہر نیویارک میں ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو دریائے ہڈسن کے اس پار رہتے بستے ہیں اور ہر روز موٹر کو جہاز پر سوار کرکے شہر نیویارک میں اپنے کاروبار کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ لندن میں لاکھوں آدمی ریل کے ذریعہ اپنے مکانات سے کارخانوں اور دفاتر کو آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان عظیم الشان شہروں کے علاوہ بھی شاید کوئی ایسا شہر ہو جس کی گنجان آبادی گزشتہ پچاس سال میں کشادہ میدانوں میں منتقل نہ ہوئی ہو۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ حیدرآباد کی آبادی کے پھیلنے میں یہ عالمگیر اثرات بھی شامل تھے۔

یہاں تک تو میں نے ان اقتصادی قوتوں کا ذکر کیا جو حیدرآباد کے باشندوں کو عام طور پر نئے نئے مکانات بنانے کے لئے اور نئی نئی بستیاں آباد کرنے کی طرف مائل کرتے آئے ہیں۔ بے شک یہ قوتیں ایسی ہیں جن کے خلاف عمل کرنا یا ان سے موثر نہ ہونا انسان کے لئے غیر ممکن ہے۔ باوجود اس کے یہ بھی ضرور ہے کہ صرف ان عام اثر قوتوں کی بنا پر حیدرآباد کی آبادی اس قلیل مدت میں اس قدر نہ پھیل سکتی اگر یہاں کوئی خاص وجوہ بھی آبادی کو پھیلنے کی ترغیب دینے کے لئے نہ ہوتے۔

ان خاص وجوہ میں پہلا نمبر ۱۹۰۸ء کی طغیانی کو دینا چاہئے جس میں ہزاروں گھر مسمار ہوگئے اور ہزاروں غریب اور متوسط درجہ کے لوگ خانہ برباد ہوگئے۔ اس حادثہ نے شاید پہلی مرتبہ حیدرآباد کے باشندوں کو مستقلانہ طور پر شہر کے باہر بسنے کی ترغیب دی۔ خود حکومت نے بھی کئی انسدادی تدابیر کیں اور جدید تعمیر کے کام کے لئے ایک محکمہ آرائش بلدہ قائم کیا۔ مدارالمہام وقت نواب سالارجنگ بہادر ثالث کی تحریک پر حضرت **اقدس و اعلیٰ** نے آرائش بلدہ کی اسکیم کو شرف منظوری بخشا جس کی وجہ سے غلیظ مکانوں کی جگہ اچھے مکانات بنائے گئے۔ سڑکیں کشادہ کی گئیں اور شہریوں کے لئے پارک اور چمن بھی لگائے گئے۔

آبادی کے منتقل ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ حیدرآباد میں چند سال تک متواتر طاعون اس شدت سے آیا کہ شہر چھوڑ کر باہر بسنا ہر امیر غریب کے لئے لازم ہوگیا۔ جنگ عظیم کی وجہ سے اس زمانہ میں تعمیر گرانی ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ پریشانی کے باعث اس ابتدائی زمانہ میں سلیقہ سے مکان بنانا تو درکنار یہ بھی نہ خیال کیا گیا کہ مکان کی ساخت مضبوط اور دیرپا بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے آرام و آسائش و دیرپائی و حسن کاری اس زمانہ کے بنے ہوئے مکانات میں عموماً بہت کم پائی جاتی ہے۔ اس صدی کے تیسرے دور میں یعنی جنگ عظیم کے چند سال بعد حالات کسی قدر بدلے طاعون اور انفلوئنزا جیسے آفات سماوی اس دہے میں مثل سابق شدت سے درپیش نہ آئے۔ اختتام جنگ کی وجہ ہر چیز ارزاں ہوگئی۔ اس لئے تعمیر امکنہ کی طرف از سر نو توجہ ہونے لگی۔ سکون کی زندگی اور سیر کرنے والوں کو طبع آزمائی

کا زیادہ موقع ملا۔ اس وجہ سے کہ اقتصادی حالات کے تحت جو مکانات بنائے گئے ان میں سے اکثر میں کسی نہ کسی قسم کی جدت پائی جاتی ہے۔ جوبلی ہلس کا پہلا مکان "بنجارہ بھون" اس جستجو کا بہترین نمونہ ہے۔ ہمارے موجودہ میونسپل کمشنر صاحب نے یہ مکان بناتے وقت بہت سی جدتیں پیدا کیں۔ سب سے پہلے انھوں نے مقام ہی ایسا غیرآباد پسند کیا جہاں اس وقت کوئی مکان تھا ہی نہیں۔ دوسرے انھوں نے مکان کی چھت اور دیواریں ایسی بنائیں کہ پورا مکان ایک گوی کی شکل اختیار کرلیا۔ "بنجارہ بھون" کی تعمیر کے بعد جوبلی ہلس پر جدت طرازی کا ایک بے پناہ سیلاب آگیا۔ کوئی اجنٹہ سے کمان ڈھونڈ لایا کسی نے جرمنی میں مزدوروں کے لئے جو نئے مکانات بنائے جارہے تھے ان کے نمونوں کو دیکھ کر تعمیر شروع کی۔ کسی نے ستارے نما ہشت پہلو مکان بناکر قدرت کی حسن کاری کا مقابلہ کیا۔

مختصر یہ کہ اس دور نے نئے نئے گل کھلائے۔ محکمۂ آرائش بلدہ نے لال ٹیکری اور ماں صاحب کے تالاب کے تحت آبادی کے پھیلنے کی توقع میں جو تیاریاں کی ہیں ان کی طرف کسی نے توجہ نہ کی اور ان دس سال میں کم از کم دو ایسے مقامات میں آبادی پھیلی جن کا آباد ہونا دس سال قبل ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ ایک تو بنجارہ پہاڑیوں پر اور دوسرے حیدرگوڑہ کے نشیب میں۔ اول الذکر اونچے مقام پر متمول لوگوں نے یکے بعد دیگر مکانات بنانا شروع کئے اور جن کی ہمت یا رسائی وہاں تک نہ ہوسکی ان متوسط درجہ کے لوگوں نے حیدرگوڑہ کے مرطوب نشیب میں اس کثرت سے مکانات بناڈالے کہ چند ہی سال میں محکمۂ آرائش بلدہ کا کام یہاں بھی از سرنو آغاز کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

اب اس کثرت تعمیر کے معاشی پہلو پر غور کیجئے۔ اراضیات خریدنا، ان پر مکانات بنانا اور مکانات کو کرایہ پر دینا، یہ بھی سرمایہ کا ایک بجا مصرف ہے۔ کوئی اپنے پس انداز کو تجارت میں لگاکر منافع کماتا ہے۔ کوئی صنعت میں کوئی بنک میں رکھواکر، کوئی مکان بناکر۔ اگر معاشی اصول پر مکانات بنانے میں رقم صرف کی جائے تو بے شک فائدہ ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی نے بارہ ہزار کا مکان بنایا اور اس کا کرایہ پچاس روپے آتا ہے۔ تو معنی یہ ہوئے کہ مالک مکان کو پانچ فی صد منافع ملتا رہا۔ اگر یہ شخص بنک میں یہ رقم دو سال کے وعدہ پر رکھ دیتا تو بھی اس سے بہت زیادہ فائدہ نہ ہوتا۔ اسی طرح مکان کی مالیت پچیس ہزار ہو اور اس سے ایک سو روپے کرایہ ملے یا پچاس ہزار کے مکان سے دوسو روپے کرایہ ملے تو دونوں صورتوں میں تخمیناً اسی پانچ فی صد حساب سے منافع ملتا ہے۔ لیکن بہت کم ایسے مکان ہیں جن کی مالیت کے مطابق انھیں متواتر کرایہ دار میسر ہوتے ہیں۔ خانگی مکانات کی کثرت کا ایک اور سبب بھی تھا۔

گزشتہ پچاس سال میں بلکہ سالار جنگ اولی کے زمانہ سے آج تک سرکاری دفاتر اور ادارہ جات کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ لیکن ان ادارہ جات کے لئے شہر حیدرآباد میں عمارتیں بہت کم تیار ہوئیں اور ہر نئے دفتر کے لئے ایک خانگی مکان کرایہ پر لیا جانے لگا۔ سیکڑوں مکانات کی مالیت مشخص کی جاکر پانچ فی صد کے حساب سے سرکار کرایہ ادا کرنے لگی اور سرکاری ضرورت کے مدنظر خانگی مکانات کے بھی کرائے بڑھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

؎ نواب مہدی نواز جنگ بہادر

سیکڑوں مکانات اس امید پر بنائے گئے کہ سرکاری ضروریات کے لئے کرایہ پر دیدیئے جائیں گے اور اگر سرکار کو نہ جاسکیں تو خانگی طور پر کرایہ پر دیدئے جائیں گے ۔

عام تجربہ ہے کہ کوئی مکان ابتدائی تخمینہ کے اندر تیار نہیں ہوتا۔ جس کسی نے خود مکان بنایا ہو یا دوسرے کو مکان بناتے دیکھا ہو اس کی گواہی دے گا کہ دس ہزار کا موازنہ بنایا گیا تھا۔ مکان تیار ہوتے ہوتے بیس ہزار خرچ ہو گئے ۔حیدرآباد میں بھی اکثر کا یہی تجربہ رہا اور وہ لوگ جن کی پوری پونجی دس ہزار ہی تھی وہ بیس ہزار خرچ کرکے مقروض ہو گئے۔ باپ دادا کی متروکہ جائداد اور خاندانی زیورات رہن ہو گئے۔ اصل اور سود کی ادائی میں دن کا چین اور رات کی نیند جاتی رہی۔

ابتدائی تخمینہ سے تجاوز کیا جا کر جس قدر بڑا مکان بنایا گیا اسی قدر کرایہ دار فراہم کرنے میں دقت ہونا ضروری تھا۔ بارہ ہزار کے مکان کے لئے پچاس روپیہ ماہانہ کرایہ ٹھیرا لیکن ایسا مکان سرکار کے علاوہ وہی شخص کرایہ پر لے سکتا ہے جس کی آمدنی پچاس سے دس گنی یعنی پانچ سو روپے ہو۔ یہ اور بات ہے کہ جوار کی روٹی کھا کر باریک چاول کا دانہ مونچھ میں لگا کر باہر نکلنے والوں کے متعدد پوتے تو اسے آج بھی دو سو روپے ماہانہ کما کر پچاس روپے ماہانہ کے مکان میں رہتے ہیں۔ لیکن سرکار کے مقررہ اصول کے مطابق آمدنی کا دسواں حصہ کرایہ مکان کے لئے موزوں ہے۔ اس اصول کے مدنظر ملاحظہ فرمائیے ہمارے ملک میں پانچ سو روپے ماہانہ کی آمدنی والے کتنے لوگ ہیں، اور اگر ان سب کو نکال دیجئے، جن کے ذاتی مکانات ہیں تو پانچ لاکھ کی آبادی میں شاید ہی سو دو سو ایسے غریب الوطن نظر آئیں گے جن کو پچاس روپے کرایہ کے مکان کی ضرورت ہو۔ پھر اس طبقے کے ہزار روپے آمدنی والے یعنی ایسے اشخاص جو پچیس ہزار کے مکان کے لئے ایک سو روپے کرایہ آسانی سے دے سکتے ہوں، ان کی تعداد اور بھی کم ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ملک میں سکونت کے مکان پر پچیس ہزار روپے صرف کرنا فائدہ مند نہیں۔ اس لئے کہ بجز سرکاری ضروریات کے بہت کم ایسے لوگ ہیں جو ایسے کرایہ پر لے سکیں۔

اب رہا یہ کہ خود کی سکونت کے لئے مکان استعمال کیا جائے۔ کرایہ پر دینے کے بجائے اگر مالک مکان خود مکان میں رہے تو معاشی نقطۂ نظر سے اس کے یہی معنی ہوئے کہ وہ خود اس کا کرایہ ادا کر رہا ہے۔ پانچ سو روپے کی آمدنی والے کو پچاس روپے بطور کرایہ ادا کرنا یا خود کی آمدنی والے کو پچاس روپے بطور کرایہ ادا کرنا یا خود بارہ ہزار کا مکان بنا کر اس میں رہنا سزاوار ہے۔ لیکن اگر یہی شخص پچاس ہزار کے مکان میں رہتا ہے خواہ وہ اس کا ذاتی مکان کیوں نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ دو سو روپے کرایہ ادا کر رہا ہے کیونکہ اگر یہی پچاس ہزار روپے وہ بنک میں رکھتا تو اسے دو سو روپے ماہانہ آمدنی ہو جاتی۔

محکمۂ آرائش بلدہ نے جو نئے مکانات بنائے ہیں ان میں اسی اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ دس روپے کی آمدنی والے کے لئے ایک روپیہ کرایہ سزاوار ہے۔ اس کے لئے مکان ڈھائی سو کا چاہئے۔ تیس روپے کی آمدنی والے کے لئے تین روپے

کرایہ یا آٹھ سو کی مالیت کا مکان چاہئے اور سو روپے آمدنی والے کے لئے ڈھائی ہزار کا مکان موزوں ہے۔ محکمۂ مذکور نے ہماری آبادی کی درجہ وار آمدنی کا اندازہ لگا کر تین درجوں کے مکانات بنائے۔ ہر ایک ادنیٰ و متوسط طبقے کے آدمی کے لئے موزوں ہو سکتے ہوں۔

سکندرآباد میں جنسی لال بیٹھ بھی انھیں اصول کے تحت بسایا گیا۔ کاش حیدرآباد کے متمول اصحاب کا شوق تعمیر بھی یہی طریقہ اختیار کرتا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔

البتہ پچیس سال کے متواتر تجربے کے بعد گزشتہ چند سال سے مکان بنانے والوں میں کچھ سلیقہ پایا جانے لگا ہے۔ ایک جرمن آرکیٹکٹ نے حیدرآباد میں دو تین ہی سال رہ کر اپنی مہر حیدرآباد کی طرز تعمیر پر لگا دی اور حال ہی میں دو چار نوجوان ملکی آرکیٹکٹ نے مذاق تعمیر میں بہت کچھ اصلاح کی ہے لیکن ان اصحاب کو اب بھی ایسی ایسی فرمائشات سے سابقہ پڑتا ہے کہ وہ فنی اصول سے ہٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہمارے گرم ملک میں بڑے بڑے کشادہ دالان نہایت موزوں ہوتے ہیں۔ لیکن "جرمن فیشن" کے دلدادہ چھوٹے چھوٹے کمرے ہی پسند کرتے ہیں۔ ہمارے مکانات میں گرد، بارش، کیڑے پتنگے، سانپ، بچھو ان سب سے حفاظت چاہئے لیکن سمنٹ کانکریٹ کی جالیاں ایسی خوش نما بنائی جانے لگی ہیں کہ گرد، بارش، کیڑے پتنگے تو کجا پرندبھی ان میں سے داخل ہو کر گھونسلے بنا سکتے ہیں اور چوہے، بلیاں بھی مدعو ہو سکتی ہیں۔

سچ پوچھئے تو میں اس تعمیر کے اثرات (کہ ہمارے سماج پر پڑ رہے ہیں اور آئندہ پڑیں گے) بارے میں زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ کچھ تو اس لئے کہ آپ کے کھانے کا وقت آپہنچا اور کچھ اس لئے کہ گھریلو مسئلوں کے متعلق سوچ بچار کرنا ضروری بھی ہے اور خطرناک بھی۔ چونکہ کمزوری ہے میں نے اس موضوع پر تقریر کرنا قبول کیا۔ خطرناک ہونے کی وجہ سے تقریر کو یہیں پر ختم کرتا ہوں۔

ستاروں کے باشندوں کو یا متقدمین کو آپ جو چاہیں کہیں۔ آپ سے جواب طلبی نہ کی جائے گی۔ لیکن ساتھیوں کی فراست اور دور اندیشی پر لحظہ بھر بھی بدگمانی کیجئے تو آپ گردن زدنی کا حکم لگا دیں گے۔ اگر میں اس گناہ کا مرتکب ہوا ہوں تو معذرت چاہی جاتی ہے۔

امیر علی ہاشم

حیدرآباد ۔ اس کتاب میں عوام اور بچوں کے لئے شہر اور ریاست حیدرآباد کے ضروری حالات سادہ اور سلیس زبان میں درج کئے گئے ہیں۔ اس کے کئی ابواب ہیں جن میں آب و ہوا، پہاڑ، دریا، پیداوار، تاریخ، طرز معاشرت، صنعتیں، زبانیں، طرز حکومت، آثار قدیمہ اور ذرائع حمل و نقل کو خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مرتبہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ بی اے۔ جامعہ عثمانیہ ہیں جن کو انشا پردازی کا خاص ذوق ہے۔ قیمت ۱؍

اشوک اعظم ۔ یہ کتاب مجلس ادبیاتِ اطفال کی طرف سے طلبہ اور عوام کے لئے سلیس اور سادہ زبان میں لکھائی گئی ہے۔ محترمہ سیدہ مہدی جعفری صاحبہ بی اے (عثمانیہ) نے ہندوستان کے اس مشہور فرمانروا کے حالاتِ زندگی اور کارنامے دلچسپ پیرائے میں قلمبند کئے ہیں۔ کتاب باتصویر ہے۔ قیمت ۸؍

آگ

سادھو سنتوں کے میل جول سے بُرے بھی اچھے ہو جاتے ہیں۔ مگر پیاگ کی بدقسمتی تھی کہ اس پر اس کا الٹا ہی اثر ہوا۔ اسے گانجہ، چرس اور بھنگ کا چسکا پڑ گیا۔ جس کا پھل یہ ملا کہ ایک محنتی اور جفاکش نوجوان سے وہ نکما اور نشہ باز بن بیٹھا۔ زندگی کے کارزار میں یہ آرام کہاں۔ کسی درخت کے نیچے دھونی جل رہی ہے۔ ایک لمبی جٹا والے مہاتما بیٹھے ہوئے ہیں۔ چیلے انھیں گھیرے بیٹھے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر سے چرس کے دم لگ رہے ہیں۔ وقفہ وقفہ سے بھجن بھی ہو جاتے ہیں۔ مزدوری میں یہ عیش و عشرت کہاں۔ چلم بھرنا پیاگ کا کام تھا۔ چیلوں کو آخرت میں جنت کی امید تھی۔ لیکن پیاگ کو دنیا میں بھی پھل ملتا تھا۔ چلم پر پہلا حق اس کا ہوتا۔ مہاتماؤں کی پاک زبان سے بھگوان کی حمد و ثنا سنتے ہوئے وہ خوشی سے مست ہو جاتا۔ اس پر غش کی حالت چھا جاتی اور وہ راگ اور رنگ سے بھری ہوئی ایک اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا۔ اس کی بیوی رات کے دس گیارہ بجے اسے بلانے آتی تو پیاگ کو بہت برا معلوم ہوتا۔ اسے دنیا کانٹوں سے بھرے ہوئے جنگل سی دکھائی دیتی۔ لیکن گھر پہونچنے کے بعد جب اُسے معلوم ہوتا کہ ابھی چولھا نہیں جلا ہے اور چنے چبینے کی کچھ فکر کرنی ہے۔ وہ ذات کا "بھر" تھا۔ گاؤں کی چوکیداری اس کی میراث تھی۔ دو روپے اور کچھ آنے تنخواہ ملتی تھی۔ وردی اور صافہ مفت۔ کام تھا، ہفتہ میں ایک دن تھانہ جانا، وہاں افسروں کے دروازوں پر جھاڑو دینا، اصطبل صاف کرنا اور لکڑی چیرنا۔ پیاگ خون کے گھونٹ پی پی کر یہ کام کرتا۔ کیونکہ جسمانی محنت اور روحانی اذیت دونوں کے لحاظ سے یہ نوکری اُسے مہنگی پڑتی تھی۔ آنسو یوں پونچھنے کہ چوکیداری میں اگر کوئی کام تھا تو اتنا ہی۔ لیکن مہینہ میں چار دن کے لئے دو روپے اور کچھ آنے کم نہ تھے۔ پھر گاؤں میں بھی بڑے آدمیوں پر نہیں تو نیچوں پر رعب تھا۔ تنخواہ گویا وظیفہ ہو چکی تھی۔ اور جب سے مہاتماؤں کی صحبت نصیب ہوئی وہ پیاگ کے جیب خرچ کے مد میں آگئی۔ تارک الدنیا سنیاسی بن جانے کا شوق اور بڑھتا ہی گیا۔ ان سنت سنگوں کی صحبت میں آنے سے پہلے وہ گاؤں میں مزدوری کرتا تھا۔ رکیمن لکڑیاں توڑ کر بازار لے جاتی۔ پیاگ کبھی "آرا" چلاتا، کبھی ہل جوتتا۔ کبھی "پور" ہانکتا۔ جو کام سامنے آجائے اس میں جٹ جاتا تھا۔ وہ ہنس مکھ، زندہ دل، خلیق اور جفاکش آدمی تھا۔ اور ایسا آدمی کبھی بھوکوں نہیں مرتا۔ اس پر لطف یہ کہ کسی کام کے لئے نہیں نہ کرتا۔ کسی نے کچھ کہا اور وہ "اچھا بھیا" کہہ کر دوڑتا۔ گاؤں میں اس کی عزت تھی اس کے اس سلوک کی وجہ سے قحط پڑ جانے پر بھی دو تین سال اسے کچھ زیادہ مصیبت نہیں اٹھانی پڑی۔ دونوں عالم کی تو اسے فکر ہی نہ تھی یہ طاقت تو مہاتماؤں کو بھی نہ نصیب ہوئی تھی۔ مہاتماؤں کے دروازوں پر بیلوں کی تین تین جوڑیاں بندھی تھیں تو پیاگ کس گنتی میں تھا۔ ہاں جو کی دال روٹی میں شبہ نہیں تھا، لیکن اب یہ بھی روز بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ اس پر آفت یہ تھی کہ رکیمن بھی کئی سبب سے اتنی شوہر پرست، اتنی فرمانبردار اور اتنی محنتی نہ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں پریشان کن خیالات پیدا ہو چلے تھے۔ ادھر پیاگ کو بس یہی فکر تھی کہ کوئی نامعلوم قوت اسے زندگی کے بکھیڑوں سے نجات دلا دے، اور وہ اطمینان سے بھگوان کے بھجن اور سادھوؤں کی خدمت میں مست ہو جائے۔

ایک دن رکیمن بازار سے لکڑیاں بیچ کر لوٹی تو پیاگ نے کہا۔ "لا کچھ پیسے مجھے دیدے .... دم لگا آؤں"۔

رکیمن منھ پھیر کر بولی "دم لگانے کی ایسی چاٹ ہے تو کام کیوں نہیں کرتے کیا آج کل کوئی بابا نہیں ہیں۔ جا کر چلم بھرو"۔

پیاگ نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "بھلا چاہتی ہے تو پیسے دیدے۔ ورنہ اس طرح تنگ کرے گی تو ایک دن کہیں نکل جاؤں گا۔ تب روئے گی۔ رکیمن انگوٹھا دکھا کر بولی "روئے میری بلا۔ تم رہتے بھی ہو تو کون سونے کا قلعہ بنا دیتے ہو۔ اب بھی چھاتی پھاڑتی ہوں تب بھی چھاتی پھاڑوں گی۔ "تو اب یہی فیصلہ ہے" "ہاں ہاں! کہہ تو دیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں"

"گہنے بنوانے کے لئے پیسے ہیں اور میں چار پیسے مانگتا ہوں تو یوں جواب دیتی ہے،" رکیمن تنک کر بولی "گہنے بنواتی ہوں تو

تمہاری چھاتی کیوں پھٹتی ہے۔ تم نے تو پتیل کا چھلا بھی نہیں بنوایا۔ اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا۔"

پیاگ اس دن گھر نہ آیا تو رکیمن کو فکر ہوئی۔ گاؤں بھر چھان آئی۔ چڑیا کسی اڈے پر نہ ملی۔ اس دن اس نے کچھ پکایا نہیں۔ رات کو لیٹی بھی تو بہت دیر تک آنکھ نہ لگی۔ ڈر ہو رہا تھا کہ کہیں پیاگ نے سچ مچ کچھ کر تو نہیں لیا۔ اس نے خیال کیا۔ صبح سویرے اٹھ کر بیتہ بیتہ چھان ڈالوں گی۔ کسی سادھو سنت کے ساتھ ہوگا! جا کر تھانے میں رپورٹ کر دوں گی۔

ابھی تڑکا ہی تھا کہ رکیمن تھانے چلنے کو تیار ہو گئی۔ کواڑ بند کر کے نکلنی ہی تھی کہ پیاگ آتا ہوا دکھائی دیا۔ لیکن وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک عورت بھی تھی۔ اس کی چھینٹ کی ساڑی، رنگی ہوئی چادر، لمبا گھونگٹ اور شرمیلی چال دیکھ کر رکیمن کا کلیجہ دھم سے ہو گیا۔ وہ ایک لمحہ کی بکی سی کھڑی رہی۔ پھر بڑھ کر عورت کو دونوں ہاتھوں کے بیچ میں لے لیا۔ اور اسے اس طرح آہستہ آہستہ گھر کے اندر لے چلی جیسے کوئی مریض زندگی سے ناامید ہو کر زہر کے گھونٹ پی رہا ہو۔

جب پڑوسیوں کی بھیڑ چھٹ گئی تو رکیمن نے پیاگ سے پوچھا۔ "اسے کہاں سے لا دئے؟"

پیاگ نے ہنس کر کہا "گھر سے بھاگی جاتی تھی۔ مجھے راستے میں مل گئی۔ گھر کا کام دھندا کرے گی۔ پڑی رہے گی۔"

"معلوم ہوتا ہے مجھ سے تمہارا جی بھر گیا۔" پیاگ نے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "دھوت پگلی! اسے تیری خدمت کرنے لایا ہوں" "نئی کے آگے پرانی کو کون پوچھتا ہے۔"

"چل۔ دل جس سے ملے وہی نئی ہے اور جس سے نہ ملے وہی پرانی۔ لا کچھ پیسے ہوں تو دیدے۔ تین دن دم نہیں لگایا۔ پیر سیدھے نہیں پڑتے۔ ہاں دیکھ دو چار دن اس بیچاری کو کھلا پلا دے۔ پھر یہ آپ ہی کام کرنے لگے گی۔" رکیمن نے پورا روپیہ لا کر پیاگ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ دوسری مرتبہ مانگنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

پیاگ میں اور چاہے کوئی گن ہو یا نہ ہو لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ہمدرد ضرور تھا اور اس نے لاپرواہی کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ ایک ماہ تک کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہ ہوا۔ رکیمن اپنی ساری چوکڑیاں بھول گئی تھی۔ بڑے تڑکے اٹھتی۔ کبھی لکڑیاں توڑ کر کبھی چارا کاٹ کر، کبھی اپلے پاتھ کر بازار لے جاتی۔ وہاں جو کچھ ملتا اس کا آدھا تو پیاگ کے ہتھے چڑھتا اور آدھے میں گھر کا خرچ نکل جاتا۔ وہ اپنی سوتن کو کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ پڑوسیوں سے کہتی، بہن سوتن ہے تو کیا۔ ہے تو ابھی کل کی آئی ہوئی۔ دو چار مہینے بھی آرام سے نہ رہے گی تو کیا یاد کرے گی۔ میں تو کام کرنے کو ہوں ہی۔"

گاؤں بھر میں رکیمن کے نیک برتاؤ کے چرچے ہوتے تھے۔ لیکن من چلا اوگھا گھ پیاگ سب کچھ سمجھتا اور اپنے ارادوں کی کامیابی پر خوش ہوتا تھا۔

ایک دن اس عورت نے کہا۔ "بہن اب تو گھر میں بیٹھے بیٹھے جی اکتا گیا ہے، مجھے بھی کوئی کام دلا دو۔"

رکیمن نے تشفی بخش آواز میں کہا۔ "کیا میرے منھ میں کالک لگوانے پر تلی ہو۔ گھر ہی کا کام کئے جاؤ۔ باہر کے لئے تو میں ہوں ہی۔"

سوتن کا نام کوشلیا تھا، جو بگڑ کر سلیا ہو گیا تھا۔ اس وقت تو سلیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن یہ لونڈیوں سی حالت اب اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ وہ دن بھر گھر کا کام کرتے کرتے مرے کوئی نہیں پوچھتا۔ رکیمن باہر سے چار پیسے لاتی ہے تو گھر کی مالک بنی ہوئی ہے۔ اب سلیا بھی مزدوری کرے گی اور مالک پن کا گھمنڈ توڑ دے گی۔ پیاگ پیسوں کا یار ہے۔ یہ بات اس سے اب چھپی نہ تھی۔ جب رکیمن چارا لے کر بازار چلی گئی تو وہ دروازہ پر ٹٹی لگائی اور گاؤں کا رنگ ڈھنگ دیکھنے کے لئے نکل پڑی۔ گاؤں میں برہمن، ٹھاکر، کائستھ، بنئے سبھی تھے۔ سلیا نے بے بسی اور مجبوری کا کچھ ایسا ڈھونگ رچایا کہ

ساری عورتیں اس پر مہربان ہوگئیں۔ کسی نے چاول دیا، کسی نے دال، کسی نے کچھ۔ نئی بہو کی آؤ بھگت کون نہ کرتا۔ پہلے ہی دورہ میں سلیا کو معلوم ہوگیا کہ گاؤں میں کوئی پسنہاری نہیں ہے اور وہ اس کمی کو پورا کر سکتی ہے۔ وہ یہاں سے گھر لوٹی تو اس کے سر پر گیہوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری تھی۔

پیاگ نے پچھر رات ہی سے چکی کی آواز سنی تو رکمین سے پوچھا "آج تو سلیا ابھی سے پیسنے لگی۔" رکمین بازار سے آٹا لایا کرتی تھی۔ اناج اور آٹے کے بھاؤ میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا اسے خیال ہوا کہ سلیا اتنے سویرے کیا پیس رہی ہے۔ اٹھ کر چکی والی کوٹھڑی میں گئی تو دیکھا سلیا اندھیرے میں بیٹھی کچھ پیس رہی ہے۔ اس نے جا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ٹوکری اٹھا کر بولی "تجھے کس نے پیسنے کو کہا ہے، کس کا اناج پیس رہی ہے؟"

سلیا تیز ہو کر بولی "تم جا کر آرام سے سوتی کیوں نہیں۔ میں پیستی ہوں تو تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ چکی کی گھر گھر بھی نہیں سنی جاتی۔ لاؤ۔ ٹوکری دے دو۔ بیٹھے بیٹھے کب تک کھاؤں گی۔ دو مہینے تو ہو گئے۔" "میں نے تو تجھ سے کچھ نہیں کہا۔"

"تم کہو چاہے نہ کہو اپنا بھرم بھی تو کچھ ہے۔" "تو ابھی یہاں کے آدمیوں کو نہیں جانتی۔ آٹا پساتے تو سب کو اچھا لگتا ہے۔ پیسے دیتے روتے ہیں۔ کس کا گیہوں ہے۔ میں سویرے اس کے سر پٹک آؤں گی۔" سلیا نے رکمین کے ہاتھ سے ٹوکری چھین لی۔ اور بولی "پیسے کیوں نہ دیں گے۔ کچھ بیگار کرتی ہوں؟"۔ "تو نہ مانے گی" "تمہاری لونڈی بن کر نہ رہوں گی۔"

یہ تکرار سن کر پیاگ بھی آ پہونچا اور رکمین سے بولا "کام کرتی ہے تو کرنے کیوں نہیں دیتی۔ اب کیا زندگی بھر دلہن ہی بنی رہے گی۔ ہو تو گئے دو مہینے۔" "تم کیا جانو۔ ناک تو میری نہ کٹے گی" سلیا بول اٹھی۔ "تو کیا کوئی بٹھا کر کھلاتا ہے چوکا، برتن، جھاڑو واڑو، روٹی پانی، پیسنا کوٹنا یہ کون کرتا ہے۔ پانی کھینچتے کھینچتے میرے ہاتھوں میں گٹھے پڑ گئے۔ مجھ سے اب یہ سارا کام نہ ہوگا۔" پیاگ نے کہا۔ "تو تو ہی بازار جایا کر۔ گھر کا کام رہنے دے رکمین کرلے گی۔" رکمین بات کاٹ کر بولی "ایسی بات منھ سے نکالتے شرم نہیں آتی۔ تین دن کی دلہن بازار میں گھومے گی تو دنیا کیا کہے گی۔"

سلیا نے بے چین ہو کر کہا "کیا کہے گی دنیا۔ کیا کوئی عیب کرنے جاتی ہوں سلیا کی جیت ہوگئی۔ رکمین کے ہاتھ سے اختیار نکل گیا۔ سلیا کی عملداری ہوگئی جوان عورت تھی۔ گیہوں پیس کر اٹھی تو اوروں کے ساتھ گھاس چھیلنے چلی گئی اور اتنی گھاس چھیلی کر سب دنگ رہ گئیں۔ گٹھا اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ جن مردوں کو گھاس چھیلنے کا بڑا زعم تھا ان سے بھی اس نے بازی مار لی۔ یہ گٹھا بارہ آنے کو بکا۔ سلیا نے آٹا، چاول، دال، تیل، نمک، ترکاری اور مسالہ سب کچھ لیا اور چار آنے بچا لئے۔ رکمین نے سمجھ رکھا تھا کہ سلیا بازار سے دو چار آنے پیسے لے کر لوٹے گی، تو اسے ڈانٹوں گی اور دوسرے دن سے پھر خود بازار جانے لگوں گی۔ پھر سے میری حکومت ہو جائے گی۔ لیکن جب یہ سارے سامان دیکھے تو آنکھیں کھل گئیں۔ پیاگ کھانے بیٹھا تو مسالے دار ترکاری کی تعریف کرنے لگا۔ مہینوں سے ایسی مزیدار چیز نصیب نہ ہوئی تھی۔ بہت خوش ہوا۔ کھانا کھا کر وہ باہر جانے لگا تو سلیا دروازے میں کھڑی تھی۔ بولا "آج کتنے پیسے ملے؟" "بارہ آنے ملے تھے۔" "سب خرچ کر ڈالے کچھ بچے ہوں تو مجھے دیدے۔" سلیا نے بچے ہوئے چار آنے پیسے دیدئے۔ پیاگ پیسے کھنکھناتا ہوا بولا "تو نے آج مالا مال کر دیا۔ رکمین تو دو چار پیسوں میں ٹال دیتی تھی۔" "مجھے گاڑ کر رکھنا تھوڑا ہی ہے۔ پیسہ کھانے پینے کے لئے ہے کہ گاڑنے کے لئے۔" "اب تو ہی بازار جایا کر، رکمین گھر کا کام کرے گی۔"

رکمین اور سلیا میں جنگ چھڑ گئی۔ سلیا پیاگ پر اپنا قابو حاصل کرنے کے لئے جان توڑ کر محنت کرتی۔ پچھر رات ہی سے اس کی

چکی کی آواز کانوں میں آنے لگتی۔ دن نکلتے ہی گھاس لانے چلی جاتی۔ اور ذرا دیر ستا کر پھر بازار کی راہ لیتی۔ وہاں سے لوٹ کر بھی وہ بیکار نہ بیٹھتی۔ کبھی سن کاتتی، کبھی لکڑیاں توڑتی۔ رکیمن اس کے کام میں برابر عیب نکالتی اور جب موقعہ ملتا تو گوبر بٹور کر اُپلے پاتھتی اور گاؤں میں بیچتی۔ پیاگ کے دونوں ہاتھوں میں لڈو تھے۔ دونوں بیویاں اسے زیادہ سے زیادہ پیسے دینے لگیں اور اس کی محبت کا اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے دن رات کوشش کرتی رہتیں۔ لیکن سلیا کچھ اس مضبوطی سے جم کر بیٹھ گئی تھی کہ ہلائے نہ ہلتی۔ یہاں تک کہ ایک دن فریقین میں کھلم کھلا ٹھن گئی۔ ایک دن سلیا گھاس لے کر لوٹی تو پسینے میں تر تھی۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ اس نے سوچا نہا کر بازار جاؤں گی۔ گھاس دروازہ ہی پر رکھ کر وہ تالاب پر نہانے چلی گئی۔ رکیمن نے تھوڑی سی گھاس نکال کر پڑوس کے گھر میں چھپا دی اور گٹھے کو ڈھیلا کر کے برابر کر دیا۔ سلیا نہا کر لوٹی تو گھاس کم معلوم ہوئی۔ رکیمن سے پوچھا اس نے کہا "میں نہیں جانتی" سلیا نے گالیاں دینی شروع کیں "جس نے میری گھاس چھوئی ہو اس کے جسم میں کیڑے پڑیں۔ اس کے باپ اور بھائی مر جائیں۔ اس کی آنکھیں پھوٹ جائیں"۔ رکیمن کچھ دیر تک تو ضبط کئے بیٹھی رہی۔ آخر خون میں ابال آ ہی گیا۔ جھلا کر اٹھی اور سلیا کے دو تین طمانچے لگا دئے۔ سلیا چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ سارا محلہ جمع ہو گیا۔ سلیا کی خوبصورتی اور کام کاج سب ہی کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ وہ سب سے زیادہ گھاس کیوں چھیلتی ہے؟ سب سے زیادہ لکڑیاں کیوں لاتی ہے؟ اتنے سویرے کیوں اٹھتی ہے؟ اتنے پیسے کیوں لاتی ہے؟ ان باتوں نے اسے اپنے پڑوسیوں کی نظروں میں حقیر کر دیا تھا۔ سب اسی کو برا بھلا کہنے لگیں۔ مٹھی بھر گھاس کے لئے اتنا اودھم مچا ڈالا۔ اتنی گھاس تو آدمی جھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ گھاس نہ ہوئی سونا ہوا۔ تجھے تو سوچنا چاہئے تھا کہ اگر کسی نے لے بھی لیا ہے تو گاؤں گھر ہی کا۔ باہر کا کوئی چور تو آیا نہیں۔ تو نے اتنی گالیاں دیں تو کس کو دیں۔ پڑوسیوں ہی کو تو۔

اتفاق سے پیاگ اس روز تھانے گیا ہوا تھا۔ شام کو تھکا ماندہ لوٹا تو سلیا سے بولا۔ "لا کچھ پیسے دیدے دم لگا آؤں تھک کر چور ہو گیا ہوں"۔ سلیا اسے دیکھتے ہی ہائے ہائے کر کے رونے لگی۔ پیاگ نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا ہوا، کیوں روتی ہے؟ کہیں پتہ تو نہیں چل گیا۔ شوہر کے گھر سے کوئی آدمی تو نہیں آیا"۔

"اب اس گھر میں میرا رہنا نہ ہوگا۔ اپنے گھر جاؤں گی"۔ "ارے کچھ منہ سے تو بول ہوا کیا؟ گاؤں میں کس نے گالی دی ہے۔ گھر پھونک دوں اس کا۔ چالان کرا دوں"۔

سلیا نے رو رو کر ساری کتھا کہہ سنائی۔ پیاگ پر آج تھانے میں خوب مار پڑی تھی۔ جھلایا ہوا تھا۔ یہ کتھا سنی تو تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ رکیمن پانی بھرنے گئی۔ وہ ابھی گھڑا ابھی نہ رکھنے پائی تھی کہ پیاگ اس پر ٹوٹ پڑا اور مارتے مارتے بیدم کر دیا۔ وہ مار کا جواب گالیوں سے دیتی تھی۔ اور پیاگ ہر ایک گالی پر اور بھی جھلا جھلا کر مارتا تھا۔ یہاں تک کہ رکیمن کے گھٹنے پھوٹ گئے۔ چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ سلیا بیچ بیچ میں کہتی جاتی تھی۔ "واہ رے تیرا دیدہ۔ واہ رے تیری زبان۔ ایسی تو عورت ہی نہیں دیکھی۔ عورت کاہے کو ڈائن ہے۔ ذرا بھی منہ میں لگام نہیں"۔ لیکن رکیمن اس کی باتوں کو جیسے سنتی ہی نہ تھی۔ اس کی ساری طاقت پیاگ کو کوسنے میں لگی ہوئی تھی پیاگ مارتے مارتے تھک گیا مگر رکیمن کی زبان نہ تھکی بس یہی رٹ لگی ہوئی تھی "تو مرجا۔ تیری مٹی نکلے۔ تجھے بھوانی کھائیں۔ تجھے مرگی آوے"۔ پیاگ رہ رہ کر غصہ میں تلملا اٹھتا اور آ کر دو چار لاتیں جما دیتا۔ لیکن رکیمن کو اب شاید چوٹ ہی نہ لگتی تھی۔ وہ جگہ سے ہلتی بھی نہ تھی۔ سر کے بال کھولے زمین پر بیٹھی انھیں منتروں کا پاٹ کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب غصہ نہ تھا۔ صرف ایک قسم کی ہراسانی تھی۔ اس کی ساری روح بے بسی کی آگ میں جل رہی تھی۔

اندھیرا ہوا تو رکیمن اٹھ کر ایک طرف نکل گئی۔ جیسے آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل جاتی ہے۔ سلیا پک رہی تھی۔ اس نے اسے

جاتے دیکھا بھی لیکن کچھ پوچھا نہیں۔ دروازہ پر پیاگ بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ اس نے بھی کچھ نہ کہا۔

جب فصل پکنے لگتی تو ڈیڑھ دو مہینے تک پیاگ کو کھیتوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ اسے کسانوں سے دونوں فصلوں پر ہل پیچھے کچھ اناج بندھا ہوا تھا۔ اگہن ہی میں وہ کھیتوں کے بیچ میں تھوڑی سی زمین صاف کرکے ایک منڈھوا ڈال لیتا تھا اور رات کو کھا پی کر آگ چلم تمباکو اور چرس لئے ہوئے اسی منڈھوے میں پڑا رہتا تھا۔ جیت کے ختم تک اس کا یہی دھندا رہتا۔ آج کل وہی دن تھے۔ فصل پکی ہوئی تیار کھڑی تھی۔ دو چار دن میں کٹائی شروع ہونے والی تھی۔ پیاگ نے دس بجے رات تک رکمن کی راہ دیکھی۔ پھر یہ سمجھ کر کہ شاید کسی پڑوسن کے گھر سو رہی ہوگی اس نے کھا پی کر اپنی لاٹھی اٹھائی اور سلیا سے بولا۔ "کواڑ بند کرلے۔ اگر رکمن آئے تو کھول دینا اور سمجھا بجھا کر تھوڑا بہت کھلا دینا۔ تیری وجہ سے آج اتنا طوفان ہوگیا۔ مجھے نہ جانے اتنا غصہ کیسے آگیا۔ میں نے اسے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا۔ کہیں کسی کنویں میں گر نہ پڑی ہو۔ کل آفت آجائے گی۔ سلیا بولی۔ "نہ جانے وہ آئے گی کہ نہیں۔ میں اکیلی کیسے رہوں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔" "تو گھر میں کون رہے گا۔ سونا گھر پاکر کوئی لوٹا تھالی اٹھالے جائے تو؟" ڈر کس بات کا ہے۔ پھر رکمن تو آتی ہی ہوگی۔" سلیا نے اندر سے ٹٹی بند کرلی۔ پیاگ کھیتوں کی طرف چلا۔ چرس کی ترنگ میں یہ بھجن گاتا جاتا تھا۔

"ٹھگنی کیا نیناں چمکاوے

کدو کاٹ مردنگ بنائے ... لیمو کاٹ منجیرا

پانچ تروئی منگل گائیں ... ناچے بالم کھیرا

روپا پہن کے روپ دکھائے ... سونا پہن رجھائے

گلے ڈال تلسی کی مالا ... تین لوک برماوے

ٹھگنی کیا نیناں چمکاوے"

ٹھکانے پر پہونچتے ہی اچانک اس نے دیکھا کہ سامنے کھیت میں کسی نے آگ لگائی۔ ایک پل میں شعلے دہک اٹھے۔ اس نے چلا کر پکارا۔ "کون ہے وہاں۔ ارے یہ کون آگ جلاتا ہے"

دھکتی ہوئی آگ نے اپنے لپکتے ہوئے تیز شعلوں کی زبانی جواب دیا۔ اب پیاگ کو معلوم ہوا کہ اس کے منڈھوے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس کی چھاتی دھڑکنے لگی۔ اس منڈھوے میں آگ لگنا روئی کے ڈھیر میں آگ لگنا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ منڈھوے میں چاروں طرف ایک ہاتھ ہٹ کر پکی ہوئی فصل کی چادریں سی بچھی ہوئی تھیں رات میں بھی ان کا سنہرا رنگ جھلک رہا تھا۔ آگ کی ایک لپیٹ صرف ایک ذرا سی چنگاری سارے کھیتوں کو بھسم کردے گی۔ سارا گاؤں تباہ ہو جائے گا۔ انھیں کھیتوں سے ملے ہوئے دوسرے گاؤں کے کھیت بھی تھے وہ بھی جل اٹھیں گے۔ اوہ! لپیٹیں بڑھتی جارہی ہیں۔ اب سوچنے کا وقت نہ تھا پیاگ نے اپنا اپلا اور چلم وہیں پٹک دیا اور کندھے پر لاٹھی رکھ کر بے تحاشا منڈھوے کی طرف دوڑا۔ مینڈوں سے جانے میں چکر تھا اس لئے وہ کھیتوں میں سے ہوکر بھاگا جارہا تھا۔ پل پل میں آگ بھڑکتی جاتی تھی اور پیاگ کے پاؤں اور بھی تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ کوئی تیز گھوڑا بھی اس وقت اسے پا نہ سکتا۔ اپنی تیزی پر اسے خود تعجب ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا پاؤں زمین پر پڑتے ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں منڈھوے پر لگی ہوئی تھیں۔ دائیں بائیں اسے اور کچھ نہ سوجھتا تھا۔ بدحواسی نے اس کے پیروں میں پر لگادئے تھے۔ نہ دم پھولتا تھا نہ پاؤں ٹھکتے تھے۔ تین چار فرلانگ اس نے دو منٹ میں طے کرلئے اور منڈھوے کے پاس جا پہونچا۔ منڈھوے کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ کس نے یہ کام کیا ہے؟ یہ سوچنے کا موقع نہ تھا۔ اسے کھوجنے کی

تو بات ہی اور تھی پیاگ کا گمان رکیمن پر تھا۔ مگر یہ یہ غصہ کا وقت نہ تھا۔ آگ کی لپٹیں شریر بچوں کی طرح ٹھٹھا مارتی اچھلتی، کودتی کبھی داہنی طرف لپکتیں اور کبھی بائیں طرف۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لپیٹ اب کھیت تک پہونچی، اب پہونچی۔ لپیٹیں غصہ سے کیاریوں کی طرف بڑھتیں اور ناکام ہو کر دوسری مرتبہ پھر دگنی طاقت سے لپکتی تھیں۔ آگ کیسے بجھے! لاٹھی سے پیٹ کر بجھانے کا خیال تھا۔ وہ تو بڑی بیوقوفی کی بات تھی۔ پھر کیا ہو! فصل جل گئی تو پھر وہ کسی کو منھ نہ دکھا سکے گا۔ آہ! گاؤں میں کہرام مچ جائے گا۔ تباہی پھیل جائے گی۔ اس نے زیادہ نہیں سوچا گنواروں کو سوچنا نہیں آتا۔ پیاگ نے لاٹھی سنبھالی زور سے ایک چھلانگ مار کر آگ کے اندر منڈھوے کے دروازے پر جا پہونچا۔ جلتا ہوا منڈھوا اپنی لاٹھی پر اٹھایا اور سر پر لئے ہوئے سب سے چوڑی مینڈ پر گاؤں کی طرف بھاگا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی آگ کا گولا ہوا میں اڑتا چلا جا رہا ہے۔ پھوس کی جلتی ہوئی دھجیاں اس کے اوپر گر رہی تھیں۔ لیکن اسے اس کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ ایک بار ایک موٹی سی لکڑی منڈھوے سے الگ ہو کر اس کے ہاتھ پر گری۔ سارا ہاتھ جھلس گیا۔ اس پر بھی اس کے پاؤں پل بھر نہیں رکے۔ ہاتھ میں ذرا بھی ہچک نہ ہوئی۔ ہاتھوں کا جلنا کھیتی کا تباہ ہونا تھا۔ پیاگ کو خود اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ اگر ڈر تھا تو یہی کہ منڈھوے کا وہ حصہ جہاں لاٹھی کا کنڈا ڈال کر اس نے اسے اٹھایا تھا نہ جل جائے کیونکہ سوراخ کے پھیلتے ہی منڈھوا اس کے اوپر آگرے گا۔ آگ کے شعلے اسے بھسم کر ڈالیں گے۔ پیاگ یہ جانتا تھا اور ہوا کی چال سے اڑا جاتا تھا۔ چار فرلانگ کی دوڑ ہے۔ موت آگ کی صورت میں پیاگ کے سر پر کھیل رہی ہے اور گاؤں کی فصل پر۔ اس کی دوڑ میں اتنی تیزی ہے کہ شعلوں کا منھ پیچھے کو پھر گیا ہے اور ان کی دہکنے والی قوت ہوا کے تیز جھونکوں سے لڑنے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہیں تو اب تک بیچ میں آگ پہونچ گئی ہوتی اور آہ و زاری مچ گئی ہوتی۔ ایک فرلانگ تو نکل گیا۔ پیاگ کی ہمت نے ہار نہیں مانی۔ وہ دوسرا فرلانگ بھی پورا ہو گیا۔ دیکھنا پیاگ دو فرلانگ کی اور کسر ہے۔ پاؤں ذرا بھی سست نہ ہوں۔ شعلے لاٹھی کے کندے پر پہونچے اور تمہاری زندگی کا خاتمہ ہے۔ مرنے کے بعد بھی تمہیں گالیاں ملیں گی تم قیامت تک آہوں کی آگ میں جلتے رہوگے۔ بس ایک منٹ اور! اب صرف دو کھیت اور رہ گئے ہیں۔ تباہی۔ لاٹھی کا کنڈا اوپر نکل گیا۔ منڈھوا نیچے کھسک رہا ہے۔ اب کوئی امید نہیں۔ پیاگ جان چھوڑ کر دوڑ رہا ہے۔ وہ کنارے کا کھیت آپہونچا۔ اب صرف دو سکنڈ کا اور معاملہ ہے۔ فتح و کامیابی کا دروازہ سامنے بیس ہاتھ پر ہے۔ ادھر جنت ہے ادھر دوزخ .... مگر وہ منڈھوا کھسکتا ہوا پیاگ کے سر پر آپہونچا۔ وہ اب بھی اسے پھینک کر اپنی جان بچا سکتا ہے لیکن اسے جان کی پرواہ نہیں۔ وہ اس جلتی ہوئی آگ کو سر پر لئے بھاگا جا رہا ہے۔ وہ اس کے پاؤں لڑکھڑائے! ہائے! اب یہ آگ اور زندگی کا کھیل نہیں دیکھا جاتا۔

یکایک ایک عورت سامنے کے درخت کے نیچے سے دوڑتی ہوئی پیاگ کے پاس پہونچی۔ یہ رکیمن تھی۔ اس نے فوراً پیاگ کے سامنے آکر گردن جھکائی۔ اور جلتے ہوئے منڈھوے کے نیچے پہونچ کر اسے دونوں ہاتھوں پر لے لیا۔ اسی دم پیاگ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس کا سارا منھ جھلس گیا تھا۔

رکیمن اس آگ کے الاؤ کو لئے ہوئے ایک سکنڈ میں کھیت کے کنارے پر آپہونچی مگر اتنی دیر میں اس کے ہاتھ جل گئے۔ منھ جل گیا اور کپڑوں میں آگ لگ گئی اس میں اب اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ منڈھوے کے باہر نکل آتی۔ وہ منڈھوے کو لئے ہوئے گر پڑی۔ اس کے بعد کچھ دیر تک منڈھوا ہلتا رہا۔ رکیمن ہاتھ پاؤں پھینکتی رہی۔ پھر آگ

اسے نگل گئی۔ رکیمن نے آگ کی جگہ لے لی۔

کچھ دیر کے بعد پیاگ کو ہوش آیا۔ سارا جسم جل رہا تھا۔ اس نے دیکھا کھیت سے ہٹ کر پھوس کی لال آگ چمک رہی ہے۔ اٹھ کر دوڑا اور پیر سے آگ کو ہٹا دیا۔ نیچے رکیمن کی ادھ جلی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا اور رونے لگا۔

سویرے گاؤں کے لوگ پیاگ کو اٹھا کر اس کے گھر لے گئے۔ ایک ہفتہ تک اس کا علاج ہوتا رہا۔ لیکن بچا نہیں۔ کچھ تو آگ نے جلا دیا تھا جو کسر رہ گئی تھی اسے ظلم کی آگ نے پورا کیا۔

(ہندی سے) **منشی پریم چند آنجہانی مترجمہ افضل عابدی**

دریوزۂ آزادی

مفہومِ غیر فہم کی تفہیم کیا کریں ! خالی ہوں جن کے ہاتھ وہ تقسیم کیا کریں

نیرنگِ اصطلاح میں الجھا ہوا ضمیر مطلب نگار خانۂ الفاظ میں اسیر

بانگِ رحیل کیوں نہ قیادت پہ بار ہو احساسِ فرض، فرض کو جب ناگوار ہو

میری نظر میں قابلِ تحسیں ہیں وہ دماغ روشن ہیں جن کی فکر سے امید کے چراغ

کیا کم ہے یہ کہ، کشمکسِ بیش و کم تو ہے اعزاز و سربلندی کا باقی بھرم تو ہے

اوروں سے آج مانگ رہے ہیں ہمارے ہاتھ وہ حق جو ساتھ لائے ہیں اپنے جنم کے ساتھ!

دشمن کی پیش رفت میں یاں انتشار ہے اور شانتی کی دیوی سمندر کے پار ہے

دورِ جدید مضحکۂ اضطراب ہے خود انقلاب منتظرِ انقلاب ہے

ہمت شکن نہیں، یہ حوادث، یہ مرحلے !

ناداں ! یہ ہیں طلسمِ سیاست کے زلزلے !

بشیر النساء بیگم بشیر

خوشی کے آنسو

شیشہ ایک پتھر سے ٹکرا کر چور چور ہوگیا، اور کارڈ تیل میں تر بتر ہوگیا تھا، بے چارہ لڑکا جس کا سن تخمیناً بارہ سال ہوگا مسلسل رو رہا تھا، دو ایک تماشائی اُسے گھیرے کھڑے تھے، میں جو دفعتاً باہر نکلا اُن محاصرہ کئے ہوئے ایک خضر صورت سے دریافت کیا
"حضرت! کیا تماشا ہو رہا ہے یہ"
آپ نے اپنی ریش مبارک کو چپکے سے کھجلاتے ہوئے فرمایا "سیکل سے ٹکر ہوگئی ہے"
"اور آپ تماشا دیکھ رہے ہیں" میں نے طنزاً مولانا کو ڈانٹ کر پوچھا "کدھر گیا وہ سیکل والا"
ان میں سے ایک نے کہا "وہ تو چلتا بنا"
افسوس لڑکے کی حالت قابل رحم تھی، شیشہ کے ایک ٹکڑے سے اس کی انگلی زخمی ہوگئی تھی،
"ادھر آنا" میں نے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر کہا "اٹھالو اس تیل کے کارڈ کو رونے سے حاصل؟
لڑکے نے ہچکی لیتے ہوئے کہا، اب تو رحمت آپا خوب مارے گی، دو روز سے گھر میں تیل کی ایک بوند بھی نہیں، تم اپنے آنسو تو پونچھ ڈالو، میں اس کا بندوبست کئے دیتا ہوں، میں اسے اپنے گھر لے آیا۔
"تمہارا مکان یہاں کہاں ہے" میں نے لڑکے سے دریافت کیا،
"بازو والی گلی کے موڑ پر"
"اچھا یہ تو بتاؤ تمہارے والد کہاں ملازم ہیں؟" جواب حسرتناک ملا
"اللہ میاں کے پاس" ماں تو ایک ڈیوڑھی میں پڑھانے جاتی ہے"
تیل آنے پر میں نے لڑکے کے حوالے کیا۔ لیکن حیرت تو اس امر کی رہی کہ لڑکا یک لخت تیل لینے سے انکار کر گیا۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "میاں! اسے اپنے گھر لے جاؤ" ___ اور اس تیل کے معاوضہ میں سمجھو۔ جو گر گیا" وہ انکار کی صورت میں سر ہلاتے رہا۔ میرے زیادہ اصرار پر اس نے کہا "رحمت آپا مارے گی"
میں نے کہا، "ارے بابا! ___ مار پڑے گی تو کہنا مت کہ بوتل ٹوٹ گئی تھی،"
"جھوٹ بولنا پڑے گا"
"اس میں جھوٹ کی کیا بات ہے، مار سے تو بچ جاؤ گے"
"مار تو مجھ پر کسی صورت میں پڑے گی، سچ بولوں یا جھوٹ"
میں اس گفتگو پر حیران ہوگیا، "خیر بابا! تمہاری مرضی، یہ تیل تو لے جاؤ"
"رحمت آپا سے پوچھ کر آؤں گا" لڑکا پھر وہی رٹ لگاتا رہا، اور چلتا بنا، میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ دس منٹ گزر گئے. لڑکا نہ آیا۔ ملازم کو میں نے لڑکے کی خبر لینے کے لئے بھیجا ___ وہ آکر کہنے لگا، لڑکے پر بُری طرح مار پڑی ہے۔ وہ باہر کھڑا رو رہا ہے، میں نے ملازم کو دوبارہ لڑکے کے بلانے کے لئے روانہ کیا، تب بھی مایوسی ہوئی۔ "عجیب لڑکا ہے" چونکہ مجھے لڑکے سے ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہو چلی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اس کے گھر پہنچ کر راضی کروں، لڑکا تو مجھے آتا دیکھ کر اندر بھاگ گیا، میں اس کے مکان کے دروازے پر پہونچ کر ایک لمحہ کے لئے خاموش کھڑا رہا۔ معمولی مختصر سا کھپریل کا مکان، لڑکے کا نام بھی مجھے معلوم نہ تھا۔ زنجیر کھٹکھٹانے پر آواز آئی ___ "جمیل دیکھ تو سہی کون آئے ہیں" کون ہیں آپ؟
"آپ کا ہمسایہ، پڑوسی" ___
"کیا چاہتے ہیں آپ" وہی نسوانی آواز آئی۔
"غالباً آپ اس لڑکے کی آپا ہیں۔ دیکھئے تو آپ کے بھائی نے جو بوتل توڑ ڈالی ہے یہ اس کا قصور نہیں محض سیکل کی ٹکر ہو جانے سے یہ حادثہ پیش آیا ہے۔
آواز آئی۔ "آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ!"
"شکریہ تو تیل لینے کی صورت میں قبول کیا جائے گا" میں نے جواب دیا، کوئی جواب نہ آنے پر میں اپنے گھر چلا آیا اور ملازم کے ذریعہ تیل بھجوادیا۔

اس واقعہ کو کچھ دن گزر گئے، مجھے یاد نہیں، کسی کا مجھے شکریہ قبول کرنا پڑا تھا۔ میں مکان تبدیل کرکے ایک دوسرے محلہ میں مقیم تھا ___ اتفاق کی بات ہے ایک دن میں اپنی آنکھوں کا

امتحان کروانے ہسپتال پہونچا، اپنے کام سے فارغ ہو کر باہر جو نکلا — کسی نے مجھے پکارا — مڑ کر دیکھا وہی میرا پڑوسی لڑکا تھا۔

"ارے جمیل! تم اچھے تو ہو، کیسے آنا ہوا یہاں؟"

"ماں بیمار ہے" دوائی لینے آیا تھا"

"تمہاری رحمت آپا تو اچھی ہیں نا، اب بھی وہ کبھی کبھی تمہیں پیٹتی ہوں گی"

"جی ہاں، لڑکا بولا" ایک دفعہ رحمت آپانے پھر مجھے پیٹا تھا —"

"بوتل توڑ ڈالی ہو گی تم نے"

"ہاں، ماں کی دوائی لا رہا تھا، دو ایک ہوائی جہاز سر پر منڈلا رہے تھے، بس جو اوپر دیکھنے لگا ٹکر ہو گئی"

"تب تو تم بڑے خراب آدمی ہو"

"آپ بھی یہی کہتے ہیں" اس نے کچھ افسردہ لہجہ میں کہا،

"اور کیا؟ اس طرح روز بوتلیں توڑ دیا کرتے ہو۔ جانتے ہو کتنی قیمت ہوتی ہے ان کی"

"رحمت آپا کہتی تھیں، چار چار آنے میں ایک آتی ہے"

"اس سے بھی زیادہ — اب احتیاط کرنا"

لڑکا تعمیل کی صورت میں سر ہلایا۔ مجھے جلدی تھی "اپنی رحمت آپا کو سلام کہنا" لڑکے سے میں نے کہا اور رخصت ہوا ————

جانے لڑکے کو میرے دفتر کا پتہ کیسے معلوم ہو گیا۔ شاید میرے سابقہ مکان دار نے بتلایا ہو گا۔ ایک دن وہ میرے پاس آ پہونچا —

"ارے جمیل!" میں نے تعجب سے دریافت کیا۔

لڑکا رونے لگا —

کیا ہوا تھیں، — رحمت آپانے مارا ہو گا، توڑ دی ہو گی کوئی بوتل۔

"نہیں" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔ "ماں چل بسی"

"ارے کب؟"

"چار دن ہوئے" —

"افسوس!" تمہاری آپا کا کیا حال ہے"

"کچھ نہ پوچھئے، کھانا پانی حرام ہو گیا ہے۔ زمین کا بچھونا ہو گئی ہے، آنکھوں سے رات دن آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی ہے"

"آہ — بیچاری — تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی۔ شاید پتہ نہ معلوم ہو گا"

"جی ہاں، اب میں آپ کے مکان دار سے پتہ پوچھ کر یہاں تک چلا آیا"

لڑکے کو ہمراہ لئے فوراً اس کے گھر پہونچا۔ لڑکا میری آمد کی اطلاع کروانے اندر چلا گیا۔ مکان پر ایک قسم کی اُداسی اور موت کی سی خاموشی طاری تھی اور اس فضا سے متاثر ہو کر میرا دل بھی افسردہ ہو چلا تھا۔ قریب سے مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی — لڑکی پردے کے قریب کھڑی رو رہی تھی۔ تعزیتی طور پر میں نے چند تسکین و صبر کے جملے ادا کئے۔ اس کا آدھے سے زیادہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ پردہ کی آڑ سے نظر آ رہا تھا ————

میں نے کہا "رحمت! صبر و شکر سے کام لو — موت یقینی اور برحق ہے۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور راضی بہ رضا رہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اپنی والدہ کی بے وقت موت سے بے حد صدمہ گزرا — مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے — تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ جمیل تو میرا اپنا بھائی ہے — تم بلا پس و پیش اپنی ضرورت کا مجھ سے اظہار کیا کرنا — آخر میں تمہارا ہمسایہ ہوں۔ اور ہمسایہ کو ایک دوسرے پر پورے پورے حقوق حاصل ہیں

میں ہفتہ میں دو ایک مرتبہ اس کے گھر جاتا — کچھ سلائی اور پڑھائی کا کام رحمت کو مل گیا تھا۔ اب وہ قدرے سکون کی زندگی بسر کر رہی تھی۔

کچھ دنوں کے لئے میں اپنی والدہ کی علالت کے سلسلہ میں وطن چلا گیا تھا اور وہاں ایک ہفتہ گزار کر اپنے مستقر پہونچ گیا۔ دفتر کے چپراسی سے معلوم ہوا کہ جمیل ایک دو مرتبہ مجھ سے ملنے کے لئے آ کر گیا اور جب میں دفتر برخاست کر رہا تھا وہ آ پہونچا —

"اچھے تو ہو جمیل" میں نے خیریت دریافت کی۔

"ہاں — آپا نے آپ کو پوچھا ہے"

"کل چھٹی کا دن ہے، حاضر ہوں گا" —

پہلی مرتبہ مجھے مکان کے اندر بلایا گیا — معمولی مختصر سا مکان، جس میں دیوان خانہ ہے نہ حمام، ایک چھوٹا سا دالان — جس کا کچھ حصہ باورچی خانہ کے لئے وقف کیا گیا تھا صحن بہت چھوٹا ————

بہ ایں ــــ مکان قرینہ سے سجا ہوا صاف ستھرا تھا۔ چٹائی پر بچھی ہوئی دری اور اس پر پڑی ہوئی سفید چادر پر جمیل نے لا بٹھایا اور خود باہر چلا گیا۔

"یہ جمیل کہاں چلدئے"ــــ

"بازار گیا ہے" پردے سے آواز آئی ــــ اس اثناء میں جمیل آگیا

"ارے میاں! یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے"ــــ میں نے اپنے متعلق کچھ اہتمام دیکھ کر کہا۔

رحمت آپا کہتی ہیں "کہ آپ کچھ کھائے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتے"

"بھئی، تم اپنی رحمت آپا سے کہہ دینا، اس کی کیا ضرورت ہے" اب مجھے جمیل کے بجائے رحمت سے یہ جواب ملا۔

"اور اس کی کیا ضرورت ہے کہ آپ خواہ مخواہ کے ہمارے لئے تکلیف اٹھائے جاتے ہیں"

"ہمدردی کے معنی اگر تکلیف کے ہیں ــــ تو ایسی ہمدردی سے باز آیا"ــــ دو بڑی بڑی ہنستی ہوئیں آنکھیں، دفعتہً میری نظروں نے پردہ کی آڑ میں ایک حسین مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا ــ اف خدا! میری نظریں ٹھٹک کر رہ گئیں ــــ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے آہ نکل کر رہ گئی

جب میں رحمت کی دعوت کھا کر اپنے گھر روانہ ہوا، میرے پیر ایک شرابی کی مانند لڑکھڑانے لگے، دل حسین فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا، اور آنکھوں میں ایک قسم کی کیف آور خوشی ناچنے لگی، اب میں رحمت کی محبت کے حسین و جمیل خواب دیکھ رہا تھا۔

ایک دن مجھے رحمت کی چٹھی ملی ــ کسی ضروری مشورہ کے لئے اپنے گھر بلایا تھا۔ وہ تنہا تھی اور جمیل اسکول جا چکا تھا۔ وہ تو پردہ کی آڑ میں ہو گئی ــــ اور میں دری پر بیٹھ گیا "رحمت" میں نے کہا اب جب کہ جمیل گھر پر موجود نہیں، مرا یہاں آنا، کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

"یہی تو مشورہ طلب کرنے کے لئے میں نے آپ کو تکلیف دی ہے"۔ میرے ایک قریبی عزیز کل مجھ سے ملنے آئے تھے ان کا خیال ہے کہ میں یہاں تنہا اور اکیلی پڑی رہتی ہوں زمانہ اچھا نہیں ہے ــ

"پھر" میں کسی اور خیال سے چونک پڑا۔

"وہ کہتے ہیں، میں ان کے ساتھ وطن چلی جاؤں"ــ

"اوہ! ــــ میری زبان سے نکلا "ٹھیک تو ہے"ــــ

"آپ بھی یہی مشورہ دیتے ہیں؟"

میرا مشورہ بھلا کیا وزن اور وقعت رکھ سکتا ہے۔ میں آپ کا کوئی عزیز تو نہیں ــــ ایک اجنبی ہمسایہ ــــ

"ایسی باتیں نہ کیجئے، مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے"

"جمیل کیا کہتا ہے اس بارے میں"ــــ

"وہ تو ایک منٹ کے لئے بھی راضی نہیں"ــــ کل رات کہہ رہا تھا "میں تو فرید بھیا کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا" "نادان کہیں کا، فرید بھیا تو کوئی اس کے بزرگ خاندان تو نہیں؟"

"بزرگ خاندان ہو کر کونسے تیر مارے۔ باپ کو مر کر چار سال ہوئے کسی نے ہمارے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھا تھا؟ جو اب ماں کے چلے جانے سے اس تنہائی اور بیچارگی کا احساس ہونے لگا ہے۔ سنئے! ہمارے لئے اس دنیا میں کوئی نہیں، ماں باپ کے ساتھ ساتھ سارے عزیز و اقارب مر گئے" جملہ کے اختتام پر اس کی آواز بھرائی۔

"رحمت" میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ نم آلود پلکوں کے ساتھ تقریباً میرے سامنے تھی۔ اپنے آنسوؤں کو اس طرح رائیگاں صرف نہ کرو ــــ "مجھے تمھیں اس طرح غمزدہ اور پریشان دیکھ کر بڑی روحی تکلیف ہوتی ہے ــ وعدہ کرتا ہوں ــ تم میری عزیز ترین دوست ہوئیں تمھیں ــ اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں"

"آپ ــــ آپ ــ اس کے لب تھرائے" شدتِ جذبات سے وہ کانپ اٹھی۔

"آہ ــ آپ کتنے اچھے ہیں، وہ صرف اتنا کہہ سکی"ــــ

میں رخصت ہونے کے لئے اٹھا ـــــ خیالات کا حسین سہارا لئے ہوئے گھر پہونچا اور ساری رات پُرلطف خیالوں ـــــ اور حسین خوابوں میں گزری ـــــ

ان دنوں گھر پر میری شادی کے تذکرے ہو رہے تھے۔ والد چاہتے تھے کہ لڑکی تعلیم یافتہ اور مالدار ہو ـــــ اور یہ صفات ان کی اپنی بھتیجی میں موجود تھے ـــــ والد کا خیال تھا کہ اپنی بہن کی لڑکی کو بہو بنائے جو ایک معمولی خاندان کی ـــــ معمولی پڑھی لکھی تھی ـــــ اسی کشمکش میں دو ایک مہینے گزر گئے ـــــ دونوں میں سے کوئی ایک بھی نتیجہ پر نہ پہونچ سکے بالآخر اس کا انتخاب میرے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا ـــــ اب میری آزمایش کا بڑا نازک وقت آپڑا ـــــ "فرض اور محبت" دو ایک دن میرے عجیب کشمکش میں گزرے ـــــ آخر کار رحمت کی محبت غالب آگئی۔ بہت جلد میں نے اپنے ارادے کا اظہار والدین سے کر دیا۔ جس کو دونوں نے خوشی خوشی منظور کر لیا۔

ادھر یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ ان حالات سے رحمت قطعاً ناواقف تھی۔ ایک دن علی الصباح میں اس کے گھر پہونچا۔ اس حرکت پر مجھے سخت ندامت رہی کہ میں بلا کسی اطلاع بے تحاشا اندر داخل ہو گیا، وہ ہنوز بستر راحت پر دراز تھی، بیتابانہ میں اس کی طرف بڑھا "رحمت! پیاری رحمت آج سے تم میری ہو، صرف میری" دنیا کی کوئی بڑی سی طاقت بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ آج سے تمہیں اس کلفت بھری درد انگیز زندگی کو خیرباد کہنا پڑے گا، اس غم خانہ کو مسرت کی دیوی جلد سے جلد تمہیں اپنی آغوش میں لینے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ خوشیاں تم پر نثار ہونے کے لئے مضطرب ہیں"

رحمت، حسرت و مسرت کی درمیانی حالت میں مرمریں مجسمہ بنی کھڑی تھی، لیکن بہت جلد اس کی حیرت مسرت میں بدل گئی "ارے! کھڑی کیا ہو، جلد سے جلد سفر کی تیاریاں شروع کر دو ـــــ آج رات ہی کی ٹرین سے ہم وطن جا رہے ہیں، وہاں ہمیں عروسی لباس میں دیکھنے کے لئے والدین، نہایت بے تابی کے ساتھ منتظر ہیں" ـــــ وہ مسکرائی، جس طرح گلاب کی کلی نسیم صبح کے جانفزا جھونکوں سے مسکرا دیتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی کیف آلود آنکھوں میں محبت آمیز جذبہ امنڈ آیا، اور دو انمول آبدار موتی دفعتہً ان آنکھوں میں نمودار ہو گئے ـــــ یہ "خوشی کے آنسو" اس کے جذبات محبت کے بڑی حد تک آئینہ دار تھے

صابر کوسگوی

تصحیح: ـ سب رس بابت اکتوبر ۱۹۴۴ء کے صفحہ (۱۴) پر مرزا ادیب کا ایک افسانہ "جائے پناہ" شائع ہوا ہے۔ افسانہ کے ختم پر مرزا ادیب کے نام کی بجائے سہواً مظفر حسین اظہر شائع ہو گیا ہے، براہ کرم قارئین اس کی تصحیح فرمالیں

اڈیٹر

رات کا بھولا اور دیگر افسانے: ـ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی، عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں۔ مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائٹیل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات (۱۶۸) قیمت عہ

بھاگ متی

(نثری خاکہ)

کردار:- محمد قلی۔ گولکنڈے کا ولی عہد

ملا وجہی۔ قطب شاہی دربار کا شاعر۔ مصنف "قطب مشتری"

بھاگ متی:- چچلم کی حسین رقاصہ

سندر۔ بھاگ متی کی خادمہ

ملازم، نقیب، چوبدار، وغیرہ۔ زمانہ۔ سولھویں صدی عیسوی۔ مقام۔ گولکنڈہ

:: جھنکارہ ::

داستاں گو (گرج دار آواز میں) دور پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

[کسی گرج کی آواز۔ تیز ہواؤں کا صوتی اثر۔ ناچ کی دُھن تیز، ناچ دھیما ہوتے ہوتے۔ پس منظر میں آجائے۔]

مرد ۔ وقت کے دھارے کا رخ پھیر دیا گیا۔

عورت ۔ ہم اپنے حال سے ماضی کی طرف لوٹ آئے۔

ع۱ یہ قطب شاہیوں کا دکن ہے۔

ع۲ ان بادشاہوں کا سکّہ رواں ہے یہاں جنھوں نے زندگی کے ہر شعبے کو سنوارا ہے۔

ع۱ کیا ادب کیا شاعری

ع۲ تلنگی اور اردو ادب ان کی سرپرستی میں پروان چڑھ رہا ہے

ع۱ ہم اس وقت تمدن کے اس مبدائے نور پر ہیں۔

ع۲ جہاں سے سارے دکن کو زندگی نواز حرارت اور روشنی ملتی ہے۔

ع۱ یہ ابراہیم قطب شاہ کا علاقہ ہے۔

ع۲ گولکنڈہ وہ گولکنڈہ جہاں سے کوہ نور نکلتے ہیں۔

ع۱ دیکھو ادب سے نگاہ روبرو جانتے ہو اس وقت ہم کہاں ہیں۔

ع۲ گولکنڈے کے ولی عہد محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں۔

ع۱ دیکھ رہے ہو تزک و احتشام اس دربار کا۔

ع۲ معلوم ہوتا ہے جنت زمین پر اتر آئی ہے۔

ع۱ حسن دلنواز کی نمائش گاہ سمجھو اسے

ع۲ زندگی صرف مسکراہٹ ہو کر رہ جاتی ہے یہاں۔

ع۱ پژمردہ دل بھی ان گل عذاروں کے قہقہوں سے تازہ پھول بن جاتا ہے۔

ع۲ لیکن تم دیکھ رہے ہو محمد قلی قطب شاہ کو۔

ع۱ ہاں گولکنڈے کے ولی عہد کے ماتھے پر شکن ہے۔

ع۲ ان کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھو۔

ع۱ معلوم ہوتا ہے کسی گہری سوچ میں ہیں۔

ع۲ ہاں اس انجمن میں رہ کر بھی وہ اکیلے ہیں۔

ع۱ زبان اردو کا ہونے والا پہلا حکمران شاعر ع۲ ایک عظیم الشان شہر کی بنیاد رکھنے والا۔

ع۱ جو مانگتے زمانہ ہے حاضر لئے ہوئے۔ ع۲ نہ معلوم کیوں ولی عہد اس ماحول سے بیزار نظر آرہے ہیں۔ ع۱ وہ دیکھو ملا وجہی ع۲ قطب مشتری کے مصنف

ع۱ ہاں وہی ملا وجہی درباری شاعر ع۲ وہ بھی حیرت سے ولی عہد کا منہ تک رہے ہیں کچھ کہہ نہیں سکتے ع۱ وہ دیکھو ولی عہد کی گہری بوجھل نظروں نے نقرئی قہقہوں کی قیمت گرادی ع۲ دیکھو شاہی مغنی بھی موجود ہے۔

ع۱ ہاں ولی عہد نغمہ کے انتظار میں ہیں۔ ع۲ وجہی نے ولی عہد کا دیوان مغنی کی طرف بڑھا دیا۔ ع۱ دیکھو وہ شروع ہی کرنے والا ہے اب خاموش ہو جاؤ

(پس منظر موسیقی اجاگر ہو جائے اور مغنی یہ غزل شروع کرے)

سنو لوگ میرے پریم کی کہانی — کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی

تمن عشق بھیدیا ہے منج بالا بالا — ہوئی ہوں تمن پیم سیں میں دوانی

محبت کی لذت فرشتاں کوں نہیں ہے — بہت سعی سوں میں یہ لذت پچھانی

جو کوئی عمر کھویا ہے ساجن ہوس میں — جیو لب پھل وہی پائیا کر میں جانی

(چند لمحے صرف پس منظر موسیقی)

ملا وجہی ۔ بہت خوب، بہت خوب۔ حضور! فدوی کی مجال نہیں کہ اس شعر کی تعریف کرے دہراتا ہے "محبت کی لذت فرشتاں کو نیں ہے"۔

واہ، واہ یہ ذرۂ بے مقدار آفتاب عالم تاب کی تعریف کس زبان سے کر سکتا ہے لیکن حضور سچ عرض کرتا ہوں۔ جی چاہتا ہے اس ایک شعر پر اپنا پورا دیوان نثار کردوں — اپنا پورا دیوان۔

محمد قلی ۔ وجہی تم اس شعر کو صرف شعر سمجھتے ہو۔ تم شاعر ہو وجہی دلوں کا حال جانتے ہیں شاعر۔ تم شاعر ہو کر اسے شعر کہہ رہے ہو۔ وجہی یہ آہ ہے جس نے شعری لباس پہن لیا ہے۔ تم اس غزل سے لطف اندوز ہو رہے ہو۔ لیکن جانتے ہو ہمارے سارے زخم ہرے ہو گئے وجہی، سارے۔

وجہی ۔ حضور! اس درد و کرب کا سبب۔ دیکھئے دنیا کی مسرتیں آپ کے لئے اپنا آغوش وا کئے ہوئے ہیں۔ آج ہی عالم پناہ نے

ایرانی فن کا ایک بے نظیر نمونہ آپ کے حرم میں روانہ فرمایا ہے۔ گولکنڈے کے ولی عہد کو کس چیز کی کمی ہے۔ حسن، شعر، شباب اب اس سے زیادہ اور کیا چاہئے ظل اللہ!

محمد قلی - وجہی یہ سب ہمارے درد کا مداوا نہیں۔ یہ ساری چیزیں ہماری نظر میں ہیچ ہیں اگر کوئی ہم سے "چچلم" میں ایک گھنٹہ گزارنے کے عوض یہ ساری راحتیں لے لے تو ہم بخوشی دے دینے تیار ہیں۔ اب ایرانی یا افغانی حسن ہمارے لئے جاذب توجہ نہیں ہوسکتا وجہی۔

وجہی - ظل اللہ - ظل اللہ - ظل اللہ - آپ یہ کیا فرما رہے ہیں چچلم کی دیہاتی فضا گولکنڈے کے ولی عہد کے لائق نہیں۔ نہیں ظل اللہ۔

محمد قلی - سونے چاندی کی چمک نے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کردیا ہے۔ وجہی تمہاری آنکھیں اس حسن کو نہیں دیکھ سکتیں جو چچلم کے طول و عرض میں بکھرا ہوا ہے۔ "چچلم" آہ "چچلم" میرے خوابوں کا مندر کیا اب میرے لئے صرف اس کی یاد ہی باقی رہ جائے گی۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا ——

وجہی ! جہاں پناہ!

محمد قلی خاموش وجہی! ہم جائیں گے ہم چچلم ضرور جائیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ابا جان ہمیں اس محل میں مقید کرکے رنگین کھلونے دل بہلائی کے لئے دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خوش ہیں۔

(بجلی کی کڑک! بادل کی گرج طوفانی ہواؤں کا شور)

محمد قلی - کوئی ہے۔ (قدموں کی آواز)

خادم - ارشاد - عالی جاہ!

محمد قلی ! جاؤ ہمارا گھوڑا تیار کرو۔ ہم اسی وقت جائیں گے جاؤ جلدی کرو ——

وجہی - حضور اس طوفان میں۔

محمد قلی ! ہاں وجہی اسی طوفان میں —— طوفان و تلاطم ہمارا راستہ نہیں روک سکتے۔ ہمیں جانے دو۔ ہٹ جاؤ ہمارے راستے سے ہمیں جانے دو ——

(قدموں کی آواز)

—— دوسرا ایکٹ ——

(ظل اللہ - ظل اللہ - آواز قریب سے دور ہوتی ہوئی گزر جائے)

[طوفان و باد باراں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز قریب سے دور ہوتی گزر جائے طوفان باد باراں اس کے ساتھ موسیقی بھی جاری رہے]

ع۱ کسی نے کہا ہے ؎

شمس و قمر کی روشنی دیر و حرم میں ہو تو کیا
مجھ کو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں

ع۲ محبت کا دیوتا اندھا ہوتا ہے۔

ع۱ اسی لئے تیر چلاتے وقت مقامات اور مراتب کا لحاظ نہیں کرتا۔

ع۲ کہاں گولکنڈے کا ولی عہد کہاں چچلم کی رقاصہ۔

ع۱ لیکن جانتے ہو کوئی کام ....

ع۲ ہاں کوئی کام مشیت ایزدی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

ع۱ ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔

ع۲ نہ معلوم اس ملاپ میں کیا مصلحت ہے

ع۱ تم گولکنڈے کے ولی عہد کا دربار بھی دیکھ چکے اب ادھر آؤ۔

ع۲ یہاں چچلم میں۔

ع۱ ولی عہد کے خوابوں کی جنت ہے یہ۔

ع۲ دیکھو وہ بھاگ متی اور اس کی خادمہ سندر۔

بھاگ متی - دیکھ رہی ہو سندر! کیسی طوفانی بارش ہے۔ موسیٰ ندی کو دیکھو کسی بپتا کی ماری سندری کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھ بن گئی ہے۔ آنسو ٹپکا اور سمجھو دنیا ڈوبی۔

سندر - نہیں دیوی! موسیٰ ندی چچلم کے پاپ دھو رہی ہے۔

بھاگ متی - نہیں معلوم سندر! یہ پاپ دھو رہی ہے یا اس کا سیلاب چچلم کو غرق کرکے رہے گا۔

سندر ! نہیں دیوی چچلم کے بھاگ بھاگ متی سے وابستہ ہیں۔ وہ ڈوب نہیں سکتا۔ کون جانے آئندہ یہ کیا ہونے والا ہے (گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز دور سے)

دیوی دیکھئے! وہاں ... اس طرف ..... وہ ایک سوار۔ ہاں وہی دیکھئے ادھر ہی آرہا ہے۔ اگر میری آنکھیں دھوکہ نہیں دے رہی ہیں تو میں سمجھتی ہوں اپنے ہی شاہزادے کا گھوڑا ہے۔

بھاگ متی ! کیا کہا سندر؟ شاہزادے کا گھوڑا۔ پاگل تو نہیں ہوگئی۔ وہ بھلا اس طوفان میں چچلم آئیں گے۔ گولکنڈے کا شاہزادہ اور چچلم میں۔ قسمت کے کھیل بھی کیسے نرالے ہیں۔ (گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز قریب آجائے)

سندر ! نہیں دیوی میری آنکھیں مجھے دھوکہ نہیں دے سکتیں - وہ ہمارے شاہزادے ہی ہیں اور ادھر آرہے ہیں۔

وہ دیکھئے اپنے احاطے میں آ گئے۔ شاہزادے
بھاگ متی! سندر دروازہ کھول جلدی۔
(قدموں کی آواز میں جیسے کچھ گڑبڑ ہے چند لمحے)
بھاگ متی! جہاں پناہ۔ آپ۔ اس وقت یہاں!۔ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھتی۔
محمد قلی۔ نہیں بھاگ متی یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ خواب کہہ کر ہماری لذت نظر کو بھی تو کم نہ کرو
بھاگ متی ہائے آئی سندر۔ ٹھیک ہے۔ جہاں پناہ یہ خلعت بھیگ گئی ہے۔ آپ ذرا یہ تن پوش ـــ
محمد قلی بھاگ متی تمھیں ہمارا اتنا خیال۔
بھاگ متی! کنیز ہوں جہاں پناہ ـــ
محمد قلی۔ اچھا۔ لاؤ۔ (پس منظر موسیقی چند لمحے)
بھاگ متی! جہاں پناہ بھاگ متی کے بھاگ جاگ گئے جو آپ نے اس جھونپڑے کو رونق بخشی ...... لیکن ......
محمد قلی۔ لیکن کیا بھاگ متی! تم کہتے کہتے رک کیوں گئیں کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔
بھاگ متی! ظل اللہ! میں سمجھتی ہوں میرے بھاگ جاگے ہیں عنقریب سونے کے لئے۔ آپ میری زندگی پر شہاب ثاقب کی طرح چمک کر غائب ہو جائیں گے اور میری زندگی کو ہمیشہ کے لئے تاریک کر جائیں گے۔
بادشاہ سلامت! اس وقت میں ایک سپنا دیکھ رہی ہوں خوش گوار جس سے مجھے جلد بیدار ہونا پڑے گا اس وقت میرے پاس کچھ نہ ہوگا سوائے چند حسین یادوں کے۔
آپ جب بادشاہ ہو جائیں گے۔ امور سلطنت میں منہمک ہو کر یہ بھی بھول جائیں گے کہ آپ بھاگ متی نام کی کسی ہستی کو پہچانتے تھے۔
محمد قلی! نہیں بھاگ متی! یہ سپنا اس وقت حقیقت بن جائے گا۔ ہماری محبت کی ہم ایک دائمی یادگار بنائیں گے۔ تاکہ ہمارے بعد بھی آنے والی نسلیں ہماری پریم کہانی کو گاہ گاہ یاد کیا کریں۔ "پریم" فانی نہیں "امر" ہوتا ہے بھاگ متی۔ یقین ہے زمانہ کا بے رحم ہاتھ ہماری اس یادگار کو فنا نہیں کر سکے گا۔
بھاگ متی! ۔ آپ کس قسم کی یادگار بنائیں گے جہاں پناہ!
محمد قلی ہم تمھیں اپنی محبت سے غیر فانی بنا دیں گے بھاگ متی! مادی روحانی دونوں طریقوں سے، ہماری شاعری کا باعث تم ہو۔ لہٰذا جب تک اُردو زبان زندہ رہے گی۔ تم بھی زندہ رہو گی۔ اس وقت کا تصور کرو جب چچلم ایک عظیم الشان خوبصورت شہر بن جائے گا۔ جس میں ہر طرف علم و فضل کے چشمے بہیں گے۔ دیکھ لینا ہمارا بسایا ہوا یہ شہر جس کی بنیاد محبت پر ہے۔ مستقبل میں ہندوستان کے لئے "مشعل راہ" ثابت ہوگا۔ یہاں امن اور شانتی، اتحاد و اتفاق کی سوتیں پھوٹیں گی۔ ادب و زبان تہذیب و ثقافت کی تعمیر ہوگی ـــ یہ ہندوستان کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کرے گا۔

ـــ تیسرا ایکٹ ـــ

۱۔ اتنی گڑبڑ کیوں ہے۔
۲۔ جانتے ہیں! آج محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کا دن ہے۔
۱۔ بھاگ نگر کے بانی کی تخت نشینی۔
۲۔ او ہو کیا داد و دہش ہے۔
۱۔ تب ہی تو طمٹن لے دولت کی زیادتی کے لئے گولکنڈہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔
۲۔ وہ دیکھو آسمانی چتر کے نیچے بادشاہ کی سواری نظر آ رہی ہے۔
۱۔ خاموش! نگاہ روبرو ـــ
ایک آواز!۔ ادب سے نگاہ روبرو جہاں پناہ تشریف لاتے ہیں۔
وجہی! جہاں پناہ! جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کرنے کی جرأت کروں!
محمد قلی! تمھیں امان ہے وجہی! کہو کیا کہنا چاہتے ہو ـــ
وجہی! جہاں پناہ! گولکنڈہ کے تخت کو آپ نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے جو شرف بخشا ہے۔ بندہ اس کی خوشی میں چند اشعار سنانے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے۔
محمد قلی! ہم خوش ہوئے وجہی شروع کرو۔
وجہی (تحت اللفظ شاعرانہ انداز میں پڑھتا ہے)

کتنے پادشاہی کیا نیں ہے یوں
کہ کرتا ہے اب قطب شاہ جیوں
بسا شہ کے انصاف سے یوں دکن
کہ بستا ہے پانی سے جوں پھول بن
شہی جوں کئے شاہ عالی جناب
نہ دارا کیا دوں نہ افراسیاب

شہنشاہِ غازی قطب شاہ تو
شہاں سب ستارے کہ ہے ماہ تو
ترا عدل ایسا ہے اے جگ ادھار
کہ آگ اور پانی رہے ایک ٹھار
محمدؐ قطب شہ ترا ناؤں ہے
ہما سو ترے پاؤں کا چھاؤں ہے
تو گیانی تو دانی تو دانا رہے
تو فاضل تو کامل تو اوتار ہے
تو ایسا سخی ہے ترے دھرم سے
دریا لائے کف ہنسپر زنرم سے

محمد قلی ! وجہی ہمیں تم پر رشک آتا ہے۔ کوئی ہے۔ (حاضر جہاں پناہ) جاؤ وجہیؔ کو سونے میں تولو۔ اچھا اب دربار برخواست کیا جاتا ہے۔ وجہیؔ تم ابھی ٹھیرو۔ مابدولت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

وجہیؔ ! ارشاد عالی جاہ !

محمد قلی ! دیکھو وجہیؔ ! اب ہم خود مختار ہوگئے ہم اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ ہم بھاگ متی کو گولکنڈہ کی ملکہ بنانا چاہتے ہیں۔

وجہیؔ ! بہت مناسب ہے حضور ! اگر آپ اجازت دیں تو ایک نذر پیش کرنے کی جرأت کروں۔

محمد قلی ! تمہیں اجازت ہے وجہیؔ ! پیش کرو کیا پیش کرنا چاہتے ہو ——

وجہیؔ ! جہاں پناہ آپ کی محبت کی یادگار میں ایک مثنوی "قطب مشتری" لکھی ہے۔ وہ میں اس وقت حضور کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

محمد قلی ! بہت خوب ! نہایت اچھی ! وجہیؔ اس کے ساتھ تم نے اپنا نام بھی زندۂ جاوید کردیا۔ یہ اپنے زمانے اور زندگی کی ترجمان ہے۔ وجہیؔ اسے تم نے جس زبان میں لکھا ہے معلوم ہوتا ہے ایک دن یہ زبان سارے ہندوستان پر چھا جائے گی۔

——(چوتھا ایکٹ)——

[فلمی ریکارڈ لگایا جائے "آیا بسنت سکھی برہا کا انت سکھی بن بن میں چھائی بہار"]

(اس کے بعد مختلف پرندوں کوئل پپیہے وغیرہ کی پکار کا صوتی اثر پیش کیا جائے)

م۱ بسنت آگیا

م۲ ہاں بسنت آگیا۔ محمدؐ قلی کی جیون پھلواری میں بسنت آگیا۔

ع۱ دیکھو شاہی محل میں بسنت منائی جارہی ہے

ع۲ یہ قطب شاہی دور کی خصوصیت ہے۔ تیوہار ایسے ہیں جن میں بلا اختلاف مذہب و ملت سب حصہ لے سکتے ہیں۔

بھاگ متی ! اب معزز ملکہ حیدر محل ہے۔

م۲ دیکھو جہاں پناہ اور ملکہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے نئے محل کوہ طور میں داخل ہو رہے ہیں

(نفیریوں کی آوازیں دور سے آتی ہیں)

سندر (دوڑتی ہوئی آکر) ملکہ جہاں پناہ تشریف لارہے ہیں اور آپ یہاں ——

بھاگ متی ! ہاں سندر موسیٰ کی روانی نے مجھے اپنے دھار کے ساتھ آج سے تین سو سال آگے پہونچا دیا گیا۔ میں سوچ رہی تھی اب سے تین سو سال بعد یہ نو تعمیر شہر کتنا بدل جائے گا۔ کیا اسوقت ہماری پریم کہانی یاد رہے گی۔ سندر ! جو اس شہر کی بنیاد کا باعث ہوئی۔

سندر۔ پریم کی یہ کہانی بھلائی نہیں جاسکتی ملکہ۔ وہ دیکھئے جہاں پناہ تشریف لاچکے ہیں۔

(نفیریوں کی آوازیں قریب آجائیں اس کے بعد قدموں کی آواز)

محمدؐ قلی۔ ملکہ دیکھو ہم نے بسنت کی تقریب میں آج ہی یہ نظم کہی ہے۔ ہم اسے شاہی مطرب سے سننا چاہتے ہیں۔ کوئی ہے ——

(دو قدم آنے کی آواز)

ملازم۔ خداوند !

محمدؐ قلی۔ شاہی مطرب کو حاضر کرو ——

(قدموں کی آوازیں جیسے کوئی جارہا ہے)

محمدؐ قلی۔ ملکہ آج ہم بہت خوش ہیں۔ یہ ہماری پہلی بسنت ہے۔ ہماری جیون پھلواری کی پہلی بسنت۔

ملازم۔ خداوند شاہی مطرب حکم کا منتظر ہے۔

محمدؐ قلی۔ اجازت ہے شروع کرو ——

مطرب کا گانا۔

بسنت کا پھول کھلیا ہے سو جیوں یاقوت رمانی
کرو مل کر سہیلیاں سب بسنت کے نائیں جہانی
نزاکت شعر کے تن میں خدا بخشا ہے تو تج کوں
معانی شعر تیرا ہے کہ یا ہے شعر خاقانی

(گانا فیڈ ان ہوجائے اور اس کے بعد روشن چوکی وغیرہ کی آوازیں شروع ہوکر پس منظر میں ہوجائیں)

م۱ آج سارے بھاگ نگر میں دوہری خوشیاں منائی جارہی ہیں۔

م۲ ایک بسنت دوسرے بادشاہ کی شخصی مسرت۔

ع۱ یہ ماحول اسی طرح شاداں و فرحاں رہیگا۔

ع۲ یہاں ہمیشہ امن و چین، اتحاد و اتفاق کی فضا قائم رہے گی۔

——(جھنکارہ)——

رفیعہ سلطانہ (عثمانیہ)

نئی کتابیں

۱- سزا (ناول) ازقیسی رامپوری .... قیمت عالہ پتہ ادارۂ اشاعت اُردو - عابدروڈ - حیدرآباددکن -

۲- کروٹیں - از قدوس صہبائی ″ عالہ ″ ″ ″ ″ ″ ″

۳- زلزلے ″ ″ عالہ ″ ″ ″ ″ ″ ″

۴- قصص و مسائل از - عبدالماجد دریابادی ″ عہ ″ ″ ″ ″ ″ ″

۵- کردار ″ ماہرالقادری ″ عہ ″ ″ ″ ″ ″

۶- انگڑائیاں ″ احمد ندیم قاسمی ″ سے ″ ″ ″ ″ ″

۷- رنگین سپنے ″ کوثر چاند پوری ″ عالہ ″ ″ ″ ″ ″

۸- سیلاب ″ احمد ندیم قاسمی ″ سے ″ ″ ″ ″ ″

۹- زندگی کی ٹھوکریں ″ رئیس احمد جعفری ″ سے ″ ″ ″ ″ ″

۱۰- تقدیریں ″ منظور بخاری ″ عہ ″ ″ ″ ″ ″

۱۱- نیرنگ مقال (مجموعہ کلام) از علامہ ضامن کنتوری ″ عالہ پتہ - کتاب منزل حویلی قدیم - حیدرآباددکن

۱۲- ہماری درماندگی اور اس کا علاج - از ظہیر احمد ایچ - سی - ایس - قیمت - عالہ - انڈیا بک ہاؤس - عابدروڈ - حیدرآباددکن

۱۳- گیت ہی گیت - از میراجی - قیمت - عالہ پتہ ساقی بک ڈپو - دہلی

۱۴- شمع فروزاں (ناول) از صادق الخیری قیمت عہ - پتہ - خاتون کتاب گھر - اُردو بازار - دہلی -

۱۵- زہراب (ناول) از محمود احمد خاں - ″ عہ ″ ″ ″ ″

۱۶- قید خانہ (افسانے) از پروفیسر احمد علی ″ عہ ″ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو - ″ ″

۱۷- تصویر - (ناول) از - اے - آر خاتون ″ للعہ ″ ″ ″ ″ ″ ″

۱۸- تنقیدی جائزے - از ڈاکٹر سید احتشام حسین ″ سے ″ سید عبدالرزاق تاجر کتب - عابدروڈ - حیدرآباددکن -

۱۹- کنٹریکٹ برج - از محمد نصیر بی اے - ″ عالہ ″ انڈیا بک ہاؤس - ″ ″

۲۰- انقلاب (افسانے) از اعظم کریوی - حجم ۱۷۲ صفحے - قیمت عہ - پتہ - کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک - لکھنو -

۲۱- ۱۹۴۳ء کے بہترین افسانے - مرتبہ حلقہ ارباب دانش - حجم ۱۹۸ صفحے - قیمت عالہ ″ ″ ″ ″

۲۲- لینن - مترجمہ تمنائی - حجم ۸۰ صفحے - قیمت ۵/ - پتہ - نیا سنسار کتاب گھر - بانکی پور - پٹنہ -

۲۳- سرگزشت حاتم (شاہ ظہورالدین حاتم کے حالات) از - ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ - حجم (۱۲۸) صفحے - قیمت عالہ - پتہ - سب رس کتاب گھر خیریت آباد

۲۴- نفسیات زندگی - از شیر محمد اختر - قیمت - عالہ - پتہ - ادارۂ اشاعت اردو - عابدروڈ - حیدرآباددکن -

۲۵- لالہ زار داغ (منتخب مصرعے اور اشعار) از فرحت جہاں - ۳۲ صفحے - قیمت ۵/ - پتہ - خاتون کتاب گھر - اُردو بازار - دہلی

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

یہ دنیا ہے از نجم الدین صاحب شکیبؔ۔ حجم ۱۶۴ صفحے قیمت عالہ
ناشر۔ کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنو۔

جناب نجم الدین شکیبؔ نے ناول "یہ دنیا ہے" نہیں لکھا بلکہ زندگی کی مختلف پُرپیچ راہوں کے چند نشانات دکھائے ہیں۔ راج محلوں کی رنگیلی دنیا، عورت کے مختلف روپ، سرمایہ دار کی بوالہوسی، مزدور کی غیرت، قسمت کے کھیل، تدبیر کی بے بسی، لیڈری کی اصلیت، مذہب کا جنون، طائف کا دکھ اور سماج کے گندے رستے اور ناسور سبھی اس تصویر میں آپ اجاگر دیکھیں گے۔ اس کے کردار تخیلی نہیں بلکہ موجودہ دور کے زندہ کردار ہیں۔ ہر گناہ کی تفصیل موجود ہے۔ لیکن پڑھ کر گناہ سے رغبت نہیں نفرت محسوس ہوتی ہے۔ یہی ایک لکھنے والے کا کمال ہے۔ لاکھوں گناہ کرنے والا محوری کردار اپنے ضمیر کی وجہ پاکباز ہی رہا

زبان ستھری ہے، طرزبیان دلچسپ۔ بعض جملے تو نہایت نفیس و نازک ہیں۔ "گناہ اتنا نیچا نہیں جتنے گناہ گار کے آنسو اونچے۔" اور "مذہب روح کی آواز نہیں جسم کا لباس بن گیا ہے۔" کہیں کہیں بے ربطی بھی ضرور ہے۔ اگر قابل مصنف نے کتاب کے مختلف باب قائم کئے ہوتے تو بہتر تھا۔ کہانی کی ابتدا اور عروج نہایت شاندار ہیں۔ لیکن خاتمہ کمزور ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ آخری حصہ نہایت جلدی میں لکھا گیا ہے۔ اختتام بھی ابتدا کا سا ہوتا تو ناول زیادہ موثر ہوتا۔ کیونکہ ناظر پر آخری حصہ ہی زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ شکیبؔ آئندہ اس سے بہتر لکھ سکیں گے۔ ان کی یہ دنیا تو کافی کامیاب ہے۔

وہاں از مرزا سرفراز علی بی اے (عثمانیہ) ایچ۔ ڈپ۔ ایڈ (ڈبلن) حجم ۱۰۲ صفحے قیمت عہ۔ ناشر۔ کتاب خانہ انجمن ترقی اردو عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

مرزا صاحب کے بارہ مختصر اور نہایت مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ سب مختلف پرچوں شہاب، نگار، داستان گو، مجلہ عثمانیہ اور مجلہ طیلسانین میں شایع ہوچکے ہیں۔ یہ مرزا صاحب کے طالب علمی کے افسانہ ہیں۔ اس لئے بار بار خامکاری کا احساس ہوتا ہے۔ طرزبیان شگفتہ اور پلاٹ میں اکثر جان ہے۔ لیکن افسانوں کو اچھی طرح بنایا نہیں گیا۔ خصوصاً ہر افسانہ کا اختتام نہایت کمزور ہے۔ "دیار مغرب" اس مجموعے میں نہایت دلچسپ ہے۔ "اور غلط فہمی" باوجود مختصر ہونے کے نہایت حسین ہے۔ محاورہ کی غلطیاں زیادہ ہیں۔ مرزا صاحب اگر اب لکھیں تو یقیناً ان افسانوں سے کہیں زیادہ بہتر لکھ سکیں گے۔

اتحادی افسانے از جناب حکیم مظفر حسین اظہر دہلوی۔
حجم ۲۰۶ صفحے قیمت عہ۔

ناشر:۔ شاعری کالج۔ اندرون لوہاری دروازہ انارکلی۔ حلقہ (۳۹) لاہور۔ یہ اتحادی افسانے موجودہ اتحادیوں کے متعلق افسانے ہیں جو جنگ عالمگیر لڑ رہے ہیں۔ بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی سیدھی سادھی پرانی کہانیاں ہیں۔ طرزبیان بغیر عشق و محبت کے بھی دلچسپ بنایا جاسکتا تھا۔ بچوں کے لئے یہ قصے مفید تاریخی مطالعہ ثابت ہوں گے۔ اظہر صاحب ہندو مسلمانوں کو ان کی پرانی دوستی کی یاد دلا رہے ہیں۔ لیکن پیرایہ دلچسپ ہوتا تو بہتر تھا۔

انقلاب از ڈاکٹر اعظم کریوی۔ حجم ۱۷۲ صفحے۔ قیمت عہ
ناشر:۔ کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنو۔

ڈاکٹر اعظم کریوی نے اپنے بارہ ایسے مختصر افسانوں کو یکجا کیا ہے جن کا محوری خیال "انقلاب" ہے۔ ڈاکٹر صاحب اردو افسانہ نویس کی حیثیت سے کافی مشہور رہیں۔ پریم چند کے انداز پر لکھنے والوں میں اب سب سے آگے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب ان کے ہر افسانہ میں سانس لیتی ہے۔ موجودہ ترقی انھیں پسند نہیں کیونکہ یہ ہمیں زیادہ سے زیادہ خودبیں اور زرپرست بنا رہی ہے۔ وہ بصیرت کھو کر بصارت لینا نہیں چاہتے۔ آنکھیں اندھی رہیں لیکن دل روشن۔ یہی حقیقی کامیابی ہے۔ مادہ پرست تہذیب نے کونسا انقلاب پیدا کیا ہے؟

وہ اپنے ہر افسانہ میں اسی کی تفسیر کرتے ہیں۔ سرورق عنوان کی اچھی تشریح کرتا ہے "دن کی روشنی میں" زیر نظر مجموعہ کا سب سے اچھا افسانہ ہے۔ زبان بے عیب ہے۔

لینن | مترجمہ تمنائی۔ حجم ۴۰ صفحے۔ قیمت ۵ر
ناشر:۔ نیا سنسار کتاب گھر۔ بانکی پور۔ پٹنہ

اسٹالین کی نظروں میں لینن کا کیا مقام ہے؟ وہ اس کتابچہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ لینن کی زندگی نے روس کو کیونکر زندہ کیا اور مر کر بھی وہ کیسے زندہ ہے؟ اسٹالین نے اپنے مختلف مضامین میں اس کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ بڑے آدمیوں کی زندگی کا مطالعہ پڑھنے والوں کے کردار پر نامحسوس لیکن تعمیری اثر ڈالتا ہے۔ نئے ادب کے ترقی پسند عنصر کو سمجھنے کے لئے تو لینن کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ "لینن انقلاب کا تخلیق کار" اس مجموعہ کا سب سے بہتر مضمون ہے۔ لیکن یہ کتابچہ لینن کے مکمل حالات پر روشنی نہیں ڈالتا۔ صرف اس کے کردار کے چند پہلو روشن کرتا ہے۔

سرگذشت حاتم | مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ۔ حجم ۱۲۸ صفحے۔ قیمت عا
ناشر:۔ سب رس کتاب گھر۔ خیرت آباد۔ حیدر آباد دکن۔

ڈاکٹر صاحب نے دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعراء شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی نہایت تحقیق و تفصیل سے لکھے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے کلام پر ذمہ دارانہ تبصرہ کیا ہے۔ حاتم، سودا اور تاباں جیسے اساتذہ کے استاد تھے۔ نظم و غزل دونوں میں ملکہ حاصل تھا۔ اُن کا یہ شعر اردو شاعری کے ایام طفلی میں کہا گیا تھا ؎

برس میں وہ کبھی برسے ہے، یہ برسوں سے برسے ہے
مقابل مت کرو باراں سے میری چشم گریاں کو

اردو شاعری کے ان محسنوں کو زمانہ نے اگر بھلایا نہیں تو ان کے شایان شان یاد بھی نہیں رکھا۔ ضرورت ہے کہ ان کے حالات روشنی میں لائے جائیں۔ حاتم کو ان کا یہ تذکرہ یقیناً حیات نو بخشے گا۔

نمود و راز | مصنفہ محترمہ آلنسہ محمودہ رضویہ۔ مدیرہ مجلہ شعاع
حجم ۲۰۹ صفحے۔ قیمت عا
مقام اشاعت:۔ دارالاشاعت انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔

"نمود و راز" آلنسہ محمودہ رضویہ صاحبہ کراچی کے لکھے ہوئے چند مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے بھی موصوفہ نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ طرز بیان کو دلکش و حسین بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن فارسی ترکیبوں کا بے جا استعمال ضرور کھٹکتا ہے۔ افسانوں میں حقیقت سے زیادہ تصور سے کام لیا گیا ہے۔ ہم رضویہ صاحبہ سے آئندہ اس سے بہتر کی امید رکھتے ہیں۔ کراچی سے نسوانی ادب کی یہ پہلی شعاعیں ہیں۔ اس حیثیت سے موصوفہ کے افسانے قابل تعریف ضرور ہیں۔

کھی شکر | از جناب محمد شفیع الدین نیر
حجم ۵۱ صفحے۔ قیمت ۶ر مقام اشاعت:۔ جامعہ ملیہ (دہلی)

اس کتاب میں نیر صاحب نے بچوں کے لئے سادہ و منظوم معمّے لکھے ہیں۔ ہر نظم "میں کیا ہوں بتلاؤ تم پھر کھی و شکر کھاؤ تم" سے شروع ہوتی ہے۔ بچے نظم پڑھ کر خود ہی پہیلی بوجھ سکتے ہیں۔ ایسی نظمیں بچوں کو بہت زیادہ پسند ہوتی ہیں۔ جس میں انھیں اپنی عقل سے بھی کام لینا پڑے۔ کتاب کے آخر میں ہر نظم کا حل تصویروں کی شکل میں موجود ہے۔ 'مور' اور 'کتاب' والی نظمیں تو بے حد اچھی ہیں۔ یہ بچوں کو کھی شکر سے تو کیا چاکلیٹ اور ٹافی سے بھی بڑھ کر پسند آئیں گی۔ امید کہ نیر صاحب آئندہ بھی بچوں کے لئے اس قسم کا ادب مہیا کرتے رہیں گے۔

نئی کہانیاں | از جناب محمد شفیع الدین نیر
حجم ۶۳ صفحے۔ قیمت ۹ر۔ سرورق رنگین۔ طباعت اچھی۔
مقام اشاعت۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ۔ دہلی

بچوں کے محبوب شاعر جناب نیر نے ننھے بچوں کے لئے نہایت اچھی منظوم کہانیاں لکھی ہیں۔ زبان آسان ہے۔ تصویروں سے جا بجا نظموں کی تشریح بھی کی گئی ہے "کہانی ہے یہ موٹر کی" اور "ضدی بچہ" تو نہایت پیاری نظمیں ہیں۔ یہ کہانیاں صرف

کہانیاں ہی نہیں بچوں کے لئے معلومات کا دلچسپ ذخیرہ بھی ہیں۔
مکتبہ جامعہ ملیہ قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ننھے بچوں کے لئے اس قسم کی نہایت عمدہ کتابیں شائع کی ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بچوں کو اس قسم کے پاکیزہ اور آسان ادب کی بہت ضرورت تھی۔ یہ کتاب بچے ضرور پسند کریں گے۔

لالہ زارِ داغ مرتبہ فرحت جہاں صاحبہ

حجم:۔ ۳۲ صفحے۔ قیمت ۵ر مقام اشاعت:۔ خاتون کتاب گھر اُردو بازار۔ دہلی۔

محترمہ فرحت جہاں صاحبہ نے فصیح الملک استاد داغ دہلوی کے کلام سے پسندیدہ دو سو معرعے اور تین سو اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ کافی اچھا انتخاب ہے۔ گو بعض جگہ معمولی اشعار کو بھی جگہ دی گئی ہے۔

ایک شاعر کے سو شعر از میر جہانگیر علی خاں صاحب قدسی لکچرار فارسی انٹر کالج گلبرگہ۔

حجم ۳۲ صفحے۔ قیمت درج نہیں۔ مقام اشاعت:۔ مکتبہ علمیہ پتھر گٹی۔ حیدرآباد دکن۔

یہ سو شعر جناب جہانگیر علی خاں صاحب قدسی کے کلام کا انتخاب ہیں۔ موصوف نے خود ہی منتخب کئے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر کوئی اور سخن فہم یہ کام کرتا۔ کیونکہ شاعر کو اپنا ہر شعر اچھا لگتا ہے۔ اکثر آپ نے پامال مضامین باندھے ہیں۔ بعض تو بہت اچھے بھی موجود ہیں۔ مثلاً؎

دل اگر ہے تو بہت داغ ہیں ارمانوں کے
کیا کمی اس کو گلوں کی جو گلستاں رکھے

شمع کا بھی عجیب عالم ہے　　اپنے رونے پہ آپ ہنستی ہے سوز

بچوں کا لندن از آغا محمد اشرف، ناشر حالی پبلشنگ ہاؤز دہلی

اس کتاب میں وہ مضامین اور قصے شامل ہیں جو لندن کی نشرگاہ سے آغا محمد اشرف صاحب نے موقع بہ موقع نشر کئے تھے اس زمانہ میں وہ لندن والے چچا کے لقب سے بی بی سی کا پروگرام سننے والے بچوں میں بہت معروف و مقبول ہو چکے تھے۔ ان کا اسلوب بیان بہت سادہ اور رواں ہے۔ ان کے جو مضامین اس مجموعے میں شریک ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی شخص لکھ نہیں رہا ہے بلکہ باتیں کر رہا ہے۔ یہ مضامین اگرچہ زیادہ تر موقتی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جس شگفتگی سے لکھے گئے ہیں ان کی بنا پر یقین ہے کہ یہ ہر زمانہ میں شوق سے پڑھے جائیں گے۔

عبد الحق اکیڈیمی کی بچوں کی کتابیں

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس اثنا میں اردو میں بچوں کے ادب کی طرف خاص طور پر توجہ کی جا رہی ہے۔ جامعہ ملیہ اور ادارۂ ادبیات اُردو کی جانب سے اس قسم کی جو کتابیں چھپتی رہتی ہیں ان کا تذکرہ اس سے قبل کیا جا چکا ہے اب عبد الحق اکیڈیمی حیدرآباد کی جانب سے بھی بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی بارہ کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کے مصنف مولوی شجاع احمد صاحب قائد ہیں۔

شجاع احمد صاحب کو بچوں کی زبان اور نفسیات پر اچھا عبور حاصل ہے ان کی دو کتابیں کشمش نانی اور باتیں اس سے قبل ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے بھی چھپ کر بچوں میں بہت مقبول ہو چکی ہیں۔ اس وقت ان کی جو بارہ چھوٹی چھوٹی کتابیں پیش نظر ہیں ان کے عنوان یہ ہیں:۔
کھٹی میٹھی پتیاں، رابنسن کروسو۔ لاڈلا اکبر، پڑوس، عید، چھو منتر کا دھاگا، کپڑے، چھتری فوج، سادہ زندگی، دسترخوان، جنگ کے بعد کیا ہوگا، سمندری جہاز۔

یہ سب رسالے مکالمے کے انداز میں لکھے گئے ہیں اور ان کی زبان و اسلوب دلچسپ اور شگفتہ ہے جو لوگ بچوں کے ادب کے متلاشی ہیں وہ ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

فیصلہ کن جنگیں از محمود خاں صاحب محمود۔ ناشر:۔ ملک بک ڈپو لاہور۔

اس کتاب کے مصنف تاریخ سلطنت خداداد اور تاریخ جنوبی ہند......

کے مصنف کی حیثیت سے اردو کی دنیا میں معروف ہیں اور تاریخ کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے ہندوستان کی آٹھ ایسی لڑائیوں کا حال بیان کیا ہے جنھوں نے ہندوستان کی قسمت پر اثر ڈالا سب سے پہلے تھانیسر کی لڑائی کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو ۱۱۹۲ء میں دریائے سرسوتی کے کنارے پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لڑی گئی تھی۔
اس کے بعد پانی پت کی لڑائی کا حال لکھا ہے جو ۱۵۲۶ء میں ظہیرالدین بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جنگ کے چودہ سال بعد قنوج کی لڑائی ہوئی اور پھر پانی پت کی دوسری لڑائی کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح تالی کوٹا، پلاسی، پانی پت کی تیسری لڑائی اور سرنگا پٹم کی لڑائیوں پر بھی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں بعض نقشے بھی ہیں اور آخر میں ایک ضمیمہ بھی شریک ہے۔ کتاب کی ترتیب اور حوالوں وغیرہ کے اندراجات کی بناء پر یہ کوشش تاریخ ہند سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے قابل داد ہے اور توقع ہے کہ مصنف ایسی تاریخی کتابوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور جنگوں کے بعد ان تحریکات اور واقعات کی طرف توجہ کریں گے جنھوں نے ہندوستان کی سماجی اور تمدنی دنیا میں انقلاب پیدا کیا اور جن کے باعث یہ ملک تہذیب و تمدن کی منزلیں طے کرتا گیا۔

ہمارے ہندوستانی مسلمان | مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین۔ ناشر:- اقبال اکیڈیمی - لاہور۔

یہ اصل میں ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جس کے مصنف بنگال کے ایک سیویلین عہدہ دار ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر ہیں۔ اور اس میں مسلمانوں کے سیاسی نظریوں اور انگریزوں کے عہد میں ان کی بے چینی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن چونکہ ایک انگریز عہدہ دار کے قلم سے لکھی گئی ہے اس لئے ممکن ہے اس میں بعض امور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ناپسندیدہ ہوں تاہم اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کی مسلسل جد و جہد اور ذہنی کشمکش کا پتہ چلتا ہے اور بعض ایسی باتیں بھی منظر عام پر آتی ہیں جو اب تک تاریخی کتابوں میں شائع نہیں ہوسکیں۔ سیاست سے دلچسپی رکھنے والے اس کے مطالعہ سے کافی مستفید ہوسکتے ہیں۔

کمپنی کی حکومت | از باری۔ ناشر مکتبۂ اردو لاہور۔

یہ کتاب ہندوستان کی سیاسی اور تمدنی تاریخ میں ایک مفید اضافہ ہے اور اس وقت تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ اس میں مغلوں کی سلطنت کے آخری دور سے لے کر ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام تک جو واقعات پیش آئے ان پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے۔ جو لوگ ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے اس کتاب میں نہایت اہم اور ضروری تاریخی معلومات یکجا کردی گئی ہیں۔

دستور الفصاحت | از حکیم سید احمد علی خاں یکتا لکھنوی۔ مطبوعہ ہندوستان پریس رامپور۔

کتاب خانۂ ریاست رامپور کی جانب سے جو مفید سلسلۂ مطبوعات شروع ہوا ہے اس کی یہ چوتھی کڑی ہے اور اس میں یکتا لکھنوی کی کتاب دستور الفصاحت کا وہ حصہ شائع کیا گیا ہے جو اردو شعرا کے تذکرے کے طور پر قلمبند کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے متعلق اس کے مرتب مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتاب خانۂ رامپور نے جو دیباچہ قلمبند کیا ہے وہ بجائے خود ایک جداگانہ کتاب ہے اور ۱۱۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مرتب نے اردو کے تمام تذکروں پر ایک عالمانہ تبصرہ کیا ہے۔ اور بعض امور میں ایسی تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے کہ ان کے اعلیٰ علمی ذوق کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ میری رائے میں ان کا یہ دیباچہ اس قابل ہے کہ اس کو علحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

اشارہ | مرتبہ تمنائی۔ ناشر۔ نیا سنسار پٹنہ۔

یہ بہار کے شعرائے اردو کے منتخب کلام کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو مرقع سخن کی طرز پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں بھی تقریباً پچیس شعرا کے مختصر سے حالات اور کلام کے

نمونے شامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سرزمین بہار عہد حاضر میں بھی صاحبان فکر و نظر پیدا کر رہی ہے اور وہاں ہر نوع کی شاعری کا نشو و نما عمدگی سے ہو رہا ہے۔ دوسرے صوبوں میں بھی اگر ایسے ہی مجموعے مرتب ہو سکیں تو اردو ادب کی تاریخ اور اس کے جدید رجحانات کی نسبت مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

اس مجموعے کے مرتب تمنائی صاحب ہیں۔ انھوں نے اس کی ترتیب اور کلام کے انتخاب اور شعرا کے تعارف میں جس اعلیٰ ادبی ذوق کا ثبوت دیا ہے اس کی بناء پر یقین ہے کہ وہ بہار کے اُردو ادب کے متعلق اُردو دنیا کو اسی طرح واقف کرتے رہیں گے اور ہمارے ادبی ذخیرہ میں اضافہ کا باعث ہوں گے۔ "ق"

Modern Islam in India پروفیسر **Wilfred Cantwell Smith** کی انگریزی تالیف ہے جسے منرو اینگ شاپ نے انار کلی۔ لاہور سے شائع کیا ہے۔ کتاب چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ و کتابت اعلیٰ اور قیمت دَس روپے سکۂ کلدار ہے، جو کسی قدر زیادہ ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ آئے دن بہت سی اُردو اور انگریزی کتابیں مسلمانان ہند کے تمدنی، تعلیمی اور سیاسی مسائل سے متعلق شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن بہت کم ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جو تعصب، کوتاہ نظری، ذہنی انتشار اور فقدان معلومات سے پاک ہوں۔ چنانچہ ایک عرصے سے ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں مسلمانان ہند کی زندگی کے ہر پہلو پر عمرانی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ اس کو خود مسلمان علماء نے محسوس نہیں کیا بلکہ لاہور کے کرسچین کالج کے تاریخ اسلام کے پروفیسر W.C. Smith نے اس اہم علمی خدمت کو نہایت ہی ذمہ داری اور حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کے اہم ترین شعبوں کا خالص عمرانی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا ہے۔ مولف کا تنقیدی معیار اتنا بلند اور قابلِ قدر ہے کہ اگر ہمارے علماء اور نقاد، تمدنی، تعلیمی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے "عمرانیاتی معیار" تسلیم کریں تو یہ ملک اور قوم کے حق میں نہایت مفید اور سود مند ثابت ہوگا۔

اصل کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں قابل مولف نے انیسویں صدی کی ابتداء سے لے کر آج تک مسلمانان ہند میں جتنے بھی رہنما اور مشاہیر گزرے ہیں اور ان بلند مرتبہ شخصیتوں کی وجہ سے جو تحریکیں مسلمانوں میں چلی ہیں ان کے تمدنی، سیاسی افکارات اور تصورات اور ان تحریکوں کے نتائج پر .... سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اور بالخصوص عصر جدید کے ملت اسلامیہ ہند کے معمار سر سید احمد خاں اور اقبال کے اثرات جو یہاں کے مسلمانوں پر پڑے ہیں انھیں نہایت ہی جامع اور واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں کتاب کے نہایت ہی دلچسپ ابواب وہ ہیں جو اقبال کی تعلیمات اور اس کے اثرات سے متعلق مختص ہیں۔ مولف نے اقبال کے افکارات پر نہایت ہی عالمانہ نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے اور تنقید عالیہ کا وہ نمونہ پیش کیا ہے جو شاید ہی ہماری زبان میں کہیں پایا جائے۔ اقبال فلسفی سے زیادہ ایک شاعر تھے۔ اسی لئے مولف کو اقبال کی شاعرانہ عظمت سے ذرا بھی انکار نہیں اگر اختلاف ہے تو اس کے پیام اور افکارات سے، لیکن یہ اختلاف تعصب اور لاعلمی کی بناء پر نہیں بلکہ خالص عالمانہ ہے۔ اسی لئے مولف نے اقبال کے ترقی پسند رجحانات اور رجعت پسند خیالات کا تجزیہ کرنے میں انتہائی ہوشمندی سے کام لیا ہے اور بے جا جذبات کو کہیں دخل نہیں۔ دوسرے حصے میں مسلمانان ہند کی سیاسی جد و جہد اور کشمکش پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مسلمانوں کے موجودہ سیاسی مقصد "پاکستان" اور اس کے عواقب اور مضرات پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بہر حال کتاب اس قابل ہے کہ ہر ہندوستانی خواہ وہ مسلمان ہو یا اور کوئی ضرور اس کا مطالعہ کرے۔ "ر۔ و۔ ع"

نوید

(ایک مفلوک الحال دوست کے نام)

تیرے اِس گریۂ پیہم سے بھلا کیا ہو گا ؟
اشکِ غم آتشِ احساس بجھانے سے رہے !
نوجوانی کے سسکتے ہوئے پیاسے ارماں !
سینۂ زیست میں طوفان اٹھانے سے رہے !

تجھ کو معلوم ہے ؟ اس غمکدۂ ہستی میں
زندگانی کبھی ہمرنگِ تمنا بھی ہوئی
قلبِ انساں کی تمناؤں کی رنگین بہار
ان خزاں بار فضاؤں کو گوارا بھی ہوئی ؟

یہ جہاں ہاں یہ اندھیروں کا پُراسرار جہاں
آج تک جل نہ سکے جس میں مسرت کے چراغ !
تیری آزردہ و افسردہ تمناؤں کو
کس طرح دے گا بھلا فرصتِ تکمیلِ فراغ ؟

مجھ کو دیکھ عمر کی اس خواب فزا منزل میں
کتنے ارمانوں کا دم گھونٹ کے بیدار ہوں میں
بل نہ آیا کبھی پیشانیٔ ناداری پر !!
زہر پی پی کے حوادث کا بھی سرشار ہوں میں

کتنے طوفاں مری کشتیٔ خودداری کو —
انتقامانہ تحکم سے بلاتے ہی رہے !
کتنے سرمایہ پرستی کے سبک سیر خیال
تند خوئی کو مری وجد میں لاتے ہی رہے

لیکن اے دوست زمانے کا عمل سوز نظام
مجھ کو پابندِ قوانینِ سکوں کر نہ سکا !
صرصرِ تلخیٔ ایام کی سوگند کبھی
میں نے احساس کی قندیل کو بجھنے نہ دیا

زندگی جبر نہیں روح جو بیدار رہے
تیرگی شعلۂ خورشید سے جل جاتی ہے
عسرت و نکبت و آلام کی سنگین چٹان
گرمیٔ سعیٔ مسلسل سے پگھل جاتی ہے

کھیل کچھ اور یونہی ظلمت آلام سے کھیل
اب کوئی دم میں ابھرنے ہی کو ہے ماہِ تمام
آ رہی ہے افقِ شرق سے لیلائے حیات
اپنے ہاتھوں میں لئے بادۂ گلفام کا جام

لطیف ساجد

ادارے کی خبریں

شعبۂ تعلیم بالغان و امتحانات میسور

تاریخ ۲۷ اگست ۱۹۴۴ء روز یکشنبہ دن کے دس بجے

مجلس تعلیم بالغان و امتحانات کا اجلاس جناب عبدالقادر صاحب سروری پروفیسر اردو جامعہ میسور کے مکان پر منعقد ہوا۔ حسب ذیل حضرات تشریف لائے تھے۔

۱۔ جناب ایچ عبدالغفور صاحب بی اے بی ٹی وائس پرنسپل گورنمنٹ ٹریننگ کالج میسور (صدر)

۲۔ جناب ٹی عبدالقدوس صاحب بی اے بی ٹی مددگار مدرس گورنمنٹ ٹریننگ کالج میسور (۳)۔ جناب مولوی رکن الدین صاحب سالک اردو و فارسی معلم مہاراجہ ہائی اسکول میسور۔ ۴۔ جناب میر مرتضیٰ حسین صاحب بی اے بی ٹی صدر مدرس اردو پراکٹسنگ مڈل اسکول میسور۔ ۵۔ جناب عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی۔ پروفیسر اردو جامعہ میسور۔ ۶۔ افضل العلماء سید عبدالحکیم صاحب معلم اردو و فارسی مہاراجہ ہائی اسکول میسور معتمد۔

کارروائی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

جناب عبدالقادر صاحب سروری نے ادارہ کے اغراض و مقاصد اور شعبۂ تعلیم بالغان و امتحانات کا لائحہ عمل منظورہ مجلس انتظامی پڑھکر سنایا جو باتفاق آرا منظور کیا گیا۔ لائحہ عمل یہ ہے :-

۱۔ عوام میں ان پڑھوں کی تعلیم کا چرچا کرنا اور اس بات کا احساس پیدا کرنا۔

۲۔ شبینہ مدارس قائم کرکے یا اور طرح پر ان پڑھوں کی تعلیم کا انتظام کرنا۔

۳۔ بالغوں کی تعلیم کی تحریکات میں اعانت کرنا۔

۴۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کو ان پڑھوں کی تعلیم کے لئے رضاکارانہ طور پر آمادہ کرنا۔

۵۔ میسور اسٹیٹ لٹرسی کونسل اور ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے امتحانات کے لئے لوگوں کو تیار کرنا۔

اس لائحہ عمل کو روبہ عمل لانے کے لیے مختلف تجاویز پیش کی گئیں بالآخر طے پایا کہ :-

۱۔ یہ مجلس میسور اسٹیٹ لٹرسی کونسل کے مدارس کا معائنہ کرے انکو جس طرح کی مدد کی ضرورت ہو اس کا انتظام کرے۔

۲۔ میسور اسٹیٹ لٹرسی کونسل کے فارغ التحصیلوں کو ادارہ کے امتحان زباں دانی کے لئے تیار کرے۔

۳۔ اپنے گھروں کو تعلیم یافتہ بناؤ کی تحریک کو آگے بڑھانے میں پرزور حصہ لے اور ہر رکن اس میں حصہ لے (جناب میر مرتضیٰ حسین صاحب نے خاص طور پر اس کا ذمہ لیا ہے)

۴۔ طے پایا کہ جو لوگ اپنے علمی و ادبی ذوق کو بڑھانے کے لیے ادارہ کے دوسرے امتحانات میں بیٹھنا چاہیں ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۵۔ طے پایا کہ جو لوگ جامعہ مدراس کے اردو امتحانات کے لئے تیاری کرنا چاہیں ان کی بھی مدد کی جائے۔

۶۔ اردو ٹائپ کے مختلف نمونوں کا معائنہ کیا گیا اور طے پایا کہ عام طباعت کیلئے جہاں تک ہو سکے دارالطبع حیدرآباد کا جدید عثمانیہ ٹائپ استعمال کیا جانے تو بہتر ہوگا اور اگر ممکن ہو تو ادارہ کی طرف سے ایک مطبع میسور میں قائم کیا جائے۔

۷۔ طے پایا کہ مسٹر پی کرشنا مورتی یم اے لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج میسور کو اس شعبہ کی رکنیت کے لئے منتخب کیا جائے۔

بارہ بجے دوپہر کے قریب مجلس برخاست ہوئی۔

شاخ ادارۂ ادبیات اردو ناگپور

تاریخ ۲ ستمبر ۱۹۴۴ء

ادارہ ادبیات اردو شاخ ناگپور کی مجلس نظما کا ایک اہم جلسہ زیر صدارت مولوی عبدالستار صاحب فاروقی مدیر الفاروق کامٹی دفتر الفاروق میں چار بجے دن میں منعقد ہوا۔ جلسہ میں شاطر

حکیم فیض انصاری، شاہد الہاشمی، عبدالستار اشرفی، صدیق اختر اور منشی یعقوب علی حضرات اراکین ادارہ شریک تھے۔ مندرجہ ذیل تجاویز کافی بحث و غور کے بعد منظور کی گئیں۔

۱۔ ادارۂ ادبیات اردو شاخ ناگپور کے قیام کے سلسلے میں اب تک جو خط و کتابت اور کام ہوا ہے اس کا جائزہ لیا گیا۔ اور طے پایا کہ مرکزی دفتر کے سکریٹری زور صاحب کا خط آتے ہی فوراً جلسہ طلب کیا جائے۔

۲۔ تعلیم بالغاں کی اسکیم کے پیش نظر جو شبینہ مدارس جاری کئے جانے والے ہیں اس کے ابتدائی انتظامات شروع کر دیئے جائیں۔ اور عید کے بعد اس سلسلہ کا پہلا شبینہ مدرسہ ناگپور کے کسی وسطی محلہ میں کھولا جائے۔

۳۔ ادارے کے شعبۂ تالیف و تصنیف کی تحریک کے مطابق صوبہ متوسط و برار کے نوجوان ترقی پسند اور منتخب شعراء کا ایک اجمالی تذکرہ بنام "سی پی کے موتی" شایع کیا جائے جس میں ان کا منتخب کلام مع مجمل حالات زندگی اور تصاویر ہونگی۔

اس سلسلے میں مراسلت کی اجازت دی گئی اور تمام رفقاء نے ایک ساتھ روزہ افطار کرکے جلسے کو برخاست کیا۔

خیام ہندی

اردو امتحانات سنہ ۱۹۴۴ء

سلسلہ نمبر	نام امتحان	شریک	حاضر	کامیاب: اول	کامیاب: دوم	کامیاب: سوم	جملہ	فیصد کامیابی	شریک: اناث	شریک: ذکور	شریک: مسلم	شریک: غیر مسلم
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳
۱	اردو فاضل	۳۰	۲۴	۰	۸	۹	۱۷	۶۶	۵	۲۵	۳۰	
۲	اردو عالم	۱۸۸	۱۴۳	۲	۱۲	۷۴	۸۸	۶۱	۵۶	۱۳۲	۱۷۲	۱۶
۳	اردو زباندانی	۷۷۴	۳۸۱	۴	۷۸	۱۳۸	۲۲۰	۷۱	۹۰	۳۰۰	۳۹۵	۷۲
۴	خوشنویسی	۹	۷	-	۔	۳	۳	۴۳	۲	۷	۹	۔

سلسلہ نمبر	نام امتحان	شریک	حاضر	کامیاب بدرجۂ امتیاز	کامیاب	جملہ	فیصد کامیابی	اناث	ذکور	مسلم	غیر مسلم
۵	اردو دانی	۸۲۲	۴۲۹	۹۴	۳۰۲	۳۹۶	۷۲	۱۴۱	۶۸۱	۶۹۳	۱۲۹

شعبۂ نسواں

شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کا اجلاس بتاریخ ۱۰ر جولائی ۱۹۴۴ء م ۴ر شہریور ۱۳۵۳ف

ادارہ کے دفتر میں ساڑھے دس بجے منعقد ہوا۔ حسب ذیل ارکان نے شرکت کی۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر۔ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر شریک معتمد محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ۔ محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ۔ محترمہ عظمت النساء بیگم صاحبہ اور معتمد شعبہ سکینہ بیگم صاحبہ۔

سارہ بیگم صاحبہ سعید النساء بیگم صاحبہ اور عظمت النساء بیگم صاحبہ (مسز قیوم) نے شرکت سے معذرت چاہی۔

اجلاس کا آغاز سابقہ روئداد کی توثیق سے کیا گیا اس کے بعد اس سے متعلق امور پر جو عمل ہوا تھا اس کی وضاحت حسب ذیل کی گئی۔

(۱) (الف) شعبہ کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے نظامت تعلیمات سے درخواست کی گئی کہ وہ رقم جو اب تک ادارہ کو دیجاتی تھی اب شعبہ کے نام بحال کی جائے۔ نیز یکمشت وسی گزار کی رقم شعبہ کو مدارس کے قیام کے لئے دلوانے کی بھی درخواست کی گئی۔ معتمد نے بالمشافہ ناظم صاحب سے ملکر شعبہ کے کاموں پر روشنی ڈالی اور اس کی دشواریوں سے روشناس کرایا۔ ناظم صاحب نے شعبہ کے کاموں سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرماتے ہوئے درخواست پر غور کرنے کا وعدہ فرمایا۔

(۲) مدرسہ کے نصاب کے متعلق معتمد نے ناظم صاحب سے گفتگو کی تھی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔

(۳) بزم ادب کا دوسرا جلسہ "اقبال" پر جیسا کہ طے پایا تھا۔ ذیقعدہ (نومبر ۱۹۴۳ء) میں بمقام محبوبیہ اسکول منعقد ہوا جس میں بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ بہادر اور بیگم صاحبہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر نے بھی شرکت فرمائی۔

(اس جلسہ کی تفصیلی رپورٹ سب رس بابت جنوری ۱۹۴۴ء میں شائع ہو چکی ہے)

(۴) معتمد و شریک معتمد میں تقسیم کار کا مسئلہ ہنوز طے نہ پا سکا۔ اس ضمن میں شعبہ کے لئے قواعد و ضوابط کی شدید ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے معتمد نے ایسے قواعد مرتب کرکے آئندہ اجلاس پر مسودہ پیش کرنے کا ذمہ لیا۔ اس کے بعد حسب ذیل امور زیر بحث رہے۔

(۱) شعبہ کے مصارف میں مزید اضافہ (۲) قیام مدرسۂ اطفال سرکاری بمقام اڈیکمیٹ (۳) امتحانات ادارہ (۴) اردو کانگریس (۵) بزم ادب (۶) قرار داد تعزیت (۷) دیگر امور۔

طے پایا کہ تاوقتیکہ سرکاری امداد نظامت تعلیمات سے جاری نہ ہوجائے مدارس کے لئے کوئی اضافہ منظور نہیں جا سکتا۔

(۲) یہ خبر بڑی خوشی سے سنی گئی کہ اڈیکمیٹ میں سرکاری طور پر ایک مدرسہ اطفال کا قیام عمل میں آیا ہے یہ گویا ہماری سہ سالہ کوششوں اور جد و جہد کا ثمر ہے۔ ہم نے خود اپنے مدرسۂ اطفال کو سرکار میں لے لینے کی خواہش کی تھی لیکن اب جبکہ ایک سرکاری مدرسہ قائم ہو چکا ہے ہم اپنے مدرسہ کو اس میں ضم کر دینے آمادہ ہیں۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد شعبہ کے مدرسۂ اطفال کو سرکاری مدرسہ میں ضم کر دیا جائے گا۔

(۳) امتحانات ادارہ حسب سال گزشتہ مدرسہ فوقانیہ نسواں نامپلی میں بتاریخ ۱۸۔ ۱۹ ۲۰ جولائی منعقد ہوں گے جن کی نگرانی حسب ذیل خواتین کے ذمہ کی گئی۔

۱۸ر جولائی۔ رابعہ بیگم صاحبہ۔ سعید النساء بیگم صاحبہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ

۱۹ر " عظمت النساء بیگم صاحبہ بلقیس بانو صاحبہ۔ سکینہ بیگم صاحبہ

۲۰ر " بشیر النساء بیگم صاحبہ۔ تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ سعید النساء بیگم صاحبہ

(۴) اردو کانگریس کے سلسلہ میں معتمد نے ارکان شعبہ سے درخواست کی

کہ کانگریس کے اجلاسوں میں زنانہ انتظامات میں مدد کریں جس کا ارکان حاضر نے وعدہ کیا۔

(۵) بزم ادب کے تیسرے جلسہ کے لئے میر تقی میر کا انتخاب کرتے ہوئے جہاں بانو بیگم صاحبہ نے شعبان کے آخری عشرہ میں اس کو پیش کرنے کا وعدہ کیا۔

(۶) فخر قوم و سرمایۂ ملت بہادر یار جنگ بہادر کی رحلت سے اردو زبان کو جو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے اس کو محسوس کرتے ہوئے شعبہ کی طرف سے حسب ذیل قرارداد تعزیت پیش کی گئی جس کو ارکین نے ایستادہ ہو کر منظور کیا اور جس کی ایک نقل مرحوم کی بیگم صاحبہ کے یہاں روانہ کی گئی۔

قرار داد تعزیت

ارکین شعبۂ نسواں ملک و زبان اردو کے بے مثل و بے نظیر خطیب نواب بہادر یار جنگ بہادر کی بے وقت رحلت پر اپنے دلی جذبات الم کا اظہار کرتے ہیں نیز اردو کے لئے اس سانحۂ عظیم کو ایک ناقابل تلافی نقصان تصور کرتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہم سب ارکان شعبۂ بیگم صاحبہ نواب بہادر یار جنگ بہادر کی خدمت میں گہرے رنج و الم کے ساتھ اپنی مخلصانہ تعزیت پیش کرتے ہیں۔　　شریک غم

رابعہ بیگم۔ جہاں بانو بیگم بشیر النسا بیگم لطیف النسا بیگم صابرہ بیگم تصدق فاطمہ بیگم بلقیس بانو بیگم سعید النسا بیگم تہنیت النسا بیگم عظمت النسا بیگم۔ سکینہ بیگم۔

۱۰ر جولائی ۱۹۴۴ء

(۷) ادارہ کے امتحانات کو مستند کرنے کے لئے معتمد صاحب امتحانات مولوی سید محمدؒ صاحب سے استدعا کرنے کی رائے ہوئی کہ وہ سرکار میں اس کے لئے درخواست کریں۔

شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ بروز جمعہ بتاریخ ۲۴ آبان ۱۳۵۳ف ادارہ کے دفتر میں صبح ساڑھے دس بجے منعقد ہوا حسب ذیل خواتین موجود تھیں۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبۂ صدر محترمہ بشیر النسا بیگم صاحبۂ شریک معتمد۔ محترمہ بلقیس بانو بیگم صاحبہ محترمہ محل مولوی عبد القیوم صاحب۔ محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ۔ محترمہ تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ۔ محترمہ عظمت النسا بیگم اور معتمد شعبہ سکینہ بیگم صاحبہ۔

طے پایا کہ آغاز ۱۳۵۴ف سے شعبہ کے مدرسہ اطفال کو سرکاری مدرسہ میں ضم کر دیا جائے۔

بزم ادب کا جلسہ | اس دفعہ محبوبیہ اسکول میں کرنے کی بار ہے لہذا یہ تجویز ہوئی کہ لطیف النسا بیگم صاحبہ سے اس بارے میں معتمد ملاقات کر کے ماہ ذیقعدہ کے کسی دن اور تاریخ کا تعین کریں اور اس کے بعد ارکین عاملہ کو اس کی اطلاع کرائیں۔ نظام العمل لطیف النسا بیگم صاحبہ کے صوابدید پر منحصر ہوگا۔

چونکہ اس سے قبل لطیف النسا بیگم نے غالب کو اپنا موضوع قرار دیا تھا اس لئے معتمد نے تحریک کی کہ سعیدہ مظہر صاحبہ کا مضمون غالب جو خاص بچوں کیلئے لکھا گیا ہے اس موقعہ پر سنایا جائے۔ بلقیس بانو صاحبہ نے بھی "غالب کی بذلہ سنجی" پر ایک مضمون دینے کا وعدہ کیا۔ یہ ہر دو اور کچھ ٹابلوز جن کا معتمد نے ذمہ لیا باجازت لطیف النسا بیگم صاحبہ پیش کئے جا سکیں گے۔

دستور العمل | حسب وعدہ معتمد نے اپنا مرتب کردہ مسودہ پیش کیا۔ ساتھ ہی یہ تجویز بھی پیش کی کہ اگر ارکین ان پر غور کر کے اپنی رائے دینا چاہیں تو ان کو اس کی نقلیں بھجوا دی جائیں۔ تاکہ وہ اس پر

اپنی ترمیمات اور اضافے پیش کر سکیں جسے اراکین نے منظور کیا۔

دیگر امور اراکین کی غیر حاضری کے متعلق گزشتہ اجلاس کے جلسہ سے غیر حاضر اراکین میں جو گفتگو ہوئی تھی اس کا حوالہ دیتے ہوئے معتمد نے یہ تحریک پیش کی کہ سارہ بیگم صاحبہ چونکہ اپنی صحت کی وجہ سے شرکت سے مجبور ہیں لہذا انھیں بحیثیت رکن خصوصی کے مجلس پر رکھا جائے اور ان کے عوض مجلس عاملہ کے لئے کسی اور کا انتخاب کیا جائے۔

اس کے بعد معتمد نے تحریک کی کہ رکنیت عاملہ کے لئے رفیعہ سلطانہ اور سعیدہ منظہر کے نام منظور کئے جائیں جس کی تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ نے تائید کی اور دیگر اراکین نے بخوشی منظور فرمایا۔

دستور العمل کے قاعدہ ۱۲ فقرہ (۱) کے بموجب معتمد نے رائے پیش کی کہ ذیلی مجالس کے لئے حسب ذیل تقسیم مناسب ہوگی۔

مجلس بزم ادب.......... داعی　تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ
مجلس تعلیم و ترقی نسواں... 〃　سعیدہ منظہر صاحبہ
مجلس ادب نسواں......... 〃　رفیعہ سلطانہ صاحبہ

جس کو اراکین حاضر نے پسند فرمایا۔

اس کے بعد ادارہ کی عمارت کا معائنہ ہوا اور جلسہ برخاست ہوا۔

شاخ پربھنی معتمد صاحب نے حسب ذیل رپورٹ روانہ کی ہے۔ "چونکہ میرا تبادلہ پربھنی سے کندکور تعلقہ دیور کنڈہ ضلع نلگنڈہ ہوگیا ہے۔ اس لئے مجبوراً ایک جلسہ عام کر کے جدید کابینہ ادارہ ادبیات اردو شاخ پربھنی ترتیب دی گئی جو بلطیفہ آرا منظور کی گئی۔"

میں اپنی خدمت معتمد اعزازی شاخ پربھنی سے سبکدوش ہوگیا ہوں اور میری بجائے مولوی ناصر بن عبد الحبیب صاحب معتمد شاخ منتخب ہوئے۔

میری تمنا ہے کہ شاخ پربھنی اپنی روایات کو باقی رکھے اور دن دونی رات چوگنی ترقی کرے ۱۳۴۹ف سے لیکر ۱۳۵۳ف تک مجھ سے جہاں تک ممکن ہو سکا میں نے ادارہ کی خدمت انجام دی اور آئندہ بھی جہاں تک ممکن ہو سکے ہر قسم کی امداد و تعاون کے لئے حاضر ہوں اور میری پرخلوص تمنائیں شاخ پربھنی کے ساتھ برابر رہیں گی۔

شاخ پربھنی ۱۳۵۳ف کے لئے حسب ذیل کابینہ منتخب کی گئی ہے۔

جدید کابینہ ۱۳۵۳ف صدر۔ مولوی جلال الدین صاحب اشک بی اے ایل ایل بی امین کروڑگیری پربھنی۔

نائب صدر۔ مولوی منظہر علی خاں صاحب علیگ وکیل ہائیکورٹ پربھنی۔

معتمد۔ ناصر بن عبد الحبیب صاحب اردو فاضل۔

شریک معتمد۔ مولوی اشرف الدین صاحب نیفتی اردو فاضل منشی فاضل

خازن۔ حاجی محمد عبد الکریم صاحب جنرل مرچنٹ پربھنی۔

کتبخانہ دار۔ مولوی سید عیسیٰ صاحب اہلکار دفتر آبکاری پربھنی

اراکین انتظامی۔ مولوی شمس الحسن صاحب زبیری صدر مدرس فوقانیہ پربھنی۔ مولوی عبد الرحمٰن خاں صاحب بی اے سب رجسٹرار پربھنی مولوی میر محبوب علی حسنا بی اے ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب۔ مولوی سید حبیب علی صاحب۔ مولوی سید خورشید حیدر صاحب خورشید

روئداد جلسہ سالانہ شاخ پربھنی

ادارہ ادبیات اردو شاخ پربھنی اور بزم رندان (کلب) کا مشترکہ جلسہ سالانہ بتاریخ یکم آذر ۱۳۵۴ف ۶ بجے شام بتقریب سال نو زیر صدارت مولوی مرزا محمد مہدی صاحب اول تعلقدار ضلع پربھنی منعقد ہوا جس میں عہدہ داران مقامی و کلا، علم و ادب سے ذوق رکھنے والے نوجوان اور بکثرت عوام شریک تھے۔ جلسہ کا آغاز پرچم آصفی کی بلندی سے ہوا۔ معتمد ادارہ ادبیات اردو نے ادارہ کی جانب سے اپنی رپورٹ

اور ادارہ کے مقاصد اور بنیادی اصولوں پر موزوں الفاظ میں تبصرہ کیا۔ پروگرام کے مطابق ایک تقریر اور ہر تقریر کے بعد ایک نظم سنائی گئی۔

مولوی محمد جلال الدین صاحب اشک بی اے۔ ایل ایل بی امین کروڑگیری و صدر ادارہ ادبیات اردو پربھنی نے جناب صدر و حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ دعائے سلامتی حضرت اقدس و اعلیٰ و شاہزادگان بلند اقبال و شاہزادیان فرخ فال پر جلسہ کا کامیاب اختتام ہوا۔

شب کے (۱۰) بجے حسب اعلان مشاعرہ مولوی محمد جلال الدین صاحب اشک کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں کافی تعداد شعراء و سامعین کی شریک بزم مشاعرہ ہوئی۔ طرحی کے بعد غیر طرحی کلام بھی سنایا گیا۔ اور یہ ادبی مجلس دو بجے شب تک نہایت سرگرمی کے ساتھ جاری رہی۔ سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ اور شعراء نے خاطر خواہ داد پائی

ناصر انصاری اردو فاضل معتمد

عطیہ مخطوطات

پروفیسر اصغر کاروانی صاحب مدیر شعاع اردو کراچی نے سندھ کی اردو شاعری کا ایک قلمی مجموعہ ادارے کو بطور تحفہ ارسال فرمایا ہے۔ اس کتاب میں کئی چھوٹے بڑے اردو و فارسی رسالے بھی شامل ہیں اور اس کے تحقیقی مطالعے کے بعد اس کی تفصیلات تذکرہ اردو مخطوطات جلد دوم میں شائع کی جائیں گی۔ ادارے کی جانب سے جناب پروفیسر کاروانی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ انھوں نے کراچی سے اور بھی قلمی کتب کی فراہمی کا وعدہ فرمایا ہے۔

مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار اردو سٹی کالج نے بھی حسب ذیل قلمی کتب بطور تحفہ کتب خانہ مخطوطات میں داخل کی ہیں۔ جس کے لئے ادارہ ان کا شکر گزار ہے۔

۱۔ شرح تہذیب فارسی۔ ۲۔ پنچھی باچھا اردو۔ ۳۔ گلستان فارسی ۴۔ تاریخ کیمیا اردو۔ ۵۔ قواعد عثمانیہ اردو۔

شعبۂ شعراء و مصنفین میسور

بتاریخ ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ء دفتر روزنامہ "آزاد" لشکر بنگلور میں دن کے چار بجے اجلاس منعقد ہوا۔ حسب ذیل عہدہ دار اور اراکین حاضر تھے۔

۱۔ صدر جناب غازی صاحب مدیر "فانوس"۔ ۲۔ معتمد جناب ڈاکٹر حکیم عبد المنعم خاں صاحب فاضل طب و جراحی دہلی۔ ۳۔ جناب مولوی حسن صاحب منشی ۴۔ جناب مولوی عبد الوہاب صاحب ایم اے بار ایٹ لا، صدر فورٹ ہائی اسکول بنگلور۔ ۵۔ جناب عبد القادر سروری صاحب پروفیسر اردو، مہاراجہ کالج میسور۔

(۱) شعبہ کا لائحہ عمل مرتبہ مجلس انتظامی، ادارہ ادبیات اردو میسور، منظور ہوا۔

(۲) طے پایا کہ شعبہ کی کارکردگی میں اضافہ کے لئے حسب ذیل عہدہ داروں اور اراکین کو شامل کیا جائے۔

نائب صدر۔ جناب محمد اسمٰعیل صاحب مائل۔ نائب معتمد جناب محمد عبد اللہ صاحب شوق۔ اراکین جناب عبد الوہاب صاحب ایم اے، بار ایٹ لا صدر۔ فورٹ ہائی اسکول بنگلور جناب عبد الرزاق صاحب ایم اے، ایل ایل بی (علیگ) مددگار فورٹ ہائی اسکول بنگلور۔ جناب محبوب شریف صاحب بی اے مددگار فورٹ ہائی اسکول۔ جناب منشی محمد ابراہیم صاحب ذائق۔

(۳) طے پایا کہ عالیجناب رکن الملک سید عبد الواحد صاحب سر دارالمہام کی خدمت میں التماس کی جائے کہ اس شعبہ کی رہنمائی کے لئے اس کی اعزازی رکنیت قبول فرمائیں۔ ساڑھے پانچ بجے جلسہ برخاست ہوا۔

عبد القادر سروری معتمد

اردو دانی کا دوسرا امتحان

حسب تصفیہ مجلس انتظامی اردو امتحانات سنہ ۱۹۴۴ء کا دوسرا امتحان اردو دانی بتاریخ ۳۰ نومبر سنہ ۱۹۴۴ء مطابق ۲۹ دے سنہ ۱۳۵۴ ف کا بلدہ اضلاع اور بیرون ریاست کے جملہ مرکزوں میں ایک ساتھ لیا جائے گا۔ فیس امتحان اور درخواستیں ۵ دے سنہ ۱۳۵۴ ف تک دفتر ادارہ پر وصول ہو جانی چاہئیں۔ ہر وہ مقام مرکز مقرر

کیاجائے گا جہاں سے کم از کم (۳۵) امیدوار شریک ہوں۔

مجلس انتظامی کے اجلاس

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا ملتوبہ اجلاس پنجشنبہ ۲۵ رمہر ۱۳۵۲ف م ۲۱ راگست ۱۹۴۳ء شام کے پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر صدر المہام تعمیرات۔

عالیجناب نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات و باب حکومت۔

مولوی عبد المجید صدیقی صاحب۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ معتمد ادارہ

آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نے صدارت فرمائی۔

(۱) گزشتہ اجلاس کی روئداد پڑھ کر سنائی گئی اور اس کی توثیق عمل میں آئی۔

(۲) کل ہند اردو کانگرس کی تفصیلات کی توثیق کی گئی۔

(۳) تاریخ دکن کانفرنس کے کام کی تفصیلات معتمد ادارہ اور مولوی عبد المجید صدیقی صاحب نے بیان کیں۔ اور اس کے انتظامات سے متعلق تبادلۂ خیال کیا گیا۔

(۴) آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر کی صدر المہامی کی مسرت میں ادارے کی جانب سے عید الفطر کے بعد ایک عصرانہ کا تصفیہ کیا گیا جس میں ادارے کے ارباب کار اور معتمدین و رفقاء کو مدعو کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں طے پایا کہ نواب صاحب معزز سے بعد رمضان تاریخ کا تعین کیا جائے۔

(۵) شعبۂ نسواں کے مدرسہ کو کھا پڑ کیلئے صدر صاحبہ و معتمد صاحبہ مدرسہ نسواں کی تحریک و تائید سے اور عالیجناب نواب لیاقت جنگ بہادر نائب صدر کی منظوری کے بعد تین سو روپے کا جو قرض منجانب ادارہ دیا گیا تھا اس کی توثیق کی گئی۔

(۶) قبلی مجلس ارد و امتحانات کی تحریک کہ شعبۂ اردو امتحانات کا نام "شعبۂ تعلیم بالغاں" رکھا جائے پیش ہوئی اور کافی غور و خوض کے بعد طے پایا کہ نام کی تبدیلی مناسب نہیں ہے۔

(۷) نواب معین نواز جنگ بہادر نے تحریک پیش کی کہ آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر سے بھی ادارۂ ادبیات اردو کے نائب صدر بننے کی استدعا کیجائے۔ دیگر ارکان نے اس کی تائید کی۔ کافی اصرار کے بعد نواب صاحب نے ادارہ کی نائب صدارت قبول فرمائی۔

(۸) مخزن علوم و فنون یعنی اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے سرکاری امداد کی جو کارروائی کی جارہی ہے وہ پیش کی گئی اور اس کی توثیق عمل میں آئی۔

(۹) ادارے کی عمارت کا مسئلہ پیش ہوا اور مناسب تصفیہ عمل میں آیا۔

(۱۰) حسب ذیل امور بھی شریک ایجنڈا تھے لیکن آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کئے گئے۔

(۱) ادارہ کے شعبہ جات میں تبدیلی کی ملتوی شدہ کارروائی۔

(۲) نئی شاخوں کے قیام کی توثیق۔

(۳) شعبۂ کتب دیہی کے قیام کا مسئلہ۔

(۴) سرکاری امداد کے شرائط اور ادارے کے دستور کا مسئلہ۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا ایک دوسرا اجلاس بتاریخ ۴ ر آذر ۱۳۵۳ف مطابق ۱۹ ر اکتوبر ۱۹۴۳ء روز پنجشنبہ شام کے ساڑھے پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر صدر المہام تعمیرات۔ صدر

〃　نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات۔

〃　مولوی سید علی اکبر صاحب پرنسپل نظام کالج۔

〃　〃　عبد المجید صدیقی صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ

عالیجناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ مددگار رجسٹریشن۔
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔۔۔۔ معتمد اعزازی

گزشتہ اجلاس کی روئداد سنائی گئی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔

(۱) ۔ ۱۳۵۴ف کا موازنہ بعد غور و خوض منظور کیا گیا۔

(۲) ۔ تحریک ڈاکٹر امیر علی صاحب ۔

"ڈاکٹر امیر علی صاحب کی تحریک پیش ہوئی کہ ادارے کی مجوزہ عمارت میں ایک حصہ ایوان قرآن کے نام سے مختص کیا جائے تاکہ قرآن کے جملہ اردو تراجم اس میں محفوظ رہیں جن کے جمع کرنے کے سلسلہ میں تین ہزار روپے کی ضرورت ہوگی یہ کام صاحب موصوف نے شروع کر دیا ہے اور اس کے لئے فی الحال تین سو روپے ادارے سے صاحب موصوف کو دیئے جائیں۔ بعد غور و خوض طے پایا کہ ۔

"ڈاکٹر امیر علی صاحب کو قرآن کے اردو تراجم جمع کرنے کے لئے تین سو روپے ایصال کرنے کی اس شرط سے منظوری دیجاتی ہے کہ یہ کتب ادارے کی ملک ہوں گے۔

اگر آئندہ مجلس انتظامی میں صاحب موصوف خود تشریف لائیں تو اس تجویز کی تفصیلات پر گفتگو ہو سکے گی ۔"

(۳) مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد ایم اے مہتمم ادارہ کی درخواست پیش کی گئی کہ ان کی بازیافت کے سلسلہ میں جس معاہدہ کی شرط لگائی گئی ہے وہ اٹھالی جائے اور ختم عمر سی سالہ کے بعد جو بازیافت ہوگی اس کا تعین کیا جائے ۔ کافی غور و خوض اور تبادلۂ خیال کے بعد مناسب تصفیہ عمل میں آیا۔

(۴) معتمد ادارہ نے ادارے کی جدید اور بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر عملہ میں اضافہ کے لئے جو تجاویز پیش کی تھیں ان پر غور کیا گیا اور طے پایا کہ عملہ ادارہ میں سے جو تین سال کی ملازمت کا معاہدہ لکھ دیں ان کے نام گزشتہ مجلس انتظامی کے تصفیے کے مطابق بیمہ کرایا جائے ۔ اس سلسلے میں نئی جائدادیں بھی منظور کی گئیں۔

(۵) ادارے کی نئی شاخوں یعنی شاخ ناگپور و شاخ میسور کے قیام کے جو اجازت نامے معتمد ادارہ نے ارسال کئے تھے ان کی توثیق کی گئی۔

(۶) سرکاری امداد کی شرائط کے بارے میں معتمد نے مجلس انتظامی کو متوجہ کیا۔

"طے پایا کہ نواب معین نواز جنگ بہادر، مولوی عبدالمجید صدیقی اور معتمد اعزازی ادارہ پر مشتمل ایک ذیلی مجلس اس معاملہ میں غور کر کے ایک یادداشت مرتب کرے تاکہ سرکار میں پیش کی جائے ۔"

(۷) ادارے کی مجوزہ عمارت کے لئے بشیر باغ روڈ پر جس اراضی کا عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نے انتخاب فرمایا ہے اس کی توثیق کی گئی اور عمارت کے لئے فراہمی رقوم سے متعلق ایک مہم کا آغاز کرنے کا تصفیہ کیا گیا اور اس اپیل کا مسودہ منظور کیا گیا جو عالیجناب نواب زین یار جنگ بہادر اس سلسلہ میں جاری فرما رہے ہیں۔

(۸) چونکہ مذکورہ مسائل کے تصفیوں میں بہت دیر ہوگئی تھی اس لئے پیش نامہ کے حسب ذیل باقی ماندہ امور آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کئے گئے۔

(۱) تحریک مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کہ ادارے کے موجودہ شعبوں میں تبدیلی کی جائے ۔

(۲) ادارہ میں شعبۂ کتب دیہی کے قیام کا مسئلہ ۔

(۳) شعبۂ نسواں کے دستور اور جدید تنظیم کی منظوری۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	پائی
من کی بپتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت عالم ...	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
زندگی نو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان حدث ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سرسید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
مغرب کی چھاؤں ..	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸		۴	۰
سائنس کے کرشمے ..	۱۱۲		۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی .	۱۶	۰	۳	۰
اردو نامہ ..	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	۰
" " دوسری کتاب	۸۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ .	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تحریر ...	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ..	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن ..	۳۴۰	۲	۸	۰
پودوں کی کہانی .	۸۰	۰	۱۰	۰
مرقعا ..	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۴	۰
رسائل طبیہ ...	۳۱	۲	۸	۰
سلک گوہر ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اس کی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۹۹	۱	۰	۰
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	پائی
سحر کا جادو ..	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات ...	۶۸	۰	۸	۰
مداح سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن .	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ..	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن .	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
نقش سخن ..	۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ..	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۰	۳	۸	۰
گہر و نسیم	۹۲	۳	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۹۶	۱		۰
معروضہ نامہ	۱۲	۲		
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۳	۱	۰
عاصم	۲۰۰		۴	۰
دینی معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آنند ورکشتان اور سورنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
مرقع محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
داغاں .	۳۰	۰	۳	۰
خطابات .	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم جامہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۹۹	۱	۸	۰
کشمش نامی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کارستان دتاسی ...	۱۳۲	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ .	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت ...	۵۶	۰	۸	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۲ع میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ ..	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
نواب صدر محبوب علی خان	۳۴	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

دسمبر

(ماہ نامہ)

سب رس

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ طابنبا یم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سبرس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۸ ر

سبرس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
مہندر راج سکسینہ ایم ایس سی

جلد ۷ بابت ڈسمبر ۱۹۴۴ء شمارہ ۱۲

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

حشرِ جذبات

کسی کے راز کی اب رُوح محرم ہوتی جاتی ہے
کہ طغیانی سے جلوؤں کی نظر کم ہوتی جاتی ہے

خدا جانے محبت مجھ کو کس منزل میں لائی ہے
تمنا اب محیطِ ہر دو عالم ہوتی جاتی ہے

نہ ہوں اہلِ قفس آزردہ میری نغمہ سنجی سے
طبیعت رفتہ رفتہ مائلِ غم ہوتی جاتی ہے

جنوں کا سلسلہ کس طرح کم ہو اُس کی الفت میں
اشارت حسنِ بے پروا کی مبہم ہوتی جاتی ہے

ہوئی جاتی ہے اب تکمیل میرے شوقِ سجدہ کی
مری تخئیل فرقت میں مجسّم ہوتی جاتی ہے

نہ ہو تو مطمئن اے حُسن اپنی بے نیازی پر
تغافل سے محبت اور محکم ہوتی جاتی ہے

محبت کی حرارت گم ہے تیرے حسنِ تمکیں میں
شعاعِ مہر یعنی غرقِ شبنم ہوتی جاتی ہے

تو ہی اے موت رکھ لے شرم اخفائے محبت کی
کہ اب تو آنسوؤں سے آستیں نم ہوتی جاتی ہے

خدا جانے وفائے عشق کا انجام کیا ہو گا
کہ اس کی زلف ثاقب غم میں برہم ہوتی جاتی ہے

ثاقب

خوابِ بیداری

وہ جلوۂ بیتاب کہاں سے لاؤں
آئینۂ خوش آب کہاں سے لاؤں

نغمے مری آہوں میں دبے جاتے ہیں
وہ ساز وہ مضراب کہاں سے لاؤں

دل یاد فراموش ہوا جاتا ہے
امید کے وہ خواب کہاں سے لاؤں

پیتا ہوں مگر جیسے نہیں پیتا ہوں
اب شوقِ مئے ناب کہاں سے لاؤں

اللہ! بہاروں میں کمی ہی کیوں ہے
میں وہ گلِ شاداب کہاں سے لاؤں

نیندوں کے دھندلکے سے برستے تھے جب
وہ شامِ سحر تاب کہاں سے لاؤں

آزردہ و افسردہ ستارو! جاؤ
وہ "سانولا مہتاب" کہاں سے لاؤں

کہنے کو مرے جام میں سب کچھ ہے نظر
وہ "بزم" وہ احباب کہاں سے لاؤں

نظر حیدرآبادی

عظیم تر حیدرآباد

شہر حیدرآباد کی بنا اور ارتقا سے متعلق میں نے اپنی کتابوں ' حیات محمد قلی قطب شاہ (بانی حیدرآباد)
اور حیات میر محمد مومن (پیشوائے محمد قلی قطب شاہ) میں تفصیل سے حالات اور معلومات قلمبند کردی ہیں اور اسی
سلسلے میں ایک اور کتاب بھی مرتب کی ہے جس میں ان تمام مشاہیر کے اصلی تاثرات شامل ہیں جو حیدرآباد کی تعمیر کے
آغاز کے وقت سے عہد حاضر تک موقع بہ موقع حیدرآباد آتے رہے ہیں۔ ان مشاہیر میں مختلف ممالک کے سیاحوں کے علاوہ
دوسری سلطنتوں کے وزیر اور سفیر بھی شریک ہیں اور ایسے شعراء اور انشاء پرداز بھی جنھوں نے حیدرآباد کا کسی نہ کسی
تقریب سے سفر کیا اور اس کے محل وقوع کی خوبیوں، مناظر کی دلآویزیوں اور عمارتوں اور بازاروں کی رنگارنگیوں
سے اس حد تک متاثر و محظوظ ہوئے کہ اپنی اپنی زبان میں اس شہر کی تعریف و توصیف قلمبند کئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان
کی یہ رطب اللسانی محض مدح سرائی نہیں ہے بلکہ بعضوں نے دنیا کے دوسرے بڑے شہروں مثلاً پیرس، روم، شیراز،
اصفہان، مشہد، بخارا، دہلی، آگرہ اور بیجاپور کی تعمیری اور بلدی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر ان سے مقابلے
میں حیدرآباد کی خصوصیات کو واضح کیا ہے۔

اس طرح حیدرآباد اور اس کی تاریخ سے مجھے جو تعلق پیدا ہو چکا ہے اس کی بنا پر میں نے مولوی محمد فیاض الدین صاحب
کے اس "منصوبۂ عظیم تر حیدرآباد" کا اس وقت ہی سے گہری دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرنا شروع کردیا تھا جب کہ
ان کا غیر معمولی طور پر ذہین دماغ اس منصوبہ کے تخیل کے ساتھ کھیل رہا تھا اور بعد کو اُن کا باکمال قلم مختلف طول و
عرض کے کاغذوں پر ان کے اعلیٰ اور پاکیزہ تخیل کے رنگین عکس اتار رہا تھا۔

فیاض الدین صاحب کی یہ تجویز محض اس لئے کامیاب نہیں ہوئی کہ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے نقشہ کار اور بلدی
آرائش کے جدید ترین میلانات کے ماہر ہیں بلکہ حیدرآباد کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے اور اس کے بانی اور اس کے مشیران کار
کی اصلی منصوبہ بندی سے واقف ہونے کی بھی انھوں نے امکانی کوشش کی۔ یہ عظیم الشان شہر قطب شاہی عہد میں
جہاں ایک سمت میں ڈُرگ کے تالاب (جانب مغرب) سے حیات نگر (جانب شرق) تک پھیلا ہوا تھا دوسری سمت میں
باباشرف الدین کی پہاڑی اور چندر نارائن گٹہ (جانب جنوب) سے حسین ساگر کے تالاب (جانب شمال) تک آباد تھا۔ ان وسیع
حدود کے درمیان بادشاہ اور امرا کے کئی باغ اور محل تھے جو گنجان آبادیوں کے درمیان ہوا کو صاف پاک اور صحت بخش
رکھنے میں مدد دیتے تھے۔ یہ تمام باغ بعد کو آبادی کی شکل میں منتقل ہوگئے اور اس طرح موجودہ حیدرآباد عمارتوں،
بازاروں اور گلیوں کی ایک ایسی بے ترتیب شکل میں منتقل ہوگیا جو نہ صرف شہری مناظر بلکہ شہریوں کی صحت کے لئے
بھی نقصان دہ ثابت ہوا۔

قطب شاہی عہد میں شہر حیدرآباد میں دادمحل جیسی سات سات منزل والی کئی عمارتیں تھیں اور خداداد محل تو
بارہ ائمہ معصومین کی مناسبت سے بارہ منزلہ بنایا گیا تھا۔ عمارتوں کی اسی رفعت و بلندی کے پیش نظر ان کے آگے
طویل و عریض صحن چھوڑے جاتے تھے۔ چنانچہ دادمحل کے آگے کئی فرلانگ کا میدان واقع تھا جس میں اب چوک کی مسجد،
چوک کی گھڑی، شاہ گنج، محبوب مارکٹ، دفتر خزانۂ عامرہ، سرآسمان جاہ، سرخورشید جاہ، سروقار الامرا کی
عالی شان ڈیوڑھیاں اور بدرالدین خاں کے کھنڈر واقع ہیں۔ اس صحن کے درمیان وہ عجیب و غریب تالاب نما
حوض موجود تھا جو بلند ستونوں پر ہوا میں معلق بنایا گیا تھا تاکہ بادشاہ دادمحل کی ساتویں منزل سے بھی پانی کا نظارہ

کر سکے ۔ اسی صحن کے دو طرف (جانب مشرق و مغرب) وہ عمارتیں واقع تھیں جن کی دیواروں پر نگار خانۂ اجنٹا کی طرح ملک و بیرون ملک کے امرا و عمائد کی قد آدم تصویروں کے علاوہ قرآنی قصوں، بہشت و دوزخ کے مناظر اور اہم تاریخی لڑائیوں اور بزم آرائیوں کو شاہی مصوروں اور نقاشوں نے اپنے موئے قلم کے ذریعے سے پیش نظر کردیا تھا ۔ آرٹ اور تاریخ کے یہ خزانے محرم کے دس اور ربیع الاول کے بارہ دنوں میں عوام اور سیاحوں کے لئے کھول دئے جاتے تھے ۔

چارمینار کے اطراف مکہ مسجد، جامع مسجد، دولت خانۂ عالی، اور ڈیوڑھی نعمت اللہ و نظام الدین تک وسیع میدان سبزہ زار کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا اور اسی طرح اب جو چارکمانیں، گلزار حوض (یا چارسو کا حوض) کی چاروں سمتوں میں واقع ہیں ان کے درمیان میں بہت بڑا میدان تھا جو دولت خانۂ عالی کے جلو خانے کا کام دیتا تھا ۔ یہ میدان عہد حضرت آصف جاہ ثانی میں (جب کہ اورنگ آباد کی جگہ حیدرآباد دارالسلطنت قرار پایا) مارواڑی ساہوکاروں اور دوسرے تاجروں کو بازار بنانے کے لئے نیلام کردیا گیا ۔ اس میدان میں جانب غرب جو کمان موجود ہے (اور جو اب کالی کمان کہلاتی ہے) اس پر نقار خانۂ شاہی کی عمارت تھی جو بعد کو منہدم ہوگئی ۔ یہ بلند نقار خانہ اصل میں دولت خانۂ عالی (جو کمان سحر باطل کے عقب میں تھا) کے بالکل مقابل واقع تھا اور جب اس دولت خانہ کی سب سے اونچی منزل میں بادشاہ دربار میں برآمد ہوتا تو اسی نقار خانہ کی نوبت و شہنائی، جلو خانہ والوں کو بادشاہ کی برآمدگی کی اطلاع بخشتی ۔

دولت خانۂ عالی سے بادشاہی عاشور خانہ تک شاہی محلات کا سلسلہ تھا چنانچہ عاشور خانہ میں ابھی وہ جھروکہ موجود ہے جہاں عزا خوانی کے وقت بادشاہ راست محل کے اندر سے برآمد ہوا کرتا تھا ۔ عاشور خانہ کا صحن موسیٰ ندی تک پھیلا ہوا تھا اور اسی میں موتی مسجد واقع تھی جو اب عاشور خانہ سے دور نظر آتی ہے ۔ اسی صحن میں ندی کے کنارے علامہ ابن خاتون ہر منگل اور جمعہ کو (جو عہد قطب شاہیہ میں عام چھٹی کے دن تھے) بعد نماز فجر حدیث اور دیگر علوم دین کے درس دیا کرتے جن میں شہر کے سیکڑوں عالموں کے علاوہ ایران و ترکستان کے علما و مشاہیر بھی شرکت کرتے تھے ۔

یہی حال بیار محل اور گوشہ محل کا تھا ۔ دونو کے صحن موسیٰ ندی تک پھیلے ہوئے تھے اور اب ان دونوں کے درمیان بیسیوں محلے اور گلیاں اور بازار آباد ہوگئے ہیں، جن کی وجہ سے شہر کی خوشنمائی اور آرائش اور صحتمندی پر نہایت برا اثر پڑا ۔

یہ اہل حیدرآباد کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ سلطان العلوم اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع کے عہد میمنت مہد میں یہ شہر از سر نو عروس البلاد بن گیا، اور اس کو بہت سی ایسی خوبیاں نصیب ہوئیں جو ازمنۂ ماضی میں کسی طرح ممکن نہ تھیں ۔ مولوی فیاض الدین صاحب نے اپنے اس پیش نظر منصوبے میں کھلے مقامات اور باغوں اور تفریح گاہوں کا خاص خیال رکھا ہے اور اس طرح شہر حیدرآباد جہاں عصری ضروریات سے بہرہ ور ہو رہا ہے اس کی وہ قدیم خصوصیات بھی از سر نو نمایاں ہو جائیں گی جن کی وجہ سے یہ شہر صدیوں پیشتر اقصائے عالم میں مشہور تھا ۔

کھلے مقامات، شاہی اور سرکاری عمارتوں کے لئے شہر کی ابتدائی منصوبہ بندی میں خیال رکھنے کے علاوہ قطب شاہی تعمیر کاروں نے رفاہِ عام کے لئے شہر میں مناسب مقامات پر ہزاروں حمام بنا دئے اور اہل شہر کی ضروریات زندگی کو

پیش نظر رکھ کر شہر کو مختلف منطقوں میں تقسیم کردیا۔ چنانچہ شہر کے آخری گوشے میں خاص اہتمام کے ساتھ قبرستان کے لئے جگہ وقف کی اور اس کے قریب میں غسالوں اور گورکنوں کے لئے ایک محلہ مختص کردیا جو اَب سلطان شاہی کہلاتا ہے۔ عرب، حبشی اور ترکی ملازموں کے لئے یاقوت پورہ اور دبیر پورہ کے محلے مخصوص تھے، ایرانی اور ترکی ملازموں کو شاہی عمارتوں کے مقابل جگہ دی گئی۔ چنانچہ دائرۂ میر مومن سے دارالشفا کے درمیان جو محلے اس وقت موجود ہیں وہ انہی لوگوں سے آباد تھے۔ سادات اور مشائخین کے لئے شہر کی شاہی عمارتوں اور موسیٰ ندی کا درمیانی علاقہ وقف کیا گیا جس میں اب حسینی علم، جلال کوچہ، محبوب کی مہندی، درگاہ شاہ موسیٰ قادری، بارہ گلی، دودھ باؤلی کا دروازہ، درگاہ شاہ راجو قتال وغیرہ واقع ہیں۔ ساہوکاروں اور تاجروں کے لئے قلعہ گولکنڈہ اور موسیٰ ندی کے درمیان وسیع حصے مختص کردئے گئے۔ اسی طرح کارخانوں، صنعت و حرفت کے مرکزوں، مزدوروں، سپاہیوں غرض ہر پیشے کے مناسب جگہ منتخب کی گئی اور محلوں کے آباد کرتے وقت ابتدائی شہری منصوبہ بندی کے مطابق عمل کیا گیا۔ لیکن امتداد زمانہ اور طرح طرح کے سیاسی و سماجی انقلابات کے باعث آصف جاہی سلطنت کے قیام کے وقت شہر کی اصلی شکل و صورت باقی نہ رہی بلکہ بہت سے حصے ویران اور بے چراغ ہوگئے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی زندگی میں اور ان کے بعد عہد محمد شاہ تک کئی صوبہ دار اس شہر پر حکمران رہے اور اپنی اپنی ضرورت اور مصلحت کے مطابق شہر کی تنظیم اور ترتیب میں تبدیلی کرتے رہے۔ کئی کئی منزل کے بچے کھچے قدیم قطب شاہی محلات کو توڑ کر ان کے چونے اور اینٹ پتھر سے اپنے اپنے مذاق اور پسند کے مطابق چھوٹی بڑی ڈیوڑھیاں بنالیں۔ چنانچہ اس شہر کے پہلے صوبہ دار شہزادہ کام بخش نے جب اپنے لئے ایک حویلی بنانی شروع کی تو شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنے اس چہیتے بیٹے کو تہدیداً لکھا کہ حیدرآباد میں تو بڑے بڑے محل موجود ہیں پھر ایک علٰحدہ حویلی بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس کے جواب میں شہزادے نے عرض کیا کہ قطب شاہی محل اتنے بلند اور وسیع ہیں کہ اگر ان میں رہوں تو اتنے چراغ کیونکر روشن کرسکتا ہوں۔ اسی لئے اپنی پسند کا ایک چھوٹا سا محل بنا رہا ہوں۔

کام بخش کے بعد یکے بعد دیگرے کئی صوبہ دار مقرر ہوئے اور سبھوں نے کام بخش کی سنت جاری رکھی اور قطب شاہی محلات کو توڑ کر ان کے مال مسالے سے ان کے صحنوں اور دیگر تفریحی مقامات میں اپنی ڈیوڑھیاں بناتے رہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ جہاں شہری ترتیب بگڑنے لگی قطب شاہوں کے وہ عظیم الشان محل جن کی تعریف میں مورخ رطب اللسان ہیں منہدم اور معدوم ہوتے گئے۔ رہے سہے محلات کے پتھروں سے آخرکار شہر کی فصیل بنائی گئی۔ چنانچہ اس شہر کی جو فصیل اب تک کہیں کہیں موجود ہے وہ اس ملک کے آخری صوبہ دار اور پہلے آصفی بادشاہ حضرت نظام الملک آصف جاہ اول کے عہد میں مکمل ہوئی ہے۔ قطب شاہوں نے شہر کے اطراف فصیل اس لئے نہیں بنائی تھی کہ وہ اس کو ایک کھلا شہر رکھنا چاہتے تھے اور قلعہ گولکنڈہ کو لڑائی کے وقت اپنا سب سے بڑا اور آخری سہارا سمجھتے تھے۔

غرض اگر کوئی عہد حاضر میں شہر حیدرآباد کے قطب شاہی محلات اور شہری ترتیب کا اندازہ لگانا چاہے تو اس کے لئے یہ امر بہت دشوار ہے۔ عہد عثمانی میں آرائش بلدہ کی خاطر جب پرانے محلے اور مکان توڑے گئے تو معلوم ہوا کہ اکثر مکان مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ اس سے بعض اصحاب نے محسوس کیا کہ شاید قطب شاہی زمانے میں مٹی ہی کے مکان بنتے تھے اور عوام میں کہاوت بھی مشہور رہی ہے کہ "حیدرآباد نگینہ اندر مٹی اوپر چونا"۔ لیکن یہ اندازہ اور یہ کہاوت دراصل صوبہ داروں کے بنائے اور بسائے ہوئے حیدرآباد کے متعلق ہے۔

مولوی فیاض الدین صاحب نے جو منصوبہ مستقبل کے حیدرآباد کے لئے تیار کیا ہے اس پر پورے غور و خوض

کے بعد عمل کیا جائے تو حیدرآباد واقعیؔ عظیم تر حیدرآباد دکھلائے گا۔ انھوں نے اس منصوبے کا خاکہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شایع کیا ہے اور انگریزی خاکہ کے ساتھ عظیم تر حیدرآباد کا جو رنگین نقشہ دیا ہے اس سے ان کے تخیل اور بیانات کی بڑی اچھی وضاحت ہوتی ہے۔ انھوں نے شہر کے اطراف حلقہ دار سڑکیں اور ریلیں بنائی ہیں۔ اور ان حلقوں کے درمیان مختلف خطے صنعتی، تعلیمی، تفریحی، اور فوجی ضروریات کے لئے وقف کئے ہیں بھاری اور ہلکی صنعتوں کے لئے علحدہ علحدہ حصے محل وقوع کے لحاظ سے منتخب کئے گئے ہیں۔ اور یہ تمام منصوبہ بندی ایسے جدید العصر معیار پر مکمل کی گئی ہے کہ اس کو دیکھ کر بڑے سے بڑے ماہرین صحت و شہری تشکیل بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ حال ہی میں حکومت ہند کے ٹاؤن پلیننگ اڈوائزر مسٹر کاگل نے جب حیدرآباد آکر اس منصوبہ کا معائنہ کیا تو اس کو نہ صرف پسند ہی کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ چونکہ ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں میں اس پیمانہ کا کوئی کام نہیں کیا گیا ہے اس لئے وہ یک گونہ مایوس ہو چکے تھے۔ حیدرآباد کی تیاری دیکھ کر وہ اتنے خوش ہوئے کہ فیاض الدین صاحب کو سرکاری طور پر ہندوستان کے دیگر شہروں کے دورے پر روانہ کرنے کی تحریک کی۔

بہرحال شہر حیدرآباد کے لئے یہ ایک مبارک کوشش ہے اور توقع ہے کہ یہ شہر آئندہ صحیح معنوں میں عظیم تر بن کر تمام ہندوستان کے لئے ایک نمونہ بن جائے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ سب رس کے صفحات میں اتنی گنجایش نہیں ورنہ منصوبہ بندی کی اس پوری تجویز کو افادۂ عام کی خاطر ان میں جگہ دی جاتی۔

ایک پُراسرار پہاڑی

دکن میں اس قدر تعلیمی ترقی اور ذوقِ تحقیق کے باوجود اکثر مقامات ایسے ہیں جن کی تاریخی اہمیت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ذوقِ تحقیق جس قدر ترقی کرتا جائے گا اسی قدر دکن کے بے انتہا تاریخی اہمیت رکھنے والے مقامات روشنی میں آتے جائیں گے۔ آج ہم جس پُراسرار پہاڑی کا ذکر کرنے والے ہیں وہ سلطنتِ دکن میں یادگیر جی۔ آئی۔ پی ریلوے اسٹیشن سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ پہاڑی کئی ہزار سال سے انسانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہ چکی ہے۔ یہ وہی پہاڑی ہے جس کے دامن میں پانڈوؤں نے پناہ لی۔ اپنے بھائی کورو سے لڑکر پانڈو جب گھومتے ہوئے نکلے تو انھیں یہ مقام بڑا پسند آیا اور یہیں سکونت اختیار کی۔ اس پہاڑی کے ایک حصہ کو آج بھی "پانڈوربنڈہ" کہتے ہیں۔ چند مکانات بھی اس پہاڑی پر بنے ہوئے ہیں جن میں آج تک لوگ رہتے بستے ہیں اور اس قدیم زمانہ کی یاد دلاتے ہیں۔

اسی پہاڑی پر راجہ دسرتھ نے تانڈورشی (شرون کمار) کو اپنے تیر سے سہواً گھائل کیا تھا۔ یہی وہ مقدس پہاڑی ہے جہاں رامچندر جی سیتا اور لکشمن نے ایک عرصہ تک گزارا کیا۔ رامچندر جی جب سیتا اور لکشمن کی ہمراہی میں پھرتے پھراتے اس پہاڑی پر پہنچے تو یہاں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ لکشمن جیسے فرمانبردار بھائی نے رامچندر جی کی اطاعت سے منہ موڑ کر کہا "بھائی صاحب! میں آپ کا غلام تو نہیں جو آپ کا سامان اپنے سر پہ لئے پھرتا رہوں"۔ وہ جب اس سرحد سے گزر چکے تو لکشمن کو اپنی بے ادبی کا احساس ہوا۔ رام نے سمجھا سارا قصور اس سرزمین کا ہے۔ ایک تو اس واقعہ کی وجہ سے اور دوسرے یہاں کے قدرتی مناظر، قدیم عبادت گاہوں اور پانڈوؤں کی تہذیب کی یادگار ہونے کے باعث رام نے اس مقام کو تفصیل سے دیکھنا چاہا۔ یہاں رام نے پانڈوؤں کے آلاتِ حرب اور عبادت گاہیں وادی میں لہلہاتے ہوئے چاول کے کھیت، بڑے بڑے تالاب، ابلتے ہوئے چشمے، بہتے ہوئے نالے، گرتے آبشار اور جابجا جنگلی پھلوں کے درخت دیکھے۔ ان حیات بخش مناظر نے رام کے دل پر بڑا اثر کیا اور انھوں نے پانڈوؤں کے اس تہذیب و تمدن کے گہوارہ کی عظمت کو باقی رکھنے اور ان کے آثار کو محفوظ کرنے کے لئے کمپالی کے راجہ سگریو کو توجہ دلائی۔ رامچندر جی نے بھی یہاں کچھ مہینوں قیام کرکے چند مندر بطور یادگار تعمیر کرائے۔ سگریو نے اپنے ایک امیر ہنومان جی کو اس مقام پر بھیجا جنھوں نے پانڈوربنڈہ کے جنوب مغربی دامن میں سگر کی آبادی بسادی جو آج تک موجود ہے۔

پانڈو جس زمانہ میں یہاں رہتے تھے ان میں ایک رواج یہ تھا کہ وہ ہر سال ایک مصنوعی جنگ کرتے تھے اور شکست خوردہ لشکر فاتح کو تاوانِ جنگ ادا کرتا تھا۔ مذہبی تہواروں کے موقع پر بھی یہاں فوجی کرتب دکھائے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ ہندوستان کی بہترین فوجی تربیت گاہ مانی جاتی تھی اور دور دور سے لوگ فوجی تربیت حاصل کرنے کے لیے یہاں آیا کرتے تھے۔ شاہ پور کے قریب اسی پہاڑی کے دامن میں "ناگر تالاب" ہے۔ حال حال تک تالاب کے دو کناروں پر ہولی کے زمانہ میں مختلف مقامات سے لوگ جمع ہوجاتے تھے اور ایک دوسرے پر سنگ باری کرتے۔ یہ انہی پانڈوؤں کے زمانہ کی یادگار اور سنت دیرینہ کی پیروی ہے۔ یہ آپس کی سنگ باری سنہ ۱۳۳۰ف تک جاری تھی۔ اسی سنگ باری کے زمانہ میں ایک سرکاری ملازم کا سر (جو وہاں سے گزر رہا تھا) بری طرح پھوٹ گیا اور سرکاری حکم سے اس رسم کو بند کردیا گیا۔

سگریو نے ہنومان جی کو یہاں متعین کیا تو انھوں نے اس کی ترقی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور بہت جلد سگر علماء و فضلاء کا مرکز بن گیا، جن کی رہائش کے لئے آشرم (مٹھ) تعمیر کرائے گئے اور حکومت کی جانب سے ان مٹھوں کو کئی زمینات بطور معاش دی گئیں۔

اس پہاڑی سلسلہ کو پانڈوربنڈہ یا "سجن گڈی" کہتے ہیں۔ اس پر ایک قلعہ بھی بنا ہوا ہے۔ زمانہ قدیم میں اس قلعہ کو

(کنگ ورگ) کہتے تھے۔ بعض لوگ اسے "پانی ورگ" بھی کہا کرتے تھے۔

قدیم راجگان کے بعد سلاطین بہمنیہ نے اس قلعہ پر قبضہ کیا پھر یہ قلعہ علی عادل شاہ کے قبضہ میں آیا۔ اسی بادشاہ نے اس پہاڑی کے دامن میں جانب شمال شاہ پور کے نام سے ایک آبادی بسائی جو آج بھی ترقی پذیر حالت میں موجود ہے۔

اس پہاڑی پر لا تعداد دیول بنے ہوئے ہیں۔ اسے "دیوا ستھان" بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ ایک راجہ نے یہ چاہا کہ اس پہاڑ کے سب دیولوں میں چراغ جلائے جائیں۔ چنانچہ اس غرض سے وہ ایک کنڈی تیل لیکر ہر دیول میں چراغ جلاتا گیا۔ جب ایک دیول پر پہنچا تو تیل ختم ہوگیا (اس واقعہ سے دیولوں کی کثرت بتانی مقصود ہے) جس دیول پر تیل ختم ہوگیا تھا، اس کو "تیل انکار" کہتے ہیں جو اب بھی موجود ہے۔ اس پہاڑی پر کثرت سے مسلمان اولیائے کرام کے مزار بھی ہیں جن میں حضرت کوہ سوار، حضرت سالار مسعود غازی، حضرت غازی مصطفیٰ قادری وغیرہ مشہور ہیں ان کا سالانہ عرس بھی ہوتا ہے۔

پانڈو رنبڑہ ہندوؤں کے لئے کاشی کا سا تقدس رکھتا ہے۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان دیولوں اور گریوں (غار) میں، جو پانڈوؤں راجچندرجی اور ہنومان جی کے زمانہ کی بنی ہوئی ہیں، آج بھی کئی رشی منی مصروف عبادت ہیں۔ یہ لوگوں کو نظر نہیں آتے۔ ان میں سے اکثر جڑی بوٹی اور موسمی میوہ پر گزارا کرتے ہیں۔ یہاں پر خلوت گزیں سادھوؤں کے وجود کا ثبوت کئی واقعات سے مل چکا ہے۔

اسی پہاڑ میں ایک باؤلی ہے جسے "منداگنی" کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لوگوں نے اس کی تہہ معلوم کرنے کی بہتیرے کوشش کی مگر اس کی تہہ نہ ملی۔ مشہور ہے کہ اس کا تعلق کرشنا ندی سے ہے۔

اسی پہاڑی کے دامن میں ایک تالاب ہے جس میں اب بھی کافی پانی موجود ہے۔ اسے "تاورگیری" کہتے ہیں (کنڑی زبان میں تالاب کو کیری کہتے ہیں) اس کا پانی بہت مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اب بھی ہندو اس میں جاکر اشنان کرتے ہیں اور اس کو کاشی کی طرح مقدس سمجھتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس میں نہانے سے جملہ گناہوں سے پاکی حاصل ہوتی ہے۔ کنول تالاب میں رنگ برنگ کے کنول آج تک اسی شان کے ساتھ اپنی بہار دکھاتے ہیں۔

اس پہاڑی پر جانے کے بعد خود بخود ایک احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ یہ ایک پراسرار پہاڑی ہے جس سے ایک بڑی تاریخ وابستہ ہے۔ یہ مقام کبھی زمانہ قدیم میں بہادر سپاہیوں، امیروں، رشیوں پنڈتوں، اولیائے کرام، خانہ بدوشوں اور مہذب لوگوں کا مامن تھا تو آج ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے زیارت گاہ خاص و عام بنا ہوا ہے۔

میں اب کی دفعہ یہاں گرما میں گیا تھا مگر بارش میں بھی میں نے اس پہاڑی کی بہار دیکھی ہے۔ اس موسم میں یہاں سیتا پھل کثرت سے ہوتے ہیں۔ ہر طرف سبزہ اور پانی نظر آتا ہے۔ تالاب، کنویں، کنڈے اور جھرنے عجیب منظر پیدا کرتے ہیں۔ پہاڑی کے سامنے چاول کے کھیت لہلہاتے ہیں اور گاؤں کے بچے اور بچیاں اپنی بکریوں کو چرانے یہاں آتی ہیں۔ عورتیں اور مرد گرما میں لکڑیوں کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ بارش میں اس پہاڑی کے دلکش مناظر اور عمدہ فضا غیر شاعر کو بھی شاعر بنا دیتی ہے اور بے اختیار زبان خدا کی حمد و ثنا کرنے لگتی ہے۔ بے شک اللہ بہت بڑا ہے۔

(نوٹ) پانڈوؤں کا زمانہ، رامچندرجی کا گنڈ، ہنومان جی کا دور، اس پہاڑی کا قلعہ اور اسی قسم کے کئی عنوانات ہیں جن پر مفصل مضامین لکھنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے مختصراً یہاں سب کا ذکر کیا ہے انشاء اللہ بشرط فرصت ان میں سے ہر موضوع پر مضامین تحریر کئے جائیں گے)

سید محمد نور الحسن

گلبرگہ کے چار بڑے گنبد

گلبرگہ اور اس کے نواح میں دو دو تین تین میل کے اندر اندر یعنی سلطان پور، راجہ پور اور ہیرا پور تک جو طرف پھیلے ہوئے چھوٹے بڑے گنبدوں کا میں نے ایک مرتبہ شمار کیا تو پچھتر اسی تک ان کی تعداد پہنچی، ان میں کے اکثر گنبد مختلف خصوصیات کے حامل ہیں مگر چار گنبد ان میں ایسے ہیں جو سب سے بڑے ہیں اور قریب قریب ایک ہی ناپ کے ہیں اور ایسی خصوصیات رکھتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس قابل ہیں کہ ان کا علٰحدہ ذکر کیا جائے۔

(۱) فیروز شاہ کا جوڑواں گنبد اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جس کا مفصل ذکر "سب رس" کے صفحات پر اس سے قبل آچکا ہے۔ دوسرا اور تیسرا گنبد، بڑے روضہ اور چھوٹے روضہ کا ہے۔ مگر یہ واضح رہے کہ اس سلسلے میں روضتین کے ان ہر دو گنبدوں کا ذکر جیسا کہ خیال کیا جاسکتا ہے کسی حسن عقیدت کی بناء پر نہیں ہے بلکہ محض تعمیری نقطۂ نظر سے ہے۔ فیروز شاہ کا گنبد نقش اول ہے اور یہ دونوں اس کے نقش ثانی ہیں اس لئے ترتیب کے لحاظ سے اس کے بعد انہیں کا ذکر ہونا مناسب ہے۔ چوتھے بڑے گنبد کی تفصیل جو اس وقت چور گنبد کے نام سے مشہور ہے ان کے بعد بیان ہوگی۔

حضرت خواجہ صاحبؒ کا گنبد

یہ گنبد طرز تعمیر کے لحاظ سے ہوبہو فیروز شاہ کے گنبد کی نقل ہے۔ وسعت میں بھی کم وبیش اسی کے مماثل ہے چنانچہ اس کا ہر ضلع اندر سے (۵۱) فٹ نو انچ اور باہر سے ۷۷ فٹ تین انچ ہے۔ چونکہ طرز تعمیر تفصیل کے ساتھ وہاں بیان کردیا گیا ہے، اس لئے اس کو یہاں مختصر طور پر بیان کرکے جہاں کہیں اختلاف ہے اس کو واضح کیا جائے گا۔

جوڑواں گنبد کی مغرب رویہ دیوار میں بعد کو جو دریچہ نکالا گیا ہے اس کی وجہ سے وہاں کی محراب اپنی اصلی حالت میں نہیں رہی۔ یہاں چونکہ ایسا نہیں ہوا ہے اس لئے ہم اس پر اس کو قیاس کرسکتے ہیں۔ چنانچہ یہاں اس مغرب رویہ دیوار میں صرف ایک طاقچہ ہے جس کی بلندی ۸ فٹ ۹ انچ، عرض ۳ فٹ ۳ انچ اور گہرائی ۲ فٹ ہے۔ دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے ڈھال نما پھول ہیں۔ اس طاقچہ کے اوپر کافی عرض وطول میں ایک تحریر تھی جو اب بالکل مٹ گئی ہے۔

جوڑواں گنبد کی طرح اس گنبد میں بھی اندر وباہر فیروز شاہی طرز کی کمانیں استعمال کی گئی ہیں جن کے سروں پر ایک ایک خوش نما پھول اور بازوؤں پر دو دو ڈھال نما پھول ہیں۔ اندر آٹھ کمانیں دس دس فٹ چوڑی ایسی بھی ہیں جن میں پھر ایک کمان آٹھ آٹھ فٹ چوڑی بنا کر ان میں لانبے لانبے چار کنگرے تکونی پھول دار بنائے گئے ہیں جیسے کہ جوڑواں گنبد میں ہیں۔ ان آٹھ کمانوں میں مزید خوش نمائی کے لئے آٹھ طاقچے بنائے گئے ہیں۔ جو طول، عرض اور گہرائی میں مغربی طاقچہ کے برابر ہیں۔ ان سب پر اب خوبصورت کواڑ لگا دئیے گئے ہیں۔ ان آٹھوں محرابوں میں دو دو آرائشی ستون ہیں مگر مغرب رویہ محراب میں چار ہیں (اسی طرح باہر کے رخ بھی دروازوں میں چار چار ستون ہیں)

جہاں کمانوں کی یہ پہلی منزل ختم ہوتی ہے وہاں تقریباً ایک فٹ چوڑا ایک مربع حلقہ ہے جس پر ہر طرف عربی تحریر ہے۔ اس حلقہ پر چار کمانوں اور چار نیم محرابوں کی دوسری منزل قائم کی گئی ہے۔ ان چاروں کمانوں پر ایک ہی قسم کی جالی سی بنی ہوئی ہے اور چاروں نیم محرابوں پر ایک ایک خوش نما پھول ہے۔ اس کے سوائے اور کسی قسم کے نقش ونگار نہیں ہر ایک پر صرف دو دو ڈھال نما پھول ہیں۔ مگر بہت غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نہایت عمدہ قسم کے رنگ کی گلکاری اس پوری منزل میں تھی جو اب دھوئیں کی تہ اور گرد وغبار میں چھپ گئی ہے۔ چنانچہ شمالی کمانوں کے ایک حصے میں ایسی گلکاری کے باقیات کچھ کچھ

نظر آتے ہیں اور قرائن بتلاتے ہیں کہ نیچے کی منزل میں بھی ایسی ہی عمدہ رنگ کاری (پینٹنگ) ہوگی، حالانکہ اس وقت دوسری منزل کے نیچے جتنا حصہ ہے وہ سب اگرچہ کہ رنگین ہے، مگر یہ نیلا پیلا رنگ بہت بعد کا کیا ہوا ہے اور اس میں جو کچھ گلکاری کی گئی ہے وہ بھی بہت ادنیٰ قسم کی ہے۔ مربع حلقہ میں جو عربی تحریر ہے وہ نہایت زشت خط میں اور اسی رنگ آمیزی کے وقت لکھی گئی ہے۔ اس کے نیچے کمانوں اور محرابوں پر جو کچھ آیتیں، سورتیں اور عربی تحریریں ہیں وہ بھی اسی قسم کے خط میں اور اسی وقت لکھی گئی ہیں۔ ان میں فن کی کوئی خوبی نہیں کہ تفصیل کی جائے۔

بزرگان دین کی درگاہوں میں سب جگہ یہی دیکھا گیا کہ صدہا سال کے بخور اور شمعوں کے دھوئیں سے دیواریں جب سیاہ پڑ گئیں تو پچھلوں نے اگلوں کے نقش ونگار کو جو صناعی کا بہترین نمونہ تھے اپنے نااہل ہاتھوں سے مٹا مٹا کر فرطِ عقیدت سے نیا رنگ چڑھا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دورِ تنزل کی بدمذاقی نے نچلی منزل کو کھلونے کی ہنڈکلھیا بنا دیا۔

اوپر کی منزل اور اس کے اوپر قبہ اگرچہ اپنے اصلی رنگ روپ میں ہے مگر حالت یہ ہے کہ چھ سو برس کے دھوئیں اور گرد و غبار سے تمام رنگ و روغن پر سیاہی غالب آگئی ہے۔ پھر اس دھوئیں کو رگڑ رگڑ کر جو صاف کیا گیا تو رہا سہا رنگ اور نقش بھی دھل گیا ہے۔ البتہ گچ میں جو کام کیا گیا ہے وہ بحالہ باقی ہے۔ چنانچہ اس دوسری منزل کے اوپر جہاں سے قبہ کی گولائی شروع ہوتی ہے مثلث نما کنگروں کا دوہرا حلقہ ہے (جوڑواں گنبد میں چھتہ نما کٹوریوں کا دوہرا حلقہ تھا) اس کے اوپر اس قسم کے پھول کا حلقہ ہے ❖ اس پر بھی مثلث نما کنگروں کا اکہرا حلقہ ہے اس کے اوپر لوح نما کنگروں کا ایک دائرہ ہے مگر اس طرح کہ ہر کنگرہ اپنے بازو کے کنگرے سے نصف ہے اور اس نصف کنگرے کے نیچے ایک پھول ہے۔ اس دائرہ سے بہت اوپر سرخ رنگ کا ایک حلقہ ہے جس پر منقش چار پان ہیں مگر دھوئیں سے یہ سب دھندلے پڑ گئے ہیں۔

اس حلقہ میں سرخ زمین پر سفید روشنائی سے لکھا ہوا ہے بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ هُوَ اللّٰہُ الَّذِی لَا اِلٰہَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الغَیبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحمٰنُ الرَّحِیمُ هُوَ اللّٰہُ الَّذِی لَا اِلٰہَ اِلَّا هُوَ المَلِکُ القُدُّوسُ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد پورے اسمائے حسنہ تحریر ہیں۔ آخر میں چار نام پڑھے جاتے ہیں الباقی الوارث الرشید الصبور اور اس کے بعد ہے الذی لیس کمثلہ شیٔ و هو السمیع البصیر غفرانک ربنا والیک المصیر وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ اجمعین۔ اس سے اوپر یکے بعد دیگرے سات حلقے ہیں۔ بیچوں بیچ ایک منقش حلقہ ہے جس میں زنجیر لٹک رہی ہے۔ اس کے نیچے دو حلقوں میں اور تیسرے حلقہ کے نصف حصہ میں آیۃ الکرسی اور اس کے بعد کی آیتیں لَا اِکرَاہَ فِی الدِّینِ سے وَاللّٰہُ سَمِیعٌ عَلِیمٌ تک تحریر ہوئی ہیں۔ اس کے بعد عبارت ہے اس کے الفاظ کچھ ایسے غیر مانوس اور رسم الخط اس قدر پیچیدہ ہے کہ باوجود کافی کوشش کے نہیں پڑھی گئی البتہ اتنا محسوس ہوا کہ فارسی زبان میں کوئی تحریر ہے ممکن ہے اشعار ہوں۔ اس کا پہلا ٹکڑا ہے "انا ذکر ما زحام عشق" اسی قسم کی عبارت آخر تک ہے اور پانچویں چھٹے حلقے میں حرف اتنے دھندلے پڑ گئے ہیں کہ کچھ پڑھا ہی نہیں جاتا۔ یہ پوری تحریر سرخ زمین پر سفید حروف سے ہے اور رسم الخط ایک خاص قسم کا بہت پیچیدہ ہونے کے علاوہ اس میں کوئی دلفریبی اور دیدہ زیبی بھی نہیں ہے۔ یہاں میں اتنا بتلا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ قبہ کے درمیانی حصہ کو بہ غور دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گنبد کے تعمیر ہونے کے بہت بعد کسی زمانہ میں اس کی ترمیم ہوئی ہے۔ ترمیم کی وجہ بہت ممکن ہے یہ ہو کہ بارش کا پانی مرنے لگا ہو۔ بہرحال جو بھی صورت ہو خواہ پانی مرنے سے یا ترمیم کے وقت پانی لگنے سے، ان حلقوں کی تحریروں پر اثر ضرور پڑا ہے۔ رنگ کے بہنے اور حروف کے مٹنے کی علامات صاف ظاہر ہیں اس لئے بھی ان کے پڑھنے میں سخت دقت درپیش ہے۔ اس گنبد میں جتنی بھی تحریریں ہیں وہ گچ کے ابھرے ہوئے حروف میں نہیں ہیں بلکہ سرخ زمین پر سفید روشنائی سے ہیں اور اکثر گل بوٹوں کا بھی یہی حال ہے، اس لئے پانی سے متاثر ہونے کے علاوہ گرد و غبار اور دھوئیں سے ان کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ ورنہ جیسا کہ مشہور ہے کہ احمد شاہ ولی بہمنی نے اس گنبد اور اپنے گنبد میں ایک ماہر ایرانی رنگ کار (پینٹر) سے کام کروایا تھا جو اگر اپنی اصلی حالت پر باقی رہتا تو قابل دید ہوتا۔

چنانچہ روایت ہے کہ احمد شاہ نے، جس کو حضرت خواجہ صاحبؒ کی حمایت و سرپرستی سے تخت سلطنت ملا تھا، آپ کے وصال کے بعد نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ، حضرت کے پوتے اور اپنے داماد شاہ سفیر اللہ حسینی کی نگرانی میں اس گنبد کو تعمیر کرایا جو سات برس میں تکمیل کو پہنچا۔

حضرت خواجہ بندہ نواز کا مزار مبارک گنبد کے بیچ میں واقع ہے۔ پتھر کا لانبا تعویذ ہے جس کے اطراف مرمریں کٹھرا لگا ہوا ہے۔ کٹھرے کی بلندی ڈیڑھ فٹ، طول ۱۲ فٹ سات انچ اور عرض ۷ فٹ ۱۱ انچ ہے۔ اس مرمریں کٹھرے کے اطراف تین فٹ ۷ انچ کے فاصلہ سے ایک نہایت خوبصورت چوبی کٹھرا ہے جس کی بلندی ۶ فٹ ۸ انچ، طول ۱۹ فٹ ۳ انچ اور عرض ۱۵ فٹ ۱۰ انچ ہے۔ اس پر اطراف کنگرے اور چاندی کے کلس ہیں۔ چاروں کونوں پر لکڑی کے لانبے لانبے سبز رنگ کے تقریباً تین فٹ اونچے ہشت پہلو ستون ہیں جن پر ہر طرف سنہری رنگ میں نادعلی لکھی ہوئی ہے۔ ان چاروں ستونوں پر بھی چاندی کے کلس ہیں۔ اس کٹھرے کا جنوبی حصہ اور اس کا دروازہ چاندی سے منڈھا ہوا ہے جس پر سنہری ملمع کے حروف میں، طغرے، آیتیں اور حدیثیں تحریر ہیں۔ چوکھٹ کے اوپر حسب ذیل چار مصرعے نستعلیق خط میں تحریر کئے گئے ہیں ~ نقرۂ ایں باب وایں جالی بہ طغرائے طلا۔ شد بنا از شہ ید اللہ الحسینی با نیاز

فیض ہم تاریخ باب آں ولی اللہ نوشت ۱۲۸۲   باب جنت ہست باب درگہ بندہ نواز ۱۲۸۲

اس کے اوپر کنگروں کے پیچھے، دستار کی جیغی کی طرح کا ایک مثلث بنا ہوا ہے جس پر ایک مرصع کلغی اور چاندی کا کلس ہے۔ مثلث پر بخط طغرا یہ آیت شریفہ لکھی ہوئی ہے۔ اللہ ولی الذین آمنو ایخرجھم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیاء ھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات اولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون ۔

دروازے کی سیدھی طرف لکھا ہوا ہے۔ قال اللہ تبارک وتعالیٰ اَلا اِنّ اَولیاءَ اللہِ لاخَوفٌ علیھم ولا ھم یَحزَنُونَ ۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم المومنونَ لا یموتُونَ بل ینقلبُونَ مِن دارِ الفَناءِ الی دارِ البقَاءِ ومِن جوارِ الشیطان الی جوارِ الرحمٰن ومِن دارِ الغرُورِ الی دارِ السّرور ۔

چوتھی سطر میں لکھا ہے ~ نیست کعبہ درد کن جز درگہ گیسو دراز   بادشاہ دین و دنیا تا ابد بندہ نواز

دروازے کی سیدھی طرف جتنا لکھا ہوا ہے اسی کی ہو بہو نقل بائیں طرف بھی ہے۔ اس کے علاوہ دونوں طرف چار چار گول طغرے ہیں۔ پہلے طغرے میں والذین آمنو ا وعملوا الصالحات فی روضاتِ الجنّات اللہ اور سید ھا تحریر ہے۔ دوسرے طغرے میں اِنّ اَولیاءَ اللہ لا یموتُون چار دفعہ اللہ اور سید ھا لکھا ہوا ہے۔ کواڑوں پر کوئی تحریر نہیں ہے۔ کٹھرے کے باقی تین طرف بارہ بارہ پان ہیں۔ ہر پان میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سید ھا اور اللہ بخط طغرا اور اس کے اطراف پنجتن پاک اور بارہ اماموں کے نام ہیں۔ یہ تمام کام چاندی کا ہے۔ ان کے مقابل اندر کی طرف بھی بارہ بارہ پان ہیں مگر ان میں چاندی کا کوئی کام نہیں صرف گلاب کے پھولوں کا نقش ہے۔ اس سے پہلے جو کٹھرا تھا وہ بہت پرانا ہو گیا تھا۔ گچ کا فرش بھی پرانا اور میلا ہو گیا تھا اس کو نکال کر سمنٹ کی نہایت عمدہ اینٹوں کا فرش کیا گیا ہے جو سیپ کی طرح چمکتی ہیں۔ یہ فرش، برقی قمقمے (جن سے سارا گنبد بقعۂ نور بن جاتا ہے) اور نیا کٹھرا یہ تینوں چیزیں نواب عزیز نواز جنگ بہادر کی صوبہ داری کے زمانہ کی یادگار ہیں۔ کٹھرے کے باہر چار کونوں پر چار اونچے اونچے ستون ہیں جن پر سبز مخمل کا زرکار شامیانہ تنا رہتا ہے۔

کٹھرے کے باہر دو مزار اور ہیں۔ بائیں طرف آپ کے چھوٹے صاحبزادے اور جانشین حضرت شاہ اصغر حسینی لہرو میاں کا اور سیدھی طرف آپ کے پوتے یعنی بڑے صاحبزادے کے صاحبزادے شاہ سفیر اللہ حسینی کا مزار ہے۔

" اس گنبد کا قدیم دروازہ جانب جنوب ہے جس کے کواڑوں پر مراد مندوں اور مرادیابوں نے چاندی کے پتر جڑے ہیں۔

دروازے کی چوکھٹ بھی لکڑی کی ہے جس کے ایک حصہ پر چاندی جڑی ہوئی ہے۔ چوکھٹ کے اوپر ایک پتھر ہے جس پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کندہ ہے۔ اس کے اوپر ایک پان نما پھول زنجیر سے لٹک رہا ہے جس میں اللہ تعالیٰ لکھا ہوا ہے۔ اس پھول کے اطراف لکھا ہوا ہے محمد رسول علی ولی (ان کا ربط بیچ کے اللہ تعالیٰ سے ہے) امتہ فاطمہ حسن حسین سبط رسول۔

اس دروازے پر ایک بڑی شاندار کمان ہے جس کے سرے پر ایک بڑا چوڑا پھول، ہر دو طرف دو ڈھال نما پھول اور گوشوں میں چار آرائشی ستون ہیں۔ چوڑے پھول کے بیچ میں ایک طغرا ہے جو پڑھا نہیں جاسکا۔ ڈھال نما پھولوں میں نصرٌ من اللہِ وفتحٌ قریب کئی بار الٹا اور سیدھا بہ طرز طغرا لکھا ہوا ہے۔

اس کمان کے اوپر دوسری منزل میں جو کمان ہے وہ اس وقت بالکل سادہ ہے صرف سرے پر ایک چوڑا پھول اور بازؤں پر دو ڈھال نما پھول ہیں۔ کمان کے اطراف ایک کتابی حاشیہ ہے۔ کمانوں کے سروں پر چوڑے چوڑے پھولوں کی ابتدا یہیں سے ہوئی ہے۔

اس قدیم دروازے کے علاوہ، مشرق و شمال کی طرف دو نئے دروازے پھوڑے گئے ہیں جن سے گنبد روشن اور ہوادار ہوگیا ہے۔

اندر کی طرح باہر بھی کمانوں کی دو منزلیں ہیں جملہ چالیس کمانیں ہیں مگر یہ کمانیں فیروز شاہی جوڑواں گنبد کی کمانوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ دوسری منزل پر کنگرے کراس پر تکونی کنگرے قائم کئے گئے ہیں۔ ہر کنگرے پر زنجیر سے ایک پھول لٹک رہا ہے۔ چاروں کونوں پر چار برجیاں ہیں جن پر کلس اور ہلال ہیں۔ (بہمنی دور میں جوڑواں گنبد تک بھی برجیوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، یہاں آکر برجیوں کی شکل بدل گئی چنانچہ مختلف گنبدوں پر مختلف وضع کی برجیاں نظر آتی ہیں)۔ بیچ میں بڑا عالیشان نورانی قبہ ہے جس کے پیٹے کے اطراف تکونی کنگروں کا حلقہ اور اوپر شاندار کلس ہے جس کے ہلال میں برقی قمقمہ کی نیلگوں روشنی تارے کی طرح جگمگاتی ہے۔

ان خصوصیات کے ساتھ اس رفعت و شان کا گنبد کسی بزرگ کے آستانہ پر، دکن تو کیا ہندوستان بھر میں شاید ہی کہیں ہو۔

جہانگیر علی خاں

ذہن کا آئینہ خانہ

حریم ذہن کی تصویر ہو نہیں سکتی

نرالا آئینہ خانہ ہے ذہنِ انسانی
ہر ایک جلوہ ہے جس کا کفیلِ حیرانی
سکون و کشمکش و اضطراب کے منظر
ہزار گونہ جہانِ خراب کے منظر
جنونیوں کا شعور اور خرد کی بے خبری
ہوس کی فتنہ گری آدمی کی بے ہنری
خرد کی کارگہوں کے کمال دیکھتا ہوں
ہر اک کمال کا حتمی مآل دیکھتا ہوں
جو روشنی پسِ پردہ یہاں جھلکتی ہے
نگاہِ ہوش ہی کچھ اس کو دیکھ سکتی ہے

یہاں کی راہیں کسی پر اگرچہ بند نہیں
گزر کسی کا بجز فکرِ ارجمند نہیں

ذرا سی جگہ میں ساری خدائی ہے موجود
یہ مختصر سا مکاں کس قدر ہے لامحدود
بہار کی ہر اک احساس آزما خوبی!
خزاں کی غمزدہ، افسردہ شانِ محجوبی
شگفتِ گل کے مناظر چمن کی رعنائی
لپکنا برق کا، ذوقِ نظر کی رسوائی
کہیں امیدوں کے باغات لہلہائے ہوئے
کہیں فضاؤں پہ ابرِ سیاہ چھائے ہوئے
غریب خانوں کی مغموم سی فضائے خموش
شراب خانوں میں ہنگامہ ہائے نوشا نوش

حقیقتیں بھی تخیل بھی خوش نگاہی بھی
سنہرا عیش کا، اندوہ کی سیاہی بھی

ہر انقلاب کی اک ناتمام سی تصویر!
نہایت الجھا ہوا ایک خوابِ بے تعبیر
مسرتوں کے جہاں غم کی کارفرمائی!
خوشی کے پہلو میں زخمِ جگر کی گہرائی
زبانِ اشک سے ٹپکے ہوئے فسانے چند
نگاہِ ساقی میں لرزاں شراب خانے چند
عجیب سلسلے نامختتم خیالوں کے
طویل قافلے نادیدہ خوش جمالوں کے
جگہ جگہ سے شکستہ طویل خواب کئی
حسیں فضا میں معلق سے آفتاب کئی

ہزار مل رنگوں کے فانوس میں ہے شمعِ خیال
نگاہ کو ہوئی تعیینِ رنگِ شمع محال

نرالے خواب کی تعبیر ہو نہیں سکتی

عبدالعزیز فطرت صدیقی

فریدہ

عزیز کی اپنے خاندان سے علیحدگی کو سات سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب میں کالج کی تعلیم ختم کر کے کئی برسوں بعد حیدرآباد آیا۔ جب میں عزیز سے ملا تو وہ بالکل ہی بدل چکا تھا۔ میں نے اس کی متغیر حالت کی بابت دریافت کیا تو اس نے ایک اداس قہقہہ سے میری بات ٹال دی۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ لیکن حقیقت میں جب مجھے اس سے ملنے جلنے کے مواقع حاصل ہوتے گئے تو معلوم ہوا کہ ضرور اس کی زندگی میں کوئی المناک واقعہ ہوا ہے۔ وہ اس حد تک بدل گیا تھا کہ کبھی کسی دن تو وہ بے معنی ہنسی ہنسنے لگتا کہ مجھے اس کی حالت پر ترس آتا اور کبھی اس قدر مغموم کہ گھنٹوں خیالوں میں کھویا ہوا رہتا۔ میں جب اس کا یہی معمول دیکھا تو حقیقت حال دریافت کرنے کے لئے عزیز سے مُصر ہوا۔ لیکن جب میں نے اس سے کہا تو وہ بہت دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔ ان نگاہوں سے کہ جیسے وہ مجھے اپنا بدخواہ سمجھتا ہے۔ میں نے یہ کیفیت دیکھی تو اس کے تخیل و احساسات کو بدلنے کے لئے ہمدردی اور خلوص کی باتیں شروع کر دیں...... تب جا کر کہیں اس کی حالت سنبھلی۔ مجھے افسوس ہوتا تھا کہ عزیز کی ذہنی اور دماغی حالت بھی درست نہیں رہی ہے۔ آخر اس نے میرے اصرار پر کہنا شروع کیا:۔

"فریدہ کو تو تم جانتے ہو نا۔ ہاں، وہی فریدہ جس نے بچپن کی سہانی گھڑیوں سے جوانی کی پُربہار ساعتوں تک ساتھ رہا۔ تمہیں تو یہ معلوم ہے نا کہ میرے والدین کا انتقال میرے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اور میں نے اسی گھر میں آنکھ کھولی۔ فریدہ مجھ سے سِن میں چار سال کی چھوٹی تھی جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک خاص مزاج کی لڑکی ہے۔ اس کے سنجیدہ خیالات اور وسیع رجحانات کی تعریف میں تم سے کیسے کروں ــــــ بس یوں سمجھو کہ وہ آج کل کی نوعمر لڑکیوں کے لحاظ کرتے ہوئے ان سب میں ممتاز اور ارفع کہی جا سکتی تھی۔ میں افسانہ اور مضمون لکھتا تو وہ خاص رغبت اور شوق سے میرے مشغلہ میں دلچسپی لیتی اور اس طرح گھنٹوں ہم دونوں مضمون نگاری اور ترجمے کرنے میں گزار دیتے۔ بس اسی زمانے سے فریدہ کی ایک خاص وقعت میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی، میں تم سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس طبیعت اور مذاق کی لڑکی تھی۔ سچ جانو دنیا کی یہ نظر فریب دلچسپیوں سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اسی طرح زندگی کے کئی سال گزر گئے اور فریدہ کے لکھے ہوئے افسانے اب صحیح معنوں میں درد کی تصویریں ہوتی تھیں۔ میں... ایک دفعہ فریدہ سے کہنے لگا۔ "تم اتنے درد بھرے افسانے لکھنا کیسے سیکھ گئی ہو فریدہ"ــــ تو اس نے مجھے جواب دیا " میں ہمیشہ اپنی نظر زندگی کے مایوس منظر اور مشاہدوں پر جذب کرتی ہوں اور جب میں کوئی افسانہ لکھتی ہوں تو میرے یہی مشاہدے اور تجربے میرے سامنے آجاتے ہیں۔ میں نے یہ سوال اس خیال کے تحت کیا تھا کہ ضرور فریدہ کی زندگی میں رومان حائل ہے۔ لیکن اس کی نظریں اور کہنے کا انداز اس قدر غم آگیں و موثر تھا کہ میں بھی حقیقت کی تہہ تک پہنچ گیا اور رفتہ رفتہ مجھ پر یہ راز بھی ظاہر ہو گیا کہ فریدہ کی زندگی کو کوئی غم گھلائے دے رہا ہے۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کی زندگی میں کون ہے جس کے لئے اس کے آنسو بہتے ہیں۔ متین اور خاموش فریدہ کی حالت مجھ پر ظاہر ہوئی کہ وہ اب کسی قدر اداس ہو چلی ہے۔ گھنٹوں خیالوں میں کھوئی ہوئی۔ تو میری نیندیں اچاٹ ہو گئیں، میں فریدہ کو دیکھتا تو میرا دل غم سے بھر آتا۔ اس کے سامنے میرے آنسو نکل پڑتے۔ میں کسی طرح ان آنسوؤں کو نہ روک سکتا۔ ایک دو دفعہ جب اس نے میری یہ حالت دیکھی، تو اس پر بھی کچھ عجیب قسم کا تحیر پیدا ہو گیا۔ رنگ فق ہو گیا اور وہ مجھے دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئی۔ لیکن اب میں محسوس کر رہا تھا کہ فریدہ روز بروز میری طرف کس تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ اپنے افسانوں...... میں اپنے دلی جذبات و احساسات کو قلمبند کرنے لگی تھی۔ ہم دونوں میں ملاپ بڑھتا جا رہا تھا۔ فریدہ کی یہ حالت جب اس کی ماں نے دیکھی تو وہ مجھ سے کچھ کھنچی کھنچی رہنے لگیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں فریدہ کے والدین مجھ سے بیزارگی کا اظہار کرنے لگے۔

نہ وہ پہلی سی محبت تھی اور نہ اگلا سا خلوص۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ جب میں نے اس گھر کی یہ حالت دیکھی جہاں بچپن سے پلا، بڑا ہوا وہ بھی اس عمر تک تو، میرا بھی دل کچھ اُچاٹ سا ہوگیا۔ لیکن فریدہ کا خیال میرے ہر ارادے کے مانع رہا۔ ایسے ہی ڈیڑھ سال اور گزر گیا۔ ابھی گھر والوں کے سلوک میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور میں کالج کا امتحان پاس کرتے ہی ملازمت کے بہانے فریدہ کے گھر سے اٹھ آیا۔ فریدہ نے مجھ سے عاجزی تک کی کہ نہ جاؤں گر میں نے اس بات کو مصلحت کے خلاف جانا جس گھر میں بچپن سے تھا۔ جنہوں نے مجھے ماں کی طرح پالا پوسا اور بڑا کیا، مجھے جاتے ہوئے رخصت بھی نہ کیا .... وہ صرف فریدہ کے خیال سے مجھ سے بدظن اور متعکی ہوگئے تھے۔ میرے یکایک گھر سے اس طرح علحدہ ہوجانے سے خاندان والوں کے خیالات بھی مجھ سے بدل گئے۔ کچھ تو یہ اور کچھ فریدہ سے میل ملاپ کی وجہ بھی وہ پہلے ہی سے ناراض تھے اور جب میں ملازمت کے سلسلے میں وہاں سے چلا آیا تو اس طریقے سے آپس کے تعلقات بھی کشیدہ ہوگئے۔ ملازمت کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ مجھے چند عرصے کے لئے حیدرآباد سے باہر جانا پڑا اور ایسے میں ایک عرصۂ دراز تک فریدہ سے ملنے کا موقع ہی نہ ملا۔ پورے دو سال بعد ملازمت کی ٹریننگ ختم کرکے حیدرآباد آیا ہوں تو یہاں کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے یہاں سے جانے کے چند ہی دنوں بعد فریدہ کی ایک رئیس سے شادی ہوگئی ہے۔ اور وہ اب ایک ملکہ کی طرح پُر مسرت زندگی گزار رہی ہے۔ جب میں نے یہ سنا تو مجھ پر جیسے انگارے برسنے لگے اور مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا، اور فریدہ سے متعلق میرے دل میں مختلف قسم کے خیالات بسنے شروع ہوگئے۔ اس نے میرے مقابلے میں ایک رئیس ہی کو ترجیح دی۔ میں نے ارادہ کیا کہ فریدہ کے گھر جاؤں — چنانچہ اسی روز شام میں فریدہ کے گھر گیا۔ وہ اپنے عالی شان خوش نما بنگلے کے ایک باغیچہ میں تنہا بیٹھی تھی۔ میں نے آواز دی تو اس نے پلٹ کر دیکھا اور میں نے ساتھ ہی کہا "تمہیں مجھ سے محبت تھی نا فریدہ"———

اس نے جواب میں مایوس و افسردہ نگاہوں سے مجھے دیکھا — "آخر کیوں۔ میں ایک غریب لڑکا تھا۔ کاش تم میرے دل کی آواز سنتیں فریدہ — تم میری زندگی کی مسرت تھیں" — "ہاں لیکن تمہیں اس وقت میں یاد نہ آئی جب تم اپنی ملازمت کے سلسلے میں دو سال کے لئے یہاں سے چلے گئے تھے۔ میں نے تم سے کتنی منتیں کیں کہ نہ جاؤ۔ مگر تم نے ایک نہ سنی۔ ایسے گئے جیسے کہ ابا جان ہی نے تمہیں یہاں سے چلے جانے کے لئے کہا تھا —"

"لیکن اس وقت بات ہی ایسی تھی فریدہ کہ — میں تم سے کیا کہوں"۔ فریدہ نے پھر کہنا شروع کیا۔ "تمہارے اس طرح چلے جانے سے خاندان بھر میں چہ میگوئیاں ہوئیں، اور لوگوں نے کچھ تو تمہیں اور کچھ مجھے برا کہا۔ لیکن تمہیں بھی کسی سے ایسی ہی محبت ہوتی تو احساس ہوتا۔ کہ میرے دل کو کتنا دکھایا ہے — تمہارے جانے کے ایک زمانے تک میں سخت بیمار ہوگئی — اور ابا جان نے ان ہی دنوں میری نسبت طے کردی —"

ابھی فریدہ سے یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ملازم نے نواب صاحب کے آنے کی اطلاع دی — فریدہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور وہ مجھ سے ان ہی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے رخصت ہوئی — لیکن سلیم — میں تم سے کیسے کہوں کہ وہ اُداس آنکھیں اور ان آنکھوں سے جھانکتا ہوا بے پناہ غم — میں لرز اٹھا ———

فریدہ روز بروز زندگی کی بہاروں سے دور ہوتی جارہی تھی۔ اس کے بعد میں پھر فریدہ کے ہاں نہیں گیا ———

محمود علی

حیاتِ تاباں

اُردو کے اقلیم سخن میں اکثر ایسے شاعر گزرے ہیں جو اِس دنیائے فانی سے گم نام ہی رحلت کر گئے جن کے کلام کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی اس لئے کہ اس عہد میں ان کا کوئی ایسا قدردان نہیں تھا یہی وجہ ہے وہ دنیا سے روشناس ہو سکتے۔ وہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جب کہ حکومت کی باگ ڈور ڈھیلی پڑی ہوئی تھی۔ سلطنت کی ناؤ مصیبت، بدامنی اور پریشانی کے متلاطم سمندر میں ڈگمگا رہی تھی۔ مغلیہ عزت و وقار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ کون ان کی خبر لیتا۔ ان کی قادر الکلامی اور استادی کا سکہ شاعری کی مملکت میں اُن کی حیات تک جاری رہا لیکن اِدھر اُن کی آنکھ بند ہوئی اور اُدھر ان کے کلام کو طاق نسیان پر رکھ دیا گیا۔ کیونکہ سب اس ناؤ کو بچانے کی فکر میں تھے جو ساحل سے ٹکرانے کے قریب تھی۔ ایک طرف یہ ٹوٹی پھوٹی کشتی اور دوسری طرف وہ موجیں مارتا ہوا طوفان۔ ایک طرف یہ ٹمٹماتا چراغ اور دوسری طرف وہ ہواؤں کے جھونکے، جھکڑ اور آندھیاں یہ سب وہ حادثات تھے جنھوں نے ان کو بھلا دینے پر مجبور کیا اور ان کا کلام بالکل فراموش کر دیا گیا لیکن اُردو ادب اُن کے احسانات کبھی بھی نہیں بھول سکتا بلکہ اس کی گردن ان حضرات کے بار احسان سے ہمیشہ ہمیشہ خم رہے گی۔ اِن ہی چند ہستیوں میں سے ایک قابلِ فخر اور جواں مرگ ہستی میر عبدالحی رضوی المتخلص بہ تاباںؔ کی ہے کہ جو اُردو زبان کے بڑے خوش گفتار شاعر تھے اور جنھوں نے زبان کو کچھ ایسا سنوارا کہ اُس کے حسن پر ایک نیا نکھار آ گیا اور وہ ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔ ان کے کلام کی اہمیت ہماری نظروں میں اس وجہ سے بھی زیادہ ہے کہ وہ قدیم دور کے آخری شاعر تھے۔ لیکن انھوں نے دوسرے دور میں قدم اٹھایا اور اپنے کلام سے گویا دو عہدوں کو ملا دیا۔

نہ تو تاباںؔ کی تاریخ ولادت صحیح معلوم ہو سکی اور نہ مقام پیدائش۔ اکثروں کا یہ خیال ہے کہ یہ شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے یعنی اِن کا وطن دہلی تھا چنانچہ میر تقی میرؔ اپنے تذکرہ میں ہی فرماتے ہیں ”... سید نجیب الطرفین مولدا و شاہجہاں آباد است۔ بسیار خوش فکر و خوبصورت، خوش خلق و پاکیزہ سیرت .“ اس امر پر تو سب متفق ہیں کہ یہ سید تھے اور جیسا کہ میر حسنؔ نے بھی لکھا ہے یہ نجیب الطرفین بھی تھے۔

ان کا سنہ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا۔ مختلف تاریخیں قیاساً دی ہوئی ہیں اور وہ بھی وفات کی۔ کسی کو تاریخ پیدائش کا علم ہی نہیں۔ یہ امر تو پایۂ تحقیق کو پہونچ چکا ہے کہ ان کا انتقال بہت ہی کم عمری میں ہوا۔ یہ جوان ہی تھے کہ موت واقع ہو گئی۔ لچھمی نارائن شفیقؔ نے اپنے تذکرہ ”چمنستان شعرا“ میں لکھا ہے ”درعینِ عنفوان شباب ورق زندگانی برگردانید“ قائمؔ اپنے تذکرۂ ”مخزن نکات“ میں لکھتے ہیں ”میر عبدالحی رضوی المتخلص بہ تاباں جوانے بود . وبہمیں احوال از جہاں رفت“ تو پھر اگر ان کی عمر بیس اور پچیس سال کے درمیان سمجھی جائے تو غلط نہ ہوگا۔ میر حسنؔ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ”در وقتِ محمد شاہ بادشاہ مشہور و معروف است“ یعنی یہ کہ محمد شاہ کے زمانہ میں ان کی شاعری کا ستارہ اوج کمال پر تھا۔ ابو المظفر ناصر الدین روشن اختر محمد بادشاہ ۱۵ ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء کو تخت نشین ہوئے اور ۱۱۶۱ھ تک زندہ رہے گویا ۱۷۴۸ء میں وفات ہوئی۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ تاباںؔ کی زندگی کا بھی یہی زمانہ ہوگا۔ علاوہ ازیں میر تقی میرؔ کے تذکرۂ نکات الشعراء کی تالیف ۱۱۶۵ھ بتائی جاتی ہے جس میں تاباںؔ کے انتقال کو ایسے پُر درد پیرایہ میں لکھا ہے گویا تاباںؔ کی وفات کو چند ہی سال گزرے ہوں۔ اس طرح تاباںؔ کی وفات ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان سمجھی جا سکتی ہے اور ان کی عمر قیاساً پچیس سال ہو تو سنہ پیدائش ۱۱۳۰ھ اور ۱۱۳۵ھ کے درمیان معلوم ہوتا ہے۔ ایک روایت تو یہ تھی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ صاحبِ تذکرۂ گلشن ہند نے ان کو لکھنؤ میں

۱۲۱۰ھ میں دیکھا تھا اور ان کے حسن وجمال کی بہت تعریف کی تھی۔ نیلین صاحب کا بیان یہ ہے کہ ۱۷۹۶ء مطابق ۱۲۱۱ھ تک تاباں زندہ تھے۔ بعض کا یہ خیال بھی ہے کہ شاہ عالم ثانی نے تاباں کے حسن وجمال کی جب بہت تعریف سنی تو مشتاق دیدار ہوئے اور ایک مرتبہ ان سے ملاقات بھی کی شاہ عالم ثانی کا زمانہ ۱۷۵۹ء مطابق ۱۱۷۳ھ سے ۱۸۰۶ء مطابق ۱۲۲۱ھ تک بتایا جاتا ہے۔ اگر اس حساب سے ولادت کی تاریخ معلوم کرنا چاہیں تو وفات ۱۲۱۰ھ تا ۱۲۱۵ھ تک سمجھی جاسکتی ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ سنہ پیدائش ۱۱۸۰ھ اور ۱۱۹۰ھ کے درمیان ہوگا۔
تذکرہ نویسوں میں کچھ ایسا اختلاف ہے کہ ان کی پیدائش کا صحیح سنہ معلوم کرنا ایک دشوار امر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون سی روایت صحیح ہوسکتی ہے، میرے خیال میں تاباں کی ولادت کا سنہ ۱۱۳۰ھ اور ۱۱۳۵ھ کے درمیان ہوگا۔ اس کے وجوہ یہ ہیں۔

میر تقی میر نے نکات الشعرا میں ان کی وفات پر بہت کچھ آنسو بہائے ہیں یہ کہتے ہوئے "معشوق عجبے از دستِ روزگار رفت۔ افسوس افسوس۔ امید قوی است کہ حق تعالیٰ مغفرتش کردہ باشد" اگر ان کے انتقال کا سنہ نیلین صاحب یا صاحب تذکرہ گلشن ہند کے مطابق مقرر کیا جائے تو پھر نکات الشعراء میں ان کی وفات کا ذکر کیونکر ہوسکتا ہے اس لئے کہ اس میں تو کوئی شک وشبہ ہی نہیں کرسکتا کہ نکات الشعراء کی تالیف ۱۱۶۵ھ ہے۔

کون یہ کہہ سکتا ہے کہ حشمت ان کے استاد نہیں تھے جب کہ خود تاباں نے اپنے دیوان میں بہت سے اشعار ایسے لکھے ہیں جو خود گواہی دے رہے ہیں۔ تاباں نے حشمت کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا ہے اور اس کے آخری شعر میں تاریخ بھی نکالی ہے ؎

مصرعۂ آخری پہ کی جو نظر
کد[۲۴] سے ہاتف نے اس کو دی یہ خبر
ہائے حشمت شہید واویلا!

۱۱۶۱ = ۲۴ + ۱۱۳۷

یعنی یہ کہ حشمت کا انتقال ۱۱۶۱ھ میں ہوگیا۔ اگر دوسری روایت کو صحیح تسلیم کیا جائے (یعنی تاباں کا سنہ پیدائش ۱۱۸۰ھ اور ۱۱۹۰ھ کے درمیان ہے) تو کیا تاباں نے حشمت کی وفات پر پچاس سال بعد مرثیہ لکھا ہوگا۔ پیدا ہونے کے قبل ہی حشمت کا انتقال ہوگیا اور یہ غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ تاباں حشمت سے اصلاح لیتے تھے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سودا حاتم کے شاگرد رہ چکے ہیں لہٰذا اس طریقے سے سودا اور تاباں ہم عصر ہوئے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تاباں عمر میں چھوٹے ہوں اور سودا عمر میں بڑے لیکن یہ دونوں ایک ہی زمانے میں تھے۔ سودا ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۵ھ میں پچھتر سال کی عمر میں انتقال کیا گویا بہ الفاظ دیگر اگر ہم دوسری روایت کو صحیح مان لیں تو معلوم ہوگا کہ سودا کے انتقال کے بعد تاباں پیدا ہوئے۔ اور ایسی صورت میں یہ بھی طے ہوجاتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی وقت میں حاتم کے شاگرد نہیں تھے۔

سنا گیا ہے کہ مظہر جان جاناں تاباں کو بہت عزیز رکھتے تھے اور تاباں کے انتقال کے وقت وہ بھی ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے بڑے افسوس کے ساتھ تسبیح ڈھال رہے تھے۔ مظہر جان جاناں کا زمانہ ۱۱۱۰ھ تا ۱۱۹۴ھ ہے۔ ہم کیونکر تسلیم کریں کہ مظہر جان جاناں کے انتقال کے بعد تاباں پیدا ہوئے ہوں گے یا یہ کہ جس وقت مظہر جان جاناں کا انتقال ہوا تاباں کی عمر چار یا پانچ سال کی ہوگی؟ یہ تمام ایسے ثبوت ہیں جن سے کوئی انکار نہیں کرسکتا لہٰذا فی المحال تو ہم یہی تسلیم کئے لیتے ہیں کہ سنہ پیدائش کے متعلق پہلی روایت درست معلوم ہوتی ہے یعنی ۱۱۳۰ھ اور ۱۱۳۵ھ کے درمیان۔
تذکرہ نویسوں میں جہاں تاباں کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے وہاں اُن کی شاگردی کے متعلق بھی اسی قدر اختلاف ہے مثلاً

(۱) بعض انھیں سودا کا شاگرد بتاتے ہیں (۲) بعض صرف حشمت کا (۳) بعض حشمت اور حاتم دونوں کا (۴) اور بعض فقط حاتم کا۔
نساخ، تاباں کو سودا کا شاگرد لکھتا ہے۔ میر صاحب کا خیال ہے کہ تاباں محمد علی حشمت سے اصلاح لیتے تھے۔ چونکہ میر صاحب حشمت کی شاعری کو کچھ اچھا نہیں سمجھتے تھے اس لئے نکات الشعراء میں لکھتے ہیں " نسبت بہ شعرا و استاد او را رتبہ شاگردی او نبود" اور یہ بھی تسلیم شدہ واقعہ ہے کہ تاباں کا کلام حشمت سے لاکھ درجہ اچھا ہے۔ لطف اور شیفتہ تو اُن کو سودا ہی کا شاگرد سمجھتے ہیں۔ آزاد، حاتم اور حشمت دونوں کو اُن کا استاد بتاتے ہیں۔ آب حیات میں لکھا ہے کہ " الغرض تاباں خود صاحب دیوان تھے۔ شاہ حاتم اور محمد علی حشمت کے شاگرد تھے۔" غلام ہمدانی مصحفی کا خیال ہے کہ تاباں نے اول اول حاتم سے اصلاح لی ورنہ در اصل استاد کہلانے کا حق تو حشمت ہی رکھتے تھے مگر یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں سے اصلاح لی۔ اپنے "تذکرہ ہندی" میں یوں تحریر کیا ہے " اگرچہ زبانی شاہ حاتم در ابتدا شاگرد شاہ حاتم است اما انچہ شہرت دارد و واقعی است اینست کہ بہ شاگردی محمد علی حشمت کہ شاگرد محمد غنی بیگ قبول کشمیریست بسیار بسر بردہ و حشمت تخلص محتشم علی خاں برادر میر ولایت اللہ ولد میر باقی نیز بود" لچھمی نارائن شفیق بھی ان ہی دونوں کو استاد تصور کرتے ہیں مگر ان کا خیال مصحفی سے بالکل برعکس ہے یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ استاد درحقیقت حاتم تھے اور یوں تو حشمت سے بھی اصلاح لی ہے۔ چمنستانِ شعراء کی عبارت یہ ہے " ظاہراً تحصیل علوم بخدمت حشمت کردہ باشد و اصلاح شعر از حاتم می گرفت " یعنی یہ خیال ہے کہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے حاتم سے اصلاح لی اور جہاں تک قابلیت اور علم کا تعلق ہے حشمت کے شاگرد رہے اب کس کو صحیح سمجھیں اور کس کو غلط؟ کسی نے کچھ لکھ دیا اور کسی نے اس کی تردید کر دی اور پھر کسی نے ایک نیا مسئلہ چھیڑ دیا۔ ایسی صورت میں بجائے اس کے کہ ہمیں تذکروں سے کچھ مدد ملتی معاملہ اور زیادہ پیچیدہ ہو گیا لہٰذا ان کی طرف سے مایوس اور نا امید ہو کر دوسری راہ اختیار کرنی پڑتی ہے یعنی خود تاباں کے دیوان کو ٹٹولنا چاہئے۔ تاباں نے جگہ جگہ حشمت کا نام لیا ہے اور بعض بعض جگہ تو ان کی استادی کی ایسی تعریف کی ہے کہ ہم پھر حشمت کی استادی سے انکار نہیں کر سکتے۔ تاباں نے اپنے محترم اور مشفق استاد کی شان میں نہ صرف مفرد اشعار لکھے ہیں بلکہ ایک مثنوی، ایک مرثیہ اور ایک مکمل غزل سات اشعار کی لکھی۔ اس غزل کی ردیف حشمت ہے اور قافیہ تیرا۔ جدا۔ خدا وغیرہ۔ ؎

ہوا ہوں اس جہاں میں دل سے تیرا آشنا حشمت — کروں میں دولتِ دنیا کے تئیں اب لے کے کیا حشمت
نہ ہوں محتاج دنیا میں کسی شاہ و گدا کا میں! — رہے لطف و کرم ایسا ہی گر مجھ پہ ترا حشمت
سخن کے بحر میں آ کے مری کشتی تباہی تھی — کنارے آ لگی جب سے ہوا تو ناخدا حشمت
پرستش کیوں نہ دنیا میں کریں ہم اس کی اے تاباں — ہمارا قبلہ حشمت، دین حشمت، رہنما حشمت

اپنے استاد حشمت اور عمدۃ الملک کی شان میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔ اس مثنوی کے پہلے حصے میں تاباں نے اپنے مہربان استاد کی مدح کی ہے۔ مدح کیا ہے تعریف کے پل باندھ دیئے ہیں مگر مبالغہ سے بالکل کام نہیں لیا ہے۔ جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت اور اصلیت پر مبنی ہے۔ چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

نہ استاد کی مجھ کو تاب ثنا — کہوں گر تو کب ایسی فکر رسا
کمالوں میں جن کے نہیں کچھ قصور — دے سب طفل کتب ہیں ان کے حضور
ہر اک علم میں ہے وہ صاحب کمال — زباں وصف میں اس کے ہوتی ہے لال
کروں علم حکمت میں کیا اس کی نقل — کہ بقراط کی دیکھ کر جائے عقل

کہاں اس کے رتبہ کی لقماں کو بار ارسطو سے شاگرد ہیں کئی ہزار

اسی طرح سے حشمت کی قابلیت اور تبحر علمی کی تعریف کرتے چلے گئے ہیں اور دوسروں کو ہیچ ثابت کر دیا ہے ؂

فلاطوں اگر ہو لے تو لیوے سبق ہو وے رشک سے بوعلی سینا شق

مثلاً استاد کو رمل میں ایسا کمال ہے کہ دانیال ایسا استاد شاگرد ہے ۔ ہئیت میں ہند کے استاد ہیں۔ منجم ایسے کہ لاثانی۔ منطق ۔ علم اشراق ۔ کیمیا ۔ نحو وصرف ۔ مشکوات وغیرہ میں طاق ۔ ان کا کون مقابلہ کرسکتا ہے ؂

تخلص بھی حشمت ہے اس کا بجا وہ اہل سخن ہیچ ہے بادشاہ

غرض اس سا کوئی نہ ہوگا کبھی جوں احمدؐ پہ ہوئی ختم پیغمبری

کوئی آج اس کے برابر نہیں وہ سب کچھ ہے اِلّا پیمبر نہیں

زیادہ کہوں وصف میں اس کے کیا بصورت ہے النّاس بمعنی خدا

ان کے دیوان میں کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو پکار پکار کر گواہی دے رہے ہیں کہ تاباںؔ کی شاگردی حشمت سے منسوب کی جائے مثلاً ؂

نہ مانے جو کوئی حشمت کو تاباںؔ وہ دشمن ہے محمدؐ اور علیؓ کا

اس شعر میں انھوں نے بڑے عجیب عقیدہ سے کام لیا ہے یا تو آپ حشمت کو استاد مان لیجئے ورنہ آپ محمد اور علی کے دشمن ۔ دوسرا نکتہ اس شعر میں یہ ہے کہ حشمت کا نام محمد علی تھا اور اس شعر سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ وہ شخص جو تاباںؔ کو حشمت کا شاگرد نہیں سمجھتا وہ محمد علی حشمت کا دشمن ہے ۔ اسی سلسلہ میں مزید اشعار ملاحظہ ہوں ؂

آشنا حشمت سا رکھتا ہوں نہیں محتاج میں کیمیا کا علم تاباںؔ مجھ کو کیا درکار ہے

یا مثلاً ؂ کرے تو کس طرح تاباںؔ غلط الفاظ معنی میں کہ تیرے پاس حشمت سا نزا استاد بیٹھا ہے

یا مثلاً ؂ ہوا شاگرد جب حشمت کا تاباںؔ نہ پایا اس سا کوئی جب اور استاد

یا مثلاً ؂ ریختہ کیوں نہ میں حشمت کو دکھاؤں تاباںؔ اس سوا دوسرا کوئی ہند میں استاد نہیں

یا مثلاً ؂ تاباںؔ کروں نثار میں حشمت کے نام پر میرے کنے اگر ہو سلیماں کا مال و جاہ

یہ آخری شعر بھی اپنی جگہ ایک بڑی قیمت رکھتا ہے کیونکہ یہ ان کی شاگردی کا ثبوت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دے رہا ہے ۔ یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ سلیمان تاباںؔ کے معشوق تھے اور اس وقت تاباںؔ اپنی سب سے زیادہ عزیز ترین چیز کو حشمت کے نام پر سے تصدق کئے دے رہے ہیں ۔ رسم تو یہ چلی آئی ہے کہ سب سے زیادہ عزیز چیز پر اس سے کم وقعت کی چیز کو نچھاور کر دیتے ہیں ۔ چنانچہ اس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تاباںؔ کی نظروں میں سلیماں سے زیادہ عزیز اُن کے استاد حشمت تھے ۔ ایک اور جگہ اسی مضمون کو دوسرے پیرایہ میں پیش کیا ہے ؂

نہ اب دل میں مرے ہے شوق اِن خوباں کی الفت کا ! نہ ہوں مشتاق اس دنیا میں تاباںؔ شان و شوکت کا

سبھی سے آشنائی ہے نہیں محتاج دولت کا ! مگر میں چاہتا ہوں ان دنوں دیوان حشمت کا

بہ شرط آنکہ پیدا ہو وے کاغذ ۔ دولت آبادی ۔

علاوہ ازیں اس ضمن میں ایک اور بین ثبوت ملتا ہے جس کی تصدیق اس مرثیہ سے ہوتی ہے جو تاباںؔ نے حشمت کے قتل ہوجانے کے بعد لکھا ۔ ایک مرتبہ حشمت روہیلوں کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے مرادآباد بھیجے گئے ۔ اس جنگ میں وہ بڑی بہادری سے لڑتے

لیکن آخرکار وہ کام آئے۔ جب تاباںؔ کو خبر ہوئی کہ اُن کا شفیق استاد شہید ہوگیا تو بہت افسوس کیا اور ایک بہت ہی پُر درد مرثیہ لکھا۔ ساتھ ساتھ یہ مرثیہ مخمس کی شکل میں ہے اور اس میں سترہ بند ہیں۔ اس میں سے چند نقل کئے جاتے ہیں۔

کیا کہوں تو نے کیا قیامت کی　　جا کے تیغ قضا سے الفت کی
قطع ہر بار کی محبت کی　　مجھ سے بھی زور ہی مروت کی
ہائے حشمتؔ شہید واویلا

روز و شب غم تو تجھ سے کہتا ہوں ● تیرے غم کو کہوں میں کس سے جا
کون ایسا شفیق ہے میرا　　کہ دلاسا دے اس الم سے آ
ہائے حشمتؔ شہید واویلا

اشک سینہ میں جب اُبلتا ہے　　طرح فوّارے کے اچھلتا ہے
بلکہ آنکھوں سے خون ڈھلتا ہے　　دم بہ دم منہ سے یہ نکلتا ہے
ہائے حشمتؔ شہید واویلا

تیرا تاباںؔ غریب و خستہ جگر　　فکر تاریخ میں تھا مضطر
مصرعۂ آخری پہ کی جو نظر　　کد سے ہاتف نے اس کو دی یہ خبر
ہائے حشمتؔ شہید واویلا

یا مثلاً ایک اور شعر حشمتؔ کی وفات کے بعد لکھا ہے۔ اس شعر میں بھی کس بلا کا سوز و گداز ہے اور پیرایہ بھی بڑا پُر درد اختیار کیا ہے۔ ؎ روتا ہوں بیں اس غم سے کہ تجھ میں حشمتؔ　　اب کس سے کہوں کہ میرے آنسو پونچھے

باوجود اس ثبوتِ کامل اور یقین کلی کے ہمیں تاباںؔ کے دیوان میں کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن سے خیال ہوتا ہے کہ حشمتؔ کے علاوہ حاتمؔ بھی ان کے استاد رہے ہیں۔ مثلاً ؎

تاباںؔ خزاں کے آنے کی حاتمؔ سے سن خبر　　بلبل اٹھی پکار چمن میں کہ ہائے گل

یا مثلاً ؎　ڈوبتے دریا میں تاباںؔ پر لے آئیں آشنا　　جب گیا تھا پار حاتمؔ اور سے تھے دام ہم

یا مثلاً ؎　اور ہی رتبہ ہوا ہے تب سے اس کے شعر کا　　جب سے حاتمؔ نے توجہ کی ہے تاباںؔ کی طرف

یا مثلاً ؎　ریختہ کیوں نہ میں حاتمؔ کو سناؤں تاباںؔ　　اس سوا دوسرا کوئی ہند میں استاد نہیں

یہ تو صحیح ہے کہ اِن چند اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حاتمؔ بھی اُن کے استاد تھے مگر یہ زیادہ مشتبہ ہوگیا اس لئے کہ دوسرے نسخوں میں حاتمؔ کے بجائے حشمتؔ لکھا ہوا ہے اور عقل سلیم بھی حاتمؔ کو استاد ماننے کے لئے تیار نہیں ہے اس لئے کہ پورے دیوان میں تو حشمتؔ ہی حشمتؔ ہے۔ بمشکل تمام چار اشعار حاتمؔ کی شان میں لکلے ہیں او وہ بھی اس قدر مشتبہ، مگر حاتمؔ کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حاتمؔ نے بھی دو اشعار ایسے لکھے ہیں جو تاباںؔ سے ان کے تعلق کا ثبوت دیتے ہیں ؎

فیض صحبت کا تری حاتمؔ عیاں ہے ہند میں　　طفل مکتب تھا سو عالم بیچ تاباںؔ ہوگیا

یا مثلاً ؎　ریختی کے فن بیں ہیں شاگرد حاتمؔ کے بہت　　پر توجہ دل کی ہے ہر آن تاباںؔ کی طرف

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد یہ کہنے کو دل چاہتا ہے کہ آزادؔ، مصحفیؔ اور لالہ لچھمی نرائن کی رائے بالکل درست ہے کہ ان دونوں کو

استادی کا حق حاصل ہے مگر اس میں بھی ذرا سا اختلاف ہے ۔ لچھمی نارائن شفیق تو یوں کہتے ہیں کہ شاعری کی حد تک حاتم اور تعلیم کی حد تک حشمت استاد تھے مصحفی یہ کہتے ہیں کہ درحقیقت حشمت ہی اُن کے استاد تھے، ورنہ حاتم سے تو بس کہیں کہیں اصلاح لی ہے ۔ آزاد نے اس کے متعلق کوئی رائے پیش نہیں کی ۔ اب پھر اس شک کو رفع کرنے کے لئے تاباں کے دیوان کی مدد ہونی چاہیئے ؎

دو سال جو ہم تم رہے یک جا حشمت   اب اس کے عوض ہجر کا ہے روز ہی سال

یعنی حشمت سے صرف دو سال تک اصلاح لے سکے تو اس حساب سے تاباں نے ۱۱۵۹ھ سے اصلاح لینی شروع کی ہوگی اور ۱۱۶۱ھ میں حشمت شہید ہوگئے گویا ۱۱۶۱ھ کے بعد جب تاباں کو کوئی استاد نہ ملا ہوگا تو حاتم کی خدمت میں گئے ہوں گے، پھر جب تک زندہ رہے اس وقت تک حاتم ہی سے اصلاح لی ہوگی ۔

بدقسمتی سے تاباں شراب نوشی بہت کرتے تھے ۔ لہٰذا نوعمری ہی میں صحت خراب ہونے لگی اور خود اُن ہی کے دوست احباب نے ان سے پرہیز کرنا شروع کیا ۔ جب ان کو خبر ہوئی کہ ان کے دوست احباب نے اسی مے گساری کی وجہ سے ملنا جلنا کم کردیا ہے تو سب کو خطوط لکھے اور توبہ کرکے فوراً مے نوشی ترک کردی ۔ لیکن شراب کی عادت فطرت ثانی بن چکی تھی اس لئے اس ترک شراب کا اثر برداشت نہ کرسکے ۔ چنانچہ اِدھر انھوں نے شراب سے ہاتھ کھینچا اور اُدھر آٹھ ہی دن میں زندگانی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ۔ بقول میر حسن : —

"چوں ہفت ہشت روز از حیات او باقی ماند توبہ کرد" میر تقی میر لکھتے ہیں "آخر آخر کہ اوائل جوانی او بود ایں قدر مداومت شراب کردہ کہ ملاقات ہمہ یاراں موقوف شد ۔ اکثرے از دوستانش کہ بہ خانۂ او می رفتند اوراست طانح می یافتند ۔ ایک مرتبہ توبہ کرد ۔ بہ ہمہ آشنایان خود رقعہا نوشتہ کہ عزیزان من توبہ کردہ ام ۔ شما شاید خبرگیران من باشید ۔ چرا کہ بہ سبب کثرت استعمال مزاج من شدہ بودہ از گزاشتن ایں از خود گزشتن من بر نزدیک می نماید ۔ غافل از احوال من بودن از عقل بسیار دور است"

یہ شراب کا ہی طفیل تھا کہ اس قدر کم عمری میں جاں بحق ہوگئے ۔ اگر یہ اور زندہ رہتے تو شاید میر اور سودا کی ٹکر لیتے مگر ہائے افسوس سودا کو چھہتر اور میر کو نوّے سال کی عمر ملی مگر تاباں زندگی کی پچیس بہار بھی مشکل سے دیکھنے پائے اور نہ معلوم دنیا کی کتنی حسرتیں اپنے ساتھ لیتے گئے ۔ تاباں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ ان کو شعر و سخن کی طرف مائل کرنے میں بے حد موزوں ثابت ہوا اور بہت جلد انھوں نے اپنے فطری ذوق کی بنا پر اپنے ہم جلیسوں کے طبقہ میں ایک نمایاں اور ممتاز جگہ حاصل کرلی ۔ لیکن موت نے انھیں اس کی مہلت نہ دی کہ وہ شعر و سخن کی محفلوں کو اپنی گرمیٔ سخن سے اور زیادہ چمکاتے اور اس طرح دنیائے شاعری میں اور زیادہ ناموری حاصل کرتے ع حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے ۔ میر نے ان کی اس جواں مرگی پر اس طرح خون کے آنسو بہائے ہیں ؎

داغ تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر   ہو نجات اس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

افسوس کہ دختِ رز کا عشق اس جوانِ رعنا، شاعر خوش کلام کا جان لیوا ہوگیا، لیکن مرتے مرتے بھی اس کی یاد دل سے نہیں گئی کہتے ہیں ؎

دفن کیجو سایۂ انگور میں ساقی اُسے
جو مرے تاباں تو تو یہ آرزو بر لائیو !

سید ضامن علی نقوی

(اُسی کے کنارے)

قلعۂ گولکنڈہ سے کچھ فاصلہ پر شمال مغرب کی جانب مرتفع پہاڑیوں میں ایک خوش نما تالاب صدیوں سے موجزن ہے جس کے دلفریب مناظر دکن کے بہت کم تالابوں کو نصیب ہوئے ہیں ۔ یہ دُرگ کا تالاب کہلاتا ہے اور چونکہ اس تالاب تک پہنچنے کے لئے کوئی سڑک موجود نہیں ہے اس لئے عہد حاضر کے تن آسان انسان اس کے حسن پرور نظاروں سے محروم ہیں ۔ یوں بھی یہ عالی شان چشمہ بلند پہاڑوں کی پیچ درپیچ گھاٹیوں میں اس طرح بنایا گیا ہے کہ جب تک خود تالاب تک کسی طرح نہ پہنچ جائیں اس کے وجود اور محل وقوع کی خبر بھی نہیں ہونے پاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی باکمال حسن کار نے اپنی صنعت گری کے عزیز ترین شہ کار کو بڑی حفاظت کے ساتھ لاکھوں پردوں میں چھپائے رکھا ہے تاکہ کس وناکس کی نظر سے اوجھل رہے۔

واقعہ یوں ہے کہ اس تاریخی تالاب کا پانی گولکنڈہ والوں کے لئے آب حیات کا کام دیتا تھا۔ کیونکہ قلعہ گولکنڈہ کی بلند سے بلند ہر فصیل اور اونچے سے اونچے محل میں اسی تالاب سے پانی پہنچایا جاتا تھا اور تحقیق کرنے والوں کو اُن زمیں دوز نہروں کے آثار صدیوں کے بعد اب بھی گولکنڈہ کی یہ فصیلوں کے باہر اور اندر جگہ جگہ نظر آجاتے ہیں، جن کے ذریعے سے اس تالاب کا صاف وشفاف اور سرد وشیریں پانی گولکنڈہ میں پہنچتا تھا ۔

پہاڑوں کے درمیان پانی کو روکنے کے لئے جو خوبصورت بند باندھا گیا ہے اور اس پر جو خوش وضع مسجد قطب شاہوں نے بنوائی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تالاب عہد قطب شاہیہ کے نفاست پسندوں اور صاحبانِ ذوق کی ایک بہترین تفریح گاہ بھی تھا ۔

اس تالاب اور اس کی نہروں کی تاریخ وتحقیق پر ایک طویل تحقیقی مقالہ بھی ایک علم دوست نے قلمبند کیا تھا جو ابھی زیور طبع سے محروم ہے ۔

(ادارہ)

یونہی ہاں گنگنائے جا یونہی تو کوہساروں میں ۔۔۔ چھلک کر جیسے مئے بہہ جائے ساغر سے بہاروں میں

یونہی دل کو ہجومِ رنج وغم میں شاد رہنے دے ۔۔۔ یونہی پابندیوں میں زیست کو آزاد رہنے دے

یونہی رہنے دے خود کو دور دنیا کی نگاہوں سے ۔۔۔ یونہی پوشیدہ رکھ معصوم فطرت کو گناہوں سے

یونہی انگڑائیوں سے دامنِ کہسار کو بھر دے یونہی کھوئے ہوؤں کی جستجو کو تیز تر کر دے

یونہی ماضی کے رنگیں خواب کی تعبیر بن کر رہ

قطب شاہوں کے ذوقِ حسن کی تصویر بن کر رہ

بسایا ہے تجھے خود حسن نے اپنی اداؤں میں ملا کر مستیوں کو جھومنے والی گھٹاؤں میں

یہ بے تابی ہواؤں کی یہ خاموشی فضاؤں کی تری مسجد میں دل تنویر پاتا ہے دعاؤں کی

بلندی سے نگاہیں جھک کے تجھ کو چوم لیتی ہیں پیامِ حسن سنتی ہیں پیامِ شوق دیتی ہیں

فلک سے دیکھتا ہے مہر کوہستان کے سائے تری موجوں پہ بل کھاتے ہیں جو باہوں کو پھیلائے

ترے دھارے پہ بہتی ہے کشاکش نور و ظلمت کی دلِ انساں میں جیسے دھڑکنیں پہلی محبت کی

گھٹا کو دیکھ کر جس طرح دہقاں گنگناتا ہو ! مچھیرا موج کو مچھلی سمجھ کر جیسے آتا ہو !

تری بے تابیوں سے یوں سکوں لینے کو آیا ہوں

خرد سے تنگ ہوں ذوقِ جنوں لینے کو آیا ہوں

میکش

اجنٹا

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را　　گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

سرزمین دکن کے ایک گوشے میں خاموش پہاڑوں کے درمیان بیٹھ کر گزرے ہوئے انسانوں نے آج سے دو ہزار برس قبل امن و سکون کی ایک بستی بسائی تھی، جو علم و ادب، فضل و کمال اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی۔ جہاں حکمت و دانش کے چشمے اُبل رہے تھے اور جس کی نیرنگیوں اور کرشمہ سازیوں کو دیکھ کر دورِ حاضر کا انسان آج بھی محوِ حیرت ہے۔ اجنٹا کی پوری تفصیلات پر نقد و تبصرہ کرنا اور اس کی پوری رنگ آمیزی کو الفاظ کا جامہ پہنانا سردست میرا مقصد نہیں ہے۔ ان کا محض ایک دھندلا سا عکس پیش ہے، تاکہ اجنٹا سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب جب وہاں جائیں تو اِس تاریخی یادگار کا کچھ نہ کچھ تصور اور خاکہ پیشِ نظر رہے۔ ممکن ہے کہ علم و فن کی اس نگری کو دیکھنے اور سمجھنے کی کچھ خواہش اور دلچسپی بھی یہ مضمون ان میں پیدا کر دے۔ یا کم از کم ہمارے زمانے کے گوشہ نشینوں کو زمانۂ قدیم کے گوشہ نشینوں کے اس شاہکار کی کچھ خبر ہی ہو جائے۔

ان غاروں کی تعمیر اگرچہ مذہبی بنیادوں پر قائم ہے مگر ضمناً دورِ ماضی کے انسان نے اپنی پوری تاریخ اور تمدن کو ان عظیم الشان معبدوں میں سمو دیا ہے۔ اس یگانگی نے اگر ایک طرف مذہب اور مذہبی تعلیم کو نمایاں کیا ہے تو دوسری طرف تاریخ کا ذوق رکھنے والوں کے لئے انہی پتھروں میں اپنی پوری زندگی کے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کو دیکھ کر بیک نظر جو سب سے پہلا اثر انسانی دماغ پر مرتسم ہوتا ہے، وہ ایک عالمِ محویت و استغراق ہے جہاں ہر پیکرِ تصویر یا تو رازہائے زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے میں کھویا ہوا متاثر و مبہوت نظر آتا ہے، یا اپنے مقصود کی طرف متوجہ اور جویا پایا جاتا ہے۔ جہاں یہ دنیا کی بے ثباتی، انسانی خود غرضی، ایثار، ایفائے وعدہ، ماں باپ کی خدمت، حاکم کی ذمہ داری، احسان فراموشی وغیرہ کے یہ نصص اخلاقی و مذہبی سبق دے رہے ہیں وہیں انسانی کمزوریوں کی بھی نہایت لطیف پیرائے میں یاد دلا رہے ہیں۔ خوبصورت نازک مرصّع زیورات کی بہتات، موتیوں کی افراط، پھولوں کی فراوانی بھی پہلی نظر ہی میں محسوس ہونے لگتی ہے۔ سطحی نظروں سے دیکھنے والے زیادہ تر پہاڑوں میں ایوانوں کی تراش خراش سے دنگ اور نقش و نگار کی خوبصورتی سے مسرور و محوِ حیرت ہو جا سکتے ہیں۔ مگر غور کرنے والے اس نادر الوجود بیت الحکمت میں اخلاقیات، تمدن و معاشرت، مدنیت و فلسفہ اور صناعی کے مختلف درس انہیں پتھروں سے لیتے ہیں۔ اور یہ معلوم کر کے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ آج سے دو ہزار سال پہلے بھی یہی تہذیب موجود تھی اور ایسے ماہر موجود تھے جن کی اداکاریاں اور موشگافیاں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر سکتی ہیں کہ غارہائے اجنٹا کے تعمیر کرنے والے معمولی انسان نہ تھے بلکہ علوم و فنون کے پیکرِ مجسم تھے اور خیالات کی گوناں گونی، مذاق کی پاکیزگی اور نگاہ کی وسعت میں وحیدِ عصر، سادگی اور پرکاری کے بادشاہ اور آسمانِ صنعت و حرفت کے درخشاں ستارے تھے۔ جذبات کی وہ کونسی لطافت تھی جس سے وہ لطف اندوز نہ ہوتے تھے۔ تصویر کشی اور جذبات کی عکاسی میں ان ماہرینِ فن نے وہ کمال کیا ہے کہ پتھر کے بت ہوں یا رنگین تصویریں ہر ایک کے خدوخال سے فطری جذبات اور تہذیب و تمدن کے طریقے عیاں ہیں۔ مختصر یہ کہ اجنٹا کی ہر شے دورِ ماضی کے بے مثل عروج و ترقی کا ایک کھلا ہوا ورق ہے جس کے تاثرات بھولے سے بھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

اجنٹا کے یہ غار این۔ ایس ریلوے اسٹیشن اورنگ آباد (دکن) سے تقریباً (۶۷) میل اور جی۔ آئی۔ پی ریلوے اسٹیشن جلگاؤں سے (۳۹) میل پر واقع ہیں۔ باہر سے آنے والے اکثر سیاحوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ جو موضع اجنٹا کے نام سے موسوم ہے وہی ان غاروں کا بھی جائے وقوع ہوگا۔ اس لئے عموماً سیاح جلگاؤں سے آتے ہوئے موضع اجنٹا چلے جاتے ہیں۔ جلگاؤں کی سمت سے آنے والے صاحبین کو چاہیئے کہ وہ موضع اجنٹا سے تین میل قبل پہاڑی گھاٹ پر چڑھنے کے بجائے سیدھے ہاتھ کی طرف جانے والی

پختہ سڑک پر مڑجائیں اور موضع اجنٹا جو گھاٹ کے اوپر واقع ہے اس کے راستے کو چھوڑ دیں۔ اورنگ آباد کی سمت سے جانے کی صورت میں غاروں کے موڑ سے ڈیڑھ دو میل قبل موضع فردا پور واقع ہے۔ جہاں عوام کے لئے ایک آرام دہ مسافر بنگلہ اور سرکاری مہمانوں کے لئے شاہی مہمان خانہ موجود ہے۔ موضع اجنٹا پر ٹھیرنے کا کوئی خاص انتظام نہیں۔ شاہی مہمان خانہ میں ایک معقول باورچی متعین ہے۔ مسافر بنگلہ کا چپراسی بھی کھانا پکادیتا ہے۔ خور و نوش کی ضروری اشیاء مل جاتی ہیں۔ گر بہت گراں۔ غاروں تک پختہ سڑک ہے۔ موٹر ٹکسی فردا پور میں نہیں ملتی بیلوں کے ٹانگے عموماً بطور سواری استعمال ہوتے ہیں۔ مسافر بنگلہ اور شاہی مہمان خانہ سے غاروں کا فاصلہ چار میل ہے۔ اورنگ آباد سے فردا پور تک بس سرویس ہے۔ اورنگ آباد پر موٹر ٹکسیاں بھی ملتی ہیں۔ جو اجنٹا کے غار دکھلاتی ہیں۔ جل گاؤں سے کوئی موٹر سرویس پابندی سے نہیں چلتی اور نہ وہاں ٹکسیوں کے مل جانے کا یقین کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے اجنٹا کے غار تبلیغی نقطۂ نظر سے بنائے گئے تھے۔ اس زمانے کی خانقاہیں عموماً مرکز علوم و فنون بھی ہوا کرتی تھیں۔ غار دو قسم کے ہیں۔ ایک عبادت گاہیں اور دوسری رہائش گاہیں۔ ان کی کل تعداد (۲۹) ہے، جن میں سے پانچ عبادت گاہیں اور باقی رہائش گاہیں ہیں۔ ان غاروں کی دیواروں چھتوں اور ستونوں پر مختلف مذہبی کہانیوں اور روایتوں سے متعلق رنگین تصاویر بنائی گئی ہیں۔ انگریزی میں انھیں فرسکوز کہتے ہیں اور ان سے وہ تصاویر مراد ہوتی ہیں جو پانی میں رنگ کی آمیزش کر کے گیلی دیواروں پر بنائی جائیں۔ تاکہ رنگ سطح میں پیوست ہو جائے۔ یہی وہ تصاویر ہیں جن میں قدیم دنیا کا بے بہا سرمایہ اس زمانے کے تمدن، معاشرت اور فلسفہ کی نمائش کر رہا ہے۔ یہ غار اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ دو ہزار برس قبل ہندوستان وحشیوں کا غول نہ تھا۔ بلکہ اس زمانے کے باشندے ایک مکمل اور مہذب زندگی کے مالک تھے، جن کا طریقۂ زندگی موجودہ تہذیب و تمدن کی دنیا سے کسی طرح پست تصور نہیں کیا جاسکتا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ عام طور پر عہد ماضی کی اس معرکتہ الآرا یادگار کو دھندلی عینک ہی سے دیکھا گیا ہے۔ اجنٹا کے آرٹ کی تشریح عموماً اس طور پر کی جاتی ہے کہ یہ لوگ کتنے رنگ جانتے تھے۔ رنگوں کے انتخاب میں موزونیت تھی یا بھدا پن، ماڈل ڈرائنگ پر کس قدر عبور تھا۔ جسامت کی گولائی بتا سکتے تھے یا نہیں۔ خد و خال کی نقاشی اور تناسب اعضاء کا پورا لحاظ کرنے کی قابلیت تھی یا نہیں۔ مختصر یہ کہ اس زمانے کا آرٹ کس حد تک ترقی کرچکا تھا اور اپنے مفہوم کو آرٹسٹ کس حد تک تصاویر کے ذریعے سے پیش کرنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ لیکن اس قدیم ترین تہذیب و تمدن کے نقوش کو اس گہری نظر سے نہیں دیکھا جاتا جس کے وہ مستحق ہیں۔ حالانکہ اجنٹا کا یہ رخ بھی بہت زیادہ قابل لحاظ ہے۔ اجنٹا کو سامنے رکھ کر آج ہم ہزاروں برس قبل کے گزرے ہوئے انسانوں کی پوری معاشرت و تہذیب کا مطالعہ اس طرح کر سکتے ہیں۔ جیسے وہ خود ہمارے سامنے چل پھر رہے ہوں۔ مغربی مورخین کا پیہم اعتراض ہے کہ مشرقی مورخ صرف حکومتوں کے عروج و زوال اور لڑائیوں کی فتح و شکست ہی کے تذکرے لکھنا جانتے ہیں۔ تاریخ، تمدن اور معاشرت سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن اجنٹا کی ان تصاویر کو دیکھ کر ان کا یہ اعتراض سطحی نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ ان میں ہندوستان کی تمدنی و معاشرتی تاریخ کا ایک گراں بہا سرمایہ موجود ہے۔ ہندوستان کی حد تک ان غاروں کو صرف محکمۂ آثار قدیمہ سرکار عالی ہی کی توجہ حاصل رہی

لیکن ہندوستانی مورخین نے عموماً بہت کم دلچسپی لی ہے

دنیا سے نفرت اور تلاش سکون، بدھ مذہب کا بنیادی اصول ہے۔ مذہب کی اس اسپرٹ کے پیش نظر غاروں کے لئے جو جگہ ماہرین اجنتا نے تلاش کی وہ خود قابل داد ہے۔ گوتم بدھ کو دنیا سے بیزار ہو کر غالباً ایسے ہی پُرسکون گوشۂ عافیت کی جستجو ہوگی جیسی کہ قدرت نے اس کے پیروؤں کو یہاں عطا کی۔ مذہبی اسپرٹ سے قطع نظر اجنتا کی رنگین وادی کا انتخاب یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ قدرتی مناظر کے کس قدر دلدادہ تھے۔ قدرت کی رنگینیوں سے دلچسپی اور قدرتی مناظر کا ذوق موجودہ ذہنیت ہی کی پیداوار نہیں، بلکہ ایک عرصۂ دراز سے انسان کی لطف اندوزیوں کا باعث ہے۔ غاروں کے وجود کو یہاں سے اٹھا دینے کے بعد بھی بطور خود یہ مقام اور اس کی دلفریبیاں اس قابل ہیں کہ محض ان سے لطف اٹھانے کے لئے سفر کیا جا سکتا ہے۔ واگھور ندی کے کنارے پہاڑوں کے پیچ پیچ کنج میں یہ غار ایک نیم دائرہ کی شکل میں کھودے گئے ہیں۔ مرہٹی میں واگھور کے معنی پیچ وخم کے ہیں۔ چنانچہ اس ندی نے ہزاروں بل کھائے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس کی سات دھاریں دلفریب آبشاروں کی صورت میں اجنتا کی وادی میں بہت بلندی سے گرتی ہیں۔ یہاں کی خاموش فضا میں یہ آبشار ایک نغمۂ مسلسل پیدا کرتے ہیں۔ اجنتا کی وادی اس طرح لہراتی اور خم پر خم کھاتی ہوئی چلی گئی ہے۔ جب انسان اس میں داخل ہوتا ہے تو اس کو وہاں کسی غیر معمولی چیز کے وجود کا گمان تک نہیں ہوتا۔ ہر موڑ پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب پہاڑ راستہ کو ختم کر دے گا۔ جن چٹانوں کو کاٹ کر غار بنائے گئے ہیں غالباً اس مقصد کے لئے ان سے بہتر دوسری چٹانیں نہ ہوتیں۔ اگر ان پتھروں میں ذرا سا بھی نقص نکل جاتا تو اس بڑی اسکیم کا خاتمہ ہی تھا۔ پتھر کی پرکھ نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ اس کو پسند کرنے والے علم طبقات الارض کے اچھے ماہر بھی تھے۔

اس مقام کا پورا منظر غاروں کے عین مقابل کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر ایک خاص مقام سے دیکھا جائے تو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس مخصوص مقام کو انگریزی میں ویو پائنٹ (VIEW POINT) یا نظارہ گاہ کہتے ہیں۔ گو ویسے یہ غاروں کے بالکل سامنے ہے، مگر بلندی اس قدر ہے کہ پختہ سڑک کے ذریعے موٹر سے (۱۶) میل کا چکر کھا کر آنا پڑتا ہے۔ آفتاب کے غروب و طلوع کے اوقات میں شفق کی رنگینیاں اس پُرسکون وادی میں ایک عجیب وغریب کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ موسم برسات میں جب ہر ذرّہ سبزہ پوش ہو جاتا ہے تو بلا مبالغہ اس مقام پر جنت ارضی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ غاروں میں روشنی کا انتظام بھی قدرت کی طرف سے ہے۔ ان غاروں کے رخ اس طرح واقع ہیں کہ نصف غار عروج آفتاب میں روشن رہتے ہیں اور نصف زوال آفتاب کے وقت۔ زمانۂ بارش اور موسم سرما میں کچھ اندھیرا ہی رہتا ہے۔ بجلی کی روشنی کا انتظام ہے۔ مگر بجلی کی روشنی سے دیکھنے کے لئے فی گھنٹہ (۵) روپے دینا ہوتے ہیں۔

۱۸۱۹ء میں ایک فوجی دستہ مقابل کی پہاڑی سے گزر رہا تھا۔ اتفاقاً فوجیوں کی نگاہ غار نمبر (۱۰) کی بلند کمان کے اوپری حصے پر پڑی۔ اس کے بعد ان کے متعلق دریافت شروع ہوئی۔ میجر گل اور دیگر محققین نے اس سلسلے میں تحقیقاتیں کیں اور اس طرح مغرب آرٹ کے اس انمول خزانے سے پہلی مرتبہ واقف ہوا۔ غاروں کی متصلہ آبادی کو ان غاروں کا علم اس انکشاف سے پہلے بھی تھا۔ چنانچہ ان کے قریب جو گاؤں واقع ہے اس کا نام "لیناپور" ہے، جس کے معنی مرہٹی زبان میں غاروں کے گاؤں کے ہیں۔ گرد وپیش کے لوگ

ان غاروں کو جنوں یا بھوتوں کا مسکن سمجھنے لگے تھے۔ ایک عرصۂ دراز تک یہ غار سخت کس مپرسی اور گم نامی میں پڑے رہے اس کا سبب ایک یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ برہمنوں کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے پر بدھ مذہب کے پیروؤں نے خائف ہو کر حفاظت کے خیال سے خود ان غاروں کے دروازوں میں مٹی بھردی تھی۔

طرزِ تعمیر کے لحاظ سے یہ عبادت گاہیں موجودہ گرجا گھروں سے بہت زیادہ مشابہ ہیں۔ سامنے کی بڑی کمان ایک خاص طرز کی بنائی گئی ہے ، جس کو "اجنتا کمان" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آج کل اس طرز کی نقل بہت سی بڑی بڑی عمارتوں میں کی جارہی ہے ، اجنتا کے ابتدائی دور کے کاریگر جب کسی مخصوص وضع کا نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے تو ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو چیز بھی بنائی جائے وہ اپنی اصل سے ہر طرح مشابہ ہو۔ چونکہ نیم بیضاوی چھت میں کمان دار لکڑی کی کڑیاں برابر برابر لگائی جاتی ہیں۔ اس لئے جب انھوں نے غاروں میں کمان دار چھت بنائی تو اصل وضع کو قائم رکھنے کے لئے پتھر تراش کر بجنسہ لکڑی کی سی کڑیاں ظاہر کردیں۔ یہ غار پتھر کے اندر لانبے کھدے ہوئے ہیں۔ پرستش گاہوں کے اندرونی حصے کے آخر میں گول اونچا پتھر کاٹ کر اس پر چھوٹا سا گنبد بنا دیا ہے۔ گنبد پر پودا رکھنے کے لئے جگہ بھی بنا گئی ہے۔ مذہب کے ابتدائی دور میں بدھ کی پرستش جائز نہ تھی۔ چنانچہ پرستش گاہ غار نمبر (۹ و ۱۰) کے اندر جو گول پتھر ہے ' اس میں مورت نہ تھی۔ جب بدھ کی پرستش کی جانے لگی تو اس پتھر کے سامنے کے حصہ میں بدھ کا مجسمہ کاٹ کر بنایا جانے لگا۔ جیسا کہ نمبر (۱۹ ، ۲۰) میں پایا جاتا ہے۔ ان غاروں کے سامنے کے حصہ میں بھی بدھ کی مختلف مورتیں ہیں۔ جن کو غالباً زمانۂ مابعد میں تراشا گیا ہے۔

رہائشی غار دراصل بڑے بڑے ہال ہیں جنھیں چوکور پتھر کے اندر سے تراش کر نکالا گیا ہے۔ درمیان میں مربع رقبے کے اطراف دالان کی طرح ستون ہیں۔ بقیہ حصہ میں بطور گیلری کے بازو میں چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ جن میں دو آدمی سو سکتے ہیں۔ کچھ کمروں میں دروازے کے دائیں بائیں بنچ کی وضع کے پتھر کاٹ دئے گئے ہیں۔ ایسے بعض پتھروں پر سر رکھنے کے واسطے پتھروں کے تکئے بھی بنادئے گئے ہیں۔ غاروں کی دیواروں ، چھتوں اور ستونوں پر جو تصاویر ہیں ان کو نہایت معمولی مگر بے انتہا پائدار مقامی مسالہ دار مٹی کے گلاوے پر (PAINT) کیا گیا ہے۔ مٹی اور گوبر میں السی ، کڑوی اور دھان کا بھوسہ ملا کر پہلے پلاسٹر کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسالے میں بیل پھل کا گودا بھی شریک ہے اس کے بعد سفیدی کے استر پر رنگ کاری کی گئی ہے۔ نو اور دس نمبر کے قدیم غاروں میں چونے کا پلاستر بھی پایا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کن وجوہ کی بناء پر چونے کا پلاستر ترک کر کے مٹی کے گلاوے کا پلاستر کیا جانے لگا۔ زیادہ تر مشہور تصاویر مثلاً پدما پانی وغیرہ مٹی کے گلاوے ہی پر بنائی گئی ہیں۔ رنگ چھے قسم کے استعمال کئے گئے ہیں ' کالا ' ہرا ' لال سفید ' پیلا اور نیلا۔ کالے رنگ کے لئے ہندوستان میں عموماً کاجل کا نسخہ مشہور ہے۔ لال اور ہرا رنگ ان لوگوں نے ان گھاٹیوں کے پتھروں سے حاصل کیا جو بہ کثرت یہاں سے دستیاب ہوتے ہیں۔ نیلا رنگ نیلے تھوتھے کا ہے۔ پیلا رنگ ہارسنگھار سے حاصل کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رنگ میں گرّہ کا شیرہ بھی ملاتے تھے۔ ان کے برش پرندوں کے پر تھے۔ ان رنگین تصاویر کو مٹی کا گلا وہ ہی اس قدر عرصے سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ غاروں میں مٹی بھر جانے سے ان تصاویر کو بہت نقصان پہونچا۔ جہاں تک

مٹی کے اثرات پہونچے ہیں۔ تصاویر باقی نہیں رہیں۔ امتداد زمانہ کے اثر سے بھی تصاویر کا بہت بڑا حصہ مٹ چکا ہے۔ جو محفوظ ہیں وہ بھی جا بجا شکستہ۔ اب ادویہ کے ذریعے سے بقیہ حصوں کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ پمپ کے ذریعے سے ایک ببس دار لیپ ان تصویروں میں پیوست کیا جاتا ہے، جس کے اثر سے گارا وہ پھر پتھر کو پکڑ لیتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے حصوں کی مرمت سمنٹ سے کر دی گئی ہے۔ اطراف میں سمنٹ کا سہارا بھی دیا ہے اور درمیانی اکھڑے ہوئے حصوں میں سمنٹ بھر دیا گیا ہے۔ جب ان تصاویر کی نقل کی جاتی ہے تو درمیانی گرے ہوئے حصے کو پر نہیں کیا جاتا بلکہ بجنسہ سمنٹ کا دھبہ بھی نقل میں بنا دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس قدیم آرٹ میں کوئی مداخلت نہ ہو سکے۔

عام طور پر رہائشی غاروں میں عین دروازہ کے مقابل عقبی دیوار کے درمیان میں ایک کمرہ اور اس کے بیچ میں بدھ کا ایک بڑا مجسمہ بنایا گیا ہے۔ اگر روشنی ہو تو غاروں میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر مجسمہ پر پڑتی ہے۔ یہ مجسمے قدیم سنگ تراشی کے بہترین نمونے ہیں۔ غار نمبر (۱، ۲، ۱۶ اور ۱۷) میں تصویریں ہیں۔ جن میں غار نمبر (۱، ۲) اور (۱۷) کی تصویریں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نا مکمل غاروں سے پتہ چلتا ہے کہ غاروں کی تعمیر کا کام مختلف پارٹیاں کیا کرتی تھیں۔ کھدائی نیچے سے اوپر کی طرف کی جاتی تھی۔ ایک گروہ کھودتا جاتا تھا، دوسرا کھودے ہوئے حصوں کی گڑھائی اور صفائی کرتا جاتا تھا تیسرا گروہ صاف شدہ حصوں پر بہت تراشی اور نقش و نگار کا کام شروع کر دیتا تھا۔ غالباً غار مکمل ہونے کے بعد پینٹنگ کی جاتی تھی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر عظیم الشان ایوانوں کو چھینی سے کھود کر بنایا گیا ہے۔ ایک غیر مکمل غار میں چھینی کے نشان پائے جاتے ہیں، جن سے متذکرۂ بالا طریقۂ تعمیر کا پتہ چلتا ہے عموماً یہ لوگ رنگ کاری سے قبل ...... نقش و نگار کا خاکہ مرتب کر لیا کرتے تھے۔ حسن اتفاق سے اس طرح کا ایک غار بھی ایک جگہ باقی رہ گیا ہے۔

ان غاروں کا زمانۂ تعمیر دو سو سال قبل مسیح سے سات سو سال بعد مسیح تک بتایا جاتا ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا مذہبی تصورات بھی بدلتے گئے اور بدھ کی حقیقی تعلیم میں برہمنی تصورات کی آمیزش ہونے لگی۔ تصاویر میں جا بجا ان اثرات کے نقوش ملتے ہیں بدھ متوا کے ایثار کے مختلف قصوں کے علاوہ اخلاقی تعلیم کے درس بھی ان تصاویر کے ذریعہ دئے گئے ہیں۔ ایک اصول کو ذہن نشین کرانے کے لئے مختلف قصے اور ایک قصہ بیان کرنے کے لئے مختلف سین پیش کئے ہیں، جن کو ملا کر دیکھنے سے پورا قصہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ بدھ مت کی مذہبی کتابوں سے مختلف قصوں کو پیش کیا گیا ہے مثلاً مہاجانیکا جاتیکا، سنکا پالا، چمپا دفنا کا وغیرہ۔ مہا جانے کا جاتیکا میں بدھ کی سابقہ زندگیوں کے حالات ہیں۔

بدھ مت والوں کا خیال ہے کہ بدھ نے متعدد جنم لئے ہیں۔ وہ کبھی سانپ کی صورت میں پیدا ہوئے اور کبھی ہاتھی، ہرن یا بندر کی شکل میں۔ کبھی قصر شاہی کو رونق بخشی تو کبھی غربت کی جھونپڑیوں کو آباد کیا۔ غرض کہ انھوں نے مختلف صورتوں میں خلق خدا کی خدمت انجام دی۔ بدھ نے جب گوتم کی شکل میں جنم لیا تو اپنی گزشتہ زندگیوں کے واقعات دہرائے جو لوگ ان کہانیوں سے واقف ہیں وہ ٹوٹی ہوئی تصویروں سے بھی پوری بات نکال لیتے ہیں۔ واقعات کو تسلسل کے ساتھ نہیں بنایا گیا۔ یہ غار کئی سو سال میں مکمل ہوئے ہیں۔ ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ تصویریں بنا دی گئی ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابتداً کسی قصے کے کچھ حالات پینٹ کر دئے گئے اور پھر آنے والی نسلیں اس خلا کو پورا کرتی رہیں۔ اور اس طرح واقعات کے وہ اجزا جو چھوٹ جاتے وقتاً فوقتاً پورے ہوتے رہتے۔ ایک واقعہ کی کچھ تصاویر سلسلہ سے برابر اور کچھ فاصلہ سے اوپر نیچے ملیں گی۔ بعض واقعات درمیان سے شروع کئے گئے ہیں۔ جن کے کچھ حصے ایک طرف اور باقی دوسری طرف ملتے ہیں۔ درمیان میں دوسرے قصوں کے جز آگئے ہیں چونکہ مذہبی قصوں سے اہل

زمانے میں سب کے کان آشنا رہتے تھے ۔ اس لیے ان لوگوں کو کڑیاں ملانے میں کوئی دقت نہ ہوئی ہوگی ۔ بعض اوقات جگہ بچانے کے لئے یا جگہ کی تنگی کی وجہ سے درمیانی یا کسی حصے کی کسی گنجائش میں کہانی کا کوئی جز بنا دیا کہیں کسی قصے کا ابتدائی حصہ ایک جگہ ہے تو آخری حصہ غار کے کسی دوسرے حصے میں بنا دیا گیا ہے ۔ غالباً ابتدا میں ایک ہی جز کا ظاہر کرنا کافی سمجھا گیا ہوگا ۔ لیکن بعد میں اگر کہیں اور خالی جگہ نکل آئی تو اس کا مابقی حصہ وہاں بنا دیا گیا ۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی بعد کے زمانے میں باقی قصے کو مکمل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی ۔

نواب احمد

ایک شب

میں جہاں کی قہر آلودہ نگاہوں کا نشانہ تو نہیں
زندگی منت پذیرِ التفاتِ زمانہ تو نہیں
یہ پرستش، تیری الفت کا بہانہ تو نہیں
یہ نیا احساس تمہیدِ فسانہ تو نہیں
اک خلوصِ والہانہ تو نہیں

آسماں پر رقص فرما ہیں ستارے باہزاراں اہتمام
لے رہا ہوں اپنی قسمت سے فسردہ زندگی کا انتقام
یہ شباب فتنہ ساماں اور مے و مینا و جام
آج کچھ مدھم رہے رفتارِ وقتِ تیز گام
ڈھل چکی ہے ایشیائی گرم شام

چند نورس آرزوئیں ہیں دلِ شاعر کی ساری کائنات
کون جانے شوق کے ہاتھوں ہی ہو جائے جو تعمیرِ حیات
ہم نشیں مت چھیڑ شامِ غم کی تازہ واردات
یہ طرب انگیز لمحے، یہ حسیں پُر کیف رات
اور اس "کافر" کی نظرِ التفات

جانتا ہوں ہاں اسی منزل پہ ملتے ہیں حدودِ کفر و دیں
شوق ہے پھر جادہ پیما، عشق کی مسدود راہیں کھل گئیں
ماورائے حدِ امکانات تو کچھ بھی نہیں
اپنے قدموں پر جھکا لوں آج گردوں کی جبیں
آفریں! اے ذوقِ مستی آفریں

سردار الہام

نئی کتابیں

۱۔ تاریخ برم وسزا (عجیب وغریب سزائیں) از امداد صابری حجم ۲۵۰ صفحے قیمت عاں۔ پتہ۔ نیا کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دلی

۲۔ وہاں (افسانے) از مرزا سرفراز علی۔ بی اے ۱۰۲ صفحے۔ قیمت عہ۔ کتاب خانہ انجمن ترقی اردو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

۳۔ یہ دنیا ہے۔ (ناول) از نجم الدین شکیب ۱۶۱ صفحے قیمت عاں۔ پتہ کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک۔ لکھنو

۴۔ ایک نشاعر کے تلو شعر از میر جہانگیر علی خاں قدسی ۳۲ صفحے پتہ کتبۂ علیہ۔ پتھر گٹی۔ حیدرآباد دکن

۵۔ اتحادی افسانے از ظہیر دہلوی ۲۰ صفحے قیمت عہ۔ پتہ۔ شاعری کالج۔ اندرون لاہوری دروازہ۔ انارکلی حلقہ (۳۹) لاہور

۶۔ نمود وراز (افسانے) از محمودہ رضویہ ۲۰۹ صفحے۔ قیمت عاں۔ پتہ انجمن ترقی اردو۔ کراچی

۷۔ چوراہا (ناول) از قیسی رام پوری قیمت ۱۲/ پتہ انڈیا بک ہاؤس۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

۸۔ نئے محل (افسانے) از ظفر قریشی دہلوی۔ قیمت عاں 〃 〃 〃

۹۔ حیدرآباد کی نسوانی دنیا (مضامین) از نصیر الدین ہاشمی قیمت عاں۔ پتہ۔ انڈیا بک ہاؤس۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

۱۰۔ عالمگیر نظام نو۔ از محمد علی ایم اے۔ حجم ۱۴۸ صفحے قیمت عاں پتہ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام۔ لاہور۔

۱۱۔ جوہر ادب (حصہ اول و دوم) از آغا حیدر حسن پروفیسر نظام کالج و رائے بل بیر پرشاد ایم اے۔ حجم ۴۰ صفحے قیمت عاں

۱۲۔ شمع فروزاں (ناول) مترجمہ صادق الخیری۔ قیمت ۱۲/۔ پتہ۔ خاتون کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی

۱۳۔ زہراب (ناول) از محمود احمد خاں 〃 〃 〃 〃 〃

۱۴۔ شام وسحر (ناول) از ایم۔ اسلم۔ حجم ۵۰ صفحے 〃 〃 کتب خانہ دار البلاغ ۵۴ محمد نگر میو روڈ۔ لاہور۔

۱۵۔ شمہ (ناول) از ایم۔ اسلم حجم ۵۰۰ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۱۶۔ رقص بہار (〃) 〃 〃 ۳۸۰ صفحے 〃 ۱۲/ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۱۷۔ پریت کی ریت (افسانے) 〃 〃 〃 عاں 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۱۸۔ رشک وقمر (〃) از کوثر چاند پوری۔ حجم ۲۷۲ صفحے قیمت عاں۔ کتب خانہ دار البلاغ ۵۴ محمد نگر میو روڈ۔ لاہور۔

۱۹۔ سنی سنائی (مزاحیہ ریڈیو ڈرامے) از شوکت تھانوی۔ قیمت عاں 〃 〃 〃 〃

۲۰۔ جلوۂ رنگیں (افسانے) از ڈاکٹر نصیر الدین۔ قیمت ۱۲/۔ پتہ سید عبد الرزاق تاجر کتب۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

۲۱۔ نگینے (افسانے اور مضامین) از مظفر حسین شمیم۔ قیمت ۱۲/ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۲۲۔ دھوپ (ناول) از قیسی رام پوری قیمت ۱۲/ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۲۳۔ تعبیریں (افسانے) از امین شرفپوری ۱۲/ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۲۴۔ نغمے کی موت (افسانے) از کرشن چندر قیمت عاں۔ پتہ۔ انڈیا بک ہاؤس۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

۲۵۔ آبا ہیچ (ناول) از قیسی رام پوری۔ 〃 عاں 〃 〃 〃 〃 〃

تنقید و تبصرہ

اقبال نامہ حصہ اول

یہ اقبال کے مکاتیب کا ایک ضخیم مجموعہ ہے جس کو مولوی شیخ عطاء اللہ صاحب ایم اے استاد شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے خاص اہتمام اور سلیقے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

اقبال نامۂ حصہ اول میں پچاس سے زیادہ اصحاب کے نام کوئی ڈھائی سو سے زیادہ خطوط شریک ہیں۔ ان اصحاب میں متعدد ایسے ہیں جن سے اقبال کے خاص تعلقات تھے۔ بعضوں سے علمی اور اکثروں سے خانگی۔ جن بزرگوں سے اقبال نے اسلام سے متعلق مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں نواب صدر یار جنگ بہادر، مولنا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولنا سید سلیمان ندوی، مولنا عبدالماجد دریا بادی جیسے اصحاب کے نام کے خطوط خاص کر قابل ذکر ہیں۔

نواب مسعود جنگ مرحوم، خواجہ غلام السیدین اور مولوی الیاس برنی صاحب کو جو خطوط لکھے گئے ہیں ان سے اقبال کی شخصیت کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بعض اصحاب کے نام متعدد خطوط ہیں جن میں ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ، مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ اور ممنون حسن خاں کے نام پیش پیش ہیں۔

اس مجموعہ میں اقبال کے بارہ خطوں کے عکس بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اس کی ابتدا میں لایق مرتب کا ایک دیباچہ ہے جس میں انھوں نے اس مجموعے کی ترتیب و تبویب کی تفصیلات بیان کی ہیں اور ان دوستوں کا شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے اقبال کے خطوط جمع کرنے میں ان کی مدد کی ہے۔ آخر میں انتساب لکھا ہے جس کی رُو سے یہ کتاب اقبال کے استاد شمس العلماء مولنا میر حسن صاحب مرحوم کے نام معنون کی گئی ہے۔

اقبال نامہ کا مقدمہ نواب صدر یار جنگ بہادر۔ ڈاکٹر حبیب الرحمن خاں شروانی نے اپنے مخصوص اسلوب بیان میں تحریر کیا ہے۔ یہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اپنی رنگینی اور شستگی کی وجہ سے خاص کر قابل توجہ ہے۔

اقبال کے خطوط اپنے اسلوب بیان کی روانی اور مصنف کے خلوص کا آئینہ ہیں، اگرچہ ان میں غالب کے خطوط کی طرح بانکپن اور ظرافت موجود نہیں ہے لیکن مطالب کی گہرائیوں کے علاوہ اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ان خطوں کو اُردو ادب میں ایک اچھی جگہ حاصل رہے گی۔ خاص کر ان کے وہ خطوط جن میں انھوں نے ہندستانیوں اور مسلمانوں کی زندگی کے ماضی و مستقبل کی نسبت خیال آرائی کی ہے یا جن میں اسلام کے مختلف مسائل سے بحث کی ہے اُردو کے جدید سیاسی ادب میں ایک خاطر خواہ اضافہ کا باعث ہیں۔

اس کتاب کا ایک نقص بہت نمایاں ہے اور وہ اس کی غیر معمولی طور پر چھوٹی تختی کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہے۔ اقبال کی تمام کتابیں ایک ہی سائز پر چھپتی رہی ہیں اور اسی وجہ سے اقبال سے متعلق اب تک جو کچھ قابل ذکر ادب اُردو میں شایع ہوا ہے وہ بھی اسی سائز پر چھاپا گیا ہے۔ چنانچہ ادارۂ ادبیات اردو نے مہاراجہ سر کشن پرشاد کے موسومہ خطوط اقبال کو بھی اسی سائز پر "شاد اقبال" کے نام سے شایع کیا تھا حالانکہ دکن میں یہ سائز عام طور پر کتابوں کے لیئے رائج نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ اقبال نامہ کے ناشر شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور نے پنجاب کی اس مقبول عام سائز کو ترک کرنا کیونکر گوارا کیا۔ اقبال نامہ جیسی کتاب کے لئے ایک چھوٹی سائز کا انتخاب کرنا اقبال کے اکثر و بیشتر دلدادوں کو یقیناً ناگوار گزرے گا۔

IQBAL HIS ART AND THOUGHT

اقبال سے متعلق حیدرآباد سے حال ہی میں ایک اور کتاب انگریزی زبان میں شایع ہوئی ہے۔ اس کے مصنف

مولوی سید عبدالواحد صاحب بی ایس سی۔ بی اے (آکسن) ناظم محکمۂ جنگلات ممالک محروسہ سرکار عالی ہیں۔ اس میں آٹھ باب ہیں اور ابتداء میں مصنف نے ایک مختصر سا دیباچہ بھی تحریر کیا ہے۔

اس انگریزی کتاب کے پہلے باب میں زیادہ تر سوانح حیات درج ہیں۔ دوسرا اقبال کے فلسفۂ خودی سے بحث کرتا ہے۔ تیسرے اور چوتھے باب میں اقبال کے تصورات فلسفۂ مشرق و مغرب پر نظر ڈالی گئی ہے۔ پانچواں باب اقبال کے شاعرانہ کمال کے لئے وقف ہے۔ چھٹے میں اقبال کو بحیثیت غزل گو روشناس کیا گیا ہے۔ ساتویں میں ان کی مثنویوں پر روشنی ڈالی ہے اور آخری باب میں اقبال کی انشا پردازانہ اہمیت دکھائی گئی ہے۔

مولوی عبدالواحد صاحب کو ادب کا ایک خاص ذوق حاصل ہے انھوں نے سالہا سال سے اقبال کا مطالعہ جاری رکھا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے کلام اور پیغام کو سمجھنے کی مولوی سید عبدالواحد صاحب نے بڑی مستحسن کوشش کی ہے، جس میں ان کو خاص کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

یہ کتاب انگریزی میں ہے اور میری نظر میں اس کا سب سے بڑا نقص یہی ہے۔ اس لئے کہ اردو میں اقبال کے متعلق اب تک جو متعدد کتابیں شایع ہوئی ہیں ان میں اقبال کے فلسفیانہ تصورات کو اس خوبی سے نہیں پیش کیا گیا جیسا کہ اس پیش نظر کتاب میں کیا گیا ہے۔ مناسب ہوگا اگر مولوی عبدالواحد صاحب اپنی اولین فرصت میں اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی شایع کریں گے۔

بحالت موجودہ اتنا تو یقینی ہے کہ انگریزی داں دنیا میں یہ کتاب اقبال کو صحیح طور پر سمجھنے میں بڑی سہولت فراہم کردے گی۔ اس لئے کہ اب تک انگریزی میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت ہی تشنہ اور غیر تشفی بخش ہے۔ اس کتاب میں اقبال کے اردو اور فارسی کلام کا جو ترجمہ جگہ جگہ مختلف مسائل کی وضاحت کے لئے درج کیا گیا ہے وہ بھی مقابلتاً بہت صحیح اور مناسب ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور محاورہ پر بھی اچھا عبور حاصل ہے۔

اس لحاظ سے مولوی عبدالواحد صاحب کو ہم یہ بھی مشورہ دیں گے کہ وہ آئندہ اقبال کے منتخب کلام کا ایک انگریزی ترجمہ شایع کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص یہ خدمت اس سے بہتر طریقے پر انجام نہیں دے سکتا۔

مشرقی اور مغربی حکما کے فلسفہ کے ساتھ اقبال کے تصورات کا مقابلہ کرنے میں بھی مولوی عبدالواحد صاحب نے بطور خاص کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کے لئے وسیع مطالعہ اور تحقیق و تلاش کی ضرورت تھی اور مسرت کا مقام ہے کہ مصنف نے ان تمام مراحل کو طے کرنے کے لئے صبر اور استقلال کا ثبوت دیا۔

یہ کتاب بھی لاہور کے شیخ محمد اشرف نے شایع کی ہے اور اس کی سائز بھی اقبال کی عام کتابوں کے مطابق نہیں رکھی گئی۔ توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

سیرت اقبال | پروفیسر محمد طاہر فاروقی صدر شعبۂ اردو فارسی آگرہ کالج نے ایک مختصر سی سیرت اقبال شایع کی تھی جس کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں قومی کتب خانہ لاہور کی جانب سے شایع ہوا ہے۔ یہ کتاب اقبال ہی کی کتابوں کی سائز پر (۳۶۰) صفحوں میں مجلد شایع ہوئی ہے اور اس میں مرتب نے اقبال سے متعلقہ جملہ مطبوعات سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابتدائی (۴۶) صفحات میں اقبال کے سوانح حیات لکھے گئے ہیں۔ پیش نظر کتاب کی معلومات جامع اور ترتیب زیادہ علمی ہے کتاب کے دوسرے حصے میں نہایت خوبی سے اقبال کے شاعرانہ ارتقاء پر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ تیسرے حصے میں اقبال کی ہر کتاب کی تاریخ شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ جو اصحاب اقبال کے متعلق اہم اور ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے اس سے بہتر ذخیرۂ معلومات اردو میں کوئی اور شائع نہیں ہوا۔ اس کتاب کے آخر میں ایک تبصرہ ہے جو ہماری نظر میں ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ اس میں مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ شریعت، طریقت اور سیاست کے معاملات میں اقبال نے اپنی قوم کو جو پیغام دئے ہیں ان کو مثالوں کے ساتھ واضح کیا جائے۔ ہر عنوان کے تحت ذیلی سرخیاں قائم کرکے پہلے اصل مسئلہ کی وضاحت کی گئی ہے اور پھر اس کے بارے میں اقبال کا کلام بطور شواہد شامل کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ بہت طویل ہے اور مناسب ہوتا کہ انہی مسائل کو کتاب کے دوسرے یا تیسرے حصے میں ضم کردیا جاتا ہے۔

ادارہ

شمس الامراء کے سائینسی کارنامے

(بسلسلۂ گزشتہ)

عمل کے طریقوں کو مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے مثلاً جمع کا طریق۔ تفریق کا قانون۔ ضرب کا قاعدہ اور قسمت مرکب کا قانون وغیرہ۔ اگر کسی جگہ مزید وضاحت کرنی ہو تو "تنبیہ" اور "فائدہ" کے تحت اس کی تشریح کر دی گئی ہے۔ مثالیں۔ تنبیہ

"جس عدد کو کہ دوسرے عدد میں ضرب کرتے ہیں مضروب کہتے ہیں۔ اور دوسرے عدد کو کہ جس میں ضرب کرتے ہیں مضروب فیہ کہتے ہیں اور اس عدد کو جو ضرب سے حاصل ہوتا ہے حاصل ضرب کہتے ہیں اور سیکھنے والے کو چاہیے کہ ضرب کے عمل کے حاصل کرنے کے لئے پہلے اس نقشے کو یاد رکھے"

پہلا نقشہ

۱ ـــــ ۲	۱ ـــــ ۳	۱ ـــــ ۴	۱ ـــــ ۵	۱ ـــــ ۶	اسی طرح (۱۲)
۲ ـــــ ۴	۲ ـــــ ۶	۲ ـــــ ۸	۲ ـــــ ۱۰	۲ ـــــ ۱۲	تک جدول دی
۳ ـــــ ۶	۳ ـــــ ۹	۳ ـــــ ۱۲	۳ ـــــ ۱۵	۳ ـــــ ۱۸	گئی ہے۔

اسی طرح اوپر سے نیچے کی طرف ۱۲ تک جدول ہے۔

دوسرا نقشہ

اس نقشہ میں کھڑے خانہ کے پہلے ہندسے کو آڑے خانوں کے ہندسے سے ضرب دے کر اسی ہندسے کے نیچے کے خانہ میں درج کیا گیا ہے۔

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲
۲	۴	۶	۸	۱۰	۱۲	۱۴	۱۶	۱۸	۲۰	۲۲	۲۴
۳	۶										
۴	۸										
۵	۱۰										
۶	۱۲										
۷	۱۴										
۸	۱۶										
۹	۱۸										
۱۰	۲۰										
۱۱	۲۲										
۱۲	۲۴										

فائدہ :- جس جگہ کہ مضروب فیہ میں صفر ہو حاجت اس کے

ضرب کی نہیں ہے بلکہ اس کے تلے ایک صفر حفظ مرتبے کے لئے
لکھنا کافی ہے جیساکہ اگر چاہیں کہ اس کو ۶۵۴۸۲ اس میں ۱۰۳۰
ضرب کریں اس صورت پر

۶۵۴۸۲
۱۰۳۰
———
۱۹۶۴۴۶۰
۶۵۴۸۲۰
———
۶۷۴۴۶۴۶۰

پس حاصل ضرب یہ ہوگا۔"

(اسی طرح اس رسالہ میں "حساب تحویل" کے عنوان کے تحت نقدی کا نقشہ۔
نقشۂ اوزان۔ پیمایش طولانی کا نقشہ۔ نقشہ پیمایش مربع۔ نقشہ
مکعب اور نقشہ اوقات دیئے گئے ہیں)

نقشہ نقدی میں بتایا ہے کہ :۔

۳ پائی۔ ایک پیسے کے

۴ پیسے۔ ایک آنے کے

۱۶ آنے۔ ایک روپے کے

۱۹ روپے۔ ایک اشرفی کے۔

اور نقشہ اوزان میں ۶ روپے بھر ایک چھٹانک کے

اگرچہ یہ رسالہ حیدرآباد میں چھپا ہے لیکن سکوں اور اوزان
کی شرح برطانوی سکہ اور اوزان کے لحاظ سے دی گئی ہے۔ اس سے یہ
پتہ چلتا ہے کہ اس رسالہ کی ترتیب کے وقت مرتب کے پیش نظر کوئی
انگریزی کتاب کا نسخہ ہوگا ورنہ وہ حالی سکہ اور حیدرآباد کے اوزان
استعمال کرتا۔

اس رسالہ کے ایک عنوان "نزول کا حساب" میں حسب ذیل
عبارت درج ہے۔

عددوں کے جزر کرنے کو نزول کہتے ہیں اور جزر معدد
وہ رقم ہے کہ اگر اس عدد کو اس کی ذات میں ایک یا

یا کتنا بار ضرب کریں عدد مذکور حاصل ہوتا ہے۔
چنانچہ تین نو کا جزر المال ہے اس واسطے کہ اگر
تین کو تین میں ضرب کریں نو حاصل ہوتا ہے اور
اسی قیاس پر جزر الکعب چونسٹھ کا چار ہے۔"
"تنبیہ۔ جزر کو اس صورت پر √ لکھتے ہیں اور مرتبے کا نشان اس کے
اوپر لکھتے ہیں۔"

جزر الکعب ۱۲۵ یعنی $\sqrt[3]{۱۲۵}$ = ۵ کے

جزر المال ۸۱ یعنی $\sqrt[2]{۸۱}$ = ۹ کے

جزر مال الکعب ۲۴۳ یعنی $\sqrt[5]{۲۴۳}$ = ۳ کے

"عام کسروں کی تعریف" کے عنوان کی عبارت یہاں نقل کی جاتی
ہے تاکہ اس زمانہ کی زبان اور طرز ادا کا اندازہ ہو سکے۔

"کسر ایک حصہ یا کئی حصے عدد صحیح کے ہیں اور طریق اس کے
لکھنے کا اس طرح پر ہے کہ دو رقم لکھیں ایک کو اوپر اور دوسرے کو
تلے اور دونوں کے بیچ ایک لکیر عرضی کھینچیں مثال $\frac{1}{2}$ آدھا اور
$\frac{1}{3}$ تہائی اور $\frac{3}{4}$ تین چوتھائی اور $\frac{5}{8}$ پانچ آٹھویں حصے۔ جاننا
چاہیئے کہ اوپر والے عدد کو شمار کنندہ اور تلے والے کو نسب نما کہتے
ہیں۔"

اس رسالہ میں قدیم طرز کی اردو کثرت سے استعمال کی گئی
ہے۔ مثال کے طور پر چند الفاظ لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً

جان تو	جاننا چاہئے	کی بجائے۔
خطا	غلط	" "
تلے	نیچے	" "
بدوں	بغیر	" "
باوصف	باوجود	" "
تس پیچھے	اس کے بعد	" "
حاجت	ضرورت	" "

ڈول طریقہ کی بجائے۔

بعض جملوں کی ساخت بھی قدیم اردو کا نمونہ ہے۔ مثلاً
"...مرقوم ہے وہ مثال کر کوری اس میں معنی بخشتی ہے وغیرہ"
"...جاننا چاہیے کہ اکثر جگہ "جاننا چاہیے" لکھا ہے "یعنی"
"ن" مشدد ہے اور "یہ" "کا املا" "بیے" اور "گنا" "کا گونہ۔
بعض ہندی الفاظ کو حرف ربط " و " سے ملایا ہے۔ مثلاً "سوچ
وبچار" وغیرہ۔

اس کتاب میں حساب کی جو اصطلاحیں درج ہیں ان میں سے بعض موجودہ اردو میں رائج نہیں ہیں۔ اس لئے ذیل میں ایسی بعض اصطلاحیں اصطلاح کے محاذی جدید اردو اصطلاحیں درج کی جاتی ہیں۔

قسمت ——— تقسیم
ارقام ——— اعداد
جذر المال ——— جزر
جذر مال الکعب۔ پانچواں جزر
قانون مثلثی۔ اربع کے سوالات (   )
قسمت مرکب۔ تقسیم مرکب
مال مال الکعب۔ دو کی قوت سات (۲^۷)
مال کعب الکعب۔ دو کی قوت آٹھ (۲^۸)
لوگارتم ——— لوکارتم
عرضی ——— نما جیسے ۲/۳

کتاب کے آخر میں ۱۰ صفحات پر " اعداد لوکارتم " کی جدول دی گئی ہے۔ کتاب کے بعض صفحات میں الٹ پھیر ہو گئی ہے اور صفحہ (۴۱) پر (۳۱) چھپ گیا ہے۔ صفحہ ۳۲ کے بعد صفحہ (۳۳) پر جو عبارت ہے وہ دراصل صفحہ (۴۳) کی ہے اور صفحہ (۴۳) پر جو عبارت ہے وہ صفحہ (۳۳) کی ہے۔

...... صفحہ (۴۱) کی جگہ (۳۱) صفحہ آگیا ہے اور صفحہ (۳۰) کے بعد صفحہ (۴۱) آگیا ہے حالانکہ اسی صفحہ کو (۴۱) صفحہ کی جگہ ہونا چاہیئے۔ یہ کتاب ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہے جس کا نمبر (۷۶۰) ہے۔

رفیع الحساب یہ رسالہ ۹/۵ کی تقطیع پر ۱۲۵۲ھ میں حیدرآباد دکن میں طبع ہوا تین کے صفحات (۱۷۷) ہیں (۱۱۲) صفحات پر لاگرتم کی جدول ہے۔ (۹۰) صفحات میں جیب و ماس وغیرہ لاگرتمی کی جدول دی گئی ہے اور کتاب کے آخری (۶) صفحات میں "فہرست کتاب رفیع الحساب" درج ہے۔ کتاب کے آغاز و اختتام پر کہیں بھی مطبع کا نام درج نہیں۔ اس کتاب کا رسم خط وہی ہے جو شمس الامراء کی دوسری کتابوں میں استعمال ہوا ہے اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ بھی شمس الامراء کے سنگی چھاپہ خانہ میں طبع ہوا ہو گا۔ کتاب کے آغاز میں موضوع کی توضیح اور افادیت کے بارے میں نواب محمد رفیع الدین خاں نے لکھا ہے۔

"بعد حمد و نعت کے کہتا ہے محمد رفیع الدین خاں المخاطب بہ عمدۃ الدولہ ابن امیر کبیر شمس الامراء بہادر اطال اللہ اقبالہٗ وافضالہٗ وکمالہٗ کہ یہ رسالہ ہے لاگرتم کے علم میں اور یہ علم علم حساب سے وضع ہوا ہے اور یہ علم انگریزی زبان میں تھا اس فن کی کتابوں سے اس کی معلومات کر کے اردو زبان میں لکھا اور اس کے سوائے بھی جو اس علم کو ضرور تھا داخل کرنے میں آیا اور اس کی جدول بھی دس ہزار تک لکھنے میں آئی اور یہ علم بہت نادر ہے اور ہندسوں کو ضرور اور لازم ہے کہ پہلے اس علم کا فائدہ حاصل کریں کہ تا اس سے بہت سے مسائل ہندسی اور حسابی مستخرج ہوتے ہیں اور یہ علم اکثر علم ہیئت اور جر ثقیل وغیرہ میں کام پر آتا ہے اور اس رسالے کا نام رفیع الحساب رکھا گیا اور

یہ رسالہ مرتب ہوا سن باراسی باون ہجری نبوی میں ایک مقدمہ اور سات باب کا و پر مقدمہ تعریفات عدد میں"

آخر میں لکھا ہے

" ناظرین سے امید ہے کہ اگر اس رسالے میں سہو عمل یا عبارت دیکھیں تو اس کی صلاح دینے میں دریغ نہ کریں واللہ ولی التوفیق"

اس رسالہ میں علم ریاضی کی ایک شاخ لوکارتم پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس علم کا موجد ایک مسلمان ریاضی دان الخوارزمی تھا۔ اس کے نام کی مناسبت سے اس علم کا نام خوارزم پڑگیا۔ یورپ والوں نے اس کو بگاڑ کر ( ) بنالیا۔ بعد کے ریاضی دانوں نے اس کو مختلف شکلوں میں لکھنا شروع کیا۔ لاگرتم۔ لوکارتم اور لوکارتم اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے جو کتابیں شایع ہوئی ہیں ان میں لوکارتم استعمال ہوا ہے۔ اختصار کے لئے انگریزی میں (LOG) اور اردو میں (لوک) کرلیا گیا ہے۔

مقدمہ کے علاوہ (جس میں عدد کی تعریف اور اعداد کے نام تبلائے گئے ہیں) یہ رسالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں حساب کے ابتدائی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ اس کی تین فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں جمع۔ تفریق۔ ضرب۔ تقسیم۔ جذر اور مکعب کی تعریفات اور ان کے عمل کے عام قاعدے مثالوں کے ساتھ لکھے گئے ہیں مثلاً اتا و کو احاد۔ اکو عشرات .. اکو آت ... ا کو الوف ...... اکو الوف الوف کہتے ہیں تفریق کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

" عدد اکثر سے عدد اقل کو وضع کرنا اور عدد اکثر کو منقوص منہ اور عدد اقل کو منقوص کہتے ہیں"

مثال :-

۲۰۰۹۷ منقوص منہ
۱۲۴۳ منقوص
۱۸۸۵۴ باقی

جذر کے بیان میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس جذر میں کسر باقی رہے اسے مجذور اصم کہتے ہیں اور جس جذر میں کسر باقی نہیں رہتی۔ اسے مجذور منطق کہتے ہیں۔ یہ دونوں اصطلاح اب بھی رائج ہیں۔

دوسری فصل میں کسور عام کی تعریف بیان کرنے کے بعد ان کے ناموں اور شکلوں کے متعلق معلومات درج کردی گئی ہیں۔

تیسری فصل میں نسبتوں کے اقسام اور ان کے معلوم کرنے کا قاعدہ تفصیل سے لکھا ہے۔

دوسرے باب میں کسور عشرات (کسور اعشاریہ) کے حسب ذیل قاعدوں کو بتایا گیا ہے۔

پہلا قاعدہ کسور عشرات کے جمع کرنے کا۔
دوسرا قاعدہ تفریق کسور کے بیان میں
تیسرا قاعدہ ضرب کسور کے بیان میں۔
چوتھا قاعدہ تقسیم کسور کے بیان میں۔
پانچواں قاعدہ جذر کا (اس کے تین قسم ہیں۔ ایک صحیح اور دوسری صحیح باکسر اور تیسری نقطہ کسر)
چھٹا قاعدہ کعب نکالنے کا (جذر کی طرح اس کی بھی تین اقسام ہیں)
ساتواں قاعدہ تحویل کسور کا۔

تیسرا باب لاگرتم کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ پہلی فصل میں لاگرتم کے مفہوم کو مثالوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔ یہاں اس فصل کی ایک عبارت بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے۔

"جب یہ صفت ان عددوں میں پائی گئی تب قدیم استادوں نے جو عالی فہم تھے ایک قاعدہ ایسا

نکالے کہ تا اس سے تمام اعداد کی ضرب اور تقسیم اور جذر و کعب وغیرہ حاصل ہو اور وقت عمل کے ضرب دینا اور تقسیم کرنا اور جذر و کعب نکالنے کی احتیاج نہ ہو .... اور ایک ایک عدد کا " لاگرتم " نکال کر بڑی بڑی کتب جدولوں کی لکھی ہیں کہ اس سے آسانی عاملوں کو بہت ہوتی ہے اور یہ بہت کار آتی ہیں "۔

دوسری فصل میں " لاگرتم " تیار کرنے کے دو قاعدے بتائے گئے ہیں۔ پہلا قاعدہ اس عبارت پر ختم ہوتا ہے۔

" یہ قاعدہ قدیم استادوں کا نکالا ہوا ہے اور بہت دقت رکھتا ہے۔ اسواسطے ایک استاذ حال میں علم الجبر کے مشق سے چند اعداد ایسے حاصل کئے ہیں کہ اس سے لاگرتم تمام عدد کے کم وقت سے نکلتے ہیں اور وہ بہت سہل ہے "

دوسرا قاعدہ بیان کرنے کے بعد اپنی رائے کا اس طرح اظہار کرتا ہے۔

" یہ قاعدہ بہت آسان اور عجیب ہے۔"

چوتھے باب میں " لوکارتم " کی جدول تیار کرنے کے قاعدوں کو چار فصلوں میں درج کیا گیا ہے۔ پہلی فصل میں ضرب۔ تقسیم۔ جذر اور کعب کے (۶) قاعدوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس فصل کی آخری عبارت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس سے زبان اور اسلوب کا حال معلوم ہوتا ہے۔

" اور پوشیدہ نہ رہے کہ انڈکس کے عدد میں کبھو غلطی نہیں آوے۔ کیوں واسطے کہ اس سے حفظ مراتب ہوتا ہے۔ اور اگر لاگرتم کے عدد میں احاد یا عشرات یا مآت وغیرہ میں ایک یا دو عدد کی غلطی آوے کچھ اس کی غلطی عمل میں اتنا فساد نہیں کرے گی کس واسطے کہ اصل قاعدے میں عدد کسری چھوڑ کر نکالے ہیں "

دوسری فصل میں کسر عام۔ کسور اعشاریہ۔ ضرب کسور۔ تقسیم کسور وغیرہ کے " لاگرتم " تیار کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ تیسری فصل میں جدول سے " لاگرتم " اور عدد حاصل کرنے کے ضروری قاعدے لکھے گئے ہیں۔ چوتھی فصل میں " تقبیہ عشرات لاگرتمی " کی تفصیلات درج ہیں۔

پانچواں باب جیب و مماس کی تعریف اور اس کے قاعدوں کے بیان پر مشتمل ہے جس میں علم ہندسہ کی (۴۰) اشکال بھی دی گئی ہیں تاکہ مسائل کے سمجھنے میں آسانی پیدا ہو۔

چھٹے باب میں جیب و مماس کی جدولیں تیار کرنے کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے جو علم مثلث میں بہت کام آتی ہیں۔

ساتواں باب علم مثلث کا ہے جس میں لاگرتم کی مدد سے مثلث تیار کرنے کے طریقے بتلائے گئے ہیں اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ " یہ علم مثلث بہت سے علموں میں کام پڑتا ہے اور مجہولات کے معلوم کرنے کے لئے اول معلوم ہونا تین چیز کا ضرور ہے۔ دو ضلع اور ایک زاویہ یا دو زاویہ ایک ضلع یا تینوں ضلعوں کا مقدار۔ ضرور ہے کہ اس سے تینوں زاویہ مجہول نہ نکلیں گے "۔ اس کو مختلف مثالوں اور اشکال سے سمجھایا گیا ہے۔

اس رسالہ کی زبان میں بعض ایسی خصوصیات اور ایسے الفاظ نظر آتے ہیں جو بعد میں متروک ہو گئے۔ مثال کے طور پر ان الفاظ کی مختصر فہرست یہاں لکھی جاتی ہے۔

متروک	رائج
کر کر	کر کے
کہ تا	تا کہ
اوپر	اور
کسور عشرات	کسور اعشاریہ

اس وضع سے لکھنا	اس طریقہ سے لکھنا
بعضے جا	بعض جگہ
کبھو	کبھی
میسر ہوں گے	حاصل ہوں گے
غلطی نہیں آوے	غلطی نہیں ہوتی ہے
منہا دینا	منہا کرنا
ضرور	ضروری
لیوین	لین
کسواسطے کہ	کیونکہ

بعض الفاظ کا املا بھی قدیم ہے مثلاً " وہ " کی بجائے " وو " " ساتھ " کی بجائے سات" مختلف الفاظ کی جمع جس طرح بنائی گئی ہے اس سے بھی زبان کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ الفاظ اب ہماری زبان میں مروج نہیں ہیں مثلاً " مثالات ، خطیں ، مثلثات ، علموں ، ضلعیں ، اصفار ، وغیرہ "۔ مذکر و مونث کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ کسر۔ جدول۔ مثلث اور مثال کو کہیں مذکر اور کہیں مونث لکھا ہے۔ حرف عطف " اور " کا جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ قدیم دکنی مصنفوں اور دہلی اور لکھنؤ کے ابتدائی زمانہ کے شاعروں نے جس طرح اپنے آپ کو " نے " کے استعمال کا پابند نہیں کیا اس کی کئی مثالیں اس رسالے میں بھی ملتی ہیں۔

" قدیم استادوں نے جدولیں تیار کئے ہیں ۔"

" محاسبوں نے رسالوں میں لاگرتم کی جدول دس ہزار تک یا لاکھ تک بعضے کروڑ تک لکھیں ہیں ۔"

بعض جگہ نقصان کرنا۔ وضع دینا یا کرنا۔ خبر دینا علحدہ نگاہ رکھنا۔ کار پر آنا جیسے مصادر کو ان معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن میں وہ اب مستعمل نہیں ہیں۔

(۱) کسر سے کسر کو نقصان کرنا۔ (منہا کرنا)

(۲) عدد اکثر سے عدد اقل کو وضع کرنا یا دینا۔ (تفریق کرنا)

(۳) یہ ایک عدد خبر دیتا ہے۔ (ظاہر کرتا ہے)

(۴) ایک صفر کو علحدہ نگاہ رکھنا۔ (الگ کر دینا)

(۵) یہ بہت کار پر آتی ہے۔ (کام آتی ہے)

پورے رسالہ میں دو ایک جگہ انگریزی لفظ انڈکس (INDEX) اور عربی لفظ غیر النہایت استعمال ہوئے ہیں۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ ریاضی کے پیچیدہ مسائل کو سہل اور آسان بنا دیا گیا ہے۔ اس رسالہ کا ایک مطبوعہ نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں ہے جس کا نمبر ۵۱۵/ع۔ر ہے۔

رسالہ کسورات اعشاریہ

تقطیع ½ ۴ × ½ ۶ صفحات ۵۹ طباعت ۱۲۵۳ھ مصنف کا نام کہیں بھی درج نہیں البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی شمس الامراء کی سرپرستی میں چھاپا گیا۔ چنانچہ دیباچہ سے پہلے کے صفحہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے :۔

" یہ رسالہ کسورات عاشریہ کا اردو زبان میں تعلیم طلبہ کے واسطے سنگی چھاپے خانے میں سرکار شمس الامراء بہادر امیر کبیر کے بلدہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں سنہ ۱۲۵۳ھ مطابق سنہ ۱۸۳۷ء میں مطبوع ہوا ۔"

یہ رسالہ شاگرد اور استاد کے سوال جواب کے طریقہ پر لکھا گیا ہے جو چار گفتگوؤں پر مشتمل ہے پہلی گفتگو میں کسور اعشاریہ کی تعریف اور کسور کی جمع تفریق کے قاعدے بتائے گئے ہیں۔ دوسری گفتگو میں ضرب کسور۔ تیسری میں تقسیم کسور اور چوتھی گفتگو میں جذر و کعب نکالنے کے طریقے مثالوں کے ساتھ سمجھائے گئے ہیں۔

اس رسالہ کی زبان اور جملوں کی ترکیب میں قدیم اردو کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض جگہ " غیر النہایت معرفت اور لاکن "

جیسے عربی الفاظ کا استعمال ہوا ہے کسر کی جمع الجمع "کسروں اور کسورات" بنائی گئی ہے۔ تیز کسور اعشاریہ کو کہیں "کسورات عاشریہ" اور کہیں "کسورات عشر" لکھا ہے جو اب مستعمل نہیں۔ اسی طرح مثال کی جمع مثالات لی گئی ہے۔ جمع الفاظ کے ساتھ اشارۂ قریب "ان" کی بجائے "اس" لکھا گیا ہے۔ مثلاً "اس کسورات عشر کے اعمال مانند کسور مشہور کے ہوتے ہیں۔"

بعض الفاظ کے املا میں ان کے تلفظ کا لحاظ رکھا گیا ہے مثلاً ہیاٗت (ہئیت) ہوگی (ہوگئی)۔ علاحدہ (علٰحدہ) وغیرہ لفظ "امتحان" کے ساتھ ضمیر مونث واحد غائب استعمال کی گئی ہے جیسے "اس کی امتحان کر کے دیکھو گا۔"

دیباچہ میں سہو کتابت سے "تیسری گفتگو تفریق کسور کے بیان میں" لکھا ہے۔ حالانکہ "تقسیم کسور" ہونا چاہئے۔ اس رسالے میں جو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

نقصان کرنا (تفریق کرنا) نسب نما (اعشاریہ جس کو انگریزی زبان میں انڈکس کہتے ہیں") اصمیت، مضلعات اصم، مجذور، منطق، جذر صحاح، جبلات کا نمونہ یہ ہے۔

"تلمیذ حضرت بمضلعات اصم کا کہاں کام پڑتا ہے جو اس کے واسطے اتنی دقت سے یہ علم وضع ہوا۔"

"استاد علم مثلثات اور علم جرثقیل اور علم ہیائت میں اکثر جذر و کعب وغیرہ اصم کا کام پڑتا ہے اور علم ہیائت میں درجات فلکی سے تکرار ہے اور ہر درجہ فلک کا کتنے ہزار کوس کا ہے اگر وہاں درجات کے جذر لینے میں ثلث یا خمس وغیرہ کی کسر چھوڑ دیں تو کئی کوسوں کا فرق ہوگا۔ اس واسطے اس کسورات عشر سے اتنی تخفیف کرتے ہیں کہ حقیقتاً وہاں کچھ گز آدھ گز کا فرق رہے گا۔"

ستۂ شمسیہ — شمس الامراء ثانی نے "ستہ شمسیہ" کے نام سے (۶) رسالے انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کرا کے ۸ رہ کی تقطیع پر ۱۲۵۶ھ میں اپنے نجی چھاپہ خانہ میں طبع کرائے تھے۔ ہر رسالہ کے آغاز میں ایک دیباچۂ عمومی ہے جس کا ضروری اقتباس درج ذیل ہے تاکہ ان رسائل کے موضوعوں اور ان کی افادیت کا خود مرتب کے الفاظ میں اندازہ ہو سکے۔

"بندہ نیاز مند درگاہ ایزدی کا محمد فخر الدین خان المخاطب بہ شمس الامراء اس طور پر گزارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہیں۔ بسبب میلان طبیعت کے کہ بہت اس طرف شوق رکھتا تھا۔ میری سماعت میں آئیں۔ اس جہت سے چند مسائل دل کے از بر تھے اور اگرچہ بعضے علوم فلاسفہ زبان عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں چنانچہ علم جرثقیل اور علم انظار وغیرہ مگر اس قدر نہیں ہیں کہ جیسا اب اہل فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجۂ کمال اثبات کیا ہے بلکہ بعضے علوم اہل فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کا نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا۔ چنانچہ علم آب اور ہوا اور برق اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصت قلیل میں اس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہوئے۔ چنانچہ ان دنوں میں بسبب مدعا چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بطریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے (ربوری رنٹ جائس صاحب کے انگریزی

زبان میں جو ۱۸۱۸ء میں بیچ شہر لنڈن کے چھاپے گئے تھے بہم پہنچے۔ ان میں سے رسالہ علم جرثقیل۔ علم ہیئت اور علم آب اور علم ہوا اور علم انظار کہ اس کے آخر میں مقناطیس کا رسالہ بھی شریک تھا اور علم برقک کا کہ ہر ایک ان میں سے بدرجۂ اوسط نہ بہت کم نہ بہت زیادہ لکھا ہوا تھا اور ہر چند ترجمہ ان علوم کا ہر ایک زبان میں قلمرو اہل فرنگ میں رواج پایا ہے مگر نظر کرتے فائدے ساکنان بلدہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد کے .. ..

میر امان علی دہلوی اور غلام محی الدین حیدرآبادی اور مسٹر جونس اور موسیٰ سندوسی کو جو ملازمان سرکار ہیں۔ حکم کرنے میں آیا کہ ان علوم مذکور کو زبان انگریزی سے اردو زبان میں ہمارے روبرو ترجمہ کریں چنانچہ بفضل حق سبحانہ تعالیٰ کے یہ چھ رسالے ترجمہ ہوئے مگر بعضے اسماء انگریزی اصطلاح کے جو زبان عربی اور فارسی میں نہ میسر ہوئے، ان کو اس زبان اصلی پر بحال رکھنے میں آیا اور یہ چھ رسالے جو ترجمہ کئے گئے چھ علم پر مشتمل ہیں اس واسطے نام ان کا ستہ شمسیہ رکھا گیا مناسب جان کے علم مقناطیس کو علم انظار کی جلد سے علیحدہ کر کے آخر میں جلد برقک کے شریک کیا گیا اور مادۂ تاریخ اس رسالے کا گزرانا ہوا حافظ مولوی شمس الدین فیض کا یہ ہے۔

"تالیف نواب شمس الامراء"

۱۲۵۱ھ

اب ہم ان چھ رسائل میں سے ہر ایک کی خصوصیات۔ موضوع اور زبان وغیرہ کے متعلق تفصیلی تبصرہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۔ علم جرثقیل — یہ رسالہ جملہ (۲۰۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلے اور دوسرے صفحہ پر اس کے موضوع اور غرض وغایت کی اس طرح صراحت کر دی گئی ہے۔

"اس میں ہیولا اور اس کے انقسامات بے نہایت اور کشش انجماد اور کشش ثقل اور مرکز ثقل اور کلیات حرکت اور جرثقیل کی تمام قوتوں اور شاقول کا بیان ہے"

"طلباء کے واسطے سرکار شمس الامراء بہادر امیر کبیر کے سنگی چھاپہ خانے میں شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد کے درمیان ۱۲۵۶ھ میں مطبوع ہوئی"

اس کے بعد (۳) صفحات کی فہرست ہے جو دیباچہ اور کیس گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔

اشکال جرثقیل کی فہرست متعلقہ صفحات کے حوالوں کے ساتھ (۳) صفحات میں دی گئی ہے۔ دیباچہ کے ساتھ ہی علم جرثقیل کی اصطلاحوں کی تعریفات بیان کی گئی ہیں اور "پوشیدہ نہ رہے" کی سرخی کے تحت کسور اعشاریہ نکالنے کا طریقہ سمجھایا گیا ہے۔ "پہلی گفتگو" علم جرثقیل کے مقدمہ پر مشتمل ہے جس میں ابتدائی امور کا ذکر ہے۔ مثلاً اس میں مختلف قسم کے زاویوں وغیرہ کو سمجھایا گیا ہے۔ "دوسری گفتگو" میں ہیولا اور اس کی اقسام پر بحث کی گئی ہے۔ "تیسری گفتگو" "کشش انجماد اور کشش ثقل" پر مبنی ہے۔ بقیہ پانچ سے آٹھ گفتگوؤں میں کشش انجماد اور کشش ثقل کے موضوعات کو مختلف مثالوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے اور اسی سلسلہ میں قوت حرکت کے متعلق معلومات درج کر دی گئی ہیں۔ نویں اور دسویں گفتگو میں ذکر ثقل کا بیان ہے۔ گیارہویں تا تیرہویں گفتگو میں کلیات حرکت اور ان کی تین اقسام کو مثالوں کے ذریعہ سے واضح کیا گیا ہے۔ لچکدار اور غیر لچکدار اجسام کی تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔ چودہویں گفتگو میں جرثقیل کی قوتوں کو سمجھایا گیا ہے۔ اور مندرجۂ ذیل (۶) آلات کے نام دیے گئے ہیں جن سے جرثقیل کی قوتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ (باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

جہانگیر

کردار

(۱) رانی ....

(۲) شہنشاہ اکبر ....

(۳) عبدالرحیم خانخاناں ....

(۴) شیر افگن خاں ....

(۵) نور جہاں ....

(۶) اناؤنسر ....

(نقیب۔ کنیز وغیرہ)

(جھنکار)

(آرکسٹرا کا ریکارڈ " نغمۂ استقبال " یہ ساز اجاگر رہنے کے بعد پس منظر میں اور پھر دور سے کئی نقیبوں کی آوازیں)

کئی نقیب۔ " ادب سے نگاہ روبرو۔ عالم پناہ تشریف لاتے ہیں
(تین بار) (صرف ساز)

رانی۔ ظل اللہ کی بارگاہ میں کنیز کورنش بجالانے کی سعادت حاصل کرتی ہے۔

اکبر۔ شہنشاہ اکبر کی ملکہ اور اتنا تکلف۔

رانی۔ عالم پناہ۔ آپ کو سلطنت کے کاروبار سے فرصت مل گئی۔ میرے تو بھاگ جاگ اٹھے جو آپ کے درشن ہوئے۔

اکبر۔ رانی تم ہم پر طنز کرنا چاہتی ہو۔

رانی۔ ظل اللہ بھلا یہ میری مجال ہو سکتی ہے جہاں پناہ کو میری محبت پر اعتماد ہے۔ سچ مانیں آپ۔ میری تو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ پونم کے چاند کی اس لئے قدر ہوتی ہے کہ وہ مہینے میں ایک دفعہ اپنا درشن دیتا ہے۔

اکبر۔ تو کیا چاند کو جس سے جوت ملتی ہے اس کی کوئی قدر نہیں۔

رانی۔ قدر ظل اللہ کیوں نہیں۔ وہ تو روز روشنی دیتا ہے پھر بھی اس کی قدر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ دنیا والے ایک دن اس کے بنا اپنا جیون بتا نہیں سکتے۔ جب بدلیوں کی اوٹ سے اس کی تیکھی بانکی کرنیں پڑتی ہیں تو دنیا والوں کی نظریں بدلیوں کو پارہ پارہ کر دینے کی کوشش کرتی ہیں۔ ظل اللہ آپ میرے جیون کے سوریا دیوتا ہیں۔ میری نظروں کو بدلیوں سے اسی طرح الجھا دے میں نہ رکھا کریں آپ

اکبر۔ ہم سمجھ گئے رانی۔ تم تو ناراض ہو ہم سے۔

رانی۔ ظل اللہ آپ کی یہ داسی آپ سے ناراض ہو کر خوش کہاں رہ سکتی ہے۔ میری عقیدت اور محبت کی توہین تو نہ کریں آپ

اکبر۔ رانی ہم شہنشاہ ہیں۔ شہنشاہ ہند۔ دنیا نے ہمیں اکبر اعظم کہا ہے اور اکبر اعظم یہ جانتا ہے کہ شہنشاہ کی عظمت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ خدمت خلق سے غافل نہ رہے۔ رانی کی محبت سے زیادہ خدمت خلق کا فرض شہنشاہ کو پیارا ہے۔

رانی۔ ان داتا۔ آپ شہنشاہ ہیں لیکن انسان بھی تو ہیں۔ شہنشاہی تاج و علم انسانی فطرت تو نہیں بدل دیتا۔ آپ کے سینے میں دل ہے اور یہ میں جانتی ہوں کہ اس سینے میں میری محبت ہے۔ خدمت خلق کا فرض آپ پورا کرتے ہیں لیکن میرا حق بھی تو نہ بھولیں ظل اللہ۔ آپ کو اپنے من کی پکار پر بھی تو کان دینا چاہیئے عالم پناہ۔

اکبر۔ من کی پکار...... (ہلکا قہقہہ) ہاں رانی کبھی کبھی سن لیتا ہوں۔ میرا من کیا کہتا ہے کبھی تم نے بھی سنا۔
(چڑیا کے چہچہانے کی آواز)
یہ آواز سن رہی ہو۔ ادھر دیکھو، اس طرف، باغ میں۔ اس درخت پر دیکھو وہ آزاد پرند کتنا خوش نصیب ہے۔ کاش میں بھی ایک ایسا ہی پرند ہوتا۔ کوہ و بیابان میں گزر اوقات کر لیتا نہ حال کی پرواہ ہوتی اور نہ مستقبل کی فکر۔

رانی۔ ان داتا۔ یہ بھگوان کی دین ہے وہ جسے چاہیں دیں

جیسے سپار میں نہ دیپ۔ یہ عالی شان محل یہ شان و شوکت مجھے ذرا نہیں بھاتی۔ من کا کنول مرجھا یا رہے تو معلوم ہوتا ہے کہ میرا ہرا بھرا چمن بھی آرزوؤں کا مرگھٹ ہے ـــــ پران ناتھ میں تو روز پرماتما سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ اس اندھیارے گھر میں اجالا کر دے۔

اکبر ـ رانی دنیا میں مسرت بہت کمیاب ہے۔ ہونٹوں کی لرزش کو مسکراہٹ نہیں کہتے رانی۔ یہ تو غم کو بھلانے کا ایک بہروپ ہے۔ کتنے ہی ایسے ہیں جو ہماری زندگی پر رشک کرتے ہیں۔ بیش بہا خزانہ عظیم الشان فوج اتنی بڑی سلطنت ـــــ لیکن رانی ہمارے دل کی حالت کوئی نہیں جانتا۔ ہم سے بڑھ کر اس سنسار میں کوئی مفلس نہیں۔ کوئی نہیں۔

رانی ـ اقبال مندوں کی زبان پر ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں عالم پناہ۔

اکبر ـ رانی شہنشاہ اکبر اقبال مند ہے لیکن محمد جلال الدین اکبر اقبال مند نہیں۔ وہ تو بدبخت ہے مفلس ہے جس کے مستقبل کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔

رانی ـ "امید" بڑی چیز ہے جہاں پناہ۔

اکبر ـ "ایک سنہرا خواب رانی" (ہلکا قہقہہ) جانتی ہو رانی خواب کتنا ہی رنگین کیوں نہ ہو۔ طویل ہو جائے تو بھیانک بن جاتا ہے۔

(ساز ـــــ ہلکا جھنکارا)

پیش خدمت ـ عالم پناہ۔

اکبر ـ خان اعظم کو بارہ دری میں طلب کرو۔

پیش خدمت ـ عالم پناہ خان اعظم بڑی دیر سے حاضر ہیں۔

اکبر ـ اچھا تم جاؤ۔ (رانی سے) رانی اب ہم چلتے ہیں۔

رانی ـ جہاں پناہ ایک باکمال شاعر کے لطیف خیال کی طرح تشریف لائے اور ہجراں نصیب کی نیند کی طرح تشریف لیجا رہے ہیں۔

اکبر ـ ہاں رانی اس لئے کہ خود میری پلکیں اب ایک دوسرے سے ملنے کی سکت نہیں رکھتیں۔

(ساز)

نقیبوں کی آوازیں (دور سے) ادب سے نگاہ روبرو عالم پناہ تشریف لاتے ہیں۔ (تین بار)

(ساز)

خان اعظم ـ جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو۔ آج مزاج دشمنان کچھ ناساز نظر آتا ہے۔ جبین اقبال سے فکر و تردد کے آثار ہویدا ہیں۔ جاں نثاروں کی موجودگی میں حضور کے بار خاطر کوئی بات گزرے تو وفا شعاروں کی زندگی آخر کس کام کی۔ جبین اقبال نشان کو تابندہ دیکھنے کے لئے وفاداران ازلی اپنا سر ہتھیلی میں لئے پھرتے ہیں۔

اکبر ـ خان اعظم۔ ما بدولت کو تمہاری وفاداری پر پورا پورا اعتماد ہے۔ مگر خان اعظم اس فکر و تردد کا علاج نہ شاہی خزانے کر سکتے ہیں اور نہ کسی کی جاں نثاری۔ ہم سوچتے ہیں کہ ہماری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد ہمارا نام لیوا کون ہوگا۔ ہمارے ساتھ ہی تیمور کی نسل دفن ہو جائے گی کہ نہیں۔

خان اعظم ـ ظل اللہ ذات الٰہی سے جہاں پناہ کو نا امید نہ ہونا چاہیئے۔ خالق کائنات نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

اکبر ـ خدا تمہاری زبان میں اثر دے خان اعظم (ٹھنڈی سانس کے ساتھ) خدا تمہاری زبان میں اثر دے۔

خان اعظم ـ عالم پناہ۔ اجازت ہو تو فدوی کچھ عرض کرتا ہے۔

اکبر ـ اجازت ہے۔

خان اعظم ـ جان نثار یہ جانتا ہے کہ علامہ ابوالفضل اور فیضی عامری ضعیف الاعتقادی کا مذاق اڑائیں گے۔ مگر عالم پناہ جب انسان کی تمناؤں اور امیدوں کے ڈانڈے ناامیدی سے قریب ہو جاتے ہیں تو اس کی تمناؤں کو بر لانے والی صرف ایک چیز ہوتی ہے اور وہ ہے تائید غیبی۔

اکبر ـ ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے خان اعظم۔

خان اعظم۔ جہاں پناہ۔ خدا کے محبوب بندوں سے اس معاملہ میں مدد چاہئیں۔ بزرگان دین کی دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس حیلے حضور کی مقصد براری کی صورت نکل آئے۔

اکبر۔ خان اعظم ہم جانتے ہیں کہ ہم شہنشاہ ہیں لیکن پھر بھی اپنے آپ کو بے بس سمجھتے ہیں۔ ہمیں تمہاری تجویز سے اتفاق ہے۔ اس مقصد کے لئے سب کچھ کرنے تیار ہیں ہم۔

خان اعظم۔ جہاں پناہ۔ آپ خواجۂ اجمیری سے مدد مانگیں۔ ہزاروں ان کے آستانے سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ آپ تو شہنشاہ ہیں۔

اکبر۔ خان اعظم ہم تمہارے سامنے اپنی عظمت و جلال کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ہمیں ہماری آنکھوں کا اجالا مل جائے تو ہم اجمیر تک پا پیادہ جائیں گے اور ان کی بارگاہ میں اپنے نذر گزرانے کی سعادت حاصل کریں گے۔

خان اعظم۔ عالم پناہ اگر اجازت ہو تو کچھ اور عرض کروں۔

اکبر۔ کہو خان اعظم۔ تم نے ہمارے زخموں پر پھائے رکھے ہیں۔ ما بدولت کو یقین ہے کہ تمہارا ہر مشورہ ہمارے لئے مفید ہوگا۔

خان اعظم۔ جہاں پناہ۔ فتح پور سیکری میں ایک بزرگ رہتے ہیں حضرت شیخ سلیم جو عرف عام میں شیخو بابا کہلاتے ہیں۔ عالم پناہ ان سے اس خصوص میں دعا کے لئے فرمائیں۔

اکبر۔ تم ٹھیک کہتے ہو خان اعظم۔

خان اعظم۔ مولانا نے بھی تو فرمایا ہے جہاں پناہ۔

اولیا را ہست قدرت از الٰہ
تیر رفتہ باز آرندش ز راہ

اکبر۔ ہم ضرور ان سے استدعا کریں گے خان اعظم۔ کوئی ہے (تالی کی آواز)۔

خدمتگار۔ عالم پناہ۔

اکبر۔ ایک ہاتھی پر سونے کی عماری کسوا کر فتحپور سیکری لیجاؤ۔ خلعت اور ماہی مراتب بھی ساتھ رکھو۔ حضرت شیخ سلیم کو ہمارے دربار میں پوری عزت کے ساتھ لے آؤ۔

خان اعظم۔ جہاں پناہ۔ گستاخی معاف فرمائیں۔ پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہے اور پھر وہاں سونے کی عماری اور ماہی مراتب کی کیا وقعت۔ اللہ والوں کا فقر غیور ہی ان کی دولت ہے۔

اکبر۔ سچ کہا تم نے خان اعظم۔ اللہ والوں کا فقر غیور ہی ان کی دولت ہے جو حقیقی عظمت کے مالک ہیں ان کو سونے چاندی کے ڈھیر اور دنیوی شان و شوکت مسرور نہیں کر سکتے۔ ہم خود وہاں جائیں گے۔ خان اعظم۔ ہم ان سے بھیک مانگیں گے۔ اب تم جاؤ ابوالفضل سے کہدو ہم فتحپور جائیں گے۔ لیکن شہنشاہ اکبر کی طرح نہیں بلکہ صرف جلال الدین کی طرح تم جاؤ خان اعظم۔ ہمارا سامان سفر تیار کرو۔

(صرف ساز چند لمحے)

(اس کے بعد نوبت نقارے۔ گانے کی آوازیں۔ بہر حال ایسی کیفیت پیدا کی جائے جیسے شاہی محل میں خوشی کی تقریب منائی جا رہی ہے)

اکبر۔ رانی جانتی ہو آج مجھے کتنی خوشی ہے۔

رانی۔ جہاں پناہ۔ آپ کو اندازہ ہے آپ کی اس خوشی سے میں کتنی خوش ہوں۔

اکبر۔ ہمیں پورا پورا اندازہ ہے رانی۔ ذرا غور کرو آج سے سولہ سال پیشتر پہلے یہ محل کتنا سونا تھا۔ سب کچھ ہوتے بھی کچھ نہیں تھا۔ لیکن آج۔ آج رانی ہم اپنے وارث کی سولھویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ اب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے سانسوں کے اکھڑ جانے کے بعد بھی ہماری زندگی ختم نہیں ہوگی۔ ہاں رانی ہم زندہ رہیں گے ہمیشہ زندہ۔

(صرف ساز)

اب بس ایک تمنا یہ ہے کہ ہم شیخو کی شادی کی مبارک تقریب بھی اپنے ہی ہاتھوں انجام دے لیں۔

رانی ۔ ہاں اَن داتا۔ آپ کی داسی کی بھی یہی آرزو ہے۔ میرے جیون کے سور باؤ یا چند سال پیشتر میری زندگی کتنی بے رونق تھی۔ لیکن آج مجھے کیفِ حیات حاصل ہے۔ شیخو کے وجود نے میرے جیون میں مٹھاس بھر دی ہے۔ میں نے یہ جانا کہ گویا مجھے سب کچھ مل گیا۔ میرا شیخو اس کی دولہن اور یہ ساری کائنات۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرے ہاتھ ہے۔

اکبر ۔ لیکن رانی تم شیخو کی شادی کے بارے میں کچھ سوچا بھی ہے۔ اس کی دولہن۔ ....

رانی ۔ پران ناتھ۔ شیخو کی دولہن۔ شیخو کی دولہن تو گھر ہی میں موجود ہے۔ مرزا غیاث الدین ایران کی بیٹی مہرالنساء۔ نورالدین نام رکھا گیا ہے شیخو کا۔ مہر اور نور آفتاب اور روشنی کا جوڑا۔ جوڑ نہیں معلوم ہوتا عالم پناہ۔ (دبی آواز میں) سچ پوچھئے تو سلیم کا رجحان طبع بھی اسی طرف دیکھتی ہوں۔

اکبر ۔ ہاں رانی یہ جوڑ تو اچھا ہی رہے گا لیکن ملکی مصالح اس شادی میں مانع ہیں یہ شادی سلیم کے اقتدار اور استحکام سلطنت میں کچھ مدد نہیں دے سکتی۔ تیمور کی نسل کو بامراد رکھنا ہے اسی خیال کے پیش نظر شیخو کا باپ جلال الدین اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اور پھر اس پر بھی دھیان رکھو کہ ہندوستان میں ہندو مسلم دونوں قومیں آباد ہیں۔ میں چاہتا ہوں اودے پور کی راجکماری جودھا بائی سے اس کی شادی ہو۔ اودے سنگھ کی تلوار سلیم کے استحکام سلطنت میں مدد دے گی۔

رانی ۔ مگر پران ناتھ اپنے سیاسی اندیشوں پر سلیم کی معصوم مسرتیں قربان نہ کیجئے۔ وہ مہرالنساء کو چاہتا ہے۔ جوان ہے۔ جوانی کی ترنگیں صرف سکونِ جان چاہتی ہیں۔ حیات مستقل نہیں۔

اکبر رانی۔ شیخو ابھی وہ امورِ مملکت کو نہیں سمجھ سکتا۔ ابھی وہ بچہ ہے۔ پہلے میں مہرالنساء کی شادی کا انتظام کرتا ہوں جس نے اس کے لئے بر بھی تلاش کر لیا ہے اور وہ ہے شیر افگن اس کی رگوں میں بھی ایرانی خون دوڑ رہا ہے۔ وہ بہادر اور قابل نوجوان ہے۔ مہرالنساء کا اور اس کا جوڑا اچھا ہی ثابت ہوگا۔

رانی ۔ جہاں پناہ۔ آپ سلیم کی معصوم تمناؤں کو روند رہے ہیں۔

اکبر ۔ رانی۔ سلیم اور سلطنت کا مفاد اسی کا متقاضی ہے۔

رانی ۔ (تعجب سے) پران ناتھ۔

اکبر ۔ رانی تم سلیم کو صرف اپنا بیٹا سمجھتی ہو لیکن میں اسے ہونے والا شہنشاہ بھی سمجھتا ہوں۔ تم میرے معاملات میں دخل نہ دو۔

(اداس موسیقی۔ ٹہلنے کی آواز)

سلیم ۔ (اپنے آپ) آج مہرالنساء کی شادی ہے جہاں پناہ نے سب کچھ راز ہی میں رکھا۔ انھیں ڈر تھا کہ میں ان معاملات میں دخل دوں گا۔ باپ کو اس بیٹے کی جوانی سے خوف تھا۔ مجھ سے راز، آخر کیوں۔ گر میں اس شادی میں حارج ہونا چاہتا ہوں۔ میں خود نہیں سمجھ سکتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں تو لٹ گیا۔ لٹ گیا میں تو۔

(قدموں کی آواز)

خدمت گار ۔ ادب سے نگاہ روبرو ملکہ عالم تشریف لاتی ہیں۔

رانی ۔ میرے بیٹے سلیم تم اتنے اداس ادھر دیکھو اپنی ماں کی طرف۔ اس ماں کی طرف جس نے تمھیں ہزاروں امیدوں سے پالا۔

سلیم ۔ ماتاجی میں آپ کا احترام کرتا ہوں لیکن آپ سلیم کو ایک چلتی پھرتی پرچھائیاں بنا کر اسے خوش دیکھنا چاہتی ہیں آپ چاہتی ہیں کہ میں اپنے سانسوں کے ترنم کو مرگھٹ کا راگ بنا دوں۔ نہیں۔ میں تو اس کے بغیر، ہاں ماتاجی اس کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔

رانی ۔ کس کے بغیر بیٹا۔ تمھارے یہ الفاظ ایک عظیم الشان سلطنت کے ولیعہد کے شایانِ شان نہیں تم سے بہت سی زندگیاں وابستہ ہیں میرے بیٹے۔ تم اکبر اعظم کی آنکھوں کی روشنی ہو

اور پھر ایک ذرا سی بات کے لئے اتنے بے چین۔

سلیم۔ ذرا سی بات۔ ذرا سی بات کیا اماں جی آپ نہیں سمجھ سکتیں۔
آپ نہیں سمجھیں گی۔ میرے سینے میں جذبات کا جو طوفان
اٹھ رہا ہے اس سے آپ کے اور دوسروں کے سکون کی دنیا
کیوں مضطرب ہونے لگی۔ لیکن میں تو اس پر قابو نہیں پا سکتا۔
نہیں پا سکتا ماں۔ اس وقت میں انسان ہوں۔ صرف انسان۔
آپ مجھے سلطنت مغلیہ کا تاجدار نہیں صرف بیٹا سمجھئے اماں جی۔ میرے
زخموں پر پھایا رکھئے۔

رانی۔ میرے چاند۔ اتنے ہراساں نہ ہو۔ عالم پناہ کے مد نظر تمھاری
بھلائی ہے۔ ان کا ہر کام بجا تلا ہوتا ہے وہ تمھارے سکھ
کے ساتھ ساتھ سلطنت کے استحکام کی بھی فکر کر رہے ہیں۔

سلیم۔ وہ مجھے آئندہ کی شان و شوکت کے خواب دکھا رہے ہیں
کیا وہ نہیں جانتے کہ میری حکومت میں مہرالنساء کی تدبیر شامل
ہو جاتی تو دنیا سیاست کا ایک نمونہ دیکھتی۔ راجپوتوں کی تلوار
سے زیادہ مہرالنساء کا تدبر میری سلطنت کے لئے مفید ہوتا نہیں
ماں جی ان کی ایک نہ مانوں گا۔ میں تو مہر کو بزور شمشیر حاصل
کروں گا۔

رانی۔ نہیں میرے لال یہ مناسب نہیں باپ کی نافرمانی کا خیال تمھارے
دل میں نہ آنا چاہیے انھوں نے تمھاری خاطر بڑی بڑی قربانیاں
کیں۔ کیا تم اپنے باپ کی خاطر ایک قربانی بھی نہیں کر سکتے۔

(ایک بڑا وقفہ پس منظر میں موسیقی)

اناؤنسر۔ ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے۔ یہی دنیا کا کارخانہ ہے۔ زمانے
نے پلٹا کھایا۔ شہنشاہ اکبر نے دنیا کو خیرباد کہا اور جہانگیر کے
سر عظیم الشان سلطنت کی ذمہ داریاں پڑیں۔

(درباریوں کی آوازیں)

وزیر۔ حضور کا اقبال بلند ہو۔ قطب الدین حاکم بہار نے بغاوت
کر دی اس کی سرحدیں بنگالے سے ملی ہوئی ہیں۔

جہانگیر۔ اس کا سر کچلنے کے لئے کسے بھیجا گیا۔

وزیر۔ جہاں پناہ۔ ابھی تک کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ حضور جسے
مناسب سمجھیں حکم صادر فرمائیں۔

جہانگیر۔ بدولت کے خیال میں شیر افگن کے سوا اور کوئی یہ بغاوت
فرو نہیں کر سکتا۔ اس کی تلوار کی دھاک پورے مشرقی ہند
میں بیٹھی ہوئی ہے۔ شیر افگن کے نام احکام جاری کر دو۔
ہمیں امید ہے وہ ضرور اس جنگ میں کامیاب ہوگا۔
احکام جاری کرو اور نتیجہ سے ہمیں فوراً اطلاع دو۔ اب
ہم جانا چاہتے ہیں۔

(نقیبوں کی آوازیں۔ دور سے)

"ادب سے نگاہ روبرو عالم پناہ تشریف لاتے ہیں۔"

(غمگین ساز)

مہرالنساء۔ ہاں تو پھر آپ کا شورش فرو کرنے جانا قطعی ہے
نہ جانے کیوں یہ خبر سن کر میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ آپ انکار
کر دیجئے نا میری خاطر۔

شیر افگن۔ نہیں مہر۔ یہ شہنشاہ کا حکم ہے۔ میں اس سے سرتابی نہیں
کر سکتا۔ میں شہنشاہ کا ادنیٰ خادم ہوں اور یہ میرا فرض
ہے اپنے فرض کی بجا آوری میں میری جان بھی کام آجائے
تو بھی دریغ نہیں کروں گا۔ اچھا مہر سچ بتانا اگر میں مارا
جاؤں تو کیا تم مجھے یاد کرو گی۔

مہر۔ (روتی آواز میں) خدا کے لئے ایسا فال بد منہ سے نہ
نکالئے۔ اُف اس تصور سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میں آپ کو
نہیں جانے دوں گی۔ کیا میرا آپ پر کچھ حق نہیں۔ آپ
اپنا فرض تو ادا کر رہے ہیں لیکن حق کو جو بھول رہے
ہیں۔

شیر افگن۔ آنسو۔ عورت کے آنسو۔ آنسوؤں کا یہ سیلاب۔ مہر
شاید صبر و ضبط کی بنیادوں کو ہلانے کے لئے آیا
ہے لیکن مہر یہ یاد رکھو میرا نام شیر افگن ہے۔ اگر
میں شیر کو مار سکتا ہوں تو اس خوف اور وسوسے پر

بھی قابو پا سکتا ہوں اور پھر عورت کا خوف اور وسوسہ۔ ذرا غور کرو۔ اس وقت ملک کو میری ضرورت ہے۔ پروا نہیں اگر میری جان کام آ جائے (تالی کی آواز) کوئی ہے۔

خادم ۔ جی حضور۔

شیر افگن ۔ کوچ کا سامان کرو۔

مہر ۔ آپ جا رہے ہیں لیکن میں آپ کو نہیں جانے دوں گی کم از کم تنہا تو نہیں جانے دوں گی میں بھی میدان جنگ میں ساتھ رہوں گی۔ آپ کا میرا ابدی رشتہ بندھ چکا۔ اگر آپ جنگ میں اتنی تکالیف سہہ سکتے ہیں تو میں بھی سختیاں برداشت کر سکتی ہوں۔

شیر افگن ۔ مہر۔ میرا کہا مانو۔ توپوں کی مہیب آوازیں۔ زخمیوں کی چیخ پکار میدان جنگ کی صبر آزما آوازیں تمہارے کان نہیں سن سکیں گے۔ تلواروں کی جھنکار تم میں لرزہ پیدا کر دے گی تمہارا سکون غارت ہو جائے گا۔

مہر ۔ (با وقار لہجے میں) آپ بھول رہے ہیں خان اعظم میں ایک بہادر سردار کی بیٹی اور جنگجو سپہ سالار کی بہن ہوں۔ جنگ کے ہنگامے میرے کانوں کے لئے انوکھے نہیں ہیں میں نے جنگل میں جنم لیا ہے اور میں نے بہادراں کا دودھ پیا ہے۔ میری پرورش شاہی محل میں ہوئی۔ گھوڑے کی سواری نیزہ بازی کی تعلیم مجھے آپ کے شہنشاہ سلیم کے ساتھ دی گئی۔ اگر آپ شہنشاہ کے حکم سے جان پر کھیل سکتے ہیں تو میں بھی ایک مشرقی بیوی کی حیثیت سے اپنی جان آپ پر قربان کر سکتی ہوں۔ پتنگے کو شمع روک نہیں سکتی۔

شیر افگن ۔ یہ میں جانتا ہوں مہر۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم راحت و آرام چھوڑ کر میرے ساتھ مصیبت اٹھاؤ۔

مہر ۔ اگر جنگل میں بھی آپ میرے ہمراہ ہیں تو وہ جنگل مجھے گھر سے بدرجہا آرام دہ ہو گا۔

شیر افگن ۔ تریا ہٹ کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اچھا چلو اگر تم مصر ہی ہو تو میں کیسے روک سکتا ہوں لیکن اچھا ہوتا اگر تم نہ چلتیں۔

(فوجی بیانڈ۔ جنگ کا ریکارڈ)

ملازم ۔ حضور اس جنگ میں امیر شیر افگن کو زخم کاری آیا۔

مہر ۔ میرے اندیشے رنگ لائے۔ کہاں ہیں وہ۔ مجھے ان کے خیمہ تک لے چلو۔ لے چلو مجھے جلد ان کے پاس۔

(قدموں کی آواز)

شیر افگن ۔ تم آ گئیں مہر۔ اچھا ہوا میری آنکھیں تمہارا عکس محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔ تم نہ آتیں تو شائد میری سانسیں بھی میری امید کے ساتھ ساتھ جاتی آتی رہتیں۔

مہر ۔ او خدا میں یہ کیا دیکھ رہی ہوں یہ آپ ہیں۔ میرے آقا۔ اوہ جہانگیر ظالم ہے۔ ظالم ہے۔ آپ کے شہنشاہ نے میرے گلے کی پوت بکھیر دینے کی کامیاب کوشش کی۔

شیر افگن ۔ (کمزور آواز میں) خاموش رہو مہر۔ رنج و غم میں انسان کو اتنا بے قابو نہیں ہونا چاہیئے۔ تم شہنشاہ کے خلاف ایک لفظ زبان سے نہ نکالو۔ انھوں نے مجھے قابل جان کر یہ فرض میرے تفویض کیا تھا۔ میری زندگی کی ڈور کو قسمت کی تلوار نے قطع کر دیا۔ ذرا یہ بھی تو سوچو مہر موت سے تو کوئی بچ نہیں سکتا تمھیں فخر کرنا چاہیئے کہ تمھارا شوہر اس بہادری سے جان دے رہا ہے۔ اپنے شہنشاہ کی خدمت میں اس کی آخری سانسیں صرف ہو رہی ہیں۔

مہر ۔ (روتے ہوئے) للہ۔ ایسی باتیں زبان سے نہ نکا۔ نہ نکالئے ایسی باتیں اپنی زبان سے۔

شیر افگن ۔ مہر۔ مہر یہ کیسی روشنی مجھے نظر آ رہی ہے۔ کیسے پھول۔ اچھا مہر خدا حافظ۔ ایک بات سنو۔ تم میرے بعد شہنشاہ جہانگیر

کی پناہ میں چلی جانا۔ وہ دیکھو وہ نیلی روشنی مجھے بلا رہی ہے
معلوم ہوتا ہے نور کا ایک سیلاب آگیا ہے۔ اچھا۔ خد...
خدا حافظ......(پریشان ساز کا ساز دل کی پریشانی
کے ساتھ ایک ایسی آواز جیسے کسی ساز کا تار ٹوٹ گیا۔)

مہر۔ (روتے ہوئے) میرے ارمانوں کا آفتاب غروب ہوگیا
اوہ۔ قسمت کتنی ظالم ہے۔ اس نے مجھے خوشی کی موہوم
جھلک دکھا کر غم کی انتہائی گہرائیوں میں ڈھکیل دیا۔ اُف
میرا مستقبل —— میرا مستقبل۔ کیا بھیانک۔ بیوہ۔
ہندوستانی بیوہ سماج کی ٹھکرائی ہوئی —— میری زندگی
اب کس کام کی ہے۔ کس کام کی ہے میری موسیقی۔
(اداس موسیقی۔ یکایک خوشگوار موسیقی میں بدل جائے)

وزیر۔ حضور کے اقبال سے باغیوں کا قلع قمع کر دیا گیا لیکن
امیر وفادار شیر افگن اس جنگ میں کام آئے۔

جہانگیر۔ ہمیں افسوس ہے بہادر شیر افگن اس جنگ میں کام
آئے۔ وہ جاں نثاروں میں تھے۔ ان کا خاندان شاہی محل
کے زیر سایہ پھلا پھولا تھا۔ اچھا تم لوگ جاؤ ہمیں تنہا چھوڑ دو۔

جہانگیر۔ (اپنے آپ سے) آہ مہر۔ ہم نے تم پر ظلم کیا تمہاری
خوشیوں کے چمن کو ویران کر دیا۔ کاش ہم اس کا ازالہ کر سکتے۔ سلیم
بادشاہ ہوا تھا۔ سلیم کا فرض تھا کہ مہر النساء یعنی اپنے بچپن کی
ساتھی کی مسرتوں میں اضافہ کرتا لیکن اس نے امیدیں خاک
میں ملا دیں۔ قدرت کے کھیل لیکن ہمارا کیا قصور ہے۔ ہماری
نظروں میں مہر کے شوہر کی وقعت تھی۔ اس لئے ہم نے اسے
اس خدمت پر مامور کیا۔ دنیا کیا کہے گی۔ آنے والی نسلیں
کیا کہیں گی۔ جہانگیر ظالم تھا۔ جس نے عمداً اپنی راہ کا کانٹا
نکالا۔ خداوند مہر کو صبر کی توفیق دے۔

کنیز۔ جہاں پناہ ملکۂ عالم یاد فرماتی ہیں

جہانگیر۔ کہو ہم آرہے ہیں۔
(نقیبوں کی آوازیں) "ادب سے نگاہ روبرو"

رانی۔ میرے بیٹے تم بادشاہ بن کر اپنے بچپن کی رفیق کو بھول گئے۔
مہر النساء کا سہاگ اجڑ گیا۔ تم نے اسے پرسہ بھی نہ دیا۔

سلیم۔ اماں جان میں کس صورت سے اسے تسکین دوں۔ میں نے
ہی اس کا سہاگ برباد کیا ہے۔ میں قصوروار ہوں۔

رانی۔ نہیں سلیم ایسا نہ کہو۔ تم بادشاہ ہو کروڑوں انسانوں کی
جان اور مال کے مالک۔ تم نے جان بوجھ کر یہ غلطی نہیں کی۔
فرض کی انجام دہی میں اس کا خون ہوا ہے۔ میں شیر افگن کی
بیوہ کو اپنی مصاحب بنانا چاہتی ہوں۔ اس طریقہ سے اس کا
غم غلط ہو جائے گا۔ (عورت کی تالی کی آواز) کوئی ہے
جاؤ مہر النساء کو ہمارے حضور میں حاضر کرو۔ (قدموں کی آواز)
بیٹا اب تم شہنشاہ ہو۔ اپنے وفادار کی بیوہ کی حیثیت سے
مہر النساء کی دلجوئی تمہارا فرض ہے۔ (قدموں کی آواز)
مہر آؤ بیٹی۔ جیتی رہو۔

مہر النساء۔ ملکۂ عالم آپ متاثر نہ ہوں۔ تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا
ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ فرض کی ادائی میں جان بحق ہوئے۔

رانی۔ مہر النساء تم بچپن سے شاہی محل میں پلی ہو۔ میں چاہتی ہوں
اب تم اپنی زندگی شاہی محل ہی میں گزارو۔

مہر النساء۔ ملکۂ عالم کا حکم سر آنکھوں پر۔
(نقیبوں کی آوازیں) ادب سے نگاہ روبرو شہنشاہ جہانگیر
تشریف لاتے ہیں۔

(ساز)

رانی۔ دیکھو تمہیں پرسہ دینے آرہا ہے کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے
اس کا دل دکھے۔ اب وہ ہندوستان کا شہنشاہ ہے لیکن
میری نظر میں اب بھی وہ وہی نازو نخرے والا حساس سلیم ہے
جتنا بچپن میں تھا۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔
(سلیم کے آنے کی آواز)

مہر النساء۔ شیر افگن کی بیوہ شہنشاہ جہانگیر کے حضور میں کورنش
بجا لاتی ہے۔

سلیم۔ کون مہر۔ تم اس لباس میں!

مہر۔ جہاں پناہ کو شائد معلوم نہیں کہ مہر بیوہ ہے اور بیوائیں

ایسا ہی لباس پہنتی ہیں۔

سلیم ۔ مابدولت کو ایسے لایق بہادر سردار کی موت کا افسوس ہے ہم اس کی تلافی کرسکتے ہیں۔

مہر ۔ خدا حضور کا اقبال بلند کرے۔ میں بنگال واپس جانا چاہتی ہوں تاکہ اپنی بقیہ زندگی اپنے مرحوم شوہر کی یاد میں گزاردوں۔

سلیم ۔ نہیں مہر یہ نہیں ہوسکتا۔ تم شاہی محل میں آرام سے رہو۔ تمہاری ادنیٰ سی خواہش کی تکمیل خود شہنشاہ جہانگیر کرے گا۔ سلیم ہر وہ کام انجام دینے تیار ہے جو مہرو کو خوش کرسکے!

مہر ۔ سب کچھ جل جانے کے بعد بجھانے کی کوشش بے سود ہے جہاں پناہ۔ آپ نے میری مسرتوں کی دنیا اجاڑ دی۔ ایک مشرقی عورت کی خوشیوں کا سرمایہ اس کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں شاہی محل کی راحت و آرام کی زندگی میرے زخم مندمل کردے گی۔ شاہی محل کے آداب یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ پہلے گستاخی کی معافی چاہوں۔ لیکن یہ عرض کروں گی کہ آپ نے عورت کی فطرت کا اندازہ کرنے میں غلطی فرمائی ہے۔

سلیم ۔ شیرافگن کی معزز بیگم۔ کیا تم ہمیں معاف کرسکتی ہو۔ ایک شہنشاہ کی حیثیت سے ہم اپنا فرض بجالانے پر مجبور تھے ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری فرض شناسی نے تم پر ظلم کیا ہے۔ ہمارا فرض اس کام کے غمناک انجام سے بے خبر تھا۔ تمہارے وفادارانہ جذبات قابلِ قدر ہیں۔

مہر ۔ میرے وفادارانہ جذبات! انہیں جہاں پناہ، ہر عورت کے جذبات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہی فرق ہے۔ مرد اور عورت کا۔ مرد کی محبت بجلی کی چمک کے مانند ہے جو جگہ جگہ چمکتی ہے۔ عورت کی محبت کٹیا کا دیا ہے جو ایک ہی گوشہ میں آہستہ آہستہ جلتا رہتا ہے: بجلی کی چمک چشم زدن میں غائب ہوجاتی ہے۔ جہاں پناہ آپ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔

(ساز)

نقیبوں کی آوازیں ـــــــ

(موسیقی۔ چہل پہل کی آواز)

رانی ۔ شکر ہے کہ مہرالنسا، عقد ثانی پر رضامند ہوگئی۔ سلیم کی زندگی کی جوت تیز ہوگئی۔ اب اس کی زندگی میں خلا نہیں رہے گا۔ جاؤ کنیزو جاؤ سارا محل آراستہ کرو۔ اس شادی کا انتظام میں اپنے ہاتھوں کرونگی۔

(خوشی کا ساز)

سلیم ۔ میری زندگی تاریک تھی۔ مگر اب وہ روشن ہوگئی ہے۔ ہمارا ملاپ اس طرح ہونا تھا۔ اب میری حکومت کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ جہانگیر کے تدبر کے ساتھ مہرو یعنی نورجہاں کی فراست کا سنگم تاریخ ہند کا ایک دلچسپ باب ہوگا۔
سلیم۔ نورِ محل ------- نہیں ....
"نورجہاں"!

مہر ۔ سلیم ....

(نفیری نقارہ وغیرہ)

(جھنکارا)

(دکن ریڈیو سے نشر ہوا)

رفیعہ سلطانہ

ادارے کی خبریں

مرکز مومن آباد ۲۵؍ اردی بہشت کو رات کے ساڑھے نو بجے براہ اسٹیشن پرلی مومن آباد پہونچا۔ بس اسٹانڈ پر مولوی غلام حسین صاحب ایجوکیشنل جمعدار، مولوی فدا محمد صاحب دفعدار اور مولوی عبد الرشید صاحب دفعدار مجھے لینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ رجمنٹ کی لاری میں ان کے ہمراہ کنٹونمنٹ پہونچا۔ میرے قیام و طعام کا انتظام انڈین آفیسرس میس میں کرایا گیا تھا۔

۲۶؍ اردی بہشت کو ساڑھے نو بجے امتحان گاہ پہونچا۔ انتظام اچھا تھا۔ امیدواروں کی نشستیں اصولی طریقہ پر جمائی گئیں تھیں۔ آغاز امتحان کے بعد وہاں کے افسر اعلیٰ بغرض معائنہ تشریف فرما ہوئے۔ امتحان ہال اور امیدواروں کا معائنہ فرما کر اظہار خوشنودی فرمایا۔ مولوی غلام حسین صاحب نے نگرانی امتحان کے فرائض نہایت اچھی طرح انجام دیے۔ مولوی ذکی الدین صاحب صدیقی لفٹننٹ نے بعد امتحان چائے پر مدعو فرمایا۔

پرلی کے مخلص کارکن معتمد ادارہ طلبہ مولوی سعید الدین صاحب پرلی سے بمقام مومن آباد کنٹونمنٹ (خاص طور پر صدر نگران کار کی ملاقات کے لئے) تشریف لائے۔ مجھ سے ملاقات کی اور ارشاد فرمایا کہ پرلی کا کتب خانہ اور وہاں کا ادارہ کو دیکھ کر حیدرآباد جاؤں۔ چنانچہ ان کے ہمراہ بذریعہ موٹر بس ساڑھے آٹھ بجے پرلی پہونچا۔ ادارہ کا کمرہ اور کتب خانہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ مولوی سعید الدین صاحب معتمد ادارہ طلبہ اور مولوی شیخ وزیر صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ و معتمد ادارہ کی انتہائی دلچسپی و ایثار و علم دوستی ہر طرح قابل ستایش و مبارک باد ہے۔ جس کی وجہ سے ادارہ خوب ترقی کر رہا ہے اور یقین ہے کہ آئندہ یہ ادارہ دوسرے اضلاع سے بڑھ جائے گا۔ بلا شبہ ان حضرات کا وجود ادارہ ادبیات اردو پرلی کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ میں مولوی سعید الدین صاحب کے خلوص اور تکلیف فرمائی کا مشکور ہوں۔

ظہیر الدین

مرکز نظام آباد ۲۴؍ اردی بہشت کو رات پونے دس ساعت شب نظام آباد پہونچا۔ اسٹیشن پر مولوی محمد حسین خاں صاحب معتمد مقامی موجود تھے۔ اور فرمایا کہ "ڈاک بنگلے عہدہ داروں کیلئے محفوظ کر لئے گئے ہیں کل صبح خالی ہو جائیں گے۔ میرے مکان پر قیام فرمائیے اور کل ڈاک بنگلہ پر منتقل ہو جائیے"۔ دوسرے روز ڈاک بنگلہ میں منتقل ہو گیا۔ اور اسی روز سنٹر کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ عمارت مدرسہ فوقانیہ بوجہ ٹورنمنٹ مقامی حاصل نہ ہو سکی۔ اس میں باہر کے کھلاڑیوں کا قیام ہے۔ مرکزی مدرسہ تحتانیہ میں امتحان کا انتظام کیا گیا۔ مولوی غلام احمد صاحب وکیل کے ہمراہ امتحان گاہ کا معائنہ کیا۔ اور ضروری ہدایتیں دی گئیں۔ ہال ٹکٹ پر سابقہ پتہ تحریر تھا۔ معتمد صاحب نے فوراً ذریعہ چپراسی تبدیل مقام سنٹر کی اطلاع امیدواروں کو کرا دی۔ میری رائے میں آئندہ سے امتحان گاہ کے لئے ہال ٹکٹ تقسیم ہونے کے پہلے مقام کی اجازت حاصل کر لی جائے تو سہولت ہوگی۔ ورنہ عین وقت پر دقت کا سامنا ہوتا ہے۔

۲۸؍ پنجشنبہ کو ساڑھے نو بجے صبح امتحان گاہ پہونچا۔ یہاں انتظامات ہو چکے تھے۔ بعد ٹھیک گیارہ ساعت صبح پرچہ جات تقسیم کر دیے گئے۔ شعبہ اناث میں محترمہ بیگم صاحبہ مسٹر طاہر سیول سرجن نظام آباد کی نگرانی میں پرچہ جات روانہ کئے گئے۔ ہر دو جگہ ٹھیک ڈیڑھ بجے جوابی بیاضیں حاصل کر لی گئیں۔ اور دوپہر میں بھی زبانی امتحان ہر دو جگہ شروع کرا دیا گیا۔ اور تقریباً چار بجے تک جملہ تکمیل کر دیا گیا۔ جوابی بیاضوں کو مولوی غلام احمد صاحب وکیل و معتمد صاحب ادارہ کے مواجہ میں محفوظ کی جا کر مہر ثبت کرائی گئی اور ہر دو اصحاب کے دستخط بھی لفافہ پر لے لئے گئے۔

امتحان شروع ہونے کے قبل مسٹر طاہر سیول سرجن نظام آباد نے از راہ ہمدردی امتحان گاہ کا معائنہ فرمایا۔ اور مولوی غلام احمد صاحب نے موصوف سے میرا تعارف کرایا۔ ختم امتحان تک حسب ذیل اصحاب نے میری مدد فرمائی جو قابل تشکر ہے۔

(۱) مولوی غلام احمد صاحب وکیل (۲) مولوی جمیل الرحمن صاحب منتظم دار الاقامہ انجمن اسلامیہ نظام آباد۔ (۳) مولوی سید شریف صاحب ترمذی پیش نماز جامعہ مسجد (۴) ماسٹر وی۔ راجیا صاحب مددگار مدرس مدرسہ تحتانیہ قلعہ (۵) مولوی شیخ حسین صاحب مدرس تھانہ کلاں۔

ب۔ شعبہ اناث میں محترمہ بیگم صاحبہ سیول سرجن اور محترمی بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسواں وسطانیہ نظام آباد اور رحیم النساء بیگم صاحبہ مددگار معلمہ مدرسہ وسطانیہ نے بہت ہی خلوص و ہمدردی سے میری مدد

فرمائی۔ معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ سیول سرجن بلاناغہ کئی وقت مقررہ
پر امتحان گاہ تشریف لاتی تھیں۔ اور تقریباً ختم امتحان تک موصوفہ
موجود رہیں۔ موصوفہ کا یہ ایثار قابل قدر اور لائق تشکر ہے۔ محترمی بیگم
صاحبہ اور رحیم النساء بیگم صاحبہ کا بھی میں بہت ممنون ہوں کہ ہر دو خواتین
نے اپنے لازمی کے لیے علاوہ صاحب سیول سرجن کی مدد فرماکر کام کو ختم کرایا۔

ص۳۔ خصوصاً مولوی محمد حسین خاں صاحب معتمد کی کارگزاری
اور انکے سلیقے قابل قدر ہے۔ موصوف کا ایثار عمل اور ہمدردی دوسروں
کے لئے قابل تقلید ہے موصوف کیساتھ اگر میں مسٹر ویرراجنا صاحب مددگار
کا ذکر نہ کروں تو ایک فاش غلطی ہوگی۔ مسٹر موصوف نے بھی معتمد صاحب
کیساتھ رہکر امتحان گاہ میں بروقت میری مدد فرمائی۔ اور ختم امتحان
تک رہے اور خاص تشکر کے قابل ہیں۔ اس کے علاوہ میری رپورٹ نامکمل
رہ جائے گی جب تک میں مولوی غلام احمد صاحب وکیل کا تفصیل سے
ذکر نہ کروں۔ موصوف نے شروع امتحان سے آخر تک موجود رہکر میرا ہاتھ
بٹایا اور اپنے قیمتی مشورہ سے مستفید فرمایا۔ اگر ایسے چند مخلص اصحاب
ادارہ کے لیے میسر ہو جائیں تو ادارہ کے لئے آئندہ ترقی و تبلیغ میں
چار چاند لگ جائیں گے۔

ص۴۔ (۲۵) امیدوار (ذکور) اور (۱۹) امیدوار (اناث)
نے امتحان میں شرکت کی میرے قیام دوروزہ ڈاک بنگلہ کا انتظام معتمد
صاحب نے فرمایا۔ بہرحال میں اپنی رپورٹ ختم کرتے ہوئے ارباب ادارہ ادبیات
اردو کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس وقت مجھے خدمت کا موقع عطا فرمایا گیا اور
آئندہ بھی ضرورت ہو تو حاضر ہوں

غلام صمدانی

مرکز ہنگولی

پنجشنبہ ۲۶ ردے سنہ ۵۴ ف صبح پونے دس بجے
معتمد صاحب ادارہ ادبیات اردو کے ہمراہ
امتحان گاہ کو روانہ ہوا۔ امتحان کا انتظام مدرسہ تحتانیہ مرکزی صدر بازار
ہنگولی میں کیا گیا تھا جو امتحان کے لئے ہر طرح موزوں تھا۔ ایک بڑے
ہال میں امیدواروں کی نشست کا انتظام تھا۔ اور دوسرے ہال
میں جو اسی مدرسہ سے ملحق ہے امیدواران اناث کی نشست کا انتظام
کیا گیا تھا۔ کمرہ امتحان ذکور میں مولوی محمد عبداللہ صاحب مدرس مدرسہ
فوقانیہ ہنگولی و مولوی مرزا احمد بیگ صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ مرکزی
ہنگولی اور محمد اسمٰعیل صاحب مشاق نگرانی فرما رہے تھے۔ دوسرے ہال میں
قمر النساء بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسواں اردو ہنگولی اور ان کی مددگار
صاحبہ نگرانی فرمارہی تھیں۔ مولوی شیخ محبوب صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ
نرسی، معتمد صاحب ادارہ اور شریک معتمد صاحب نے زبانی امتحانات
میں مدد دی۔

امتحان مقررہ وقت پر شروع ہو کر مقررہ وقت پر ختم ہوا۔
امیدواران ذکور میں ۲۳ میں سے ۲۲ حاضر اور اناث میں ۲۲ میں
سے ۱۴ حاضر تھے۔

مولوی نجم الدین صاحب انصاری دوم تعلقدار ڈویژن ہنگولی
ادارہ کے صدر تھے لیکن صاحب موصوف کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تبادلہ کے بعد
کوئی صاحب صدر مقرر نہیں کئے گئے۔ مولوی عبداللہ صاحب اور مولوی
مرزا احمد بیگ صاحب اپنا اپنا مفوضہ کام انجام دے رہے ہیں۔ مقامی
ہنگولی اور خصوصاً نوجوانوں کو تعلیم سے خاص شغف ہے اور ادارہ ادبیات
اردو کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ امیدوار ذکور میں تقریباً
نصف تعداد اہل ہنود پر مشتمل ہے۔ طبقہ اناث بھی امتحانات ادارہ
ادبیات اردو میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ اور وہ خواتین مستحق شکریہ ہیں
جو اس طبقہ کو امتحان کے لئے تیار کرتی ہیں اور انھیں تعلیم دیتی ہیں

مولوی غلام دستگیر صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ پان کنیہ گاؤں
مستحق شکریہ ہیں کہ صاحب موصوف نے اپنے مستقر سے سات امیدوار بعد
تیاری شریک امتحان کروائے۔ معتمد صاحب، شریک معتمد صاحب، صدر معلمہ
صاحبہ و مددگار صاحبہ کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے امتحانات
کے سلسلہ میں میری مدد فرمائی۔

شریک معتمد صاحب مزید شکریہ کے مستحق ہیں کہ صاحب موصوف نے
طعام کا انتظام فرمایا اور اسٹیشن تک آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

منجانب ادارہ ادبیات اردو ہنگولی ۲۶ ردے کو شام میں
دس بجے بمکان مولوی محمود علی صاحب یزدانی مددگار مدرسہ فوقانیہ
ہنگولی بصدارت عالی جناب دوم تعلقدار صاحب ڈویژن ہنگولی
مشاعرہ غیر طرحی منعقد کیا گیا۔ مقامی شعراء نے اپنا اپنا کلام سنا کر حاضرین
کو محظوظ فرمایا۔ دو گھنٹے کے بعد یہ علمی مجلس برخاست ہوئی!

محمد حسین

مرکز بمبئی

اردو کے بہی خواہوں کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ ادارۂ ادبیات اردو نے اردو امتحانات کا سلسلہ قائم کرکے اہل ملک کو پڑھا لکھا بنانے اور ان کے ذوق ادب کی آبیاری کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ یہ امتحانات نہ صرف ریاست کے اضلاع اور دیہات میں مقبول ہوئے بلکہ ریاست کے باہر کے بہی خواہان اردو بھی ان امتحانات کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کرکے ان کی ترویج و اشاعت میں سرگرم ہیں۔ چنانچہ اب تک بمبئی میں یہ امتحانات تین دفعہ منعقد ہو چکے ہیں اور ہر دفعہ وہاں کے باشندوں کی ایک کافی تعداد نے ان میں شرکت کرکے کامیابی حاصل کی۔ شہر بمبئی کے چند خاموش مخلص اصحاب کار اردو امتحانات کی تعلیم اور مرکز قائم کرکے اردو زبان و ادب کی مخلص خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کا یہ جذبۂ خدمت گزاری اور اردو دوستی دوسرے مقامات کے بہی خواہان اردو کے لئے قابل تقلید ہے۔ بالخصوص مولوی عبدالرزاق صاحب قریشی بانی مرکز اردو امتحانات کا ایثار، جوش عمل اور بے ریا خدمات کا اعتراف کرنا میرا اولین فریضہ ہے۔ صاحب موصوف نے شہر بمبئی میں وہ کام کیا ہے جو ان لوگوں سے بھی نہ ہوسکا جن کو اردو زبان کی خدمت گزاری کا بڑا دعویٰ ہے۔ اگر ہر شہر میں ان جیسے چند نوجوان پیدا ہو جائیں تو اردو کی ترقی کے راستے میں بڑی سے بڑی طاقت بھی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔

گزشتہ دو امتحانات کے موقعوں پر ادارہ کی طرف سے مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے اور مولوی معین الدین صاحب ایم ایس سی بہ حیثیت صدر نگران تشریف لے گئے تھے۔ اس دفعہ قریشی صاحب نے مجھے بہ حیثیت صدر نگران آنے کے لئے لکھا اور اس انداز سے لکھا کہ مجھ سے انکار نہ بن پڑا۔ قریشی صاحب کے حکم کی تعمیل میں امتحان سے ایک روز قبل بمبئی پہنچا۔ اسٹیشن پر قریشی صاحب اور مولوی انصار علی صاحب نے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے ساتھ انجمن اسلام لے گئے جہاں میرے قیام و طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔ مولوی سید نور الدین صاحب سپرنٹنڈنٹ انجمن اسلام سے میرا تعارف کرایا گیا۔ صاحب موصوف حیدرآباد کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت خلیق و سنجیدہ نوجوان ہیں۔ قوم کی خدمت کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے اور اپنی زندگی انجمن اسلام کے طلبہ کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما کے لئے وقف کر دی ہے۔ دوپہر کا کھانا آپ ہی کے ساتھ ہوا اور ادارہ کے کاموں سے متعلق گفتگو رہی۔

دوسرے دن امتحان تھا۔ نشستوں کا انتظام انجمن اسلام ہائی اسکول میں کیا گیا تھا۔ میں وقت سے آدھ گھنٹہ قبل امتحان گاہ پہنچ گیا۔ نشستوں کا انتظام دو کمروں میں کیا گیا تھا۔ میں نے ٹھیک ۱۱ بجے پہلا پرچہ امیدواروں میں تقسیم کیا۔ امتحان گاہ کی نگرانی میں مولوی عبدالرزاق صاحب قریشی، مولوی انصار علی صاحب بی اے، بی ٹی مدرس انجمن اسلام، مولوی شہاب الدین صاحب دسنوی بی ایس سی بی ٹی سکریٹری صابو صدیق انسٹیٹیوٹ، مولوی تاج الدین دلوی صاحب جائنٹ سپرنٹنڈنٹ ایڈلٹ ایجوکیشن بمبئی نے میری مدد فرمائی۔

جملہ (۶۲) امیدواروں میں سے (۵۸) حاضر تھے۔ ان امیدواروں میں (۱۲) خواتین تھیں جن میں ایک پارسی اور بقیہ ہندو تھیں۔ شرکائے امتحان میں زیادہ تعداد ان پڑھ نوجوانوں اور بڑی عمر والوں کی تھی۔ بعض کی عمریں تو پچاس سے بھی متجاوز تھیں۔ کوئی کم عمر لڑکا شریک نہ تھا۔ یہ معلوم کرکے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تقریباً سب امیدواروں نے پہلی دفعہ اردو لکھنا پڑھنا سیکھا ہے اور شہر بمبئی میں صحیح معنوں میں تعلیم بالغان کا کام انجام دیا گیا ہے۔ ٹھیک ۱½ بجے امیدواروں سے جوابی کیفیتیں لے لی گئیں اور ان کو سربمہر لفافہ میں بند کر دیا گیا۔

زبانی امتحان ٹھیک ۲½ بجے سے شروع ہوکر ۶ بجے ختم ہوا۔ سہولت کار اور وقت کی تنگی کے پیش نظر مولوی شہاب الدین صاحب دسنوی اور مولوی انصار علی صاحب کو زبانی امتحان لینے میں اپنے ساتھ شریک کر لیا اور ہم تینوں نے ہر امیدوار کا امتحان لیا۔ زبانی امتحان سے یہ پتہ چلا کہ خواتین نے بڑے شوق سے اردو سیکھی ہے اور بے تکلفی کے ساتھ اردو بول سکتی ہیں۔ امیدواران ذکور میں غیر مسلم امیدواروں نے بھی کافی محنت کرکے اردو سیکھی ہے۔

شہر بمبئی میں اردو امتحانات کے کام کا آغاز جناب قریشی صاحب نے کیا تھا اور اب یہ کام انھوں نے انجمن اسلام کے سپرد کر دیا ہے۔ انجمن کی سرپرستی اور نگرانی میں یہ کام باضابطہ طور پر انجام پا رہا ہے۔ مولوی اسمٰعیل مصوری صاحب اسسٹنٹ سکریٹری انجمن اسلام بطور خاص اردو امتحانات کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ روزانہ پابندی

کے ساتھ اردو کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ مختلف اردو نواز اصحاب شام میں تعلیم دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس کام کو اور وسیع پیمانہ پر کیا جائے تو بہترین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور بمبئی جیسے بڑے اور آباد شہر میں تعلیم بالغاں کے بیسیوں مدارس قائم کئے جا سکتے ہیں اور ہر مدرسہ سے سیکڑوں کی تعداد میں اردو امتحانات کے لئے امیدوار فراہم ہو سکتے ہیں۔ امتحان گاہ کی نگرانی کے ضمن میں بعض امور میرے پیش نظر آئے اور غالباً ہر مرکز میں یہی صورت پیش آتی ہوگی اس لئے بانیان مرکز اگر اس طرف ذرا سی توجہ فرمائیں تو یہ مشکلات آسانی سے حل ہو سکتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ امیدوار سوال کو سمجھنے اور جوابات لکھنے کے طریقے سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اسلئے تعلیم دینے والے اصحاب کو چاہیے کہ امیدواروں کو سوالات کے سمجھنے اور جوابات کے طریقے سے واقف کرایا جائے۔ اس کیلئے یہ ہو سکتا ہے کہ کم از کم ہر ماہ آزمائشی امتحان لیا جائے اور امیدواروں کو ان کی غلطیوں سے واقف کرایا جائے۔ اساتذہ تختۂ سیاہ (Black Board) پر ہر سوال لکھ کر اس کا جواب لکھیں تاکہ جواب دینے کا انداز امیدواروں کے ذہن نشین ہو سکے۔ نیز ان سے زبانی امتحان کی بھی مشق کرائی جائے۔ امیدواروں کو روشنائی اور نب کے قلم سے لکھنے کا عادی بنانا بھی بہت ضروری ہے۔

امتحان کے دوسرے دن شام کے ۵½ بجے جناب قریشی صاحب نے چند علم دوست اصحاب کو انجمن اسلام میں تعارفی ملاقات کیلئے مدعو کیا تھا تاکہ اردو امتحانات سے متعلق تبادلۂ خیال ہو سکے۔ ان میں قابل ذکر حسب ذیل اصحاب ہیں۔ جناب شہاب الدین صاحب دسنوی، مولنا مہر محمد خاں صاحب شہاب مالیر کوٹلوی، جناب اسمٰعیل معروفی صاحب، جناب سبط حسن صاحب معتمد شاخ انجمن ترقی اردو بمبئی، جناب تصدق حسین صاحب پرنسپل اینگلو اردو ہائی اسکول، جناب انصار علی صاحب خلیفہ ضیاء الدین صاحب پرنسپل انجمن اسلام آگ بوٹ والا ہائی اسکول، جناب محمد عمر صاحب جامعی، جناب سلامت علی صاحب، جناب ابو الحسن صاحب بلگرامی اور مولوی عبد الحلیم صاحب۔

جناب دسنوی صاحب نے تعلیم بالغاں اور نصاب کے متعلق مختصر مگر پر از معلومات تقریر فرمائی۔ جناب سبط حسن صاحب نے بھی اردو تعلیم سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور وعدہ کیا کہ شاخ انجمن ترقی اردو کی طرف سے بالغوں کی تعلیم کا انتظام کر کے ان امیدواروں کو اردو امتحانات میں شریک کرایا جائے گا۔ میری اس تحریک پر قریشی صاحب نے بمبئی میں انجمن اسلام کے تحت ایک مجلس اردو امتحانات قائم کرنے کی تائید فرمائی۔ میں نے اردو امتحانات سے متعلق تفصیلی معلومات سے حاضرین کو واقف کرایا اور یہ بتایا کہ ادارۂ ادبیات اردو نہ صرف امتحانات لیتا ہے بلکہ امتحان کامیاب کرنے والے بالغوں کے لئے غیر نصابی کتابوں کی ترتیب اور تالیف کا کام بھی انجام دے رہا ہے۔ جناب سبط حسن صاحب نے فرمایا کہ اردو کی قدیم کتابوں کو آسان زبان میں منتقل کیا جائے تاکہ امتحان کامیاب کرنے کے بعد بالغوں کو اردو کی کلاسیکل کتابوں سے واقفیت حاصل ہو۔ غرض یہ پرلطف علمی صحبت دو گھنٹے کے بعد برخاست ہوئی۔

میں نے اپنے قیام بمبئی کے دوران میں ڈاکٹر بذل الرحمٰن صاحب پرنسپل اسمٰعیل کالج جوگیشوری، پروفیسر وار صاحب (اسمٰعیل کالج) اور پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی صدر شعبۂ اردو اسمٰعیل کالج سے ملاقات کی۔ پروفیسر ندوی صاحب نے اردو امتحانات سے متعلق اپنی گہری دلچسپی ظاہر فرمائی اور ان کی اہمیت اور افادیت کے مدنظر وعدہ فرمایا کہ اس تعلیمی مہم میں وہ دامے درمے سخنے قدمے ہر طرح مدد دینے کے لئے تیار ہیں۔

اس سلسلے میں مجھے اپنے تین عزیز دوستوں کا شکریہ ادا کرنا بہت ضروری ہے جنھوں نے میرے قیام کے زمانہ میں ہر طرح میری مدد فرمائی اور میرے قیام کیلئے اپنا گھر عنایت فرمایا۔ ان میں ایک مسٹر سلامت علی (فرزند آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر) اور دوسرے ان کے عزیز مسٹر ابو الحسن بلگرامی اور تیسرے مسٹر تقی حسن ہیں۔ یہ تینوں حیدرآبادی نوجوان تعلیم کی غرض سے بمبئی میں قیام پذیر ہیں۔ تین روز کے قیام کے بعد میں حیدرآباد روانہ ہوا۔ جناب قریشی صاحب، جناب انصار علی صاحب، جناب سلامت علی صاحب، جناب ابو الحسن صاحب بلگرامی، جناب تقی حسن صاحب اور انجمن اسلام کے دو طلبہ نے مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے اسٹیشن تک تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی۔ میں ان سب اصحاب کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آخر میں مجھے کارکنان انجمن اسلام اور بالخصوص مولوی سید نورالدین صاحب کا شکریہ ادا کرنا بہت ضروری ہے جنھوں نے میرے قیام و طعام کا نہایت معقول انتظام فرمایا اور مجھے یہ محسوس تک نہ ہونے دیا کہ میں پردیس میں آیا ہوا ہوں۔

خواجہ حمید الدین

مرکز دوم کنڈہ

۲۵ ار دے اسٹیشن کاچی گوڑہ سے صبح ۵/۴۵ کی ٹرین سے روانہ ہوا۔ اسٹیشن تلمنڈلہ (ٹمڈلہ) پہنچا اور وہاں سے بسطے مسافت (۷ ½) میل بذریعہ کھا پر دوم کنڈہ پر ۱۲ بجے پہنچا۔ بلدہ حیدرآباد سے دوم کنڈہ تقریباً (۲۷) میل پر واقع ہے۔

جناب دوم تعلقدار صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا موصوف نے مسٹر لکشمی نارائن سے تعارف کرایا جو بحیثیت معتمد ادارہ کام کر رہے ہیں۔

دوسرے روز حسب قواعد و ضوابط امتحان اردو دانی ٹھیک دس بجے صبح شروع ہوا۔ دوسرا زبانی پرچہ (۲) بجے سے شروع ہوا اور (۶) بجے شام ختم ہوا۔ (۴۲) امیدواران کے منجملہ ۳۳ حاضر تھے اور ۹ غیر حاضر۔ مسٹر لکشمی نارائن صدر مدرس خاص خوبیوں کے حامل ہیں۔ امتحان سے ایک روز قبل صاحب موصوف کو ضروری ہدایات کردی گئیں حسبہ صاحب موصوف نے مدرسہ کے ہال میں معقول انتظام فرمایا تھا۔ موصوف اثنائے امتحان میں وقتاً فوقتاً ضروری انتظامات سے متعلق میرا ہاتھ بٹاتے رہے جس کا میں مشکور ہوں۔

مولوی سید غوث صاحب (دوم تعلقدار) سرپرست نے اپنی بیگم صاحبہ کے زیر نگرانی امتحان اناث کا انتظام فرمایا تھا۔ ۲۶ ار دے کی صبح پرچہ جات مکمل ہدایات کیساتھ صاحب معز کے حوالہ کردیے گئے۔ بعد ختم امتحان سربمہر لفافہ وصول ہوا۔ مسٹر غوث کے ہم ممنون ہیں اس موصوف نے اپنا قیمتی وقت ایسی خدمات کے لئے پیش کرکے اپنے قومی جذبات کا ثبوت دیا۔ یہ عمل صاحب موصوف کی علم دوستی کا بین ثبوت ہے۔

دو سال قبل اس مرکز سے چند امیدوار امتحان زبان دانی میں شریک ہوئے تھے جن میں سے ایک امیدوار نے طلائی تمغہ بھی حاصل کیا تھا۔ اس سال جو امیدوار شریک امتحان ہوئے ہیں یہ تمام صاحب معتمد ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ صاحب ممدوح کا ارادہ ہے کہ دوم کنڈہ میں مستقل مرکز کا قیام عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ معتمد نے اردو عالم کی جملہ کتابیں اور اس کے قواعد و ضوابط و نیز سب رس کا نمونہ روانہ کرنے کی خواہش ظاہر فرمائی ہے۔ اور کتابت (طباعت) کی رنگینیت کا بھی خیال ظاہر فرمایا ہے۔

اب یہ ادارہ تقریباً ہندوستان میں شہرت حاصل کرچکا ہے بڑے شہروں کا تو ذکر ہی کیا معمولی دیہات میں بھی کافی تشہیر ہوچکی۔ امیدواروں کی تعداد بھی کافی ہوچکی ہے۔ لیکن اردو عالم و اردو فاضل کے اساتذہ انھیں دیہات میں فراہم نہیں ہو رہے ہیں۔ احسن صورت یہ ہوگی کہ اولاً بلدہ کی حد تک کسی مناسب مقام پر اردو عالم اور اردو فاضل کے درس کا انتظام فرمایا جائے۔ من بعد محلہ واری ادارہ جات کا قیام عمل میں لایا جائے اس طرح رفتہ رفتہ خود ادارہ کے کامیاب طلبہ سے یہ خدمات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دیہات میں بھی اس کی تشہیر ہوجائے تو مناسب ہے مستطیع امیدوار اس سے فائدہ حاصل کرسکتے ہیں تبویج دیہاتی طلبہ کے لئے قیام گاہ کے علاوہ خورد و نوش کے انتظامات بھی کرنے ہوں گے۔ مناسب ہوگا کہ معتمد صاحب اس جانب توجہ فرما کر کوئی ایسا لائحہ عمل مرتب کریں کہ ہر دیہاتی امیدوار بسہولت اس سے مستفید ہوسکے۔

مجلس عاملہ اردو کانگریس

کل ہند اردو کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس بتاریخ ۱۵ ر نومبر روز چہارشنبہ شام کے ساڑھے پانچ بجے دفتر ادارۂ ادبیات اردو میں منعقد ہوا۔

حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نائب صدر کل ہند اردو کانگریس (صدر جلسہ)

محترمہ مسز سروجنی نائیڈو۔

مولوی قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام۔

پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو جامعہ میسور۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں معتمد عمومی۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور شریک معتمد۔

حسب ذیل مسائل شریک ایجنڈا تھے۔

(۱) کانگریس کی منظور شدہ تحریکات کو روبہ عمل لانے کی تجاویز۔

(۲) دستور کے ذیلی قواعد۔

(۳) فراہمی سرمایہ۔ (۴) دفتر کی منتقلی (۵) آئندہ کانگریس کے مقام کا تعین اور انتظام

ان کے بارے میں حسب ذیل تصفیے عمل میں آئے۔

ف ۱۔ مسئلہ نمبر ایک کے بارے میں طے پایا کہ معتمدین باہم مشورے سے تحریکات سے متعلقہ کام کو تقسیم کرکے ان کے بارے میں عملی کارروائی شروع کریں۔

ف ۲۔ دستور کے ذیلی قواعد کا مسودہ مرتب کرنے کے لئے ایک ذیلی مجلس بنائی گئی جو حسب ذیل اصحاب پر مشتمل ہے۔

مولوی قاضی عبدالغفار صاحب
پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری۔
پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی۔
ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب۔
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

طے پایا کہ یہ مجلس ذیلی قواعد کا جو مسودہ مرتب کرے گی وہ رائے کے لئے ارکان مجلس عاملہ کے یہاں بھیجدیا جائے اور آئندہ اجلاس عاملہ میں منظوری کے لئے پیش کیا جائے۔

ف ۳۔ فراہمی سرمایہ کے سلسلہ میں معتمدین نے ایک موازنہ پیش کیا جس میں معتمد اور شریک معتمد کے دفاتر دہلی و حیدرآباد کے لئے عملہ و صادر کی ضروریات کو پیش نظر رکھا گیا۔ یہ موازنہ منظور کیا گیا اور سالانہ رقم کی فراہمی سے متعلق عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نے کوشش کرنے کا وعدہ فرمایا اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ سالانہ ایک ہزار انعامات دینے کے لئے یکبشت تیس ہزار روپے جمع کرنے کی بھی تحریک فرمائیں گے۔

طے پایا کہ کانگریس کے ارکان بنانے کی مہم شروع کی جائے۔ اور ممالک محروسہ کے لئے بھی فیس رکنیت سکہ رائج الوقت میں وصول کی جائے۔

ف ۴۔ طے پایا کہ دفتر معتمد صاحب عمومی کے سپرد کیا جائے اور اس کا مقام آئندہ کانگریس تک دہلی ہوگا جہاں اس کی رجسٹری کی کارروائی کی جائے گی۔

ف ۵۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے تجویز پیش کی کہ مارچ سنہ ۱۹۴۴ء میں جامعہ ملیہ کی جوبلی منائی جارہی ہے اس لئے اس زمانہ میں اگر کانگریس کے اجلاس بھی وہیں منعقد ہوں تو بہتر ہوگا۔

طے پایا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اس بارے میں لکھنو والوں سے ملاقات کرکے طے کریں اور آئندہ مجلس عاملہ میں پیش کریں۔

ف ۶۔ طے پایا کہ مجلس عاملہ کا آئندہ اجلاس مارچ سنہ ۱۹۴۴ء میں منعقد ہو۔

تاریخ دکن کانفرنس کے انتظامات

تاریخ دکن کانفرنس کی مجلس انتظامی کا تیسرا اجلاس بصدارت عالیجناب نواب علی یاور جنگ بہادر ایم۔ اے (آکسن) ۱۹ نومبر سنہ ۱۹۴۳ء ۵ اردے بہشت سنہ ۱۳۵۳ف شام کے ساڑھے پانچ بجے دفتر ادارۂ ادبیات اردو میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

نواب عنایت جنگ بہادر۔ پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ پروفیسر ہمنت راؤ (نظام کالج)۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ مولوی خواجہ محمد احمد صاحب۔ مسٹر آر۔ ایم جوشی۔ مولوی میر محمود علی صاحب۔ مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب (معتمد مجلس انتظامی)۔

(مولوی سید محمد اعظم صاحب۔ مولوی سید علی اکبر صاحب اور نواب محمد نصیر الدین خاں صاحب نے بذریعہ تحریر بوجوہات شرکت سے معذرت چاہی۔)

(۱) گزشتہ اجلاس کی روئداد سنائی گئی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔

(۲) طے پایا کہ کانفرنس کی تاریخیں ۱۰، ۱۱ اور ۱۲ اپریل مقرر کی جائیں۔ کیونکہ فروری میں انتظامات بوجہ قربت مکمل نہیں ہوسکیں گے۔

(۳) طے پایا کہ عالیجناب صدر اعظم بہادر سے اس کانفرنس کے اخراجات کے سلسلہ میں عطیہ کی استدعا کی جائے۔

(۴) کانفرنس کا مجوزہ دستور بغرض منظوری پیش ہوا۔ اس کے سلسلہ میں عالیجناب صدر نشین مجلس نے تحریک فرمائی کہ کانفرنس "اسوسی ایشن" کی بجائے "تاریخ دکن اسوسی ایشن" نام رکھا جائے تاکہ اس اسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد کے تحت "تاریخ دکن کانفرنس" مختلف مقامات پر منعقد ہوتی رہے۔ یہ تحریک بہ اتفاق آرا منظور ہوئی اور پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی کو مجوزہ دستور کا مسودہ سپرد کیا گیا تاکہ وہ اس جدید تصفیے کے مطابق مسودے میں تبدیلی فرمائیں۔

(۵) طے پایا کہ مجلس انتظامی میں بزم تاریخ جامعہ عثمانیہ اور بزم تاریخ نظام کالج کے صدر صاحبان کو بھی شریک کیا جائے۔

(۶) طے پایا کہ مجلس انتظامی کی ذیلی جالس اعضائے مجلس ہوا کرے اور وقتاً فوقتاً جلسے منعقد کرکے اپنی سفارشات آئندہ مجلس انتظامی میں پیش کیا کریں۔

ادارے کی عمارت

ادارۂ ادبیات اردو کی عمارت کے لئے فراہمی چندہ کی حسب ذیل اپیل عالی جناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر صدر المہام تعمیرات و نائب صدر ادارہ نے جاری فرمائی ہے۔ توقع ہے کہ علم دوست حضرات اپنے اپنے چندے ارسال فرما کر ملک کی اس ضرورت کی تکمیل میں مدد فرمائیں گے۔

جناب من

ادارۂ ادبیات اردو نے جو آج سے چودہ سال قبل قائم ہوا اپنی علمی و ادبی مصروفیتوں اور ملک کی سرکاری و مشترکہ قومی زبان اردو کی ہمہ جہتی خدمت گزاری کے ذریعے سے اہل ملک کے دلوں میں ایک خاص جگہ حاصل کر لی ہے۔

اس ادارہ نے اپنے آغاز ہی سے اپنے چند خاص کارکنوں کے ذاتی ایثار و خلوص کی بنا پر ایک ایسا مسلک اور طریقۂ کار اختیار کیا کہ سرکاری امداد یا عوام سے چندہ حاصل کئے بغیر تقریباً ایک لاکھ روپے کی مطبوعات شائع کیں۔ علاوہ اس کے زنانہ و قدیم کے تقریباً دو ہزار نادر مخطوطات اور پچیس ہزار اردو مطبوعات جمع کر لیں جو اردو زبان اور تاریخ دکن کی تحقیق و تفتیش کرنے والوں کیلئے ایک بیش بہا سرمایہ ہیں چنانچہ ادارے کے کتبخانہ کے معائنے کے بعد ایسے اصحاب بھی اس کی اہمیت کے معترف ہوئے جن کی عمریں کتابوں کی دنیا میں تلاش و تحقیق میں بسر ہوئی ہیں۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نواب صدر یار جنگ بہادر علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا امتیاز علی عرشی ناظم شاہی کتب خانہ رامپور وغیرہ۔ کتب خانہ کے علاوہ ادارے نے تاریخ و ادب کے مشاہیر کی قلمی تحریریں۔ تصاویر۔ اور قدیم دستاویزات کا بھی ایک گراں قدر ذخیرہ محفوظ کر لیا ہے۔

ادارے کا کام بارہ شعبوں میں تقسیم ہے جن میں سے ہر ایک سرگرم معتمد اور متعدد قابل ارکان پر مشتمل ہے۔ اردو امتحانات اور مخزن علوم و فنون (اردو انسائیکلوپیڈیا) کے شعبے اردو کی جو عظیم الشان خدمات انجام دے رہے ہیں ان سے ملک کے عوام و خواص دونوں بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ شعبۂ تاریخ دکن اس سر زمین کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر تصنیفات و تالیفات شائع کرنے کے علاوہ قدیم تاریخی آثار کی چھان بین اور ان کی حفاظت کے لئے جو کام انجام دے رہا ہے اس کے ذریعے سے اہل ملک میں تاریخ کا صحتمند ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ ادب اطفال اور ادب نسواں کے لئے بھی دو علحدہ شعبے وقف ہیں۔ اردو میں بچوں اور عورتوں کے لئے مفید ادب کی جو افسوس ناک کمی ہے اس کو دور کرنے کے علاوہ یہ شعبے ایسے وسائل بھی اختیار کرتے رہتے ہیں جن سے ان پڑھوں کو پڑھا لکھا بنانے اور پڑھے لکھوں کے ذوق علم و ادب اور اخلاق و شائستگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ان سب کاموں کے باوجود ادارے کی کوئی علحدہ عمارت نہیں ہے اور اب تک یہ سارے کام اس کے معتمد اعزازی کے ذاتی مکان میں انجام پاتے رہے چنانچہ جب ایک مکان ادارے کے دفتر اور کتبخانہ سے معمور ہو گیا تو معتمد ادارہ کو ایک دوسرا مکان اپنے ذاتی صرفہ سے تعمیر کرنا پڑا اور وہ بھی اب ناکافی ہو گیا ہے۔ اگرچہ گزشتہ پانچ سال سے ادارے کے لئے ایک خاص عمارت کی فراہمی میں ادارے کی مجلس انتظامی جد و جہد کرتی رہی اور مختلف مقامات اس کے پیش نظر رہے لیکن آخر کار اب ایک موزوں مقام کا انتخاب کر لیا گیا ہے جو شاہی سڑک پر واقع ہے اور اپنی مرکزیت کی وجہ سے حیدرآباد اور سکندرآباد دونوں جگہ کے دلدادگان علم کا مرکز بن سکتا ہے اور اس طرح ادارے کی افادیت میں کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے۔

انتخاب اراضی کے بعد ایک ایسی عمارت کے نقشے تیار کئے جا رہے ہیں جو حیدرآباد جیسے مرکز اردو کے شایان شان ہو اور جو ادارے کے بڑھتے ہوئے کاموں اور وسیع ضروریات کو ملحوظ رکھ کر سہ منزلہ بنائی جائے گی اور جس میں ایک رفیع الشان مینار بھی ہو گا۔ اردو کے گنگا جمنی مزاج کے پیش نظر کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ عمارت ہندوستانی اور دکنی طرز تعمیر کی ایک اعلیٰ نمائندہ ہو۔

ادارے کی اس مجوزہ عمارت میں فن تعمیر کی اعلیٰ خصوصیات کو ملحوظ رکھنے کے سوا اس امر کا بھی خیال رکھا جائے گا کہ اس کے مختلف حصے حسب ذیل اہم ضروریات کے لئے وقف ہوں۔

(۱) ایک ایسا مکمل کتبخانہ جس میں ہر وقت اردو کی جملہ مطبوعات کا مجموعہ رہیں۔
(۲) دکن کی تاریخ اور دکنی شعراء و مصنفین کے علمی و ادبی آثار۔
(۳) اردو کے قدیم و جدید اخبارات و رسائل کی مکمل جلدیں اور نمونے
(۴) ایوان قرآن جس میں خاص طور پر قرآن شریف کے جملہ اردو تراجم محفوظ رہیں گے۔
(۵) اردو زبان اور اس سے متعلقہ السنہ کے بیش بہا اور نادر مخطوطات۔

(۶) اردو زبان اور ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کو مطالعہ کی سہولتوں کے علاوہ ان کے عارضی قیام کے لئے کمرے۔

(۷) دارالمطالعہ۔ (۸) دارالتقاریر۔

(۹) اردو کے محسنوں اور شعرا و مصنفین کی تصاویر کے مرقعے۔

(۱۰) مخزن علوم و فنون یعنی اردو انسائیکلوپیڈیا۔

(۱۱) مطبع۔ (۱۲) کتاب گھر۔

ظاہر ہے کہ ان تمام ضروریات کے لئے ایک بہت ہی وسیع اور جدید العصر عمارت کی ضرورت ہے جو ضروری فرنیچر وغیرہ کے ساتھ پانچ لاکھ روپیہ کے سرمایہ ہی سے مکمل ہو سکتی ہے اور جس کی فراہمی کے سلسلہ میں یہ استدعا نامہ آپ کی خدمت میں پیش ہے اور چونکہ ادارے نے اب تک اپنے کسی کام کے سلسلہ میں چندے نہیں طلب کئے ہیں اسلئے توقع ہے کہ آپ اس کی اس پہلی استدعا کو قبول فرما کر خاطر خواہ امداد فرمائینگے۔

ادارے کی مجلس انتظامی نے طے کیا ہے جو اصحاب پانچ ہزار روپیہ عطا فرمائیں گے ان کے نام سے ایک کمرہ ادارے کی عمارت میں منسوب رہے گا۔ اسی طرح اگر کسی ایک مقام سے مجموعی طور پر پانچ ہزار کی رقم وصول ہو تو اس مقام کے نام سے بھی ایک کمرہ منسوب کیا جائے گا جو اصحاب ایک ہزار یا اس سے زیادہ روپیہ عطا فرمائیں گے ان کے نام نمایاں طور پر کندہ کرائے جائیں گے اور جو اصحاب سو روپیہ عطا کرینگے ان کے اسما کی فہرست کسی موزوں مقام پر کندہ رہے گی۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ حیدرآباد کے اس کارگزار اور مخلص ادارے کی تعمیر میں ضرور حصہ لیں گے اور اپنا چندہ میرے یا حسب سہولت اصحاب ذیل میں سے کسی کے یہاں ارسال فرما کر شکریہ کا موقع عطا کریں گے فقط

زین یار جنگ

نائب صدر ادارۂ ادبیات اردو

میجر جنرل حبیب سید احمد العیدروس سی آئی ای۔ او بی آئی۔ کمانڈر افواج باقاعدہ۔
جناب نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ سیف آباد۔
جناب راجہ ہربنس چند صاحب۔ عالی آبادیہ۔ گلن محل روڈ۔
جناب ڈاکٹر منور علی صاحب سول سرجن دواخانہ عثمانیہ۔ حمایت نگر۔
جناب مولوی میر طلا احسین صاحب ناظم تعمیرات صوبہ میدک۔ جوبلی ہلز۔
جناب مولوی امیر علی خاں صاحب صوبہ دار۔ ورنگل۔
جناب مولوی غلام مصطفیٰ صاحب اول تعلقدار۔ اورنگ آباد۔
جناب مولوی باقر حسین صاحب قریشی اول تعلقدار۔ کریم نگر۔
جناب مولوی عارف الدین حسن صاحب ڈیویژن افسر ناگر کرنول
جناب مولوی مظہر حسین صاحب افسر اراضی نظام ساگر نظام آباد
جناب سری کرشن سنہا صاحب ڈیویژن افسر نارائن پیٹھ۔
جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اردو رفعت منزل خیریت آباد۔

نمونۂ فارم ارسال رقم عطیہ برائے عمارت ادارۂ ادبیات اردو

جناب ....

....

میں ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی عمارت کے لئے عطیہ مبلغ ....
بذریعۂ منی آرڈر یا چک یا نقد ارسال کر رہا ہوں۔ براہ کرم رسید سے ایما فرمایا جائے۔

مورخہ .... دستخط

پتہ ....

مقام ....

ترقی پسند

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

ترقی پسند ادب نمبر

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

نشان ڈاک آصفیہ ۱۵۳
نشان ڈاک برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۱۲

جلد ۷ بابت ماہ جولائی ۱۹۴۴ء شمارہ ۷

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

ترقی پسند ادب کی چند مطبوعات

"سرخ سویرا" :- ترقی پسند شاعری کا شاہکار۔ مخدوم محی الدین کی رومانی اور انقلابی نظموں کا مجموعہ ـــــ مخدوم کی شاعری ـــــ جدت فکر، صداقت بیان خلوص اور خود اعتمادی کا آئینہ ہے آپ ان نظموں کو پڑھ کر ایسا محسوس کرینگے، جیسے خود آپ ہی کے احساسات اور تجربات کی گرہیں کھل رہی ہیں۔ (قیمت ۱۲/)

"یہ کس کا خون ہے ؟" :- مشہور ترقی پسند ادیب علی سردار جعفری کا ڈرامہ ہے جو جاپانی حملہ سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے ڈرامہ کی کامیابی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندستانی عوامی تھیٹر اسوسی ایشن نے جنوری و فروری ۱۹۴۳ء میں ۳۰ بار اسٹیج کیا ہے۔ قیمت ۸/

"یہ امرت ہے" :- خواجہ احمد عباس کی ڈرامہ نگاری سے کون واقف نہیں۔ "یہ امرت ہے" آپ کا مختصر مگر دلچسپ ڈرامہ ہے۔ امرت کا کون مستحق ہے۔ ایکٹر یا ایکٹرس۔ ہٹلر، مسولینی۔ پنڈت یا ملّا۔ اس کا جواب صرف "یہ امرت ہے" میں ملیگا۔ ۴/

"اجرتی محنت اور سرمایہ" :- کارل مارکس ـــــ اس کتاب میں مارکس نے یہ بتایا ہے کہ دراصل محنت پیداوار کی جڑ ہے لیکن پیداوار کی قیمت کا ایک قلیل حصہ محنت کش کو ملتا ہے باقی سب سرمایہ دار ہضم کر جاتا ہے۔ قیمت ۱/

(دیگر مطبوعات)

"نجات کا راستہ" :- سی۔ راج گوپال چاری۔ "میرا مقصد حالات پر افسوس ظاہر کر کے خاموش ہو جانا نہیں ہے بلکہ میں چاہتا ہوں کہ جو غلطیاں اس وقت تک کی گئی ہیں ان کے ازالہ کی طرف اپنے ہم وطنوں کو مائل کروں" (سی راج گوپال چاری) قیمت ۱۰/

"ہندوستانی ریاستوں کا مستقبل" :- از خواجہ معین الدین بی اے ـــــ "جنگ کی کہانی" از افضل عابدی قیمت ۱۰/

(ملنے کا پتہ)

ناشر :- "اشاعت گھر" چمن گولی گوڑہ حیدرآباد دکن

"دکن بک ڈپو" عابد روڈ حیدرآباد دکن

حرفِ اولین

(میرے دوست میر عابد علی خاں بی اے حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کو صحت بخش طریقہ پر آگے بڑھانے میں پرخلوص خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کی خواہش پر جولائی کا شمارہ ترقی پسند ادب کیلئے وقف کیا گیا۔ انھوں نے جو مضامین اور نظمیں مرتب کر کے بھیجیں ان سے مرتب کے اصل نشاط اور ذوق کا پتہ چلتا ہے) شاہد

سب رس کی خصوصی اشاعت "ترقی پسند ادب نمبر" آپ کے سامنے پیش ہے۔ اس کی ترتیب و اشاعت کا مقصد یہ تھا کہ کل ہندار دو کانگریس اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سالانہ جلسے کی عظیم تقاریب کے موقع پر جبکہ ہندوستان کے ممتاز اہل قلم جمع ہو رہے ہیں حیدرآباد کے جواں سال ادیبوں کا تعارف اور ان کی تحریرات سے روشناس کرایا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر میں نے محترمی ڈاکٹر زور صاحب سے خصوصی اشاعت کیلئے درخواست کی تھی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب ڈاکٹر صاحب کا ممنون ہوں کہ آپ نے اجازت مرحمت فرمائی اور میں اس قابل ہو سکا کہ یہ شمارہ آپکی خدمت میں پیش کر سکوں۔

میں بحیثیت مرتب یہ عرض کرونگا کہ یہ خصوصی اشاعت صرف ایک ہفتہ کی محنت و کوشش کا نتیجہ ہے اس قلیل عرصے میں جو کچھ ممکن ہو سکتا تھا کیا گیا۔ یہ نہیں بتلا سکتا کہ میں اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہو سکا۔

"نئی باتیں" میں قاضی عبدالغفار اور احتشام حسین کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ قاضی صاحب نے اس سال کی عظیم و ضخیم تصنیف پر تنقید فرمائی ہے۔ احتشام حسین نے اس عظیم المرتبت شاعر کی جناب میں اپنا خراج عقیدت پیش کیا ہے جو سرزمین دکن میں محوِ خواب ابدی ہے۔ نظر نے حیدرآباد کے ترقی پسند شعرا، کا تعارف کرایا ہے۔ شہاب اور کلیم نے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیب میکسم گورکی اور ڈانگے کی تحریرات کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

بھارت چند۔ رشید قریشی۔ محبوب حسین۔ افضل عابدی کے افسانے ہماری مجلسی زندگی کے عکاس اور اس پر کہیں کہیں طنز بھی ہیں۔

علی اختر۔ سردار جعفری۔ میکش۔ جواد زیدی۔ نظر۔ صمد رضوی۔ ساز۔ میر حسن۔ اریب۔ تمکین۔ ترقی پسند شعرا، میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں مجھے افسوس ہے کہ مخدوم محی الدین اس محفل میں شریک نہیں ہیں۔ اصرار کے باوجود مخدوم نے اپنی شدید مصروفیت کیوجہ سے کچھ نہیں لکھا۔

میں برادر حمید شاہد ایم اے کا ممنون ہوں کہ آپ کی وجہ سے میں طباعت و اشاعت کی دشواریوں سے محفوظ رہا

جناب خلیل اللہ صاحب نے اس خصوصی اشاعت کے لئے ایک دیدہ زیب سرورق تیار کیا جس کے لئے میں خلیل صاحب کا مشکور ہوں۔

میر عابد علیخاں

اعمال نامہ

(قاضی صاحب نے سر سید رضا علی سی' بی' ای' ام' ال' اے کی خود نوشت سوانح عمری "اعمال نامہ" (جسے ہندوستانی پبلشرز دہلی نے شائع کیا ہے) پر جو تنقید فرمائی ہے وہ بلا شبہ تنقیدی ادب میں ایک ممتاز مقام کی حامل ہے' زیر نظر مضمون کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ قاضی صاحب نے صرف اعمال نامہ ہی پر تنقید نہیں فرمائی ہے بلکہ یہ بھی بتلا دیا ہے کہ تنقید کا واقعی معیار کیا ہے)

مغربی لٹریچر میں خود نوشت سوانح عمریاں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مورخ ان کے اوراق سے قومی تاریخ کی اندرونی تفصیلات اور اہم واقعات کے پس منظر اور مضمرات کا پتہ پاتا ہے۔ یہ صنعت ادب اردو زبان میں تقریباً ناپید ہے۔

ملک کے مشاہیر میں سے سوائے مولانا ابوالکلام آزاد کے ابھی تک کسی نے بھی اپنی زندگی کے حالات اپنے ہی قلم سے لکھنے کی جرات نہیں کی۔ "جرات" میں اس لئے کہتا ہوں کہ اس کام میں واقعی بہت بڑی "جرات" کی ضرورت ہے۔ یہ کام بہت مشکل اور نازک ہے بخصوصاً اس لئے کہ وہ لوگ جن کی زندگی کا کوئی پہلو منظر عام پر رہا ہے اس کی معنوی کیفیات کو اگر رنگ آمیزی یا ذہنی تحفظات کے بغیر لکھیں تو انھیں نہ صرف اپنی انسانی کمزوریوں کو پردہ سے باہر اتارنا پڑتا ہے بلکہ وہ بہت سے دوسرے زندوں اور مُردوں کو اپنی [illegible] کے ساتھ لپیٹ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ——— ایسا نہ کرنے [illegible] سوانح تشنہ رہ جاتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے "تذکرہ" میں اپنی زندگی کے حالات بہت مختصر بیان کئے ہیں ان کا انداز تحریر بلاشبہ بہت دلنواز ہے۔ لیکن بعض مقامات پر اور بعض حالتوں میں ایک ایسا انداز تحریر بجائے خود حقائق کے چہرہ پر نقاب بن جایا کرتا ہے۔ علاوہ بریں مولانا نے اپنی زندگی کے جن اجزا پر تبصرہ کیا ہے ان کا تعلق دوسرے معاصرین اور مشاہیر کی زندگی سے بہت کم ہے۔ اس لئے مولانا کا کام نسبتاً آسان تھا۔ مگر سر سید رضا علی نے اپنے "اعمال نامہ" میں ایک بہت مشکل کام کو انجام دینے کی کوشش کی ہے' یعنی اپنے "اعمال نامہ" کو اپنے معاصرین اور دوستوں کا بھی اعمال نامہ بنا دیا ہے انھوں نے بہ یک وقت اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی کراماً کاتبین کے فرائض انجام دئے ہیں۔ گویا انھوں نے ان فرشتوں کا روزنامچہ چرا لیا ہے۔

اس طرح سید صاحب اردو لٹریچر کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک ایسی "بدعت" کے مرتکب ہوئے ہیں اور ایسے خارزار میدان سے گزرے ہیں کہ اگر موصوف زبان اور ادب کا سلیقہ نہ رکھتے ہوتے تو شاید یہ اعمال نامہ ملک کے مختلف مکاتیب خیال کے لئے بہت نزاعی اور بحث طلب مسائل پیدا کر دیتا۔ لیکن سید صاحب سب کچھ صاف صاف کہہ دینے کے باوجود ان اوراق میں اپنی زندگی کی دلچسپ داستان کو اس طرح بیان کرتے ہوئے گزر گئے ہیں کہ نہ تو راستہ کے کسی کانٹے کو اپنے دامن سے الجھنے دیا اور نہ کسی سنگ راہ سے ٹھوکر کھائی۔ حق گوئی میں لہجہ اور انداز بیان کے ایک خوش گوار توازن کی یہ مثال ایسی ہے جس نے اعمال نامہ کو اپنی قسم کی ایک معیاری کتاب بنا دیا ہے۔

سوانح نگار نے اپنے جو کچھ خاندانی حالات اور اپنی زندگی کے ابتدائی کوائف بیان کئے ہیں وہ ان کی پبلک زندگی کی تصویر کا ایک دلچسپ پس منظر ہے جس نے ان کی زندگی کے خد و خال کو نہ صرف زیادہ نمایاں بلکہ بہت سبق آموز بنا دیا ہے۔ چنانچہ ان ۵۲۷ اوراق کی وسعت میں ہم نہ صرف سر سید رضا علی کے۔ ٹی۔ سی۔ بی۔ ای۔ سابق رکن پبلک سروس کمیشن

ڈ ایجنٹ جنرل جنوبی آفریقہ کی پبلک زندگی کو مصور پاتے ہیں۔ بلکہ اس تصویر کے باریک خطوط ایک ایسے - SELF MADE MAN کے افکار و عزائم کے بصیرت افروز اور تعارف کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں جس نے اپنی غیر معمولی ذہنی اور اخلاقی قوت کے بل پر سیڑھی کے سب سے نیچے قدم سے چڑھنا شروع کیا شہرت و نصرت کی منزلیں طے کیں اور بالآخر اپنی بھرپور زندگی کے اس درجہ میں قدم رکھا جس میں جوانی کی جدوجہد کے سرمایہ سے بوڑھاپے کے لئے سکون قلب اور آسائش ضمیر کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ سید صاحب کا بڑھاپا اس قسم کا بے باک بڑھاپا ہے جو ایک سدا بہار جوانی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتا! بہت سی تھکی ہوئی جوانیاں اس قسم کے بڑھاپے سے شرمایا کرتی ہیں!

اعمال نامہ کے اوراق میں تنوع اس قدر ہے اور افکار کی لہریں اس قدر ایک دوسرے پر چڑھتی چلی گئی ہیں کہ کتاب کے مختلف ابواب کی تقسیم قائم نہیں رہ سکی ہے - یعنی ایک باب کا موضوع دوسرے سے الجھا ہوا ہے - حتیٰ کہ اس نگار خانے میں نقش و نگار کا ہجوم اس قدر زیادہ ہوگیا ہے کہ اس کا تجزیہ کرنا آسان کام نہیں - مگر سید صاحب کا طرز انشا رواں بے تکان اور دلچسپ ہے کہ مضامین اور موضوعات کی تقسیم کا الجھاؤ پڑھنے والے پر گراں نہیں گزرتا - معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان اوراق کا لکھنے والا پڑھنے والے کو اپنے ساتھ دوڑائے لئے جا رہا ہے - نہ خود کہیں رک کر سانس لیتا ہے اور نہ پڑھنے والے کو دم لینے کی اجازت دیتا ہے - اس دور کے لپیٹے اور اس تیز گامی کی جھونک میں جو کچھ سامنے آیا وہ اس سیلاب کے ساتھ بہنے لگا - انیسؔ و دبیرؔ، غالبؔ و مومنؔ، حافظؔ و سعدیؔ اور ایسے کتنے ہی قدیم و جدید شعرا اور ادیب اس آندھی کے جھونکوں میں اڑے چلے جاتے ہیں - علیٰ ہذا قومی زندگی اور سیاست کے بہت سے مشاہیر بھی ان اوراق میں جا بجا اس طرح ٹکے ہوئے ہیں جیسے گدڑی کے لعل! سر سیدؔ، محسن الملک گوکھلے، گاندھی، محمد علی یہ تمام موتی اور ہیرے ایک ہی کشکول میں پڑے دمک رہے ہیں - ان کے گرد و پیش ہندوستان کی پبلک اور سیاسی زندگی کے مسائل بکھرے ہوئے ہیں اور اس تمام قوس قزح کو خود مصنف کا قلم اس کی فکر و نظر سے چمک اور دل آویزی عطا کرتا ہے - اس لئے ان اوراق کی وسعت اور ہمہ گیر تنوع نے انتشار کے بجائے اس مرقع میں ایک ایسی جاذبیت پیدا کر دی ہے جو شاید کسی سست انداز بیان کے ساتھ دلکش نہ بن سکتی -

یہ جاذبیت اور بھی زیادہ ذوق نواز ہو جاتی ہے جب ہم مصنف کے قلم کی بے تکان حقیقت نگاری کو خود ان کی زندگی کے "نازک" مسائل سے بھی بے باکانہ کھیلتے دیکھتے ہیں - یوں تو کتاب کے کسی صفحہ پر بھی سوانح نگار نے اپنی زندگی کے ان اجزا کو جو منظر عام سے دور تھے پردہ کے اندر رکھنا پسند نہیں کیا اور جس طرح دوسروں پر تنقید کی، اسی طرح اپنے اعمال و افکار کے لئے بھی اپنے قلم کی نوک کو نشتر بنا دیا - مگر گیارھویں باب میں شملہ کی جو ادبی محفل آراستہ کی گئی ہے اس کا حسن بیان "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کے نازک مقامات سے کچھ اس طرح گزرا ہے کہ حقیقت کا چہرہ ایک باریک نقاب کے پیچھے صاف نظر آ رہا ہے! سید رضا علی صاحب اگر شاعر ہوتے تو اس ایک "ادبی جلسہ" کی چند داستانوں سے ہزارہا مثنویاں لکھ ڈالتے، اگر افسانہ نگار ہوتے تو "حسن و محبت کی ان جیتی جاگتی" تصویروں کو اپنے افسانوں میں حیات جاودانی عطا کرتے! اس گیارھویں باب کی تمہید میں "کچھ اپنے متعلق" فرماتے ہیں کہ:-

"کسی ایسے شخص کے لئے جس کا کم و بیش
چالیس برس تک ملک کی سیاسی زندگی سے
تعلق رہا ہو اپنی داستان محبت بیان کرنا
اور اس کو کتاب کی صورت میں اپنی زندگی
میں شائع کرانا بڑا دشوار کام ہے ۔
ملا عبدالقادر بدایونی کی جرأت کی داد دینا
چاہئیے کہ ان کی تقدس نے اس آفتِ جاں
کے حالات قلمبند کرنے سے باز نہ رکھا جس
سے انھوں نے دل لگایا تھا ــــــ"

اپنی زندگی میں حسن و عشق کی کارفرمائی کا قصہ خود اپنے ہی
قلم سے بیان کردینے کی جرأت اردو ادب میں سید صاحب
کا ایک بے مثل اجتہاد ہے، جس نے سید صاحب کی قدامت
پسندی کا ڈانڈا ترقی پسند ادب سے ملا دیا ہے ۔ تعجب نہیں کہ
قدیم "زاہد خشک" اس ادبی و دوقی پراگنگی اٹھائے ۔ لیکن
خود سید صاحب شاعر کی زبان سے اپنے اس "اقدام
رندانہ" پر استدلال کرتے ہیں کہ ؎

داغِ دل دکھار ہے ہیں اپنا رنگ میرے سینہ کی صفائی دیکھئے

سینہ کی اس صفائی میں جن داغوں کی نمود سے گیارھویں
باب کی آٹھ کہانیاں کسب رنگ و بو کرتی ہیں وہ اردو زبان
کے ادیبوں کے لئے ایک دعوت نظر ہیں :
اس آپ بیتی کے بنیادی نقوش پر کیسے اچھے افسانوں
کی عمارت تیار ہو سکتی ہے ۔ ان افسانوں کا عنوان کچھ ایسا
ہونا چاہئیے جیسے ۔

"سیاسی قیادت محبت کی رنگینیں جالی میں"
"ایک لیڈر قوم ــــــ ہدف ناوک حسن"
"سیاست اور حسن"

"قائدانہ زندگی کی نفسیات لطیف"
اور اگر سوانح نگار کی زندگی کے خشک اور سنجیدہ مشاغل
سے قطع نظر نہ کی جائے تو ان افسانوں کا بہترین نام ہوگا ۔
"خشک و تر"
بڑے آدمیوں کے سوانح نگاروں نے اکثر بڑا ظلم کیا ہے ۔
اپنے ممدوح پر اور خود اپنے اوپر جب انھوں نے دیدہ و دانستہ
اس زندگی کی داستان سے اس کی تمام تر شخصیت کو خارج
کردیا ہے ۔ یعنی سب کچھ لکھا جو زندگی کی بیرونی سطح پر نمایاں تھا
اور کچھ بھی نہ لکھا جو ان کے ممدوح کی معنوی زندگی کا سرمایہ
تھا ــــــ وہ خزانہ جس سے بیرونی زندگی کے چشمے پھوٹتے
تھے ــــــ باطن کے اس انعکاس سے قطع نظر کرکے ظاہر
کے خدوخال پر سوانح نگاری کی تمام قابلیت کو صرف کردینا
اس فن کی قوت کو مفلوج کردینا ہے ۔ انسان کو ایک
انسان کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے
انسانیت کی ان نام نہاد "کمزوریوں" اور لغزشوں" سے قطع نظر
کرنا ادب اور فن کی بنیادی حقیقت سے انحراف کرنا ہے ۔ اس
مقام پر ترقی پسند ادب پیدا ہوتا ہے جو دعویٰ کرتا ہے کہ کوئی
ادب ادب نہیں اگر وہ زندگی کے حقائق کا آئینہ دار نہ ہو ۔
سید رضا علی صاحب نے پہلی دفعہ اردو ادب اور سوانح نگاری
کی اس "کمزوری" کو رد کرکے خود اپنی انسانیت کا چہرہ بے نقاب
پیش کیا ہے اور اس اصول کو تسلیم کرلیا ہے کہ بڑی زندگی
کی بڑائی کو سمجھنے کے لئے اس زندگی کے ڈھکے ہوئے پہلوؤں
کا بھی منظر عام پر آجانا ضروری ہے ۔ کمزوریوں کے تقابل
ہی سے انسانیت کی صلاحیتوں اور طاقتوں کا صحیح اندازہ
ممکن ہے ورنہ پھر سوانح نگاری میں حقیقت نگاری کا جز
بہت کم رہ جاتا ہے اور ایسی کتابیں یا محض قصیدہ سے

بتاتی ہیں یا کسی بزرگ ولی یا پیغمبر کی ملفوظات۔ انسان کو انسان ہی کی حیثیت سے پیش کرنا سوانح نگاری کا بنیادی فرض ہے اور اس فرض کو سید صاحب نے خود اپنی روئداد زندگی میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے دنیائے ادب میں "اعمال نامہ" سوانح نگاری کا ایک نیا اور بہتر میعار پیش کرتا ہے اور یہ ایک صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے ——— کہ اگر جرأت ہے تو میدان میں آؤ اور اپنی زندگی کی ترازو کے دونوں پلوں کو بھردو ——— ایک طرف ظاہر اور دوسری طرف باطن ——— پھر منظر عام پر اہل نظر کو موقع دو کہ وہ شخصیت کے ظواہر کی سطح کے نیچے انسانیت کی اجزائے ترکیبی کا پتہ پائیں ——— وہ اجزا جن کو ظاہر پرست دنیا کے عرف عام میں "کمزوریاں" کہا جاتا ہے ——— لیکن جو درحقیقت قوت کردار کا منبع ہیں ——— گہوارہ ہیں جس میں کیرکٹر پرورش پاتا ہے۔ ان انسانی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی "رسم کہن" کو جدید ادب نے ترک کرنا شروع کردیا ہے اور سوانح نگاری کی اس "بدعت" کو قبول کرکے سید صاحب نے بھی اردو زبان میں اس فن کا ایک نیا راستہ بنایا ہے۔ عمر کی پختگی کے اس درجہ پر پہونچ کر جب وہ دنیا کے تمام سرد و گرم سے گزر چکے ہیں، ادب کا یہ شعور مجتہدانہ قوت عمل کرکے بہت سی نئی راہیں پیدا کرسکتا ہے ——— "اعمال نامہ" اسی قوت کا ایک مظاہرہ ہے۔ اس کے صفحات میں خشک اور کھردرے سیاسی اور قومی مسائل کے ساتھ ساتھ شعر و سخن اور ادب لطیف کا جو عجیب و غریب امتزاج نظر آتا ہے وہ اس کتاب کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی مثال اس معیار کی کتابوں میں بمشکل مل سکتی ہے۔

"اعمال نامہ" میں سید صاحب نے بہت سے بحث طلب مسائل کو چھیڑا ہے۔ بہت سی چٹکیاں لی ہیں۔ بعض مواقع پر قلم کی نوک کو نشتر کی نوک بنا دیا ہے۔ لیکن یہ رائے کا اختلاف یا تنقید کی شدت کتاب کے مجموعی حسن کو خراب نہیں کرتی بلکہ اس بات کا ثبوت بنتی ہے کہ وہ جو بات لکھ رہے ہیں بالکل اسی طرح لکھ رہے جس طرح وہ ان کے دل میں ہے۔ پڑھنے والے بعض مسائل میں ان سے متفق الرائے نہیں ہوسکتے۔ اس کی انھیں پرواہ نہیں! وقائع نگاری کی یہ آزادی مورد اعتراض نہیں ہوسکتی بلکہ دراصل قابل قدر ہے۔ اس لئے کہ اس صاف گوئی سے کتاب کا میعار بہت بلند ہو جاتا ہے۔

اعمال نامہ اردو ادب میں ایک "اوریجنل" کتاب ہے۔ سید صاحب نے اپنے دیباچہ میں خود ہی اپنی سوانح نگاری کے اسلوب کی ان الفاظ میں وضاحت کردی ہے کہ۔

"میں نے یہ تہیہ کرکے قلم اٹھایا تھا کہ واقعات کو اصلی روپ میں پیش کروں۔
.... میرے نزدیک اپنی لکھی ہوئی سوانح حیات کی سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہئے کہ ایک مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آکر بہ آواز بلند پڑھ لیں تو لکھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے۔ اسی مناسبت سے میں نے اس کتاب کا نام اعمال نامہ رکھا ہے۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ فرشتوں کا لکھا ہوا اعمال نامہ دفتر کا دفتر ہوگا۔ ان اوراق کو اس کا مختصر اور بہت مختصر چربہ سمجھئے یا مرقع کہئے ———"

زیر نظر اوراق اس امر کے شاہد ہیں کہ سید صاحب نے

اپنے اس اصول کی پابندی کا کتاب کی ہر سطر میں لحاظ رکھا ہے۔

اعمال نامہ پر یہ تبصرہ ایک ایسے شخص کے قلم سے لکھا گیا ہے جس کے سیاسی عقائد اور سیاسی مشاغل سید صاحب کے عقائد اور مشاغل سے بڑی حد تک مختلف رہے ہیں۔ لیکن کبھی بھی یہ اختلاف ان مخلصانہ تعلقات پر اثر انداز نہ ہو سکا جو تقریباً ۳۵ سال سے اس وقت تک تبصرہ نگار اور سید صاحب کے درمیان قائم ہیں۔ اس حقیقت کا ذکر صرف اسی لئے کیا گیا ہے کہ اس کی روشنی بھی اعمال نامہ کے مصنف کے کردار پر پڑتی ہے۔ بدقسمتی سے زمانہ کا رنگ اب بدل گیا ہے۔ موجودہ دور کے جذباتی اور اضطراری ہنگاموں میں سیاسی اختلاف اور دوستی بہ یک وقت یک جا نہیں ہوتے۔ قومی زندگی میں شخصی کردار کا یہ انحطاط ان مغربی افکار و اوضاع کا نتیجہ ہے جو ہماری سیاسی غلامی کی مدد سے مشرقی وضعداریوں پر حاوی ہو چکے ہیں۔ مگر اس بربادی کے مرثیہ خوان بھی اب چند ہی ہیں جو دنیا میں باقی رہ گئے ہیں! اور میری طرح وہ سب بھی پا بہ رکاب!

قاضی عبدالغفار

انسان دوستی اور تہذیب

از میکسم گورکی

پیرس میں ادیبوں کی کانگریس اس غرض سے منعقد کی گئی تھی کہ تہذیب کو فاشزم کے تباہ کن حملوں سے محفوظ رکھا جائے۔ بہ ظاہر یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ زمانۂ حال کی بورژوائی کی "تہذیب" کے اصلی معنی و مفہوم کانگریس کے جملہ ارکان کے نزدیک یکساں طور پر معین ہیں اور ان کی تعبیر میں اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن کیا واقعی ایسا تھا؟

فاشزم زوال یافتہ بورژوا تہذیب کی اولاد اس کا ناسور ہے۔ فاشزم کے نظریہ ساز اور اس پر عمل کرنے والے وہی مکار ہیں جو بورژوازی کے زمرہ سے آئے ہیں۔ اٹلی اور جرمنی میں بورژوازی ہی نے سیاسی اور مادی اقتدار فاشسٹوں کے حوالے کیا جن پر یہ بورژوازی تقریباً اسی عیاری کے ساتھ نگرانی رکھتی ہے جس عیاری سے زمانۂ وسطیٰ میں اطالوی شہروں کا دولتمند طبقہ کرایہ کے سپاہیوں کو اپنے قبضہ میں رکھا کرتا تھا۔ مزدوروں کے انتہائی نفرت انگیز کشت و خون جو فاشسٹوں کے ہاتھوں ہوتا ہے، بورژوازی نہ صرف اظہار اطمینان کرتی ہے بلکہ فاشسٹوں کو اس کی بھی اجازت دیتی ہے کہ وہ ان ادیبوں اور سائنسدانوں پر ظلم و ستم ڈھائیں اور انھیں جلاوطن کریں جو خود اسی کی ذہنی قوت کے نمائندے ہیں اور جن پر وہ حال حال تک افتخار اور فخر کیا کرتی رہی ہے۔

فاشزم اپنے سامراجی آقاؤں کی خواہشات کی تشفی کا ذریعہ بن کر آئی جو چاہتے ہیں کہ ایک نئے قتل عام کے ذریعہ دنیا کی پھر سے تقسیم کی جائے۔ اس نے یہ نظریہ تراشا کہ جرمن نسل کو ساری دنیا اور نسلوں پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ "سفید فام درندہ" کی برتری سے متعلق بیمار فریڈرک نیٹشے کے اس بھولے ہوئے تصور کی ابتدا اس وقت ہوئی جب اس نے ہندوستانیوں، ہندچینیوں، ملایا والوں، پولی نیشیائیوں، حبشیوں وغیرہ کو اپنی ماتحتی اور غلامی پر مجبور کیا۔ یہ تصور اس وقت پروان چڑھا جب جرمن بورژوازی، اپنے آسٹریائی اور فرانسیسی حریفوں کو شکست دے کر نوآبادیات کی لوٹ کھسوٹ میں برطانوی، ولندیزی اور فرانسیسی بورژوازی کی شریک بننا چاہتی تھی۔ اسی نظریہ کی رو سے بورژوازی کے ہر قومی گروہ کو اس کی اجازت ہے کہ وہ نہ صرف سیاہ فام نسلوں کو بلکہ اپنے سفیدفام یوروپی ہمسایوں کو بھی وحشی تصور کرے، انھیں غلام بنائے یا تباہ کرے۔ یہ نظریہ .... ان واقعات میں سے ایک ہے جو "تہذیب" کے عصری تصور کے ساتھ ذہن میں آتے ہیں۔

یورپ کے بورژوا معززین کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ وہ برابر شور مچاتے ہیں کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ علم کو محدود کردیا جائے۔ تہذیب کے نشوونما یہاں تک کہ ٹیکنک کی ترقی اور اضافہ کو روک دیا جائے۔ ان کی خواہش ہے کہ دستی محنت کا دور پھر لوٹ آئے۔ بورنی متھ میں ایک اسکول کا افتتاح کرتے ہوئے یارک کے آرچ بشپ صاحب فرماتے ہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ تمام ایجادات روک دی جائیں۔ اگر میرا بس چلے تو میں اندرونی احتراق (INTERNAL CONBUSTION) کے انجن کو ضرور تباہ کردوں"

ان کے ساتھی آرچ بشپ آف کنٹربری ..... بہ ظاہر ٹیکنیک کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ سوویت یونین کے خلاف "جہاد" کی تبلیغ میں وہ اسے کارآمد سمجھتے ہیں ——— اور ماہروں کا خیال ہے کہ نئی جنگ "مشینوں کی جنگ" ہوگی۔ اگر لندن اور روم کے ان خدائی پیشواؤں

اوران تمام بورژوا مبلغوں کے بیانات ——— جن کے
دماغ مزدوروں سے نفرت کرنے کی وجہ سے یا پھر آنے والے ناگزیر
سماجی انقلاب کے ڈر سے ماؤف ہوچکے ہیں ——— جو
تہذیب کے نشوونما کو روک دینے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر یہ بیانات
انیسویں صدی کے اواخر میں دئے جاتے تو خود بورژوازی انھیں
بیوقوفی اور جہالت سے تعبیر کرتی ....

یہ ظاہر ہے کہ یوروپی بورژوا تہذیب "لائینفک کل"
نہیں ہے جس کی تصویر بورژوا مورخ پیش کیا کرتے ہیں۔ اس
کی "قوت متحرکہ" نفع بازوں اور بنکروں میں ——— جو بقیہ
تمام انسانوں کو ایک سستی اور بہ افراط میسر آنے والی شئے سمجھ کر
اپنے اعلیٰ سماجی پوزیشن سے ہر قیمت چمٹے رہنا چاہتے ہیں —
اور ان لوگوں میں بٹ چکی ہے جو تہذیب کی ترقی کے لئے
کام کرنے کے حق کی مدافعت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قوت ان
فاشستوں میں بٹ چکی ہے جن میں ایک زمانے کے تنہ نے
سماج دشمن بنا دیا ہے ......

لیکن پیرس کے بعض اہم اخبار نویس اس حقیقی
خطرہ سے گریز کرتے ہوئے جو بورژوا تہذیب کو فاشزم کی
وجہ سے لاحق ہے، اپنے زمانہ کے بنیادی مسئلہ کو اس طرح
پیش کرتے ہیں۔ اخبار "وان میڑ" پوچھتا ہے :-

"تہذیب کی مدافعت کرنے والی کانگریس کے فرانسیسی
منتظموں میں پانچ انقلابی ادیب ہیں - باربوس - ژاں رچرڈ
بلوش - اندرے جید - اندرے مالرو - روماں رولاں -
کیا یہ نام ایک طرح کی بدگمانی نہیں پیدا کرتے ؟
جب ہم ان ناموں کو دیکھتے ہیں تو ہم یہ پوچھنے
کا حق رکھتے ہیں کہ وہ کونسی تہذیب ہے جس کی مدافعت
کی ہمیں دعوت دی جارہی ہے"

یہ سوال بہت ہی برمحل ہے .... پانچ چھپے اخباروں
نے اسی سوال کو اور بھی زیادہ صاف طور پر پیش کیا ہے
وہ پوچھتے ہیں۔ کیمونزم مغربی یوروپی تہذیب کی وارث ہوگی
جس کی بنیاد یونانی اور رومی تہذیبی قدروں پر قائم ہے ؟

یہ سوال ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس خیال
سے کہ یہ جھگڑا مفید ثابت ہو اس کا یقین کرنا ضروری ہے
کہ ہم کس بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ انکار اور رد کس کا ہے
اور تائید وحمایت کس چیز کی - وہ کونسے حقیقی مشتملات ہیں
جنھیں موجودہ بورژوا تہذیب کے حامی "تہذیب" کے
اس تصور سے منسوب کرتے ہیں جس کا مفہوم عرصہ دراز سے
غیر واضح ہے ؟

مارلیس بوردے نامی کوئی صاحب ہیں جن کا خیال ہے
کہ "تہذیب کی تعریف وتحدید" ضروری بھی ہے اور ممکن بھی
اور یہ کہ اس کے بنیادی تخلیقی ذرائع محنت ——— مادی اور
فنی ذریعہ ——— اور ذہنی قوت ہیں۔ راقم الحروف کا
خیال ہے کہ کوئی بھی عقیدہ اور مسلک لازمی طور پر،
اپنے وسیع مفہوم میں فنی ہی ہوتا ہے، وہ منطقی طریقوں
کا ایسا قابل عمل نظام ہوتا ہے جس کے ذریعہ بنی نوع انسان
کائنات سے متعلق اپنے علم میں وسعت پیدا کرنا چاہتا ہے
تاکہ بتدریج اس میں تبدیلی کرے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ
ہمارے زمانے کی بورژوازی جو کچھ ہے اسی پر قانع ہے۔
اور بڑی کامیابی سے "تہذیب کی روک تھام" کررہی ہے۔
وہ برابر لاکھوں بے روزگار پیدا کرتی، ٹیکنیک کے استعمال
کو روکنے کی کوشش کرتی اور اعلیٰ مدارس عجائب خانوں وغیرہ
کے مصارف گھٹاتی جارہی ہے اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں
کہ وہ تنہا صنعت جس میں بلا روک ٹوک مسلسل ترقی ہو رہی ہے

وہ جنگی صنعت ہے، جس کا مقصد لاکھوں مزدوروں اور کسانوں کو مستقبل کے میدان کے لئے جنگ میں تباہ و برباد کر کے مغربی یورپ کی بورژوازی اپنے اس بین الاقوامی تنازعہ کا تصفیہ کرنا چاہتی ہے کہ اس کا کون قومی گروہ دوسروں پر تسلط جمائے۔۔ ...

اب اس تصور کے حقیقی مفہوم کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ مغربی یورپ کی "جدید بورژوا تہذیب کی بنیاد یونانی اور رومی اقدار پر قائم ہے"۔۔۔۔۔۔

فرانسیسی اخبار نویس پوچھتے ہیں کہ "کیا ایسی قدیم تہذیب جو یونان اور روم کی تہذیبی قدروں کی وارث ہے، رکاوٹوں کے باوجود اپنا مشن جاری رکھے گی یا اس نئی تہذیب سے مغلوب ہو جائے گی جو روح پر معیشت کو حاوی سمجھتی ہے"؟

جب اخبار نویس حضرات "روح پر معیشت کے حاوی ہونے" کا ذکر کرتے ہیں تو وہ غیر شعوری طور پر اپنی جہالت کا یا پھر —— اس کا زیادہ امکان ہے —— بے شرمی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعضوں نے "روحانی" آزادی کے فریب سے اب تک نجات نہ حاصل کی ہو حالانکہ وہ پوری طرح ان اڈیٹروں کے دست نگر ہوتے ہیں جن کے جسم و روح پر پبلشروں، بینکروں، سرمایہ داروں اور اسلحہ کے مالکوں کا قبضہ ہوتا ہے۔

اگر یہ سادہ لوح اخبار نویس ... سچائی اور احتیاط سے اپنی اطراف نظر ڈالیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ دو پاؤں والی مکڑیوں کی ٹھیک یہی "معیشت" جس کا اظہار نجات ہی کردہ طریقوں سے ہوتا ہے، سرمایہ دار ریاستوں ہی میں حاوی ہے۔ برخلاف اس کے "نئی تہذیب" محنت کش انسانیت کو اس بے معنی معیشت سے نجات دلانا چاہتی ہے جسے ..... موجودہ بورژوا تہذیب کے رہنماؤں کی "روح" نے جنم دیا ہے۔ اسی سماج میں انفرادی آزادی کا خواب دیکھنا اور اس کا تذکرہ کرنا انتہائی مضحکہ خیز ہے جہاں عوام —— جن میں اخبار نویس بھی شامل ہیں —— بھیڑ اور بکروں کی طرح بہ آسانی خریدے اور بیچے جا سکتے ہوں۔

بورژوا تہذیب کی گندہ "روح" میں جو زہر سرایت کر چکا ہے اس کا صحیح اندازہ خود دغابازی کی گرم بازاری اور دغابازوں کے کھوکھلے پن سے ہوتا ہے۔۔۔ ۔۔ ...

آج غداروں کی تعداد میں جو کمیاتی اضافہ اور ان سے نفرت میں جو کیفیاتی شدت پیدا ہو رہی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ بورژوا "روح" کتنی خبیث اور تنزل یافتہ شکل اختیار کر چکی ہے۔ .... اس کا اندازہ بورژوازی کی زندگی کی اس تصویر سے ہوتا ہے جسے یورپ کے اخبار نویس دلفریب انداز میں آئے دن پیش کیا کرتے ہیں۔ خونریزی اور گندگی کے اس مشغلہ نے ان اخبار نویسوں کو اس قدر بےحس بنا دیا ہے کہ اب ان میں اپنے مشاہدات سے نتائج اخذ کرنے کی خواہش ہی باقی نہیں رہی ہے۔ وہ بظاہر غیر جانبداری سے صرف "واقعات کو قلمبند" کرتے ہوئے بھی انھیں خون اور گندگی سے آلودہ کر دیتے ہیں تاکہ اس طرح اپنے بورژوا قارئین کی تفریح کا سامان مہیا ہو۔ اور یہ قارئین جرائم کے تذکرہ اور توصیف سے متاثر ہو کر اور بھی گستاخ اور بے وقوف بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ متوسط اور ادنیٰ متوسط طبقہ کا سب سے زیادہ مقبول ادب جاسوسی کہانیاں ہے۔

کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ اس گندگی اور تنزل میں "یونانی اور لاطینی تہذیبی قدریں" کہاں اور کس شکل میں محفوظ ہیں؟ "مادی" قدروں کی حیثیت سے وہ عجائب خانوں اور امیروں کے دیوان خانوں میں بند ہیں جہاں محنت کش عوام

اور ادنیٰ متوسط طبقہ کا گزر نہیں ہو سکتا۔ "روحانی" قدروں کی حیثیت سے ——— مثال کے طور پر ——— ایچی لس، سوفوکلیس، یوری پیڈیس کی تصانیف تھیٹروں میں پیش کی جا سکتی تھیں لیکن یورپ میں یہ بھی نہیں ہوتا۔ بورژوا یونیورسیٹیوں میں پروفیسر قانون روما پر، قدیم یونانی فلسفہ پر اور دوسری قدروں پر لکچر دیتے ہیں جن میں بین الاقوامی قانون یہاں تک کہ زمانہ وسطیٰ کی انسان دوستی کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ یورپ کے اخبار نویس بتائیں کہ موجودہ زندگی کے انتشار میں یہ قدریں کہاں دستیاب ہو سکتی ہیں؟ اور ان کی عملی تعلیمی اہمیت کیا ہے؟ ....

موجودہ یورپ کے حکمران طبقہ کے زوال اور انتشار کا جو عمل جاری ہے اس میں بورژوا اہل علم کا مقام انتہائی عجیب اور حسرت ناک ہے........ ۱۹۱۴ء میں یورپی بورژوازی نے ایسے ہزاروں اہل علم کو معمولی سپاہیوں کی طرح محاذ جنگ پر بھیج کر انھیں مجبور کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کا خون بہائیں۔ یہ وہی "آقایان تہذیب" ہیں جنھوں نے ہاتھ پاؤں سے معذور ہونے، زہریلی گیس کا شکار بننے اور مرنے سے بیشتر شہروں کی تباہی، زرخیز زمینوں کی تاراجی اور تہذیب کی بربادی میں عملی حصہ لیا تھا........ اب بورژوازی اس سے بھی وسیع پیمانے پر ایک نئے عالمگیر قتل عام کی تیاری کر رہی ہے..... بہت ممکن ہے کہ آئندہ جنگ میں برٹش میوزیم، لورے اور قدیم دار السلطنتوں کے بے شمار عجائب گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے اور ذہنی قوت رکھنے والے ہزاروں انسان، ہزاروں "آقایان تہذیب" اور لاکھوں طاقتور مزدور اور کسان موت کا شکار ہو جائیں۔ اور یہ سب کس مقصد کے لئے؟ صرف اس لئے کہ چند بڑے نفع خور اور بینکر دوسرے گروہوں کو غلام بنا کر اپنی ہوس رانیوں کی تشفی کریں۔ یہ بات کئی بار اور پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ جو قتل عام وقفہ وقفہ سے بورژوازی کے ہاتھوں ہوتا ہے وہ مسلح لوٹ ہے، وہ ایسا جرم ہے جو تمام ملکوں کے بورژوا قانون کی رو سے بھی مستوجب سزا ہے.......

"معیشت کے عادی ہونے" کا اظہار تو جائداد والوں کی عامیانہ اور حیوانی مادیت سے ہوتا ہے۔ اس موٹے دو پاؤں والے جانور کی حریصانہ مادیت کی زہرآلود "روح" اب تو مذہب اور فلسفہ کے بوسیدہ چیتھڑوں سے بھی بے نیاز ہو چکی ہے۔ فاشزم نسلی نظریہ مسلح غارتگری ہی کا مجنونانہ اور کھلا اعتراف ہے....

لیکن ایک سرزمین ایسی بھی ہے جہاں تمام مزدوروں اور کسانوں کے ارادہ اور ان کی ذات کو سماجی طور پر ضروری محنت کے ذریعہ جو تمام محنت کشوں کے لئے یکساں مفید ہے، متحرک کیا جا رہا ہے۔ جہاں مزدوروں کی تمام صلاحیتیں نئے حالات زندگی کی تخلیق میں ——— ایک نئے اشتراکی تہذیب کی تخلیق میں صرف کی جا رہی ہیں۔

جہاں مزدوروں نے مارکس اور لینن کی تعلیمات کی پیروی اور جوزف اسٹالن کی رہبری میں کسان طبقہ کو زمین کے احمقانہ اقتدار سے، فطرت کی تلون مزاجی سے اور خانگی ملکیت کے مسموم اثرات سے آزاد کیا ہے۔ جہاں مزدور طبقہ نے جائداد کے مالک کو اجتماعی انسان بنا دیا ہے۔

جہاں پرولتاریہ ——— جو بورژوا سماج میں صرف محنت و مشقت ہی برداشت کرتا ہے ——— یہ ثابت کر چکا ہے کہ وہ علم سے آراستہ ہو کر تہذیب کا مالک اور خالق بن سکتا ہے۔ جہاں کسی فرد کے تہذیبی کارنامے کی قدر پوری محنت کش آبادی اس سے کہیں زیادہ کرتی ہے جتنی کبھی کہیں اور ہوتی ہو گی۔ جہاں یہ قدر افزائی فرد کے نشو و نما اور اس کے کام میں مسلسل معاونت کرتی ہے۔

جہاں عورت ـــــ ملک کی آبادی کا نصف حصہ ـــــ مردوں کے مساوی سمجھی جاتی ہے اور ان کے شانہ بہ شانہ ہر شعبۂ زندگی میں کام کرتی ہے ۔جہاں عقلی قوت کو استعمال کیا جاتا ہے ۔جہاں عورتوں کی صلاحیتوں میں ان کے کام کرنے کے جوش و خروش میں غیر معمولی رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے ۔

جہاں بچوں کی پرورش کلیسا کے مخرب اخلاق ماحول میں نہیں ہوتی ۔جس کا مقصد انسانوں میں علم' مسکینی اور " آنے والی قوتوں'' کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرنا ہے ۔

جہاں مختلف اور عددی اعتبار سے ناقابل لحاظ' نیم وحشی باشندے جن کی پہلے کوئی تحریری زبان نہ تھی اب اپنا ادب رکھتے ہیں اور آزادانہ ترقی کرنے کا حق پا چکے ہیں ۔ اب دنیا ان کے خیالات اور جذبات کی ابتدائی شگفتگی سے' ان کے کام کرنے کی صلاحیت اور ان کی شاعری کی حسین سادگی سے روشناس ہو رہی ہے ۔

جہاں قدیم قبیلے' جن کی تہذیب کو نفع بازوں اور زار کی سامراج پالیسی نے کچل دیا تھا' اب اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور آزاد شدہ اسپرٹ کے جواہر کو اجاگر کر رہے ہیں ۔

اس سرزمین میں آرٹسٹ اور سائنس داں صرف محنت کش عوام کی خدمت بجا لاتا ہے جو انسانیت کی جملہ تہذیبی قدروں کو جذب کرنا اور اپنانا چاہتے ہیں ۔

لیکن یہ سرزمین دشمنوں سے گھری ہے جو اس کی دولت پر رشک کرتے اور دنیا کے محنت کشوں پر اس کے مفید اثرات سے ڈرتے ہیں ۔ وہ اس سرزمین کو لوٹنے' برباد کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں ۔ اس لئے ماضی کو جاننے کی حقیقی خواہش' جو مستقبل کی تعمیر کے لئے ناگزیر ہے' کسی قدر ملک کی مدافعت کی ضرورت کے تابع ہو گئی ہے اور اس طرح اس کی مادی تہذیب کے نشو و نما اور پھیلاؤ میں ایک حد تک ڈھیل دے دی گئی ہے ۔ ماضی سے واقف ہونے کی یہ خواہش ایک حد تک اس وجہ سے بھی محدود ہو گئی ہے کہ بورژوا تہذیب کی میراث میں کھرے اور کھوٹے کی بری طرح آمیزش ہے اور انسانی تاریخ کے متعلق بورژوا تعلیمات کی "اصلیت'' ان تمام فریب کاریوں سے مملو ہے جن سے ایک بوڑھی تجربہ کار قحبہ ایک معصوم لڑکی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے ۔

پرولتاریہ کو انسان عزیز ہے ۔ اگر کوئی شخص سماج دشمن رجحانات ظاہر بھی کرے اور کچھ عرصے کے لئے سماجی طور پر خطرناک بن جائے تب بھی اسے قید خانہ کی مخرب اخلاق بے عملی کا شکار ہونا نہیں پڑتا بلکہ اسے ایک شاق مزدور اور سماج کے ایک کارآمد رکن بنانے کی غرض سے ازسرنو تعلیم دی جاتی ہے ۔"مجرم'' کے ساتھ پرولتاریہ کا یہ طرز عمل اس کی انسان دوستی کے عملی پہلو پر روشنی ڈالتی ہے ۔ یہ انسان دوستی اس سماج میں نہ کبھی تھی اور نہ ہو سکتی ہے جہاں انسان انسان کے حق میں بھیڑیا ہوتا ہے ...... یہاں ایسے بہت سے نئے کاموں کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے جو بڑی سرعت سے اس ملک کو مالا مال کر رہے ہیں اور قطعی طور پر اس کی طبعی شکل و صورت میں تبدیلی کر رہے ہیں .... اس ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ محنت کی کمی محسوس کی جا رہی ہے' اور یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جب یورپ اور امریکہ کے نفع بازوں نے لاکھوں انسانوں کو بے روزگار کر رکھا ہے ۔

سوویت یونین میں یہ سب کچھ بیس سال سے ہی کم عرصہ میں ہوا ہے اور اسی سے اس کے باشندوں کی قابلیت اور ان کی جرأت آمیز محنت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے ملک میں محنت آرٹ کی

شکل اختیار کر رہی ہے اور سوویت یونین کا پرولتاریہ لینن اور اس کی پارٹی کی تعلیمات کی رہبری اور جوزف استالن کے نہ ختم ہونے والے بڑھتے ہوئے جوش عمل کی وجہ سے انسانیت کی ایک نئی تہذیب ایک نئی تاریخ بنا رہا ہے ۔ .... جو کچھ یہاں مختصر اور نامکمل طور پر بیان کیا گیا ہے وہی پرولتاری انسان دوستی کی غیر معمولی تخلیقی قوت کی اساس ہے ــــ وہی مارکس اور لینن کی انسان دوستی ہے۔ یہ وہ انسان دوستی نہیں ہے جس پر حال حال تک بورژوازی اپنی تہذیب و تمدن کی بنیاد کی حیثیت سے ناز کیا کرتی تھی ۔

لفظ "انسان دوستی" کے سوا یہ دو انسان دوستیاں کسی چیز میں بھی مشترک نہیں ہیں۔ لفظ وہی ہے لیکن معنی بالکل مختلف ہیں ۔ بورژوا انسان دوستی تقریباً پانچسو سال پہلے جاگیرداروں اور ان کے "روحانی پیشوا" کلیسا کے مقابلہ میں .... بورژوازی کی حفاظت خود اختیاری کا ایک ذریعہ بن کر نمودار ہوئی تھی ۔ دولتمند بورژوازی، صنعتوں کے مالک یا تاجر جب انسانوں کی "مساوات" کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے مراد خود اپنی شخصی مساوات ہوتی ہے ....

عام طور سے بورژوازی نے مزدوروں کی زندگی کو سدھارنے بجز خیرات کے ــــ جو مزدور سے اس کی خودداری چھین لیتی ہے ــــ کوئی اور ذریعہ استعمال نہیں کیا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ یہ مجہول اور خود پرست بورژوازی "کارخیر" میں ہی ہاتھ بٹاتی ہے یعنی ان ہی کو لوٹا جاتا ہے جنھیں خیرات دی جاتی ہے ۔ اس کے جواز کے لئے اس نے ایک نہایت ہی احمقانہ اور پرفریب حکم گھڑ لیا ہے کہ "جو کچھ بائیں ہاتھ سے دو اس کا علم سیدھے ہاتھ کو نہ ہونے دو" ــــ اور پھر بے حساب دولت لوٹنے کے بعد یہ "آقایان حیات" بڑی سخاوت سے چند ٹکے مدرسوں، ہسپتالوں اور بیت المعذورین پر بھی خرچ کرتے ہیں ۔ ان خود غرض انسانوں کا ادب مظلوموں کے ساتھ "رحم" کی تلقین کرتا ہے لیکن یہ مظلوم وہی ہیں جنھیں خود بورژوازی نے لوٹا اور ذلیل و خوار کیا ہے۔

اگر بورژوا انسان دوستی سچی ہوتی۔ اگر وہ خلوص سے ان لوگوں کو جنھیں اسے غلام بنایا تھا، ابھارتی اور ان میں انسانی عظمت اور اجتماعی قوت کا شعور پیدا کرتی، انھیں اس کا احساس دلاتی کہ دنیا اور قدرت کی قوتوں کو منظم کرتے ہیں انسان کا کیا مقام ہے تو وہ کسی مصائب کے اٹل اور ناگزیر ہونے کا پرچار نہ کرتی اور نہ ہمدردی کا انفعالی احساس پیدا کرتی بلکہ جملہ مصائب اور خاص کر سماجی و معاشی حالات کے پیدا کردہ مصائب سے کلی نفرت دلاتی ... .. برخلاف اس کے ان کم مایہ خود پرستوں کی انسان دوستی ہمدردی کی آڑ میں ان خوفناک مصائب کو برداشت کر لینے کی تبلیغ کرتی ہے جو طبقاتی تعلقات کا نتیجہ ہیں اور جنھیں اٹل اور مستقل ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ مصائب اسی شرمناک تقسیم کا نتیجہ ہیں جس نے انسانوں کو اعلیٰ اور ادنیٰ نسلوں میں سفید فام امراء اور سیاہ فام غلاموں میں بانٹ دیا ہے۔ اسی تقسیم نے محنت کشوں کے مفادات کی یک جہتی کے احساس کو کچلا ہے۔ ...... لیکن انقلابی پرولتاریہ کی انسان دوستی کھری اور بے لاگ ہے۔ وہ پرشکوہ اور دل خوش کن اصطلاحوں میں انسانی محبت کا پرچار نہیں کرتی ۔ اس کا مقصد ساری دنیا کے مزدوروں کو سرمایہ داری کے شرمناک، خونیں اور مجنونانہ تسلط سے آزاد کرانا ہے، انسانوں کو یہ سمجھانا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایسی تجارتی اشیا نہ سمجھیں جو خریدی اور بیچی جاسکتی ہوں۔

انھیں یہ بتلانا ہے کہ وہ ایسی خام اشیا نہیں ہیں جو چند مجہول اور خود پسند اشخاص کی تعیشات کا سامان فراہم کرتی رہیں۔

.... پرولتاریہ کی انسان دوستی محبت کے عاشقانہ گیت نہیں چاہتی بلکہ وہ ہر مزدور سے اس کے تاریخی مشن کے احساس کا اس کے حق اقتدار کے شعور کا ــــــ ایک انقلابی سرگرمی کا مطالبہ کرتی ہے .... وہ اس کا مطالبہ کرتی ہے کہ تہذیب دشمنی، مجہولیت، اور خود پسندی سے، سرمایہ دارانہ اقتدار اور اس کے خدمت گاروں اور طفیلیوں سے، فاشسٹوں اور قاتلوں سے، مزدور طبقہ سے غداری کرنے والوں سے نفرت اور حقارت کی جائے ــــــ نفرت ان تمام چیزوں سے جو مصائب کا باعث ہیں، نفرت ان تمام لوگوں سے جو لاکھوں انسانوں کے مصائب پر جی رہے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ حقائق اور واقعات کے اس مختصر خاکہ سے بورژوازی اور پرولتاری تہذیب کی قدریں ہر ایماندار آدمی پر واضح ہو جائیں گی (۱۹۳۵)

(مترجم) **شہاب الدین**

فانی بدایونی

اردو غزل گوئی نیم وحشی صنفِ سخن ہو یا محض روایت پرستی مگر کبھی کبھی اس تاریکی میں ایسے شعلے بھی لرز اٹھتے ہیں کہ دل کی فضا کچھ دیر کے لئے بے قرار ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے وجدان کی تعمیر میں قدیم روایات کا بہت شاندار حصہ ہے۔ روایتی شاعری میں مقدار اور تعداد کا اضافہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے نئی خصوصیتیں مشکل سے پیدا ہوتی ہیں۔ صرف مضبوط اور جاندار انفرادیت رکھنے والے اس دائرے کو توڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اپنے حدود ہی کے اندر رہ کر اپنے سینے کی آگ اور اپنے دل کا گداز اپنی شاعری میں بھر دیتے ہیں پھر چونکہ ان کے پڑھنے والے اپنے معاشی اور معاشرتی روابط کی وجہ سے خود اس ماحول سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں اس لئے اثر ان کی خصوصیت بن جاتا ہے۔ ہم اور آپ غزل کی شاعری سے متنفر ہوں، عاجز ہوں، اسے مٹا دینے کے درپے ہوں، ایام جاہلیت کی یادگار سمجھ کر اس دورِ تہذیب کو اس سے پاک کر دینا چاہتے ہوں، سننا نہ چاہتے ہوں، سن کر اثر لینے سے دور بھاگتے ہوں، مگر ہمارے مضبوط ارادوں کا قلعہ توڑ کر کوئی میرؔ کوئی غالبؔ، کوئی آتشؔ، کوئی حسرتؔ، کوئی جگرؔ، کوئی فانیؔ، کوئی فراقؔ ہمارے وجود کے اندر جھانکتا ہے اور وہ نغمہ چھیڑتا ہے جسے ہماری روح قبول کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ زندگی کی کوئی گہری حقیقت، غم، درد اور محبت کا کوئی پریشان کرنے والا خیال۔ ان سے بھاگ کر کوئی کہاں جائے گا! ان کی آواز پیچھا کرتی ہے اور اشعار دہرانے پڑتے ہیں کیونکہ صرف عقل ہمیں ان سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرے تو کرے ہمارا دل اب بھی انھیں پناہ دیتا ہے اور غالباً دیتا رہے گا۔ پھر غور کیجئے تو غزل صرف دل کی شاعری ہے بھی نہیں اسے عقل سے گہرا تعلق ہے اور یہی امتزاج اچھا غزل گو پیدا کرتا ہے۔ اس نئے تصور سے چاہے تغزل اور (LYRICISM) کا مفہوم مجروح ہوتا ہو یا بدلتا ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ اچھا غزل گو عقل کے مسائل سے بہت زیادہ دور نہیں رہتا۔ فانی ایسے ہی غزل گویوں میں سے ایک ہیں۔

فانی بدایونی نے ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو حیدرآباد میں انتقال کیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۲ سال کی تھی اور اگر ان کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی موت بہت پہلے واقع ہو چکی تھی۔ یا واقع ہونا شروع ہو چکی تھی اور یہ ۶۲ سال ایک "مرگِ مسلسل" کی طرح گزرے۔ ہر لمحہ انھیں موت کا انتظار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شکست کھائی ہوئی انفرادیت نے اپنے اندر ایک طرح کی "خواہشِ مرگ" (DEATH-WILL) پیدا کر لی تھی اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے ذہن مختلف صورتیں اختیار کیا کرتا تھا

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یارب موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہئے تھا

فانیؔ کا نام شوکت علی خاں تھا۔ شوکت تخلص ہو سکتا تھا لیکن انہوں نے فانیؔ تخلص رکھ کر اس خواہش کی تسکین کا سامان کیا۔ یہ بات تنقید کے لئے بہت اہم نہ ہو لیکن نفسیاتی حیثیت سے فانی کے مزاج اور افتادِ طبع کے بہت سے بھید کھول دیتی ہے۔ اس خواہش کے ماتحت وہ کسی وقت موت کے خیال سے غافل نہ رہے۔ زندگی کی وہ تلخیاں جو ایک انفرادیت پسند حساس شاعر کے ہاں بیماری بن جاتی ہیں فانی کے ساتھ ساتھ رہیں۔ وہ ایک وارفتہ مزاج شاعر تھے، عاشقانہ طبیعت رکھتے تھے اور عاشقانہ طبیعت میں خود ایک طرح کی انفرادیت ہوتی تھی۔ محبت اگرچہ ایک اجتماعی اور معاشرتی جذبہ ہے لیکن مختلف قسم کے اخلاقی تصورِ حیات میں مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ فانیؔ کے لئے وہ ایک مخصوص انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس میں ناکامی انھیں زندگی کے اس دھارے پر ڈال دیتی ہے جہاں انفرادیت مجروح ہو کر سانپ کی طرح بل کھاتی ہے اور زہر اگلتی ہے۔ جب وہ زمانے کے آئین و قوانین کو، رسم و رواج کو، ماحول اور سماج کو اپنے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کا نشانہ نہیں بنا سکتی تو اپنی انفرادیت کے خلاف بغاوت بلند کرتا ہے اور اسی کا گلا گھونٹ کر تسکین حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنے ہی گریبان میں زور چلتا ہے اور "خواہشِ مرگ" قوی سے قوی تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

فانیؔ کا پیشہ وکالت تھا۔ لیکن دونوں میں بہت بُعد تھا۔ وکالت ان کے لئے ایسی تھی جیسے کسی "گول خانے میں چوکھٹی چیز" بٹھانے کی کوشش کی جائے مگر ہمارا نظامِ تمدن اس کی کب فکر کرتا ہے کہ افراد کی اصل صلاحیتوں سے کام لیا جائے۔ طاقت کی بربادی کا ایک سلسلہ جاری ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو جہاں ہے وہاں خوش نہیں۔ فانیؔ بھی اسی طرح ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے جو ان کی تمناؤں سے ہم آہنگ نہ تھی ان کی شخصیت چیختی تھی، دماغ احتجاج کرتا تھا، دل بغاوت کرتا تھا، ہڈیاں چٹختی تھیں لیکن زمانے کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوتی تھی۔ کون جانتا ہے کہ فانیؔ کو انھیں تجربات نے جبر کا قائل نہ بنا دیا ہو۔ اس زندگی سے نجات صرف موت دلا سکتی تھی۔ اس لئے ہر وقت موت کا انتظار ——— ہر وقت ہے

آج روزِ وصال فانی ہے موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

چمن سے رخصتِ فانیؔ قریب ہے شاید کچھ آج بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

جب دیکھئے جی رہا ہے فانیؔ ! اللہ رے اس کی سخت جانی

لذتِ فنا ہرگز گھٹتی نہیں یعنی دل ٹھہر گیا فانیؔ موت کی دعا کر کے

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانیؔ — زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

آ، اب اے مرگِ ناگہانی، آ — سخت منتظر ہیں تیرے شیدائی

چارۂ دردِ زندگی تو ہے — کر اگر ہو سکے مسیحائی

فانیؔ تلخ کام کی امید — تو اگر آئی، تو بر آئی

فانیؔ ہی وہ ایک دیوانہ تھا جو موت سے پہلے مر جائے

کیا ہوش کی کافر دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

اور ایسے ہی سیکڑوں شعر! زندگی کو موت میں تبدیل کر لینا، زندگی کو موت سمجھنا، مرنے سے پہلے مر جانا، یہ سب اسی خواہش مرگ کے پہلو ہیں جو نہ خودکشی میں تبدیل ہوتے ہیں اور نہ بغاوت میں۔ غور و فکر کے بہت سے مواقع آتے ہیں۔ عمل کا کوئی موقعہ نہیں نکلتا۔ اسی وجہ سے فانیؔ کا رنج و الم گہرا اور فلسفیانہ ہے۔ غم دو چار دن کا ہوتا تو اس میں رقت پسندی، جذباتیت اور بھڑک بجھ جانے کی کیفیت ہوتی لیکن جب غم زندگی بن جائے، جب جینا گناہ معلوم ہو، جب زندگیٔ جاوید کی خواہش بھی عزیز نہ رہے اس وقت موت سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں، اسی کی تاریکی روشنی پیدا کرتی ہے، اسی کے ظلمات میں آبِ حیات ملتا ہے اور معشوق کی خواہش بھی بھیس بدل کر موت ہی کے پردے میں چھپ جاتی ہے ؎

ادا سے آڑ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے

مری قضا کو وہ لائے دولہن بنائے ہوئے

یہی وجہ ہے کہ فانیؔ کی موت خوفناک اور ڈراؤنی نہیں، وہی زندگی کے پیچیدہ معمہ کو حل کرتی ہے۔ وہی سکون لاتی ہے۔ قنوطیت اور یاس جہاں زندگی کا مقصد بن جاتے ہیں فانیؔ وہاں کھڑے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں مرگ کی تکرار فلسفۂ حیات کے سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ زندگی جو ان کے لئے دیوانے کا خواب ہے ان کے پیش نظر ہے وہ اسی کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اس گتھی کا سرا ابھی نہیں ملتا کیونکہ ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یہ صوفیانہ مذاق کی کارفرمائی نہیں ہے! یہ لفظوں کے ساتھ کھیل نہیں ہے۔ یہ شکست کھائے ہوئے شدت احساس کی آواز ہے کہ زندگی کی ابتدا اور انتہا کے نہ معلوم ہونے پر وہ حصہ بھی وہم معلوم ہونے لگتا ہے جو نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ جستجو کی منزل ہے جو یاس کی تاریکیوں میں کھوئی گئی ہے۔ یہاں پہونچ کر بہت سے سوچنے والے فانیؔ کے ساتھ ہو جائیں گے اور بہت سے ان کا ساتھ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کریں گے۔ تصوریت اور واقعیت، عینیت اور حقیقیت ان دونوں راستوں سے زندگی اور موت کے راز کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فانیؔ نے پہلا راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے بہت سوچا لیکن انھیں اس کا جواب نہ مل سکا کہ زندگی کسے کہتے ہیں۔ ہاں موت کے بارے میں البتہ انھوں نے ایک فلسفہ سا بنا لیا تھا۔ زندگی ٹھوس مادی حقائق سے لبریز ہے۔ اس کے تغیرات کا سلسلہ پہلے مادی روابط میں تلاش کرنا چاہیے جسے تصوریت کے حامی نظر انداز کر جاتے ہیں لیکن موت کا راز تو تخیل آفرینی کی مدد سے حل کیا جا سکتا ہے اور اس کے سمجھنے اور اس سے تسکین پانے کے لئے تصوراتی باتیں نکالی جا سکتی ہیں۔ یہی فانیؔ نے بھی کیا ؎

زندگی خود کیا ہے فانیؔ یہ تو کیا کہیئے مگر

موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

ان کی خواہش مرگ اتنی قوی تھی کہ ان کے یہاں ذوق کا وہ شک بھی پیدا نہ ہوا کہ "مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"۔

غزل گوئی فطری شاعری ہے یا نہیں، یہ ہمارے بڑھتے ہوئے خیالات کا ساتھ دے سکتی ہے یا نہیں، اسے مٹ جانا چاہئے یا رہنا چاہیے، ان بحثوں سے قطع نظر فانیؔ مکمل غزل گو ہونے کے باوجود

عام غزل گو شعراء سے بہت مختلف ہیں کیونکہ ان کے یہاں ایک طرح کا فلسفیانہ تسلسل پایا جاتا ہے۔ ان کا ایک الگ انداز بیان بھی ہے۔ یہ چیز انھیں غزل گو شعراء میں بہت بلند مرتبہ بناتی ہے۔ اگر کوئی غزل گو ہمارے سامنے زندگی کے مسائل، محبت کے مسائل، ان کی پیچیدگیاں اور ان کے حل پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی شاعری موجودہ دور کے لوگوں کے لئے بھی اپنے دامن میں کچھ بجلیاں رکھتی ہے۔ فانی کے یہاں ایسی بہت سی بجلیاں ہیں۔ انھیں زندگی اور موت کا بھید معلوم کرنے کی تمنا ہے۔ وہ عشق اور عشق کی کیفیات کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ انسانی طاقت اور اختیار کے حدود دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسائل کسے پریشان نہیں کرتے اجتماعیت پسند اور انفرادیت پسند دونوں ان مسائل پر غور کرتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ اجتماعیت پسند انھیں پھیلا دیتا ہے، جواب کہیں اور ڈھونڈھتا ہے اور کہتا ہے ع

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں پھر ل کر تدبیریں سوچیں (فیض)

لیکن انفرادیت پسند تنہا ہونے کی وجہ سے شکست کھا جاتا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ؎

راس آئے ہیں اشک و آہ کسے
کرنہ آب و ہوائے غم سے ساز (فانی)

"آب و ہوائے غم سے ساز" کر لیتا ہے اور اس مصالحت کو عاشقانہ کیف کا رنگ دیتا ہے ؎

کیا کروں نازک بہت ہے ان کی مرضی کا سوال
ورنہ فانی اس جئے جانے سے کچھ حاصل نہیں،

محبت، زندگی اور موت، جبر اور اختیار، ان کا ایک دائرہ ہے جن میں فانی کا داغ گھرا ہوا ہے اور سب کے اوپر فنا اور بربادی کی ایک تلوار لٹکتی رہتی ہے جو امیدوں کو پنپنے کا موقع نہیں دیتی۔ اگرچہ امیدیں بھی مجبوری کا ایک جزو ہیں اور تمنائیں بھی جبر کی آفریدہ۔ فانی نے جبر کے حدود کو دیکھتے ہوئے ایک دنیا تعمیر کر لی تھی جس میں بہار نہیں آتی، جس میں دور عشرت نہیں آتا، جس میں لوگ ہنس نہیں سکتے، جس میں زہر، ویرانی، نشتر، اندھیری راتیں، خون تمناؤں کے گھونٹے ہوئے گلے، موت کے بھیانک پروں کی سرسراہٹ ہے۔ اس دنیا میں سب دبے پاؤں چلتے ہیں، اگر بہار آتی ہے تو اس لئے کہ خزاں آ کر اسے تباہ کرے، اگر دور جام ملتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ کسی کو زہر دیا جانے والا ہے۔ اگر شمعیں روشن کی جاتی ہیں تو اس لئے کہ انہیں ہوائیں بجھا دیں۔ ایسی دنیا تعمیر کرنا اور اس میں بسنا کسے پسند ہو سکتا ہے لیکن فانی کہتے ہیں کہ کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ انسان کی فطرت اس مجبوری کو مان لینے کے بعد بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ بھی مجبوری کے ماتحت ہوتا ہے یا اتنا اختیار رہتا ہے۔ فانی نے طنز سے کام لیا ہے ؎

کچھ امید کرم میں گزری عمر　　کچھ امید کرم میں گزرے گی
اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یا رب　　در و دیوار دیئے اب انھیں ویرانی دے

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اندر جو اختیار کی طاقت ہے وہ جبر سے نہیں دبتی اور اگر انسان عمل پسند نہیں ہے تو بھی اسے ذہنی طور پر حرکت کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ فانی کی شاعری کبھی کبھی اتنی متحرک بھی ہو سکتی تھی ؎

ہاں شب ہجراں آج صبح نہ ہو　　ہاں چلی جائے یاد زلف دراز

کون باعزم اور عمل پسند اپنے نصب العین کے حاصل کرنے میں اس جوش سے کام لینا پسند نہ کرے گا؟ فانی کے تمام نقاد قریب قریب اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی شاعری عام معیار تغزل سے بلند تھی، ان کے خیالات اور محسوسات ان کے ذاتی تخیلی تجربہ کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے اندر ایک طرح کی فلسفیانہ بصیرت تھی جو انھیں

اپنے تجربات کو فلسفیانہ سانچے میں ڈھالنے کی طرف مائل کرتی تھی۔ اس طرح جنون اور حکمت عقل اور دل، علم اور عشق کا امتزاج پیدا ہوتا ہے لیکن دل کا قابو عقل پر ہے اس لئے اگر کبھی اس بات کا احساس ہوتا بھی ہے کہ دل ناکامی کی جانب لے جا رہا ہے تو اس سے نکلنے کے لئے جس توانائی اور قوت ارادی کی ضرورت ہے وہ حاصل نہیں ہوتی۔ فانی کا ایک فارسی شعر ہے

از جلوتیاں لذتِ عیشِ نگہے پرس
بر خلوتیاں فرصت نظارہ حرام است

یہ ان کی خواہش مرگ کا مظہر ہے اور مجبوریوں کے ہوتے ہوئے جبر کی گرفت میں رہنے کے باوجود، فانی نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ انھیں جلوتیوں میں نہیں خلوتیوں میں شامل سمجھا جائے۔

فانی کے بعض اشعار جنھوں نے مجھے تڑپایا ہے آپ بھی سنیئے

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے — تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے
اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے — میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے
سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا
روحِ اربابِ محبت کی لرز جاتی ہے — تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر
بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا — مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا
لبریز متوج تھا اک خطِ پیمانہ — محفل سے جو وہ اٹھے لیتے ہوئے انگڑائی
کیوں فلک! انتہا ہوئی کہ نہیں — ایک دم رہ گیا ہے اب دم سا
مجھے خبر ہے تیرے تیرِ بے پناہ کی خیر — بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا
میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات — جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے
محو تماشا ہوں میں یا رب کہ مدہوشِ تماشا ہوں — اس نے کب کا پھیر لیا منہ بیگانۂ تغافل ہوں
ہیں ندامت جان کر خوش ہوں یہ منظر دیکھنا — وہ مجھے تڑپا کے تیرا پھر نہ مڑ کر دیکھنا
صبح تک فانی ہر آوازِ شکستِ دل کے ساتھ — کیا قیامت تھا وہ تیرا جانبِ در دیکھنا
نامہربانیوں کا گلہ تم سے کیا کریں — ہم بھی کچھ اپنے حال پہ اب مہرباں نہیں
پچھتائیں گے آپ دل کو لے کر — کم بخت غم آشنا بہت ہے

کیا بلا تھی ادائے پرسشِ یار — مجھ سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر — کچھ امیدِ جواب میں گزری

مختصر یہ کہ غم عشق اور غم روزگار دونوں نے فانی کو وہ کچھ بنا دیا تھا جسے وہ اپنے کلام میں ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اور زندگی میں ہم آہنگی ہے جسے تجربہ کی شاعرانہ صداقت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فانی کے یہاں میر کے گداز اور غالب کے علو کا امتزاج ہے۔ ممکن ہے ایسا بھی ہو لیکن فانی، میر اور غالب میں سے کسی کے قریب ہوں یا نہ ہوں، اپنی ذات سے بہت قریب تھے اور اسی کی ترجمانی نے ان کی شاعری میں اثر پیدا کر دیا ہے

فانی غزل گو تھے اور غزل گوئی میں مکمل آسودگی کا سامان نہیں ہے۔ زندگی کے بہت سے مسائل غزل پر بار ہو جاتے ہیں۔ اور تمام مسائل کو غزل ہی کے ڈھانچہ پر بننا ایک جانب تو ان مسائل پر ظلم ہے، دوسری جانب غزل پر۔ اس لئے فانی کا مطالعہ کرتے وقت اس کا خیال رکھنا پڑے گا کہ غزل جس نظام تمدن سے وابستہ رہی ہے اس میں انقلاب آچلا ہے۔ اس لئے غزل میں مکمل تسکین کا پہلو پیدا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ فانی ہی کا شعر یاد آتا ہے

اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز
میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز

فانی کی انفرادیت پسندی اور غزل کی انفرادیت پسندی دونوں کا دور ختم ہو چکا ہے اب نئے سرے سے ساز چھیڑنے کا وقت آگیا ہے۔ شاید کوئی نیا نغمہ نکلے، کوئی نیا گیت سنائی دے جو اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ زندگی کے معمہ کو حل کر سکے۔ زندگی کے معمہ ہی کو حل کرنا فانی کا مقصد بھی تھا لیکن وہ الجھ کر رہ گئے۔ انھوں نے وجدان سے کام لینے کی کوشش کی اور زندگی "دیوانے کا خواب" بن گئی جو نہ سمجھی جا سکتی ہے اور نہ سمجھائی جا سکتی ہے۔ لیکن دوسرے راستے

بھی ہیں جن پر فانی کی نگاہ نہ جا سکی اور وہ اپنی انفرادیت پسند شخصیت کا شکار ہو کر رہ گئے۔

فانی کے احساس کی شدت کا اثر ان کی شاعری کے ظاہری محاسن پر بھی پڑا تھا۔ ان کا فلسفۂ زندگی اور عقیدہ جبر نیا نہ تھا۔ صدیوں انسانی دماغ نے اس کی پرورش کی تھی، ان کی قنوطیت نئی نہ تھی۔ ان کے خیالات انوکھی طرح پیش ہونے کے باوجود نئے نہ تھے کیونکہ ان کی صدائے بازگشت فارسی اور اردو شعراء کے یہاں بہت دنوں سے گونج رہی تھی، اور اب بھی گونج رہی ہے۔ ایسی شاعری میں اثر کی کمی پائی جا سکتی ہے لیکن فانی کے یہاں اثر کی کمی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں صرف روایتی طور پر دہرا دی گئی ہوتیں تو ان میں تاثر آفرینی کی صلاحیت نہ ہوتی۔ لیکن خلوص اور ذاتی اثر پذیری نے ان کے طرز اظہار میں واقعیت پیدا کر دی ہے اور لب و لہجہ میں ایک نئی کھنک سنائی دیتی ہے جو خلوص کے بغیر ممکن نہیں۔ جبر و اختیار کے رسمی عقیدہ میں ذاتی اعتقاد کی وجہ سے قنوطیت میں بھی زندگی کی الم انگیزی کے سبب نیا پن ہے جو طرز اظہار میں نمایاں ہوتا ہے۔ اور فانی کو دوسرے غزل گویوں سے الگ کر دیتا ہے۔ پرانے اشارے اور قدیم علامات میں نئے گوشے پیدا ہو کر ان کی شاعری کو فرسودگی کا شکار ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ اس طرح فانی کی شاعری کے بعض اجزا بہت دنوں تک کچھ لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرتے رہیں گے۔

احتشام حسین

تاریخ گولکنڈہ ۔ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بڑی سائز سوا تین سو سے زیادہ صفحات قیمت (۳)

جدید شاعری اور حیدرآباد

ہمیشہ کی طرح آج بھی زندگی تعمیر و تخریب کے دوراہے پر کھڑی ہے، اور ایک نئے آدم اور ایک نئی دنیا کی تمنائیں دور بہت دور چراغِ منزل کی طرح چمک رہی ہیں، اور ہمیشہ کی طرح آج بھی ایک نئے صحت مند تمدن کو جنم دینے کے لئے مادرِ کائنات کو ایک خونین لباس سے آراستہ کیا جا رہا ہے، اور جہاں سیاست زمانے کے گرداب میں ہچکولے کھا رہی ہے، سائنس کہیں نازاں کہیں پشیمان اور فلسفہ کہیں بیمار کہیں معالج ہے، وہیں ادب کہیں "ادب برائے ادب" اور ادب برائے زندگی" کی بھول بھلیاں میں پریشان اور کہیں میدان کارزار میں نعرہ زن! ایک طرف تاریکی ہے اور ایک طرف روشنی!! اس دوراہے پر انسانی دکھ درد کا علاج سیاست کو بھی ڈھونڈنا ہے اور فلسفہ، سائنس اور ادب کو بھی! اور یہ کٹھن منزل "نہ "آئین نو" سے "ڈرنے" سے سہل کی جا سکتی ہے نہ "طرزِ کہن" پر "اڑنے" سے!! یہی ایک احساس اور اسی طرح کی ایک فکر ساری دنیا کے ادیبوں اور خصوصاً ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے ادیبوں اور شاعروں کی طرح ہمارے ادیبوں پر بھی طاری رہی، پچھلی جنگ عظیم سے اس جنگ عظمیٰ تک اردو شاعری بہت سے نئے تجربوں سے گزری، اگلے وقتوں کی بہت سی باتیں بھلا دی گئیں اور جہاں بہت سی باتوں کو ایک نئے انداز میں "دہرایا" گیا وہیں بہت سی نئی باتیں سینے میں گھٹ کر رہ گئیں!! ــــــ ابھی "غدر کی یادگاریں غالب کے لئے واہ اور میر کے لئے آہ کہہ ہی رہی تھیں کہ مسدس کے ذریعہ زمانے نے ایک نئی آواز سنی، ایک نئی آواز لیکن کسی قدر دھیمی کسی قدر ہلکی! ــــــ آفتاب کی آخری شعاعوں کی طرح یہ دور بھی گزر گیا، پھر دنیا نے اکبر کے نشتروں کے ساتھ ایک طوفانی گرج بھی سنی اور یہ طوفانی گرج تھی اقبال کی شاعری!! یہ نیا آفتاب چونکہ "غرقِ صد ہزار انجم" کے بعد ابھرا تھا اس لئے دنیا نے اسے آنکھیں کھول کر دیکھا! ساری دنیائے اردو شاعری میں اس کی شعاعیں پہنچیں اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دکنی کے وطن والوں نے بھی اس سے اکتسابِ نور کیا! یہی وہ زمانہ ہے کہ جب جامعہ عثمانیہ کے قیام کی وجہ سے یہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں ایک نئی زندگی ایک نئی ہلچل شروع ہو گئی تھی، توفیق کی میٹھی میٹھی درد انگیز غزلیں سننے کے باوجود اور داغ و امیر کے "احسانمندوں" کے ہوتے ہوئے یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ ایک ادبی تشنگی سی محسوس کرنے لگا تھا اور یہاں کے نوجوان شعراء نے بھی زمانے کے بدلتے ہوئے رخ کو پہچانا اور اس طرح "تنگنائے غزل" سے نکل کر نظموں کی طرف متوجہ ہونے لگے، اس مقام پر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان نئے مسافروں کو ایک نئے راستے پر گامزن کرنے میں اقبال کے علاوہ ان صاحبانِ کمال کی شاعری کا بھی بڑا اثر ہے جو جامعہ عثمانیہ اور دار الترجمہ اور دوسری ملازمتوں کے سلسلے میں حیدرآباد میں مقیم تھے اور ان حیدرآبادی علماء اور شعراء کا بھی اثر ہے جو فراخدل تھے اور زمانہ کا رخ پہچانتے تھے! ہمارے بڑے بھائیوں کی یہ خوش نصیبی ہے کہ مولانا شمسی، ضیا یار جنگ توفیق، کیفی، امجد، عزیز یار جنگ تجلی، مائل، شہرت، صفی، اور علی منظور کے ساتھ ساتھ جلیل، ضامن، باغ، لبیب، ظفر علی خاں نظم، رسوا، سلیم، عظمت اللہ خاں، فانی، جوش، علی اختر، آزاد مسعود علی محوی اور خلیفہ عبد الحکیم کی صحبتیں بھی انھیں میسر آئیں!! ــــــ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن محفلوں میں اب بھی "شمع" گھومتی ہی رہی! اور جن شعراء کے سامنے وہ شمع رکھی گئی ان میں قابل ذکر ڈاکٹر زور

حبیب اللہ رشدی، جلال الدین اشک، اکبر وفاقانی، عبدالقیوم خاں باقی، ابوالکلام بدرالدین بدر، بنی الحسن شمیم، امیر احمد، طاہر علیخاں مسلم، بدرشکیب، تمکین سرمست، وفا مرحوم اور سرمد مرحوم ہیں!

اقبال کا ایک مصرع ہے "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں"
چنانچہ ہماری ادبی محفلیں ان حضرات سے بھی سیر ہو گئیں، اس "نقشِ اول" کے بعد ہم ایک "نقشِ ثانی" کے منتظر تھے، ہمارا پہلا تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا لیکن بہرحال وہ پہلی کوشش تھی طبیعتوں میں جدت ضرور تھی لیکن زبان و بیان کی "لکنت" ایک اور صحت مند تجربہ کی محتاج تھی! ہمارے بڑے بھائیوں کو بھی اس کا احساس تھا چنانچہ ان میں سے اکثر شعرا کی شاعری زمانۂ طالب علمی کے ساتھ ختم ہو گئی اور بعض اب تک ہماری محفلوں میں کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں مگر ان کو زمانے کے نئے تقاضوں اور مطالبات کا پورا پورا احساس ہے اور وہ نہایت خلوص و ہمدردی کے ساتھ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآنے کی سعی کرتے رہتے ہیں، بہرحال ہم ان کے ممنون ہیں!

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد!

مشرق کے شاعر اعظم کا ایک پیام ہے ؎

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

صوفیانہ قسم کے تصور کو ہٹا دینے کے بعد یہ پیام ہندوستان کے نوجوان کے لئے ایک نئی زندگی کی نوید تھا، اسی شعور بیداری نے ہندوستانی ادب میں بھی ایک نئی تحریک کی بنا ڈالی، اور اس تحریک نے "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی شکل میں جنم لیا اس قسم کی انجمن کا خیال غالباً سب سے پہلے فرانس میں پیدا ہوا اور بعد میں ایک ادبی رحمت بن کر اس کی شاخیں ساری دنیا میں پھیل گئیں! لیکن ہندوستان میں اس تحریک کا بھی وہی حشر ہوا جو ہر آزادی پسند تحریک کا ہوا کرتا ہے۔ یعنی شور و غوغا سے ابتدا اور پھر گاٹے باجے کے سے منحوس جھگڑوں پر اختتام! بالخصوص ہندوستانی روایات کے تحت بہت سی "ادبی ذاتیں" بنیں اور ہر کچھ و غلط ادیب نے اپنے نزدیک ترقی پسندی کا مفہوم کچھ کا کچھ مقرر کر لیا، پہلے پہلے "ترقی پسند" ادیب وہی خوش نصیب ہو سکتا تھا جو کمیونسٹ ہو یا کسی نہ کسی طرح روس کو اپنا کعبۂ فکر و نظر سمجھتا ہو، لیکن بعد میں زمانے کے صحیح اور وسیع مطالبات نے اس تصور کو ختم کر دیا اور اب ہر وہ شاعر یا ادیب "ترقی پسند" ہے جو اپنے وطن کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے، جو اس وسیع ملک میں بسنے والی تمام قوموں کو یگانگت اور اتحاد کا آدرش دے، جو سرمایہ داری کی لعنت کو ساری دنیا کے لئے مضر سمجھتا ہو، جو جھونپڑوں کی غلاظتوں میں دم توڑنے والوں کا ترجمان ہو لیکن خود "قالین پر دم توڑنا" جس کا مقصد نہ ہو، اور جس کی تحریریں ہر سامراجی حملہ آور کے خلاف ہم میں جذبۂ نفرت پیدا کریں! لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ندی کے دریا بن جانے کے بعد کتنے ایسے ہیں جنھوں نے اس کی رفتار کا ساتھ دیا، اور کتنے ایسے ہیں جو پایاب تہ میں بیٹھ گئے یا ذرّوں کی طرح کناروں سے چمٹ گئے اور منتظر ہیں کہ کسی موجِ حوادث کے "دو چار تھپیڑے" ان کی طرف بھی آئیں اور وہ "طوفان کا نظارہ "صرف" ساحل" سے نہ کریں! ــــ اب ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ "ہر کس خیال خویش خبطے دارد" والا معاملہ کس نوبت پر پہنچا یا کس نوبت پر ہے، یہاں ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ اظہار کرنا پڑتا ہے کہ وقت کے جائز مطالبہ کی طرف بہت کم "دردمندوں" نے توجہ کی، جدید رجحانات کی نفسیاتی تحلیل، اور غزل و نظم کے غیر شاعرانہ "اصطلاحی" جھگڑوں آزاد نظم و پابند نظم کی

خرافات میں ہم اس قدر الجھ گئے کہ یادش بخیر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سارا ہندوستان انشاء و مصحفی کا لکھنؤ ہے!! کیا تاریخ اس طرح بھی اپنے کو دہراتی ہے! ــــ ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ جیلوں میں ہمارے بڑے بڑے قائدین کا کیا حشر ہوا، اور نہ اس کی خبر ہے کہ جو بڑے بڑے قائدین آزاد ہیں انھیں کس طرح آزادی کی جنگ میں شریک کیا جا سکتا ہے، ہم میں سے کتنے ایسے ادیب و شاعر ہیں جنھوں نے بنگال کی فاقہ کشی کو ایک محب وطن کی طرح محسوس کیا ہو اور اپنے ہاتھوں کے لبریز جام پھینک دیئے ہوں، نئے ادب کے پردے میں "لحاف" کے اندر کی گدگدی پیدا کرنے والی باتیں بیان کرنے والے "کالی شلوار" میں گوری گوری جوان بل کھائی ہوئی پنڈلیوں کو دیکھ کر مچل جانے والے، کیا کبھی فاقوں سے مرتے ہوئے لاکھوں مزدور، بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچے، اور معصوم بچوں کو بیچتی ہوئی ان گنت مجبور ماؤں کو نہیں دیکھتے، اسی دنیا میں، اسی ان کی اپنی دنیا میں، ان کے اپنے وطن میں! یہ "ابہام و اشاریت" کی آڑ لے کر امد نئی نئی طرزِ سخن ایجاد کرنے والے کیا اب بھی اپنے حاکم ملک کی کسی حسین عورت کے حسین ہونٹوں سے اپنے وطن کی غلامی کا "انتقام" لے کر ایک عظیم فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں اور اس طرح کہ ان کے جیتے جی، ان کی آنکھوں کے سامنے، ان کے وطن کی لاکھوں بہنیں پیٹ کی خاطر اپنی عصمتیں بیچ رہی ہیں! ہو سکتا ہے کہ یہ "ادب برائے زندگی" ہو لیکن یہ سب کچھ ادب برائے انسانیت تو نہیں!!

یہ اور اسی طرح کے ملے جلے خیالات ہمارے ذہنوں پر بھی طاری رہے! ہم نے سچے خلوص کے ساتھ زمانے کے حالات کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے مقاصد بھی شور، مجاز، جذبی، فیض، ندیم قاسمی، یوسف ظفر، علی سردار جعفری، اور کیفی اعظمی کی طرح معین اور اعلیٰ ہیں، ہم نے "ترقی پسندانہ رجحانات" کو غلط "استعمال" کرنے کی سعی نہیں کی ہے! ــــ اب آیئے آپ کا تعارف یہاں کے جدید شعراء سے کراؤں، آپ کو اس محفل میں ایسے شعراء بھی نظر آئیں گے جو ادب کے ترقی پسندانہ رجحانات سے غیر شعوری طور پر متاثر ہیں لیکن وہ اس زمانے میں بھی اس "اثر" کو "سمجھنا" نہیں چاہتے! اور آپ کو حیرت ہوگی جب آپ سے کچھ ایسے شاعر بھی ملیں گے جو اب تک قدیم دبستانِ سخن کے پرستار ہیں، لیکن آپ کو اس وقت یقیناً مسرت ہوگی جب انھیں کے پہلو بہ پہلو ترقی پسند شاعر بھی نظر آئیں گے!!

مخدوم محی الدین ــــ یہ بکھرے الجھے بال اور متفکر چہرے والا شاعر مخدوم ہے، "سرخ سویرا" کا مصنف، مخدوم کو آپ نے کافی پڑھا اور سنا ہے، یہ اپنی نظموں کی تعداد سے زیادہ مشہور ہیں، بنگال میں جس طرح قاضی نذر الاسلام مقبول ہیں بالکل اسی طرح یہ ہمیں محبوب ہیں! نقاد ان کی شاعرانہ جسارتوں اور فنی غلطیوں کی گرفت کرنی چاہتے ہیں لیکن ان کا صالح عمل، خلوص، گہرا مطالعہ اور ان کی گفتگو کا من موہن انداز سب کو خاموش کر دیتا ہے، بہر حال ان کی شاعری ترقی پسندانہ عناصر کی بہترین مثال ہے! ان کی مشہور نظم "استالین" ہے اس کا ایک بند ملاحظہ کیجئے، جو میں سمجھتا ہوں آزاد شاعری کا سب سے اچھا نمونہ ہے۔

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں

کیا مجاہد نہ بنوں؟
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر
مرے پیارے مرے فردوس بدن کی خاطر
ایسے ہنگام قیامت میں مرا نغمۂ شوق
کیا مرے ہم وطنوں کے دل میں
زندگی اور مسرت بن کر
نہ سما جائے گا؟
قرۃ العین! میری جان عزیز
او میرے فرزند!
برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا!
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا!!

صمد رضوی ساز ــــ یہ ہنستے ہوئے چہرے اور کھوئی کھوئی سی آنکھوں والے صاحب ساز ہیں، یہ اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں نظم نگار فانی تھے! انھیں بھی زندگی ایک ایسی قید" نظر آتی تھی جس کو" زنجیر بھی درکار نہیں"۔

لیکن ــــ چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق!

کے تجربہ سے یہ بھی گزرے اور جب زندگی کی جدوجہد میں انھیں بھی عملی حصہ لینا پڑا تو تصور میں پھولوں کی آبادی بسانے والے اس شاعر نے اپنے لئے کانٹوں کا بستر بھی قبول کرلیا وراب ان کی شاعری میں زندگی دلہن کی طرح نہیں مجاہد کی طرح جلوہ گر ہے!! یہ جتنا اچھا کہتے ہیں اتنا ہی اچھا پڑھتے ہیں، اپنی آواز کی طرح نرم و نازک الفاظ کا استعمال ان کی شاعری کی بے مثل خصوصیت ہے، بہرحال یہ ساز ہیں اور ان کے بغیر محفلیں کچھ سونی اور خاموش سی نظر آتی ہیں

ساز کی نئی نظم "شام صحرا" کے کچھ شعر ملاحظہ کیجئے!

بوڑھے املی بن میں مفلس دہقانوں کی اک وادی
یعنی تمدن کی لعنت تہذیب کی خانہ بربادی
جھونپڑیاں خس پوش وہ جن میں لٹتی ہوئی دولت انکی
جن کے خون پسینے سے رنگین شہروں کی آبادی
دنیا کے ٹھکرائے ہوئے ارمان و تمنا کیا جانیں
بھوکے ننگے جی لیتے ہیں یہ ہی ان کی آزادی
ذہن میں صدیوں کی تاریکی خوں میں پشتوں کی نکبت
ان کے تصور میں بھی نہ آئی موج احساس شادی
کچلے ہوئے جذبات ہیں، مردہ روحیں، دل زندہ لاشیں
جن کا شعور زیست مسلسل محنت اور پھر بربادی

بھوک جہالت غربت پستی کب تک ان پر چھائے گی
شام و سحر کی رنگینی کب تک ان کو بہلائے گی
کب تک رکھے گی پوشیدہ فطرت کوہ و صحرا میں
وہ بجلی جو قصر امارت کی بنیادیں ڈھائے گی
سورج ڈوبا خونیں تارے کھیتوں پر تھرّاتے ہیں
طوفانوں کی آمد کے آثار سے پائے جاتے ہیں

سکندر علی وجد ــــ حیدرآباد کے ممتاز شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے، ابھی چند دن گزرے "لہو ترنگ" کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہوا ہے، اس کو پڑھنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ جدید خیالات اور کہنہ انداز بیان کا ایک بہت اچھا مرقع ہے، ان کی شاعری کا لہجہ جتنا سخت ہے اتنے ہی یہ نرم لہجہ اور مرنجان مرنج انسان ہیں

شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی اور یہ حقیقت ہے کہ بہترین غزل کہتے ہیں، "فرزند جامعہ عثمانیہ" کے علاوہ "اجنتا" اور "تاج محل" ان کی مشہور نظمیں ہیں، "تاج محل" کا ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

بہزادِ عصر ہیں تری گلکاریوں پہ دنگ
منظر کشِ بہارِ چمن ہے جبینِ سنگ
کلیوں کا وہ نکھار وہ کھلائے رنگ رنگ
فانوسِ شمع کشتہ سے لپٹے ہوئے پتنگ
رنگینیاں ہیں جو ہر اہلِ کمال کی
چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی !

صاحبزادہ میکش ——— شادی، ملازمت اور فارغ البالی کس طرح بعض صلاحیتوں کے لئے مضر ہوتے ہیں، اس کا اندازہ میکش کی موجودہ زندگی سے ہوتا ہے، حیدرآباد کی بہت سی تاریخی سیاسی کشمکشوں کا رجز خوان، جوانی اور جوانوں کا شاعر اب وہاں نظر آتا ہے جہاں اس کو نہ ہونا چاہیے اور وہ محفلیں اس سے خالی نظر آتی ہیں جس کے لئے وہ خلق کیا گیا تھا ! ——— دیکھئے میکش نے ہندوستان کے لئے کیا کہا تھا!

اک سسکتا سانس اک ٹوٹا ہوا تارِ رباب
جیسے گہری سوچ میں پچھلے پہر کا ماہتاب
جیسے باسی پھول کی بو جیسے پت جھڑ کا گلاب
جیسے دن میں چاند تارے جیسے دریا میں حباب
جیسے دیوانے کی جنت جیسے مفلس کا شباب !
کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں اے ہندوستاں !!

رشید احمد ——— بہت اچھے شاعر تھے مگر معلوم نہیں کہاں روپوش ہوگئے نہ رسالوں میں نظر آتے ہیں نہ محفلوں میں ! —

ع ہائے بے دردیاں زمانے کی !

کاوش ——— کبیر خاں نام ہے لیکن قدرت نے مولانا سہا مجددی کی طرح انھیں "مختصر مفید" بناکر پیدا کیا ہے، چاہے غالب کی شرح نہ کرسکیں مگر شعر خوب کہتے ہیں، انھیں جتنا پستہ قد ملا ہے اتنے ہی یہ بلند خیال و بلند حوصلہ، نظم بھی کہتے ہیں غزل بھی، ادھر کچھ دنوں سے آزاد شاعری بھی شروع کی ہے چونکہ فطرتاً شاعر ہیں اس لئے اس نئے تجربے میں بھی کامیاب ہیں، ان کی غزل کا ایک شعر یاد آرہا ہے:

جو آج میرے مقدر سے ہے حدیث خموش
ترے نثار وہی شوخیٔ بیاں تھی کبھی !

علی اشرف ——— تعجب ہے کہ انھیں اخباری مصروفیتوں سے اتنی اچھی نظمیں کہنے کی کیسے فرصت مل جاتی ہے، کبھی کبھی کہتے ہیں مگر بہت اچھا کہتے ہیں، اور بڑی خوشی اس سے ہوتی ہے کہ زمانے کی نبض پر ان کے ہاتھ ہیں، ان کی نظم "انقلاب" بہت پسند کی گئی جو اس طرح شروع ہوتی ہے ع

سن کہ اب انقلاب آتا ہے !

سلام اللہ سلام ——— فطرت نے بابر کی طرح ان سے بھی اس طرح انتقام لیا کہ یہ بھی اب پولیس میں ملازم ہیں، اور بہت دنوں سے خاموش، لیکن ان کی بہت سی نظمیں بہت دنوں تک یاد رہیں گی !

سلیمان اریب ——— جتنا ان کا تخلص عجیب ہے اتنے ہی یہ سیدھے سادے اور "لطیف" ہیں ! جس طرح یہ اپنی گفتگو میں محتاط اس سے زیادہ شعر میں بے باک، سوچ کر لکھتے اور لکھنے کے بعد ہمیشہ سوچنے کے لئے تیار رہتے ہیں، بہت زمانے سے انکا کلام چھپتا اور پسند کیا جارہا ہے، محفلوں میں شرکت ابھی شروع کی ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنا ایک خاص

مقام پیدا کر لیا ہے، جواں فکر و جواں سال شاعر ہیں، انھوں نے اپنے متعلق خود لکھا ہے۔

میرے اشعار مرا زمزمہ مرا ساز جواں
آتشِ قلب سے دہکی ہوئی آواز جواں
میرے رہوار جواں سال کے انداز جواں
میری تلوار مری مونس و دمساز جواں
میں بہادر ہوں جوانی ہے پرافشاں ہونا

جمیل احمد ـــــ بہت زمانے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ شاعر بھی ہیں اور اتنے اچھے شاعر ان کا یہ شعر میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔

وہ حسن کیا جو محبت میں سر جھکا نہ سکے
وہ عشق کیا جو سر دار مسکرا نہ سکے

محمد علی تیر ـــــ غزل و نظم دونوں کہتے ہیں اور دونوں میں بقدر حوصلہ جوہر دکھائے ہیں، ابھی ابھی یونیورسٹی کی تعلیم ختم کی ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اپنی شاعری کے لئے آئندہ کیا لائحہ عمل بنائیں گے۔

تحسین سروری ـــــ تحسین تخلص ہے اس لئے زمانے سے ناشناسی ان کی شاعری کا مقصد نہیں، بلکہ زمانے کی ناشناسیوں نے انہیں ایک حساس شاعر بنا دیا ہے اپنی شاعری میں غریبوں کی حمایت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ خود غربت میں پلے بڑھے ہیں بلکہ اسے وہ اپنا "فرض" سمجھتے ہیں، ان کی نظم "انتقام" طنز کا بہت اچھا نمونہ ہے، چند شعر سنیئے۔

میرے قبضہ میں اگر نظم جہاں ہو جائے
شب کی ظلمت میں گناہوں کے دیئے جلتے رہیں
مکر کے سانچوں میں سرمایہ کے بت ڈھلتے رہیں
خون آدم سے بجھانے کے لئے پیاس اپنی
جرم آغوشِ تمدن میں یونہی پلتے رہیں
مرے قبضہ میں اگر نظم جہاں ہو جائے

امیر احمد خسرو ـــــ پہلے یہ محفلوں میں شعر سناتے ہوئے جھجکتے اور شرماتے تھے، مگر اب جب کہ اپنا کلام خود سنانے لگے ہیں تو جھجکتے اور شرماتے ہوئے سناتے ہیں، کبھی کبھی نظم کہہ لیتے ہیں ورنہ ان کی محبوب صنفِ کلام غزل ہے خسرو کا ایک شعر ہے ؎

مر نہ سکنے کا نام جینا ہے
تہمت زندگی اٹھائے جا

یوسف ناظم ـــــ بہت کم عمری میں یونیورسٹی کی تعلیم ختم کی ہے، لیکن کلام کہنہ مشقوں کا سا ہے، نظمیں زیادہ کہتے ہیں جن میں جدید رجحانات جھلکتے ہیں۔

لطیف ساجد ـــــ بہت کمسن، لیکن مستقبل کے ایک ممتاز شاعر یقین ہے کہ یہ اپنا مقام پیدا کریں گے، ابھی چند دن ہوئے ایک غزل سننے میں آئی تھی دو شعر اب تک یاد ہیں ؎

عشرتِ سال کو تکتے ہیں ٭ دریاؤں کے بھوکے دھارے
راہ کسی کی دیکھ رہا ہوں ٭ ڈوب رہے ہیں چاند ستارے

عزیز احمد علی احمد ـــــ آپ حضرت فصاحت جنگ بہادر جلیل کے صاحبزادے ہیں، لیکن ان دونوں کو سنے کہنے کی طلب نہیں، اس لئے میخانۂ امیر ان کی منزل نہیں دونوں نظم زیادہ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔

اس لطیف حکایت کو دراز تر گفتم نہ کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ بعض اچھی شاعرات نے بھی معیار سخن کو بلند تر بنایا ہے جن میں قابلِ ذکر بشیر النساء بیگم مخفی، لطیف النساء بیگم اور نوشابہ خاتون

وغیرہ ہیں۔ بعض جوان عمر شاعر بھی اپنے اجداد کی میراث سے دور نئے میلانات و رجحانات کے ساتھ افق پر چھا رہے ہیں جن میں قابلِ ذکر مظفر، قتیل، آوج، عظیم، متین، صفا، ناصر سروش اور آثر صدیقی ہیں۔ یہ یقین ہے کہ اس عہد کشاکش میں پروان چڑھنے والے شاعر اپنے کلام سے بزم میں اجالا کریں گے۔

آخر میں حیدرآباد کے تین ممتاز شاعروں کا تذکرہ انتہائی ضروری ہے جو دکھنی زبان میں شاعری کرتے ہیں، دہقانی، علی صاحب، اور گمنا عوام کے محبوب شاعر ہیں ان کی شاعری آہ ہے، سماج پر ایک طنز ہے، عوام کی زبان میں عوام کے لئے پیام بیداری ترقی پسند ادب کا خاص موضوع ہے، دہقانی اپنی اسی قابلیت کے باعث سارے جنوبی ہند میں اپنی انفرادیت پیدا کرچکا ہے۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد میں یہ کہوں گا کہ شعراء کی اس جمعیت نے اپنے مقدس فرض اور مشن کو فراموش نہیں کیا ہے، انھوں نے وقت کی آواز سنی ہے اور سناتے رہے ہیں، اب وقت آگیا ہے کہ صوبہ واری تعصبات کو ختم کرکے صرف کمالِ فن کی پرستش کی جائے۔

نظر حیدرآبادی

شاد اقبال

۔ اقبال اور شاد دونوں کی ہستیاں محتاج تعارف نہیں۔ البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی کہ علامہ اقبال مرحوم اور مہاراجہ یمین السلطنہ کے درمیان پچیس تیس سال تک جو مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے۔

یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اقبال کی زندگی اور کردار کے ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن کے متعلق دوسرے ذرائع سے کوئی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ ان گراں مایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ شاد اقبال کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔

صفحات (۲۰۰) قیمت عا / ۸ مہر

مرہٹی ادب میں ترقی پسندی کی روایات

مرہٹی زبان اور ادب کی بنیاد ہی انقلابی دور میں پڑی ہے جبکہ پہلے پہل مظلوم عوام نے اس خطہ ملک میں ظالم اور لوٹنے کھسوٹنے والے طبقہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ آٹھویں صدی عیسوی کا زمانہ عہد جاگیر داری کا شباب اور غریب کسان اور چھوٹے صنعت پیشہ ایک طرف جاگیرداروں اور راجاؤں کے ظلم اور لوٹ کھسوٹ کا شکار تھے دوسری طرف مذہبی گروہ یا برہمن مذہب کی آڑ میں ان کی جہالت اور توہم پرستی سے فائدہ اٹھا کر انھیں جی بھر کے لوٹتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام نے جگہ جگہ بغاوتوں کے علم بلند کرنے شروع کر دئے۔ عوام کی اس انقلابی جدوجہد میں مرہٹی ادب نے جنم لیا۔ اس زمانے میں ایک طرف چترانگ چنتامنی تصنیف کی گئی جس میں دو ہزار مذہبی رسومات کی تفصیل بیان کرنے میں برہمنوں نے اپنی عقل و فراست ختم کر دی جس میں انھوں نے ہر جگہ اپنی برتری کو راسخ کیا ہے۔ عوام کے فرائض میں سب سے زیادہ اہمیت برہمنوں کی خدمت اور خیرات کو دی گئی ہے۔ دوسری طرف سنت گیا نیشور نے عوام کے حقوق کے تحفظ میں اپنی آواز بلند کی اور عوام کی زبان میں عوام کو زندگی کا نیا پیام سنایا اور اس جنت کی بشارت دی جس کا وعدہ بھگوان کرشن نے کیا تھا۔ اور جس میں مرد اور عورتیں۔ شودر اور ویش سب آزاد اور برابر تھے۔ گیا نیشور کی اس تصنیف نے نہ صرف عوامی ادب بلکہ خود مرہٹی ادب کی بنیاد رکھی۔ باوجودیکہ برہمنوں اور مقامی حکومت نے سنت گیانیشور پر ظلم و تعدی کے پہاڑ توڑے لیکن وہ اس کے پیغام کو عوام سے نہ چھین سکے۔ اس لئے کہ گیانیشور کی آواز عوام کے دل کی آواز تھی۔

اسی کے کچھ زمانہ بعد جبکہ سوسائٹی میں طبقہ واری کشمکش شدید ہو چکی تھی۔ فرقہ بندی اپنے عروج پر تھی مسلمانوں نے حملہ کر دیا۔ اور ان کے نئے اور جمہوری نظام زندگی نے معاشرے کو جڑوں سے ہلا دیا۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد مقامی جاگیرداروں اور راجاؤں نے نئے حملہ آوروں سے صلح کر لی اور مسلمان جو ابتداءً جمہوریت کا پیام لائے تھے جو سود خواری کے خلاف تھے۔ جن کے یہاں بیواؤں کی یہ درگت نہ ہوتی تھی۔ اتنے زیادہ محاصل نہیں تھے۔ جہاں تعلیم مذہبی فریضہ تھی۔ اپنی انفرادیت قائم نہ کر سکے۔ وہ آہستہ آہستہ جب جاگیردار، منصب دار اور وطن دار بننے لگے اور اسلامی حکومت نے بھی جاگیرداری نظام کا قالب اختیار کر لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابتداءً جو ان کے ترقی پسندانہ نظام حیات کا اثر عوام پر پڑا تھا وہ زائل ہو گیا۔ عوام کے سامنے اب مسلمان اور برہمن میں کوئی فرق نہ رہا۔ اس لئے کہ اب یہ دونوں یکساں طور پر انھیں لوٹتے تھے۔ اس لوٹ کھسوٹ کے خلاف ذات باہر برہمنوں، جلاہوں کہاروں، مظلوم عورتوں، درزیوں، مرچیوں، تباہ حال تاجروں اور کسانوں نے ہر جگہ صدائے احتجاج بلند کی۔ اور ان نئے حالات میں ایک نئی قسم کی شاعری نے جنم لیا جسے سنت یا بھگتی شاعری کہا جاتا ہے۔ یہ احتجاج کرنے والے پورے ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں تھے ان میں سے کبیر، حر تیوا نجیا، ایکناتھ، تکارام، جنا بائی اور چنگ دیو کا تذکرہ کافی ہے۔ مسلمان شعراء نے صوفیانہ شاعری کا رنگ اختیار کیا اور ہندوؤں نے بھگتی اور وشنو شاعری کا۔ مرہٹی زبان کے بھگتی شاعر صرف اپنے معبود کی حمد نہیں گاتے تھے بلکہ ان گیتوں میں ہمیں ان عوام کی بپتاؤں کا بھی عکس ملتا ہے جو لوگ گرتے ہوئے معاشی نظام۔ سودخواری امراء کی باہمی جنگ و جدل اور بڑھتے ہوئے محاصل کے تلے کچلے جا رہے تھے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ سیاسی نقطہ نظر سے اس قدر

صاحب نظر ہو گئے تھے کہ کسی معاشی یا معاشرتی انقلاب کی دعوت دیتے ہوں یا طبقہ واری کش مکش کے خاتمہ کا کوئی پروگرام پیش کرتے ہیں بلکہ وہ اس کا مطالبہ کرتے تھے کہ بھگوت چترورما کے قوانین پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے اور ایسے اوتار کی دعا مانگتے تھے جو ملک کو اس تباہ حالی افلاس اور کشمکش سے نجات دلائے۔

کچلے ہوئے عوام کے لئے سنت اور بھگتی شاعری اور شاعر خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ جب حکومت نے غلہ ذخیرہ کرلیا اور عوام بھوک کے مرنے لگے تو داجی نے اپنی ذمہ داری پر تمام اناج تقسیم کردیا اور جب داجی سے جرمانہ مانگا گیا تو ایک انتہائی پست طبقہ کا انسان۔ ایک چمار آگے بڑھ کر جرمانہ ادا کردیتا ہے۔ اور یہ چمار کرشن کے اوتار کا درجہ پاتا ہے۔ اور سارے بھگتی شاعر اس کے گیت گانے لگتے ہیں۔ جانی جنار دھن بیجاپور کا ایک غریب ملازم پیشہ تھا اس نے بھی ایک مرتبہ قحط کے زمانے میں سرکاری غلہ عوام میں تقسیم کردیا۔ حکومت نے اسے موت کی سزا دیدی اور سارے عوام اور ان کے شاعروں کا ہیرو بن گیا۔ یہ بھگتی شاعر عوام میں سے نکلتے تھے۔ عوام کے دلوں کی دھڑکن اپنے سینوں میں محسوس کرتے تھے۔ ان ہی کی طرح سوچتے اور ان ہی کی زبان میں شاعری کرتے اور ان ہی کے گیت گاتے تھے۔ ان کے نزدیک اوتار وہی تھا جو سماج کے مظالم کا خاتمہ کردیتا۔ چترورما کے معنی اس معاشرتی نظام کے تھے جس میں اس گاؤں کی ساری پیداوار اسی گاؤں کے لوگوں کے استعمال کے لئے ہوتی۔ پیداوار کے صرف ۱/۶ حصہ پر حکومت کا حق ہوتا۔ برہمن کے معنی بڑی بڑی دعوتیں کھانے والے مویشیوں کے بڑے بڑے گلے پالنے والے اور غریبوں پر ظلم کرنے والے کے نہیں تھے بلکہ اس کے معنی ایک ایسے غریب انسان کے تحت جو دوسروں کے دماغوں کو نور علم سے منور کرتا اور ان کے ستارے دیکھ کر مستقبل کے بارے میں رہبری کرتا۔ کھتری کا مفہوم ایسے آدمی سے نہیں تھا جو ہر وقت شراب کے نشہ میں چور رہتا اور حسین عورتوں کے جھرمٹ میں رنگ رلیاں منایا کرتا۔ بلکہ جو گاؤں اور وطن کی حفاظت کرتا اور سب سے انصاف برتتا۔ ویش کے معنی ایسے شخص کے نہیں تھے جو دوسروں کے محنتوں کا ثمرہ لوٹ کر اپنا پیٹ بھرتا بلکہ جو تجارت کے ذریعہ گاؤں کی ضروریات پوری کرتا اور مناسب نفع لیتا۔ سنت اور بھگتی شاعروں کا عقیدہ تھا کہ اس طرح معاشرتی نظام کی اگر اصلاح ہو جائے تو قحط، جنگ، بیرونی حملوں اور تباہ حالی سے نجات مل جائے گی۔ اور واقعی اس وقت کے حالات کے لحاظ سے تمام معاشرتی خرابیوں کا یہی ایک حل تھا خواہ وہ کتنا ہی وقتی کیوں نہ ہو۔ تمام بڑے سنت شعرا نے اپنے پورے ادب اور کویتاؤں میں تمام مظلوم عوام کی طرف سے ان ہی قسم کے جذبات پیش کئے ہیں۔ ان کی بپتاؤں اور مصیبتوں کی داستانیں ان ہی کی زبان میں پیش کی ہیں۔ اور اس طرح مرہٹی ادب کو ابتدا ہی سے عوامی اور ترقی پسند ادب کا بہت بڑا سرمایہ ملا ہے۔ سنت شاعری گو کہ عوام کی کوئی سیاسی رہبری نہ کرسکی اور نہ ہی آئندہ کی کشمکش کے لئے تیار کرسکی تاہم اس نے ایک بہت بڑی معاشرتی ضرورت کو پورا کیا اور اپنے زمانے کے ظلم اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف آواز بلند کی۔ البتہ عوام کی تنظیم کرکے اس میں حرکت پیدا نہ کرسکنے کی وجہ سے کچھ ہی روز بعد ان میں شکست خوردگی۔ ڈر اور لاچارگی کا احساس گھر کر گیا۔ اور اس کی وجہ تھوڑے دن بعد ہی بھگتی شاعری کی جاذبیت بھی ختم ہونے لگی۔ لیکن یہ حالات بھی زیادہ دن تک باقی نہ رہے اور آہستہ آہستہ ایک نئی پود ایک نئی آواز اور ایک نئی جھنکار کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ اساجوانی کی جس کا تعلق مرہٹہ کسانوں کے دیوتا کھنڈویا سے تھا پرستش سب سے زیادہ کی جانے لگی۔ غریب طبقہ میں رام داس کی

تعلیم مقبول ہونے لگی۔ اور ہر طرف رام راج کے قیام کی مانگ بڑھنے لگی اس لئے کہ روایات کے مطابق رام راج میں راجہ اور پرجا میں کوئی بُعد نہ تھا۔ اس راج میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔ کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں شُدر بھی برہمن کے خلاف انصاف چاہ سکتا تھا اور اسے انصاف ملتا تھا۔ رام داس نے رام کو اپنا دیوتا بنایا اور عوام کے خواب نے شیواجی کی شکل اختیار کی جس نے آتے ہی فوراً پرانے محاصل (وطن) منسوخ کر دیے۔ کچلے ہوئے عوام کو آزادی کا پیغام سنایا۔ اس نے قانون بنایا کہ ہر کاشتکار کو زمین ملنی چاہیے۔ مالگزاری پیداوار کے لحاظ سے لیجانی چاہیے پیداوار پر وطن کے نام سے کوئی ٹکس نہ لگانا چاہیے۔ اس لئے عوام میں ایک انقلابی لہر دوڑا دی۔ عوام ہی میں سے نئے نئے فوجی لیڈر پیدا ہونے لگے۔ گریلا لڑائی کے ماہر پیدا ہو گئے۔ یہ گریلا جنگجو سیاسی نقطہ سے کافی بیدار ہوتے تھے۔ یہ عوام میں سے ہوتے اور ان کے لئے ہمیشہ کمربستہ رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سلطنت مغلیہ اور دکن کی جیسی سلطنتوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔

ان نئے حالات میں ادیبوں کا کیا مقام تھا؟ سنت شاعری کے پیرو نئے حالات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہ کشمکش بالکلیہ نوجوان کاشتکاروں کے ہاتھ میں تھی اور غریبوں کا خون چوسنے والے وطن داروں کے مفاد کے خلاف تھی اور اس لئے یہ ان برہمنوں کے لئے کسی امید کا پیام نہیں رکھتی تھی جو کہ مرہٹوں کی فتح پر اس کی امید رکھتے تھے کہ وہ اچھی تنخواہیں اور منصب پانے والے قاضیوں کی جگہ لے سکیں گے۔ اور نہ ہی یہ ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کے جاگیرداروں اور زمینداروں کے مفاد کے مطابق تھی یہی وجہ ہے کہ ان سب نے ملکر اس جدوجہد کو ختم کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے مکند اور وامن جیسے شاعر اور ادیبوں نے اس جنگ اور اس کے پیچھے کام کرنے والی انقلابی تحریک اور اس کے لیڈر کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ البتہ خود عوام نے تلوار کے ساتھ کویتا اور گیت کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بڑے بڑے ادیب اور شاعر صرف محفلوں اور درباروں کی زینت بن کر رہ گئے۔ یہ نئے نئے انقلابی شاعر نئی نئی کویتا اور گیت لکھنے لگے اور ان سے لاکھوں عوام کے دل گرمانے لگے۔ ایک خاص قسم کے گیت نے جسے پواڑا کہا جاتا ہے اسی زمانے میں جنم لیا جو عوام کی زبان میں عوام کے لئے ہوتا تھا اور جسے ہزارہا کی تعداد میں ایک ساتھ ملکر گایا جاتا تھا۔

یہ نئے شاعر دن بھر تلوار لے کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ میدان کارزار میں رہتے اور شام کو دن بھر کے کارناموں کو نغماؤں کی شکل دیکر اپنے ساتھیوں کے دل گرماتے۔ ان میں اپنے ساتھی بہادروں کے غیر معمولی کارناموں جوانمردی اور ایثار کا تذکرہ ہوتا۔ ان کی مدد سے آگے بڑھنے اور دشمنوں کو شکست دینے کے نئے ولولے اور نئی امنگیں پیدا کی جاتیں۔ اور یہ گیت گاؤں گاؤں پھیل جاتے اور بچے بچے کی زبان پر آ جاتے۔ اس لئے کہ یہ ان کی دلی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کی امید دلاتے تھے۔ ان میں سے سب سے اچھے شاعر "اجنن داس" (بے پڑھوں یا عوام کے خادم) کہلاتے تھے۔ یہ عوام میں سے ہوتے تھے۔ زندگی کے حقائق سے باخبر رہتے تھے اور عوام کی جدوجہد سے متاثر ہو کر لکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیدھی سادھی نظموں میں جو جان ہے وہ آج کل کے بڑے بڑے سیاسی ناولوں میں نہیں پائی جاتی۔ ان کا مہر وسیواجی ان کے لئے ایک شہزادہ نہیں بلکہ

اسیری میں بیٹھا ہوا محراس رہا ہو بلکہ وہ ان ہی میں سے ہے اور ان ہی کے جیسا ہے۔ تمام سپاہی عوام میں سے ہیں اور عوام کے لئے لڑ رہے ہیں اسی لئے ان کی شاعری میں اتنا اثر اتنا خلوص اور جوش ہے۔

پچاس سال کی کشمکش کے بعد آخر کار مرہٹہ سلطنت قائم ہوگئی اور سلطنت کے قیام کے ساتھ کسان عوام اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوگئے۔ ان کی جتھا بندی ختم ہوگئی۔ اور اس نئے اسٹیٹ میں پھر وہی جاگیردارانہ نظام حاوی ہوگیا۔ کچھ نئے اور کچھ پرانے زمیندار پہلے کی طرح پھر ان کے سروں پر مسلط ہوگئے۔ پرانے محاصل اور وطن وغیرہ پھر ان پر عائد کر دیے گئے۔ مجاہد سپاہیوں کی جگہ کرایہ کے سپاہیوں نے لے لی جس میں کچھ مرہٹے اور کچھ باہر کے پٹھان اور دوسری قوموں کے۔ کریلا اور سیاسی نقطۂ نظر سے تربیت یافتہ کسان پیچھے رہ گئے۔ اس تبدیلی کے ساتھ عوام کی شاعری بھی ختم ہوگئی۔ پواڑہ اور اس کی اصل روح بھی ختم ہوگئی۔ گو اس کی ایک شکل ضرور رہ گئی لیکن اس میں زندگی کی وہ تابندگی باقی نہیں رہی۔ اب اس پواڑے میں راگ۔ سُر اور تال داخل ہوگئے۔ اس میں جاگیرداروں اور پیشوا کے قصیدے گائے جانے لگے۔ ظاہر ہے کہ حقیقت اور اصلیت سے دور جو چیز ہوتی ہے اس میں زندگی کہاں ہوسکتی ہے۔

اس دور میں اس نئے پواڑے کے علاوہ ایک نئی قسم کی شاعری نے بھی جنم لیا جو لاؤنی کہلاتی ہے۔ پیشوا کا صدر مقام اور دوسرے شہر ہر طرف جاگیرداروں، سپاہیوں اور تاجروں سے بھرے ہوئے تھے۔ دیہاتی عورتوں کو اپنے سپاہی شوہروں سے برسوں ملنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور انھیں شہر جانے کی بڑی خواہش رہتی تھی۔ یہ نوجوان عورتیں اکثر فوجیوں، امراء اور روساء کے ہاتھ پڑجایا کرتیں اور انھیں شہر پہنچایا جاتا اور پیشوا اور امراء کے درباران سے بھرے رہتے۔ ہر طرف شراب اور عیش و عشرت کا دور رہتا۔ اور اس دور میں جو شاعری کی جاتی وہ جنسی اور شہوانی خواہشات کو ابھارنے اور عیش و عشرت کو دوبالا کرنے کے لئے ہوتی اسی قسم کی شاعری لاؤنی کہلاتی۔

لاؤنی کے ساتھ ایک قسم کی پنڈت شاعری نے بھی جنم لیا۔ یہ اپنے فارم اور مضمون دونوں کے لحاظ سے سب سے بالکل مختلف تھی۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سنسکرت کے ماہر پنڈتوں کی شاعری تھی اور اس لئے بھگتی اور پواڑا سے بالکل جدا تھی اس لئے کہ ان کا تعلق عوام سے تھا۔ ساتھ ہی چونکہ یہ پنڈت جاگیرداروں اور امراء کی لوٹ کھسوٹ میں تو شرکت کرتے تھے لیکن ان کی رنگ رلیوں اور فحشیات سے الگ رہنا چاہتے تھے اس لئے اپنی شاعری کو لاؤنی کے اثر سے بھی بچائے رکھتے اور وہ قدیم سنسکرت کے رنگ میں شعر گوئی کرتے تھے جو حقائق سے دور اور بالکل بے رس ہوتی تھی جیسے آج کل اردو غزلیں بالکل بے رس ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ ان ہی کے طبقہ تک محدود رہتی تھی۔ غریب و تباہ حال طبقہ وہی پرانے پواڑے بھجن دہراتا تھا اور ان حالات میں عوامی شاعری کا گویا جنازہ نکل گیا تھا۔

اٹھارویں صدی میں ہندوستان کو ایک نئی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ پیشوا کی حکومت زوال پذیر ہونے لگی اور ایک نئی بیرونی حکومت کا اثر و اقتدار ملک میں بڑھنے لگا جس کی معاشی زندگی زیادہ ترقی یافتہ تھی جو جاگیردارانہ نظام سے نکل کر سرمایہ دارانہ نظام میں داخل ہوچکی تھی۔ اس نئی برطانوی سرمایہ دارانہ حکومت کے مقابلہ میں

فرسودہ جاگیردارانہ نظام نہ ٹھہر سکا اور اس نے اس ملک کی معاشی بنیادوں کو جڑوں سے ہلا دیا۔ ساتھ ہی ریلیں اور صنعتی کارخانے قائم کرکے ایک نیا طبقہ صنعتی مزدوروں کا پیدا کر دیا۔ اور درمیانی طبقہ میں ایک بیداری پیدا کر دی جس نے بیسویں صدی کے ابتدائی دور کی کشمکش کا آغاز کر دیا۔ یہاں بھی سرمایہ دار طبقہ پیدا ہو گیا جس نے پورے ہندوستان کے ایک قوم ہونے کا نعرہ لگایا اور جمہوریت اور آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ اس دور میں بڑے بڑے رہنماؤں اور ادیبوں مثلاً تلک رانا ڈے۔ اگرکر اور چپلونکر نے اس نئی بیداری کو پھیلانے کے لئے نثر کو اپنا آلۂ کار بنایا اور پریس کی مدد سے عوام کو اپنے جھنڈے تلے منظم کرنے کی کوشش شروع کی۔ یہ پہلا گروہ ہے جس نے نثر سے اتنا بڑا کام لیا اسی کے بعد ہری نارائن آپٹے نے "کل تر کیٹھن آلد" نامی ناول لکھ کر ناول کو سیاسی و معاشرتی بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا۔ آپٹے کے اس ناول میں کسان جنتا کی تباہ حالی اور اس کی لوٹ کھسوٹ کا نہایت حقیقی رخ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے دوسرے ناولوں میں ہمارے معاشرتی نظام کی گرتی ہوئی دیواروں کے مختلف رخوں اور درمیانی طبقہ کی معاشی اور معاشرتی کشمکش کی بہت ہی لاجواب تصویریں پیش کی گئی ہیں۔

ہندوستان میں جیسے جیسے سیاسی بیداری بڑھتی گئی اور دنیا کے سرمایہ دارانہ نظام کا اندرونی تضاد بڑھنے لگا۔ کساد بازاری تمام دنیا پر چھانے لگی تو ہندوستان میں بھی ہڑتالوں اور عدم تعاون وغیرہ کی تحریکوں میں تندی پیدا ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی حکومت نے بھی ان کو کچلنے کے لئے سخت تدابیر اختیار کرنی شروع کیں اور تحریر و تقریر پر سخت احتساب لگا دیا۔ لیکن ادیب اس کش مکش میں کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ وہ تاریخی واقعات اور مذہبی قصوں کی آڑ میں قومی جد و جہد کی داستانیں بیان کرتے تھے۔ کھاڈیلکر کا ناول پرتاب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ اس میں اس دور کے قوم پرستوں کی سرگرمیوں کو پیش کیا گیا تھا۔ اس کے ڈرامہ "کیچک وادھ" میں غیر محسوس طریقہ پر لارڈ کرزن کے عہد حکومت کو پیش کیا گیا ہے۔ کوروں اور پانڈوں کے قصوں کے رنگ میں اس دور کے مظالم اور قوم پرستوں کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان چند مثالوں کے سوا عام طور پر ادیب ناول نگار اور ڈرامہ نگار غیر معمولی احتساب کی وجہ سے سیاسی مسائل سے زیادہ معاشرتی اور گھریلو مسائل پر توجہ کرتے تھے۔ ملک کا سیاسی اور معاشی ہیجان ان میں زیادہ حرکت پیدا نہ کر سکا۔

سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد ملک میں دو بہت اہم کشمکشیں آئیں۔ ایک سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء کی تحریک سول نافرمانی دوسری سنہ ۳۲-۱۹۳۰ء کی جن میں لاکھوں کسانوں، مزدوروں اور درمیانی طبقہ کے لوگوں نے عملی حصہ لیا۔ اور جنھوں نے سارے ملک میں ہیجان پیدا کر دیا لیکن اس زمانے کے ادیب خاطر خواہ پیمانے پر وقت کی ضروریات کا ساتھ نہ دے سکے۔ سوائے اس کے کہ ناولوں کا رنگ کسی قدر ضرور بدل گیا۔ اس زمانے کے لاکھوں انسانوں کے جذبات و احساسات، ایثار، قربانی اور بہادری کا عکس ہمیں کہیں نہیں ملتا۔ گڈکری، کھاڈیلکر اور کولہٹکر جیسے ناول نگار اور ادیب بھی وقت کا ساتھ نہ دے سکے۔ صرف پھڑکے کے یہاں نئی سوسائٹی کی جھلک ضرور

ملتی ہے اب اس کے ناولوں میں عورتوں کو بھی سماج میں کچھ جگہ ملنے لگی تھی۔ اب میاں بیوی دن کے وقت بھی گھر میں ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے تھے۔ اب نوجوان تعلیم یافتہ لڑکوں اور لڑکیوں میں محبت کی شادی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کا ادب بھی یہیں آکر رک گیا۔ ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی سیاسی میدان کی کشمکش، قربانیوں اور ایثار کی تصویریں پیش کرنے سے وہ بھی قاصر رہا۔ مزدوروں اور کسانوں کی بیداری، ان کی تنظیم اور کشمکش کی تصویریں تو دور کی چیزیں ہیں۔

۱۹۳۰ء اور اس کے بعد کی عالمگیر کساد بازاری اور سول نافرمانی کی تحریک نے نہ صرف ہندوستان کے درمیانی طبقہ کو ملک کی آزادی کی کش مکش میں ڈھکیل دیا بلکہ اب کسانوں اور صنعتی مزدوروں کا بھی بہت بڑا اور منظم گروہ اس میں حصہ لینے لگا تھا۔ عدم ادائی لگان کی تحریک زوروں پر تھی لاکھوں مزدور ہڑتالوں میں حصہ لے رہے تھے۔ ایسے ہیجانی دور میں مذہبی یا تاریخی تحریریں وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر تھیں اب نئے ادب کو راست اس جدو جہد سے تعلق پیدا کرنا تھا چنانچہ اس وقت کے ادب نے نومت وادیا نئے ادب کا نام اختیار کیا لیکن اس نئے ادب کی آڑ میں جس کا دعویٰ مزدوروں اور کسانوں کے جذبات و احساسات کو پیش کرنا تھا اور ان کی آزادی کی جنگ کو آگے چڑھانا تھا بہت ہی گھٹیا قسم کا جنسی ادب پیش کیا جانے لگا جس میں کہیں کہیں کسانوں اور مزدوروں سے ہمدردی بھی ظاہر کر دی جاتی تھی۔ یہ ادب اجتماعی کش مکش اور خارجی مطالعہ کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ ایسے نوجوانوں کی داخلی کشمکش کا نتیجہ تھا جو آگے تو بڑھنا چاہتے تھے لیکن جمہور کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے تھے۔ جمہور کے متعلق لکھنا تو چاہتے تھے لیکن بغیر ان کی دھڑکن محسوس کئے ہوئے یہ ایسے لوگ تھے جو مزدوروں اور کسانوں کے مطالبات اور ان کی کش مکش کے فلسفہ سے بالکل نابلد تھے۔

خود اردو زبان میں گزشتہ ۸۔۱۰ سال سے نئے ادب کا لیبل لگا کر اسی قسم کا بازاری ادب بہ کثرت ہمارے ہاتھوں میں آ رہا ہے۔ مرہٹی زبان میں پھڑکے۔ کھانڈیکر۔ ڈکھول کر۔ واری کر اور ڈپ وغیرہ چند ادیب ایسے ضرور ہیں جن میں اس کش مکش اور ان نئی قوتوں کو جاننے اور سمجھنے کی خواہش پائی جاتی ہے لیکن صرف ایمان دارانہ خواہش سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ یہ لوگ درمیانی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ اس طبقہ کی خاص روایات ہیں۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ نئے اور بدلے ہوئے حالات کے سانچے میں اپنے آرٹ کو ڈھالا ہوتا محنت کش طبقہ کو اپنے آرٹ کی طرف لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا نتیجہ انتہائی مضحکہ خیز نکلا ہے۔ پہلے ان کے قصوں اور کہانیوں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مالابار ہل کے اعلیٰ بنگلوں میں عشق و محبت کے پینگ بڑھایا کرتے تھے اور اب ان کی جگہ مزدوروں اور کسانوں کے جھونپڑوں نے لے لی۔ ان کے ہیرو اور ہیروئن چوپائی یا جوہو پکنک کر کے اظہار محبت کرتے تھے اب اس کے لئے ہڑتال یا ستیاگرہ کا بندوبست کیا جانے لگا۔ ان محنت کشوں کے اتحاد، طاقت، بیداری، باقاعدہ تنظیم، جوش عمل، شاندار مستقبل کی امید، کامیابی کے مصمم ارادے اور قربانی اور ایثار نے ان پر کوئی اثر نہیں کیا اس کی کوئی جھلک ان کی کہانیوں میں نہیں ملتی۔ اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ جنسی محبت کا وجود نہیں ہونا چاہیے نہیں یہ چیز تو ضروری ہے لیکن صرف یہی کافی نہیں۔ صرف اسی کو چھانے نہ دینا چاہیے۔ اس کی بہترین مثال ہمیں سویٹ ناول نگاروں مثلاً شولوخوف

ایلیا اہرن برگ، اور شالسٹائی وغیرہ کے ناولوں میں ملتی ہے۔
مرہٹی ادب پر تاریک بادل یورپ میں نازیت کے عروج
کے ساتھ اور گہرے ہوگئے۔ بعض ادیب نازیت اور فاشزم کی تعریف
اس غلط فہمی میں کرنے لگے کہ یہ ایک مخالف برطانیہ تحریک ہے۔
اگست کے بعد قومی تحریک پر برطانوی حکومت کی ضرب نے
ہمارے ادیبوں میں اور بھی ہراسانی پیدا کردی ہے۔ انھیں
ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ وہ زندگی کے حقایق
سے فرار ہوکر انفرادیت کے خول میں پناہ گزیں ہوگئے ہیں۔
اس تاریکی سے باہر نکلنے کے لئے نہ انھیں خود کوئی راستہ نظر
آتا ہے اور نہ وہ دوسروں کو راستہ بتانے کے قابل ہیں۔
ہمارے ادیب رجعت پسند قوتوں اور ترقی پسند قوتوں کی
اس کش مکش کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہوگئے ہیں۔ اس میں
شک نہیں کہ ہم عوام کی زندگی اور ان کی سیاست کو
جب فنون کے ذریعہ پیش کرتے ہیں تو اظہار کے طریقے
میں ہمیں آرٹ ہی کے قوانین کی پیروی کرنی ہوگی لیکن
فن کار اتنی آزادی نہیں لے سکتا کہ ان کی سیاست کی شکل
وصورت ہی بدل کر اسے مسخ کردے۔ فرقہ پرست اور
رجعت پسند ادیب ہمیشہ یہی کرتے رہے اور آج بھی یہی کر رہے
ہیں۔ موجودہ جنگ شروع ہونے کے بعد سے اکثر ترقی پسند ادیب
بھی انتہائی سرعت سے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے
سے قاصر ہوگئے ہیں۔ اور قوم پرستی کے پردے میں اپنی
کوتاہیوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ موجودہ
جنگ میں ترقی پسند قوتوں کے مقام۔ فاشزم کی رجعت پسندی۔
ملک کے سیاسی جمود۔ قحط اور غذائی مسائل۔ اور جاپانیوں
کے حملے وغیرہ اور ان کے اسباب و اثرات کو سمجھنے سے قاصر
ہوگئے ہیں اور ان پر ایک ایک جمود اور افسردگی چھاگئی ہے
اس اندھیرے میں اب نیا ادب ان لوگوں کے
ہاتھ میں آگیا ہے جو اس کش مکش میں عقل و حواس کو گم
کئے بغیر حصہ لے رہے ہیں اور جو لوگ مزدوروں کو کسان
طبقے سے اور ان کی تحریکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو یہ
جانتے ہیں کہ اس جنگ میں فاشزم کی شکست کے معنی عالمگیر
سامراجیت کی شکست کے اور تمام دنیا کے عوام کی آزادی کے ہیں۔
اور جس کے لئے ملک میں قومی اتحاد ضروری ہے۔ غذائی مسئلہ کو
سلجھانا ضروری ہے اور جاپانی فاشزم کے خلاف ملک کو منظم
کرنا ضروری ہے۔ آج صرف اسی طبقے سے گرمانے والی نظمیں
کہانیاں اور چھوٹے ڈرامے ہمارے سامنے آرہے ہیں۔
پواڑا جو اٹھارویں صدی میں دفن ہوچکا تھا پھر زندہ ہوگیا
ہے۔ اور اس کی مثال ہمارے سامنے انا ساٹھے کے پواڑے
"اسٹالن گراڈ" کی شکل میں موجود ہے۔ جاپانی بم اور ان کی
تباہ کاریاں بنگال اور مدراس کے لئے زندہ حقیقتیں ہیں
اور آج وہاں کے ادب میں ان ہی کا تذکرہ سب سے زیادہ
ہے۔ قحط اور قومی اتحاد اس خطۂ ملک کے بھی حقیقی مسائل ہیں
اور اس عوامی ادب میں بھی مسائل سب سے زیادہ چھائے
ہوئے ہیں۔ اس اندھیری دنیا میں صرف یہی ادب ایک امید
کی کرن پیدا کئے ہوئے ہے۔

محمد کلیم اللہ

(ماخوذ: Literature And the People by S. A. Dange)

انگارے اور اس کے بعد

سجاد ظہیر، احمد علی اور رشید جہاں کی کہانیوں کا مجموعہ "انگارے" اردو ادب میں ایک نئی آواز تھی جو ایک نئے شعور اور احساس کے ساتھ بلند ہوئی تھی، اس کتاب کی اشاعت نے دنیائے ادب میں ایک تہلکہ مچا دیا، ہر سمت سے شور بپا ہوا کہ چند گستاخوں نے تہذیب و اخلاق پر ایک ضرب لگائی ہے۔ کہا جانے لگا کہ ان کہی باتیں بھی ان گستاخوں نے منظر عام پر کہی ہیں، ان کہانیوں کے مخالفین نے آداب و تہذیب کے واسطوں سے دہائیاں بلند کیں اور اس مجموعے کو ضبط کرا کے چھوڑا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ "انگارے" ادیبوں کے اس سماجی احساس کا پہلا اظہار تھا کہ وہ زندگی کی تگ و دو میں خاموش تماشائی بھی نہیں ہیں، وہ زندگی کی ناکامیابیوں، بربادیوں اور تباہیوں کو دیکھ کر خاموش گزر نہیں سکتے، بلکہ وہ زندگی کے معالج بھی ہیں، یہی وہ بلند احساس تھا کہ "انگارے" کے لکھنے والوں نے بیمار زندگی کی نبض ڈھونڈی اور دیکھا کہ ہر جگہ تباہی اور گندگی ہے، سماجی و سیاسی زندگی کے کئی گوشے کثافتوں اور عفونتوں کا شکار ہیں، زندگی بے بسی، لاچاری اور پشیمانی کا ایک پشتارہ ہے، اگر اس تخریبی دھارے کو ختم نہ کیا گیا تو حشر تک انسانیت اور انسان کو تباہی کا روگ لگا رہے گا۔ سماجی ذمہ داریوں کے احساس نے انگارے کے مصنفین کی نگاہوں کی زد میں سماجی انتشار اور خرابیوں کو پیش کیا اور انھوں نے اپنے احساس کی بلند قوت کے ساتھ ان سماجی و سیاسی خرابیوں کو شکر میں لپٹی ہوئی کونین کی طرح، کہانیوں کے دلنشین پیرایہ میں بیان کیا، یہ بیان دراصل اردو ادب میں حقیقت نگاری اور جمہور کی بربادو زندگی کا پہلا اظہار تھا۔

گویا "انگارے" نئے رجحانات اور میلانات کی آئینہ دار پہلی تصنیف ہے۔

"انگارے" کی تصنیف و اشاعت دراصل اس عہد اضطراب کی پیداوار ہے جو سیاسی و معاشی بحران کی وجہ سے ساری دنیا میں بپا تھا، یورپ میں جرمنی اپنے اقتدار کے لئے فاشزم کا خونین لبادہ پہنے ہر اس تحریک یا نظام کی تخریب چاہتا تھا جو فاشزم کی ارتقاء میں حائل ہو، اہل فکر و ارباب نظر یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ فاشزم جو سرمایہ داری کی منہلے عروج حاصل کرے، ان کی اس مخالفت نے ان پر ایک قیامت توڑی، بلند مقام ادیب اور فن کار اگر فاشزم کی مشین کا پرزہ نہیں بن سکتے تو انھیں جلاوطنی، مفید اور دوسری صعوبتوں کا شکار ہونا پڑتا۔ فاشزم کا بڑھتا ہوا بہیمانہ سیلاب کسی صاحب فکر کے لئے کسی طرح گوارا نہ ہو سکتا تھا اس کے علاوہ ایک اور محرک بھی کار فرما تھا جس نے ادیبوں کو ایک خاص نصب العین کے تحت اکٹھا ہونے پر مجبور کیا، گزشتہ جنگ کے بطن سے نئے نئے فتنے پیدا ہو رہے تھے، جمہور اپنی آزادی اور انفرادیت کو خطرہ میں پا رہا تھا، یہ وہ حالات تھے کہ یورپ کے ممتاز ادیبوں نے جولائی ۱۹۳۵ء فرانس میں متحدہ طور پر اپنی جماعت بنائی، اس جماعت میں میکسم گورکی، رومین رولاں، آندرے مالرو، ٹامس مان وغیرہ جیسے عظیم المرتبت ادیبوں نے شرکت کی، ہندوستان کی نمائندگی مس سوفیہ واڈیا نے کی، ادیبوں کے اس گروہ نے ادب کو زندگی کا محدود، ترجمان اور مسیحا قرار دیا کہ انسانیت اپنی بیچارگی کا علاج کرے اور دنیا کو ایک نوید حاصل ہو سکے تاکہ تخریب کے دھارے اب اپنی روانی جاری نہ رکھ سکیں، یورپ میں مقیم نوجوان ہندوستانی طلبہ ان بدلتے ہوئے حالات اور نئی تحریکات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے، چنانچہ نوجوانوں کا یہ گروہ

جس میں ملک راج انند، سجاد ظہیر، جیوتی گھوش، سنگھ وغیرہ تھے، لندن کے ایک چینی رستوران میں نئے ادبی رجحانات کی پذیرائی اور ترویج پر غور وفکر کرتے رہتے۔ انہی کی کوششوں سے ۱۹۳۵ء میں لندن میں ہندوستانی ادیبوں نے اپنی انجمن بنائی جس کا مقصد یہ تھا کہ ادیب اپنے فن یا ادب کے ذریعہ زندگی کی رہنمائی کریں چونکہ ادب ایک روشن مشعل ہے جو عوام کو تاریکیوں اور گم راہوں سے بچاتا اور سیدھا راستہ بتلاتا ہے۔ اس کی صدائے بازگشت ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں بلند ہوئی اور یہاں بھی ادیبوں نے اپنی انجمن بنائی جس کا نصب العین یہ تھا کہ ایسا صالح ادب پیش کیا جائے جو زندگی کا غمخوار اور بیمار زندگی کا مسیحا ہو، نیز ان رجعت پسند اور مرتی ہوئی قوتوں کو ختم کیا جائے جو عوام کی ترقی وآزادی کے آڑے ہوں۔

اس گروہ میں زیادہ تر ملک کے نوجوان ادیب شریک تھے جو یہ محسوس کرتے تھے کہ ادب کا کام محض نشاط آرائی یا انبساط افزائی نہیں، سماج کے بیمار کا علاج اور ہزاروں کوتاہیوں اور مجبوریوں کا انسداد ادیب کا مقدس فرض ہے، چنانچہ ادیبوں نے اسی مقصد کے پیش نظر لکھنا شروع کیا، نئی تحریر رسم ورواج کی پابند دنیا میں بغاوت اور انقلاب تصور کی جانے لگی، ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک مخالفت کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں، ایک شور بلند ہوا کہ یہ ادب جو نوجوان ادیب پیش کر رہے ہیں، تہذیب وآداب کی دھجیاں اڑا رہا ہے، ان باغیوں نے انہیں تک ہی اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ انھوں نے زبان اور اسلوب بیان کی بنیادیں بھی ہلا دی ہیں، یہ تبدیلیاں دراصل اس احساس کا نتیجہ تھیں کہ زندگی کے تمام گوشے جو اصلاح طلب ہیں، منظر عام پر بتلائے جائیں اور ان میں جو خرابیاں ہیں انھیں ختم کیا جائے، ادیبوں نے عوام سے رشتہ جوڑنے کے لئے ادب میں صنعت گری اور الفاظ کے طلسم کے بجائے واقعیت اور حقیقت پیدا کرنے کی کوشش کی، چنانچہ انھوں نے اپنے مسلک کے لئے مخالفتوں کی پرواہ کئے بغیر زبان اور انداز بیان کی پابندیوں کی پرواہ نہ کی اور کہتے چلے گئے چونکہ

نالہ پابند نئے نہیں ہے

واقعات کی اسی رفتار میں ادیبوں نے اپنے مطالعہ کے دوران میں یہ محسوس کیا کہ انقلاب روس نے روسی ادب کی دنیا ہی بدل دی ہے، روسی ادب انسانیت کا گہرا رفیق اور ترقی کا پیامبر ہے، وہاں کے ادیب خیالوں کے طلسم وسحر میں گرفتار داستان امیر حمزہ وفسانہ الف لیلیٰ کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہیں، ان کا موضوع سخن روزمرہ کی زندگی ہے، اس ادب نے ہمارے ادیبوں میں بھی ایک نیا شعور پیدا کیا، اسی شعور کا یہ نتیجہ تھا کہ واقعیت نگاری اور حقیقت پسندی نے ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا، ادب میں اظہار بیان اور انداز فکر میں نئے تجربے ہوئے اور نئی راہیں نکلیں، چنانچہ اس کش مکش میں نئے ادب کی تخلیق ہوئی، چند مٹھی بھر ادیبوں کے شعور نے قبول عام حاصل کیا اور ملک میں ان گنت ادیبوں نے اپنے فرض کو محسوس کیا۔ اب "انگارے" کی بجھی ہوئی چنگاریاں دہکتا ہوا شعلہ بن گئیں، جوش نے شعراور ترنم کو آواز دی کہ ملک کی تقدیر بدلنے میں تمہارا پیش پیش رہنا لازمی ہے، شعر شبستانوں میں گرجنے یا گلوئے زہرہ کی آواز سننے کے لئے

ہی نہیں تخلیق کیا گیا ہے بلکہ ملک کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی فلاح کا پیامبر بھی ہے۔ ناولوں نے پراسرار رموز و نکات کے بجائے ملک کے سیاسی و سماجی مسائل کے لئے جگہ چھوڑی، پریم چند کے ناول انسان دوستی اور انسانیت پرستی کا اظہار ہیں، ان ناولوں کے کردار واقعی دنیا میں بستے ہیں، ساتویں آسمان میں نہ یہ پرواز کرسکتے ہیں اور نہ انھیں تختِ سلیمانی اور نہ مقدس عصا حاصل ہے۔ لاچار زندگی کے مجبور انسان اپنی کمزور طاقت کو سمیٹ کر تباہیوں کی مخالف قوت پر وار کرنا چاہتے ہیں، افسانوں میں سے جن، بھوت اور پریاں ڈر کر بھاگ چکے اور انسانوں کو اپنی جگہ دی۔ ان کے مسائل کہ افسانوں کا موضوع قرار پائے، اندر سبھا، اور شیریں فرہاد کے ڈراموں نے زندگی کی ناانصافیوں کی دکھ درد بھری داستان کو اپنا جائزہ دیا۔ غرض ادب کے ہر شعبے میں ایک انقلاب آیا، ادب زندگی سے قریب اور زندگی ادب میں حلول کرگئی۔ ادیب نے سماجی ذمہ داریوں کو محسوس کیا کہ زندگی کا یہ قافلہ اب تاریکیوں میں بھٹکتا نہیں پھر سکتا۔ اس دنیا میں ایک نیا نظام قائم ہوکر رہے گا جس میں آسودگی اور چین نصیب ہوگا۔

وہ رسوائے زمانہ "انگارے" جس کی حیات کو اس کی ضبطی نے خطرہ میں ڈال رکھا تھا، آج جاوداں ہوچکی ہے۔ "انگارے" کے بعد ہمارے ادیبوں کی آتشیں تحریروں نے سماج کی معاشرتی و سیاسی خرابیوں کے پردے چاک کئے اور ان خرابیوں کا انسداد کیا، بات یہیں تک رکی نہ رہی بلکہ ان ادیبوں نے قدامت اور فرسودگیوں سے جنگ کرتے ہوئے ایک نئی دنیا کی تخلیق بھی کی، یہ نئی دنیا، جمہور کے لئے مسرت اور شادمانی کا پیام لارہی ہے ادب میں اس نئی تبدیلی نے زندگی کی جو خدمت کی ہے اور درد بھری انسانیت کو جو سکھ پہونچایا ہے، یہ "انگارے" کے مصنفین کا رجحان یا میلان ہی ہے جو آج ملک کے سارے ادیبوں میں پیدا ہوچکا ہے۔ ان دس بارہ سالوں میں ہمارے ادب میں وہی روح دوڑ رہی ہے جو "انگارے" میں دوڑتی پھری، مخالف قدرتیں اور قوتیں بھی اپنی ترکش کے تمام تیر چلا چلا کر مایوس و پشیمان ہیں اس نئے ادب کی سمت سمٹی چلی آرہی ہیں، آج جب کہ اس ہیبت ناک جنگ نے زندگی کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے ادیب تاریکیوں کے خلاف عوام کو برسرِ پیکار کررہے ہیں اور انھیں اس تجلی کا نشان دے رہے ہیں جس سے انسانیت آسودگی حاصل کرسکے، وہ اس معرکہ بیم و رجا میں اپنا تاریخی فرض انجام دے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا فتنوں سے بچی رہے، زندگی کی تباہی و بربادی کی غمگساری ہی ان کا مدعا نہیں رہا بلکہ ان ادیبوں نے مستقبل کی خدمت بھی کی ہے، اس نئے رجحان اور میلان ہی بدولت ادب اپنا مقدس اور تاریخی فرض انجام دے رہا ہے، یہی رسوائے زمانہ اور ہدفِ طنز و اعتراض "نیا ادب" ہے جس نے زندگی کا علاج کیا، دکھ درد میں غمگساری کی اور زندگی کے اس کاروان کو منزل کی راہ دکھلائی اور رہنمائی کر رہا ہے، زمانہ "جدید ادب" کی خدمات کو نظر انداز نہیں کرسکتا، مستقبل کا مورخ کبھی فراموش نہیں کرسکے گا کہ دو جنگوں کے درمیان تاریکیوں اور بربادیوں کے اس دور میں ادیبوں نے معاشرے کی جو خدمات انجام دی ہیں، ابدالآباد سے لے کر اب تک کبھی ادا نہیں کی گئی ہیں۔ ہدفِ ملامت "انگارے" اور اس کے بعد کی تصانیف ہی ہیں جن سے زندگی نے فیضان حاصل کیا ہے۔

(مہر عابد علیخاں)

جدید ترین تعلیم کا نصاب جدید تر

شیخ سعدی کا قول ہے کہ :۔

بے علم نہ تواں خدا را شناخت

اس مصرع کو سمجھنے کے لئے فارسی داں کی ضرورت ہے ۔ مگر اس خدا کو جس کا ذکر شیخ صاحب نے فرمایا ہے اس کو سمجھنے کے لئے انڈھی اور ایسی کوشش کی ضرورت ہے جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔ اور یہ کوشش ایسے دل سے نکلے جو حصول نتائج کی ناامیدی کے خیال سے بے نیاز ہو۔۔۔ لہٰذا ایسے پیچیدہ مسائل ایسی مشکل تعلیم اور ان دونوں سے زیادہ پر پیچ علم عام آدمی کے بس کا ہے اور نہ ہی ان سے اس کو کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ علم جو مروجہ ہیں ان کے حصول میں انسان کی آدھی عمر صرف ہو جاتی ہے اور باقیماندہ کا نصف جزو نصف اول کی کامیابیوں کے حاصل کرنے کی روز و شبینہ کی کوشش کی وجہ سے کم ہو جاتا ہے۔ بقیہ ایک چوتھائی جو بچ رہتا ہے وہ تلاش ملازمت میں گزر جاتا ہے۔ یعنی مختصراً جب آدمی علم کی روشنی سے منور ہو کر اپنی محنتوں کا پھل حاصل کرنے کے درجہ میں قدم رکھتا ہے تو اس وقت موت کے فرشتے اس کو اس دنیا سے کھینچ کر لے جاتے ہیں اور اس طرح علم سے جو روشنی انسان کے دل و دماغ کو روشن کرتی ہے اس سے انسان کو اس لئے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کہ اس موقع پر روح اور جسم کا تعلق قائم نہیں رہتا۔ قبر کی گہرائیوں میں یا چتا کی آگ کے نیچے عالم اور جاہل ہر دو کی ہڈیاں کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ پس ایسے علم سے مقصد ا

یا تو دنیا کا یہ نظام بدل دیا جائے تاکہ علم حاصل کرتے ہی عالم کی قدر ہو یا پھر علم ہی تبدیل کر دیا جانا چاہیے۔ اور اس کے بجائے ایسے علم کو جگہ ملنی چاہیے۔

۱۔ جو مختصر ہو ۲۔ جو عام فہم ہو ۳۔ جو زندگی میں دل و دماغ کو اپنی روشنی سے منور کرنے کے علاوہ سود مند ثابت ہو سکے۔ ۴۔ جس کا اطلاق عام زندگی میں ہو سکے۔ ۵۔ جس پر انگلی رکھ کر یہ کہا جا سکے کہ "مجھے یہ معلوم ہے"۔

پرانے بزرگ ہمیشہ مڈل پاس یا میٹرک فیل ہوتے تھے۔ اس پر بھی ان کا خیال ہے کہ وہ آج کل کے نوجوان عالموں سے زیادہ سمجھ رکھتے ہیں۔ موجودہ تعلیم کو وہ کھیل سمجھتے ہیں۔ موجودہ طالب علموں کو وہ فیشن پرست اور ان کے مدرسین اور پروفیسروں کو لفنگے۔ موجودہ عالم پرانے لوگوں کو جاہل گردانتے ہیں مگر دونوں تعلیم عام انسان کی نہایت عام زندگی کے لئے موزوں نہیں۔ اسی لئے مندرجہ ذیل نصاب میں علم کو عام فہم اور کارآمد قسم کا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

علم تاریخ :۔ اس سے مراد کسی ماہ کی کوئی تاریخ نہیں بلکہ جہاں تک ایسی گزشتہ تاریخوں کے متعلق مواد معلوم ہوا ہے اور گزرے ہوئے تمام ایام میں جو کچھ واقعات ہو چکے ہیں ان کی تفصیل چاہے یہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ عام طور پر اس میں بادشاہوں اور ملکوں کا حال ہوتا ہے۔

گوتم بدھ :۔ ایک خوبصورت انسان تھے مگر پھر خوراک کم ملنے کی وجہ سے بہت دبلے ہو گئے تھے۔ حیوانوں کے بہت دوست تھے کہتے ہیں کہ جنگلوں میں انھوں نے اپنی قابلیت کی وجہ سے بہت سے جانوروں کی بولیاں سیکھ لی تھیں۔

اگر یہ آج کل زندہ ہوتے تو کسی سرکس کے مالک ہوتے۔

کیوں مشہور ہیں؟ اپنی تعلیم کیوجہ سے۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ سب خواہشات کو مار دینے سے مکتی حاصل ہو سکتی ہے۔

تنقید:۔ یہ استدلال غلط ہے کیونکہ سب خواہشات کو مار دینے کی خواہش تو دل میں پھر بھی رہ جاتی ہے۔ مکتی کیا ہے؟ ہندی یا سنسکرت کا ایک لفظ۔ اسے بھلا دو کیونکہ یہ تاریخ نہیں ہے۔

رامائن:۔ رام، اجودھیا کے راجہ دسرتھ کے بیٹے تھے باپ نے بن باس کا حکم دیا۔ یہ اپنی بیوی سیتا اور بھائی لکشمن کے ساتھ چودہ برس تک جنگلوں میں رہے۔ راون کو شکست دی اور پھر واپس آگئے۔

مہابھارت:۔ رشتہ دار راجوں کورو اور پانڈو کی جنگ کا حال۔

۱۔ اشوک اعظم ۲۔ سکندر اعظم۔
۳۔ ہرش وردھن اعظم ۴۔ اکبر اعظم
۵۔ شہنشاہ اعظم ۶۔ قائد اعظم
۷۔ شاعر اعظم۔ ۸۔ مرزا احمد اعظم وغیرہ

ان کا پیشہ حکمرانی تھا اور ہے ان کو سب ضروریات زندگی اور عیش و عشرت کے سامان حاصل ہیں اور اسی لئے یہ اعظم کہلاتے ہیں۔

گاندھی اور جناح:۔ کالے آدمی۔ ان میں مناسبت۔

(۱) ان کا تیلا پن جو ہندوستان کے بھوکوں کی سند ہے۔
(۲) ان کے بولنے کی خوبی۔
(۳) ان کے لکھنے کی خوبیاں۔
(۴) ان کی ڈگریاں۔
(۵) ایک ہی ملک میں پیدائش۔
(۶) دونوں اردو اچھی طرح نہیں جانتے۔

ان میں اختلاف:۔

۱۔ گاندھی اکثر و بیشتر جیل میں نظر آتے ہیں اور جناح بیرون جیل یا عدالتوں میں۔

۲۔ گاندھی نیچ قوموں کے اجار کی پیروی کرتے ہیں اور جناح اونچے مقدموں میں فریقین کے ابھرے ہوئے جیبوں کو نیچا کرتے ہوئے اپنے موکلوں کی پیروی کرتے ہیں۔

۳۔ گاندھی عینک پوش مگر لباس پوش نہیں۔ جناح لباس پوش ہیں مگر عینک پوش نہیں۔

علم جغرافیہ:۔ دنیا گول ہے۔ کیوں گول ہے؟ ایک بڑی بھینس کے سینگ پر جس کی مونچھیں ہمالیہ پربت سے زیادہ اونچی ہیں (جن کو اس نظریہ سے اختلاف ہو وہ اس کو رد کرنے کی کوشش کریں)

دنیا دو حصوں میں تقسیم ہے۔ کالوں اور گوروں میں۔ گورے کالوں پر حکومت کرتے ہیں مگر ماہران فن ورنگت کا خیال ہے کہ بہت جلد کالے کالوں پر حکومت کریں گے اور گورے اگر آپس کی جنگ سے بچ رہے تو اپنے اپنے ملکوں میں چلے جائیں گے۔

ہندوستان:۔ دنیا کا ایک حصہ ہے جہاں بہت سے کالے بہت بری طرح رہتے ہیں مثلاً گاندھی جسے پہننے کو کپڑا اور کھانے کو روٹی میسر نہیں۔ یہ باشندے محکوم ہیں گوروں کے جو کیک کھاتے ہیں، وسکی اور تمباکو پیتے ہیں اور خاکی کپڑا پہنتے ہیں۔ ان لوگوں کو مچھر نہیں کاٹ سکتا یہ مچھردانوں میں رہتے ہیں۔

پاکستان:۔ ابھی خیالی جغرافیہ ہے کہتے ہیں اگر یہ صحیح سلامت زمین پر اتر آیا تو اس میں پاک چیزیں بہت ہوں گی۔ آدمی، آب و ہوا، علم، مذہب، دودھ، گوشت، عقل، عورتیں، سپاری وغیرہ وغیرہ۔

ناپاکستان:۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد جو حصہ ہندوستان کا بچ رہے گا وہ ناپاکستان کہلائے گا۔ چونکہ سب پاک

آب و ہوا علم وغیرہ پاکستان کھینچ لے گا اس لئے اس میں صرف کثافت ہی کثافت رہ جائے گی۔

کتابستان :۔ ایک بھٹی ہے جس میں سے گرما گرم اور سخت سخت کتابیں نکلتی ہیں۔

حبش :۔ بہت ہی کالے لوگوں کا ملک۔ اس کے شہنشاہ کو نیگس کہتے ہیں۔ نیگس "ناگ" سے نکلا ہے ناگ سنسکرت میں سانپ کو کہتے ہیں اور سانپ اکثر کالا ہوتا ہے لہذا شہنشاہ حبش کو نیگس کہتے ہیں۔

اس ملک میں حبشی رہتے ہیں۔ گورے اطالوں نے اس پر کچھ عرصہ تک قبضہ جمائے رکھا مگر اب انگریزوں نے پھر نیگس کو حبش میں رہنے کی اجازت دیدی ہے حبش میں جو اطالوی سپاہی گرفتار ہوئے تھے وہ آج کل ہندوستان میں فروکش ہیں کیونکہ یہ گرم ملک میں رہنے کے عادی ہوگئے ہیں۔

جاپان :۔ "چڑھتے سورج" کی روشنی اس ملک کے باشندوں کو راس نہیں آئی ـــــ

اے روشنیٔ مہر تو بر من بلا شُدی

یونان :۔ یہاں جرمن فوجی رہتے ہیں۔

فرانس :۔ یہاں انگریز اور جرمن باری باری گولا باری کرتے ہیں۔

امریکہ :۔ یہاں کے باشندے بت پرست ہیں۔ ان کے دیوتا کا نام حضرت ڈالر ہے۔ یہ سترہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئے اور اب تک زندہ ہیں۔ یہ اپنے پرستاروں کو انوکھے روپوں میں درشن کرتے ہیں بعض دفعہ بالکل کاغذی پیرہن میں اور بعض دفعہ دھات میں ڈھل کر۔ امریکی ان کو مندروں میں نہیں رکھتے بلکہ یا تو کوٹ کی اندرونی جیبوں میں رکھتے ہیں یا مقفل فولاد کی الماریوں میں۔

انگلستان :۔ یہاں کے باشندوں کو بدہضمی کی آج کل بہت شکایت ہے۔ امریکی اور روسی ڈاکٹر علاج کر رہے ہیں قدرے افاقہ ہے۔

جرمنی :۔ ہوا پیٹ میں بھر جانے کی وجہ سے گوئرنگ پھول کر کپا ہو رہا تھا۔ انگریز، امریکی اور روسی جراح بڑی احتیاط سے اس ہوا کو خارج کر رہے ہیں۔

ایران :۔ رستم و سہراب کی وجہ سے نہیں بلکہ تیل کے چشموں کی وجہ سے مشہور ہے۔

موجودہ زمانے کی چند قابلِ ذکر ایجادیں

موٹر :۔ تیل اور پٹرول نہ ہونے کی صورت میں نہیں چل سکتی۔

ہوائی جہاز :۔ دشمن کے ملکوں پر اڑتے ہیں۔ ان پر گولا بارود وغیرہ لاد کر دشمن کے ملکوں کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ مگر چونکہ موجودہ زمانہ میں وقت کی بہت قدر ہے اس لئے یہ سامان دشمن کے زیادہ سے زیادہ آباد حصوں میں اوپر ہی سے پھینک دیا جاتا ہے تاکہ ہوائی جہازوں کو اترنے اڑنے میں وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔ دشمن کو سامان کے وصول ہوجانے کی رسید دینے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ ملک جس سے سامان روانہ کیا جاتا ہے خود بذریعہ ریڈیو دنیا کو اس امر کی خبر دیتے ہیں تاکہ وقت ضرورت سند رہے۔

ریڈیو :۔ بجلی کا ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ ہر ایک ملک اپنی خوبیوں اور اپنے مخالفین کی برائیوں کو بڑھا چڑھا کر بولتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی گانے بھی سنائے جاتے ہیں۔

جہاز:۔ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک جو سطح سمندر پر نظر آتے ہیں دوسرے جو پانی کے اندر مچھلیوں کی طرح پھرتے ہیں مگر ان کی خوبی یہ ہے کہ جلد یا بدیر ہر دو ایسا ڈوبتے ہیں کہ پھر کبھی نظر نہیں آتے اس طرح سمندر کی تہہ میں کروڑوں من لوہا اور فولاد جمع ہوا ہے جب سمندر خشکی میں اور خشکی سمندر میں تبدیل ہو جائیں گے تو اس وقت خشکی پر بہت سے جہاز بنے بنائے ملیں گے جن کو تیل وغیرہ دے کر اور پہیے لگا کر سواری کے کام میں لایا جائے گا۔

(نوٹ۔ ملحوظ رہے کہ ان کے لئے سڑکیں چوڑی ہونی لازمی ہوں گی)

تارپیڈو:۔ دیکھنے میں ایک لمبوتری وضع کی خوبصورت چیز جو ملائم اور شاعری کی طرح خوب صورت ہوتی ہے۔ اس کے شروع کے بول ہیں۔

شرررررررررر ٹھک ——— پھٹ

حشر و۔ جس چیز کو یہ لگے وہ آن واحد میں سمندر کی تہہ تک پہنچنے کی کارروائی شروع کرے۔

ہوا مار توپ:۔ اسم بامسمیٰ۔ اکثر ہوا کو نشانہ بناتی ہے۔ ہوائی جہاز تو صاف بچ جاتا ہے مگر گولہ جو چھوڑا جاتا ہے وہ واپس زمین پر آکر اپنے آدمیوں کو ہلاک کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

اے۔ آر۔ پی:۔ یہ کوئی چیز نہیں بلکہ ایک نئے محکمہ کی ایجاد ہے کہتے ہیں کہ اس محکمہ میں کام کرنے والوں کی خوراک انڈا، روٹی، پلاؤ ہے۔ اسی لئے اس محکمہ کا نام بھی مذکورہ بالا اشیاء کے حرفوں سے مل کر بنا ہے۔

یہ بہت اچھا محکمہ ہے۔ اس میں مختلف کھیلیں کھیلے جاتے ہیں۔ مثلاً بعض اوقات تمام حکام محکمہ دو ٹیموں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ ایک ٹیم کسی گھر میں جاکر تیل وغیرہ چھڑک کر آگ لگا دیتی ہے۔ پھر دوسری ٹیم والے فولادی ٹوپیاں پہن کر بالٹیاں۔ پمپ وغیرہ لے کر آتے ہیں اور جلدی جلدی آگ بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کھیل میں جیت اکثر آگ لگانے والی ٹیم ہی کی رہتی ہے جب آگ اپنا کام کر کے بجھ جاتی ہے۔ تو دیکھنے والے خوب تالیاں بجاتے ہیں۔ مظاہرے کرنے والے اپنے اپنے کمروں میں جاکر انڈا، روٹی، پلاؤ کھانا شروع کر دیتے ہیں تاکہ ان کی ہمت اور طاقت گھٹنے نہ پائے بعض اوقات انہی حکام میں سے بعض مردہ بن کر لیٹ جاتے ہیں۔ بعض آکر ان کو خاص طریقہ سے اٹھا کر مرہم پٹی وغیرہ کرنا شروع کر دیتے ہیں اور مرہم پٹی کے بعد پھر وہی انڈا، روٹی، پلاؤ پیٹ میں منتقل کرنے کی کارروائی! کہتے ہیں کہ جنگ ختم ہونے پر متعدد حکومتیں اس محکمہ کے لوگوں کو اس مضمون کا حکم دیں گی۔ "اے۔ آر۔ پی" یعنی "اپنا راستہ پکڑو" اس پر یہ محکمہ منتشر ہو جائے گا۔ مگر اس وقت تک ان لوگوں کے پیٹوں میں اس قدر مقداراً انڈا، روٹی، پلاؤ کی پہنچ چکی ہوگی کہ باقیماندہ زندگی میں ان کو کبھی بھوک نہ لگے گی۔

علم ریاضی:۔ اس میں ہندسوں وغیرہ کو گننا ہوتا ہے۔ ایک سے ہزار تک گننا کافی ہے۔ کیونکہ عام ہندوستانی کو اس سے بڑی رقم سے واسطہ ہی نہیں پڑتا۔

جمع اُس کو کہتے ہیں مثلاً ایک اور ایک کو اکٹھا کیا جائے تو دو ہو جاتے ہیں۔ مگر بعض ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ ایک اور ایک کو اکٹھا رکھنے کے باوجود حاصل صرف ایک ہی رہ جاتا ہے۔ مثالیں

۱۔ مرغی ذبح کر کے ہانڈی میں پکانے کے لئے ڈالتے وقت

اس کی ٹانگوں کی تعداد "ایک جمع ایک" یعنی دو عدد ہوتی ہے
گر پکنے کے بعد جب نکالی جائے تو صرف ایک ہی ٹانگ نظر آئے
گی۔ اگر باورچی چالاک ہو تو دوسری ٹانگ کی ہڈی ضرور قاب
میں موجود رہے گی۔

۲۔ اگر کسی بڑے عہدہ دار سے ملنے جاتے وقت
آپ اپنی جیب میں "ایک جمع ایک" یعنی دو روپے ڈال کر
ساتھ لیتے جائیں تو چپراسی کی نظر عنایت حاصل کرنے کے بعد
جب آپ اپنی جیب کو محسوس کریں تو صرف ایک روپیہ باقی رہ
جائے گا۔ بعض اوقات ایک جمع ایک تین بھی ہو جاتے ہیں مثال

۱۔ شادی کے بعد میاں بیوی کو اگر جمع کیا جائے تو
جملہ تعداد دو ہوتی ہے مگر یہ تعداد ہموطن ہندیوں کی حد تک
عموماً اور اگر ان کا مشغلہ بیکاری ہو تو خصوصاً نو ماہ کے اندر
اندر کم از کم تین تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ تیسرا عدد عالم غیب سے
وجود میں آتا ہے۔ کچھ رونے چلانے کی آوازیں آتی ہیں۔ رفقاً
کا ہجوم ہوتا ہے اور آن واحد میں دو کی تعداد تین میں
منتقل ہو جاتی ہے۔ محکمہ اعداد و شمار والوں کو اگر پتہ چل جائے
تو وہ اپنے پیدائش کے کتابچہ میں ایک نفر کا اضافہ کر لیتے
ہیں۔

تفریق:۔ کسی چیز میں سے کسی چیز کے نکال لینے کو کہتے
ہیں۔ اس سے بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور دل بیٹھ جاتا ہے۔ یہ
کارروائی اکثر دفتروں میں تنخواہ تقسیم ہونے وقت شروع
ہوتی ہے۔ بیوہ فنڈ، جنگی فنڈ، پنشن فنڈ، فیملی فنڈ، بیمہ فنڈ
غربا فنڈ، فنڈ نیپاں، فنڈ سرخ چلیپہ، فنڈ چپراسیاں، فنڈ میز اور
کرسیاں، فنڈ عصرانہ برائے عہدہ داران محکمہ ہذا وغیرہ وغیرہ
ان فنڈوں میں رقم وضع ہو جانے کے بعد بوجھ یقیناً ہلکا
ہو جاتا ہے مگر باوجود اس ہلکے پن کے دل کسی بوجھ سے
بیٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ تفریق اس کو بھی کہتے ہیں جو جذبہ
ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں موجود ہے یا پھر
اس کو جو فصل پکنے پر کاشتکاروں کے سر پر زمیندار
کے کارندے یا دوسرے زمینداروں کے موجود ہو جانے سے
عمل میں آئے۔

سود:۔ گُر (۱) [ضرورت زر + ضرورت زر + ضرورت زر] تاحیات [کمی وسائل + افزائی کنبہ + گرانی اشیاء] جنگ

= بنیے کی دوکان / حاجت مند انسان = ادائیگی قرضہ تاحیات

= شلوار پوش پٹھان / حاجت مند انسان = ضرباتِ ڈنڈہ برسرِ حاجت مند انسان

= قرقیِ مکان و تباہی خاندان

چند زبانی سوالات مع جوابات۔

۱۔ ایک مزدور جس کام کے کسی حصہ کو ۲ گھنٹے میں
مکمل کر سکتا ہے اس حصہ کے لئے حکومت نے تین روپے
دینا منظور کیا ہے۔ ایک ٹھیکہ دار ٹھیکہ حاصل کر کے چند مزدور
کام پر لگاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مزدور دن میں
بارہ گھنٹے کام کرتا ہے بتاؤ ہر ایک مزدور کی مزدوری
یومیہ کیا ہوگی۔

جواب۔ زیادہ سے زیادہ چھ آنے۔

۲۔ سوال۔ آدمی کے پاجامے کو سوا دو گز لٹھا لگتا ہے۔
بتاؤ دو پاجاموں کے لئے کتنا لٹھا درکار ہوگا؟

جواب۔ چار گز کیونکہ آدھ گز درزی کھا لے گا۔
اور پاجامے ذرا چھوٹے اور تنگ سیئے گا مگر اس سے
تکلیف پہننے والے کو ہوگی سینے والے کو نہیں۔

جدید ترین نصاب کے یہ چند نمونے اوپر درج کر دیئے گئے ہیں اگر پسند آئے تو دیگر مضامین کو بھی عام فہم بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ بھارت چند کھنہ

ایک سوال

آپ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جس نے شادی سے پہلے کسی دوسری عورت سے محبت کی ہو؟۔ آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ میں آپ کا شریک راز بننا نہیں چاہتا۔ مجھے یاد آیا کہ مجھ سے کسی موقع پر ایک لڑکی نے یہی سوال کیا تھا۔ اور اس سوال کا جواب میں نے اثبات میں دیا تھا۔ اس لڑکی کا شوہر میرا دوست تھا۔ آپ کے بھی دوست ہونگے جنھوں نے آپ سے مشورے لئے ہونگے۔ جنھوں نے اپنی زندگی کے ہر واقعہ کو آپ سے بیان کیا ہوگا۔ انکی محبتیں ان کی شادیاں! غرض ہر موقعہ پر آپ کی دوست نوازیاں ان کی شریک حال رہی ہوں گی۔ اب کہئے وہی لڑکی اگر آپ کے کسی دوست کی بیوی ہوتی تو آپ کیا جواب دیتے؟۔ سچ تو یہ ہے کہ اس صدی کا نوجوان طبقہ محبت کے لئے بیحد ذکی الحس ہے۔ ماحول اور معاشرت کی پابندیاں جن مجبوریوں کو سدِ راہ بناتی ہیں وہ انھیں خاطر میں لانا تو درکنار توڑ کر آگے نکل جانے کی دھن میں رہتا ہے۔ لیکن جب بھی وہ آگے بڑھا ہے ٹکرایا ہے۔ میں صرف نوجوان ہی کو موردِ الزام نہیں ٹھیراتا فریقِ مخالف کو بھی اعانتِ جرم کا قصوروار گردانتا ہوں۔ محبت کی شادیوں کی بہت کم مثالیں آپ کے ذہن میں ہوں گی۔ لیکن اکثر شادیوں کے بارے میں آپ سن چکے یا واقف ہوں گے کہ دولھے کو کسی اور سے محبت تھی۔ جب میرے دوست کی شادی ہوئی تو بعض لوگوں نے پوچھا کہ "ہم نے سنا ہے دولھے کو یہ شادی دل سے پسند نہیں"۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ "صاحب دشمنوں کی اڑائی ہوئی خبر ہے ہمارا دوست تو دل کے جھمیلوں میں پڑنے کو گناہ سمجھتا ہے۔"

میرے جواب سے وہ مطمئن ہوئے نہ میں انھیں کر سکتا تھا۔ میری زبان جو کچھ بھی کہے میرا دل کہتا ہے کہ "سچ سچ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ یہ جواب ایک اجنبی لڑکی کے دولھا بننے والے ہیں پہلے ایک سے دل لگا چکے ہیں۔ لیکن اس کو کیا کرتے کہ محبت کرنا اپنے بس کی بات تھی اور شادی کرنا دوسروں کے"۔ میرے دل کی آواز کو جس طرح آپ سن رہے ہیں۔ دولھا کے بارے میں پوچھنے والے سن پاتے تو رنگ میں بھنگ ہی پڑ جاتا۔ آپ چاہیں چار شادیاں کر ڈالیں۔ کسی کی انگلی نہ اٹھے گی۔ لیکن کسی ایک کی ناکام ہی محبت کا راز کھل جائے تو ایسی لے دے ہوگی کہ دوبارہ کبھی محبت کا نام لینے کی ہمت نہ ہوگی۔ ویسے محبت کی مزیداریوں کا میں بھی قائل ہوں لیکن چار لوگوں کے کہنے سننے کا کھٹکا ایسا لگا رہا کہ ہمت نہ بڑھی۔ آج وہی ہمارا دوست ایک وفا شعار اور محبت نواز بیوی کا شوہر ہے۔ لیکن جب میرے پاس ہوتا ہے تو گزری ہوئی محبت کی یاد کو کرید کرید کر چھیڑتا ہے۔ بار بار یہ شعر گنگناتا ہے۔

عشرتِ گم شدۂ خلد تو مل جائے گی

اے محبت ترا آغاز کہاں سے لاؤں

اور میں کہتا ہوں کہ آغاز کو کیا روتے ہو انجام کی فکر کرو۔ جس لڑکی سے تم نے محبت کی اس کی بھی کسی سے شادی ہو جائے گی۔ اور یہ امرِ اور ھادھند محبت خواب و خیال ہو کر رہ جائے گی۔ محبت پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے یہ بہت معرکۃ الآرا بحث ہے غالب نے کہا خلل ہے دماغ کا۔ شیفتہ نے کہا "ایک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی" اور میں کہتا ہوں کہ جس طرح انسان کو بھوک پیاس لگتی ہے اسی طرح محبت دل کی بھوک یا پیاس ہے۔ اور یہ آگ کی طرح وقتاً فوقتاً بھڑکتی رہتی ہے۔ آپ کا نظریۂ محبت کچھ اور ہوگا

آپ شاعرانہ یا فلمی یا رومانی محبت کے قائل تو نہیں؟ ایسی محبت میں تو انسان ایک نظر میں عمر بھر کے لئے دام محبت کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اور چاہے کوئی پوچھ کر بھی نہ دیکھے۔ اپنے جذب اور کشش کا آسرا لئے محبت کے مختلف مدارج طے کرتا رہتا ہے۔ اور آخر میں ع "موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز" کا سماں باندھ دیتا ہے۔ آپنے محبت کو اپنے تاثرات کے تحت محسوس کیا ہے تو آپ کوئی درست نظریہ بھی قائم کر سکیں گے ورنہ اسی میرے دوست کا حال ہوگا کہ ازدواجی محبت کا قائل ہی نہیں ہوتا۔ جب پوچھتا ہوں "کیوں" تو جواب ملتا ہے کہ دل سے مجبور ہوں۔ اچھا دل ہے کہ ایک لڑکی سے محبت کرنے پر مائل ہوتا ہے اور دوسری سے کتراتا ہے۔ خوش قسمتی سے بیوی محبوبہ سے زیادہ حسین زیادہ سمجھدار اور زیادہ محبت کے قابل ملی ہے۔ اور یہ بات بھی نہیں کہ بیوی اس کی محبت کا دم نہیں بھرتی وہ اس کی ایک مسکراہٹ کے لئے سو سو جتن کرتی ہے۔ اور میاں ہیں کہ "دل سے مجبور" یہ دل کی مجبوری اس پر کھل جائے تو۔ اور مجھے شبہ ہے کہ وہ کچھ بھانپ گئی ہے تب ہی تو اس نے مجھ سے ایسا سوال کیا۔ وہ سوال آپ بھی سن چکے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خاوندوں کو گزشتہ پر صلوات بھیج دینا چاہیے لیکن آئندہ کے لئے صرف اپنی بیوی کا ہو رہنا چاہیے۔ بیوی کے حق میں احتیاط برتنا اپنی پر مسرت زندگی کو اپنے ہاتھوں بد مزہ بنا لینا ہے۔ بیوی صرف بیوی بننے کے لئے نہیں آپ کی۔ میری مراد ہے اپنے شوہر کی محبوبہ بننے کی آرزو مند ہوتی ہے۔ اور یہ اس کا جائز مطالبہ ہوتا ہے۔ آپ کسی لڑکی ہی سے تو محبت کرتے ہیں۔ اور جب بیوی آپ کی پچھلی خطاؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا دل آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اس کے دل کو اپنے دل میں جگہ دیں۔ گزری ہوئی باتوں کو بھلا دینا ہی اچھا۔ اور جس قدر جلد اسی قدر بہتر۔ میں نے اپنے دوست سے بھی کہا اور آپ سے بھی یہی کہتا ہوں کہ ہماری زندگی کا مقصد صرف محبت کرنا نہیں۔ زندگی کی بہت سی اہم ذمہ داریوں کی تکمیل ہمارا مقصد ہونا چاہیے۔ قیس و فرہاد کی جانشینی اگر منظور ہو تو یہ بات اور ہے لیکن زمانہ کے ساتھ آئین محبت بھی بدل گئے ہیں۔ اب محبت ہی سب کچھ نہیں رہی۔ کوئی دن جاتا ہے کہ محبت سرے سے ناپید ہو جائے گی۔ انگلستان کی کسی محبوبہ نے اپنے چاہنے والے کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا کہ یہ وقت بے وقت آ دھمکتا ہے۔ اور میرے قیمتی وقت کو ضائع کرتا ہے اور اب تک جو میرا وقت خراب ہوا ہے۔ اس کا مجھے ہرجانہ بھرنے کے لئے بھی تیار رہنا پڑتا ہے ورنہ عدالت قیام و طعام کا بار اپنے سر لے لیتی ہے۔ کوئی شاعر مزاج کہہ اٹھے گا

کیا اسیر مجھے لذتِ اسیری نے ؏ بہ اُڑ کے دام میں آنے کا اک بہانہ تھا

توصاحب مبارک ہو یہ اسیری۔ چکی پیستے رہیے۔ ناک سے چنے چبائیے۔ آپ اسی اسیری کے مزہ لیتے رہیے۔ اور آپ کا محبوب آپ سے بے نیاز۔ زندگی کی کامرانیوں سے لطف اندوز ہوتا رہے گا۔ آپ کے ساتھی اعزاز و مراتب کے بلند مقاموں پر ہوں گے اور آپ اس سنگین چار دیواری میں اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر رہ جائیں گے۔ اور آپ لاکھ توبہ کریں معافی چاہیں، آپ کو وقت سے پہلے رہا نہ کیا جائے گا۔ میرے خیال میں محبت میں زندگی کو ضائع کرنا انسانیت کی توہین ہے کہ صرف محبت کے لئے انسان کی تخلیق مقصود ہوتی تو انسان تہذیب اور ترقی کے ان مہتم بالشان مدارج اور وسائل کا مالک نہ ہوتا۔ بھلا ایک گم کردہ محبت کو اپنا یا اپنے متعلقین کا

کیوں کوئی خیال ہو۔ وہ کچھ سوچ سکتا ہے۔ تو صرف اپنے محبوب کے لئے۔ اور محبت کرنے والوں کی یہ عجیب کمزوری بھی دیکھنے میں آئی کہ وہ اگر اپنے محبوب کو سب کچھ سمجھتے ہیں تو وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کا محبوب بھی انھیں سب کچھ سمجھے۔ اگر وہ زیورات یا ملبوسات یا کسی دوسری چیز کی فرمائش کر بیٹھے تو یہاں دل بیٹھا جاتا ہے کہ ہم چاہیں ان کو اور یہ چاہیں جنگل کے جھاڑوں کو۔ اس محاورہ کو عام بول چال میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ہاں خوب یاد آیا میرے دوست کی بیوی نے بھی اپنی گفتگو کی روانی میں اسی محاورہ کو استعمال کیا تھا۔ میرے دوست کے طرز عمل کی وہ شاکی تھی میرے دوست کی بے اعتنائی سرد مہری اور بے تعلقی اس کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ میرا دوست اس کی محبت کی قدر نہیں کرتا ہمیشہ اپنے آپ کو اجنبیوں کی طرح الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرے دوست کا یہ طرز عمل واقعی سخت تکلیف دہ تھا۔ اس کی چند اور بھی حماقتیں ہیں جنھیں میں بیحد مذموم سمجھتا ہوں۔ اس کی محبوبہ کی شادی کہیں قرار پانے والی ہے۔ تو اس کے ہوش و حواس گم ہیں۔ طرح طرح سے کوشاں ہے کہ یہ شادی نہ ہونے پائے۔ اور ادھر اس کی محبوبہ کا یہ حال ہے کہ اپنے منگیتر کی ہمت افزائیاں کر رہی ہے میرا دوست صرف ایک بار اس لڑکی سے ملنے کی دعائیں کرتا ہے۔ میں نے سمجھا دیا کہ ایسی نادانی نہ کرنا۔ اب تم اکیلے نہیں۔ تم سے دو خاندانوں کا تعلق وابستہ ہے۔ لیکن ٹیڑھی دم سیدھی ہوتی نظر نہیں آتی۔ میں نے تو سوچ لیا تھا کہ اس کی بیوی کے آگے سارا بھانڈا پھوڑ دوں۔ لیکن دوستی کا خیال مزاحم ہوا۔ اور میں نے گفتگو کو دوسرے ہی پہلو سے چھیڑ دیا۔ میں صاف گو آدمی ہوں کوئی بات کسی سے پوچھتا ہوں یا کہتا ہوں تو کچھ لپیٹ کر کام میں نہیں لاتا۔ میرے دوست کی بیوی اپنی قسمت پر آنسو بہاتی ہوئی بیٹھی تھی کہ میں نے دھیمے لہجہ میں پوچھا: "آپ نے کسی سے محبت کی ہے"۔ ایک دم وہ چونک پڑی۔ آنکھوں میں غصہ کوند گیا۔ لیکن میری سنجیدگی اور شخصیت کے زیر اثر چپ ہو رہی۔ میں نے اصرار کیا تو کہنے لگی "میں نے کسی سے محبت نہیں کی۔ دل تو میرا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے موقع نہ ملا۔ میں اپنے شوہر سے محبت کرنے کی آرزو میں جی رہی تھی۔ میں محبت نہیں پرستش کرنا چاہتی تھی۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے دیوتا نے مجھے کس طرح ٹھکرا دیا"۔ ہاں میں دیکھ رہا تھا۔ اور اس دیوتا کو کیسی پوجا چاہیے یہ بھی میں جانتا تھا میں نے اپنی امید افزا باتوں سے اس کی ڈھارس بندھائی اور وہ چلی گئی۔ اسی اثنا میں وہ مجنون دوست میرے پاس آئے۔ ایک نئی خبر لائے کہ وہ لڑکی ملی تھی۔ اس شادی سے سخت ناراض تھی۔ اس کا تو ارادہ ہے کہ عمر بھر ان کی یاد میں آنسو بہاتی رہے وغیرہ" میں نے نفرت سے اپنی گردن پھیری اور ناراض لہجہ میں کہا: "تم سے کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ زیادہ نہیں مجھے صرف چند دن کی مہلت دو میں تمھیں دکھلا دیتا ہوں کہ تمھیں کس طرح بہکایا جا رہا ہے۔ اور کہنے والا کس قدر سچا ہے"۔

مجھے زیادہ دن انتظار نہ کرنا پڑا۔ اس لڑکی کی شادی ہوگئی۔ جب میرے دوست نے دولھے کو دیکھا تو اپنے سے زیادہ وجیہہ زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ دولت مند پایا۔ اس کے باوجود اسے لڑکی سے کچھ آس بندھی تھی۔ اور وہ آس یوں ٹوٹی کہ دولھا ان کے دوست نکلے۔ اور شادی کے بعد تو اچھا خاصا "یارانہ" ہوگیا۔ اب وہ دولھا

اپنی بیوی کی روز افزوں محبت کے افسانے سناتا۔ اور میرا دوست ذرا سوچیئے تو کیا حال ہوتا ہوگا بچارے کا۔ ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے۔ میں نے سمجھا تھا اس کی آنکھیں اب کھل جائیں گی۔ لیکن اپنے دل کا سارا ابال وہ بیوی کے سر انڈیلتا کہ اس سے شادی کرکے اس نے اپنی محبوبہ کو کھو دیا۔ اس نے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس سے شادی کرکے ایک الھڑ معصوم لڑکی کتنی خوشیوں سے محروم رہ گئی۔ اور کتنی تمنائیں اس کے دل میں گھٹ کر رہ گئیں۔ میں تو سوچتا ہوں کاش اس کی بیوی نے بھی محبت کی ہوتی۔ آج اس کی تلخ کامی اتنی اندوہناک تو نہ ہوتی۔ اتفاق کہیئے یا پیے در پے ناکامیوں کا اثر میرا دوست بیمار پڑ گیا۔ بیماری نے طول کھینچا۔ اور ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کردی۔ لیکن بیوی کی تیمارداری اور شبانہ روز خدمت نے اسے موت کے منہ سے چھڑا لیا۔ اب اسے احساس ہوا کہ حقیقت اور افسانہ میں کتنا فرق ہے۔ بیوی اور خیالی محبوبہ میں کون سچی بہی خواہ اور قابل محبت ہے۔ اس بیماری میں وہ اپنی بیوفا محبوبہ کے تصور میں ایڑیاں رگڑتا رہتا۔ تو کب کا راہی عدم ہوچکا ہوتا۔ اب اپنی نئی زندگی میں بیوی اس کی محبت کی مالک ہے۔ اور یہ محبت چھینی ہوئی یا زبردستی حاصل کی ہوئی نہیں۔ عطا کی ہوئی ہے۔ نذر کی ہوئی ہے۔ اور وہ دونوں خوش ہیں۔

اس واقعہ سے آپ کو محبت کی مفروضہ رومانیت اور واقعیت کا بھی اندازہ ہوگیا ہوگا۔ اب ایک سوال آپ سے بھی ہے؟۔ یہ کوئی امتحانی سوال نہ ہوگا۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میرا سوال ہزاروں دلوں کی پکار ہے۔ ان ستم رسیدوں کی فریاد ہے جو ہماری معاشرت کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہیں۔ جن کی مرضی جن کی زندگی جن کی خوشی کسی کے نزدیک درخور اعتنا نہیں ہوتی۔ اور وہ مظلوم ہستیاں عورتیں ہیں۔ بیویاں!! جن کی قسمتیں شوہروں کے ہاتھوں میں دیدی جاتی ہیں۔ یہ نوجوان محبت کے متوالے شوہران کو اپنی محبت سے محروم رکھتے ہوئے تباہی کے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ اور یہ معصوم زندگیاں گھٹتی ہوئیں ان کے پیچھے پیچھے تباہی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ بیویوں کو بیڑیاں سمجھ کر پاؤں میں پہن لیا جاتا ہے۔ اور گھر کی چار دیواری ان کی بیاہتا زندگی کا مدفن بن جاتی ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ کون اس ناانصافی کے لئے جوابدہ ہوگا۔ کیا اس سوال کا کوئی جواب آپ کے پاس ہے؟ اس گتھی کا کوئی حل آپ سوچ سکتے ہیں؟ آپ جتنا وقت چاہے لیجئے۔ زمانہ آپکے جواب کا انتظار کرتا رہے گا۔

رشید قریشی

پرچم

وہ دو روز سے بھوکا تھا۔ خود کے پیٹ بھرنے کا سوال نہیں تھا۔ وہ خود تو کافی دنوں تک بھوک سے ہی بہلا سکتا تھا، لیکن اس کے سامنے سوال تھا اپنے دو ننھے ننھے بلکتے ہوئے بچوں کا۔ اپنی بیوی اور ضعیف ماں کا۔ پرسوں سے مل بند ہے۔ ایک وہ ہی نہیں بلکہ سیکڑوں مزدور بے کار اور بھوک کا شکار بن گئے ہیں۔ صبح جب سو کر اٹھا تو منے کی ماں کو عجیب حالت میں دیکھا۔ اس کا دودھ سوکھ گیا تھا۔ اب اس سے اور نہ دیکھا جا سکا۔ وہ گھر سے نکل پڑا ـــــ سماج اور اس کے قانون سے لڑنے کے لئے ـــــ ظلم اور ناانصافیوں کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کے لئے ـــــ یا پھر ـــــ نہ جانے کس لئے۔

"چاندا رے ار چاندخاں"

اس کا نام تو اصل میں تھا رمضان خاں لیکن ماں بیچاری کا وہ اکلوتا تھا اس لئے وہ اسے چاند پکارتی تھی ـــــ یہی نام چل نکلا تھا اس کا۔

"کیا ہے رے میکو"

"سانپ سونگھ گیا ہے کیا"

"ہاں بس یہی سمجھ لے"

"یار مجھے بھی کچھ نہیں سجھائی دیتا۔ پرسوں اس بنیے نے ایک روپے کے چاول ادھار دیے تھے۔ آج تو گھر میں ایک دانہ بھی نہیں۔ تیری بھابی رو رہی تھی میں نے سوچا چلو اتنا بڑا شہر ہے کوئی کام دھندا ڈھونڈ نکالو ـــــ ایک مل بند ہو گئی تو کیا ہوا"

چاندخاں اور میکولال تکا رام کی گرنی میں کام کرتے تھے۔ مشین کا معاملہ تو نازک ہوتا ہی ہے بیل بدھو تو ہے نہیں کہ اڑ گئے تو مار پیٹ کر ہانک لیا۔ مشین کا کوئی پرزہ بگڑ گیا تھا جس سے گرنی ہی بند ہو گئی۔ پورے پانسو مزدور بے کار ہو گئے کسی لیڈر یا قائد کو ان پانسو بھوکوں کی فکر نہیں تھی لیکن بھوکوں کو تو موت سے بہرحال لڑنا ہی تھا۔

میکو اور چاندخاں شہر کے چوک میں آ گئے دیکھا ایک میلہ لگا ہوا ہے کھانا نہ سہی تماشا ہی سہی۔ تماشے سے بھی تو پیٹ بھر سکتا ہے۔ لیکن وہ تو تماشا نہیں تھا۔ ایک شخص خاکی وردی پہنے چلا چلا کر کہہ رہا تھا ـــــ

وطن کے پاسبانو! ہندوؤ اور مسلمانو۔ آؤ ـــــ

میری بات سنو آج تمہارے امتحان کی گھڑی آ پہونچی ہے۔ دشمن تمہارے ملک کی سرحدوں میں گھس پڑا ہے۔ آیئے اس وقت اپنے ملک سے نکال باہر کرنا تمہارا کام ہے۔ تمہارا وطن تمہاری قوم اور تمہارا مذہب تم سے کچھ مانگتا ہے۔ قربانی ـــــ ایثار ـــــ حب الوطنی ـــــ"

میکولال نے چاندخاں کے کندھے پر رکھ کر کہا۔

"چاند بھیا یہ کیا کہتا ہے۔"

"کہتا ہے ہندوستان میں دشمن گھس آیا ہے۔ ملک کی حفاظت کرو"

"تو بھیا یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی۔ ملک سے دشمن چاہے نکلے یا نہ نکلے۔ ہمارے تو بیوی بچوں کے پیٹ کا بندوبست ہو جائے گا"

"ہاں ہے تو بات بڑی اچھی۔ مگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"مگر کیا چلو چلو ـــــ یوں بھی دیش کی رکشا کرنا اپنا دھرم ہی تو ہے۔"

ایک ایک کرکے سارا مجمع چھٹ گیا لیکن تکا رام کی گرنی کے کئی مزدور باری باری سے اپنا نام لکھاتے رہے۔ گنگا۔

موہن، سونی، میکولال اور چاند خاں نے بھی اپنا نام لکھا دیا۔

"روتی کیوں ہو میں مرنے کے لئے تھوڑا ہی بھرتی ہوا ہوں۔
ارے میں تو تیرے اور منے کی ماں کے کھانے پینے کا بندوبست کررہا ہوں"
"نہیں نہیں بیٹا تو مت جا۔ لڑائی پر جانے والوں کا صحیح حال
نہیں معلوم ہوتا اور پھر یہ دن ہمیشہ ایسے ہی تھوڑے رہیں گے۔
نہیں بیٹا تو اپنے شہر ہی میں کوئی کام دھندا کرلے۔"
"میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں ماں دیکھتی نہیں ہو کتنے سارے
لوگ بھرتی ہوگئے ہیں ــــ کیا ان سب کے بیوی بچے نہیں
ہیں ارے میکولال بھی تو رہے گا میرے ساتھ۔"

چاند خاں یوں تو اپنی ماں سے ہمت کی باتیں کررہا
تھا لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ وہ دیکھ
رہا تھا اس کے منے کی ماں سسکیوں سے جھنجھناتی ہوئی کڑاہی
چاٹ رہی تھی اس کا منا ابھی رو رو کر سوگیا تھا۔

چاند خاں کے سامنے دو سوال تھے۔ محبت اور فرض۔
اس نے اپنی بے بس محبت پر فرض کو ترجیح دینا ہی مناسب
خیال کیا وہ اپنی محبت سے اپنی ماں۔ بیوی اور بچوں کا
پیٹ تو نہیں بھر سکتا تھا۔ وہ محاذ جنگ پر چلا گیا ــــ
دشمنوں کو ملک سے نکال باہر کرنے کے لئے اپنے وطن کو
آزاد کرنے کے لئے۔ اپنے مذہبی فرض سے سبکدوش ہونے
کے لئے!

سنناتی ہوئی گولیاں اور توپوں کی گرج۔ سیکڑوں ہزاروں
کی آہ کراہ۔

آزادیٔ وطن کے لاکھوں پرستار اسی ہنگامے میں اپنی
جنم بھومی پر تڑپ تڑپ کر جان دے رہے تھے۔ دن ــــ
ہفتے اور مہینے ہو گئے ــــ چاند خاں اب تنہا رہ گیا
تھا۔ میکولال کی بیوی خط کے انتظار میں رہ گئی۔ موت
اور حیات کی آغوش میں بے دست و پا بچے کی طرح چاند خاں
بوکھلا گیا تھا۔ دشمن آگے بڑھتا ہی گیا ــــ پیچھے ہٹو پیچھے
محاذ چاند خاں کے شہر کی حدود تک پیچھے ہٹ گیا۔

"ماں سن رہی ہو یہ آوازیں۔ چلو نا انھیں دیکھ آئیں۔"
"بہو کلیجہ تو میرا بھی پھٹ رہا ہے۔ لیکن کون جانے وہ
کہاں ہوگا۔"
"ہردیال آیا ہے وہ کہتا تھا کہ منی پور سے کچھ ہی دور ہیں"
قریب آدھی رات کے توپوں کا ایندھن کچھ دیر کے لئے
ٹھنڈا پڑا۔ چاند خاں کی ماں ادا اس کی بیوی کی طرف
چل پڑے۔ ہر طرف خموشی تھی لیکن منی پور سے قریب پہنچ کر
انھوں نے سنا۔ سیکڑوں انسان کراہ رہے ہیں۔ کئی سپاہیوں
کو انھوں نے مرا ہوا دیکھا۔ بوڑھی ماں کا دل دہل گیا بہو کی
آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی لیکن وہ آگے بڑھے
چلے جا رہے تھے۔ انھیں یقین نہیں آتا تھا کہ چاند خاں جیسا
ہٹا کٹا انسان مر سکے گا۔ وہ اسے توپوں اور بندوقوں سے
بھی بڑی قوت سمجھے ہوئے ــــ بڑھے جا رہے تھے کچھ
شور سا ہوا۔ تاریکی کے پردوں کو چاک کرنے کے لئے توپوں
کے منہ کھل گئے۔ گولہ باری ہونے لگی۔ اندھیرے میں ایسا
معلوم ہو رہا تھا جیسے ہزاروں تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔
"بہو" بوڑھی ماں نے چیخ کر کہا۔"
"ماں۔ مجھے ان کے پاس لے چلو۔" گولی بہو کے سینے میں
آر پار ہوگئی تھی۔ بہو دھم سے زمین پر گر پڑی۔ وطن کو آزاد
کرانے والوں نے زور شور سے گولے برسانے شروع کئے۔

ایک بار بجلی زور سے چمکی —— بڑھیا نے دیکھا۔ درخت کے پیڑ سے سہارا لئے کوئی کھڑا ہے۔ وہ دوڑی قریب پہنچ گئی۔

"چاند"

بڑھیا کی ہلتی ہوئی آواز توپوں کی گرج میں دب کر رہ گئی۔ اس نے دیکھا اس کا چاند آج روشن نہیں ہے۔ ہاتھ پیر شل ہو گئے ہیں۔ اور سر پر —— اونچا بہت اونچا ایک پرچم لہرا رہا ہے —— وطن کی آزادی کا حب الوطنی کا پرچم ——"

افضل عابدی

انقلاب

اے غلام ہندوستانِ محوِ خواب
اٹھ کہ سر پر آگیا ہے آفتاب
ذرہ ذرہ کھا رہا ہے پیچ و تاب
ہے فضا لبریز جوش و اضطراب
اب حقائق ہو رہے ہیں بے نقاب
اٹھ رہا ہے روئے فطرت سے حجاب

عہدِ بربادی کا ہے دورِ شباب
انقلاب اے قومِ خفتہ انقلاب

(۲)

اب نہیں وقتِ سوالِ این و آں
بڑھ نہ جائے زندگی کا کارواں
سنسناتی ہیں چمن میں آندھیاں
آشیاں کو تاکتی ہیں بجلیاں
تھرتھراتے ہیں زمین و آسماں
جاگ تو بھی اے مرے جنت نشاں

جھونک دے شعلوں میں مضرابِ رباب
انقلاب اے قومِ خفتہ انقلاب

(۳)

سرنگوں ہے آج فاروقی جلال
چھا رہا ہے قصر و ایواں پر زوال
سسکیاں بھرتے ہیں پارینہ کمال
لوٹتا ہے خاک و خوں میں عہدِ حال
خیرہ کن تھا جس تمدن کا جمال
اب نظر آئے ہیں اس کے خد و خال

اہرمن زادوں کا ہے روزِ حساب
انقلاب اے قومِ خفتہ انقلاب

(۴)

انتظارِ صبحِ خنداں —— تا بکے
حسرتِ بزمِ چراغاں —— تا بکے
بھیس میں شیطاں کے انساں —— تا بکے
کفر کے ہاتھوں میں ایماں —— تا بکے
اقتدارِ فتنہ ساماں —— تا بکے
ذلتِ خونِ شہیداں —— تا بکے

تا بکے افسانۂ حسن و شراب
انقلاب اے قومِ خفتہ انقلاب

(۵)

دیکھ اصلِ عزم و ہمت بڑھ چلے
دیکھ آزادی کے پرچم کھل گئے
نظرِ عہدِ کہن کیا چیز ہے
دیکھ آنکھیں کھول نظارے نئے
وقت کیوں ٹھیرے گا تیرے واسطے
موت کے طوفاں میں کشتی ڈال دے

پنجۂ بلبل میں شاہین و عقاب
انقلاب اے قومِ خفتہ انقلاب

صمد رضوی ساز

شاعر

وہ انقلابی نظمیں اور گیتیں لکھا کرتا تھا، اسی جرم کی پاداش میں وہ جیل بھیج دیا گیا، چونکہ وہ سکون کو طوفان سے آشنا کر رہا تھا۔

میں بھی حیران ہوکر سوچتا ہوں کہ وہ ایسے گیت اور اتنی خطرناک نظمیں کیوں لکھا کرتا ہے؟ وہ کیوں ان تاروں کو نہیں چھیڑتا ہے جن سے محبت کے نغمے پیدا ہوں۔ شباب بے پناہ ہو جائے، ہر ایک کے شعور اور لاشعور میں رنگینیاں کیف اور سرمستیاں رقص کرتی رہیں۔ ہمارے دیس کے شاعروں نے آج تک یہی راگ الاپے ہیں شاعر کا نغمہ اور مغنی کی لے بغاوت اور انقلاب ہو جائیں تو یہ دنیا جہنم بن کر رہ جائے گی۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ ہندوستان کو محبت کے نغمے اور عشق کی تانیں چاہئیں ورنہ ہمارے دلوں کی آگ، ہماری گرمیٔ حیات اور عقل و خرد سب فنا ہو جائیں گے۔

جمیل نے بھی یہی سوچتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ کسی دربار میں کئی شعراء موجود تھے ایک مرتبہ بادشاہ اپنے دشمن سے مقابلے کے لئے ان شاعروں کو ساتھ لئے میدانِ جنگ گیا تھا، وہاں ان شاعروں نے اپنے خیال کی ندرتوں اور لطافتوں کے وہ اعجاز دکھائے کہ بادشاہ سلامت لے آرٹ کی قدردانی کی۔ شاعر کی دنیا، خیالوں کے وہ جزیرے ہیں جہاں وہ والہانہ اور مستانہ وار گھومتا، ان واردانوں اور کیفیتوں کو شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہے جس سے آگہی پیدا ہو جائے۔

لیکن یہ انوکھا شاعر، مزدوروں اور دہقانوں کے گیت لکھا کرتا ہے جو نہ شعر کی حقیقت سے واقف ہیں اور نہ ہی شعر کے معنی سمجھتے ہیں وہ اسے ان شعروں کے عوض کیا دے سکتے ہیں؟ اب شعر و نغمہ کا خدا ہی حافظ ہے۔ شاعر ایوانوں اور شبستانوں سے نکل کر کھلیانوں اور کھیتوں کا رخ کر رہا ہے۔ ڈر رہا ہوں کہ کارخانوں کے دھوئیں اور کھیتوں کے گرد و غبار میں وہ کہیں گم ہی نہ ہو جائے۔ ازل سے آج تک شاعر نے ایوانوں میں اپنے دن گزارے ہیں، زر و جواہر میں تولا گیا ہے، اور جب شبستانوں میں رہا ہے جن نے شاعر کا استقبال کیا ہے، اس کے نغموں کو فردوس بنا دیا ہے، اس کے راگوں میں محبت کی دنیائیں آباد کی ہیں۔ لیکن یہ بیچارا شاعر۔ دیوانہ اور گم کردہ راہ! آج بھی اس نئے دور میں شاعر کی تانوں میں محبت کا طلسم ہے لیکن نہ جانے شہاب یہ دیوانہ شاعر!

شہاب دیوانہ ہی تو ہے، شہاب کے لکھے ہوئے گیتوں اور نغموں سے رضیہ کے گانے سارے ملک میں جادو جگا رہے تھے، اس کے گانے سارے ملک میں جادو جگا رہے تھے، اس کے گانے ہمارے دیس کا ہر فرد گاتا ہے۔ بچے، جوان، نوجوان اور بوڑھے سب ان نغموں پر جان دیتے ہیں۔ ہمالہ سے لیکر راس کماری تک بنگال سے کراچی تک، کانن بالا اور خورشید کی آواز لہرا رہی ہے۔ ان لوگوں سے پوچھ لو کہ تمہارا گورنر کون ہے وہ سوال پوچھنے والے کو تعجب کی نگاہوں سے یوں دیکھیں گے جیسے وہ افریقہ کا کوئی جانور ہے ان کے تئیں اگر آپ کو "پریت کی ریت" یاد نہیں تو کچھ یاد نہیں۔ رضیہ کی آواز میں جیسے موسیقی کا دیوتا چھپا بیٹھا تھا، اس پر شہاب کے لکھے ہوئے نغمے ہندوستان کے رہنے والوں کی ایک دنیا بناتے ایک دنیا مٹا دیتے تھے وہ اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر سرد ھنتے ہوئے سرد آہیں بھرتے یا کیف و مستی میں چور مسکرا پڑتے۔

لیکن شہاب دفعتاً بدل گیا۔ اس نے حسن و عشق کے

گیت ہی چھوڑ دے گا۔ رضیہ کی شبستانوں میں رات رات بھر جاگ کر خیالوں کے کئی آتش کدے بنائے تھے، حسن کو سرفراز کیا تھا، عشق کو رعنیں بخشی تھیں۔ لیکن نہ جانے وہ کن پرچھائیوں کو دیکھ کر ڈرا ـــــ سہما اور پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک شام وہ رضیہ کی محفل میں زندگی کو سرشار یا عطا کر رہا تھا کہ ایک بڑھیا دو لڑکیوں کو لئے چلی آئی۔ دو لڑکیاں کیا تھیں، دو جوانیاں تھیں، دو شعلے تھے دو بجلیاں تھیں جو گرد و غبار میں آٹی ہوئی افلاس کی ماری تھیں۔ بڑھیا نے رضیہ سے کہا۔ یہ دونوں بہنیں بنگال سے آئی ہیں۔ بنگال میں کال پڑا ہے۔ قحط ـــ قحط ـــــ نجانے ان کے ماں باپ کدھر گم ہو گئے۔ زندگی اور موت کونسی طاقت نے انھیں اپنے قبضہ میں رکھا ہے۔ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ مجبور و بے بس ہیں اور زندگی کے لئے سہارا چاہتے ہیں۔ وہ مجبور و بے بس لڑکیاں اپنی بے بسی اور درد کا ایک خاموش افسانہ سنا رہی تھیں، حیا ان کے رخساروں پر سرخی بن کر دوڑ رہی تھی۔ رضیہ نے بڑھیا سے کچھ گفتگو کی اور وہ بنگال کی بھوکی لڑکیاں رضیہ کے ہاں رہنے لگیں۔ شہاب نے کچھ ہی دنوں میں یہ محسوس کیا کہ یہ لڑکیاں کہی جا رہی ہیں آگ سرد ہوئی جا رہی ہے، ان کی پیشانی کے بل اور چہرے کی ایک ایک شکن سے غم و اندوہ جھانک رہے ہیں۔ ہر لفظ ایک آہ ہے، ہر سانس ایک نوحۂ غم ہے جو بنگال کی بربادی پر بلند ہو رہی ہے۔ شہاب نے یہاں دیکھا کہ جنت جہنم میں داخل ہو رہی ہے، جہنم کے شعلوں نے فردوس کی راحتوں کو بھی تباہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ شبستان سے بھاگ نکلا اور کارخانوں کھیتوں میں جا پہونچا۔ یہاں پہنچے

آنے سے پیشتر وہ غم جاناں اور فکر محبوب کی آگ میں جھلستا رہا اور اب مزدور اور کسان کا غم اس کی تقدیر بن گئے ہیں۔ مزدور کا افلاس اور کسان کی بیچارگی کے رنج و الم میں اب یہ گھلتا رہے گا۔

قدرت نے شاعر کو احساس کی امانتیں اس لئے نہیں سونپی ہیں کہ وہ فکروں میں ڈوبا رہے غم جاناں کے بعد یہ غم دوراں، شاعر کی نسل ہی کو کہیں ختم نہ کر دے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہمارا دیس ایک صحرا ہو کر رہ جائے گا۔ جہاں کوئی نغمہ نہیں کوئی لے نہیں۔ گھونگھٹ میں گوری جلے اوس سے بھرے تورے نین، رات اندھیری کالی کالی اور پیا بن نہیں آوت چین کی مدھ بھری تانوں نے آج ہمارے دیس والوں کو زندہ رکھا ہے۔ حیات کی تلخی اور بدمزگی شاعر کے انہی نغمات سے بجھاتی جا رہی ہے کسی سندری کا ڈھول پر گنگنانا، وفات اور آزادی کے موہوم تذکروں سے زیادہ حیات بخش ہے رات جب میں سویت جرمن جنگ کی خبریں پڑھ رہا تھا، ایک تانگہ والا تان اڑاتا جا رہا تھا۔ (تورے من میں بسونگی او ساجنا) مورے من نین بسوائے ساجنا ـــــ۔ اخبار ہاتھ سے چھوٹ پڑا اس روز جرمنی سے بھاگ کر میں رفیعہ کی جناب میں پہونچا جو بجائے میرے کسی لورڈ وا کے مسند رنیں جا بیٹھی ہے۔ ایک کلرک اور رفیعہ نہ کبھی مل سکتے ہیں اور نہ مل سکیں گے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ مفلس خاندان کو اور افلاس میں جھونک کر بی اے کی چاندی سی سفید سند لینے کے باوجود صرف کلرک ہی رہا اور آگے نہ بڑھ سکا اس تان نے میرے دل کے ان تاروں کو چھیڑا ہے جس سے آہیں تھرا اٹھیں جیسا نے شاعر کی خدمت میں اپنا خراج پیش کیا وہ میرا ہمنوا ہے، شریک غم اور زخموں پر پھایا رکھنے والا۔

یہ شاعر سارے انسانوں کے دکھ اور درد کے ساتھی ہیں لیکن آج اس انوکھے شاعر پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا جو دو بھوکی بنگالی لڑکیوں کو دیکھ کر اپنا راستہ بھٹک گیا۔ یہ مزدور اور کسان نجانے کونسی آفت لے آئے کہ دنیا کا رنگ بدل رہا ہے۔ محفل کی رونق، انجمن کی ضیاء اور بزم نشاط کے انجم کو چھین رہے ہیں۔ شہاب شبستان سے بھاگ نکلا۔ اب وہ ایسی بے نور پھیکی اور اداس دنیا میں جا پہونچا جہاں نہ رضیہ کے گلے کا لوچ ہے نہ شبستانوں کی کافوری شمعیں، نہ عود و عنبر کی لپٹیں اور نہ ہی زرتار فرش ہے و مینا، جام و ساغر کی جگہ رہٹ چلنے کی آواز اور مشین کا شور وہ شاعر کے بجائے پاگل ہو جائے گا۔ اسی خبط کا تو یہ اثر ہے کہ اس نے انقلاب اور بغاوت کے نعرے لگائے۔ بے مدعا اور بے مقصد نعرے ان نعروں پر اس کو جو سزا ملی ہے وہ عین انصاف ہے مجسم عدل ہے"۔ اس سکون کو درہم برہم کر رہا تھا جو صدیوں سے دائم و قائم ہے"۔ ایک ذخیرۂ آب میں کنکریاں پھینک رہا تھا جس سے سارا پانی سکون سے حرکت میں آگیا تھا اور وہ مچھلیاں جو چھوٹی مچھلیوں کے شکار کو آگے بڑھ رہی تھیں سہم گئیں۔ اس کی یہ حرکت ہنگاموں کی ابتدا ہے جن کی انتہا ایک قیامت ہے۔

شہاب جیل میں ایڑیاں رگڑ رہا ہوگا، اگر وہ بنگال کی دو بھوکی دوشیزاؤں کو نہ دیکھ پاتا تو آج تقدیر اس کے سر پر ایک جگمگاتا تاج پہنا دیتی، اس کے نغمے دیس کے گلی کوچوں میں گونجتے اس کے دکھ بھرے گیت سن کر لڑکیاں ایک آہ بھرتیں نوجوان اپنی ہمنوائی کے لئے اس کے زیر بار منت ہوتے اس کی محبت کے اشعار دھڑکتے دلوں کی صدا بن جاتے، انھیں حیات دوامی عطا کرتے اس کا گیت موسیقیت کے امتزاج سے بے شمار فردوس بناتا۔ وہ خود گلوئے زہرہ کی آواز بن جاتا۔

اس کی زہریلی نظمیں انہی کو مبارک ہوں جو دیس سے دلوں کی دھڑکن بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ ہماری آخری متاع زرد چہروں، بے نور آنکھوں، لاغر جسم اور نحیف و نزار روح کو ان ترانوں کی ضرورت ہے جو جسم میں ارتعاش پیدا کریں، روح میں ایک لرزش بپا کردیں اور دل میں امنگ اور تمنا رقص و اہتزاز کرنے لگ جاتے۔ یہی ترانے ابتدا سے گاتے جارہے ہیں اور گاتے جاتے جائیں۔ شہاب کی شاعری سکون کو درہم و برہم کرتی ہے۔ وہ ایک ذخیرۂ آب میں کنکریاں پھینکتا ہے جس سے سارا پانی سکون سے حرکت میں آجاتا ہے اور وہ مچھلیاں جو چھوٹی مچھلیوں کے شکار کو آگے بڑھتی ہیں سہم جاتی ہیں۔

ہنگامہ و اضطراب کا خالق یہ دیوانہ شاعر سکون، سکوت اور محبت کے رموز پر ایک کاری ضرب لگانا چاہتا ہے۔ اف بنگال کی بھوکی لڑکیاں نصیبوں جلی اپنے جلو میں بدنصیبوں کا ایک لشکر لئے آئی ہیں۔ بنگال سے بھاگ کر یہ لڑکیاں شاعر کو گلشن سے صحرا میں بھگا رہی ہیں۔

یہ بھوکی لڑکیاں اور ان کا وارفتہ یہ شاعر!

ستارہ، آسمان کی گود سے ٹوٹ کر زمین کی نجاست میں راکھ ہو رہا ہے ——— بے چارہ شہاب ——— دیوانہ شاعر!

محمد محبوب حسین

(نوٹ) اس شمارہ کے متعلق آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

مدیر

کفر اور شاعر

سلام اس نظم کو خونریزیاں بھی جس میں شامل ہوں — سلام اس دہر کو افسوس و حسرت جس کا حاصل ہوں
سلام اس عقل کو جو چھین لے چہروں سے رنگینی — سلام اس زہد کو جو دے رہا ہو درسِ خود بینی
سلام اس علم کو جو نخوتوں سے آشنا کر دے — سلام اس ہوش کو جو زندگی صبر آزما کر دے
سلام اس بزم کو تخلیقِ عبرت کام ہو جس کا — سلام اس عیش کو سوزِ نہاں انجام ہو جس کا
سلام ان مذہبوں کو خون سے ہوں جن کی تعمیریں — سلام ان نیکیوں کو پاسباں ہوں جن کی شمشیریں
سلام اس زندگی کو جو قضا کی زد میں رہتی ہو — سلام اس سرخوشی کو جو ہوا کے رُخ پہ بہتی ہو
سلام ان دولتوں کو جو خداوندی سکھاتی ہیں — سلام ان عشرتوں کو جو غرض مندی سکھاتی ہیں
سلام اس گلستاں کو جس میں ویرانی نکھرتی ہے — سلام اس آشیاں کو جس پہ بجلی رقص کرتی ہے
سلام اس کارواں کو گمرہی پہ ناز ہو جس کا — سلام اس امتحاں کو ناشناسی راز ہو جس کا
سلام اس نظمِ دوراں کو سلام اس کبریائی کو — سلام ایسی عبادت کو سلام ایسی خدائی کو

عارف

یہ انکارِ حقیقت بھی حقیقت سے نہیں خالی — کہ اک درسِ حیاتِ نو ہے شاعر کی زبوں حالی
سمجھ سکتے نہیں اہلِ جہاں سوز و گداز اس کا — کہ دنیا سطح بیں ہے اور بہت گہرا ہے راز اس کا
یہ مزدوری کا دکھ غارت گری اربابِ دولت کی — یہ آسایش کے پردے میں گھٹائیں دردِ عبرت کی
یہ بیماروں کی چیخیں، یہ غریبوں کی دکھی نظریں — یتیموں کی یہ دردِ یاس میں ڈوبی ہوئی نظریں
یہ بیوائیں اور ان کی چشم و ابرو کی یہ ویرانی — یہ مائیں اور بھری گودوں پہ ان کی خستہ سامانی
یہ اہلِ علم اور باطل کے آگے سرنگوں ہونا — یہ اربابِ ہنر اور اس قدر زار و زبوں ہونا
یہ جنگیں، قتل و غارت کی یہ ہمت آزما رسمیں — حریفِ آدمیت کیا حقایق اور کیا رسمیں
ہوا کی رو میں اڑ جانا مہکتے گلستانوں کا — قضا کی زد میں یہ دم توڑنا کڑیل جوانوں کا
برستی جبریں اربابِ عقل و دل کی چوکھٹ پر — ضمیر و روح کی قربانیاں باطل کی چوکھٹ پر
حجابِ لطف میں بیرحمیاں آسودہ حالوں کی — یہ دیں کی آڑ میں خود بینیاں اللہ والوں کی

یہ مانا کر رہی ہے عقلِ اول اہتمام اس کا
نہ ہستی خام ہے خود اور نہ آئیں ناتمام اس کا

گر شاعر کے دل کا بھید کوئی پا نہیں سکتا
یہ وہ عقدہ ہے جس کو نطق ابھی سلجھا نہیں سکتا

یہ عالم ہے کہ ہر اک سانس ہے گویا حریف اس کا
بہت نازک بہت نازک ہے احساسِ لطیف اس کا

اسے فرصت کہاں ان خشک راہوں سے گزرنے کی
نظامِ زندگی کی الجھنوں پر غور کرنے کی

اچٹتی سی نظر اک ڈال دیتا ہے ببولوں پر
مگر اس کی نگاہیں جھومتی ہیں آ کے پھولوں پر

اسے اس سے غرض کیا پھول کی رگ رگ کو پہچانے
یہ کانٹے کیا ہیں کیا ہے پنکھڑی یہ راز بھی جانے

نظر شاعر کی جب پڑتی ہے اس عہدِ تباہی پر
نظامِ علم و عقل و ہوش کی گم کردہ راہی پر

اسے ملتا ہے اندیشوں سے گھبراتا ہوا انساں
ہجومِ تیرگی میں ٹھوکریں کھاتا ہوا انساں

ہوائیں ہونکتی ہیں ہر قدم آغوشِ طوفاں میں
فضائیں چیختی ہیں دم بدم اس دشت ویراں میں

بھٹکتا ہے اسی تاریک وادی میں خیال اس کا
نہیں پاتا نہیں پاتا جواب اکثر سوال اس کا

اسے اس کی گرفتہ خاطری پھر لے کے اڑتی ہے
حقیقت پر جمی تھی جو نظر اک بار مڑتی ہے

وہ کہتا ہے مآلِ زندگی برباد ہونا ہے
جسے کہتے ہیں ساحل اصل میں کشتی ڈبونا ہے

یہ سوز و درد ہوتا اور نہ یہ سود و ضرر ہوتا
زمانہ کا کوئی والی کوئی وارث اگر ہوتا

یہاں ہیں جس قدر آلامِ آب و گل کی بستی میں
سمٹ کر جمع ہو جاتے ہیں سب شاعر کی ہستی میں

انہیں رہ رہ کر دہراتا ہے وہ ان کی زباں ہو کر
سناتا ہے یہ قصے زندگی کا ترجماں ہو کر

دل اس کا اصل میں سرگرمِ سوز و ساز ہوتا ہے
کہ اس کا کفر اس کی روح کی آواز ہوتا ہے

علی اختر

اشتراکی

برہمن تجھ کو سمجھتا ہے نجس
مولوی کے لئے کافر تو ہے
توڑ دے جھوٹے خداؤں کا طلسم
صبحِ صادق کا پیمبر تو ہے

علی سردار جعفری

بے گناہ

(ایک دوست کے جیل جانے پر)

فریب لفظ پرستی ہے پردہ دارِ جنون
بنا دیا ہے جسے اقتدار نے قانون

ہیں خواہشوں کے جنازوں پہ زرق برق غلاف
اٹھا رہا ہے جنھیں اپنی دوش پر انصاف

یہ پستیوں کی بلندی سے ضابطوں کا نزول
حقیقتوں سے یہ بچنے کے گول مول اصول

یہ جنبشِ خمِ ابرو، یہ عدل کے فرمان
ہے فتح مندِ زباں کی شکست کے اعلان

فریب خوردہ غلامی کا یہ بلند مقام
یہ چند لفظوں پہ تعمیرِ زندگی کا نظام

یہ اختیار کی بے چارگی ہے یا ہے غرور
ہے زعمِ ذوقِ نظر سے حقیقتیں مستور

جبینِ جبر کی ہر اک شکن میں ہے مرقوم
کہ میری روح پشیمانیوں سے ہے محروم

زباں پہ مہر لگا دی قلم کو روک دیا
سمجھ رہے ہیں کہ سینے میں دم کو روک دیا

غلام ہاتھ نے پاؤں میں ڈال دی زنجیر
مگر صداقتِ احساس ہو سکی نہ اسیر

ترے خیال کی پرواز اب بھی ہے آزاد
تری نظر، تری آواز اب بھی ہے آزاد

سکوں نوازِ شب و روز قید خانے میں
کٹیں گے جرأتِ اظہار کے بڑھانے میں

میکش

ترقی پسند مصنفین

آگ محفل میں غلاموں کی لگا دیں اے دوست
دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کر دیں
گائیں ٹوٹے ہوئے بربط پہ ترانے دل کے
بزم کو اپنی نواؤں سے غزلخواں کر دیں
ڈال دیں وقت کی افسردہ نگاہوں میں نگاہ
عہد پارینہ کو اک خواب پریشاں کر دیں
رنگِ خون بھر کے بنائیں وہ نئی تصویریں
کاوشِ مانی و بہزاد کو حیراں کر دیں
چھین لیں ہاتھ بڑھا کر مہ و پرویں سے چمک
ہند کی خاک کے ذروں کو درخشاں کر دیں
کب تلک راہ کے کانٹوں سے بچائیں گے قدم
ان کو تھوڑا سا لہو دیکے گلستاں کر دیں
دے کے احساس نیا ہند کے شہ پاروں کو
حسنِ یوسف کو چراغِ تہ داماں کر دیں
عام ہو غالب و اقبال کی رعنائیٔ فکر
بے زبانوں کو زباں دے کے زباں داں کر دیں
کھول دیں سب کے لئے قفلِ در میخانہ
حضرتِ جوش کو سر حلقۂ رنداں کر دیں

علی سردار جعفری

فتح استالین گراڈ کے بعد!

توہمات کے تاریک و تنگ ڈیرے میں
مغالطوں کے فسوں کار سخت گھیرے میں
خیال و خواب کے عبرت نشاں اندھیرے میں!
ابھی تو شمعِ حقیقت جلائی ہے ہم نے!

ہزار فتنے ہیں پوشیدہ ذوقِ راحت میں
ہزار کانٹے ہیں پنہاں، گلوں کی چاہت میں
ہزار حشر ہیں خوابیدہ بطنِ فطرت میں!
ابھی تو ایک قیامت اٹھائی ہے ہم نے!!

وہ جانِ دید وہ ارمان دیدۂ حیراں
وہ نور و طور کی اک داستانِ نغمہ کناں
جہاں نے دیکھی کہاں مجلسِ مہہ تاباں!
ابھی تو محفلِ زہرہ سجائی ہے ہم نے!!

ابھی تو سازِ شبستاں کا وقت باقی ہے
ابھی تو لطفِ نگاراں کا وقت باقی ہے
ابھی تو رقصِ بہاراں کا وقت باقی ہے!
ابھی تو روحِ گلستاں جگائی ہے ہم نے!!

ابھی تو گردشِ دوراں پہ مسکرانا ہے
ابھی تو دشمنِ بیجان پہ مسکرانا ہے

ابھی تو حسرتِ طوفاں پہ مسکرانا ہے!

ابھی تو حیرتِ طوفاں بڑھائی ہم نے!!

دلاورانِ حسیں وہ بہادرانِ حسیں
قرارِ خاطرِ صحرا، نگارِ نجد نشیں
بتانِ چیں ہیں کہیں آہوانِ ہند کہیں!

"نئے جہاں" کو نئی مے پلائی ہے ہم نے!!

مہک رہا ہے کہاں "گلستانِ سرخ" نہ پوچھ
لہک رہے ہیں کہاں "شاہدانِ سرخ" نہ پوچھ
کہاں کہاں ہے ابھی "کاروانِ سرخ" نہ پوچھ!!

ابھی تو ایک ہی منزل دکھائی ہے ہم نے!!

نظر حیدرآبادی

غزل

بہ اندازِ نو اک جہاں بن رہا ہے	زمیں پر نیا آسماں بن رہا ہے
فلک کے ستاروں کے دن پھر رہے ہیں	قفس کی جگہ آشیاں بن رہا ہے
ہر اک نوع کی بندشیں اٹھ رہی ہیں	ہر اک بے زباں با زباں بن رہا ہے

نئی راہ پائی ہے انسانیت نے
نئی طرز کا کارواں بن رہا ہے

میر حسن

منزلیں

ہزاروں منزلیں ایسی ملیں گی — جہاں ہر گام پر کلیاں کھلیں گی
جہاں ہوں گی محبت کی بہاریں — جہاں ہوں گی مسرت کی پھواریں
جہاں دکھلا کے دلآویز راہیں — تجھے بہکائیں گی تری نگاہیں
جہاں الفت کے کچھ رنگین نظارے — کریں گے تجھ کو پردوں سے اشارے
مگر تو ان کے دھوکے میں نہ آنا
مسافر راستے میں رک نہ جانا

ملیں گے تجھ کو کچھ ایسے محل بھی — جہاں جلتے ہیں عشرت کے کنول بھی
جہاں شیشوں میں بہتی آگ بھی ہو — جہاں للچانے والا راگ بھی ہے
جہاں منہ مانگی دولت بھی ملے گی — جہاں شاید حکومت بھی ملے گی
تیرے سر پر خدائی ہاتھ ہوگا — ہر اک قانون تیرے ساتھ ہوگا
نہ بن جانا کہیں اِن کا نشانا
مسافر راستے میں رک نہ جانا

کچھ ایسی وادیاں تجھ کو ملیں گی — جہاں بربادیاں تجھ کو ملیں گی
دھواں اٹھے گا رنگیں مسکنوں سے — لپٹ جائیں گے شعلے دامنوں سے
جہاں چھوڑیں گے تجھ کو ساتھ والے — جہاں ٹوٹیں گے تیرے دل کے چھالے
جہاں دار و رسن کے حال ہوں گے — جہاں دل قید میں پامال ہوں گے
مگر گھبرا کے یاں ٹھوکر نہ کھانا
مسافر راستے میں رک نہ جانا

تری منزل ہے آزادی کی منزل — تمناؤں کی آبادی کی منزل
تجھے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنا ہیں — غلامی کی سلاخیں توڑنا ہیں
لگے بڑھنے وہ تاریکی کے سائے — بڑھے جانا قدم رکنے نہ پائے
فضا تاریک ہے مشعل جلا دے — اندھیرے راستوں کو جگمگا دے
وطن تیرا مصیبت میں ہے ہمدم — نجات اب تیری ہمت میں ہے ہمدم
وطن میں کیا زمانہ ہے اندھیرا — مگر ہونے ہی والا ہے سویرا
نئی تعمیر ترے ہاتھ میں ہے — تری تقدیر ترے ہاتھ میں ہے
بڑھے جانا نہ ہرگز، ہچکچانا
مسافر، راستے میں رک نہ جانا

علی جواد زیدی

انتقام

میرے قبضہ میں اگر نظمِ جہاں ہو جائے
لاغرِ انساں کی گردن پہ چلا دوں شمشیر
روند دوں سامنے آئے جو مرے بے تقصیر
محفلِ عیش میں پہنچے نہ کبھی نالۂ غم
اور مضبوط کروں درد و الم کی زنجیر
مرے قبضہ میں اگر نظمِ جہاں ہو جائے

ظلم و بیداد کے طوفاں کو روانی دے دوں
پھر سے چنگیز و ہلاکو کو جوانی دے دوں
عظمتِ کفر کو کچھ اور بڑھانے کے لئے
جہل کے ماروں کو نمرود کا ثانی دے دوں
مرے قبضہ میں اگر نظمِ جہاں ہو جائے

دیوتاؤں کی دیا، اور مسیحا کی شفا
اہلِ ایماں کی عنایات، رسولوں کی عطا
سایۂ شہپرِ جبریل کا دامِ تقدیس
کچھ بھی باقی نہ رہے فتنۂ شیطاں کے سوا
مرے قبضہ میں اگر نظمِ جہاں ہو جائے

شب کی ظلمت میں گناہوں کے دئیے جلتے رہیں
مکر کے سانچوں میں سرمایہ کے بت ڈھلتے رہیں
خونِ آدم سے بجھانے کے لئے پیاس اپنی
جرم آغوشِ تمدن میں یوں ہی پلتے رہیں
مرے قبضہ میں اگر نظمِ جہاں ہو جائے

تحسین سروری

فرمان

جو ہمیں لیجائیں عہدِ بربریت کی طرف
ذہن و قلب و پا کی ایسی رجعتوں کو چھین لو

بندۂ بےبس کے نالے بھی پہنچ سکتے نہیں
آسمانِ خواجگی کی رفعتوں کو چھین لو

جھونپڑوں تک جب پہنچ سکتی نہیں موجِ طرب
قصر و ایواں کی فراواں عشرتوں کو چھین لو

بے گناہ و بے خطا دوزخ کا ایندھن کیوں بنیں
قبضۂ شداد سے سب جنتوں کو چھین لو

جلوتِ جمہور کی بے کیفیوں کا واسطہ
ہر محمد شہ کی رنگیں خلوتوں کو چھین لو

مستی و رندی فقط زردار کا حصہ نہیں
جام و مینائے حسیں کی عصمتوں کو چھین لو

بے خضر ہی سب کو ملنا چاہیے آبِ بقا
راستہ گم کرنے والی ظلمتوں کو چھین لو

عام ہو کر بھی جو محدود و مقید ہو گئیں
فطرتِ فیاض کی اُن رحمتوں کو چھین لو

عرش و کرسی سے مقامِ تختِ سلطاں ہے بلند
ابنِ آدم کی خدائی عظمتوں کو چھین لو

سلیمان اریب

مرکز مصنوعات ملکی
ملکی مزدور نے
آپکے لئے کیا کچھ تیار نہیں کیا۔
مرکز مصنوعات ملکی
(بر ملاحظہ فرمائیے۔)
مالکان
اینڈ کمپنی

سوویٹ روس

یہ اردو زبان میں پہلی کتاب ہے۔ جس میں سوویٹ روس کی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت تفصیل سے بالکل غیر جانبدارانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ چند عنوانات ذیل میں دیئے جاتے ہیں۔

معاشی زندگی:۔ صنعتی نظام۔ صنعتی سائنس۔ زرعی نظام۔ زرعی سائنس۔ تقسیم پیداوار کا نظام۔ معاشی تحفظ۔

سیاسی زندگی:۔ سوویٹ حکومت کا دستور۔ دستور کی خصوصیات۔ کمیونسٹ پارٹی۔ مزدور سبھائیں۔ ڈکٹیٹر شپ یا جمہوریت۔ خارجی پالیسی قومیت کا مسئلہ۔ غیر روسی قومیتوں کی معاشی اور معاشرتی ترقی۔ سرخ فوج کا حصہ موجودہ جنگ میں۔ سرخ فوج کی تنظیم۔

معاشرتی زندگی:۔ تعلیم کا نظام۔ فنون لطیفہ کی حیثیت۔ فن تعمیر مصوری و سنگ تراشی۔ تھیٹر۔ میلے۔ سینما۔ ادب۔ پریس۔ عورتوں کی حیثیت۔ صحت جسمانی۔ کھیل۔ مذہب اور اخلاق۔

ہماری مطبوعات

(۱) غذا کیونکر ملے؟ قیمت ۶/ (۲) سوویٹ روس قیمت تین روپے (۳) مسئلہ غذا اور قیمتوں پر نگرانی ایکروبیہ ازیم زرسنگ راؤ ایڈیٹر رعیت

ہمارے پاس ملنے والی کتابیں

سین ۔۔۔۔۔۔۔ ۶/	نئی تصویریں ۔۔۔۔۔۔۔ ۹/۴
استالین ۔۔۔۔۔۔۔ ۶/۸	اتحاد و عمل کا پیام ۔۔۔۔۔۔۔ ۶/
غذا کیسے ملے؟ ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴/	نیا ادب نمبر (۱) ۔۔۔۔۔۔۔ عہ ۲/۸
نفرت ۔۔۔۔۔۔۔ ۶/	نیا ادب نمبر (۲) ۔۔۔۔۔۔۔ ”
بچوں کے قاتل ۔۔۔۔۔۔۔ ۶/	جاپان کا اصلی روپ ۔۔۔۔۔۔۔ عہ ۶/۴
رویا ۔۔۔۔۔۔۔ ۳/۶	فاشزم کیا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴/
نئے نغمے ۔۔۔۔۔۔۔ ۶/	بیکار ۔۔۔۔۔۔۔ ۶/
ہل اور ہنیا ۔۔۔۔۔۔۔ ۶/	دیہات کے غریبوں سے خطاب ۔۔۔۔۔۔۔ عہ ۲/۸
لینن ازم کی اساس ۔۔۔۔۔۔۔ عہ ۱۲/	جھنکار ۔۔۔۔۔۔۔ عہ ۱۲/
کارل مارکس ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴/	سوشلزم ۔۔۔۔۔۔۔ عہ ۱۲/

ماڈرن بک ڈپو

پبلشرز و بک سیلرز

سلطان بازار — حیدرآباد دکن

مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز
(مشیشہ حیدرآباد دکن)

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلی فون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۸ر

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

سب رس

جلد (۷) بابت ماہ اگست ۱۹۴۴ء شمارہ (۸)

فہرست مضامین

قرارداد تعزیت

"کل ہند اردو کانگرس کا یہ افتتاحی اجلاس نواب بہادر خاں مرحوم کی بے وقت وفات پر اظہار تعزیت کرتا ہے۔ اس موقع پر ان کی جواں مرگی سے نقصان عظیم پہنچا۔ ان کو اردو سے خاص دلچسپی تھی جس کا ثبوت یہ تھا کہ انھوں نے اس کانگرس کی سرپرستی بھی قبول فرمائی تھی۔"

۷۱۹۳۳

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

اداریہ

ادارۂ ادبیات اُردو نے ۲۱ تا ۲۳ جولائی مطابق ۱۵ تا ۱۷ ارشہریور جو کل ہند اُردو کانگریس حیدرآباد میں منعقد کی اس کے انتظامات اور مصروفیات کی وجہ سے ہم اس قابل نہ رہ سکے کہ سب رس کا ماہ اگسٹ کا شمارہ مرتب کرسکیں۔ ابھی کانگریس کے سلسلے کے کچھ کام باقی ہیں اس لئے مجلس ادارت نے طے کیا ہے کہ اگسٹ کا شمارہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے ملتوی نہ کیا جائے اس لئے کہ یہ سب رس کی روایات کے خلاف ہے۔

جو کچھ صفحات تیار ہو سکے وہی ناظرین سب رس کی خدمت میں روانہ کردئے جارہے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے محبوب رسالہ کا زیادہ دیر تک انتظار نہ کرتے رہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہم ستمبر کا رسالہ بہ پابندی وقت شائع کرسکیں گے۔

ادارہ

چند آنسو (خطیرۂ مشیر آباد کے صحن میں)

محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیرؔ نے قائد ملت نواب بہادر یار جنگؒ کی اچانک رحلت پر ایک نظم "جانبازِ ملت" میں اپنے دلی تاثرات قلمبند کرکے پوری قوم کی ترجمانی کردی ہے۔ ہم اس نظم کا آخری حصہ "چند آنسو" یہاں شائع کررہے ہیں

اے مشیر آباد! کتنا بڑھ گیا تیرا وقار
سو رہا ہے تیرے دامن میں دلوں کا تاجدار!

سرمہ سا ہر ذرہ تیری خاک کا مرغوب ہے
تیرے سینے میں مسلماں قوم کا محبوب ہے!

ایک جذبِ اندروں سے تونے پایا یہ مقام
ہے شکستِ آرزو پر نوحہ گر "دار السلام"

تیرے اس سنسان خطیرے میں جو محوِ خواب ہے
ملتِ مظلوم کا سرمایۂ نایاب ہے!

ہر زمانے میں یہ کہنا گردشِ افلاک سے
اک نیا خورشید ابھرا تھا دکن کی خاک سے

بشیر النساء بیگم بشیر

خطبۂ افتتاحیہ عالی جناب ہز اکسلنسی صدر اعظم بہادر دولت آصفیہ

(جو کل ہند اُردو کانگریس کے افتتاحی اجلاس منعقدہ ۲۱ر جولائی ۱۹۴۳ء کو ٹاؤن ہال باغ عامہ میں پڑھا گیا)

محترم خواتین اور حضرات!

سب سے پہلے میں اس پیام کو سنانے کی عزت حاصل کرتا ہوں جو اعلیٰ حضرت اقدس خسرو دکن و برار مدظلہم العالی نے ازراہِ عطوفت شاہانہ اُردو کانگریس کے افتتاح کے موقعہ پر ارسال فرمایا ہے۔

"میری قلمرو میں بھی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں جو مجھ کو اپنی رعایا کی طرح یکساں عزیز ہیں۔ اُردو بھی ان ہی ملکی زبانوں میں سے ہے۔ پہلے یہاں کے دفاتر کی زبان فارسی تھی لیکن نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا کہ اُردو نے اس کی جگہ لی اور اب وہ اس ریاست کی سرکاری زبان ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستان کے بعض صوبوں اور ریاستوں میں بولی اور اکثر دوسرے حصوں میں سمجھی جاتی ہے اس طرح اس کا شمار ملک کی ان زبانوں میں ہے جو کسی خاص فرقہ کی زبان نہیں۔ چنانچہ اس کی بنیاد ہندوستان کے دونوں بڑے فرقوں کے میل جول نے ڈالی ہے۔ ان ہی وجوہ کی بناء پر میں نے جامعۂ عثمانیہ کی بنیاد ڈالتے وقت انگریزی کے بجائے اُردو زبان کو اس کا ذریعہ تعلیم قرار دیا۔

مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ ایک کل ہند اُردو کانگریس قائم کی گئی ہے جس میں ہندو اور مسلمان اصحاب دونوں شریک ہیں اور جس کے آئندہ اجلاسوں کی تنظیم میں نہ صرف حیدرآباد بلکہ سارے ہندوستان کے وہ ادارے جو اردو یا ہندوستانی سے دلچسپی رکھتے ہیں یا اس کی خدمت کر رہے ہیں ہاتھ بٹانے کے لئے تیار ہیں۔ میں توقع کرتا ہوں بلکہ مجھے یقین ہے کہ ارباب کانگریس اس اجلاس اور اس کے آئندہ اجلاسوں کو فرقہ واریت سے ہر طرح دور رکھیں گے۔ چنانچہ میری ملکی روایات بھی یہی ہیں اور میرا اور میری حکومت کا یہ شعار رہا ہے کہ مختلف اقوام و مذاہب کے ساتھ ہمیشہ رواداری کا برتاؤ کیا جائے۔

مجھے امید ہے کہ کل ہند اُردو کانگریس ہندوستان کی دونوں بڑی قوموں کی اس مشترکہ زبان کی آئندہ ترقی اور توسیع کا اس طرح ذریعہ بنے گی کہ ان کو ایک دوسرے سے قریب تر اور صحیح معنوں میں ایک دل و یک زبان بنا دے۔

خدا آپ کی ان ساری کوششوں کو بارآور کرے۔"

خواتین وحضرات! ہندوستان کے وسیع رقبے اور کثیر آبادی کی علمی، اخلاقی اور اقتصادی ترقی کے لئے کسی ایسی زبان کی ضرورت ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک ہو اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ زبان اردو کی سب سے بڑی اہمیت یہی ہے بلکہ جیسا کہ حضرت اقدس نے اپنے پیام شاہانہ میں ارشاد فرمایا ہے اس کی بنیاد تو دونوں فرقوں کے میل جول نے ڈالی ہے۔ اب آپ خواہ اسے اُردو کا نام دیں یا ہندوستانی کا۔ میں اسے ملک کی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ عام فرقہ واری فضا نے ہمارے اس

مشترک سرمایہ کو بھی بعض حلقوں میں بحث اور اختلاف کا موضوع بنا دیا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ سیاسی فضا کے صاف ہوتے ہی یہ اختلافات مٹ جائیں گے۔ رہا رسم الخط کا مسئلہ تو میرے نزدیک وہ ایسا نہیں ہے کہ اس کا کوئی حل ہی نہ ہو۔ زبان اُردو کے اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک مشترک سرمایہ ہونے ہی کی بناء پر (جس کے علاوہ وہ دیگر اقطاع ہند میں بھی بولی یا سمجھی جاتی ہے) اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی ژرف نگاہی اور حکیمانہ تدبر نے جامعہ عثمانیہ میں اسے بجائے انگریزی کے ذریعہ تعلیم قرار دیا اور اسے ایک علمی حیثیت بخشی۔ بندگان عالی کی اس علم نوازی پر ہندوستان کے علم دوست اور اصول تعلیم میں اصلاح کے دل دادہ طبقے جس قدر شکر بجا لائیں بے جا نہیں۔

مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ اُردو نے پچھلی ربع صدی میں ملک میں اپنے لئے جو مقام پیدا کرلیا ہے وہ ہم میں کلچرل نقطۂ نگاہ سے یگانگت اور سوشل اعتبار سے یک رنگی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ اس اعتبار سے اُردو کے بہی خواہوں کی جدوجہد اور مساعی کو ملک کے لئے بجا طور پر فال نیک سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اُردو یا ہندوستانی زبان کو ملک میں جو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اور لسانی اعتبار سے اس کی صحیح حیثیت اور سماجی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت کو تسلیم کرکے ملک کے وطن دوست طبقے بلا امتیاز مسلک و عقائد جس طرح اس کی ترقی کی جانب مائل ہیں اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ردو اخبارات اور رسائل کی ہندوستان کے ہر گوشے میں مقبولیت اس زبان کی بڑھتی ہوئی قوت کا بین ثبوت ہے۔ اور جہاں یہ اخبارات و رسائل زیادہ تر انفرادی کوششوں کے نتیجے ہیں۔ وہاں ان کی ماسوا اجتماعی طور پر بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس مشترکہ زبان کو ترقی دینے کی ضرورت کو محسوس کرنے والے حضرات بھی اپنے اپنے اداروں کے ذریعہ سے زبان کی اصلاح۔ ترویج اور خدمت میں مصروف ہیں۔

ان انجمنوں میں ادارۂ ادبیات اُردو کا بھی شمار ہے جو چند سال ہوئے حیدرآباد میں قائم ہوئی اور جس نے ممالک محروسہ میں تصنیف و تالیف کا خاص شوق پیدا کر دیا اور بالخصوص نوجوان طبقے میں ادبی ذوق کے علاوہ ملک کے اس مشترک سرمایہ کو پھیلانے اور اس کی نسبت غلط فہمیوں کو مٹانے کا جوش پیدا کر دیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ کے چند دوسرے اصحاب فکر کے اس خیال کو کہ زبان اردو کی ایک کانگریس قائم ہونی چاہئے اس ادارہ نے عملی جامہ پہنایا۔ اس لئے منتظمین و اراکین ادارۂ ادبیات اُردو قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اعلیٰ پیمانے پر اس مشکل کام کو شروع کیا۔ اردو کانگریس کی بنا ڈالی اور اسے کل ہندی بنیادوں پر قائم کیا۔ چنانچہ ادارہ نے جن خادمانِ اُردو کو دعوت شرکت دی اور جو آج اس کے اجلاس میں شریک ہیں وہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور ریاستوں سے تشریف لائے ہیں اور ان میں خوش قسمتی سے ایسے ارباب فکر بھی موجود ہیں جیسے رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو اور مولوی عبدالحق جن کے خدمات زبان اردو کبھی بھول نہیں سکتی۔ اور جو ایسے مستند اور ممتاز اداروں کے روح رواں ہیں جیسے انجمن ترقی اردو اور ہندوستانی اکیڈمی، انجمن ترقی اردو جو ایک کل ہند ادارہ ہے اور جسے اعلیٰ حضرت بندگان عالی کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے تقریباً نصف صدی سے اردو زبان کی خدمت کر رہی ہے اور اس وقت ہندوستان کے ہر صوبہ اور حیدرآباد میں بھی اس کی

شناخیں موجود ہیں۔ انجمن کے زیر اہتمام وقتاً فوقتاً کانفرنسیں بھی منعقد ہوتی ہیں اور ادبی اور علمی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ علاوہ ہے۔ انجمن کے تین مختلف رسالے ہیں جن میں ایک سائنس کے لئے مخصوص ہے۔ زبان اردو کی اصلاح۔ ترقی اور ترویج کے سلسلے میں اس انجمن نے جیسے سابق میں علامہ شبلی مرحوم اور نواب عماد الملک مرحوم جیسی جامع شخصیتوں کی خدمات اور دلچسپیاں حاصل رہی ہیں اور جس کے مولوی عبدالحق صاحب اس وقت روح رواں ہیں۔ جو نمایاں کام کیا ہے اس کا ہر اردو داں کو علم و اعتراف ہے۔ چنانچہ صرف تصنیف و تالیف کے میدان میں نہیں بلکہ تراجم کے ذریعہ سے بھی اس انجمن نے علوم مشرق و مغرب کو اردو کا لباس پہنایا اور انگریزی کی ایک جامع لغت مرتب کی جس کے علاوہ فنی اصطلاحات کی ایک لغت بھی زیر ترتیب ہے جو امید ہے کہ بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہنچے گی۔ اس کام میں بھی حکومت سرکار عالی نے انجمن کی امداد اور سرپرستی کی ہے۔ اسی طرح ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد کے کارنامے بھی اس کے محترم مربی اور سرپرست کی بلند پایہ شخصیت کے باعث آج محتاج تعارف نہیں۔

سرتیج کا اس ادارہ سے گہرا اور عملی تعلق اس کے نیک مقاصد اور مفید کاموں پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ جو ڈاکٹر تاراچند کی زیر سرکردگی شمالی ہند میں ہندوستانی کی قابل قدر خدمت انجام دے رہا ہے۔

ہمارے ملک کی ترقی کے لئے ہر میدان عمل میں اشتراک کی بے حد ضرورت ہے۔ مجوزہ اردو کانگریس کے قیام سے اردو زبان کے اساتذہ ۔ ماہرین اور خدام کو باہمی روابط پیدا کرنے کے علاوہ اس زبان کی ترقی کے مختلف مسائل پر بحث اور غور کرنے کے لئے بھی موقعے ملیں گے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس قسم کے اشتراک اور تبادلۂ خیال سے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔

علمی اور فنی اصطلاحات کے وضع کرنے کا مسئلہ بھی ایسا ہے جو کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ علم و فن کی ترقی اور تحقیق میں ہمارا نقطۂ نظر بین الاقوامی ہی ہو سکتا ہے چنانچہ علوم و فنون کے احیاء اور ترقی میں یورپ کی زبانوں میں بھی یہی نقطۂ نظر ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس بارہ میں جو سابقہ مباحث اور تصفیے ہوئے ہیں ان پر اقدام نہ صرف زبان کو وسعت دینے بلکہ علوم و فنون کو ملک میں رائج کرنے کے لئے ضروری ہو گیا ہے۔ دوسرا مسئلہ جو اس قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ زبان کی سادگی کا مسئلہ ہے۔ یوں تو طرز تحریر یا تقریر ہر لکھنے یا بولنے والے کے مذاق اور میلان طبع پر منحصر ہے۔ اور زبان انگریزی میں بھی بہت سے ایسے مصنف ہیں جو نامانوس اور موٹے الفاظ کے ذریعہ سے معنی کو ادا کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں اس مسئلہ کی اہمیت صرف انفرادی نہیں ہے کیونکہ علاوہ ان اشخاص کے جن کی تعلیم عربی و فارسی میں یا ان اصحاب کے جن کی تعلیم سنسکرت کے پس منظر میں ہوئی ہے اور جو اس لئے فطرتاً اپنی اردو زبان میں عربی اور فارسی یا سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں فرقہ واریت کی عام فضا نے بھی بعض طبقوں میں ایک ضد سی پیدا کر دی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو یا تو آدھی فارسی اور عربی ہو گئی یا آدھی سنسکرت بن کر رہ گئی اور ظاہر ہے کہ ایسی لکھی یا بولی ہوئی اردو یا ہندوستانی عام فہم نہیں ہو سکتی یہی رجحانات اصطلاحات کے گھڑنے میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں' اور زبان کی ترقی میں سد راہ ہو رہے ہیں۔ میری رائے میں زبان کی سادگی نہ صرف اردو کو مقبول زبان بنادے گی بلکہ اس خلیج کو بھی رفتہ رفتہ

مشاہدے کی جو ہندی اُردو کے اختلافات کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پیدا ہو رہی ہے۔ درانحالیکہ اردو یا ہندوستانی دونوں قوموں کی مشترک میراث ہے اور اس کے روایات بھی اس تاریخی واقعہ پر مبنی ہیں کہ اسی زبان کے ذریعہ سے دونوں قوموں نے ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے سے روابط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو اس زبان کا ماخذ عربی وفارسی ہے اور دوسری طرف سنسکرت اور بھاشا۔ اگر یہ کانگرس اپنی جدوجہد اور اپنے فکر وعمل سے اس رجحان کو پھیلائے اور اس کی ترویج میں حصہ لے تو مجھے یقین ہے کہ وہ صحیح معنوں میں کل ہند کی خدمت کرے گی اور اگر اس سے ایسی خدمت کامیابی کے ساتھ ہو سکے تو حیدرآباد کو ہمیشہ فخر رہے گا کہ اردو کانگرس کی بنیاد یہاں پڑی اور اس کا سب سے پہلا اجلاس یہاں منعقد ہوا۔ کسی ایسے مقصد کے ساتھ ملک کی دوسری زبانوں کا جن کے یکساں عزیز ہونے کی طرف حضرت بندگان عالی نے اشارہ فرمایا ہے تصادم کا اندیشہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو اپنے اپنے روایات اور اہمیت کے ساتھ اپنی جگہ لازماً قائم رہیں گی۔ اور حیدرآباد کی حد تک ان کی یکساں ترقی اور ادبی اور تعلیمی حیثیت کو برقرار رکھنا تو ان فرائض میں داخل ہے جن سے حکومت سرکار عالی کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتی۔

گو اس کانگرس کی تحریک ادارۂ ادبیات اُردو کے پُرجوش کارکنوں کی سعی اور کوشش کا نتیجہ ہے اور میں اس سلسلہ میں خاص طور سے نواب زین یار جنگ بہادر اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کو مبارکباد دئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن مجھے یہ سن کر اور بھی مسرت ہوئی کہ ادارہ نے اس کانگرس کا جو دستور مرتب کیا ہے اس میں اس کی کل ہندی بنیادوں کو ملحوظ رکھ کر ہندوستان کے دوسرے ممتاز اور مستند اداروں کو بھی جگہ دی ہے جس کی ضرورت تھی۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ دنیائے اردو میں انجمن ترقی اردو، ہندوستانی اکیڈیمی اور دار المصنفین اعظم گڑھ جیسے اداروں کو کسی ایسی تنظیم کے لئے جو کل ہندی بنیادوں پر قائم کی جائے علحدہ نہیں رکھا جا سکتا۔

اور مجھے مسرت ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو کی بھی یہ کوشش رہی ہے کہ ان دونوں انجمنوں کے ساتھ مل کر اردو کی خدمت انجام دے اور آئندہ کام کی شاہراہیں معین کرے۔ یہ اسی ارادہ کا مبارک نتیجہ ہے کہ آج کے اجتماع میں ایسے اصحاب کو دیکھ رہا ہوں جو صرف ممالک محروسہ سے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے خواہ وہ کتنے ہی دور دراز کیوں نہ ہوں شرکت کی غرض سے یہاں تشریف لائے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی مسرت ہو رہی ہے کہ یہ اجتماع اسی طرح مشترک ہے جس طرح خود زبان اُردو یعنی اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہیں جو اس امر کی دلیل ہے کہ زبان اردو حقیقی معنوں میں ہماری ہے اور صرف میری یا تمہاری نہیں۔ میں اس وسیع تر تعاون اور اس کے ارادہ اور تصور کو ہماری مشترک زبان کے مستقبل کے لئے ایک فال نیک سمجھتا ہوں اور اعلیٰحضرت حضور پُرنور کی اس دعا کو دہراتے ہوئے کہ یہ مشترکہ زبان دونوں قوموں کو قریب تر اور ان کو یک دل اور یک زبان بنادے دست بدعا ہوں کہ خداوند تعالیٰ ان کوششوں کی سرپرستی کے لئے حضرت اقدس کی ذات شاہانہ کو تا دیر قائم ودائم رکھے۔

جگر پارے

کیا کشش حسنِ بے پناہ میں ہے
جو قدم ہے اسی کی راہ میں ہے

میکدے میں نہ خانقاہ میں ہے
جو تجلی دلِ تباہ میں ہے

ہائے وہ رازِ غم کہ جو اب تک
میرے دل میں تری نگاہ میں ہے

میں جہاں ہوں ترے خیال میں ہوں
تو جہاں ہے مری نگاہ میں ہے

میرے پندارِ عشق پر مت جا
یہ ادا نازِ گاہ گاہ میں ہے

مستئ چشمِ یار کیا کہئے!
مے تو کیا میکدہ نگاہ میں ہے

اللہ اللہ یہ اتحادِ مذاق
عالمِ دل بھی اب نگاہ میں ہے

حسن کو بھی کہاں نصیب جگر
وہ جو اک شے مری نگاہ میں ہے

جگر مرادآبادی

چلا گیا!

کل صبح حسنِ بزمِ شبانہ چلا گیا
معصوم عاشقی کا بہانہ چلا گیا

باقی نہیں سکونِ دل و مرکزِ خیال
بہکی ہوئی نظر کا نشانہ چلا گیا

اب کھل گئے ہیں گنجِ الم ہائے روزگار
ساری مسرتوں کا خزانہ چلا گیا

ملتے نہیں جنوں کو بیاباں نئے نئے
سامانِ انقلابِ زمانہ چلا گیا

کیا تلخ و دلگداز حقیقت ہے زندگی
دلچسپ و دلنواز فسانہ چلا گیا

سکندر علی وجد

محسوساتِ ماہر

خوشی کہاں کی نہ دل ہی کو جب قرار آیا
شبِ الم جو گئی روزِ انتظار آیا

نہ جانے کون گلستاں میں یہ پکار آیا
خزاں کو ساتھ لئے موسمِ بہار آیا

تمہاری بزم میں تسکینِ آرزو نہ ہوئی
امیدوار گیا تھا امیدوار آیا

چمن سے کوئی غرض تھی نہ آشیاں کا خیال
قفس میں قید کے دن اس طرح گزار آیا

خدا کا شکر کر اے دل وہ آگئے دمِ نزع
کہ زندگی میں یہی وقت سازگار آیا

تو میرے نالۂ فرقت کو رائگاں نہ سمجھ
جہاں جہاں بھی ترے نقش تھے ابھار آیا

جنابِ شادؔ ؎ سے تھی رونقِ چمن ماہرؔ
دکن میں پھر نہ کوئی موسمِ بہار آیا

ماہر القادری

؎ سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ (آنجہانی)

زندگانی

ہنستے گاتے نہ سہی، روتے رلاتے ہی سہی
غم اٹھاتے ہی سہی، غم سے نبھاتے ہی سہی
دل کے ہر زخم کو ناسور بناتے ہی سہی
رات جائے گی تو کیا صبح نہیں آئے گی؟
زندگانی تو بہر حال گزر جائے گی

اب کسی سے جو مری بات نہیں ہے تو نہ ہو
مئے سے دعوئی وہ ملاقات نہیں ہے تو نہ ہو
حسن اور حسن مدارات نہیں ہے تو نہ ہو
رات جائے گی تو کیا صبح نہیں آئے گی؟
زندگانی تو بہر حال گزر جائے گی

کون ہے جو نہیں افلاسِ تخیل میں شریک
قیس و فرہاد فرومایہ ہیں میرے نزدیک
عشقِ خوددار بھلا حسن سے کیوں مانگے بھیک
رات جائے گی تو کیا صبح نہیں آئے گی؟
زندگانی تو بہر حال گزر جائے گی

کوئی زردار سہی، یہ بھی بجا میں ہوں غریب
مجھ سے ناراض اگر ہیں تو رہیں میرے نصیب
خوار و مجبور سہی پھر بھی ہوں خوددار اریبؔ
رات جائے گی تو کیا صبح نہیں آئے گی؟
زندگانی تو بہر حال گزر جائے گی

سلیمان اریب

کل ہند اردو کانگریس کا خیر مقدم

رسالہ معارف اعظم گڈہ بابت جون ۱۹۴۳ء

ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن نے اپنی چھوٹی عمر میں اردو زبان کی جو گوناگوں اور متنوع خدمات انجام دی ہیں اس کی مثال دوسرے اداروں میں مشکل سے ملے گی۔ اب اس کے نوجوان اور بلند ہمت کارکنوں نے سارے ہندوستان میں اُردو کی خدمت کے لئے ایک وسیع نظام کی ترتیب و قیام کی جانب قدم بڑھایا ہے۔ اور اس سلسلہ میں ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳ جولائی ۱۹۴۳ء کو حیدر آباد میں ایک آل انڈیا اردو کانگریس منعقد کی ہے۔ اور اردو کے تمام بہی خواہوں، خدمت گذاروں اور ہندوستان کے ممتاز اہل علم اور اصحاب قلم کو اس میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ ادارۂ ادبیات اُردو ایک علمی اور کارکن ادارہ ہے اس لئے یقین ہے کہ یہ کانگریس عملی نتائج کے اعتبار سے بھی نتیجہ خیز ہوگی۔ اُردو کے بہی خواہوں کو اپنی شرکت اور مفید مشوروں سے اس کو کامیاب بنانا چاہیے۔

رسالہ ہمایون لاہور بابت جون ۱۹۴۳ء

اردو ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں جہاں پنجاب میں خالص ادبی تجربے کئے جا رہے ہیں وہاں حیدر آباد میں ٹھوس علمی اور فنی پہلوؤں پر زور دیا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں ہمیں نواب زین یار جنگ بہادر صدر مجلس منتظمہ آل انڈیا اُردو کانگریس حیدر آباد کا ایک مکتوب موصول ہوا.... ہم سمجھتے ہیں کہ اب وقت آپہنچا ہے جب اُردو کے ان مسائل پر پورے غور و خوض سے کام لیا جائے۔ ہم اس کانفرنس کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہیں۔

اخبار پیام حیدر آباد دکن، ۱ مئی ۱۹۴۳ء

دکن میں اُردو زبان کی جدوجہد کا مرکزی ادارہ یعنی ادارۂ ادبیات اُردو ـــ مبارکباد کا مستحق ہے

کہ اس نے اپنی جدوجہد کے دائرہ کو وسیع کرنے
کا فیصلہ کیا ہے اور ایک آل انڈیا کانگریس کا
سنگ بنیاد نصب کرکے وہ اردو کے اساتذہ اور
ارباب علم وفن اور قومی زبان کے ہندو اور
مسلمان حامیوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی
کوشش کر رہا ہے۔ آل انڈیا ہسٹری کانگریس
اور سائنس کانگریس کی طرح ملک میں چند ہی
ادارے ایسے ہیں جو ایک کل ہند تنظیم کے
تحت کام کر رہے ہیں اور جو کوئی بڑی مرکزی
حیثیت رکھتے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو کے
منصوبات میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت
کے لئے اسی قسم کی ایک کانگریس کا خاکہ تیار
ہے اور ہمیں یقین ہے کہ تمام ہندوستان
میں اس تحریک کا خیر مقدم کیا جائے گا.....
جو بنیادی مسائل اس اجتماع کے سامنے
پیش ہوں گے۔ ان کا تعلق ہندوستان کی
قومی زبان کی ترقی و اشاعت سے ہوگا اور
اصحاب علم وفن کے مشورہ سے ایک ایسا آل انڈیا
پروگرام مرتب کیا جائیگا جو اس کام کے تمام
شعبوں پر حاوی ہو۔ نہ صرف حیدرآباد میں
بلکہ غالباً تمام ہندوستان میں اپنی نوعیت
کا یہ پہلا علمی اجتماع ہوگا اور ہم امید
کرتے ہیں کہ جو مقصد پیش نظر ہے
اس کے لحاظ سے کانگریس کے اجلاسوں کا زیادہ
وقت محض قراردادوں کے پاس کرنے یا طویل
مقالات اور تقریروں کے سننے اور سنانے میں
ضائع نہ کیا جائیگا۔ یہ کام تو ہندوستان کی
اور بھی انجمنیں کر رہی ہیں کانگریس کا اصل کام
یہ ہونا چاہئے کہ وہ ماہرین سے مشورہ کرکے اردو
زبان کی ترقی کا ایک "آل انڈیا" اور ہمہ گیر
پروگرام مرتب کرے۔ اگر اس کام کی بنیاد مجوزہ
کانگریس میں قائم کیجا سکے تو یہ سب سے بڑی
خدمت ہوگی جو ادارۂ ادبیات اردو نہ صرف
دکن کی بلکہ تمام ہندوستان کی انجام دے سکے گا
.... قومی زبان کی ترقی کا مسئلہ محض پروپگنڈا
کے بل پر کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا جبتک کہ
اسکی ترقی کے سائنٹفک مسائل کو بھی ماہرین کے
نقطۂ نظر سے نہ دیکھا جائے۔ ابتک مسئلہ کا یہ
پہلو کچھ زیادہ توجہ حاصل نہ کرسکا اور اس کے
اکثر عملی پہلو توجہ سے محروم رہے ہیں......

ادارۂ ادبیات اردو کا یہ نہایت اہم اقدام
ایسا ضروری اقدام ہے کہ تمام ہندوستان میں
اس کا خیر مقدم ہونا چاہئے۔ ادارہ کے اراکین
جس سرگرمی کے ساتھ اس تجویز کا کامیاب بنانے
میں مصروف ہیں وہ بہت امید افزا ہے۔ علاوہ
بریں نواب سر مہدی یار جنگ بہادر صدر مجلس
استقبالیہ اور نواب زین یار جنگ بہادر صدر
مجلس منتظمہ کی سرپرستی اور رہنمائی اس تحریک کی
کامیابی کی ایک بہت بڑی ضمانت ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کی صحافت بھی

اس تحریک کو کامیاب بنانے میں ادارۂ ادبیات اردو
کے ساتھ یہ سمجھ کر پورا تعاون کرے گی کہ مجوزہ
کانگریس کوئی ایسا تماشا نہیں ہے جیسے کہ اکثر اسٹیج
کئے جاتے ہیں بلکہ ایک ٹھوس اور نتیجہ خیز کام ہے۔

روزنامہ مسلمان دہلی بابت ۲۴ مئی ۱۹۴۴ء

حیدرآباد کے خادمان اُردو خاص طور پر ہمارے
شکریہ کے مستحق ہیں جو برابر اُردو کی توسیع و ترقی
میں کوشاں رہے ہیں۔ اور اُردو کی بہتری کیلئے
مصروف کار رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اہل حیدرآباد
کا تازہ ترین اقدام انتہائی شاندار اور قابل تقلید
ہے......ظاہر ہے کہ اس اسکیم کی کوئی بھی
سنجیدہ اور ذہین آدمی مخالفت نہیں کرسکتا۔
بلکہ حق یہ ہے کہ اُردو کے تمام خدام اسکا پرجوش
خیر مقدم کریں گے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اُردو نواز
حلقے اس اسکیم کو کامیاب بنانے کیلئے تمام ضروری
اقدامات عمل میں لائیں گے اور اس تجویز کے پیش
کرنے والوں کی زبردست ہمت افزائی کرینگے۔

ہماری زبان - دہلی یکم جون ۱۹۴۴ء

اس کانگریس کے متعلق جو گشتی اعلان حیدرآباد
سے جاری ہوا ہے وہ اس اشاعت میں ملاحظہ
ہو........ یہ مقصد مستحسن ہے اور اُردو کے
حامیوں کا مطمح نظر رہا ہے........ہمیں اُمید
ہے کہ جس سازوسامان سے یہ تحریک شروع
ہوئی ہے اسی مقدار سے اسے کامیابی حاصل ہوگی

اخبار الاماں دہلی - ۹ جون ۱۹۴۴ء

حیدرآباد دکن میں کل ہند اُردو کانگریس کا جلسہ
منعقد کیا جارہا ہے اور اسی ضمن میں ہندستانی
زبانوں کے اخبارات وجرائد کے عمال اور دیگر
اہل قلم حضرات کی بھی ایک کانفرنس منعقد کیجارہی
ہے تاکہ اخبار نویس طبقہ اور جرائد ہند کی تنظیم
کی طرف قدم اٹھایا جائے۔

ہمیں سب سے بڑی مسرت یہ ہے کہ ہندستانی
اخبارات کی تنظیم اور اُن میں کام کرنے والے
اخبار نویسوں کے اتحاد اور ان کے حقوق اور
مفاد کے تحفظ کے لئے جو آواز...... بلند کی
تھی وہ بے اثر اور صدا بصحرا نہ ثابت ہوئی۔
اور یو۔ پی۔ اور حیدرآباد جیسے مرکزی علاقوں
سے اس کے اور مقصد کی تکمیل کے سلسلہ
میں حساس وفرض شناس اکابر ملک نے اولین
فرصت میں لبیک کہا۔

رہبر دکن حیدرآباد - ۱۰ جون ۱۹۴۴ء

ہمارے ادارۂ ادبیات اُردو کے کارکن زبان اُردو
کی خدمت میں رات دن جس طرح سرگرم ہیں اس کا
حال اب نہ کسی ملک کے باشندے سے پوشیدہ
ہے اور نہ باہر والے سے ان کے ٹھوس اور
قابل قدر کاموں نے ان کو ہر طرف مشہور

حریت - دہلی - ۱۱ جون ۱۹۴۴ء

جولائی ۱۹۴۴ء کے وسط میں حیدرآباد دکن
میں آل انڈیا اُردو کانگریس نواب زین یار جنگ بہادر
کی سعی سے ہو رہی ہے جو قابل صد تبریک
تہنیت ہے ۔

حیدرآباد نے اُردو کی جو خدمت گذشتہ
دس سال میں کی ہے وہ نہایت شاندار ہے ۔
ہندوستان کا کوئی حصہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
تاجدار دکن نے اُردو کی سرپرستی فرما کر
اُردو کو جس طرح آج عروج پر پہنچایا ہے اسکی
نظیر اندلس اور بغداد کے علاوہ کہیں نہیں ملتی
...... میری دلی دعا ہے کہ حیدرآباد کی
اُردو کانگریس اپنے مقاصد کے پیش نظر کامیاب ہو۔

صبح دکن - حیدرآباد - ۱۴ جون ۱۹۴۴ء

حیدرآباد میں یہ علمی اور ادبی اجتماع اپنی نوعیت
کا پہلا اجتماع ہوگا .... اس قسم کے
کل ہند اجتماع کے لئے ہر حیثیت سے سرزمین
حیدرآباد ہی موزوں ہوسکتی تھی۔ ادارۂ ادبیات
اُردو زبان اور ادب کی خدمت کا جو بھی کام
انجام دے چکا ہے، اور اب دے رہا ہے وہ بیرون
حیدرآباد کیلئے قابل رشک ہے ۔ پروفیسر
ڈاکٹر زور صاحب کے ادارہ کی جانب سے
اس قسم کی کل ہند اُردو کانگریس کا قیام اُردو کے
کر دیا ہے اور اب ان کے اس جذبۂ خدمت
اُردو نے انھیں کل ہند اُردو کانگریس کی بنا
ڈالنے پر آمادہ کر دیا ہے ....
یہ ایک مبارک خیال ہے اُردو کے خلاف
ہندستان میں اور یہاں بھی ایک کل ہند
اساس پر بڑی منظم کوشش شروع ہو گئی ہے
اور ہندستان کی لنگوا فرینکا اُردو کو اگر بچایا
جاسکتا ہے تو ایک ایسی ہی سعی کے ذریعہ جو
کل ہند اساس پر کی جائے .... اور ادارۂ
مذکور کے ارباب قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے
دیر سے ہی سہی مدافعت کا ایک موثر طریقہ آخر
کل ہند اُردو کانگریس کی صورت میں اختیار
کر ہی لیا۔ اگر اتفاقاً یہ مدافعتی ضرورت
اس وقت درپیش نہ ہوتی تب بھی ہندستان
کی ایک عام ترقی پذیر زبان کی ترقی کے لئے
اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک کل ہند سعی
کی جاتی اور ان تمام کمزور کوششوں کو جو منفرداً
ہندستان کے اکثر شہروں اور جامعات
میں جاری ہیں ایک مرکز سے مربوط کر کے
طاقتور بنایا جاتا .... یہ کام بہت
اہم ہے اور اگر یہ اجتماع کامیاب ثابت
ہوا اور اس کانگریس کی داغ بیل یہاں مخلصانہ
کوششوں سے پڑ گئی تو حیدرآباد کی شہرت
اُردو کے ایک سچے خدمت گذار کی حیثیت
سے یقیناً بہت بڑھ جائیگی ۔

استحکام اور ترویج کے لئے مفید ثابت ہوگا۔
اس قسم کا کوئی اجتماع ہندوستان میں کبھی
نہیں ہوا۔ اور نہ ہی ایسی کوئی تجویز کسی ادارہ
کے پیش نظر تھی۔ سیاسی جماعتوں کی طرح
اس کانگریس کے انعقاد کا منشا محض دکھاوٴ
اور نمائش نہیں ہے .... یہ خبر بھی بڑی
مسرت سے سنی گئی کہ ان اجلاسوں میں مختلف
مکاتیب خیال کے حضرات کو مقالے پڑھنے اور
اپنے مسائل کو پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔
اس علمی اجتماع میں ادیبوں۔ مدیروں۔ شاعروں
نقادوں۔ اور مصنفوں کو اپنی اپنی مشکلات
بھی حل کرنے کے مواقع حاصل ہونگے........
ہندوستان میں دوسری انجمنیں بھی اُردو
کی اشاعت و ترویج کے لئے اپنے اپنے طور پر
کام انجام دے رہی ہیں۔ لیکن جیسا کہ اس
کانگریس کے انعقاد کا اصل منشا ہے ان سبھوں
کو ایک مرکز پر لایا جائے تو اُردو کا موثر اور وسیع
طور پر پروپگنڈا کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب میں
بعض انجمنیں محض صوبہ ہی کی حد تک اُردو کی
اشاعت و ترویج کے سلسلہ میں خدمات
انجام دے رہی ہیں لیکن چونکہ انکا دائرۂ عمل
محدود ہے اس لئے وہ دوسروں کے لئے
سودمند نہیں ہوسکتیں۔ اردو کانگریس کے
سلسلہ میں ایک خبر یہ بھی ملی ہے کہ ترقی پسند
ادیبوں کو بھی اس موقع پر مدعو کیا گیا ہے۔
ہمارے خیال میں اس سے اس موقع پر کسی کو
برا بھلا کہنا بالکل عبث ہوگا۔ کل ہند مسلک کے
تحت ایک صحت بخش تصفیہ ہی ہماری ترقی کا
ضامن ہوسکے گا۔ پرانے ادیبوں کے دوش
بدوش نئے لکھنے والوں کا اجتماع ترقی اُردو
کے لئے یقیناً فال نیک ثابت ہوگا۔

اخبار وحدت۔ دہلی ۱۶ جون ۱۹۴۴ء

معلوم ہوا ہے کہ حیدرآباد میں کل ہند اُردو
کانگریس اور اس سلسلہ میں کل ہند اخبار نویس
کانفرنس بھی جولائی کے چوتھے ہفتہ میں منعقد
کیجا رہی ہے۔ ہم اس اجتماع کی کامیابی کے
دل سے خواہاں ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں
دہلی کی مرکزی جماعت کے تعاون اور دوسرے
صوبوں کی انجمنوں کے اشتراک عمل سے اسے
صحیح معنوں میں کامیاب بنایا جائیگا۔

روزنامۂ انصاری۔ دہلی ۱۷ جون ۱۹۴۴ء

اُردو زبان کی ترقی اور اشاعت کے مسائل پر
غور کرنے کے لئے حیدرآباد کے لوگ ایک کل ہند
اُردو کانگریس منعقد کر رہے ہیں حیدرآباد نے
اُردو کی بڑی خدمت کی ہے اور اسے حق پہنچتا
ہے کہ وہ ایسی کانفرنس منعقد کرے۔

اخبار مسلمان دہلی۔ ۱۷ جون ۱۹۴۴ء

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا نام

اُردو دنیا میں اب محتاج تعارف نہیں کیونکہ
اس خالص علمی و ادبی ادارے نے جناب
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی نگرانی
میں ادب اُردو کی وہ خدمت کی ہے کہ ادبیات
اُردو کی تاریخ میں اس ادارے کے کارہائے
نمایاں کا ذکر بہ حروف جلی کیا جائیگا۔ سچ تو
یہ ہے کہ مجنوں کو لیلیٰ سے اور فرہاد کو شیریں
سے اس قدر محبت نہ ہوگی جتنی جناب ڈاکٹر
سید محی الدین صاحب قادری زور اور آپکے
دست راست جناب خواجہ حمید الدین صاحب
کو اُردو سے ہے۔ ان دونوں حضرات کی
زندگیاں خدمت علم و ادب کیلئے وقف ہیں
دونوں حضرات ہر ممکن طریقہ سے اردو کی
نشر و اشاعت کا کام کرتے رہتے ہیں محض
خدمت اُردو کی غرض سے ایک علمی و ادبی
ماہ نامہ "سب رس" جاری رکھا ہے۔ چونکہ
اس ماہ نامہ کا علمی و ادبی معیار بہت بلند ہے
اس لئے اس کا حلقہ اشاعت بھی محدود ہے
اور ادارہ کو ہر ماہ اس ماہ نامہ کی وجہ سے
کافی مالی نقصان ہوتا ہے...... ادبیات
اُردو کے امتحانات کے ذریعہ اس ادارہ نے
دکن میں اُردو کو عوام کی زبان بنانے کیلئے قابل
قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور اب ڈاکٹر
سید محی الدین صاحب قادری زور کی کوششوں
سے آئندہ ماہ اُردو کانگریس منعقد ہونے والی ہے۔

جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور
اپنے ایک کرم نامہ میں تحریر فرماتے ہیں...
.... ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن
مستحق مبارکباد ہے کہ اس نے اجتماعی کوشش
کی ضرورت کو محسوس کر کے اسے جامہ عمل
پہنانے کا بھی فیصلہ کر لیا ہے۔

روزنامہ جنگ دہلی ۱۸ جون ۱۹۴۴ء

اردو کی بے چارگی کے موجودہ دور ہی میں
اُردو کے قدیم گہوارہ حیدرآباد دکن کے
ادارہ ادبیات اُردو نے یہ بیڑا اٹھایا ہے
کہ اُردو کی حفاظت اور اصلاح اور ترقی
کے لئے موثر اور نتیجہ خیز اقدامات عمل میں
لائے جائیں۔ اور ان نیک عزائم کو واقعی
عملی جامہ پہنانے کیلئے اُردو کے نثار، شاعر
اہل زبان اور اہل قلم ہر قسم کے ادب پرست و
علم نواز حضرات کو ایک کل ہند اردو کانگریس
کے اجتماع کے موقع پر حیدرآباد دکن میں
جمع کیا جائے اور ان کے غور و بحث اور
رد و قبول کے بعد اردو کی ترقی کے لئے
میدان تیار کیا جائے۔ ہم حیدرآباد کے
علم دوست حضرات خصوصاً ادارہ ادبیات
اُردو کے حساس و بیدار مغز کارکنان و اراکین
کو ان کے اس عزم پر مبارکباد دیتے ہیں
اور امید کرتے ہیں کہ ان کے اسی ارادہ کے

ساتھ ہی ان کے اقدام اور انکے اقدام کے
شاندار نتائج پر بھی ہمیں انھیں مبارک باد
دینے کی عزت حاصل ہوگی۔

یہ خیال اور بھی ہمت افزا ہے کہ اس
اجتماع میں ملک کے بلند پایہ ادیبوں اور
اہل قلم حضرات کو بھی شریک کیا جارہا ہے
اور ارباب صحافت کی کانفرنس بھی منعقد
کی جارہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ملک کے
ورکنگ جرنلسٹس اس سلسلہ میں ادارۂ ادبیات
اُردو کا کافی ہاتھ بٹائیں گے اور دہلی کی مرکزی
ورکنگ جرنلسٹس ایسوسی ایشن اس پاک
مقصد کے کامیاب بنانے میں اہل حیدرآباد
کے ساتھ اپنا پورا تعاون پیش کرے گی۔

اخبار وحدت دہلی ۔ ۱۰ جون ۱۹۴۳ء

ساورکر نے جو محاذ جنگ اور آل انڈیا مورچہ
قائم کیا ہے اس کا جواب کیا ہوگا۔ ایک اور
فقط ایک کہ حیدرآباد دکن میں منعقد ہونے
والی عظیم الشان اُردو کانفرنس جس سے
ملک کی اہم ترین توقعات وابستہ ہیں وہ خصوصیت
کے ساتھ ساورکر کے بیان کی روشنی میں اُردو
کی حفاظت کے مسئلہ کو اپنے اجلاس کا مقصد
اولین بنائے۔ اردو کانفرنس تحفظ اُردو
کے لئے ایک آل انڈیا مضبوط و مفید لائحہ عمل
مرتب کرے جس پر فی الفور عمل بھی شروع
کر دیا جائے۔ ساورکر کو جواب دینے کی اور
اردو کی حفاظت کی یہی ایک صورت ہے۔
حیدرآباد اردو کانفرنس جن قابل ترین اور
عملی اشخاص سرگرم کارکنون اور حفاظت اُردو
کا سچا جذبہ رکھنے والے افراد کے ہاتھوں
منعقد ہو رہی ہے اس کے پیش نظر ہم یہ توقع
کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ اُردو کے
اولین و قدیم گہوارہ دکن کو اس کی حفاظت
اور دشمنوں کے ناپاک حملوں سے صیانت کا
بھی شرف حاصل کرنا چاہئے۔ ہمیں امید ہے کہ
اردو کانفرنس ان توقعات کو پورا کرنے میں
کوئی کمی نہ کرے گی۔ انشاءاللہ۔

اخبار روزنامہ جنگ دہلی ۔ ۱۹ جون ۱۹۴۳ء

ہمیں اپنے اس احساس کے اظہار میں یا اسکے اخفا
میں ذرہ بھر پس و پیش نہیں ہے کہ ادارۂ ادبیات
اُردو کے رکن خصوصی ڈاکٹر سید محی الدین صاحب
قادری زور اور جناب نواب زین یار جنگ بہادر صاحب
صدر استقبالیہ وغیرہ نے جن عنوانات سے
اپنی مساعی کی بسم اللہ کی ہے وہ بہت کچھ
ہمت افزا۔ امید افزا۔ اور توقع بخش نظر
آتے ہیں۔ اب جب کہ ہم اپنے دوستوں
کی ان توقعات میں پوری طرح شریک ہیں
کہ حیدرآباد کے یہ ادبی۔ علمی اور مجلسی اجتماع
اپنے مقصد کے پیش نظر انشاءاللہ کامیاب

قرار پائیں گے تو ہم ان تجاویز اور مشوروں
کے پیش کرنے سے بھی گریز اور پہلوتہی
نہیں کرتے جو ہمارے خیال میں ان جلسوں
میں زیر غور لائے جانے ضروری ہیں....."

اخبار مملکت ہفتہ وار حیدرآباد دکن۔ یکم جولائی ۱۹۴۴ء

خوشی کی بات ہے کہ اُردو کی ترقی اور اشاعت
کے ذرائع پر غور کرنے کے لئے ادارۂ ادبیات
اُردو نے زیر سرپرستی نواب صدر اعظم بہادر
ایک کل ہند اُردو کانگریس حیدرآباد میں منعقد
کرنے کا فیصلہ کیا ہے ....
حیدرآباد کے خادمان اُردو مبارکباد کے مستحق ہیں
کہ انھوں نے اُردو کے جنم بھوم میں ایک کل ہند اُردو
کانگریس منعقد کرنیکا فیصلہ کیا ہے..... انجمن ترقی اُردو نے
زبان کی جو خدمت کی ہے اسکی قدر وقیمت کو متاثر کئے
بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک ایسی کل ہند اُردو کانگریس
کے انعقاد کی ضرورت تھی جو ان تمام عناصر کو ایک جا کرے
جو اس زبان کی ترقی اور توسیع کے دل سے خواہاں ہیں۔
ادارۂ ادبیات اردو نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا ہے یہ ایک بھاری ذمہ داری ہے...
مجوزہ اُردو کانگریس سے توقع ہے کہ حیدرآباد
کو بھی منظر عام پر آنے کا موقع ملے گا۔

اخبار مارننگ نیوز کلکتہ۔ ۱۹ر جون ۱۹۴۴ء

دعوت نامے کل ہند وسیع پیمانہ پر جاری
کئے گئے ہیں اور یقین ہے کہ یہ اجتماع
انتہائی کامیاب اور تمام ملک کا نمائندہ
ہوگا جتنا کہ بانیان کانگریس نے توقع کی
ہے۔ (ترجمہ)

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) شریک معتمد انجمن ترقی اردو (دہلی)

اُردو کے متعلق ایسی کانفرنس ضرور مفید
ہوگی۔ خدا آپ کے کام میں برکت دے۔

اویس احمد ادیب ایم اے۔ صدر شعبۂ اُردو مسلم کالج کانپور۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اس کوشش میں کامیاب کرے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین صدر اردو اکیڈیمی جامعہ ملیہ دہلی۔

خدا آپ کی سعی کو کامیاب کرے۔ اور اُردو
کانگریس ہم کو زبان کی خدمت کا صحیح راستہ دکھائے۔

منظر صدیقی مدیر "ایشیا" آگرہ

میری دلی آرزو ہے کہ یہ اجتماع زیادہ سے
زیادہ کامیاب ہو اور ہم باہمی مشورہ کے
بعد اُردو کی ترقی اور عملی جدوجہد کے لئے
کوئی نئی راہ پیدا کرسکیں۔

سید حسین امام مدیر ماہنامہ "ندیم" گیا

کانگریس مجوزہ کی کامیابی کا متمنی ہوں اور
آپ کی یاد فرمائی کا ممنت پذیر۔

ساغر نظامی مدیر ماہنامہ "ایشیا" بمبئی۔

میں اس نئے اقدام پر دلی مبارکباد پیش

کرتا ہوں .... خدا کی ذات اور آپ کے
خلوص سے امید ہے کہ اردو کے لئے کچھ نہ کچھ
ضرور ہوگا۔

صادق الخیری ایم۔ اے دہلی۔

بہت ہی اچھا اقدام ہے۔ خدا مبارک اور
کامیاب کرے۔ آپ کی ذات اور کوششوں
سے یہی امید ہے کہ اردو کے لئے زیادہ
سے زیادہ مفید کام کئے جائیں گے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین۔ شیخ الجامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مجھے یقین ہے کہ آپ کے زیر اہتمام یہ کانگریس
نہایت کامیاب ثابت ہوگی اور اس کے بہت
مفید نتائج مترتب ہوں گے۔

ڈاکٹر تاراچند نائب صدر ہندستانی اکیڈمی الہ آباد

آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اردو زبان اور ادب کے
ساتھ پوری دلچسپی ہے اور ایسی کانفرنس میں
جس کا مقصد اردو کی ترقی کے ذریعوں پر غور
کرنا ہو شریک ہونا ضروری سمجھتا ہوں......
میری دلی خواہش ہے کہ کانگریس کا اجلاس
ہر طرح پر کامیاب ہو۔

سجاد ظہیر معتمد کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین

جس زور و شور کے ساتھ آپ کانفرنس کر رہے ہیں

اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل اردو کی
سب سے بڑی کانفرنس ہوگی اور باقی سب
اس قسم کی کوششوں کو آپ بالکل مات
دیدیں گے۔ اللّٰہم زد فزد۔

فصیح الدین احمد ایم اے مدیر ماہنامہ "ادیب" دہلی

آپ کے مساعی زبان اردو کی خدمت کے
سلسلہ میں قابل مبارکباد ہیں اور مجھے
یقین ہے کہ آپ کی کانگریس تاریخ ادب اردو
میں آپ اپنی نظیر ہوگی۔

سید ابو سعید بزمی چیف ایڈیٹر اخبار "مدینہ" بجنور یوپی

حقیقت یہ ہے کہ اردو کانگریس کے نام سے
جس قسم کا شاندار کل ہند اجتماع آپ کرنا چاہتے
ہیں وہ نتائج کے لحاظ سے بے حد مفید ثابت
ہوگا۔ انشاءاللہ۔ خدا آپ کے ارادوں
میں برکت اور شرکاء میں خلوص نیت عطا فرمائے۔

قاضی عبدالودود بیرسٹر و معتمد انجمن ترقی اردو صوبہ بہار

اردو کانگریس کی اہمیت کا احساس، اس کے
مقاصد سے ہمدردی اور اسکی کامیابی کی آرزو ہے۔

اعجاز صدیقی۔ مدیر ماہنامہ "شاعر" آگرہ

میں اس عظیم اجتماع کی کامیابی کے لئے دست بدعا
ہوں اور ادارہ کی اجتماعی اور آپ کی انفرادی

کوششوں کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔

سید احتشام حسین ایم اے شعبۂ اردو جامعۂ لکھنؤ۔

بڑی مسرت ہوئی کہ آپ حضرات کی مساعی سے
یہ دن اُردو کو دیکھنا نصیب ہوا۔ حیدرآباد
سے اُردو زبان کی جو خدمت ہو رہی ہے اس کا
اعتراف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ زیادہ سے
زیادہ لوگ اس کانگریس میں شریک ہو کر
تبادلۂ خیال اور مفید تجاویز پر غور کرنے کے
مواقع نکالیں ...... یقین ہے کہ آپ
حضرات کا خلوص کوئی مفید نتیجہ پیدا کریگا۔

عبدالسمیع پال اثر صہبائی ایم اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ جموں (کشمیر)

میری دلی تمنا ہے کہ خدا آپ کو اس عظیم الشان
کام میں کامیابی عطا فرمائے ..... میری
دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی صدر شعبۂ اردو جامعہ لکھنؤ۔

مجھے امید ہے کہ یہ اجلاس نہایت شاندار
ہوگا اور اس سے مفید نتیجے برآمد ہوں گے۔

محمد یحییٰ تنہا۔ مصنف سیر المصنفین۔ میرٹھ

میں اس نئی تحریک سے بیحد خوش اور مطمئن ہوں۔

حمید اللہ خاں مدیر روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ

آپ نے آل انڈیا اُردو کانگریس کے انعقاد کا
مبارک اقدام اٹھایا ہے۔ اردو پر جو ہر چہار
طرف سے یورش ہو رہی ہے اسکے دیکھتے ہوئے
یہ قدم یقیناً نہایت مسعود ہے اور میری و
ہمدم کی کامل تائید آپ کے ساتھ ہے۔

محمد علی کمال مدیر روزنامہ "آزاد" بنگلور۔

بیحد مسرت ہوئی کہ حیدرآباد میں نہایت ہی
وسیع پیمانہ پر اُردو کانگریس کے اجلاس
منعقد کئے جا رہے ہیں۔ کسے انکار ہو سکتا
ہے کہ اُردو کی ترویج و اشاعت کیلئے اور
اسے صحیح معنوں میں ملک کی زبان بنانے
کے لئے ایک طاقتور نظام کی ضرورت ہے
.... ایسے اجتماعات کو غنیمت
سمجھنا اور ان سے پورا فائدہ اٹھانا ہر
حامی زبان کا فرض ہے۔

راجندر ناتھ شیدا۔ جائنٹ ایڈیٹر ماہنامہ "آجکل" دہلی

کانگریس کا انعقاد اردو کی ایک بڑی خدمت
ہوگی ہمیں اپنی قومی زبان کی حفاظت اور ترقی
کیلئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ مجھے اسکے
اعلیٰ مقاصد سے پورا اتفاق ہے۔

شفیق الرحمٰن قدوائی معتمد ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ دہلی

بڑی مبارک تجویز ہے اور اُمید ہے کہ حیدرآباد
کی قیادت اور سرپرستی میں یہ اجتماع زبان اردو کی

ترقی اور ترویج و اشاعت کیلئے بہر نوع
مفید ثابت ہوگا۔

معین الدین احمد ندوی دار المصنفین اعظم گڈھ

اس اہم کام کی توقع ادارۂ ادبیات ہی کے
بلند ہمت اور حوصلہ مند کارکنوں سے ہوسکتی
تھی۔ درحقیقت آپ کے ادارہ نے اس
چھوٹی سی عمر میں اُردو کی جیسی گراں قدر
خدمات انجام دی ہیں اس کی مثال پرانے
اداروں میں بھی نہیں مل سکتی ہے۔ اُردو
کانگریس کا اجتماع شرکت کے لائق ہوگا۔
اُردو کے بہی خواہوں کو ضرور اس میں شریک
ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اورینٹل کالج لاہور

آل انڈیا اردو کانگریس کا تخیل نہایت مبارک
اور برمحل ہے۔ میں اسکی کامیابی کے لئے
دست بدعا ہوں۔

حامد اللہ افسر میرٹھی

کل ہند اُردو کانفرنس کی تجویز مجھے بہت
پسند آئی۔

انیس الرحمٰن مدیر ماہنامہ "نئی زندگی" الہ آباد

ہمارے خیال میں آپ کی تجویز نہایت مناسب،

......آپ کی یہ رائے کہ اردو کانگریس
کو صحیح طور پر ہندستان کے تمام ماہرین
اردو اور اساتذہ کی نمائندگی ہونا چاہیئے
بالکل صحیح ہے۔ اور کام کرنے کا بھی طریقہ
یہی ہے۔

عبدالرؤف عباسی مدیر روزنامہ "حق" لکھنؤ۔

ترقی زبان کے لئے صحافت کی قوت کے نظم کی
یہ سعی یقیناً انشاءاللہ خوشگوار نتائج پیدا کریگی
بشرطیکہ اس کو پوری ہمت و استقلال کے
ساتھ جاری رکھا جائے۔ آپ حضرات نے
اس راہ میں جو قدم اٹھایا ہے وہ بہت
زیادہ قابل ستائش ہے خداوند برتر آپ کی
ان مساعی کو مشکور فرمائے۔

سید عبدالجلیل مائل صدر انجمن ترقی اردو بھوپال

ترقی اُردو کے لئے ارباب دکن کا یہ اقدام
بروقت اور نہایت مبارک شگون ہے۔
ہندوستان اس وقت ایک انقلابی دور سے
ہو کر گذر رہا ہے۔ اور کسی مفید تحریک کو استوار
بنیادوں پر قائم کرنے کا یہی مناسب وقت
ہے۔ اس وقت کا معمولی تساہل بھی آئندہ
کے عظیم نقصانات کا ذمہ دار قرار دیا جائیگا۔
اس دعوت نامہ میں اشاعت اُردو کے لئے
جس طریقۂ کار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے گویا

میرے ہی دل کی آواز ہے۔

اوپندر ناتھ اشک ۔ دہلی

اُردو کانگریس کے انعقاد کی خبر سن کر خوشی ہوئی ...... کانگریس کی کامیابی کا دعاگو ہوں۔

یوسف ظفر بی۔ اے جائنٹ ایڈیٹر ماہنامہ ہمایوں لاہور

مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کے اس نیک اور مستحسن اقدام پر ہدیۂ تبریک پیش کروں۔

خان بہادر ایم۔ اے رحمٰن چغتائی ۔ لاہور

میں آپ کی اس کوشش کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کانگریس کا نتیجہ اردو زبان کے حق میں بہت مفید ثابت ہوگا۔

رام بابو سکسینہ۔ مصنف تاریخ ادب اردو ۔ کلکٹر بلند شہر

نواب صاحب چھتاری کی صدارت۔ نواب سر مہدی یار جنگ بہادر کی صدارت مجلس استقبالیہ اور آپ جیسے لائق اور مستعد کی معتمدی میں اس کانگریس کا پوری طرح کامیاب ہونا لازمی ہے۔ (ترجمہ)

عبدالستار فاروقی۔ مدیر الفاروق ہفتہ وار کامٹی ناگپور

میں ادارۂ ادبیات اردو اور حیدرآباد کے دیگر حامیان اُردو کے اس اقدام کو اُردو کی ترقی کے سلسلہ میں مفید و مبارک خیال کرتا ہوں۔ اس لئے میری یہ انتہائی کوشش ہوگی کہ کانگریس ہر لحاظ سے کامیاب ثابت ہو۔

محمود رضویہ مدیر ماہنامہ "ہندستانی" کراچی

حیدرآباد دکن بسلسلۂ اُردو پروری جو کچھ کر رہا ہے وہ نہ صرف قابل تقلید ہے بلکہ باعث صد ناز بھی۔ میں آپ کی کانگریس کی کامیابی کی متمنی ہوں۔ دعا ہے کہ قدرت آپ کے ارادوں میں استقامت دے۔ اور بڑھتی ہوئی ہمتوں میں پرواز۔

سید بشیر زیدی معتمد انجمن ذوق ادب مدیر ماہنامہ تصویر رام پور

آل انڈیا اردو کانگریس یقیناً ضروری اور قابل قدر ہے۔ خدا کرے ہمارا ملک گرم جوشی سے اس کا استقبال کرے۔ آپ کی توجہ سے اس کا پورا بھروسہ ہے۔

سید سبط حسن انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی

اردو کانگریس کا اعلان نامہ بہت جامع ہے اور اگر ہم لوگوں نے اس کے پروگرام کے دسویں حصے پر بھی عمل کر لیا تو آپ لوگوں کی کوشش مشکور ہو جائیں گی۔ شکر ہے کہ اردو کے ادیب جاگے تو اور انھیں اردو کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کی فکر تو ہوئی۔

محمد امیر حیدر خاں مہاراج کمار محمود آباد

جناب کی سعی ادب اردو کی بقا اور ترقی کے لئے ایک قابل قدر و تقلید مثال ہے۔ اور اُمید پائی جاتی ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو کو دیکھ کر اطراف ملک ہند میں ایسے ادارے قائم کئے جائیں گے۔

ابو الاثر حفیظ جالندھری

اردو کانگریس میں جو مسائل زیر بحث لائے جارہے ہیں نہایت ضروری ہیں۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ کا دست عقدہ کشا ان اہم مشکلات کو آسان کر دیگا۔ اور پورا ہندستان اُردو کی اشاعت و ترقی کے سلسلہ میں حیدرآباد اور آپ حضرات کی مساعی کے لئے شکر گذار ہوگا۔

جناب تمنائی۔ نیا سنسار۔ بانکی پور۔ پٹنہ

کوئی شبہ نہیں کہ یہ اجتماع اپنی نوعیت کا ایک بہترین اجتماع ہوگا۔ اور جو مسائل اس عظیم الشان کانگریس میں زیر بحث آئیں گے وہ بھی وقت کے نہایت اہم مسئلے ہیں۔ میری بہترین خواہشیں آپ کی مساعی کے ساتھ ہیں۔ اور میں سچے دل سے اس کانفرنس کی کامیابی چاہتا ہوں۔

طاہر میر دار النشر لاہور۔

خدا اردو کانگریس کو کامیاب کرے اور آپ کو اُردو کی خدمت کی زیادہ توفیق دے۔ آپ صاحبان جو اُردو کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں اُردو کی تاریخ میں اس کے لئے نمایاں جگہ ہے۔

خواجہ حسن نظامی دہلی۔

جن لوگوں نے حیدرآباد میں اُردو کانگریس منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے ان میں اکثر بلکہ سب کے سب حیدرآباد کے ہیں۔ اور ہر شخص کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مولوی عبدالحق صاحب جیسا خلوص اور جوش اُردو زبان کی حمایت اور خدمت کا اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور جو کمی مولوی عبدالحق صاحب کے بڑھاپے یا خاص مزاجی حالت کی وجہ سے اُردو کی ترقی میں واقع ہوگئی تھی وہ حیدرآباد کی اس اُردو کانگریس کے ذریعہ سے دُور ہو جائیگی۔ یا وہ کمی پوری ہو جائیگی۔ میں اپنے مریدوں اور مداحوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ سب محض اُردو کی مدد کا مقصد سامنے رکھکر اور ذاتی تعلقات سے قطع تعلق کر کے اس کانگریس میں شریک ہوں یا اپنی اپنی حیثیت کے موافق اس کی مدد کریں۔

(منادی یکم جولائی ۱۹۴۴ء)

ہنر الہ آبادی - مدیر ماہ نامہ ہل الہ آباد

حیدر آباد اور اہل حیدر آباد کی اُردو کی
خدمات کی جو قدر میرے دل میں ہے اور آپکی
ذات خاص کے ساتھ مجھے جو عقیدت ہے
اس کی بنا پر میری خواہش ہے کہ میں حیدرآباد
آؤں۔

سید ریاست علی ندوی دار المصنفین اعظم گڑھ

حیدر آباد کے ہاتھوں اُردو زبان نے نئی زندگی
پائی ہے۔ اُردو کی اور خدمت گذار انجمنوں نے
بھی جو بیرون حیدر آباد میں ہیں بالواسطہ و
بلاواسطہ اسی کے فیض کرم سے سیراب ہو کر
خدمتیں کر سکنے کی صلاحیتیں پائی ہیں۔ اسلئے
حیدر آباد ہی کو یہ حق حاصل تھا وہ شمال و
جنوب کے خدمت گذاروں کے لئے نقطۂ
اتصال قرار پائے۔ اور اس اُردو نواز فضا
میں بیٹھ کر وسیع تر بنیادوں پر اُردو کی خدمت
کے مواقع پیدا کئے جائیں۔ آپ مخلصوں کے
حسن عمل سے بحمد اللہ اب یہ مواقع سامنے
آگئے۔ ہماری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

محمد سلطان محی الدین ایم اے۔ ایل ایل بی۔ ایم ایڈ ناظم تعلیمات ریاست میسور

میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپنے ایسی
مفید کانگریس کے قیام کا تخیل پیش کیا اور
اس کا پہلا اجلاس حیدر آباد میں منعقد کرنے
کا انتظام کیا جو ہندوستان کی ترقی اُردو کا
سب سے اہم مرکز ہے۔ جو مضامین غور و خوض
کے لئے متعین کئے گئے ہیں وہ اُردو زبان
اور ادب گویا اُردو تمدن اور کلچر کے لئے
خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

برکت علی چودھری مالک مکتبۂ اردو لاہور

کل ہند کانگریس کا یہ علمی پہلو قابل تحسین ہے
آپ لوگوں کا دم غنیمت ہے کہ اُردو زبان
کے جدید ترین مسائل و ارتقائی مدارج کے
لئے ایسے عظیم الشان اجتماعوں کا اہتمام
فرماتے ہیں۔ ہمارا خلوص آپ کے ساتھ
ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی تجاویز
کے بہترین پہلوؤں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

محمد مرزا۔ دائرہ ادبیہ زینت محل دہلی۔

میں اس مبارک تحریک میں دل سے آپ کے
ساتھ ہوں اور اپنی بساط بھر خدمت کو حاضر
ہوں۔ بڑے اہم اور ضروری کام کا آپ نے
بیڑا اٹھایا ہے خدا آپ کو کامیاب کرے۔

بدر جلالی - مدیر روز نامہ جنگ دہلی۔

جناب مکرم کی مساعی جمیلہ نے جس لسانی موتمر
کی ترتیب دی ہے ہماری سب کی دعائے

خیر کی حقدار ہے۔ رب کریم جناب کو اور جناب کے مخلص رفقاء کو کامیاب فرمائے۔

خلافت۔ بمبئی۔ ۱۲ ر جولائی ۴۴ء

اس ماہ حیدر آباد میں ایک اردو کانگریس منعقد ہو رہی ہے جس کے داعی ڈاکٹر محی الدین قادری زور ہیں۔ اس کانگریس کے سلسلہ میں زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اور امید ہے کہ ملک کے مختلف حصوں سے اُردو کے ادیب ایڈیٹر اور دوسرے بہی خواہ بڑی تعداد میں شریک ہوں گے۔ چونکہ یہ کانگریس اپنی نوعیت کا پہلا اجتماع ہے۔ اور ایسے زمانہ میں ہو رہا ہے جبکہ اُردو کی بقاء و تحفظ کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس لئے بہی خواہان اُردو کا فرض بھی ہو گیا ہے کہ وہ اسے کامیاب بنائیں۔ اُمید ہے کہ وہاں ہندوستان کی اس قومی زبان کی ترقی و تحفظ کے وسائل پر پوری سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔ اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

بعض حلقوں میں کانگریس کے انعقاد پر اعتراضات بھی کئے جا رہے ہیں اور سب سے بڑا اعتراض دو ہیں۔ ایک یہ کہ کانگریس کو ہندوستان کے کسی حصہ کے بجائے ایک ریاست میں کیوں منعقد کیا جا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے اُردو کے مخالف حیدر آباد کی مخالفت شروع کر دیں گے۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ دونوں اعتراضات کوئی وزن نہیں رکھتے کیونکہ حیدر آباد نے اُردو کی جو خدمت کی ہے اسکی وجہ سے وہ اُردو کے مراکز میں سے ایک خیال کیا جاتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اُردو کا سب سے بڑا اور مضبوط قلعہ ہے۔ کیونکہ وہاں کی سرکاری زبان اُردو ہے۔ اور وہاں اعلیٰ تعلیم تک اُردو میں دیجاتی ہے۔ اور یہ بات اس کے سوائے ہندوستان کے کسی اور حصہ کو حاصل نہیں۔ پھر کانگریس کے بانی تو حیدر آباد ہی کو اس کا مستقل مرکز بنانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے ہیں۔ رہا دوسرا اعتراض تو وہ بھی اسی بناء پر فضول ہے کہ حیدر آباد کی آج تک اس وجہ سے کسی نے مخالفت کرنے کی ہمت نہیں کی ہے کہ وہ اُردو کا مرکز ہے۔ کچھ لوگ خود غرضانہ سیاسی اسباب کی بناء پر حیدر آباد کی مخالفت کیا کرتے ہیں۔ اردو کانگریس کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

ماہنامہ جدید اردو کلکتہ۔ بابت جولائی ۴۴ ۱۹ء

ہمیں اُردو کانگریس کے اغراض و مقاصد سے

- کامل اتفاق تھے اور ہم اس کو کامیاب بنانے
کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے کہ اُردو کانفرنس
کا یہ پہلا ہی اجلاس معیاری طور پر کامیاب ثابت
ہو۔ اور اس کی اساس ایسی مضبوط بنیادوں
پر قائم ہو جائے کہ وہ اردو اور حامیان اُردو
کے لئے "روشنی کا مینار" ثابت ہو اور
حامیان اُردو کی مساعی ایک ہی مرکز سے
ہدایات پا کر مربوط ہو جائیں اور اُردو زبان
ملک کے چپے چپے پر پھیل جائے ......

مجلس استقبالیہ نے بنگال کے
پروفیسران اور ادیبوں کو بھی اس کانگریس
میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ اور اُمید
کی جاتی ہے کہ یہاں سے خاصی تعداد ارباب اُردو کی
شریک اجلاس ہو گی۔